THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ہجری سنہ ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۱

یکم و ۱۶ فروری ۱۹۸۲ء ۱، ۲

مدیر سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول۔ قاضی معزالدین احمد

قیمت فی پرچہ

سالانہ پندرہ روپے

۱۵۱

اس پرچہ میں صرف مضامین مفیدہ جو مسلمانوں سے متعلق ہیں چھاپہ ہوتے ہیں اور اس سبب سے اخبار امصار و دیار اس میں مندرج نہیں ہوتے۔ مقصود اس پرچہ کے اجراء سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حُسنِ معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہبِ اسلام کے برخلاف ہیں وہ بھی مٹائے جاویں۔

(سر سید) از تہذیب الاخلاق سنہ ۱۸۷۰ء

(اس پرچے کی لوح اور مندرجہ بالا مضمون تہذیب الاخلاق کے سب سے پہلے شمارے سے جو سر سید کی ادارت میں نکلا تھا، لی گئی ہے)

تمہید

تہذیب الاخلاق مورخہ ۲۴ر دسمبر سنہ ۱۸۷۰ء مطابق سنہ ۱۲۸۷ھ

اس پرچہ کے اجراء سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ کی سویلیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جاوے تاکہ جس حقارت سے سویلیزڈ یعنی مہذب قومیں اُن کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز و مہذب قوم کہلاویں۔

سویلیزیشن انگریزی لفظ ہے جس کا تہذیب ہم معنی ترجمہ کیا ہے مگر اس کے معنی نہایت وسیع ہیں اس سے مراد ہیں انسان کے تمام افعال ارادی اور اخلاق اور معاملات اور معاشرت تمدن اور طریقہ تمدن اور صرف اوقات اور علوم اور ہر قسم کے فنون و ہنر کو اعلیٰ درجہ کی عمدگی پر پہونچانا اور ان کو نہایت خوبی اور خوش اسلوبی سے برتنا جس سے اصلی اور جسمانی خوبی ہوتی ہے۔ اور تمکین اور وقار اور قدر و منزلت حاصل کی جاتی ہے اور وحشیانہ پن اور انسانیت میں تمیز نظر آتی ہے۔

یہ بات نہایت سچ ہے کہ کسی قوم کے مہذب ہونے میں اس قوم کے مذہب کو بھی بڑا دخل ہے بے شک بعضے مذہب ایسے ہیں کہ وہ تہذیب قوم کے بڑے مانع ہیں پس اب دیکھنا چاہیے کہ کیا مسلمانی مذہب بھی ایسا ہی ہے۔

اس باب میں مختلف رائیں ہیں ایک عیسائی متعصب مورخ نے ٹرکی یعنی روم کی سیر کے بعد اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ ترک جب تک مذہب اسلام کو نہ چھوڑیں گے مہذب نہ ہو سکیں گے کیونکہ مذہب اسلام انسان کی تہذیب کا مانع قوی ہے۔

سلطان عبد العزیز خاں سلطان روم کو جو بالفعل بادشاہ ہے اس بات کی تحقیقات منظور ہوئی کہ درحقیقت مذہب اسلام مانع تہذیب ہے یا نہیں اور چند علماء اور عقلا اور وزراء کی کونسل اس امر کی نسبت رائے لکھنے کو مقرر کی جس کا افسر فواد پاشا تھا اس کونسل نے جو رپورٹ لکھی اُس کے دو فقروں کا ترجمہ اس مقام پر لکھا جاتا ہے۔

"اسلام میں وہ سب سچی باتیں ہیں جو کہ دنیا کی ترقی کو حاصل کرنے والی اور انسانیت اور تہذیب اور رحمدلی کو کمال درجہ پر پہونچانے والی ہیں مگر ہم کو اپنی بہت سی رسوم و عادات کو جو اگلے زمانے میں مفید تھیں مگر حال کے زمانے میں نہایت مضر ہو گئی ہیں چھوڑنا چاہیے"

اب دونوں رایوں میں سے کسی ایک رائے کا سچ کر کر دکھا دینا مسلمانوں کے اختیار میں ہے۔ اگر وہ اپنے عملی کاموں سے مثل اور دنیا کی مہذب قوموں کے اپنے تئیں بھی مہذب کر دکھاوینگے تو فواد پاشا کی رائے کی تصدیق کریں گے۔ ورنہ از خود اس پہلی رائے کی تصدیق ہوگی۔

ایک اور انگریز مورخ ہندوستان کے مسلمانوں کی موجودہ حالت کی نسبت یہ لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے مسلمان ذلیل ترین امت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہیں اور قرآن کے مسئلوں اور ہندوستان کی بت پرستی سے مل ملا کر ان کا مذہب ایک عجیب مجموعہ ہو گیا ہے۔"

ہماری سمجھ میں فواد پاشا کی رائے اور اس پچھلے انگریزی مورخ کا بیان بالکل درست ہے۔ ہم مسلمانوں میں بہت سے پورانے قصے یہودیوں کے اور بہت سی باتیں اور خیالات اور اعتقادات رومن کیتھلک کے جو ایک قدیم عیسائی فرقہ ہے اور جو مدت سے عرب میں بھی موجود تھا اور بے انتہا رسمیں اور عادتیں ہندوؤں کی مل گئی ہیں اور مزید برآں بہت سی باتیں خود ہماری طبیعتوں یا ہماری غلط فہمیوں نے پیدا کی ہیں جو درحقیقت مذہب اسلام

یں نہیں ہیں۔ اور اسی سبب سے مسلمانوں کی عجیب حالت ہو گئی ہے اور یہی باعث ہے کہ غیر قومیں ہماری اس ہیئت مجموعی پر خیال کر کر اس مجموعہ کو مذہب اسلام قرار دیتی ہیں اور اس کی نسبت نہایت حقارت کی رائے رکھتی ہیں جیسے کہ ایک انگریزی مورخ نے مفصلہ ذیل رائے لکھی ہے۔

"عیسائیت اس بڑی سے بڑی خوشی کے جو قادر مطلق نے انسان کو دی ہے صرف موافق اور مطابق ہی نہیں ہے بلکہ اس کو ترقی دینے والی ہے اور برخلاف اس کے اسلام اس کو خراب کرنے والا اور ذلت میں ڈالنے والا ہے"

پس اب کیا یہ غیرت کی بات نہیں ہے کہ ہم غیر قوموں سے ایسی حقارت کے الفاظ اپنی نسبت اور اپنے روشن اور سچے مذہب کی نسبت سنیں اور اپنی تہذیب اور تربیت اور شائستگی کی طرف متوجہ نہ ہوں۔

یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ ہم فواد پاشا کی رائے کو جو بڑے بڑے عقلاء اور علماء کے اتفاق سے لکھی گئی ہے اختیار کریں اور بخوبی ہوشیار ہو کر نیک دلی اور غور سے اپنی حالت پر خیال کریں اور جو رسوم و عادات اب ہم میں موجود ہیں اور جو مانع تہذیب ہیں ان کو دیکھیں کہ وہ کہاں سے آئیں اور کیونکر ہم میں مل گئیں اور یا کیونکر ہم میں خود پیدا ہو گئیں اور ان میں سے جون جون سی ناقص اور خراب اور مانع تہذیب ہوں ان کو ترک کریں اور جو قابل اصلاح ہوں ان کی اصلاح کریں اور ہر ایک بات کو اپنے مذہبی مسائل کے ساتھ مقابلہ کرتے جائیں کہ وہ ترک یا اصلاح موافق احکام شریعت بیضا کے ہے یا نہیں تاکہ ہم اور ہمارا مذہب دونوں غیر قوموں کی حقارت اور ان کی نظروں کی ذلت سے بچے کہ اس سے زیادہ ثواب کا کوئی کام اس زمانہ میں نہیں ہے۔

یہی ہمارا مطلب اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں سے ہے اور اسی مقصد کے لیے یہ پرچہ جاری کرتے ہیں تاکہ بذریعہ اس پرچہ کے جہاں تک ہم سے ہو سکے ان کے دین و دنیا کی بھلائی میں کوشش کریں اور جو نقصان ہم میں ہیں گو ہم کو نہ دکھائی دیتے ہوں مگر غیر قومیں اُن کو بخوبی دیکھتی ہیں ان سے اُن کو مطلع کریں اور جو عمدہ باتیں اُن میں ہیں اُن میں ترقی کرنے کی اُن کو رغبت دلاویں۔

واللہ ولی التوفیق

السعی منا والاتمام من اللہ اللہم آمین ثم آمین

راقم

سید احمد

نہیں مقام کی خوگر طبیعت آزاد
ہوائے سیر مثال نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضرب کلیم پیدا کر

(اقبال)

تہذیب الاخلاق
یکم فروری ۱۹۸۲ء

ہمارے مسائل

سید حامد

سو سال سے زیادہ ہوئے سرسید نے ایک رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے جاری کیا تھا۔ یہ تین بار نکلا اور بند ہوا۔ تہذیب الاخلاق کی کل مدتِ حیات دس برس سے آگے نہ بڑھ سکی۔ سرسید نے آخری بار اسے اس لیے بند کیا کہ جن اصلاحی خیالات کا اظہار وہ اس کے ذریعہ کر رہے تھے وہ بعض ان بااثر اور قدامت پسند اشخاص کو ناگوار تھے جن کی مدد سرسید ایم اے او کالج کے قیام اور فروغ کے لیے لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے یہ رسالہ بادلِ ناخواستہ بند کیا۔ اگرچہ ان اشخاص کا اور خود اسی تحریک کا بھرم رکھنے کے لیے انھوں نے اپنے اس لختِ جگر کو پیوندِ خاک کرتے ہوئے کہا تو یہی کہ وہ اپنا مقصد پورا کر چکا تھا۔ مقصد کی ایک گونہ تحصیل ضرور ہوئی تھی یعنی پڑھے لکھے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ہمیں مایوسی، جہالت، جھوٹی قناعت اور اندھی قدامت سے دل کے دامن کو بچانا ہے ان برائیوں سے نجات حاصل کرنا ہے۔ ہمیں زمانہ کے تقاضوں کو سمجھنا ہے اور انھیں پورا کرنا ہے۔ اگر ہم نے جدید تعلیم سے منہ موڑا تو زندگی کی دوڑ میں ہم پیچھے رہ جائیں گے اور پیچھے رہ جانے کا انعام شروع میں تحقیر اور رسوائی اور آخر میں فنا ہے۔ لیکن یہ احساس ابھی عام نہ ہوا تھا کہ یہ رسالہ بند ہو گیا۔ سرسید نے سوچا ہوگا کہ جس کالج اور جس یونیورسٹی کا خواب انھوں نے دیکھا ہے اس کے قیام کے بعد وہ ادارہ خود سرچشمہ تہذیب و ہدایت بن جائے گا۔ اس ادارے کے منبع سے جو کرنیں پھوٹیں گی وہ ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشہ کو منور کریں گی۔

اس سے ادارہ کا کام نہ صرف تعلیم دینا اور تحقیق کرنا ہوگا بلکہ تربیت دینا اور اخلاق کو سنوارنا بھی ہوگا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کو قائم ہوئے ۱۰۴ سال ہو گئے اور اسے یونیورسٹی بنے ہوئے دو اوپر ساٹھ سال۔ تہذیب الاخلاق کو جو کام کرنا تھا وہ یہ ادارہ نہ کر پایا۔ اس میں شک نہیں کہ اس ادارہ نے حوصلہ پیدا کیا، روشنی بخشی۔ اس نے ایسے فرزندوں کو جنم دیا جو ملک و ملت کے لیے سرمایۂ افتخار بنے۔ جو کچھ روشنی ہم ہندوستانی مسلمانوں میں دیکھتے ہیں وہ بڑی حد تک اسی ادارہ کی دین ہے۔ لیکن آگے چل کر یونیورسٹی کے ولولے سرد ہو گئے۔ ملک کی تقسیم کے لیے اسے الزام دیا گیا۔ یہ اس کے ساتھ ناانصافی تھی۔ یہ خیال کہ ہم پر شبہ کیا جا رہا ہے، ہمیں عداوت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے، صحت کے لیے مضر ہے۔ ہمارے طالب علم سمجھنے لگے کہ ہمارے ساتھ اپنے ملک میں انصاف نہیں ہوگا، ہمیں یہاں روزگار نہیں ملے گا۔ اور واقعی جب انھوں نے روزگار کے دروازہ کو یہاں بند پایا تو ان کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا کہ روزگار کی تلاش میں سرحد کو پار کریں۔ وہ اس طرح گئے کہ نہ جانے والوں کو اور مشتبہ کر گئے۔ مشتبہ رہنے کے بعد حوصلہ کہاں باقی رہتا ہے۔ چنانچہ جس ملت کو سرسید نے سرگرمِ عمل ہونا اور آگے بڑھنا اور زمانہ کے ساتھ چلنا سکھایا تھا وہ ملت اپنے خول میں واپس چلی گئی۔ خول کے اندھیرے سے اس کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچی۔ روشنی کھٹکنے لگی۔ مایوسی نے انوکھے مشورے دیے۔ خود پر ترس کھانے، طبیعت

[illegible] نظر انداز کر دیا گیا۔
قومی کمالات کے صحت مند اور نارمل ردِّ عمل سے ہم لوگ محروم ہوگئے۔ مفادات اور تعصبات نے اس سلسلے کو اور تیز کر دیا۔

یونیورسٹی جوکھوں میں پڑ گئی تھی۔ اس کو ایک بڑے رہنما اور اس کے ایک مشیر کی بصیرت نے بچا لیا۔ یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی تعداد، اس کی عمارتوں اور ساز و سامان، اس کے بجٹ میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اس کے سارے مصارف کی حکومت کفیل بن گئی لیکن اس دارالعلوم میں وہ روح پلٹ کر نہ آئی، جس نے اسے تعلیم و تہذیب کی ایک بڑی تحریک کا مرکز بنا دیا تھا۔ اس کے فرزند اس اعتماد اور ولولے سے محروم رہے جو ان کی پہلی پیڑھیوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ انھوں نے ریاضت سے دامن بچایا، مقابلے سے آنکھ چرائی۔ انھوں نے مقدار کو معیار کا بدل سمجھا۔ لہٰذا سے زیادہ داخلے کیے گئے۔ ہم آگے بڑھے، صرف تعداد میں۔ اس اطمینان نے کہ حکومت وقت سارے اخراجات کی ضامن ہے، ہمت کو پا بہ زنجیر کر دیا۔ انجام کار یونیورسٹی عام یونیورسٹیوں کی صف میں بیٹھ گئی۔ جسے عہد آفریں ہونا تھا وہ عہد شکن ثابت ہوئی۔ اُس عہد کو توڑنے والی جو اس نے اپنے بانی سے کیا تھا۔ یعنی یہ پیمان کہ وہ شجر سے پیوستہ رہتے ہوئے جدید ترین ترقیوں کو جذب کرے گی، تعلیم اور تہذیب کی نقیب اور کاروان سالار بنے گی۔ افسوس کہ یہ جیتا جاگتا، امنگوں، خوابوں اور زندگی سے بھرپور ادارہ، ضابطہ، آسائش اور بے امنگی اور معیار فراموشی کے شکنجے میں جکڑ گیا۔ اب یہ خود کو سنبھال لے، اپنے طالب علموں کو روشنی اور حوصلہ بخشے تو بڑی بات ہے۔ پوری ملت کی رہنمائی کا اس کا بوتا نہیں ہے۔ حالاں کہ یونیورسٹی کے ایکٹ میں حال ہی میں جو ترمیمیں ہوئی ہیں اُن میں ایک کی رُو سے یونیورسٹی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی بہبود اور ترقی کے لیے جدوجہد کرے۔ یہ دفعہ اہم اور [illegible] دیکھنے کے لائق

ہے۔ اس کام میں اسے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ کانفرنس نے ایک زمانہ میں کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس کے سالانہ اجلاس ہندوستانی مسلمانوں کے سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس اجلاس کے صدارتی خطبے مسلمانانِ ہند کے تمام اہم مسائل کا احاطہ کرتے تھے اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کی تجاویز پیش کرتے تھے۔ تہذیب الاخلاق کی طرح آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ تحریک کا اہم جزو تھی۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ تہذیب الاخلاق کو نئے سرے سے زندہ کیا جائے اور کانفرنس کی مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑایا جائے۔

اس رسالہ کو کوئی دوسرا نام دے سکتے تھے لیکن تہذیب الاخلاق نام رکھنے کی جسارت تسلسل کی خاطر کی جا رہی ہے اور توانائی اور روشنی حاصل کرنے کے لیے بھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں یہ موڑ بہت کچھ ویسا ہی ہے جیسے ۱۸۵۷ء کی بغاوت یا پہلی جنگِ آزادی کے بعد کا موڑ۔ پہلی جنگ آزادی کے بعد پہلی بار مسلمانوں کے اطوار و افعال اور زاویۂ نگاہ کو انگریزوں سے شکست اور ان کے مظالم نے مسخ کر ڈالا تھا۔ بٹوارہ اور آزادی کے بعد ایک بار پھر اُن کے اعتماد کو دھکا لگا۔ انھوں نے بے رحم دنیا سے بدلہ اس طرح لیا کہ اس کی ہماہمی اور اس کی پیش رفت سے کنارہ کش ہوگئے۔ بند پانی میں فساد کی بو آتی ہے۔ پانی مرتا ہے تو سڑنے لگتا ہے۔ کارواں رک جائے تو ناکارہ ہو جاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کی دوسری بڑی اکثریت ہیں انھیں اقلیت کہنا نامناسب ہوگا۔ صدیوں تک صاحب اقتدار و اختیار رہ چکے ہیں۔ ان کا تعلق ایک ایسی ملت سے ہے جس نے علم و اعمال کی مشعلیں روشن کیں، جس نے اُخوت، حریّت اور مساوات کے دیے جلائے، ان مشعلوں، ان چراغوں کو لے کر چشم زدن میں دنیا کو منور کر دیا۔ تاریخ کا یہ بڑا المیہ ہے کہ چند صدیاں گزرنے کے بعد وہی لوگ جو مشاہدہ، تجربہ اور غور و فکر کے علمبردار

علم و اخلاق کے کارواں سالار تھے۔ جہالت، جمود اور اندھی تقلید کے حصار میں آ بیٹھے۔ جہالت نے انھیں کہیں کا نہ رکھا۔ اپنے بھلے برے کا انھیں شعور نہ رہا۔ جب تک کہ تعلیم عام نہیں ہوتی، مسلمان تہذیب کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔ علم ہماری گمشدہ میراث ہے اسے حاصل کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ اس پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے یہ کام تہذیب الاخلاق انجام دے گا۔

اردو میں اخبار و رسائل کی کمی نہیں لیکن ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سنجیدہ انداز میں مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور اقتصادی مسائل پر غور کرتے ہوں۔ جن کا مقصد ہو مسلمانوں میں وہ خواص پیدا کرنا جو انھیں تنزل سے ہٹا کر ترقی کی طرف لے جائیں۔ یہ بات کہتے ہوئے ہماری گردن شرم سے جھک جاتی ہے کہ مسلمان اس ملک کا سب سے پسماندہ فرقہ ہیں۔ اس سے زیادہ تشویش ناک یہ بات ہے کہ انھیں اپنی پسماندگی کا نہ علم ہے نہ احساس۔

ہماری دوسری شانِ امتیاز کاہلی ہے۔ اگر ہمارا کوئی عضو سرگرمِ عمل ہے تو زبان۔ زیادہ بولنے والے دو طرح لٹتے رہتے ہیں۔ اس عادت سے ایک تو قوتِ عمل کو زنگ لگتا ہے، دوسرے یہ سننے، غور کرنے اور سمجھنے کا موقع نہیں دیتی۔ ہم قول کو فعل کا بدل سمجھنے لگتے ہیں۔ یہیں سے خود فریبی کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جو کردار کو کھوکھلا کر دیتا ہے اور انسان کو جھوٹ کے گڑھے میں ڈھکیل دیتا ہے۔ مختصر یہ کہ آرام طلبی ہماری طبیعت بن گئی ہے۔ محنت، ریاضت اور جفاکشی سے ہم جی چراتے ہیں۔ ہم وقتی جوش میں کبھی کبھی خون بہانے کی بات تو کرتے ہیں، پسینہ بہانے سے گھبراتے ہیں۔ پتّہ مارنے کے بجائے ہم ڈینگ مارتے ہیں۔ بادشاہی، جاگیرداری اور زمینداری کے زمانے ختم ہوئے لیکن وہ مزاج ہنوز باقی ہے۔ رسّی جل گئی بل نہ گیا۔

ملے خاک میں پر رعونت وہی ہے
ہوئی صبح اور خوابِ راحت وہی ہے

شراب کی طرح کاہلی بھی اُم الخبائث ہے۔ اَن گنت برائیوں کی جڑ ہے۔

اور رعونت وہ تیسرا روگ ہے جو گھن کی طرح ہمیں لگ گیا ہے جسے دیکھیے فرعونِ بے ساماں بنا ہوا ہے۔ اگر سامان ہوتا تو نہ جانے کیا کرتے۔ یا شاید بے سر و ساماں ہونے کی نفسیاتی تلافی رعونت و گھمنڈ کے ذریعہ کی جا رہی ہے۔ انانیت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بڑے بڑے اہم ملی مسائل میں کیا رُخ اختیار کیا جائے اس کا فیصلہ صرف اس بات پر ہوتا ہے کہ جو شخص براہِ راست اس مسئلے سے متعلق ہے وہ آپ کی طرف کس حد تک ملتفت ہوا۔ اس نے قصداً یا سہواً آپ کو نظر انداز کر دیا تو آپ نہ صرف اس کے دشمن ہو جائیں گے بلکہ اس مسلک کی مخالفت پر بھی تل جائیں گے جو اس غریب نے اپنایا ہے۔ امور کے متعلق ردعمل کا یہ انداز خام کاری اور تنگ ظرفی کی دلیل ہے یہ طریقِ کار، افراد کی یہ سوجھی اور پھولی ہوئی انانیت، جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔ عبرت کی جگہ ہے کہ انفرادی نخوت نے اجتماعی عزتِ نفس کا خون کر دیا ہے۔ بلکہ خود جمعیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

یہی رعونت نفاق کی جڑ ہے۔ اتحاد نہ ہوگا تو طاقت کہاں سے آئے گی۔ جسے دیکھیے لڑنے مرنے کیلیے تیار ہے۔ بے مہار انفرادیت نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔ طغیان آمادہ انانیت اور بے زنجیر انفرادیت پر انکس لگانا ہے۔

انانیت نے ایک اور بہروپ بھرا ہے: حسد۔ اس کے جو زیادہ قریب ہوتا ہے وہی زیادہ موردِ التفات ہوتا ہے۔ بیگانے ترقی کریں پھلیں پھولیں، کوئی فکر نہیں، لیکن اپنوں میں کوئی بڑھنے نہ پائے، آگے بڑھنے نہ پائے۔ اس سے یہ راز کھلا کیوں اپنے مسلمانوں پر جو بیگانگی

ہے وہ انھیں کی خود ساختہ پرداختہ ہوتی ہے۔ اسلام نے اجتماعیت اور قناعت پر زور دیا ہے یہ دونوں سبق ہم فراموش کر چکے۔

دوسرے حیوانوں پر انسان کی برتری عقل کی وجہ سے ہے۔ عقل ہی جذبات کو قابو میں رکھتی ہے، اُن کی عنان گیر ہوتی ہے، اُن کو راہ پر لگاتی ہے، ان کو اچھے کاموں میں استعمال کرتی ہے۔ عقل ہی بُرے بھلے کو پہچانتی ہے۔ وہی اندھیرے میں راستہ دکھاتی ہے۔ ہم نے عقل کو معزول کر رکھا ہے۔ ہمارے یہاں سارا کھیل جذبات کا ہے۔ کوئی خطیب، کوئی چابک دست اہلِ قلم، کوئی سیاست داں، کوئی بانی سُترجب چاہے ہمارے جذبات کا رُخ جس طرف چاہے موڑ دے۔ جذبات کا طوفان ہمیں اونچ نیچ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ جو چاہے ہمیں برانگیختہ کر دے بے وقوف بنا دے، خودکشی پر آمادہ کر دے۔ جذبات کے سیلاب میں بہنا کون سی اچھی بات ہے۔ سیلاب میں تو خس و خاشاک بھی بہتے ہیں۔ ہمیں چٹان کی طرح قدم گاڑ کر رہنا ہے۔ یہی عزتِ نفس کا تقاضا ہے، بقا بھی اسی میں ہے۔ عقل بھی یہی سکھاتی ہے۔ عقل کی بازیابی، عقل کی بالادستی ہمارا مقصود ہے۔

یہاں تک تو ہم نے اپنے مزاج، اپنی افتادِ طبع کو آئینہ دکھایا ہے۔ وہ افتادِ طبع جو ہماری خوش حالی، ہماری ترقی کے خلاف جاتی ہے۔ اب ہم ان باتوں کا ذکر کریں گے جن پر رسالہ میں خاص طور سے دھیان دیا جائے گا۔ پہلے ان توہمات کو لیجیے جنھوں نے ہمیں کمزور، اپاہج، اور معطل یقین بنا دیا ہے۔ خدا کے بنائے ہوئے ہفتے اور دن انسان کو امکانات اور مواقع فراہم کرنے میں یکساں ہیں۔ ہم نے اپنی ضعیف الاعتقادی کے باعث اُن پر مبارک اور منحوس کے لیبل لگا دیے ہیں۔ بہت سی تباہ کن، وقت، پیسہ اور اعتماد ضائع کرنے والی رسموں کو ہم نے پتھر کی لکیر مان لیا ہے۔ عقلی اور علمی ترقی کے دور میں ہم جھاڑ پھونک اور ٹونے ٹوٹکے پر ایمان لائے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات کے لیے ہم دوسروں کے دستِ نگر بن جاتے ہیں اور اپنے اور اپنے خدا کے درمیان فاصلوں کو طول دیتے رہتے ہیں۔ خدا کے سوا ہم ہر ایک سے ڈرتے ہیں۔ مل کر ہم کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ہماری شرکت کی ہانڈی ہمیشہ چوراہے پر پھوٹتی ہے۔ اس لیے ہمارے کاریگر اور ہنرور امدادِ باہمی اور سہکارتا اور اشتراکِ عمل سے طاقت نہیں اخذ کر پاتے۔ جہالت اور نفاق اور کم حوصلگی ہنر کے باوصف انھیں آگے بڑھنے نہیں دیتی۔

علی گڑھ تحریک کا ادبی اور لسانی پہلو کس قدر درخشاں تھا۔ اردو زبان اور ادب کو اس تحریک نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ لیکن یہ احسان یک طرفہ نہ تھا۔ اگر اردو زبان اور ادب کی پُرزور تائید اسے حاصل نہ ہوتی تو یہ تحریک کُھلا کر رہ جاتی۔ سرسید اور ان کے رفقا، حالی، شبلی، ذکاء اللہ، نذیر احمد، محسن الملک، وقار الملک وغیرہ نے اردو تحریر و تقریر کو سرسید کے مقاصد اور منصوبوں کی تکمیل اور اشاعت کے لیے استعمال کیا۔ اُس زمانہ میں اُردو میں سلیقہ اور خلوص سے جو بات کہی یا لکھی گئی مسلمانوں کے دلوں میں اترتی چلی گئی۔ اس زمانہ میں یہ عالم ہے کہ دن بدن مسلمانوں میں اردو جاننے والوں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے مشاہیر اہلِ قلم کے گھروں کو ٹٹولیے تو بیشتر کے بچے کو اردو سے ناواقف پائیے گا۔ اگر زمانہ کی رفتار یہی رہی تو وہ دن دور نہیں جب اردو ایک بحرِ بیکراں سے سمٹ کر جوئے کم آب رہ جائے گی۔ یعنی صرف ایک بولی جس کے بولنے والے بہت ہوں گے اور لکھنے پڑھنے والے بہت کم۔ اردو کو مطالبات سے زیادہ مجاہدات کی ضرورت ہے۔ یہ ریاضت اور ایثار کی طالب ہے اور اِن اجناس کی ہوا تک ہمارے ذخیرہ نہیں لگی۔

شادیوں میں داد و ستد کا شرمناک سلسلہ کہیں کہیں ہمارے یہاں بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس رسم کو پھیلنے سے پہلے جڑ سے اکھاڑنا ہوگا ورنہ لڑکیوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی اور ان کے والدین پر عرصۂ حیات تنگ ہونے لگے گا۔

جمود اور آسائش [illegible] اور تن آسانی نے خانہ نشینی کو فروغ دیا ہے۔ وہ لوگ جو [illegible] میں دنیا پھیل گئے تھے، دنیا پر چھا گئے تھے اب گھر چھوڑتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ لہٰذا ترقی سے جس کے لیے نقل و حرکت ضروری ہے محروم رہتے ہیں۔

تعلیم نسواں کی اہمیت ہم نے دیر سے تسلیم کی جس کا اثر آئندہ نسلوں کی تعلیم پر پڑ رہا ہے۔ جب لڑکیوں میں تعلیم پھیلی تو ایک اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ تعلیم یافتہ لڑکیوں کو حسبِ صلاحیت برسرِ روزگار رہنے میں مشکل ہو گئے۔ ملک کے بٹوارہ کے بعد جب بہت سے لڑکے تلاشِ معاش میں پاکستان چلے گئے اس مسئلہ نے اور شدت اختیار کر لی۔ نہ معلوم کتنے مسلم گھرانوں میں لڑکیاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان تھک کوشش کر کے روزگار کی راہیں لڑکیوں پر کھولی جائیں۔

تہذیب اور شائستگی مسلمانوں ساتھ منسوب کی جاتی ہے لیکن جب یہ حدود سے بڑھ جاتی ہے تو بناوٹ اور تصنع بن جاتی ہے۔ کبھی ظاہرداری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ کبھی مبالغہ اور غلو کی، کبھی کھوکھلی لفاظی کی۔ ان سب سے گریز اولیٰ۔

مسلمان اسراف پر ناز کرتے ہیں۔ فضول خرچی کو شاہ خرچی اور فراخ دلی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس آیت کریمہ کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ۔ (فضول خرچ ——— شیاطین کے بھائی ہیں) اس اسراف کی بدولت لاکھوں گھر تباہ ہو گئے۔ اقتصادی بنیادیں کھوکھلی ہو گئیں۔ ہمارے یہاں دور اندیشی اور منصوبہ بندی جو فی زمانہ افراد کے لیے اتنی ہی ضروری ہے، جتنی اقوام کے لیے بخل اور ناقناعتی اور ضعفِ ایمان پر محمول کی جاتی ہیں۔

ہم لوگ زبان کے زخم خوردہ ہیں ایک پہلو دراز نفسی اور زیادہ گوئی کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ زبان کا چٹخارہ گفتگو تک محدود نہیں رہتا۔ لذتِ کام و دہن اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے اور لذتِ کام و دہن کا چسکا صحت۔ جسمانی اور ذہنی صحت کے زیاں کے علاوہ وقت کی تضییع کا ذمہ دار بھی ہے۔

اوسط مسلمان گھرانے میں عورتوں کا سارا وقت کھانے پکانے میں صرف ہوتا ہے۔ ان کا سابقہ چکی اور دست پنے، چولہے اور توے دھوئیں اور انگاروں سے رہتا ہے۔ لذیذ مُرغّن مسالہ دار کھانے عورتوں کے اوقات کو تلخ اور مردوں کے اذہان کو کند کرتے ہیں۔ اس حد تک کہ مسلسل دماغی ریاضت اور یکسوئی سے ہم بیشتر دامن بچاتے ہیں۔ ریاضی ہمیں اسی لیے آج تک راس نہ آئی۔ سائنس کے مضامین کو ہم ہفت خواں سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری غذا ہے جو ہمیں سہل پسندی اور آرام طلبی کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمارے طالب علم اکثر وہ مضامین لیتے ہیں جن میں متواتر اور باقاعدہ محنت کی ضرورت نہ پڑے۔ امتحان کے قریب نصاب کی ورق گردانی کی اور اگلی جماعت میں دھکیل دیے گئے۔ کاش ہمیں احساس ہو کہ وقت اور صحت کام و دہن کی لذت سے زیادہ اہم ہیں اور مہارت اور کامیابی کے لیے لگاتار اور ان تھک محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ دور سخت اور جانفشان مقابلہ کا دور ہے جو لوگ محنت سے جی چرائیں گے وہ صفحۂ ہستی سے مٹا دیے جائیں گے۔ یہ دور دماغ کی بالادستی کا دور ہے اگر دماغ پر ہم نے زنگ لگنے دیا یا اسے دھوئیں اور کہرے میں گھر جانے دیا یا اسے طویل وقفوں میں جست کے ساتھ کام کرنے کا عادی بنا دیا تو ہمارا انجام پستی میں بالاتمام ہو جائے گا اور ذلت کی راہ سے ہم فنا کے راستے پر پہونچ جائیں گے۔ جسم اور دماغ کے باہمی ربط کو نظر انداز کر کے کوئی پنپ نہیں سکتا۔ دماغ کو پس پشت ڈال کر کوئی جماعت جانبر نہیں ہو سکتی۔ ہمیں زندگی کے ہر شعبہ میں تکلف اور تصنع سے دامن بچانا ہے خصوصاً غذا میں۔ سادہ اور

صحت مند غذا مہیا ہو جائے تو ہمارا "دلدر" دور ہو جائے۔ بہت سی بیماریوں جن میں ہم سر فہرست ہیں، وجود ہی سے مٹ جائیں۔ غذا میں سادگی کے ساتھ توازن کا اہتمام بھی کرنا پڑے گا۔ ذائقہ پرستی مگر اعتدال کے ساتھ۔ غذا ہمیں چٹورے پن سے بچائے۔

من حیث القوم ہم جسمانی ورزش سے بھی جی چراتے ہیں۔ "نماز نیند سے بہتر ہے" کی صدا ہمارے کان تک پہونچتی اور پہونچ بھی جائے تو دوسرے کان سے نکل جاتی ہے۔ کسی بستی میں جاکر دیکھیے ان لوگوں میں جو علی الصباح چہل قدمی کے لیے نکلتے ہیں، مسلمان ڈھونڈے نہ ملیں گے۔

کس قدر تم پہ گراں صبح کی بیداری ہے

اور ان لوگوں میں جو روز سویرے غسل کرتے ہیں ہمارا گزر نہ ہوگا۔ زندگی کی دوڑ میں ہم روز پیچھے رہتے ہیں۔ ہمارے دن کا آغاز دیر سے ہوتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ طہارت کی لطافت تک ہم پہونچ جاتے ہیں لیکن بنیادی صفائی اور حفظانِ صحت سے ہم غفلت برتتے ہیں۔ خواہ اس کا تعلق جسم سے خواہ گھر سے۔ ہمارے ساتھ کاہلی کے علاوہ گندگی منسوب کی جانے لگی ہے اور یہ الزام کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔

جذبات کے ہاتھ میں عنان دے دینے سے ہمیں بہت نقصان پہونچے ہیں۔ ہمیں بھٹکانا اور اکسانا اور بھڑکانا بہت آسان ہو گیا ہے۔ ہم کوئی منصوبہ نہیں بنا سکتے اور اگر بنا بھی لیا تو اس پر عمل نہیں کر سکتے۔ کیوں جذبات ہمارا اوڑھنا بچھونا ب، وہی نشیب و فراز بھی سکتی ہے۔ جذبات کو ثبات کب ہے۔ ندی کی طرح چڑھتے ہیں اور اسی طرح اتر جاتے ہیں۔ وہ غور و فکر کا موقع کہاں دیتے ہیں۔ جذباتیت سے ہمیں اپنا ناتا توڑنا پڑے گا۔

مذہب کا نفوذ و اثر جتنا مسلمانوں میں ہے، کسی اور قوم میں نہیں۔ لیکن محرومی نے ہمارا یہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ ہم نے عبادات کو ظواہر تک محدود کر دیا ہے۔ آیات تو فر فر پڑھنے لگے دل تک آنچ بھی نہ پہونچی، دل کو آہٹ بھی نہ ملی۔ جو لوگ ٹکریں مار لیتے ہیں انھیں سجدہ اور عبادت کی قدر و قیمت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ وہ سجدہ جس کے لیے اقبال نے کہا ہے

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

حضورِ قلب بڑی بات ہے۔ کاش ہم نماز حضورِ ذہن کے ساتھ پڑھنے لگیں تو ہمارے اخلاق و اطوار خود بخود سنور جائیں۔ نماز میں جو کچھ ہم پڑھتے ہیں اس کا مفہوم ذہن نشین ہونا چاہیے ذہن تک بات پہونچنے دیجیے تان بالآخر دل پہ ٹوٹے گی۔ فی الحال ہم نہ عبادات کا حق ادا کر رہے ہیں نہ عباد کا۔ خلقِ خدا کی خدمت اور معاملات میں راست روی کو ہم نے ثانوی حیثیت دے رکھی ہے۔

خلقِ خدا کی خدمت کا جہاں تک تعلق ہے یہ روایت ہماری متروک ہو چکی ہے۔ بہت کم تنظیمیں ہمارے یہاں ایسی ہیں اور بہت کم افراد۔ جو سماج کی خدمت کے لیے میدان میں آئے ہیں۔ سوشل ورکر نام کی کوئی چیز ہمارے یہاں نہیں ہے۔ کیوں کہ معاشرہ کی خدمت اور اصلاح کے جذبے نے ہمارے دامنِ دل کو چھوا تک نہیں۔ یہ کام سخت ہے۔ نفس کشی، جانفشانی، پامردی اور استقامت کا طالب ہے اور ہم صرف وقفوں کے ساتھ چونکتے ہیں۔ ہمارا مزاج "صحافی" وضع کا بن گیا ہے۔ یعنی شہرت اور سنسنی والا مزاج۔ ملک کی اکثریت سے اپنا موازنہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں سنجیدگی، خاموشی اور محنت سے خلق کی خدمت کرنے والوں کا ہجوم ہے، ہمارے یہاں وہ معدوم ہیں۔ محنت اور خدمت کے بجائے یہاں سیاست کا چٹخارہ لگا ہوا ہے۔ جھوٹی اور

زاں سیاست جو تبادلۂ [illegible] سے آگے نہیں بڑھ تی جو اربابِ اقتدار کے [illegible] پر گزرتی ہے۔ ہماری قیادت [illegible] نہیں کہ وہ [illegible] اپنے آپ کو بازار میں لیے پھرتی ہے۔ نس کاسد کی جو قیمت لگ جائے غنیمت ہے۔ ہمارے ئی رہنما اربابِ اقتدار کا طواف کرتے رہتے ہیں، اور ان کی نگاہ و لطف کا انتظار۔ ملک گیر تو در کنار اب صوبہ ی سطح کی رہبری بھی ہمیں میسر نہیں۔ مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں اور کلیہ کو بنانے میں ان سے مدد ملتی ہے۔ بہر حال بحیثیت مجموعی ہماری رہنمائی حاضر باشوں اور خوشہ چینوں اور ہنگامہ پروروں کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں احساس نہیں کہ کسی ملت یا جماعت کی تعمیر اور ترقی سیاست سے نہیں ہوتی، تعلیم، تربیت اور محنت سے ہوتی ہے طاقت امداد باہمی سے آتی ہے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نے صلۂ رحمی کو بے دردی کے ساتھ ترک کر دیا ہے۔ تعلیم اور تربیت کے سلسلہ میں اپنے عزیزوں کی مدد کرنا ہمیں گراں گزرتا ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ مقابلہ کیجیے تو مسلمانوں کی یہ خامی اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ اُن کے یہاں مشترک خاندان کا تصور ابھی تک باہمی امداد اور مناسب پرداخت کا ضامن ہے۔ ہمارے یہاں سب کچھ انانیت کی طغیانی اور نفسی نفسی کے سیلاب میں بہہ گیا۔ ہمارے یہاں جو افراد ترقی کرتے ہیں اُن سے نہ رہبری ملتی ہے نہ مدد۔

ایک اختلاف نے ملت کو دو نیم کر دیا ہے۔ ہم لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ طبقہ جس نے دینی تعلیم پائی ہے، دوسرا وہ گروہ جس نے عام تعلیم انگریزی اسکولوں میں پائی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک وسیع کھائی ہے۔ گویا دونوں الگ الگ دنیاؤں میں رہتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہیں۔ اس کھائی کو پاٹنا ہوگا۔ یہ کام بہت دشوار اور [illegible] ہے ایسا نہ ہوا تو ملت کا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔ دینی تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اور ان طلبہ کو جو عام اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں جزوقتی طور پر دین کی تعلیم دینا ہوگی۔ یہ نہ ہوا تو ایک دنیا کا نہ رہے گا اور دوسرا دین کا۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں اُن برائیوں، کمزوریوں اور بیماریوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہندوستانی مسلمانوں خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے زوال اور پستی کے لیے ذمہ دار ہیں۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین شرح و بسط کے ساتھ ان کمزوریوں اور دوسری برائیوں کا ذکر کریں گے۔ اور ان کو دور کرنے کی عملی تجاویز سامنے رکھیں گے حالات اور ان سے زیادہ ہماری بے حسی میں "تہذیب الاخلاق" در اور ڈال سکے گا یا نہیں، کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس رسالہ کا اجرا اور احیا اُسی امید کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ ہم ان سب حضرات سے اپیل کرتے ہیں، بلا لحاظ مذہب و ملت جنہوں نے مسلمانوں کے مسائل پر غور کیا ہے، جو ان کے اخلاص سے فکرمند ہیں کہ اصلاح کی اس مہم میں ہمارا ہاتھ بٹائیں، ہمارا حوصلہ بڑھائیں۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا تجربہ اور وسائل کے تحت ہم اس رسالہ کی وضع میں ترمیم اور اس کی افادیت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ ممکن ہے کہ آگے چل کر ایک سے زیادہ زبانوں میں شائع کیا جائے۔ بہرکیف "تہذیب الاخلاق" کا مستقبل اور منفعت قارئین کرام کے تعاون اور مدد پر منحصر ہوگی۔

دعا فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان مقاصد میں کامیاب کرے اور یہ رسالہ اصلاح اور ترقی کی ایک بڑی اور ملک گیر مہم کا ترجمان بن جائے۔

آمین۔

آپ کے اور

تہذیب الاخلاق کے بارے میں

آپ کے سامنے رسالہ تہذیب الاخلاق ہے۔ یہ رسالہ نہ ادبی ہے نہ سیاسی نہ فلمی۔ اس میں آپ کو کوئی چٹ پٹی بات نہ ملے گی۔ لیکن یہ رسالہ آپ کو سوچنے کے لیے کچھ مواد فراہم کرے گا آپ کو اپنے حال اور مستقبل کی طرف متوجہ کرے گا۔ یہ پرچہ خدمت کیلئے نکالا گیا ہے۔ اس زمانہ سے اور اس دور کے مطالبات سے آگاہ کرنے کے لیے نکالا جارہا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس رسالہ کو پڑھنے کے لیے کچھ وقت نکالیے اور اس کو خریدنے کے لیے کچھ خرچ بھی کیجیے۔

سو سال پہلے ایک آہنی ارادہ کے آدمی نے ہم آپ سب کو جگایا تھا۔ اس کا نام سید احمد تھا۔ یہی سبب تھا کہ ہمارے سماج میں بہت سے اچھے آدمی پیدا ہوئے اور ہم نے ملک میں کچھ ترقی کی۔ لیکن وہ ایک غیر ملکی قوم کی حکومت کا زمانہ تھا۔ اب ہمارا ملک آزاد ہے آج ہمیں کتنی ہی دشواریاں اپنی ترقی کی راہ میں کیوں نہ نظر آئیں پھر بھی آزاد ہندوستان میں ترقی کے راستے سب ہی کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ البتہ ہم کسی وابستہ پر بلا کوشش نہ چل سکیں گے۔ تہذیب الاخلاق کا یہ کام ہوگا کہ آپ کو ترقی کی راہوں پر چلنے کے لیے تیار کرے۔ ہمیں تنہا نہیں چلنا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت سے فرقے ہیں ان کو ساتھ لے کر چلنا ہے۔ سب کو مل مل کر چلنا ہے اور اپنی ملت کو ان کے ساتھ مل کر آگے بڑھانا ہے۔ ہمارا کام دل کو جوڑنا ہے توڑنا نہیں اور اس دیس میں پیار و محبت کی جو فضا مہاتما گاندھی پیدا کرنا چاہتے تھے وہ پیدا کرنا ہے اور دوسروں کا اس کام میں ہاتھ بٹانا ہے۔

اس پرچہ کا سالانہ چندہ صرف پندرہ روپیہ ہے۔ یہ چھوٹی سی رقم منی آرڈر کے ذریعہ ہمیں بھیجیے۔ اگر آپ کاروبار کرتے ہوں تو ہمیں اشتہار دیجیے۔ بس اسی کی آمدنی سے ہم رسالہ کے اخراجات پورے کریں گے اور اپنی ملت، اور اپنے ملک کی تعلیم اور تہذیب کی خدمت کریں گے جس راہ پر ہم چلنا چاہتے ہیں اس کی وضاحت اس آہنی ارادے کے شخص سید احمد نے کی ہے۔ اس کے الفاظ جو اس نے اپنے قلم سے لکھے اس پرچہ کے صفحہ اول پر تحریر ہیں۔ اس کو ملاحظہ فرمائیے بس وہی ہمارا نشان راہ ہے اور ہم سب کو منزل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس شمارہ کے اداریہ میں اس منزل کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ان ہی مسائل پر اس پرچے میں مضامین شائع ہوں گے اور آپ کو قدم بڑھانے کی طرف دعوت دیں گے آپ سے ہماری یہ بھی درخواست ہے کہ آپ ہمارے ساتھ قلمی تعاون کریں۔

جن مسائل کا اداریہ میں ذکر ہے ان پر مضامین لکھیں، ان پر اپنے تاثرات تحریر فرمائیں۔ تعلیم کی ترقی، اخلاقی اور تہذیبی ترقی پر مضامین لکھیں لیکن مضمون مختصر ہو۔ بس دو تین فل اسکیپ صفحات کا ہو اور صاف اور کھلا کھلا لکھا ہو تاکہ کتابت میں دشواری نہ ہو اور اغلاط کا احتمال نہ رہے۔

مدیر مسئول

نقی امینی
شعبۂ دینیات

اسلام میں قوت وطاقت کی اہمیت

مسلم معاشرہ میں مذہب کے غلط تصور سے یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ چند مذہبی مراسم و اعمال کی پابندی سے وہ سب کچھ مل جائے گا جس کو دنیا والے انتھک جدوجہد اور محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح معجزات وکرامات سے یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جس طرح مادی سبب کے بغیر ان کا ظہور ہوگیا، اسی طرح مادی ترقی کے بغیر قومی ترقی اور سربلندی حاصل ہوجائے گی۔ بلاشبہ آگ کی خاصیت جلانا ہے جو شخص اس میں ہاتھ ڈالے گا وہ جل جائے گا۔ اگر ابراہیم علیہ السلام کے حق میں آگ گلزار بن گئی تو یہ معجزہ ہے جس کا مطلب ہے کہ لوگ اس سے عاجز ہیں اور عام قانون سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، جب کہ دنیا کا نظام عام قانون کے تحت چلتا ہے نہ کہ اس کے تحت کہ جس کے کرنے سے لوگ عاجز ہیں۔

انبیاء علیہم السلام دنیا کا نظام چلانے کے لیے عام قانون ہی کی طرف دعوت دیتے رہے اور مختلف قوموں کے احوال و واقعات اور ترقی تنزلی کا ذکر کرکے اس کا ثبوت پیش کرتے رہے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس کا واضح ثبوت ہے کہ دنیا کا نظام چلانے کے لیے آپ نے کبھی معجزات کا سہارا لیا اور نہ زندگی کی جدوجہد کو کسی ایک گوشہ میں محدود رکھ کر اسی کو ترقی کا مدار قرار دیا۔ بلکہ آپ نے اخلاق وکردار کی درستگی کی طرف دعوت کے ساتھ قوت وطاقت حاصل کرنے کی طرف خصوصی توجہ دلائی۔ چنانچہ اسی لیے آپ نے ہر مفید علم حاصل کرنے کے لیے دور دراز سفر کرنے کی تاکید فرمائی اور اس راہ میں کسی قسم کا تعصب گوارہ نہ کیا۔ آپ نے فرمایا۔

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّيْنِ، علم حاصل کرو اگرچہ چین میں ملے[1]

بات صرف علم پر نہیں ختم ہوتی بلکہ ہر دور کے لحاظ سے قوت وطاقت کے لیے علم کا جو معیار ہے، اس کے مطابق علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ مثلاً یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے کہ جس میں ترقی اور سربلندی کے لیے جدوجہد اور قوت وطاقت کا پیمانہ موجودہ معیار کے مطابق ہے۔

قرآن حکیم میں لفظ قوت اور اَلْحَدِیْدُ (لوہا) کا جس انداز سے تذکرہ ہے اس سے یہ اشارہ بھی ہوتا ہے کہ قوت وطاقت کے سامان اور ترقی اور سربلندی کی صلاحیتوں میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے گا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے جدید ترین اور اہم ترین قوت وطاقت کے آلات استعمال فرمائے وہ یہ تھے۔

دَبَّابَہ :

یہ خاص قسم کی گاڑی تھی جو تیر سے حفاظت کے لیے موٹا چمڑہ منڈھ کر بنائی جاتی اور قلعہ شکنی کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔

ضبور:

لکڑی پر کھال منڈھ کر چھتری کی طرح بنائی جاتی جس

[1] مشکوٰۃ، کتاب العلم

کے ذریعہ بیٹھ کے تیر سے حفاظت ہوتی تھی۔

منجنیق:

یہ جنگی ہتھیار تھا جس کے ذریعہ وزنی پتھر دشمنوں کی طرف برسائے جاتے تھے۔

حسک:

یہ ایک خار دار گھاس (گوکھرو) کی شکل کا تھا جس کو قلعہ اور لشکر کے چاروں طرف بکھیر کر راستہ مخدوش کیا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو برآمد کر کے غزوۂ طائف میں استعمال فرمایا۔ بلکہ منجنیق سب سے پہلے خود آپ نے چلائی اور حسک آپ نے بکھیری۔

ابن ہشام کا بیان ہے کہ

جس شخص پر میں اعتماد کرتا ہوں اس نے یہ مجھ سے بیان کیا کہ اسلام میں سب سے پہلے طائف والوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منجنیق چلائی۔[1]

علامہ مقریزیؒ کہتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے قلعہ پر منجنیق نصب کی"[2]

دوسری جگہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلعہ کے گرد حسک بکھیری[3]

جس منجنیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استعمال کیا تھا، اس کے بارے میں مختلف قول ہیں بعض کے نزدیک وہ باہر سے منگایا گیا تھا اور بعض کے نزدیک حضرت سلمان فارسی نے اس کو بنایا تھا[4]

طائف فتح ہونے کے بعد ۹ھ میں عروہ بن مسعود ثقفی اور غیلان بن سلمہ ثقفی نے اسلام قبول کیا اور جرش جا کر مذکورہ ایجادات میں مہارت حاصل کی[5]

"جرش" دمشق کے مضافات میں ایک شہر تھا جو اس وقت کی دوسری بڑی طاقت روم کے قبضہ میں تھا۔ اس میں ہتھیاروں کا بڑا کارخانہ تھا۔ شرحبیل بن حسنہ نے حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت میں اس کو فتح کیا تھا[6]۔ جرش فتح ہونے کے بعد ہتھیار سازی کا کارخانہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا تو انھوں نے اس کو اور زیادہ ترقی دی۔

یہ چند مثالیں بطور نمونہ اس بات کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جد و جہد اور قوت و طاقت کا جو "پیمانہ" تھا، اس کو آپ نے ملحوظ رکھا تھا، اسی طرح ہر دور کا جو "پیمانہ" ہو اس کو ملحوظ رکھے بغیر کوئی قوم ترقی و سربلندی نہیں حاصل کر سکتی ہے۔

---

۱ ابن ہشام السیرۃ النبویۃ ذکر غزوہ طائف

۲ تقی الدین احمد بن علی مقریزی امتاع الاسماع حصن الطائف

۳ ایضاً ص ۴۱۸

۴ ایضاً

۵ الروض الانف فصل ذکر اہل الانف

۶ امتاع الاسماع حاشیہ ص ۳۶۶

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

ششماہی =/۸

سالانہ =/۱۵

بیرونِ ہند سے

قیمت فی پرچہ ۱ ڈالر ششماہی ۱۲ ڈالر

سالانہ ۲۰ ڈالر

اولاد احسن صدیقی

آہ نواب چھتاری مرحوم

سعید الملک، نواب، ڈاکٹر، سر، حافظ، محمد احمد سعید خاں صاحب چھتاری کے انتقال سے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا۔

وہ ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے جس سال ایک معزز ہندوستانی جواہر لال نہرو نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ دونوں نے کامیابی الگ الگ میدان میں حاصل کی اور ملک پر مختلف اثرات چھوڑے۔

نواب صاحب کی پیدائش ایک خوش حال اور مذہبی اثرات سے معمور خاندان میں ہوئی۔ ان کے دادا حضرت شیخ امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے۔ ان کے دادا کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔ نواب صاحب کی پرورش ایک گہرے مذہبی ماحول میں ہوئی جس میں خدا ترسی، غربا اور فقرا سے سلوک اور ان کی امداد انھیں ورثہ میں ملی۔ انھوں نے ۹ برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ اردو، فارسی اور کسی حد تک عربی کی تعلیم کے بعد پندرہ سال کی عمر میں علی گڑھ کالجیٹ اسکول میں داخلہ لیا۔ ان کے اساتذہ میں میر ولایت حسین صاحب اور اسکول کے ساتھیوں میں سید راس مسعود، سر سکندر حیات خاں اور خواجہ ناظم الدین قابل ذکر ہیں۔ راس مسعود ملک کے نامور ماہر تعلیم مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور بھوپال میں وزیر تعلیم ہوئے اور سکندر حیات خاں اور خواجہ ناظم الدین ملک کے دو مشہور صوبوں یعنی پنجاب اور بنگال کے وزیر اعظم ہوئے۔

پبلک زندگی کا آغاز نواب صاحب نے ۱۹۱۱ء میں آنریری مجسٹریٹ سے کیا۔ جب پہلی جنگ عظیم کے بعد مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ہند کے تحت صوبوں اور مرکز میں نئی کونسلوں کی تشکیل ہوئی۔ تو نواب صاحب یو پی کی کاونسل میں ممبر منتخب ہوئے۔ چند سال بعد صوبہ میں پہلے وزیر صنعت اور زراعت اور پھر وزیر داخلہ مقرر کیے گئے۔ بعد میں نو ماہ کے لیے یو۔ پی کے گورنر بنائے گئے۔ گورنری کے حکومت ہند کے عارضی ممبر اور آخر میں حیدر آباد کے وزیر اعظم منتخب کیے گیے۔ علی گڑھ کا ٹرسٹی، پھر یونیورسٹی کے پرو چانسلر اور چانسلر کے عہدوں پر فائز ہوئے

نواب صاحب انیسویں صدی کو بیسویں سے ملانے والی ایک کڑی تھے۔ جس ماحول میں ان کی پرورش ہوئی تھی وہ سر تا سر مذہبی اور قدیمانہ تھا۔ اپنی کوششوں سے انھوں نے انگریزی حکومت میں اپنی جگہ بنائی اور اقتدار حاصل کیا۔ ملک کے مختلف النوع اکابرین کی صحبت میں وہ نئے رجحانات سے آشنا ہوئے اور انتظامی صلاحیت پیدا کی ملک کے رئیسوں میں وہ ان خال خال اشخاص میں سے تھے جنکی ریاست مقروض نہیں تھی۔ ان کا اصول تھا "جب تک مالگذاری ادا نہ ہو آمدنی میں سے کچھ صرف نہ کیا جائے" ان کا طرز عمل بھی مرنجان مرنج اور بُردبارانہ تھا "مجھے اس کی ہمیشہ خواہش رہتی تھی کہ جہاں تک ہو سکے جھگڑے سے بچا جائے۔ میرا خیال تھا کہ بات ٹھیک ہے تو دوسروں کی سمجھ میں آ کر رہے گی۔ جھگڑے اور اوقات تلخ کرنے سے کیا حاصل۔ رواداری صلح پسندی، درمیانہ روی، نرمی اس تہذیب کا ورثہ تھیں جو جاگیرداری دور کا عطیہ کہلائی جا سکتی ہیں۔ اس میں اخلاق کا اعلیٰ معیار، شخصی زندگی کا ستھراپن، تعلقات کو آخر وقت تک برقرار رکھنے کی کوشش فرقہ اور مسلک کے اختلاف کے باوجود فریق کا احترام، اہم ترین قدریں تصور کی جاتی تھیں۔ نواب صاحب ان کے حامل اور حاصل دونوں تھے آج کے صنعتی دور میں جب معیشت کی ترقی اور تنوع سے زندگی کے سارے شعبے متاثر ہو رہے ہیں۔ اقدار میں فرق آ گیا ہے۔ آج کا ذہن نئے سائنسی کرشمات کے تحت نئی اقدار کو اپنانے کے لیے نئے سانچے ڈھال رہا ہے۔

ذرالحسن
شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی منزل بہ منزل

اٹھارہ سو ستاون کی ناکام بغاوت کے بعد جب ہندوستانی
انوں پر مصیبتوں کی گھٹائیں چھائیں ، جب وہ بدیسی حکمرانوں کے انتقام
نشانہ بنے ، جب انھیں سرکاری ملازمتوں اور ان کے اپنے مال و جائیداد
محروم کر دیا گیا اور جو ملک ان کے زیر نگیں تھا جب وہ اس میں
یار و مددگار رہ گئے تو ایک مرد بزرگ نے ان کے درد کا درماں
کیا ۔ اس کی دور بیں نگاہوں نے دیکھ لیا کہ وہ اپنا کھویا ہوا
اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب وہ جدید تعلیم سے پوری
ع بہرہ یاب ہو جائیں ۔ یہ بزرگ تھے سر سید احمد خاں ۔

سر سید نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک ساتھ دو منصوبے
تیار کیے ۔ ان میں سے پہلا یہ تھا کہ ملک میں مسلمانوں کی ابتدائی
اور ثانوی تعلیم کے لیے اسکول قائم ہوں اور دوسرا یہ کہ اعلیٰ تعلیم
کے لیے ایک مرکزی تعلیمی ادارہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونے پر
قائم ہو سر سید صرف خواب دیکھنے والے انسان نہ تھے ۔ وہ جد و جہد
سے خوابوں کو حقیقت میں بدل دینے کی زبردست صلاحیت رکھتے
تھے انھوں نے پہلے کام کے لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد
ڈالی اور ۱۸۷۵ء میں دوسرے کام کا آغاز علی گڑھ میں ایک

بقیہ مضمون "آہ نواب چھتاری مرحوم"

ں یہ اقدار ایک ایسے زمانہ کی یاد دلاتی ہے جسے ہم نے
خ کی کتابوں میں پڑھا تھا ۔ آج کا دور تبدیلیوں کا دور ہے
میں بقول اقبال " ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں "

نواب صاحب کی سیاست اعلیٰ طبقہ کے زمینداروں اور
قہ داروں کی سیاست تھی ۔ مگر نواب صاحب اپنی رعایا نیز اپنے
شت کاروں کے ساتھ انصاف پسندانہ رویہ اپنانے پر زور دیتے
۔ زمینداروں میں بالعموم اور تعلقہ داروں میں بالخصوص
زوری ہے کہ وہ زمانہ کی نبض پہچاننے سے گریز کرتے ہیں اور
کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ کس قدر حصہ اپنے حقوق کا قربان کر دیا
ے اور کیا بچا لیا جائے یہی وجہ ہے کہ حالات بدل جانے پر بھی
صاحب مرحوم کی شہرت اور مقبولیت میں کوئی فرق نہیں پڑا ۔

نواب صاحب کے تعلقات ملک کے اکابرین سے بڑے خوشگوار تھے
ت موتی لال نہرو ، سر تیج بہادر سپرو ، پنڈت گو بند بلبھ پنت ، پنڈت
ت نرائن ، چنتامنی ، کنور جگدیش پرشاد جو اس صوبہ کے

درخشاں ستارے تھے ۔ ظاہر ہے ایسے اصحاب سے تعلقات ان
کی وسیع القلبی اور رواداری پر دلالت کرتے ہیں ۔

مسلم یونیورسٹی سے ان کے تعلق کی مدت بیسویں صدی کی
اس وقت تک گذری مدت کے تقریباً برابر ہے ۔ یہ تعلق جو طالب علم
کی حیثیت سے شروع ہوا اور چانسلر کے عہدہ پر فائز ہونے پر ختم ہوا ۔
یونیورسٹی کی بھلائی اس کی اصلاح اور اس کی ترقی کے لیے استعمال ہوا ۔
آج یونیورسٹی برادری کے رکن ان کے اس حسن سلوک کو نہیں بھولیں گے
جب وہ اس کے اصرار پر کسی جلسہ کا افتتاح کرنے ، کسی کے گھر پر تقریب
یا دعوت میں شرکت کرنے کے لیے باوجود کبر سنی اور علالت کے تشریف
لے آتے تھے ان سے مشورہ اور مدد کا دروازہ ہر شخص کے لیے
کھلا تھا ۔ ان کی شخصیت میں ہماری قدیم تہذیب جلوہ گر تھی ؎

بہ آں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
سلام ما بہ رسانید ، ہر کجا ہستند

●●

چھوٹے سے مدرسے کے قیام سے کیا جو ۱۸۷۷ء میں ترقی کر کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بنا اور ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں نمودار ہوا۔

جب اس سرزمین پر ہمارا یہ پہلا مدرسہ قائم ہوا تو اس میں طلبہ کی تعداد صرف گیارہ تھی اور اس کا ماہانہ خرچ کل ۹۸۹/- روپے تھا۔ آج سب دشواریاں ہماری ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں تو ہم کہی چھوڑ بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ دشواریاں ہمیں ورثے میں ملی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرسید کا ایک درزہ ہم تک پہنچا ہے۔ ان کا مقابلہ کرنے اور انہیں زیر کرنے کا حوصلہ جب کالج کے لیے حکومت سے ۷۴ بیگھہ زمین بطور امداد دینے کی درخواست کی گئی تو پہلے تو اسے منظور اور پھر کچھ سوچ کے مسترد کر دیا گیا لیکن اس درس گاہ کے بانی کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں اور زمین حاصل ہو کے رہی جس اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھنے سے کلکٹر نے انکار کر دیا تھا اس کی بنیاد رکھنے کے لیے وائسرائے ہند لارڈ لٹن خود علی گڑھ آئے بعض انگریزوں نے اس ادارے کو ملیامیٹ کر دینا چاہا مگر وہ ناکام ہوئے اور یہ کارواں برابر آگے بڑھتا رہا اور وہ دن بھی آیا جب شیخ عبداللہ کی کوششوں سے یہاں لڑکیوں کے اسکول اور پھر کالج کی بنیاد پڑی۔ اساتذہ کی تربیت کا ادارہ انجینئرنگ کالج اور میڈیکل کالج قائم ہوا۔ جو ادارہ محض ایک اسکول تھا آج ایک یونیورسٹی ہے جس میں حسب ذیل تعلیمی شعبے اور طلباء کے قیام کے لیے ہوسٹل اور ہال ہیں۔

میڈیکل کالج

انجینئرنگ کالج

پالی ٹیکنیک

فیکلٹی آف سائنس

فزکس۔ کیمسٹری۔ باٹنی۔ زوالوجی۔ جیالوجی۔ ریاضی

جغرافیہ۔

فیکلٹی آف سوشل سائنس

تاریخ۔ معاشیات۔ سماجیات۔ سیاسیات۔ نفسیات۔ تعلیمات۔ لائبریری سائنس

فیکلٹی آف آرٹس

اردو۔ فارسی۔ ہندی۔ انگریزی۔ عربی۔ فلاسفی۔

فیکلٹی آف کامرس

ڈپارٹمنٹ آف کامرس۔ ڈپارٹمنٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن

فیکلٹی آف لا   فیکلٹی آف تھیالوجی

نام ہال	تعداد طلبہ	نام ہال	تعداد طلبہ
آفتاب ہال	۸۹۱	ایس ایس ہال	۱۶۷۸
سلیمان ہال	۹۶۵	وی ایم ہال	۸۳۳
نیو ہال	۴۶۷	محمد حبیب ہال	۹۳۲
ہادی حسن ہال	۷۲۶	ایم ایم ہال	۱۳۹۹
راس مسعود ہال	۸۰۳	این آر ایس سی	۳۴۱۴
سروجنی نائیڈو ہال	۹۰۰	عبداللہ ہال	۱۷۰۲

۲۸ بیرونی ممالک کے ۵۱۳ طلبہ وطالبات

اوپر پیش کی گئی تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے اس عظیم ادارے کا سفر شروع کہاں سے ہوا تھا اور اب ہم کتنے آگے پہنچ چکے ہیں۔ لیکن یہ ہماری منزل نہیں صرف نشانِ راہ ہے۔ ابھی ہمیں دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے برابر پہنچنے کے لیے لمبی مسافت طے کرنی ہے اور ابھی بے شمار کام ہیں جو فوری توجہ چاہتے ہیں مثلاً طلبہ کی رہائش کا مسئلہ۔ طالب علموں کی تعداد بہت بڑھ چکی ہے اور ان کی رہائش کا کوئی معقول بندوبست نہیں۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کئی نئے ہالز کی تعمیر کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن اس کا فوری حل یہ تلاش کیا گیا ہے کہ بعض مضبوط عمارتوں پر بالائی منزل تعمیر کی جائے اور یہ کام بلا تاخیر شروع ہو گیا ہے

اگلے پانچ برسوں میں تین ہزار مزید طلبا کی رہایش کا بندوبست کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ نے پانچ سو طلبا کی رہائش کے انتظام کے لیے ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے کی امداد کا یقین دلایا ہے۔

پالی ٹکنیک میں مزید داخلے یہ سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے۔ اس وقت ملک میں اور دیگر ترقی پذیر ممالک میں انجینیروں کی ضرورت ہے کوشش کی جا رہی ہے کہ پالی ٹکنیک میں داخلے کے لیے جو تعداد مقرر ہے اسے یو جی سی کی منظوری لیکر دوگنا کر دیا جائے۔

پیٹرو کیمکلس انجینیرنگ کالج میں یو۔ اے۔ ای کے شیخ کی اعانت سے پیٹرو کیمکلس کا شعبہ قائم ہو چکا ہے۔

ٹیکنولوجیکل کمپلیکس اس کمپلیکس کے قیام کا مقصد یہ ہوگا کہ یونیورسٹی میں صنعت و حرفت کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست ہو سکے۔

ہوٹل مینجمنٹ ہوٹل مینجمنٹ کی تربیت کا ایک شعبہ قائم کرنے کی تجویز زیر غور ہے تاکہ ہمارے طلبہ کو ملازمتوں کیلیے اور زیادہ مواقع حاصل ہو سکیں۔

نرسنگ ٹریننگ نرسنگ ٹریننگ کا کورس شروع کرنے کی تجویز بھی عنقریب عملی جامہ پہننے والی ہے۔ اس سے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ میڈیکل کالج میں مریضوں کے بستروں کی تعداد میں اضافہ ہو جائے گا۔

فشری کورس امکان ہے کہ فشری کا ایک کورس بھی بہت جلد شروع کیا جا سکے گا۔

یہ ہماری امنگوں کا مختصر سا اشاریہ ہے۔ اگر خدائے ذوالجلال کی تائید اور اساتذہ طلبہ نیز ملک و قوم کا تعاون شریک حال ہے تو یہ اور دوسرے منصوبے جلد تکمیل کو پہنچیں گے۔ انشاء اللہ

مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں ۸۱-۱۹۸۰ء بڑے ہنگامے کے سال رہے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے وسط میں نئے وائس چانسلر سید حامد صاحب نے جو یونیورسٹی کے اولڈ بوائے بھی ہیں، وائس چانسلر کے عہدے کی ذمہ داری سنبھالی۔ یونیورسٹی اس دور میں اندرونی انتشار کا شکار تھی۔ مفاد پرست لوگوں کا درس گاہ میں دور دورا تھا۔ ان میں طلبا بھی تھے اساتذہ بھی اور غیر تدریسی ملازمین بھی۔ اس پورے گروہ نے نئے وائس چانسلر کی آمد پر اپنے مستقبل کے لیے خطرہ محسوس کیا اور کوشش شروع کر دی کہ نیا وائس چانسلر بد دل ہو کر مستعفی ہو جائے۔ چنانچہ منظم طور پر طلبا نے ہنگامہ شروع کر دیا پہلے کلاسوں کو جبراً بند کرایا گیا۔ پھر دفاتر کو۔ یونین کلب کو ہنگاموں کے لیے استعمال کرنا شروع کیا اور طلبا کو اس کے جلسوں میں شرکت کے لیے مجبور کیا پھر بھی بہت کم طلبا نے ان ہنگاموں میں حصہ لیا۔ چونکہ غیر ذمہ دار طلبا منظم تھے اور ان کو یونیورسٹی کے ملازمین کے ایک منظم حلقہ کی حمایت حاصل تھی۔ اس لیے پوری یونیورسٹی کی فضا مکدر ہو گئی۔ عام طلبا جو ہنگاموں سے بچنا چاہتے تھے وہ بے دست و پا اور غیر منظم ہونے کی بنا پر بے اثر رہے اور یونیورسٹی کے حالات معمول پر لانے کے لیے یونیورسٹی ۱۹۸۱ء میں دو بار بند کرنی پڑی۔
سب سے بڑا افسوسناک واقعہ ایک طالب علم آفتاب احمد کا پولس کی گولی سے ہلاک ہونے کا ہے جس کا یونیورسٹی کے ہر فرد کو افسوس ہے اور جس سے سید حامد جیسا ہمدرد وائس چانسلر بہت متاثر ہوا۔ تفصیلات افسوسناک ہیں۔ اس دور میں جس طرح وائس چانسلر کو ہدف ملامت بنایا گیا اور ان کی رہائش گاہ پر پتھر برسائے گئے وہ ایک مہذب معاشرے کے لیے انتہائی شرمناک ہے ایسے واقعات ایسی درس گاہ میں نہ تو ہونے چاہیئے تھے جو مسلمانوں کی بہبود اور اسلامی علوم کے فروغ کے لیے قائم کی گئی ہے اور جبکہ مسلمانوں کو ملک میں باعزت زندگی گذارنے کی غرض سے حصول علم کے لیے جد و جہد کی شدید ضرورت ہے۔
خدا کا شکر ہے کہ طلبا کے والدین نے، اکابر ملت نے، اولڈ بوائز نے اور حکومت ہند نے وائس چانسلر کے ہاتھ مضبوط کیے اور مفاد پرستوں کی حمایت سے اجتناب کیا۔ ان کے رویہ نے یونیورسٹی کو دوبارہ

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

مولانا حسرت موہانی مرحوم پر سیمینار

اردو کے مشہور شاعر اور جنگ آزادی کے مجاہد جناب حسرت موہانی پر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ۱، ۲ جنوری کو آل انڈیا سیمینار کا انعقاد کیا۔ سیمینار کی صدارت وائس چانسلر سید حامد نے کی۔

پروفیسر آل احمد سرور، ڈائرکٹر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا، حسرت موہانی پر سیمینار کا انعقاد ایک تعلیمی ذمہ داری ہی نہیں بلکہ ایک قومی اور سماجی فریضہ بھی ہے۔

وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا کہ یہ سیمینار حسرت موہانی جیسے بڑے شاعر پر ریسرچ کی نئی راہیں دکھائے گا جنھوں نے اپنی شاعری سے اردو شاعری کو ایک نیا مزاج بخشا تھا۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ ہمیں حسرت موہانی کی حیات سے سبق حاصل کرنا چاہیے جنھوں نے نہ صرف یہ کہ اردو شاعری میں ایک گرانقدر اضافہ کیا تھا بلکہ ملک کی آزادی کے لیے بے خوف و خطر جدوجہد بھی کی تھی۔

ملک کے طول و عرض سے آئے ہوئے بہت سے ادیب شا[عر] اور نقاد نے اس سیمینار میں حسرت موہانی کی زندگی اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے اپنے مقالات پڑھے جن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر کلیم الدین احمد، محترمہ قرۃ العین حیدر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس موقع پر مشہور شاعر علی سردار جعفری نے حسرت موہانی کی تصانیف اور تصاویر پر مشتمل ایک نمائش کا بھی افتتاح کیا

فرقہ وارانہ تصادم پر مجلس مذاکرہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قومی یک جہتی سمیتی کے زیر اہتما[م] "ہندوستان میں فرقہ وارانہ تصادم" کے موضوع پر ہم جنو[ری] کو سرسید ہاؤس میں ایک مجلس مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا جس [کا] افتتاح وائس چانسلر جناب سید حامد نے کیا۔ اس حیثیت میں تعلیمی ک[...]

بقیہ مضمون "مسلم یونیورسٹی منزل بہ منزل"

کھلنے میں مدد دی اور یونیورسٹی ماہ اگست میں دوبارہ کھل گئی۔ یونیورسٹی کھلی تو طلبا امتحانات کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ اب شب کو ۱۰ بجے تک یونیورسٹی کی لائبریری کھلتی ہے اور طلبہ مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں۔

یونیورسٹی میں اصلاحات کا سلسلہ جاری ہے وائس چانسلر پرو وائس چانسلر سب ہی یونیورسٹی کا معیار تعلیم بلند کرنے یونیورسٹی میں تعلیمی فضا پیدا کرنے اور تمام شعبوں اور دفاتر کی کارکردگی کی اصلاح میں مصروف ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے اسکول خاص طور پر اصلاح طلب ہیں ان کے نئے ہیڈ ماسٹر بڑی تلاش کے بعد ملے ہیں بس دعا کیجیے کہ اللہ اس درسگاہ کو انتشار پسندوں اور مفا[د] پرستوں سے بچائے اور یہ درسگاہ مسلم اور غیر مسلم طلبا کی ترقی کا ذریعہ ثابت ہو۔

(ق۔م)

کے چیرمین مسٹر حمید اللہ بیگ، روس میں ہندوستان کے سابق سفیر مسٹر آئی۔ کے۔ گجرال، مسز ج انٹرنیشنل کی مدیرہ مسز اوما واسیلو مسز طلعت پال ملک ممبر پارلیمنٹ، آرگنائزر کے ایڈیٹر ایم آر ملکانی اور مشہور صحافی مسٹر راجندر سرین کے علاوہ دوسرے حضرات نے بھی حصہ لیا۔

یونیورسٹی قومی یک جہتی کمیٹی کے صدر وائس چانسلر سید حامد اور کنوینر مسٹر خالد ہاشمی ہیں۔

اس موقع پر وائس چانسلر جناب سید حامد نے فرمایا کہ اہم موضوع ایک مستقل مذاکرہ کا تقاضہ کرتا ہے۔ اس دفعہ ہم نے باہر کے مہمانوں کو دعوت دی اور اب اس مجلس میں پاس ہونے والی تجاویز کی روشنی میں اگلا اجلاس ہم اپنے طلبا کا کریں گے۔ تاکہ وہ جو اس ملک کا اصل مستقبل ہیں اس مسئلہ میں کوئی واضح راہ اپنا سکیں۔

آخر میں کمیٹی کے وائس چیرمین پروفیسر خواجہ شمیم احمد نے شرکاء وحاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

یادگار مشاعرہ

یونیورسٹی لٹریری کلب کے زیر اہتمام ۲۱ جنوری ۱۹۸۲ء کو شام ۶ بجے کینیڈی ہال میں ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔

اس مشاعرہ میں پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ مصور خطاط اور شاعر جناب صادقین نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ مشاعرہ میں ڈاکٹر شہریار، جناب اختر حسین، جناب مغنی تبسم، جناب افتخار امام صدیقی کے علاوہ مقامی شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

ویمنز کالج کی پلے ٹینیم جوبلی

ویمنز کالج علی گڑھ مورخہ ۲۳ جنوری کو محترمہ شہناز ہاشمی صاحبہ استاد انگریزی کنوینر ویمنز کالج پلے ٹینم جوبلی سے تقریبات جوبلی کے سلسلہ میں حسب ذیل معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ویمنز کالج کی طالبات اور اساتذہ نے کالج کی پلے ٹینم جوبلی منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جوبلی تقریبات کا آغاز کالج میں ۲۰ فروری ۸۲ء سے ہو رہا ہے۔ اسی دن بانی کالج ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ (پاپا میاں) اور بیگم عبداللہ (اعلیٰ بی) پر یادگاری جلسہ ہوگا۔ جلسہ میں محترمہ عصمت چغتائی مہمان خصوصی ہوں گی اور محترم سید حامد مقرر خصوصی

اس کے علاوہ اولڈ گرلز ایسوسی ایشن، گرلز ہائی اسکول، عبداللہ نرسری اسکول، کالج کی طالبات کی یونین مختلف انجمنوں، موسیقی کلب اسپورٹس کے ذریعہ جوبلی میں مختلف تعلیمی، سماجی اور ثقافتی پروگرام پیش کیے جائیں گے۔ خواتین ادیبوں اور ماہرین تعلیم کی ایک کانفرنس بھی ہوگی۔

جوبلی تقریبات کا یہ سلسلہ مارچ کے پہلے ہفتہ تک جاری رہے گا۔

جوبلی کے سلسلہ میں محترمہ شہناز ہاشمی سے خط وکتابت کیجیے۔

جملہ خط وکتابت و ترسیل زر مندرجہ ذیل پتہ پر کریں

قاضی معز الدین احمد
صفدر منزل۔ تار بنگلہ
اے۔ ایم۔ یو علی گڑھ۔ یو۔ پی

مضامین مختصر، صاف اور رسالے کے مقاصد کے مطابق ہوں۔

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی
(نگراں ٹرسٹی ندائے ملت)

ادارہ تاریخ سے نہیں تحریک سے چلتا ہے

مسلم یونیورسٹی کی موجودہ شکل و صورت سے کسی شخص کو یہ خیال یا مغالطہ ہو سکتا ہے کہ یہ سر سیدؒ کی عین خواہش کے مطابق ہے اور اس سے سر سیدؒ کے مشن کی تکمیل ہوتی ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب "اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش" میں سر سید کی تعلیمی تحریک اور ان کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے جہاں اس کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے، وہیں ان کی خدمات کا بھی اعتراف کیا ہے۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سر سید احمد خاں ایسی طاقتور شخصیت کے مالک تھے جس سے زیادہ طاقتور شخصیت اس دور کے قائدین میں کسی کی نظر نہیں آتی۔ انھوں نے ایک بڑے وسیع محاذ پر جنگ جاری رکھی جس تحریک کی انھوں نے قیادت کی اس کو ایسی کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اتنا متاثر کیا جتنا کسی دوسری تحریک نے نہیں کیا تھا سر سید احمد خاں کی طاقتور شخصیت کے اثر کا ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں دائرہ بہت وسیع ہے۔ انھوں نے ادب و زبان، طرزِ فکر و اسالیب بیان سب کو کم و بیش متاثر کیا اور ایک ایسے ادبی و فکری دبستان کی بنیاد ڈالی جس کے اندر بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں۔

اس عظیم تعلیمی تحریک نے جس کی قیادت سر سید احمد خاں نے پوری نصف صدی تک خلوص اور قابلیت کے ساتھ کی تھی، بعض ناقابلِ انکار نتائج پیدا کیے اس نے ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی میں اس تعلیمی اور اقتصادی خلا کو بڑی حد تک پر کیا، جو انگریزی اقتدار اور انقلاب حکومت کے بعد پیدا ہو گیا تھا۔ ایک حد تک اس نے مسلمانوں سے مایوسی اور بد دلی بھی کم کی۔ اس ادارے میں، بعض بڑے لائق نوجوان، صاحبِ فکر صحافی اہلِ قلم اور ایسے لیڈر پیدا ہوئے جنھوں نے بعد میں تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادیٔ ہند کی پرزور رہنمائی کی........ لیکن مسلمانوں کے جدید نازک ثقافتی و فکری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس ادارہ نے وہ کردار ادا نہیں کیا جس کی اس سے توقع تھی۔ یہ مغرب کے علمی و عملی تجربوں اور ذخیروں کو مسلم معاشرہ اور ملتِ اسلامیہ کے حالات و ضروریات کے مطابق ڈھالنے کا مجتہدانہ کام تھا۔ یہ ایک نئی اسلامی نسل کا پیدا کرنا تھا۔ جو عقیدہ اور اصول میں مستحکم و مضبوط اور اس اہم کردار سے واقف ہوں جو اس تہذیب عالم کی قیادت میں ادا کرنا ہے۔ اس کی نظر میں وسعت اور فکر میں لچک ہو۔ جدید علوم اور مغربی ثقافت سے اس نے اس کے اچھے پہلو اور اس کا مغز لیا ہو اور اس کی کمزوریوں اور غیر ضروری اجزاء سے احتراز کیا ہو جس کے نتائجِ فکر و تحقیقات اپنے دماغ کا نتیجہ ہوں اور ان میں اسلامی ذہانت اور خود اعتمادی صاف جھلکتی ہو اور جن کے فکر و عمل میں "لذت کردار" اور جرأت اندیشہ پہلو بہ پہلو ہوں۔ یہ وہ نئی نسل تھی جس کا عالمِ اسلام بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ عرصہ سے منتظر اور اس کے لیے چشم براہ تھا۔ یہ نسل (اگر اللہ کی مرضی ہوتی) عالمِ اسلام کو اس تحیر اور اضطراب

ـے ... دے ... تھی، جس میں وہ عرصہ سے مبتلا تھا اور اقوام عالم کی قیادت اور تہذیب حاضر کی رہنمائی میں مرکزی مقام عطا کر سکتی تھی۔"

جس دردمندی کے ساتھ اوپر کی سطروں میں مسلم یونیورسٹی کے علمی خانوادے سے توقعات اور امیدیں وابستہ کی گئی ہیں۔ ہمیں جائزہ لینا ہوگا کہ کیا مستقبل قریب میں اس کی کوئی امید کی جاسکتی ہے۔ ہر اولڈ بوائے اپنے پرانے دور کو موجودہ دور سے بہتر سمجھتا ہے۔ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شجر سایہ دار زوال پذیر ہے۔ اپنی وسعت اور رقم کی ترقی کے باوجود کوئی ایسی چیز ضرور ہے جس نے اس کی قوت نمو کو متاثر کر رکھا ہے۔

جن اساتذہ اور کارکنوں سے یہ دانش گاہ عبارت ہے کیا وہ حقیقت پسندی سے اس صورت حال کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے اور وہ خود اس ضرورت کو کس حد تک پورا کر رہے ہیں اور کہاں تک اس مشن کی تکمیل میں جا سکتے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کی سب سے بڑی خوبی ان کا خلوص اور ادارہ اور طالب علموں کے ساتھ ان کی وابستگی رہی ہے۔ اچھے طالب علموں کی تلاش ان کی سرپرستی اور اکثر اپنی یافت کا بڑا حصہ ان پر لگا دینا ان کے کردار کا وہ سب سے نمایاں اور روشن پہلو ہے جس نے اس ادارہ کی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ ان کا ایثار ان کی زندگی میں ایسا رچا بسا ہوا تھا جو باد سحر کے نم کی طرح نئی کلیوں میں جذب ہو جاتا اور انھیں کھلے ہوئے پھولوں میں تبدیل کر دیتا۔

... والے ... ہیں ... ان کی تعداد گھٹ رہا ہے اور ان لوگوں کا تناسب بڑھ رہا ہے جو محض ملازمت اور اپنی آمدنی کی خاطر یہاں آگئے ہیں اور ذرا ان کو اس سے بہتر مواقع کے آثار کہیں نظر آئے اور انھوں نے طوطا چشمی کی۔ یہاں تو لوگ اپنی کشتیاں جلا کر آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

کوئی ادارہ محض اپنے اسلاف کی کارگزاریوں سے نہیں چلتا جب تک کہ طاقتور شخصیتیں ان کی جگہ لینے والی نہ ہوں۔ جیسا کہ ایک مدبّر نے کہا کہ ادارہ تاریخ سے نہیں تحریک سے چلتا ہے مسلم یونیورسٹی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ پورے ملک سے وابستہ تھی۔ ہندوستان کے اہم مقامات پر اس کے اجلاس ہوتے تھے۔ اس کے نتیجے میں پورے ملک میں ایک ساکھ قائم تھی۔ لیکن مسلم ایجوکیشنل تحریک کے ختم ہونے کے نتیجہ میں زبردست خلا پیدا ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم یونیورسٹی پر ہاتھ ڈال دیا گیا اور ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ کب تک یہ دست درازی جاری رہے گی۔

سرسید کے تعلیمی مشن کو پورا کرنے کے لیے داخلی طور پر مسلم یونیورسٹی کے ماحول اور اس کے نصاب کو از سر نو تشکیل دینے کی اور پورے ملک کی سطح پر رابطہ قائم کرنے کے لیے مسلم ایجوکیشنل تحریک کو نئے سرے سے متحرک کرنے کی ضرورت ہے۔

Regd. No. L/ALG-247

نوٹ :-
تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارے کی کل کاپیاں اپنی مقبولیت کی
بنا پر بہت جلد ختم ہو گئیں ۔ اس لیے کرم فرماؤں کی طلب
اور تقاضے پر اس شمارے کی دوبارہ اشاعت کی جارہی ہے ۔

(مدیر مسئول)

پرنٹر پبلشر قاضی معز الدین احمد نے لیتھو کلر پرنٹرس میں چھپوا کر صفدر منزل تار بنگلہ اے ایم یو علی گڑھ سے شائع کیا۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تهذیب الاخلاق

جلد چهارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ هجری سنہ ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۲

جلد ۱ یکم مارچ ۱۹۸۲ء شمارہ ۳

مدیر : سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔

مدیر مسؤل : قاضی معز الدین احمد

فی پرچہ ۷۵ پیسے
سالانہ ۱۵ روپئے

غیر ممالک سے
فی کاپی ایک ڈالر

قارئین سے التماس

تہذیب الاخلاق کا ایک اور شمارہ ارسال خدمت ہے ۔ امید ہے کہ آپ اس کے اصلاحی مقاصد سے اتفاق فرمائیں گے ۔ جیسے جیسے وقت گذرتا جائیگا اور وسائل فراہم ہوتے جائیں گے اس رسالے کی افادیت اور اس کا معیار بڑھتا جائیگا ۔ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کو متاثر کرنے والے سارے اہم مسائل سے بحث کی جائیگی ۔ علاوہ بریں اس کا ایک جزو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات و کوائف اور اس کے منصوبوں اور پیش رفت کے لئے وقف ہوگا ۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ عظیم ادارہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی حالیہ ترمیم کی رو سے یونیورسٹی کو مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی پیش رفت کی ذمہ داری بھی سونپی گئی ہے ۔ اگرچہ زیر نظر جریدے کا یونیورسٹی سے براہ راست تعلق نہیں تاہم یہ مذکورہ مقصد کی تکمیل میں یونیورسٹی کی معاونت کرتا رہے گا ۔

ارادہ ہے کہ ہر شمارے میں مندرجہ ذیل موضوعات میں سے ہر ایک پر ایک مضمون شائع کیا جائے :—

۱ ۔ علی گڑھ تحریک
۲ ۔ سرسید اور ان کے رفقاء
۳ ۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ اور تعلیمی پیش رفت کی تجاویز ۔
۴ ۔ اخلاق و اطوار
۵ ۔ اقتصادی حالت اور پیش رفت کی تجاویز
۶ ۔ سماجی کمزوریاں اور برائیاں
۷ ۔ زاویۂ نگاہ اور طرزفکر

جن حضرات کو ان مقاصد سے ہمدردی ہے اور جو ان مسائل پر اظہار خیال کرنا چاہیں اُن سے التماس ہے کہ اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مضامین لکھ کر ہمیں ارسال کریں ۔

عام قارئین سے درخواست ہے کہ تہذیب الاخلاق کے خریدار خود بنیں اور خریدار بنائیں کیونکہ اس رسالے کی توسیع، ترقی اور اس کی افادیت میں اضافہ اور اس کے مقاصد کی تکمیل خریداروں کی تعداد بڑھائے بغیر ممکن نہ ہوگی ۔

سید حامد

مدیر

تہذیب الاخلاق

پندرہ روزہ — **علی گڑھ**

مدیر: سید حامد — مدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

خط سرسید

بنام

سید مہدی علی (نواب محسن الملک)

(۲۷ مئی ۱۸۷۰ء - مکتوبات سرسید مرتبہ اسمٰعیل پانی پتی مطبوعہ لاہور)

"ایک اخبار خاص مسلمانوں کے فائدے کے لیے جاری کرنا میں نے تجویز کر لیا ہے اور "تہذیب الاخلاق" اس کا نام فارسی اور انگریزی میں محمڈن سوشل ریفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے اور یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعہ جہاز بادبانی روانہ کر دیں کہ میرے وہاں پہونچنے تک پہونچ جاویں گی۔ خرچ ماہواری اجراے اس اخبار کا سو روپیہ ہوگا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپیہ مہینہ کر دیں گے اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور قیمت بھی بھیجیں گے۔ اس اخبار میں بجز اس کے کہ خاص مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل ہوں گے اور کچھ نہیں ہونے کا۔ اگر صلاح ہوگی تو منشی ذکاء اللہ صاحب کو اور منشی نجم الدین صاحب ڈپٹی انسپکٹر کو بھی آرٹیکل لکھنے میں شریک کریں گے۔"

تہذیب الاخلاق

یکم مارچ ۱۹۸۲ء

آغازِ سفر

الحمدللہ کہ رسالہ تہذیب الاخلاق جاری ہوگیا اور اس کی رسم اجرا ۶؍ فروری ۱۹۸۲ء کو دہلی میں نائب صدر مملکتِ ہند عالی جناب جسٹس ہدایت اللہ صاحب نے ادا کی اور علی گڑھ میں ۸؍ فروری ۸۲ء کو تقریب اشاعت رسالہ تہذیب الاخلاق کے جلسہ کی صدارت الحاج جناب عبیدالرحمٰن خاں شروانی صاحب نے کی۔

دہلی میں افتتاح سورہ "عصر" کی تلاوت اور اس کے معنی و مطالب کی وضاحت سے ہوا۔ مولانا تقی امینی نے یہ فریضہ ادا کیا۔ اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے محمد طلحہ صاحب نے اقبال کی ایک غزل سنائی اور پھر شمیم جے پوری صاحب نے ایک رباعی پیش کرکے سامعین کو محظوظ کیا
سید حامد صاحب مدیر تہذیب الاخلاق نے پرچہ کی اشاعت کے مقاصد پر روشنی ڈالی۔ دہلی کے معززین نے جلسہ میں شرکت کی۔ افسوس ہے کہ دعوت نامے بہت سے حضرات کو وقت پر نہ مل سکے اور وہ جلسہ کو رونق نہ بخش سکے

علی گڑھ میں تلاوت اور سورہ عصر کی وضاحت جناب یٰسین مظہر صاحب نے کی۔ تقاریر سید حامد صاحب، آل احمد صاحب سرور اور صدر جلسہ نے کیں۔

سرسید نے علی گڑھ کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنا کر جو تحریک شروع کی تھی، وہ علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم کی جاتی ہے

اس تاریخی تحریک نے مسلمانوں کی زندگی بدل دی اور وہ اس قابل ہوگئے کہ انگریزوں کی حکومت کے دور میں ملک کی سماجی زندگی میں اہلِ وطن کے ساتھ اگر قدم ملا کر نہ چل سکیں تو اُن سے بہت زیادہ پیچھے بھی نہ رہیں۔ اس تحریک کو مقبول بنانے کے لیے سرسید مرحوم نے مختلف ناموں سے رسائل جاری کیے تھے ان میں رسالہ تہذیب الاخلاق کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اس رسالے نے مسلمانوں کے وہ بہت سے بت توڑ ڈالے جو انہوں نے اپنی آستینوں میں چھپا رکھے تھے۔ اور یہ کوشش کی کہ اُن کو صنعتی دور کا خوگر بنائیں۔ یہ قدم بڑا انقلابی تھا اور مسلمان جو آج بھی عہدِ وسطیٰ کے فکر و عمل کی بھنور میں پھنسے ہوئے ہیں سرسید کی اس کوشش کے متحمل نہ ہوسکے اور سید احمد مرحوم کو یہ رسالہ بند کرنا پڑا۔ لیکن اس کو جاری کرنے کی اُن کو دوبارہ ضرورت پڑی۔ اور اس طرح پر تقریباً دس سال اس پرچہ کے ذریعہ وہ مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش میں معروف رہے

علی گڑھ تحریک کے نتیجے میں مسلمانوں کے ایک چھوٹے سے گروہ نے ضرور ترقی کی لیکن مجموعی طور پر مسلمان مالی اور تعلیمی حالت کے اعتبار سے پسماندہ ہی رہے اور اُن کا تہذیبی انحطاط انگریزی دور میں برابر جاری رہا۔ آج آزاد ہندوستان میں گو وہ انگریزی دور کے مقابلہ میں کافی خوش حال ہیں۔ مسلم دستکاروں کی مالی حالت اچھی ہوگئی ہے اور مسلمانوں کی تعلیم

کی طرف بھی توجہ ہے۔ مسلمانوں میں ایسی تنظیمیں اور ایسے افراد بھی ہیں جو اُن میں تعلیم پھیلانے کی کوشش میں سرگرم ہیں لیکن مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ معمولی نہیں۔ مسلمانوں کی ملک میں تعداد بھی کم نہیں پھر کچھ لوگوں کی خوش حالی سے ملت کی خوش حالی کا مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا اور اس کی غربت و افلاس کا سوال باقی رہتا ہے۔ ان حالات میں " تہذیب الاخلاق " ملت اور اکابرِ ملت کی توجہ اس کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کرے گا۔ بس دُعا کیجیے کہ اللہ خلوص دے اور اس کوشش میں ہم سب کو کامیابی دے۔

تہذیب الاخلاق میں اشاعت کے لیے مضامین وصول ہوتے ہیں۔ رسالہ کا حجم محدود ہے اس لیے ہمیں اشاعت کے لیے مضامین ترتیب دینے میں دشواری ہوتی ہے۔ اگر کسی محترم کے مضمون کی اشاعت ہم ملتوی کرتے ہیں اور مضمون کسی آئندہ اشاعت کے لیے محفوظ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مضمون اہم نہیں ہے اور اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے کم ہے۔ یہ قدم اس لیے اُٹھایا جاتا ہے کہ رسالہ کا حجم کم ہے

پھر ایک بات اور عرض کروں گا۔ رسالہ کا ایک مقصد ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ تعلیم۔ تربیت اخلاق و کردار۔ اصلاح رسوم پر مضامین ہوں ایسے مضامین بھی ہوں جو مسلمانوں میں اپنی زندگی کی جدو جہد تیز کرنے کی طرف متوجہ کریں ان میں بیداری اور فکر فروا پیدا کریں تاکہ وہ اپنے لیے ہی نہیں اس ملک کے لیے اور اپنے معاشرے کے لیے ایک مفید شہری بن سکیں۔

پرچے میں سید ملت کی کاوشوں اور تحریک علی گڑھ پر بھی مضامین ہوں گے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حالات پر بھی لکھا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ کسی نہ کسی تاریخی شخصیت کی سوانح حیات ہو۔

اس کوشش میں آپ کے تعاون کی ضرورت ہے اور یقین ہے کہ وہ ہمیں ضرور حاصل ہوگا۔

ہندوستان آزاد ہوا اور ملک تقسیم ہوا تو پڑھے لکھے لوگوں کا ایک بڑا حصہ ترک وطن کر گیا۔ اس کے چلے جانے سے مسلم معاشرہ میں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ گو یہ کمی پوری ہو رہی ہے لیکن ہمارے نوجوان مایوسی کا شکار رہیں اور بہت سست رفتار ہیں۔ چند سال کا کام ۲۵ ۳۰ برس میں بھی پورا نہ کر سکے۔

انگریزوں کے دور میں کام کاج کے بہت کم شعبے تھے اور ترقی کی راہیں بھی بہت کم تھیں۔ آزاد ہندوستان میں نہ کام کاج کے شعبے کم ہیں نہ ترقی کی راہیں مسدود ہیں البتہ محنت اور جدو جہد شرط ہے۔ کچھ لوگ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے ترقی کر لیتے ہوں گے، کچھ کو ترقی کے لیے محنت، صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ زندگی کی اس کشمکش سے گھبرانا کسی باہمت ملت کے نوجوانوں کے لیے زیب نہیں دیتا۔ افسوس یہ ہے کہ مسلم طلبا اور طالبات امتحان پاس کرنے اور ڈگری یا سرٹیفکٹ حاصل کرنے کی طرف تو متوجہ رہتے ہیں مناسب مضامین کا انتخاب نہیں کرتے اور جو مضامین لیتے ہیں ان میں نمایاں قابلیت نہیں پیدا کرتے ہیں۔ سائنس اور ریاضی کے استاد اور استانیاں مسلمانوں میں ملنا دشوار ہیں۔ اسکول اور کالج کا یہ سلسلہ نہیں ملتے یہی حالت اور شعبہ زندگی کی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قابل مسلمان کہیں نہیں ہیں نہیں ہے ملک میں بعض شعبوں میں بہت قابل اور با صلاحیت مسلمان ہیں لیکن ان چند کی موجودگی ان کی اس کمی کا اور احساس پیدا کراتی ہے جو ملک کے سیکڑوں اہم اور بنیادی شعبوں میں ہے۔

تہذیب الاخلاق کا اجرا اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ملت کا شعور اور ضمیر بیدار کرنے کی کوشش کرے گا

سید حامد

ہماری جذباتیت

ہم نے اپنے پہلے اداریہ میں اس بات کی طرف دھیان دلایا ہ ہندوستانی مسلمان سوچ بچار اور غور و فکر کے بجائے ات کی رَو میں بہتے ہیں۔ جذبات کے طوفان کو روکنے کے لیے ان کو خدا نے دو چیزیں دی ہیں۔ ایک عقل اور دوسرا ضمیر۔ نہ ہوں تو انسان جانوروں سے بدتر ہو جائے۔ عقل انسان کو ے بھلے، نفع نقصان میں فرق کرنا سکھاتی ہے۔ جس وقت عقل س کی شہ پاکر اس کام کو انجام دینا بند کر دیتی ہے، جب وہ ع اور ہوس کی غلام ہو جاتی ہے، جب وہ عداوت اور غصہ ے دھندلا جاتی ہے، تو وہ انسان کو دھوکا دینے لگتی ہے۔ اچھے و بُرا اور بُرے کو اچھا ثابت کر دکھاتی ہے۔ تاکہ دل کی آرزو پوری ہو جائے، تاکہ ہوس کی پیاس بجھ جائے گویا پاسبان رہزن بن جاتا ہے۔ رہبر فریب دینے لگتا ہے۔ ایسے آڑے وقت میں ضمیر آگے بڑھتا ہے۔ عقل کو گمراہی سے بچاتا ہے، زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ شاعر نے کہا تھا ؎

اب کوئی کس پہ اعتبار کرے
عقل ہے آرزو کی حلقہ بگوش

ایسے نازک لمحہ میں انسان صرف ضمیر پر اعتبار کر سکتا ہے۔ ضمیر ہی اس کی عقل کو اور خود اس کو تباہی سے بچاتا ہے۔ دل کی آواز اُسے بھٹکنے سے روکتی ہے۔ اس کے سامنے ہوس کا چراغ نہیں جلتا۔ فریب خوردہ عقل کی منطق نہیں چلتی۔ ضمیر کا فیصلہ سخت ہوتا ہے۔ اس کا فیصلہ تلخ ہوتا ہے۔ اس کی بات ماننے تو کڑوے گھونٹ پینا پڑتے ہیں۔ بہت سی آرزوؤں اور امنگوں [illegible] سے بے تاب ہاتھ

کھینچنا پڑتا ہے جو آپ کی دسترس میں ہے جو آپ کے قبضہ میں، اب آیا، اب آیا۔ ضمیر کی بات ماننے کے لیے بڑا دل گردہ درکار ہوتا ہے۔ تمناؤں کی طغیانی، ہوس کا سیلاب، طمع کی شدت، طیش کی سرکشی، انتقام کی آگ کو یک لخت پیچھے کی طرف دھکیلنا ہوتا ہے۔ ان پر انکش لگانا پڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے چابک سوار سرکش اور منہ زور گھوڑے کو رام کرتا ہے یا سرکس کا ماہر درندوں کو زیرِ نگیں کرتا ہے۔ دراصل وہ چیز جو انسان کو حیوان سے جُدا کرتی ہے۔ وہ بولنے کی طاقت یا نطق سے بھی زیادہ بُرے بھلے کو پرکھنے اور بُری خواہشوں اور میلانوں کو روکنے اور قابو میں رکھنے کی طاقت ہے۔

عام خیال ہے کہ وہ چیز جو انسان کو حیوان مطلق سے جدا کرتی ہے بولنے کی طاقت یا نطق ہے۔ لیکن ہم یہ کہیں گے کہ وہ طاقت عقل ہے، وہ طاقت ضمیر ہے۔ عقل اس وقت بھی جب کہ وہ ہوس کے تابع فرمان نہ ہو، دلائل کے وسیلے سے بُرے اور مضر و مفید میں امتیاز کر سکتی ہے۔ عقل کی حدیں جب وہ جذبات کے کہرہ سے اوپر نکل جاتی ہے، جب وہ آرزو کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے، جب استدلال اس کی گرد راہ بن جاتا ہے، اس وقت عقل کی حدیں ضمیر سے مل جاتی ہیں اس وقت اسے بصیرت کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جب عقل ہوس کی غلام ہوتی ہے اور طیش عداوت، نفرت کی آلۂ کار، تو اسے چالاکی اور مکاری کہتے ہیں اس وقت فریب اس کا شیوہ ہوتا ہے۔ وہ راہ نہیں دکھاتی گمراہ کرتی ہے۔ اسے عقل سفلی بھی کہہ سکتے ہیں۔ غرض کہ عقل جب ضمیر سے ملتی ہے تو وہ عقل علوی بن جاتی ہے اور جب جذبات

کے ساتھ شیر وشکر ہوتی ہے تو عقلِ سفلی۔

یہ عقل سفلی ہے جو بُرے کاموں کے لیے طرح طرح کی تاویلیں کرتی پھرتی ہے۔ یہ ضمیر کو خاموش کرنے کی ترکیبیں ہیں۔ لیکن ضمیر اس بیج کی طرح ہے جو برف پوش زمین میں مہینوں دبا رہنے کے بعد انکُر کے پر و بال نکالتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں انکر موسم بہار میں نکلتے ہیں، ضمیر میں انکر موسم خزاں میں۔ یعنی جب جوانی، دولت اور جاہ واقتدار کا نشہ اُترنے لگتا ہے قوا میں اضمحلال آجاتا ہے اور انجام کی فکر دامن گیر ہوتی ہے تو وہ بُرائیاں، وہ بداعمالیاں وہ ناانصافیاں جنھیں عقل نے بھلا کر کے دکھایا تھا، کھٹکنے لگتی ہیں۔ ایک آن چین نہیں آتا۔ اس دن سے ڈرنا چاہیے۔ وہ دن جب نہ تلافی مقدور ہوتی ہے نہ ازالہ۔ وہ دن ہم سب کو دیکھنا ہے۔ جس کسی نے اپنی عناں جذبات کے ہاتھ میں دے دی تھی اس دن اس کو ایک لمحہ چین میسر نہیں آتا۔ جو کوئی عقل اور ضمیر سے جذبات کا عناں گیر ہوا تھا، اس کا یہ دن بلکہ سب دن آسان اور بے خلش گزرتے ہیں۔ وہ زندگی کا سفر سر اُٹھا کر، سینہ تان کر بے نیازانہ طے کرتا ہے۔ اس کی خاطر ہمیشہ شگفتہ رہتی ہے۔ انسان کے بہت سے میلانات اسے بدی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہوس اسے چین لینے نہیں دیتی۔ ہمسایہ کے چمن کے پھول کو دیکھ کر اُسے آرزو ہوتی ہے کہ اسے توڑ کر اپنی دستار میں سجالے۔ اس سے ساری برائیاں شروع ہوتی ہیں۔ انھیں چاہیے زر، زن، زمین کی طلب کا نام دیجیے جس کو حاصل کرنے کے لیے جھوٹ، فریب اور ظلم روا رکھا جاتا ہے، چاہیے غیبت حسد اور جلن کہیے۔ تُند میلانات اور تیز و تند جذبات انسان سے وہ کچھ کروا لیتے ہیں، جنھیں اگر وہ غور و فکر کرتا تو ہرگز گوارا نہ کرتا۔ جو اس کے لیے اخلاقی گراوٹ اور پشیمانی کا سبب بن جاتے ہیں۔

انسان خود ہی اس چراغ کی طرح ہے جو ہوا کی زد میں ہو ایک طرف اسے تند و تیز میلانات کا، دوسری طرف تحتا... کے جوالا مُکھی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان پر قابو پانا بڑی م... کا کام ہے۔ ان سرکش میلانات کو دیکھتے ہوئے جذبات کمک پہونچانا کہاں کی دانش مندی ہے۔ تعزیری زبان... اسے اقدام خودکشی کہیں گے۔ جہاں بریک لگانا ہو، وہا... ایکسلریٹر پر پیر رکھ دینا مہلک حادثہ کو دعوت دینا ہے... لگ گئی ہو تو اسے بجھانے کے بجائے ہوا دینا نری مورکھ...

آپ نے دیکھا کہ افراد کے لیے جذبات آمادگی کا... مضر رساں ہے۔ اس سے زیادہ نقصان وہ جماع... کے لیے ثابت ہوتی ہے۔ ایک فرد جو جذبات کے سیا... میں بہہ رہا ہو کبھی کبھی سنبھل بھی جاتا ہے لیکن ایک جما... جسے جذبات کی باڑھ بہالے گئی ہو نہ سنبھل سکتی ہے ن... کی طرح قدم گاڑ سکتی ہے۔ جماعت کا ہر فرد رو میں... ایک دوسرے کو دھکیلتا ہے اور اس سے وہ تند ر... مومینٹم پیدا ہوتا ہے جو کسی گرفت، کسی روک کو قبول نہ... جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے اس کی بہتری بڑھتی جا... جسے میانہ روی ایک آنکھ نہیں بھاتی جو سلامت رو... بیگانہ رہتا ہے۔

جذبات پرست لوگ، ریاضت سے جی چراتے... بات جم کر نہیں کر سکتے، مداومت اور مقاومت سے گ... ہیں۔ پتہ مارنا اور پسینہ بہانا اُن کے بس کی بات نہیں... اُن دونوں کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں ہوسکتا۔ کوئی... بغیر اینٹ پر اینٹ رکھے کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ یہ عمل... صبر آزما اور دیر طلب ہے۔ پہلے ضروریات کا تعین... پھر خاکہ بنے گا، پھر نیو کھدے گی پھر مسالہ سے ایک... پر دوسرا ردا جما کر دیوار کھڑی کی جائے گی۔ ا... پلاسٹر ہوگا۔ یہ سب عقل کی قلمرو ہے۔ یہ سب عقل...

[سکتی] ہے عقل آگے کے لیے سوچتی ہے اور اس کے لیے تیاری کرتی ہے۔ اب جذبات کی سنیے وہ یا تو بنیاد ہی کو بہا لے جائیں گے یا [پتھ]رے سے نیو کھدنے ہی نہ دیں گے۔ پھر عمارت کا کیا ذکر۔ اور یہی راز [ہن]دی مسلمانوں کی پسماندگی کا ہے۔ انھوں نے جذبات کی خاطر [عق]ل سے دست کشی اختیار کر لی۔ مسئلہ بڑا ہو یا چھوٹا ہمارا ردعمل [جذ]باتی ہوگا۔ ہم عقل کو موقع ہی نہ دیں گے کہ اونچ نیچ دیکھ سکے [ر]استہ دکھا سکے۔ جذبات کی دلدل میں لوٹنا ہم نے ایک یہی کام سیکھا ہے۔ عقل سے کنارہ کشی کرنا ہی ہمارا شیوہ ہے۔ یہ سودا ہمیں بہت مہنگا پڑا اور پڑ رہا ہے۔ اس سے آسان کوئی طریقہ نہیں کہ جذبات جدھر بہا لے جائیں بہتے چلے جائیں۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جذبات شر محض ہیں۔ سوال ان کو قابو میں رکھنے کا ہے۔ ان کو بھٹکنے سے بچانے کا ہے۔ انھیں بے اعتدالی سے روکنے کا ہے۔ اس کے لیے عقل بھی درکار ہے، ضمیر بھی۔ کوئی شخص آپ کے در پئے آزار ہوتا ہے۔ سیدھا سادہ آسان ردعمل یہ ہے کہ عداوت کا جواب عداوت سے، جراحت کا جواب جراحت سے دیا جائے۔ آپ کو اس نے نقصان پہنچایا ہے اس کا بدلہ لیا جائے۔ آپ بھی اس کی گھات میں رہیے موقع ملے تو بھرپور وار کیجیے۔ اس طرح جذبہ کی تشفی ہو جائے گی لیکن نفرت، عداوت اور خونریزی کا سلسلہ بڑھتا چلا جائے گا اور آپ محض دیکھا دیکھی، محض غضب کی حالت میں وہی برائی کر بیٹھیں گے جو آپ کے ساتھ کی گئی۔ دشمن کو اس سے بڑھ کر داد کیا دی جا سکتی ہے کہ اس کے کام کی اس کے طرز عمل کی تقلید کی جائے لیکن عقل ساتھ دے جائے، ضمیر بیدار ہو، بصیرت راستہ دکھائے تو ایک دوسرا ردعمل بھی ممکن ہے۔ یعنی عداوت کا جواب رافت، دشمنی کا جواب دوستی، نفرت کا جواب بردباری سے دینا۔ یہ کام دشوار ہے لیکن کام کرنے کا یہی ہے۔ اس روش کی وجہ سے تہذیب کو ترقی ہوئی انسانیت کو فروغ ہوا۔ غور کیجیے

تہذیب دراصل جذبات کی عنانگیری اور ان کے ارتفاع کا نام ہے۔ ہم ادنیٰ کو اعلیٰ، سفلی کو علوی بنا سکتے ہیں۔ اگر اسے انسانی فطرت کی ہجو نہ سمجھا جائے تو ہم کہیں گے کہ بنیادی طور پر بحیثیت حیوان کے ہمارے میلانات، ہمارے محرکات، ہوس، طمع، انانیت، جور اور استیلا سے عبارت ہیں۔ عقل اور ضمیر انھیں بھٹی میں پگھلا کر بے غرضی، بے نفسی، رحم اور ایثار میں بدل دیتے ہیں۔ یہ تجربہ کہ انسان کو اس کی فطری حالت پر چھوڑ دیا جائے، مضحکہ خیز ہے۔ ایسا کر کے دیکھیے وہ ایک دوسرے کو پھاڑ کھائے گا۔ تہذیب کی نگہبانی کے باوجود اب بھی جب اسے موقع ملتا ہے وہ پاسبانوں کو مغلوب کر کے باہمی قطع و برید کے بھیانک مشغلہ سے دل بہلاتا ہے۔ تہذیب کی راہ توازن اور اعتدال کی راہ ہے۔ یونانیوں کے اس نظریہ میں عملی صداقت ہے کہ خوبی وسط میں ہوتی ہے اور اس میں زیادتی اور کمی افراط و تفریط اس کے دائیں بائیں برائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً شجاعت یعنی بہادری خوبی ہے۔ شجاعت کی کمی ہو تو وہ جبن یا بزدلی میں بدل جاتی ہے، برائی بن جاتی ہے۔ اس شجاعت میں زیادتی ہو، شجاعت اعتدال سے تجاوز کر جائے تو اسے تہور کہتے ہیں یعنی وہ بہادری جس میں بے ضرورت خطر طلبی اور جارحیت شامل ہو۔

جذبات اور میلانات کے اشارہ پر چلنے والے کبھی جم کر محنت نہیں کر سکتے۔ وہ عقل اور ضمیر کی رہبری کے علاوہ ریاضت اور استقامت سے بھی محروم رہتے ہیں اور بغیر ریاضت اور استقامت کے کوئی فرد آگے نہیں بڑھ سکتا کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی یہ بات اس زمانہ میں اور صادق آتی ہے جب کہ ہمارا سابقہ زبردست گذار مقابلہ سے ہے۔

یہ سچ ہے کہ جذباتیت کسی قوم یا گروہ کو متحد بھی کر دیتی

ہے مگر یہ اتحاد چند روزہ ہوتا ہے۔ چڑھی ہوئی ندی کے اترنے میں دیر نہیں لگتی۔ باڑھ پیچھے ہٹتی ہے تو دور تک کشت امید کی بربادی کا سماں دکھائی دیتا ہے۔ تند و تیز شعلے بجھتے ہیں تو اپنے پیچھے راکھ کا ڈھیر چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر طرف خاک اڑنے لگتی ہے۔ یہی نہیں مزاج پر جذباتیت کا غلبہ ہو تو ہر فرد وقتی جذبے کے تحت مختلف سمت میں چلے گا۔ قدم ملا کر چلنا اشتراک عمل، تعمیر کے لیے تعاون مشکل ہو جائے گا۔ اسی کو افراتفری کا عالم کہتے ہیں۔ یہی نفسی نفسی کا سماں ہے، یہی جذباتیت کی دین ہے۔ یہی اقوام و ملل کے زوال کا پیش خیمہ ہے

ہم جوش آسانی کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ موقع پاتے ہی اپنی عناں جذبات کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ جذبات کے ساتھ جہاد کرنا، میلانات پر انکس لگانا، خواہشوں کو ضابطہ کی قدر میں لانا، استخواں گداز تمناؤں کو ٹھنڈا کرنا، نفس امارہ کو مارنا، یہ کوئی آسان کام نہیں ہے اور ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ ہر اس کام سے جو آسان نہیں ہے جی چراتے ہیں۔ عقل عناں کھینچتی ہے، ضمیر سخت گیری کرتا ہے۔ دونوں جی کا جنجال بن جاتے ہیں۔ ان کو ہم نہیں پھٹکنے دیں گے۔ ہمیں یکسوئی کوئی تعلق ہے، ہمیں فراغت کوئی ناگوار ہے، ہمیں آسان روی سے کوئی یہ ہے کہ عقل او ضمیر کو پاس آنے دیں۔ ہمارے لیے جذبات کافی ہیں۔ اُن کی رو میں بہنا کیسے بُرا لگتا ہے۔ بے سدھ ہو کر لہروں میں بہتے چلے جایئے۔

خاکستر ہو گیا۔ خانہ جنگی اور دھینگا مشتی کی نذر آبرو بھی ہو گئی اور عافیت بھی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں زر کا ظرف نہیں زر ہمیں راس نہیں آتا۔ یہ بھی ایک عنوان بے تعبیر ہے اور "اَلْفَقْرُ فَخْرِی" کی جب تک شان امارت میں اس کا سماں رہا، ہم زندہ رہے۔ اب امارت ہم کو راس نہیں آتی کہ اس میں فقر کا شائبہ باقی نہیں۔ اس کی عبرتناک مثال اس دولت میں ملے گی جو مشرق اوسط کو پٹرولیم سے حاصل ہوئی ہے اور پٹرو ڈالر کہلاتی ہے (اس کا ذکر آئندہ کسی صحبت میں آئے گا)

لیکن اس دور میں وسائل کے بغیر کام ہی نہیں چلتا۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم وسائل کے غلام نہ بنیں، اُن کے امام بنیں۔ جذبات ہم پر مستولی نہ ہوں، ہمیں جذبات پر استیلا حاصل ہو۔ خدا ہمیں جذباتی مزاج سے نجات دے۔

آیئے ہم ارزاں جذباتیت کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔ تن آسانی اور خود فراموشی اور بے خودی سے دامن بچائیں۔ جانکاہی، جانفشانی، عرق ریزی سے عقل کو جلا بخشیں، صلاحیتوں کو چمکائیں۔ ہمیں ضرورت ہے بصیرت بدوش عقل کی اور ایسے ضمیر کی جو کائنات کو محیط ہو۔

ہمیں چاہیے کہ اپنے بچوں کو ایسی تربیت دیں کہ اُن کا ردِ عمل جذباتی ہونے کے بجائے عقلی، ان کی گفتگو پُر جوش ہونے کے بجائے مدلل ہو۔ وہ سادہ دلی سے ہر بات کو باور کرنے کی جگہ تحقیق کے خوگر ہو جائیں۔ ہر بات، ہر افواہ، ہر دعوے کو پہلے عقل کی کسوٹی پر پرکھیں۔ پھر اس پر یقین کریں

اپنوں میں جہاں کہیں نفاق دیکھیے گا، اور یہ کہاں نہیں ہے، اس کا سرچشمہ مجروح انا اور زود مشتعل جذباتیت میں پایئے گا۔ تحریکوں اور اداروں کو دیکھیے۔ جہاں وہ کامیاب اور خوشحال ہوئے، حسد اور ہوس کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ ادارہ اور تحریک کا مستقبل

سورہ عصر کے معانی و مطالب پر
مولانا تقی امینی کی تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝
وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۔ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

یہ ہدایت الٰہی کی چھوٹی سی سورت ہے۔ جس میں انسان کے عکس، قوموں کی تقدیر اور ترقی کے اصول ہر ایک کی جھلک موجود ہے انسان کا عکس جدید دنیا نے بھی لیا ہے وہ کائنات کی عکاسی کے لیے تیار کیا گیا ہے جس میں کائنات کی چیزیں بڑی حد تک دیکھ لی گئیں۔ لیکن انسان ہی کا صحیح عکس اس میں نظر نہ آسکا۔ دراصل انسان ایک سربستہ راز اور رعنائی کا بہترین شاہکار ہے۔ اندر کی پُرپیچ راہوں سے گزرنا۔ باریک تاروں تک پہونچنا اور پھر اندھیری کوٹھری میں روشنی کی کھڑکی دریافت کرنا آسان کام نہیں ہے۔ انسان وہیں سفر کرسکتا ہے جہاں اس کی توانائی اجازت دیتی ہے اسی منزل تک جاسکتا ہے جس تک عقل ساتھ دے سکتی ہے راہیں اتنی پرپیچ کہ قدم رکھتے ہی توانائی جواب دے دے۔ تار اس قدر باریک کہ ان کو چھوتے ہی وہ الجھ کر رہ جائیں۔ ایسی حالت میں کیا توقع ہوسکتی ہے کہ انسان خود اپنا عکس لینے میں کامیاب ہوسکے گا۔ بے بسی کی اس صورت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ سمندر کی موجوں سے کھیلنا، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روندنا اور چاند کی دھرتی پر قدم رکھنا اس کے لیے آسان ہے لیکن نفس کی چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ادنیٰ سی کشش پر قابو پانا اس کے لیے حد درجہ مشکل ہے۔ ہزار ایجادات کے باوجود عقل کو جذبات پر فتحمند بنانے کے لیے کوئی ایجاد اب تک نہ کرسکا۔ ہزار تدبیروں کے باوجود روح اور حیات کے سرچشمہ کی دریافت میں کامیاب اب تک نہ ہوسکا اور جس کا نتیجہ بقول ڈاکٹر اقبال یہ ہے ؎

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

ہدایت الٰہی نے انسان کے عکس کے لیے جو آئینہ تیار کیا ہے وہ اصلاً اسی کے لیے ہے۔ کائنات اس کے جلوہ میں خود بخود آجاتی ہے۔ جو چیزیں انسان کے بنائے ہوئے آئینہ میں دیکھ لی گئیں۔ یا دیکھی جاسکتی ہیں اس میں ہدایت کو دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ یہ کرتی رہی اور اب بھی کر رہی ہے۔ ہدایت الٰہی نے خاص انسان کے لیے جو آئینہ تیار کیا ہے اس میں انسان کی اصلیت

نورانی نظر آتی ہے۔ اُس میں وہ نورانی موتی بھی نظر آتے ہیں جو نیچرل کانسٹی ٹیوشن [Natural Constitution] میں ٹکے ہوتے ہیں۔ وہ محض تار بھی دکھائی دیتے ہیں جو انسان کے شعور و تحت الشعور میں پیوست ہیں اور جن کا ربط ایک ذی شعور طاقت سے ہے۔ تاروں کے وہ زیر و بم بھی دکھائی دیتے ہیں جن کے بغیر زندگی کے ساز میں سوز نہیں پیدا ہوتا۔ اور بہت سے نغمے خاموش ہو جاتے ہیں اور اندھیری کوٹھری میں روشنی کی وہ کرن بھی نظر آتی ہے جس کے ذریعہ ماورائے عقل پرواز کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ ـمی کوۃ من عالم القدس۔

مذکورہ آیت جو پڑھی گئی ہے وہ اسی ہدایت آلہی کی ہے جس میں انسان کا بے کم و کاست عکس لیا گیا اور جس کی حفاظت اور صحت کی ضمانت کا اس قدر اہتمام و انتظام کیا گیا کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ترجمہ یہ ہے۔

" زمانہ شاہد ہے کہ انسان خسارے میں ہے سوائے
ان کے جو ایمان لائے اور عمل صالح کیے اور آپس
میں ایک دوسرے کو حق کی وصیت کی اور ایک
دوسرے کو صبر کی وصیت کی۔ "

"والعصر" میں "واو" قسم کے لیے ہے۔ اور عصر کے معنی زمانہ ہیں۔ ہدایت الہی میں اس طرح کی قسمیں تمام تر اس دعوی کے لیے دلیل اور شہادت کی حیثیت رکھتی ہیں جو قسم کے بعد ذکر کیا جاتا ہے۔ سورت میں انسان کو خسارہ سے بچانے کے لیے جو چار اصول ہیں، ان کی صداقت اور سچائی کے لیے پوری تاریخ کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے۔

پہلا اصول ایمان ہے

ایمان جان لینے اور مان لینے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ قرآن کی اصطلاح میں اس حقیقت کا نام ہے جس کی تعبیر ہم

اپنی زبان میں "دل میں اتر جانا" رگ و ریشہ میں سرایت کر جانا" سے کرتے ہیں۔

یہ بے جان تصدیق اور جامد عقیدہ کا نام نہیں ہے بلکہ علم و عقیدہ اور معرفت و محبت کے صحیح امتزاج سے قلب و ذہن کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان اپنی خواہش اپنی مرضی حتیٰ کہ اپنی ذات کو اس کی مرضی اور ارادہ پر چھوڑ دیتا ہے جس پر وہ ایمان لایا ہے اس کا تعلق اندرونی زندگی سے ہے جہاں سب سے پہلے اصلاح و انقلاب کی تخم ریزی ہوتی ہے اور جہاں افکار احساسات اور تصورات کی تخلیق ہوتی ہے۔ یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی اصلاح و انقلاب کے لیے جب عالم انفس (اندرونی زندگی) کی فضا سازگار ہو گئی تو عالم آفاق (زندگی) کے تمام مراحل آسانی سے طے ہوتے رہتے ہیں۔

عمل صالح سے مراد چند ظاہری مراسم و اعمال اور چند رواجی نیکیاں نہیں ہیں بلکہ اس کا قرآنی مفہوم اخلاقیات و مادیت کے ہر شعبہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے۔ البتہ ایمان کی حیثیت بنیاد کی ہے کہ اس کے بغیر نہ صالح معاشرہ وجود میں آتا اور نہ عالمی تصرفات انسانیت کے لیے مفید بنتے۔

کلام عرب میں صالح کا لفظ جس کام کے لیے بولا جاتا ہے اس کی مناسبت سے صلاحیت اور موافقت ہوتی ہے۔ قرآن و سنت اور مفسرین کے اقوال سے اس کی مناسبت سے صالح کے مفہوم میں عمومیت اور وسعت کا ثبوت ملتا ہے۔

تیسرا اصول "تواصی بالحق" ہے۔

تواصی وصیت سے بنا ہے جس میں ذمہ داری، ایثار و قربانی، باہمی شرکت و تعاون جذبہ اسپرٹ ان سب ہی ملحوظ ہیں۔ حق کے معنی ثبوت اور قیام کے

کلامِ عرب میں یہ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے، وہاں ثبوت، قیام۔ نہ ٹلنا نہ ہٹنا وغیرہ کا مفہوم کا پایا جانا یقینی ہے۔ مفسرین کے اقوال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔ وہ بات جو عقل کے نزدیک مسلم ہو۔ وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو۔

چوتھا اصول " تواصی بالصبر" ہے۔ صبر ایک منفی قوت نہیں بلکہ زبردست مثبت قوت ہے۔ جس سے اصلاح وانقلاب میں مدد لی جاتی۔ ظرف کی کمی وبیشی کی نشاندہی ہوتی اور زندگی کے مقام ومرتبہ کا پتہ لگایا جاتا ہے۔ مطالبات وفرائض کی ادائیگی پر صبر، مرغوبات ومفادات کے ترک پر صبر، مشکلات ومصائب پر صبر۔

ان چاروں کی وسیع تعبیر اس طرح بھی کی جاتی ہے۔

(۱) ایمان

جن نظریات پر یہ تحریک کی بنیاد رکھی گئی ان پر قوم کی تنظیم ہوئی ہو، وہ افراد جماعت کی رگ رگ میں سمائے ہو ئے اور اُن کی پوری زندگی پر چھائے ہوئے ہوں۔

(۲) عمل صالح

ان نظریات کو بروئے کار لانے کے لیے جن جن تدبیروں اور صلاحیتوں کی ضرورت پڑے اور جس جس قسم کی اطاعت و فرمانبرداری کا مطالبہ کیا جائے اس کے لیے قوم کے افراد ذاتی مفاد کو نظرانداز کرکے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار رہیں۔

(۳) تواصی بالحق۔

قوم کا ہر فرد قولی اور عملی طور پر ان نظریات کا مبلغ ہو اور ایک دوسرے کی نگہداشت اور تعلیم وتربیت کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو۔

(۴) تواصی بالصبر۔

قوم کے افراد عزم واستقلال کے ساتھ مطالبات و فرائض اور مصائب ومشکلات میں ثابت قدم رہیں۔ اور آگے بڑھنے کا جذبہ سرد نہ ہونے پائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ " علم کو مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ علم مومن کا دوست ہے۔ حلم (بردباری) اس کا وزیر ہے۔ عقل اس کی رہبر ہے۔ نرم خوئی اس کا بھائی اور صبر اس کے لشکر کا امیر الامراء (کمانڈر انچیف) ہے۔

(نوادر الاصول از تفسیر عزیزی)

یہ چار اصول ہیں جن میں قوموں کی تقدیریں چھپی ہیں۔

چوں سرمۂ افرنگی از دیدہ فرو شستم ـ تقدیرِ امم دیدم پنہاں بکتاب اندر

عطیات۔ چندہ سالانہ خط وکتابت

اور مضامین بھیجنے کا پتا حسب ذیل ہے

مدیر مسئول۔ قاضی معزالدین احمد

صفدر منزل، نار بنگلہ، اے ایم یو
علی گڑھ۔ یو پی

دل کی مہلک ترین بیماری

کیا اس سے بچا جا سکتا ہے ؟

محمد عارف صدیقی
جے این میڈیکل کالج
اے ایم یو۔

فلاسفر، اطبا، شعرا اور عام لوگ دل کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اہمیت دیتے آئے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں یہ عام عقیدہ تھا کہ دل روح کا مسکن ہے اور اس کا صحیح کام کرنا زندگی، اور ناقص کارکردگی یا بند ہونا موت کے مترادف ہے۔ یہ کسی حد تک صحیح بھی ہے یہ سب اسی عضو کا حال ہے جو سینے کے وسط اور تھوڑا سا بائیں طرف واقع ہے اور جس کا وزن بالغوں میں ۳۰۰ سے ۳۴۰ گرام ہوتا ہے شکل ناشپاتی کی سی ہوتی ہے۔ اور سائز میں بند مٹھی کے برابر ہوتا ہے۔

دل کا دھڑکنا ماں کے پیٹ میں بچے کی ۶۔ ہفتے کی عمر میں شروع ہو جاتا ہے اور موت پر ختم ہوتا ہے۔ اس پورے عرصے میں یہ برابر دھڑکتا رہتا ہے۔ چاہے آدمی آرام کرتا ہو یا جسمانی مشقت دماغی کام کرتا ہو یا سوتا ہو، یا کچھ بھی کرتا ہو۔ اس کا کام سارے جسم میں خون کا دوران قائم رکھنا ہے۔ اور یہ کام دل ۷۲، بار فی منٹ دھڑک کر خون پمپ کرتا ہے۔ ۲۴ گھنٹے کام کرنے کے دوران ۹۶،۰۰۰ کیلو میٹر خون کی رگوں میں گردش خون ہوتی ہے اور ۷۰ سال کے عرصہ میں دل تقریباً ۲۲ کروڑ لیٹر سے بھی زیادہ خون کو پمپ کرتا ہے۔ اتنا کام تو جب کرتا ہے جب عام رفتار سے دھڑکن ہوتی رہتی ہے۔ اس میں کئی گنا زیادہ کام کرنے کی طاقت (Reserve Capacity) ہوتی ہے جس کی ضرورت اکثر و بیشتر پڑتی رہتی ہے۔ مثلاً دوڑنے، جسمانی مشقت کرنے

اتنے سال کام کر سکے آج تک کوئی انجینئر نہیں بنا پایا۔ یہ گوشت کا پمپ اپنا کام انجام دینے کے لیے اس خون سے خوراک حاصل کرتا ہے جو دل کی رگیں یا کاروناری آرٹریز، — Coronary Arteries) کہلاتی ہیں۔ دل کا وزن گو کہ پورے جسم کے وزن کا صرف 0.25 فی صد ہوتا ہے۔ اسے اپنے کام انجام دینے کے لیے جسم کا چار ۴ فیصد خون، اپنے وزن کے تناسب سے ۱۶ گنا زیادہ، درکار ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے دل کو خون کی مقدار اس کی ضرورت سے کم ملتی ہے تو اس کا اثر بہت برا ہوتا ہے۔

دل کے امراض کی شرح تقریباً ہر ملک میں پریشانی کا باعث ہو گئی ہے۔ دل کی وہ بیماری جو دل میں خون پہنچانے والی رگوں کی خرابی سے پیدا ہوتی ہے یعنی Coronary Artery Heart Disease (C.A.H.D.)، آج کل تقریباً ہر ملک میں وبائی شکل اختیار کر رہی ہے۔ اس بیماری میں ان رگوں میں تنگی یا ان کے منہ کے بند ہو جانے سے دل کے ایک حصہ کو ضرورت کے مطابق خون نہ ملنے پر دل مردہ (Necrosis) ہو جاتا ہے۔ اس کو عام اصطلاح میں ہارٹ اٹیک اور طبی اصطلاح میں (Myocardial Infarction) کہتے ہیں۔ یہ مرض تیزی سے بڑھ رہا ہے اور اس کی اہمیت یوں زیادہ ہے کہ عام طور سے مرد اور وہ بھی ۳۵ سے ۵۰

پر تقریباً ۳۰ فیصد مریض پہلے حملے میں فوت ہو جاتے ہیں اور جو صحت یاب ہو جاتے ہیں اُن پر دوبارہ اس مرض کے حملہ ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہی عمر زیادہ کام اور ترقی کرنے کی ہوتی ہے۔ عورتوں میں یہ بیماری سن یاس [MENOPAUSE] کے بعد ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ البتہ بچّہ جننے کی عمر میں عورتیں عام طور پر اس بیماری سے محفوظ رہتی ہیں۔

Epidemological Studies سے بہت سے ایسے اسباب کا پتہ چلا ہے کہ جن کی موجودگی پر CAHD ہونے کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اگر کسی طرح یہ اسباب [Factors] کم یا ختم کر دیے جائیں تو اس بیماری کا امکان یا خطرہ کافی کم ہو جاتا ہے۔ بعض اسباب [Factors] تو ایسے ہوتے ہیں جن پر کسی کو اختیار نہیں مثلاً خاندانی اثر، ایک خاص عمر پر بیماری کا ہونا، اور مرد ہونا وغیرہ مگر خوش قسمتی سے یہ سب بہت ثانوی اور کم اہم ہیں۔ زیادہ اہم اسباب کافی حد تک اختیاری ہوتے ہیں اور ان سے بچ کر بیماری کے امکان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ یہ اہم اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) سگریٹ نوشی کا نقصان دہ ہونا تو بہت سے کئی ممالک میں Studies اور ریسرچ سے ثابت ہو چکا ہے۔ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ سگریٹ نوشوں کو سگریٹ نہ پینے والوں کے مقابلے دل کا دورہ پڑنے کا امکان ۳ سے ۵ گنا زیادہ ہوتا ہے جتنی زیادہ تعداد میں سگریٹ پی جائے یہ خطرہ اتنا ہی زیادہ ہے۔ سگریٹ کے مضر اثرات نہ صرف نکوٹین اور ٹار کی وجہ سے بلکہ سگریٹ کے کاغذ جلنے کی وجہ سے جو گیس اور دھواں بنتا ہے اس سے بھی ہوتے ہیں۔ کئی مغربی ممالک میں کم نکوٹین مقدار کی سگریٹیں بکنے لگی ہیں مگر سب سے اچھا یہی ہے کہ یا تو سگریٹ نوشی کی عادت ڈالی ہی نہ جائے اور اگر بدقسمتی سے یہ ہو بھی جائے تو جلد از جلد اسے چھوڑ دیا جائے۔ اگر سگریٹ پینے والے سگریٹ نوشی ترک کر دیتے ہیں تو دل کے دورہ پڑنے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ پائپ، سگار اور حقّہ پینا نسبتاً کم نقصان دہ ہے۔

(۲) جسمانی وزن کا زیادہ ہونا یا مٹاپا نہ صرف CAHD بلکہ کئی اور مہلک بیماریوں کی جڑ ہے۔ آدمی کا وزن عام طور سے ادھیڑ عمر میں بڑھتا ہے اور یہ وہی عمر ہے جس میں اس بیماری کے ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ ہر کلوگرام زیادہ چربی (جسمانی وزن کی زیادتی کا سبب) میں ۱۰۰ کلومیٹر لمبی خون کی رگیں ہوتی ہیں اور ظاہر ہے دل کو ہی ان فالتو خون کی رگوں میں دوران خون کرانا ہوگا اور اس طرح دل کا کام بڑھ جاتا ہے۔ اگر کسی شخص کا وزن معمول سے ۵ یا ۱۰ کلوگرام زیادہ ہے تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دل کا کام کس قدر زیادہ بڑھ جائے گا۔ عام کہاوت کہ "جس کی کمر کی وسعت جتنی زیادہ اس کی عمر کی لمبائی اتنی ہی کم" بہت مناسب اور درست ہے۔ ضرورت سے زیادہ کھانا کھانا وہ بھی چربیلا، گھی، مکھن، سوکھا میوہ و خاص کر مونگ پھلی، میٹھی چیزیں اور پھر جسمانی کام کم سے کم کرنا مٹاپے کی عام وجہ ہے۔ مٹاپا ایسی علت ہے کہ جس سے جلد چھٹکارہ حاصل کر لیا جائے اُتنا ہی صحت اور خاص کر دل کے لیے مفید ہے۔

(۳) ہائی بلڈ پریشر یا خون کا دباؤ زیادہ ہونا دل کی بیماری اور خاص کر CAHD کا ایک اہم سبب ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ بلڈ پریشر بڑھتا ہے اتنا ہی دل کو آرام کرنے کا موقع کم ملتا ہے۔ دل اپنی ہر دھڑکن کے دوران تقریباً آدھے سیکنڈ کے لیے آرام [Rest] لے لیتا ہے۔ بلڈ پریشر زیادہ ہونے سے CAHD ہونے کا امکان ۳ سے ۵ گنا زیادہ ہو جاتا ہے۔ بلڈ پریشر بڑھنے کی بیماری موٹے اشخاص میں زیادہ عام ہے۔ اگر بلڈ پریشر پر وزن گھٹا کر یا دوا کے استعمال سے قابو کر لیا جائے تو اس بیماری کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

(۴) خون میں چربی کی مقدار بڑھنے Hyperlipidaemia سے خون کی رگوں کی دیواروں کو نقصان پہونچتا ہے اور وہ تنگ

ہوجاتی ہیں۔ کیوں کہ فاضل چربی ان کی دیواروں پر جمع ہوجاتی ہے
جس سے خون کے دوران میں رکاوٹ ہوجاتی ہے یا خون کا اس
دل میں آنا بند ہوجاتا ہے۔ خون میں چربی کے بڑھ جانے سے CAHD
کا امکان تقریباً ۴ گنا زیادہ ہوجاتا ہے۔ خون کی چربی کی مقدار
غذا میں چربی اور وہ بھی حیوانی ماخذ ANIMAL SOURCE
کی اور SATURATED FATS کم کرنے اور پابندی سے
جسمانی ورزش کرنے سے ہوجاتی ہے

(۵) ایسی خوراک کی عادت جس میں مقدار
SATURATED FATS، CALORIES اور سفید شکر کی
مقدار زیادہ ہوتی ہے وہ نہ صرف جسمانی وزن بڑھاتی ہے،
خون کی چربی بڑھاتی ہے بلکہ کی شرح بھی
زیادہ کردیتی ہے۔ کھانے میں کٹر [Fanatic] ہونے
کی ضرورت نہیں اور نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے مستفید نہ
ہوا جائے بلکہ جن غذائی اشیاء سے نقصان ہونے کا اندیشہ
ہوتا ہے وہ کم سے کم اور کبھی کبھی استعمال کی جائیں اور ایسی اشیاء
کہ جن سے نہ وزن بڑھے نہ خون کی چربی بڑھے اور نہ CAHD
کا امکان زیادہ ہو، وہ عام طور سے استعمال کی جائیں۔ نقصان دہ
غذائی اشیاء کے استعمال کا چلن خود ساختہ تہذیب یافتہ اور
صنعت یافتہ ممالک کی آبادی میں زیادہ ہے اور انہیں لوگوں میں
یہ بیماری عام ہے۔ یوروپی ممالک میں جب دوسری جنگ عظیم کے
دوران راشن بندی اور خاص طور سے Animal fats & Sugar
اور بڑی مشکل سے دستیاب ہوتے تھے تب CAHD کم ہوگئی
تھی۔ اب جتنا زیادہ تمول اور صنعتی ترقی ممالک رہی ہے CAHD
بھی اتنا ہی بڑھ رہی ہے۔ زیادہ کافی پینا بھی مضر ہے۔

(۶) ذیابیطس (Diabetes Mellitus)
جو کہ ایک عام بیماری ہے اور موٹے لوگوں کو زیادہ ہوتی ہے
بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے اور اس کے مریضوں میں CAHD
بھی ۳ گنا زیادہ ہوتی ہے اس کو اگر کنٹرول رکھا جائے چاہے
غذا پر کنٹرول کرکے یا دواؤں کا استعمال کرکے، تو CAHD ہونے کا
امکان کم ہوجاتا ہے۔

(۷) زیادہ جسمانی آرام کرنا، سست روی کی زندگی
[Sedentary habits]، پیدل کم چلنا، پابندی سے ورزش
نہ کرنا سب دل کی بیماری CAHD ہونے کے امکان کو زیادہ
کرتے ہیں۔ سب سے آسان ورزش روزانہ تقریباً ۲-۴ کلومیٹر
پیدل چلنا ہے۔ اس سے نہ صرف خون کا دوران بڑھتا ہے۔ بلکہ
نئی رگوں کا جال بن جاتا ہے جن سے خون کا دوران بہتر رہتا ہے

(۸) دماغی الجھنیں، اعصابی تناؤ، کشمکش کا ماحول
مستقل پریشان رہنا، زیادہ جھنجھلانا یا چڑچڑانا دل کے لیے بہت
مضر ہیں۔ ان سب حالات میں جسم میں ایک ایسا کیمیائی جز
[CATECHOLAMINES] پیدا ہوتا ہے جو بلڈ پریشر
اور دل کی رفتار بڑھاتا ہے، رگوں کا منہ تنگ کرتا ہے، خون کی
چربی کی مقدار بڑھاتا ہے اور دل کے آرام کرنے کے وقفہ کو کم کرتا
ہے۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جن سے دل کو نقصان پہونچتا ہے
اور CAHD ہے تو اس کا دل بھی Relax کرتا ہے،
ایسا کرنے سے دل بہتر اور زیادہ عرصہ تک ٹھیک کام کرتا رہتا ہے۔
جن لوگوں کی شخصیت [PERSONALITY] مندرجہ بالا نوع
کی ہوتی ہے یعنی ہمیشہ یا زیادہ تر تناؤ یا الجھن کی کیفیت طاری کیے
رہتے ہیں انہیں CAHD عام طور پر زیادہ ہونے کا امکان ہے
ماحول [Environment] کا اثر اور Contribution
مسلّم ہے مگر اپنی شخصیت اور حالات کے ردعمل پر کنٹرول کرنے
سے زیادہ آسان چیز کوئی نہیں ہے۔

بعض خاندانوں میں CAHD ہونے کی شرح زیادہ
ہوتی ہے۔ مگر ایسی بہت سی احتیاط ہیں جن پر عمل کرکے CAHD
کے امکان کو کم کیا جا سکتا ہے اوپر ذکر کیے ہوئے factors

اطہر پرویز
شعبۂ اردو

تعلیم کے نئے مسائل

ہم نے انگریزوں سے ورثے میں جو تعلیمی ڈھانچا پایا ہے، وہ بوسیدہ اور فرسودہ تو تھا ہی، لیکن ہم نے بدلنے کے بجائے اُس کی مرمت کا کام کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ رہا سہا بھی جاتا رہا — ہم نے جب ترقی کی طرف دھیان دینے کی کوشش کی تو مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں کی طرف نظر دوڑائی جہاں بیشتر آبادی تعلیم یافتہ تھی — جہاں بھوک اور بیکاری جیسے مسائل کا کہیں ذکر نہ تھا۔ ہم نے اپنی مغرب پرستی کی دھن میں تعلیم بالغان کا سبق بھی ان ہی ملکوں سے سیکھا، جہاں ہر بالغ پڑھا لکھا تھا۔ ہم نے اپنی ابتدائی اور ثانوی تعلیم پر توجہ دینے کے بجائے اعلیٰ تعلیم کی طرف دھیان دیا۔ ہم "اعداد و شمار" دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے کہ ہمارے مدرسوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ تعلیمی ضروریات اور وقت کے تقاضوں کی طرف ہم نے کبھی کوئی دھیان نہ دیا۔

سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے تو ایک خود غرضی کا مظاہرہ کیا، جس کی مثال شاید ہی دنیا کے کسی معاشرے میں ملتی ہے۔ یہ لوگ عوام کو مادری زبان میں تعلیم دینے پر زور دیتے رہے اور خود اپنے بچوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دیتے رہے۔ اس حمام میں تقریباً تمام سیاسی جماعتیں ننگی ہیں۔ اُن کے اپنے بچے بہترین اسکولوں میں زرِ کثیر صرف کر کے پڑھتے رہے، انھوں نے سرکاری اسکولوں کو، جن میں بیشتر میونسپل اسکول شامل ہیں، کبھی پلٹ کر نہ دیکھا۔ یہاں بیچارا استاد کا الف، گا پڑھتا رہ گیا۔

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ کسی غیر ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا جا سکتا ہے۔ اِس سچائی

بقیہ مضمون "دل کی مہلک ترین بیماری"

اگر ایک سے زیادہ موجود ہوں تو اُن کا اثر Additive نہیں Synergistic ہوتا ہے یعنی اگر کوئی سگریٹ نوشی کرتا ہے اور اس کے خون میں چربی کی مقدار زیادہ ہے تو CAHD کا امکان 5 = 3 + 2 گنا نہ ہو کر 16+4 گنا زیادہ ہوتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی سگریٹ نوشی نہ کرے (یا اگر کرتا ہو تو چھوڑ دے)، وزن معمول کے مطابق رکھے (یا بڑھا ہوا ہو تو گھٹا دے)، پابندی کے ساتھ ورزش کرے، مناسب غذا کھائے اور اعصابی تناؤ، الجھن، جھنجلاہٹ اور تناؤ کے ماحول سے دور رہے تو نہ صرف CAHD کا امکان بہت کم کیا جا سکتا ہے، بلکہ اپنی صحت بہت بہتر رکھی جا سکتی ہے۔ یہ آپ کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ آپ خود دل کی مہلک ترین بیماری CAHD میں مبتلا ہونا چاہتے ہیں یا اس کے امکان کو کم سے کم کر دینا چاہتے ہیں، صحت مند رہیں یا مستقل بیمار رہیں۔ ڈاکٹروں کے مطب کے چکر لگائیں اور پیسہ برباد کریں۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزاریں یا اُن کو داغِ مفارقت دے جائیں۔ یہ فیصلہ آپ کا اپنا ہونا ہے اور آپ خود اس کے ذمہ دار ہیں۔

سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ابتدائی تعلیم کا زمانہ ہی وہ زمانہ ہے جب بچہ بہت کچھ سیکھنے اور جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس زمانے میں ہم اپنے بچوں کی تعلیمی ضروریات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ جس وقت ان کے یہاں تجسّس اور اثر پذیری زیادہ ہوتی ہے اس وقت ہم ان کی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دیتے اور جن اسکولوں میں (انگریزی میڈیم) توجہ دی بھی جاتی ہے تو وہاں صرف ایک غیر ملکی زبان کی تدریس پر ہی زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ انگریزی میڈیم اسکولوں کا تجربہ اس لحاظ سے بھی کامیاب نہیں ہو سکتا کہ بچے جتنا وقت اسکول میں گزارتے ہیں اس سے تین گنا زیادہ وقت اسکول کے باہر گزارتے ہیں جہاں انگریزی بولنے یا سننے کا موقع نہیں ملتا اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اچھی طرح انگریزی سیکھ پاتے ہیں اور نہ ہی انھیں اپنی مادری زبان کو پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔

اگر نتائج سے طریقوں کی صحت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو بہتر ہے کہ ہم کو ان اسکولوں کے ہائر سکنڈری کے بچوں کا مقابلہ انگلستان کے مینیہ کیمبرج کے طلباء سے کرنا چاہیے جو اُن کے Counter Parts ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ فرق صاف طور پر نظر آ جائے گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان بچوں کی مادری زبان انگریزی ہوتی ہے اور انھیں انگریزی بولنے اور سمجھنے کے لیے چار پانچ سال صرف کرنے نہیں پڑتے وہ اک دم سے علوم کی طرف متوجہ کر دیے جاتے ہیں اور یہاں ہم انھیں پانچ سال تک انگریزی زبان سکھاتے رہتے ہیں اور اس درمیان میں جب کچھ جاننے کا شوق ختم ہو جاتا ہے تو پھر ہم چاہتے ہیں کہ اس زبان کے ذریعہ وہ کچھ جانیں۔

میں انھیں "مصنوعی بچے" کہوں گا۔ جب یہ مصنوعی بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے دفتروں اور دوسرے اداروں میں جاتے ہیں تو اُن کا سارا طریقۂ کار مصنوعی رہتا ہے۔ یہ ایک اجنبی ماحول میں رہتے ہیں۔ آس پاس کی ہر چیز کو حقارت سے دیکھتے ہیں۔

میں اُن انگریزی اسکولوں کا مقابلہ مادری زبان کے اسکولوں سے جان بوجھ کر نہیں کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریزی اسکولوں میں جیسی بھی ہو تعلیم تو ہوتی ہے۔ مادری زبان کے اسکولوں میں تعلیم کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان گاؤں میں بستا ہے۔ اگر ہم گاؤں کے اسکولوں کو دیکھیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ آزادی کے بعد جب گاؤں میں بڑے پیمانہ پر اسکول کھولے گئے تو خیال ہوا کہ اب تعلیم عام ہو جائے گی۔ لیکن جب وہاں مدرس رکھے گئے تو یہ معلوم ہوا کہ ان کی تنخواہیں جھاڑو دینے والوں سے بھی کم ہیں چنانچہ یہ کام ان لوگوں کے حصے میں آیا جو اس معاشرے میں ایک طرح سے رد کر دیے گئے تھے۔ ان کے لیے بہترین موقع تھا کہ وہ اپنی ساکھ جمائیں۔ اُدھر ہم نے بالغ رائے دہندگی کے حق کو بھی تسلیم کر لیا تھا، نتیجہ چناؤ میں ووٹ دینے اور لینے کا تھا۔ یہ چناؤ پارلیمنٹ سے لے کر گاؤں پنچایت تک چل پڑے گویا گاؤں کی زندگی میں چناؤ آئے دن کی بات ہو گئی۔ اب اس کے لیے ایک کل وقتی کارکن کی ضرورت ہوئی۔ لیکن یہ معاشرہ کل وقتی کارکن کو پیشہ ور سمجھ کر نظر انداز کر سکتا تھا۔ اس لیے بہر بھ کہ نظر استاد پر پڑی جو اپنی قلیل تنخواہ کو کسی دوسرے طریقے سے supplement کرنا چاہتا تھا۔ سیاسی جماعتوں نے اسے اچک لیا۔ اب تعلیم کا کام دوسرے ہی نہیں تیسرے اور چوتھے درجے پر آ گیا۔ اس لیے کہ گرو جی کا پہلا فرض تو نیتا جی کا الیکشن لڑانا ہے (یہ حقیقت ہے کہ انگریزوں کے زمانے میں جن گاؤں میں اسکول تھے وہاں گرو جی کا کام ڈاک بانٹنا بھی تھا) — یہ بات نہیں کہ ہماری حکومت کو اس کی خبر نہ ہو لیکن جب تعلیم کی اہمیت اور خصوصاً ابتدائی تعلیم کی اہمیت صفر کے برابر ہے تو پھر اس پر توجہ دینے کی کیا ضرورت۔

یہ سچ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی لیکن

جب پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی ہے تو دیوار کی کجی کو کیسے روکا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں یونیورسٹی میں جو طالب علم آتے ہیں ان کا بھی سب سے بڑا مسئلہ زبان ہے۔ انھیں کوئی زبان نہیں آتی۔ اُن سے جب کہا جاتا ہے کہ آپ کی مادری زبان کیا ہے؟" تو وہ بڑی شان سے اپنی مادری زبان کا نام لیتے ہیں۔ لیکن جب اُن سے آگے سوال کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسے واجبی واجبی ہی جانتے ہیں۔ اردو بولنے والے بچے تو اور زیادہ بدنصیب ہیں کہ وہ اپنی زبان کو پڑھ بھی نہیں سکتے۔ کیا دنیا میں کسی اور ملک میں بھی یہ ممکن ہے کہ یونیورسٹی میں تعلیم پانے والے نوجوان اپنی مادری زبان کو پڑھنے سے قاصر ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ صورتِ حال کسی بھی حکومت کے لیے شرمناک ہے کہ اُس ملک کی آبادی کا اچھا خاصہ حصہ اپنی مادری زبان کو نہ پڑھ سکے۔ میں اسے "بدتہذیبی" کہوں گا جو کسی زندہ زبان کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا ہے۔

اردو سے تو خیر عدم توجہی کے اسباب نظر بھی آ سکتے ہیں لیکن ہندی زبان کو اچھی طرح نہ سکھانا، یہ کسی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ ہم نے انگریزی کو تو تیزی کے ساتھ ہٹانے کی کوشش کی، لیکن ہندی کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ یہ پوری نسل گونگی ہے جو بول نہیں سکتی۔ میں جنوبی ہندستان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن شمالی ہند کے ان علاقوں کے بارے میں جانتا ہوں جو ہندی کے علاقے کہلاتے ہیں۔

ہندی والے اردو کو ہندی کی ایک شیلی کہتے ہیں۔ یہ بات اگر مان لی جائے تو پھر رسم خط ہی کا مسئلہ رہ جاتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ہندی کے علاقوں میں ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ آزادی سے پہلے یو۔ پی، بہار، دہلی، سی۔ پی وغیرہ کے علاقوں میں استاد بول چال کی زبان میں تعلیم دیتا تھا جسے مہاتما گاندھی ہندوستانی کہتے تھے اور وہ جسے ہندستان کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے۔ یہ بول چال کی زبان (اس کا کوئی بھی نام رکھ لیجیے) تو استاد کی زبان تھی جس میں وہ پڑھاتا تھا اور بچوں کے پاس اردو اور دیوناگری رسم خط میں کتابیں موجود ہوتی تھیں۔ جو بچے دیوناگری رسم خط جانتے تھے وہ دیوناگری رسم خط کی کتاب پڑھتے تھے اور جو اردو رسم خط سے آشنا ہوتے تھے وہ اردو رسم خط کی کتاب پڑھتے تھے۔ یہ درسی کتابیں ایک ہی مصنف کی لکھی ہوتی تھیں اور استاد کی زبان کا مسئلہ کبھی بھی اختلاف کا مسئلہ نہ بن سکا، اور نہ اس طرح پڑھانے پر کبھی بحث ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک اور طریقہ رائج تھا۔ آٹھویں جماعت تک ہر بچے کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو یا ہندی میں سے کوئی ایک زبان پڑھے۔ یہ عُرفِ عام میں ورنیکلر فارم کا کلاس کہلاتا تھا۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا تھا کہ ہندی جاننے والے بچے اردو رسم خط سے آشنا ہو جاتے تھے اور اردو جاننے والے بچے ہندی رسم خط سے سیکھ لیتے ہیں۔ اس طرح ان اسکولوں کے بچے اپنے آپ کو دونوں زبانوں سے واقف کہہ سکتے ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ یہ طریقہ آج کیوں رائج نہیں کیا جا سکتا کم از کم پرائمری سطح پر تو اس کو رائج کیا جا سکتا ہے۔ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ اگر ہمارا آئین مذہب کا احترام کرنا سکھاتا ہے تو پھر زبان کے ساتھ بدسلوکی کیوں کی جائے۔

آج شمالی ہند کا ہر بچہ ہندستانی زبان کو با آسانی سمجھ سکتا ہے۔ اگر ہندی والے اسے ہندی کہہ کر خوش ہوتے ہیں تو میں بھی ملکی سنسد، بورڈ کی طرح اس زبان کو ہندی کہنے سے گریز نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ ہندی ہندستانی فلمی کی ہندی ہو نہ کہ آل انڈیا ریڈیو کی ہندی۔ چنانچہ اس ہندی میں استاد سبق دے اور حکومت کا فرض ہے کہ دونوں رسم خط میں درسی کتابیں موجود ہوں۔ اِس طرح اردو بو

تہذیب الاخلاق دور اول کے موضوعات اور مضمون نگار

رخ علی جلالی
شعبہ تاریخ

تصویر مصور کے ذہن اور ذوق کا مرقع ہوتی ہے۔ رنگ اور لم کے امتزاج منظر اور پس منظر کو بہتر طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ سرسید کی میت کا جو تاثر ہمارے ذہنوں میں ہے اس میں تہذیب الاخلاق کو من مقام حاصل ہے۔ آج سے ایک سو بارہ برس پہلے سرسید نے لندن کا فر کیا۔ انگلستان میں انھوں نے بصیرت میں مسرت تلاش کی۔ وہاں ھوں نے کچھ یورپ کو دیا اور کچھ مغرب سے لیا۔ مانگے کے حسن میں تعلیم کا نصوبہ اور ایک رسالہ کا تخیل بھی تھا۔ سرسید نے لندن میں دیکھا کہ لوم اور صنعت کی ترقی اور قوت کے پیچھے اخبار و رسائل کی زبان لزا ور موضوعات کے تنوع نے ذہنی افق کو بہت کچھ وسیع کیا ہے سرسید ۱۸۷۰ء کے آخر میں واپس آئے تھے۔ انھوں نے آتے ہی رسالہ تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا۔ مقصد کے بارے میں سرسید فرماتے ہیں،

" اس پرچہ میں صرف مضامین مفیدہ جو مسلمانوں سے متعلق ہیں چھاپے ہوتے ہیں اور اس سبب سے اخبار امصار و دیار اس میں مندرج نہیں ہوتے۔ مقصود اس پرچہ کے اجرا سے یہ ہے کہ مسلمانوں کے حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں، وہ بھی مٹا دیے جاویں"۔

[اطلاع بخدمت ممبران وخریداران وناظرین تہذیب الاخلاق]

سرسید لندن کی واپسی کے بعد ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۶ء تک بنارس میں صدر الصدور درجہ اول رہے۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج [مدرسۃ العلوم مسلمانان] کا افتتاح ہوا۔ ۱۸۷۶ء میں جب سرسید ریٹائر ہو کر علی گڑھ آگئے تو انھوں نے بعض مصالح اور ضرورتوں کے پیش نظر تہذیب الاخلاق بند کر دیا۔ اب ایک دوسرا اخبار مسمیٰ 'اخبار سائنٹفک سوسائٹی' ان کے قبضہ اختیار میں تھا'

بقیہ مضمون " تعلیم کے مسائل "۔

والوں کو بہلانے کے لیے کسی اکیڈمی کی ضرورت نہ ہوگی اور اس طرح اردو بولنے والوں میں علیحدگی پسندی کا رجحان نہ صرف ختم ہوگا بلکہ قومی یک جہتی کے جذبے کو فروغ ملے گا۔

ہندوستان کے آئین میں ہر زبان کو قومی اور سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ آئین کے آٹھویں شیڈول میں جو زبانیں مندرج ہیں وہ سب کی سب قومی اور سرکاری زبانیں ہیں اور اُن میں سے کسی کی طرف بھی عدم توجہی آئین سے بے انصافی برتنے کے مترادف ہے۔ رہ گیا دفتری زبان کا معاملہ، اسے بھی آپسی بات چیت سے حل ہونا چاہیے۔

یہ طے ہے کہ اگر ہم اپنے معیارِ تعلیم کو بلند کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنے ذریعہ تعلیم کا مسئلہ سب سے پہلے حل کرنا چاہیے۔ میں سرسید کے ایک قول پر اپنے اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔

آنے والے زمانے کی یادگاری کے واسطے میرے
یہ الفاظ ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر جلی حرفوں سے لکھ
دیے جاویں کہ تعلیمی ترقی اسی وقت ممکن ہے جب
ساری تعلیم مادری زبان میں ہو"۔

۱۹۶۶ء سے شائع ہو رہا تھا۔ تہذیب الاخلاق اردو کا پہلا رسالہ تھا جس میں نظر کو خبر پر ترجیح دی گئی تھی اور جس کے اثرات اور مخالفت نے ایک طوفان بپا کر دیا۔ اس بھونچال سے بہت سے غزلیے ابل پڑے۔

تہذیب الاخلاق کے مندرجہ ذیل چار خاص موضوع تھے

(۱) تعلیم

۲۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی تحریک کی رفتار

۳۔ معاشرت   ۴۔ مباحث دینی۔

انیسویں صدی علما کے درمیان بعض بنیادی عقائد اور زیادہ تر فروعی مسائل پر جتنے مباحثے ہوئے۔ حد یہ ہے کہ بعض مناقشوں میں تبدیل ہو گئے۔ سرسید نے بعض اہم مذہبی موضوعات پر کھل کر مضامین لکھے جس کی وجہ سے وہ مطعون اور مخالفت کے مورد رہے۔ سرسید کے عقائد مذہبی ہر زمانہ میں بحث کا موضوع ہو سکتے ہیں لیکن عشق رسول سے سرشار ہو کر انھوں نے خطباتِ احمدیہ نام کی کتاب اردو اور انگریزی میں چھپوائی اس کا جواب یا اعتراض نہ طبقہ علما کی طرف سے ہوا نہ کسی اور طرف سے ممکن ہو سکا۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں جن مباحث دینی پر لکھا اس میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ الاسلام ہو الفطرت۔ ۲۔ الدین یسر۔ ۳۔ النظر فی رسالۃ الغزالی۔ ۴۔ الوحی والالہام ۵۔ ہو الموجود۔ ۶۔ دین اور دنیا کا رشتہ۔ ۷۔ طبقات علوم الدین ۸۔ عبادات۔ ۹۔ کتب الاحادیث۔ ۱۰۔ احادیث ۱۱۔ غیر معتمد احب ایانی

اس طرح یہ فہرست خاصی طویل ہو سکتی ہے۔

اسی طرح معاشرت اور تہذیب کے موضوعات پر سرسید، مشتاق حسین (وقار الملک) مہدی علی (محسن الملک) عنایت الرحمٰن، سید محمد محمود، چراغ علی، حالی، محمد حکمت اللہ نجف علی سہسرامی، غلام حیدر، خواجہ محمد یوسف، غلام محمد اور دوسرے حضرات نے جو کچھ لکھا وہ آج بھی اہم ہے

مغربی مصنفین میں بکل او گیزو کی تہذیب ... من کی تاریخ کے ترجمے اور ملخصات بھی شائع ہوتے رہے۔ بعض انگریز مضمون نگاروں کے مضامین کی تلخیص اور ترجمے بھی شائع ہوئے۔

تہذیب الاخلاق میں معاشرت اور تہذیب کے موضوعات پر جو مضامین چھپے اس میں سے چند کی فہرست یہ ہے۔

۱۔ تدبیر فلاح ۲۔ شیریں زبانی ۳۔ دوستی ۴۔ طریقۂ زندگی۔ ۵۔ سستی کا برتاؤ ۶۔ اعتدال ۷۔ افسوس مسلمانوں کے حال پر ۸۔ مباحثہ نئی تہذیب اور پرانے خیالات کا ۹۔ تہذیب و شائستگی۔ ۱۰۔ مسلمانوں کا افلاس ۱۱۔ خودغرضی اور قومی ہمدردی ۱۲۔ تہذیب ۱۳۔ اپنی مدد آپ ۱۴۔ نامہذب ملک اور نامہذب گورنمنٹ ۱۵۔ زمانہ ۱۶۔ طریقۂ تناول طعام ۱۷۔ تدبیر و امید ۱۸۔ نصیحت کا صلہ ۱۹۔ مسلمانوں کی قسمت ۲۰۔ عام محبت یعنی غیر مذہب والوں کے ساتھ محبت اور دوستی ۲۱۔ ریا ۲۲۔ مخالفت ۲۳۔ تہذیب ۲۴۔ سخاوت اور گداگی ۲۵۔ عزت

ان مضامین کے عنوانات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تہذیب الاخلاق کا دائرہ کتنا وسیع تھا۔ مغربی مصنفین کے مضامین اور کتابوں سے جو اخذ و ترجمے شائع ہوئے ہیں وہ بھی اہم ہیں۔ ہنری ٹامس بکل کی تاریخ تہذیب کے بعض حصوں کے ترجمے۔ ایف گیزو کے بعض تقاریر اور مضامین کے ترجمے۔ اسی طرح مندرجہ ذیل مضامین بھی اخذ و ترجمے کے طور پر پیش کیے گئے۔

۱۔ سمجھ
۲۔ تعلیم
۳۔ وحشیانہ نیکی
۴۔ امید
۵۔ گزرتا ہوا زمانہ
۶۔ بحث و تکرار

سرسید نے تعلیم اور کالج پر جو کچھ لکھا، اس کو دوسرے موقع پر پیش کروں گا۔

فضل الرحمٰن
شعبۂ دینیات

شاہ ولی اللہ دہلویؒ
ایک اجمالی تعارف

ملتِ اسلامیہ میں تجدید واصلاح کے مسلسل عمل کی ضرورت کا کون انکار کرسکتا ہے ۔ مگر یہ کام کن خطوط پر ہو اور اس کے اصول ومبادی کیا ہوں، اس کے بارے میں اچھے خاصے ذہنوں میں الجھن پائی جاتی ہے ۔ بعض لوگ اس کے قائل ہیں کہ ماضی اور اس کے تمام تر سرمائے سے جب تک مکمل انقطاع نہ ہو، اصلاح کی ہر کوشش بے معنیٰ ہے ۔ یہ لوگ مسلم معاشرے کو اجتماعی ارتداد کی دعوت دیتے ہیں۔ کیوں کہ اُن کے خیال میں اس کے بغیر دورِ جدید کی برکتوں سے استفادہ ناممکن ہے ۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو ماضی پرست تو نہیں لیکن اُن کا خیال ہے کہ پچھلے چودہ سو سال کا ہر اضافہ نامبارک اور ملت کے جسم کا ناسور ہے اور جب تک چودہ سو سال پہلے کی فکری، تہذیبی، معاشرتی، سادگی و بساطت اپنی اسی شکل اور ہیئت میں واپس نہیں لائی جاتی تب تک حقیقی معنیٰ میں نہ اصلاح ہوسکتی ہے نہ تجدید ۔ پہلے گروہ کے برخلاف یہ لوگ قرآن وسنت کو اپنا محورِ علم وعمل بتاتے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ دونوں گروہ ایک دعوی میں مشترک ہیں ۔ وہ یہ کہ ملتِ اسلامیہ کی چودہ سو سالہ علمی، فکری، تہذیبی تاریخ کو لپیٹ کر رکھنا کسی اصلاحی کوشش کا اوّلین قدم ہے ۔ ملتِ اسلامیہ کے تاریخی تسلسل اور اس کے داخلی اصلاحی میکنزم سے دونوں صرفِ نظر کرلیتے ہیں۔ ان دونوں کے برخلاف شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء - ۱۱۱۴ھ / ۱۷۰۲ء) اُن حضرات کے سرخیل ہیں۔ جن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ زمانہ اور اس کے حقیقی تغیرات ملت کا ارتقا پذیر فکر اور اس کا تاریخی تسلسل ملت کے اجزائے ترکیبی کا مقام حاصل کرلیتے ہیں ۔ چنانچہ ماضی کے سرمایہ سے یکسر صرفِ نظر کرلینا اور اس کی تاریخ سے اُسے بیگانہ کردینا ایسا غیر دانشمندانہ اقدام ہے جو اصلاح وتجدید تو کیا کہلائے گا، ملتِ اسلامیہ کو سرے سے اس کی اساس وبنیاد اور تشخص سے محروم کردے گا ۔ ان کے نزدیک اساسی اصولی اور دائمی عناصر کو برقرار رکھتے ہوئے باقی اجزاء کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کسے باقی رکھا جائے اور کون اپنی معنویت کھو بیٹھا ہے ۔

اصلاح وتجدید کا یہ عمل تحقیق وتنقید کی خارزار اور دشوار گزار وادی سے گزرتا ہے ۔ غیر صالح عناصر کا تعین اور اُن کا اخراج، صالح عناصر کی نشان دہی اور اُن کا ابقاء، اساسی اور اصولی امور کا تحفظ، خارجی اور بے جان امور سے تطہیر، کارآمد اجزاء کو باقی رکھ کر ناکارہ اجزاء کو چھانٹ دینا اور اس پورے عمل میں قرآن اور سنت کو معیار کے طور پر استعمال کرنا علومِ اسلامیہ میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت، مسلم معاشرے کا عمیق مطالعہ اور دقیق تاریخی احساس کا طلب گار ہے ۔ یہ کام مشکل ہے اور تمام تر توانائی چاہتا ہے۔ تن آسانی اور سہل نگاری کی اس میں گنجائش نہیں ۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے یہی کام کرکے دکھا دیا اور بعد میں آنے والوں کے لیے نہ صرف یہ مثال قائم کردی کہ مسلم معاشرے کی تعمیرِ نو کا کام

کیا جاتا ہے بلکہ اُن کی خداداد بصیرت نے آنے والے پورے ایک دور کے ارتقا کے مناہج کا اندازہ لگا کر اپنے اخلاف کے لیے اسلام کو معاشرے کی تعمیر کے لیے ایک زندہ اور فعال قوت کی حیثیت سے برتنے کی راہ بھی ہموار کردی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تین صدیاں گزر جانے کے بعد بھی شاہ صاحب کے طریقہ کار، نتائج فکر اور منہج تحقیق کی معنویت پر پژمردگی طاری نہیں ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کو اس حقیقت کا بخوبی احساس تھا کہ وہ نہ صرف اپنے معاشرے کے لیے کام کر رہے ہیں بلکہ آئندہ دور کے لیے بھی جو پچھلے ادوار سے یکسر مختلف ہوگا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ وہ آئندہ دور کا افتتاح کرنے والی ہستی ہیں۔ اس آئندہ دور کے لیے بھی معنویت رکھنے والے جن امور پر شاہ صاحب نے کام کیا۔ اور اُن امور کو پیش کردیا جو اس قانونی انضباط کے سلسلے میں دور آئندہ میں ایک معاشرے کے لیے بنیاد بن سکتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ احکام کے پس پردہ جو حکمتیں اور مصالح کام کر رہے ہیں اُن کو اس طرح مدون کیا کہ خود بقول شاہ صاحب اُن سے پہلے کسی نے اس کا عشر عشیر بھی نہیں کیا تھا، تصوف یا فن تزکیہ واحسان جو انسان کی باطنی اور داخلی زندگی کے تزکیہ، تطہیر اور نشو ونما کا فن ہے۔ اسے ان خطوط پر استوار کیا جو دورِ جدید کے انسان کی داخلی ضروریات کا متکفل ہو سکتا ہے۔ عقائد وافکار کو جو مذہب کا بنیادی اور اہم ترین حصہ ہوتے ہیں اسے شاہ صاحب نے یونانی منطق اور فلسفہ کی بھول بھلیوں سے نکال کر قرآن اور سنت سے مستفاد دلائل وبراہین سے ثابت کیا۔ انسانی نفوس کی استعدادیں اور عالم کون وفساد میں تصرفات الٰہیہ کے طریقے یہ دونوں وہ باتیں ہیں جن پر شاہ صاحب سے پہلے کسی کا ایسا تفصیلی

بیان نہیں ملتا جو شاہ صاحب کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ علاوہ بریں معاشیات وسیاسیات اور معاشرے کی ابتدائی اکائی یعنی خاندان اِن تینوں کی تنظیموں کے اصول کی تدوین نیز قرآن وسنت اور صحابہ کے آثار کے ذریعہ ان کی تفصیل، تطبیق اور تشریح شاہ صاحب کا خاص فن ہے۔ شاہ صاحب کی ان علمی خدمتوں کا جائزہ لیا جائے تو اُن کا یہ دعویٰ حقیقت سے بعید نہیں معلوم ہوتا کہ وہ ایسی بصیرت کے مالک ہیں جس کے ذریعہ وہ دین کی حقیقی اصلاح کو جو رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عطا کردہ ہے ان امور سے جو بعد کا غیر مستند اضافہ ہیں یا جن کی نوعیت تحریف کی ہے واضح طور پر پہچان سکتے ہیں۔ مزید براں امت کے ایسے شدید اختلافی مسائل کے درمیان جو طالب حق کے لیے ہمیشہ سرگرانی کا باعث رہے ہیں شاہ صاحب نے جمع وتطبیق کی وہ راہ نکالی ہے کہ جس کے مطالعہ سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کی نظر اس امت کے چودہ سو برس پر پھیلے ہوتے علمی فکری اور دینی سرمائے کے بارے میں کتنی ہمہ گیر اور عمیق ہے۔

فقہی مسائل چوں کہ اہم مسائل ہیں اور ایک آدمی ایک وقت میں ایک چیز پر ایک ہی طریقہ سے عمل کر سکتا ہے، اس لیے ان کے بارے میں اختلافات کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کا عمل اور زیادہ دشوار ہے۔ ان کے بارے میں بھی شاہ صاحب کا طرز عمل یہی ہے کہ امکانی حد تک آپ مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ میں باہم اختلافات کو جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ایسا کرنا ناممکن ہو جائے تو شاہ صاحب ان کو سطحی اور غیر حقیقی سمجھ کر اس سے دامن بچا

کوشش نہیں کرتے، بلکہ اُن مسائل کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں اور جو دلیل قرآن وسنت کی رو سے زیادہ قوی ہوتی ہے اور اُن سے زیادہ موافقت رکھنے والی ہوتی ہے، اس کے مقتضا پر عمل کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کا دلائل شرعیہ کا ماخذ یعنی قرآن اور سنت کا مطالعہ نہ صرف گیرائی رکھتا ہے بلکہ وہ اُن کی گہرائی میں اتر کر ان کے بارے میں قوت وضعف کے نقطۂ نظر سے فیصلہ بھی کر سکتے ہیں اور یہ اُن کی اجتہادی صلاحیت کی روشن دلیل ہے۔

شاید ہی کوئی علم، علومِ اسلامیہ میں ایسا ہو جس پر شاہ صاحب نے مجتہدانہ قلم نہ اُٹھایا ہو اور اس پر سیر حاصل اور تسلی بخش گفتگو نہ کی ہو۔ کتنے ہی ایسے مضامین وموضوعات ہیں جن پر بحث کرنے کی اولیت کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کے بارے میں ایسے اچھوتے خیالات کا اظہار کیا جو صرف آپ ہی کا حصہ ہیں۔ اسلام کو ایک ایسے مرتب ومکمل نظام کی شکل میں پیش کرنا جو انسان اور معاشرے کی روحانی، اخلاقی، قانونی، فکری، سیاسی اور معاشرتی ضرورتوں کا کفیل ہے جو سب سے شاید آپ ہی کے طاقتور ذہن کا کارنامہ ہے پھر اس پورے نظام کے ہر اساسی جزو کو انسانی فطرت کا عین تقاضا اور عقل واستدلال کی میزان میں پورا اترنے والا ثابت کرنا آپ کے بڑے کارناموں میں سے ہے۔ اصولِ تفسیر پر جو کچھ آپ نے لکھا اس کا بڑا حصہ فارسی افکار کا مظاہر ہے۔ مضامین قرآن کریم کی تقسیم علوم خمسہ کے اعتبار سے شان نزول کی وہ تعبیر جو قرآن کریم کی آفاقیت اور عالمگیریت کو برقرار رکھے نسخ قرآنی کی حقیقت متعین کر کے قرآن کریم کی آیات ناسخ ومنسوخ پر کلام کرنا۔ قرآن کے طرز بیان اور نسق آیات پر گفتگو ان میں سے ہر چیز وہ ہے جس کی نظیر اصول تفسیر کے پورے ادب میں ملنا مشکل ہے۔ حدیث کی کتابوں کی مختلف طبقات میں تقسیم، امام مالکؒ کی موطا کی تمام کتب حدیث پر ترجیح، اس کا علمی ثبوت فراہم کرنا کہ حدیث قرآن کریم کا بیانِ تفصیلی اور تشریح ہے، یہ وہ چیزیں ہیں کہ شاہ صاحب سے پہلے کے محدثین کے یہاں خال خال ہی ملیں گی، یا بالکل نہ ملیں گی۔ فلسفہ، مذہب اور فلسفۂ تاریخ پر مرتب گفتگو کرنے والے شاہ صاحب پہلے ہندوستانی مفکر ہیں۔

اپنے دور کے معاشرے پر شاہ صاحب کتنی گہری نظر رکھتے ہیں اور مفاسد کن ذرائع سے اور کس حد تک معاشرے میں در آئے ہیں اُس کا آپ کو کتنا صحیح اندازہ تھا یہ آپ کی "التفہیمات الآلہیہ" اور آپ کی وصیتوں سے بڑے واضح طور سے معلوم ہوتا ہے۔ اس دور میں ہندوستان میں مختلف سیاسی قوتوں میں کس جگہ عدم توازن پیدا ہو رہا تھا اور اس کے کیا متوقع نتائج ہو سکتے تھے اور مسلمانوں کے لیے خطرہ بننے والی قوتوں کا زور کس طرح توڑا جا سکتا تھا، اس کی وضاحت کرنے والے اور شاہ صاحب کی سیاسی بصیرت کا شاہ کار آپ کے وہ مختلف خطوط ہیں جو اس سلسلے میں لکھے گئے۔

شاہ صاحب کے فکر کی جامعیت اور اپنے نیز ہمارے دور کے لیے اس کی معنویت نہ کسی مختصر تحریر کا موضوع بن سکتی ہے اور نہ زیر نظر سطور کا یہ مقصد ہے۔ اشارہ صرف اس طرف کرنا مقصد ہے کہ عقل ووجدان یا قلب ودماغ کو حریف قوتیں قرار دے کر نہیں، جیسا اقبال نے کہا ہے، بلکہ ایک کو دوسرے کا حلیف بنا کر جیسا کہ شاہ ولی اللہ نے کہا ہے، اصلاح وتجدید کا کوہ گراں آج بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہ بات عجیب ہے اور افسوس ناک بھی کہ شاہ صاحب جیسی جامع شخصیت پر آج تک اُن کے شایان شان کوئی اچھا یادگار کام نہیں ہو پایا۔ جو کچھ جیسا کچھ ہوا ہے وہ "نسبب دیگراں" ہی رہا ہے

بین مذہبی مناکحت

محمد مجتبیٰ صدیقی
آئی۔ اے۔ ایس
سابق رجسٹرار

ایک مشترک سول کوڈ کے اجراکے لیے ملک میں آزادی کے بعد سے اکثر آواز اٹھائی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کوڈ قوانین شریعت کا پابند نہیں ہوگا۔ اس طرح کا ایک قانون یعنی اسپیشل میرج ایکٹ ۱۹۵۴ء میں بن چکا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس قانون کے تحت رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتا ہے تو نکاح کے تمام ارکان و شرائط جو شریعت نے عائد کر رکھے ہیں نظر انداز ہو جاتے ہیں اور مہر، طلاق، وراثت، اولاد وغیرہ کے مسائل پر قوانین شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ تبنیت، جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے کے متعلق بھی ایک ایسے ہی قانون کا اجراء زیر غور ہے۔ گو اسپیشل میرج ایکٹ کا نفاذ لازمی طور سے مسلمانوں پر نہیں ہوتا اور نہ غالباً تبنیت کے مجوزہ قانون میں کوئی ایسی قرارداد ہوگی لیکن حق اختیار کے حاصل ہونے سے مسلمانوں کے لیے ان احکام شریعت سے جن پر چودہ سو سال سے عمل ہو رہا ہے، انحراف کا راستہ کھل جائے گا۔

اسپیشل میرج ایکٹ کو مسلمانوں نے ابھی اتنا نہیں اپنایا ہے کہ اس کے پس پشت جو خطرہ ہے وہ کھل کر سامنے آ جائے لیکن کچھ تعجب نہیں کہ مستقبل قریب میں یہ ایک وبائی صورت اختیار کرلے۔ مسلمانوں کے ایسے خاندان جو خاندان کے باہر تک رشتۂ مناکحت استوار کرنا معیوب سمجھتے تھے (گو یہ کوئی قابل تعریف بات نہ تھی) اب اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ عواقب کا لحاظ کیے بغیر اُن کے نونہال ایکٹ میں دی ہوئی رخصت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خاندان کے افراد اُن کی روک تھام تو درکنار، خود اُن کی اس "خوشی" میں شریک ہوتے ہیں اور مذہبی غیرت و حمیت یا خاندانی عصبیت کوئی بھی اُن کا راستہ نہیں روکتی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ شریعت کی رو سے مسلمان مرد کا نکاح صرف مسلمان عورت سے اور مسلمان عورت کا نکاح صرف مسلمان مرد سے جائز ہے۔ کتاب اللہ میں مشرک سے نکاح کی ممانعت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔

"تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی شرک کرنے والی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام شرک کرنے والے سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمھیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے ...." (۲—۲۲۱)

اس آیت میں مسلمان مرد اور مسلمان عورت دونوں کے لیے مشرک سے نکاح کی صریحاً ممانعت ہے بلکہ میرے خیال میں یہ اشارہ کہ "یہ لوگ تمھیں آگ کی طرف بلاتے ہیں" ایک طرح سے وعید بھی ہے۔

اس ممانعت کا ایک نفسیاتی پہلو ہے۔ ازدواجی رشتہ ایک ایسا گہرا قلبی تعلق ہے جو اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہونچ سک

ب اس کے ساتھ روحانی تعلق بھی شامل ہو۔ اگر دونوں
ں، یا اُن میں سے کسی ایک کو مذہب سے کچھ بھی لگاؤ
ا ایسے اہم مسئلہ میں اختلاف ہونا دونوں کی زندگیوں کے
س سے زیادہ مضرت رساں ہوسکتا ہے جتنا کہ پیدائش،
زبان یا دنیاوی حیثیت کا فرق۔ اس لیے یہ کہنا بالکل صحیح
ر دونوں فریقوں کا اعتقادی نظریہ ایک ہونا چاہیے۔ اگر دو
ں ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں تو دنیا کے اہم ترین مسائل
اُن کے خیالات میں ایک حد تک ہم آہنگی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ
ا تو ان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل دونوں میں آئندہ چل
دشواریاں پیش آئیں گی۔

مسلمان مرد کو عورت کے مقابلہ میں ایک رخصت بھی دی
ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

> "آج تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کردی گئی ہیں
> اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے، اور تمہارا کھانا
> اُن کے لیے اور محصنات (پاک دامن عورتیں) بھی
> تمہارے لیے حلال ہیں خواہ وہ اہل ایمان کے گروہ
> سے ہوں یا اُن قوموں سے جن کو تم سے پہلے کتاب
> دی گئی تھی۔ ......" (۵-۶)

یہ سوال علیحدہ ہے کہ کن قوموں کا شمار اہل کتاب میں ہے۔ یہود و نصاریٰ کا ذکر بحیثیت اہل کتاب قرآن کریم میں ہے اور عام طور سے یہی لوگ اہل کتاب مانے جاتے ہیں۔ لیکن کتاب اللہ میں کئی مقامات پر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر امت کے لیے رسول بھیجے ہیں:

> "ہر امت کے لیے ایک رسول ہے...." (۱۰-۴۷)

> "ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا...." (۱۶-۳۶)

بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت کاملہ اسی کی مقتضی بھی تھی کہ اس کا پیغام لانے والے صرف جزیرۃ العرب ہی کے لیے مخصوص ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ دنیا کی اور قومیں بھی ان سے فیضیاب ہوں ...
ان رسولوں کو کتابیں بھی دی گئی تھیں یا نہیں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ لیکن اغلب ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا دستور جزیرۃ العرب کے لیے تھا، ویسا ہی کرۂ ارض کے اور خطوں کے متعلق بھی رہا ہو اور کتابیں دی گئی ہوں، مگر غالباً وہ ضائع ہوگئیں۔ انجیل مقدس کو ہی لیجیے۔ حضرت عیسیٰؑ کے فوراً ہی بعد وہ ضائع ہوگئی اور اس کی جگہ اُن کے حواریوں کی تصنیف کردہ کتابوں نے لے لی جن کو انجیل کے نام سے موسوم کیا گیا۔

ہندوستان کے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کا خیال ہے کہ یہ ملک بھی اس برکت سے محروم نہیں رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے رگ وید کی ایک مشہور دعا "گایتری" کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ تو بہتوں نے بانگ درا میں پڑھا ہوگا مگر علامہ نے اس پر جو شذرہ لکھا ہے اس کے ساتھ اگر نظم پڑھی جائے تو اُس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ شذرہ چونکہ بانگ درا کے عام ایڈیشنوں میں نہیں ملتا۔ اس لیے ہم اس کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتے ہیں:

> "ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور
> مشہور منتر کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں
> یہ دعا اعتراف عبودیت کی صورت میں گویا اُن
> تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظام عالم کے حیرتناک
> مظاہرہ کے مشاہدہ سے اوّل اوّل انسانِ ضعیف
> البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا...... یہی وہ
> دعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی
> جاتی ہے...... حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت
> کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنۂ عالم میں
> وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت
> مشکل ہے...... اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر"

استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ "آفتاب" رکھا ہے۔ لیکن اِس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے مادّی آفتاب کسبِ ضیا کرتا ہے اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیا نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن شریف میں آیا ہے اللّٰہُ نورُ السّمٰوٰتِ والارض ۔
اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ " اللہ تعالیٰ ایک نور ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ خود نظر نہیں آتا ......"
شذرہ کا اتنا ٹکڑا لکھنے کے بعد طوالت کے خوف کو نظر انداز کر کے نظم بھی ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

آفتاب

اے آفتاب روحِ روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو
باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمنِ ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
تیرا کمال ہستی ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا تیری نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

آپ دیکھیں گے کہ نظم کے ہر شعر سے وحدانیت ہی یہاں کا اظہار ہوتا ہے، کہیں کوئی شائبہ شرک کا نہیں ہے۔
شذرہ کے آخر میں علامہ تحریر فرماتے ہیں: "میں ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گرداننا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا۔" بیشک نظم کے پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ علامہ کا خیال صحیح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل ہندو مذہب کے اعمال اس سے بہت کچھ مختلف ہو گئے ہیں۔
یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جو رخصت مرد کو کتابیہ سے نکاح کرنے کی دی گئی ہے وہ عورت کے لیے ممنوع کیوں ہے میرے خیال میں اس میں ایک حکمت مضمر ہے۔ عورت کو مرد کے برابر درجہ دینے کی زمانہ حال میں بڑی کوششیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں اور خالص نظری اعتبار سے برابری کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر دیا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے، اور میدانِ عمل میں مرد کا تفوق بدستور قائم ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے

"...... عورت کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے۔ ......" (۲: ۲۲۸)

کوئی بھی ادارہ ہو اس کو کامیابی سے چلانے کے لیے کسی ایک شخص کی سربراہی ضروری تسلیم کی گئی ہے مگر ہر شخص کو برابری کا درجہ دے دیا جائے تو جتنے منہ ہوں گے اتنی باتیں، اور نتیجہ سوائے انتشار کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اسی طرح انسانی معیشت

ما میابی سے چلانے کے لیے چھوٹی سے چھوٹی اکائی جو قائم کی گئی ہے
خاندان ہے اور اس کا بھی ایک سربراہ ہونا چاہیے ۔ مرد ہی سربراہ
ہ ۔ ظاہر ہے کہ خاندان میں جس کو تفوق حاصل ہوگا اسی کے مذہب کو
الادستی بھی حاصل ہوگی ۔ اس کے عقائد، عادات اور اطوار کا اثر
ل خاندان اور خاص کر اس کی اولاد اور زوج پر پڑے گا ۔ اس لیے
ر شوہر غیر مسلم ہے اور بیوی مسلمان تو شوہر کے عقائد کا اثر اولاد اور
بیوی پر پڑنا ضروری ہے۔ ملکی قانون اب یہ ہے کہ اولاد کا وہی
مذہب ہوگا جو شوہر کا ہے ۔ اسلامی شریعت اس بات کو پسند
نہیں کرتی کہ جس ماحول میں کفر و شرک کا دور دورہ ہو اس میں ایک
مسلمان عورت نکاح کر کے مجبوری کی زندگی بسر کرے اور اس کی اولاد
دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے۔

لیکن اگر کوئی مسلمان ان واضح احکام کے ہوتے ہوئے
ان کی خلاف ورزی کرے تو کیا صورت ہوگی ؟ شیعہ فقہ میں تو
ایسے نکاح باطل مانے جاتے ہیں۔ یعنی سرے سے اُن کا انعقاد ہی
نہیں ہوتا اور یہی حکم مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ میں ہے ۔ بہ الفاظ
دیگر مرد اور عورت دونوں زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن حنفی فقہ
میں ایسے نکاح باطل نہیں بلکہ فاسد سمجھے جاتے ہیں یعنی نکاح
منعقد ہو جاتا ہے اور اس نکاح فاسد سے اگر اولاد ہو گئی تو اس
کا نسب باپ سے ثابت مانا جاتا ہے لیکن صاحبین (امام یوسف
و امام محمد) کو اس سے اختلاف ہے اور وہ دوسری فقہوں کی
طرح ایسے نکاح کو باطل کہتے ہیں۔ غالباً امام ابوحنیفہ یہ کہنا چاہتے
ہیں کہ شریعت کی سخت ممانعت کے باوجود بھی اگر ایسے نکاح واقعتاً
وقوع پذیر ہوتے ہیں تو اُن کو باطل قرار دینے میں یہی نہیں کہ
سماج میں ایک انتشار پیدا ہوگا بلکہ والدین کے گناہ کی سزا اُن
کی بے گناہ اولاد کو بھگتنا پڑے گی

لیکن اس رعایت کے باوجود فقہ حنفی اِس بات کی اجازت
نہیں دیتی کہ فاسد نکاح قائم رہے بلکہ قاضی کے لیے تاکید ہے
کہ فریقین کو اپنے سامنے طلب کرے اور جس فرد سے نکاح جائز
ہو اس کو اِسلام لانے کی ترغیب دے اگر وہ قبول نہ کرے
تو فریقین میں علیحدگی کرا دے۔

یہاں تک تو اِس مسئلہ پر مذہبی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی
گئی ۔ اب اس کے سماجی پہلو کو دیکھیے ۔ ابھی کل بات ہے کہ مسلمان
اس شخص سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے میں احتراز کرتا تھا جس
سے نکاح شرعاً ممنوع ہو ۔ ایک مثال محمدؐ علی جناح کی لے لیجیے
ان کو بھی مذہب کی پاسداری اس درجہ منظور تھی کہ انھوں نے
ایک پارسی خاتون سے نکاح کیا تو اُن کے اِسلام لانے کے بعد گو
اس وقت اسپیشل میرج ایکٹ کا نفاذ نہیں ہوا تھا مگر ایک
اور قانون موجود تھا جس کے تحت ایسے نکاح ہو سکتے تھے مگر
جناح نے مذہب ترک کرنا منظور نہیں کیا لیکن اب یہ حالت ہے
کہ مرد اور عورتیں دونوں یا تو مذہب سے برگشتہ ہوتے جاتے
ہیں یا مذہب پر صرف برائے نام قائم رہ کر اس کے احکام کی
کھلے بندوں خلاف ورزی کرتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ
ہماری مذہب سے ناواقفیت ہے ۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے
متوسط طبقہ پر اکثریت کے مقابلے میں اس کی ذہنی مرعوبیت
طاری ہو گئی ہے ۔ عوام اس بات میں پڑھے لکھوں سے بہتر
ہیں ۔ اُن میں نہ دینی غیرت کی کمی ہے اور نہ اُن پر کسی کی مرعوبیت
طاری ہے ۔ پڑھے لکھے لوگ اپنے مذہبی شعائر پر کاربند ہونے
میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں ۔ یہ ایک طرح کا ذہنی ارتداد ہے
جس کا ہمارا متوسط طبقہ شکار ہو رہا ہے ۔ ناجائز نکاح اس ارتدا
کی طرف دوسرا قدم ہے ۔ مسلمان عورت کے لیے غیر مسلم معاشرے
میں اپنے مذہب پر قائم رہ جانا ایک بہت مشکل کام ہے ۔ مرد
مسلمان ہو تو وہ بھی اپنی مشرک شریک حیات کے عقائد سے اثر
پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ ممکن ہے ایسے نکاح اوّل اوّل
کامیاب نظر آئیں مگر اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ کچھ عرصہ

کے لیے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک مشغلہ ہاتھ آجاتا ہے اور انسان ایک نئی دنیا میں پہونچ کر سب کچھ بھول جاتا ہے۔ لیکن بعد میں جب یہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے تو عواقب سامنے آنا شروع ہوتے ہیں۔ بیگم صالحہ عابد حسین نے اپنے ایک مضمون میں جو انھوں نے اس موضوع پر اخبار قومی آواز میں کچھ دن ہوئے لکھا تھا اس مسئلہ کا جائزہ صرف سماجی نقطۂ نظر سے لیا ہے۔ انھوں نے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے نکاح عام طور سے کامیاب نہیں ہوتے۔ تعجب کی بات ہے کہ جس بات کی شریعت سختی سے مخالفت کرتی ہے اور جس کا عملی تجربہ سماجی نقطۂ نظر سے بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا ہم اس کو اپناتے جا رہے ہیں ایک طرف تو ہم قرآن کریم کو خدا کا کلام مانتے ہیں لیکن دوسری طرف ہم اس کے احکام سے صرف لاپرواہی نہیں برتتے بلکہ عمداً اس کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں شریعت سے اس انحراف کی سب سے بڑی وجہ ہماری مذہب سے ناواقفیت ہے۔ بچے کا سب سے اول مدرسہ ماں کی گود ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ لڑکیاں شریعت کے احکام سے آشنا کی جائیں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دینی تعلیم ضروری ہے کیوں کہ اردو نہ صرف ہماری مادری زبان ہے بلکہ ہمارا سارا مذہبی لٹریچر اسی میں ہے۔

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ مذہبی تعلیم جس طرح ہم لڑکیوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں ویسے ہی لڑکوں کے لیے بھی ضروری ہے۔ مذہبی لٹریچر کو ہندی میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یہ امر ضرور قابلِ ستائش ہے مگر اس میں اتنا وقت لگ جائے گا کہ ہماری نئی نسل مذہب سے بالکل بیگانہ ہو چکے گی۔ عربی خط سے اس قدر تو ہر مسلمان کو آشنا ہونا پڑے گا کہ کتاب اللہ کو اس کی اصلی زبان میں پڑھ سکے۔ عربی زبان کو بھی جہاں تک ہمارے محدود ذرائع اجازت دیں سیکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جسٹس محمود عربی کے فاضل تھے۔ وہ قرانی لٹریچر سے براہ راست استفادہ کر سکتے تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کے فیصلے آج تک نظیر مانے جاتے ہیں۔ ایک جج کی اُن کے متعلق رائے تھی کہ "اگر کسی خاص مذہبی حکم" کی انھوں نے کسی خاص طریقہ سے تشریح کی ہے تو ہمارے لیے اُس کو مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔" ان کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ہندو شاستروں کے متعلقات فیصل کرنے کے لیے انھوں نے سنسکرت پر عبور حاصل کیا اور اس کے بعد شاستروں کی مروجہ تفاسیر کے اغلاط پر اُن کے ماخذ کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طلبا کو دینیات کی اعلی تعلیم بی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تک دی جاتی ہے یعنی اس کے بعد ان کا شمار دین کے فقہا میں کیا جانا چاہیے۔ مگر تعجب ہے کہ اُن اونچے درجوں کے طلبا کے لیے عربی جاننا لازمی نہیں۔ یہی[1] نہیں بلکہ اساتذہ کے لیے بھی عربی جاننے کی قید نہیں ہے۔ دین کی ادھوری تعلیم سے دینی ذوق تو خیر کیا پیدا ہوگا البتہ اس سے یہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ کہیں دین کے خلاف طلبا میں استہزا کے جذبات نہ پیدا ہو جائیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے علماء اور دوسرے دین دار حضرات کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہیے سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے سمجھا کر۔ چور کو چور کہیے تو تو آپ ایک حقیقت بیان کرتے ہیں مگر چور اپنی اس تعریف سے کبھی خوش نہ ہوگا اور نہ چوری سے توبہ کریگا معاشرے کی بہت سی برائیاں محض اس لیے فروغ پاتی ہیں کہ اُن سے کوئی منع کرنے والا نہیں ہوتا اگر کوئی منع بھی

---

[1] دینیات کی فیکلٹی کے درجات میں پہلے بھی عربی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور اب بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ بیچ میں ایک دور ضرور ایسا گزرا ہے جب فیکلٹی کے درجات کے لیے کتابیں اردو میں تھیں اور عربی زبان بھی سکھائی جاتی تھی۔ (ادارہ)

[redacted]

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی - ادارہ یا درس گاہ؟

عتیق احمد صدیقی
شعبۂ اردو

قوموں کی تعمیر و تشکیل میں تعلیم کی جو اہمیت ہے، اس کا ذکر کرنا آج تحصیل حاصل ہے۔ گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ عالم نے ثابت کر دیا کہ سورمائی اور قوت آزمائی کا دور ختم ہو چکا۔ عددی اور افرادی قوت و کثرت بھی بہت زیادہ اہمیت کی چیز ہیں۔ رہ گئی جہد للبقا کے لیے جسمانی طاقت، جوش و خروش اور شجاعت و مردانگی کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ گئی ہے وہ دور ختم ہو گیا جب کوئی سورما اٹھتا تھا اور گرز و تلوار لہراتا ہوا، دشمنوں کو تہ تیغ کرتا ہوا، اپنی بہادری کے ڈنکے بجاتا ہوا، قریہ قریہ اپنے جھنڈے گاڑتا چلا جاتا تھا اور ایسے ہی بادشاہ اور حکمراں قوموں کو روندتے اور ملکوں کو فتح کرتے چلے جاتے تھے۔

اب عقل کی حکمرانی ہے اور اس کی عسکری قوت ہے علم۔ تجارت ہو یا زراعت، صنعت ہو کہ حرفت، حکمرانی ہو کہ جہانبانی، فتح و کامرانی کے علم اب اسی لشکر کے ہاتھ میں ہیں۔ عالمی نقشہ پہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو قومیں ذرا جلد خواب غفلت سے بیدار ہو گئیں اور علم و عقل کو اپنا رہنما بنایا وہ آگے بڑھتی اور ترقی کرتی چلی گئی ہیں۔ انھوں نے بڑی بڑی آبادیوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنایا خشکی و تری پر حکمرانی قائم کی۔ ہواؤں کو مسخر کیا، خلاؤں میں تگ و تاز کی اور ان کی ترقیات پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ اور یہ سارے جہاں اب ہماری گرد راہ ہوں گے۔

ہندوستانی مسلمان نے یہ آواز صرف گزشتہ صدی میں سنی اور بقول سرسید "کچھ کسمسائے کچھ کلبلائے"۔ اکثر نے اس آواز کو واہمہ، گمراہی اور دنیا پرستی سے تعبیر کیا اور اس لیے لغو، بے مفید اور ناقابل اعتنا قرار دیا اور کروٹ بدل، منہ ڈھانپ، پھر سو گئے۔ بڑی تعداد اب بھی خواب غفلت کے مزے لے رہی ہے مگر جن کی چشم بصیرت اور گوش حقیقت نیوش وا تھے، انھوں نے صورت حال کو جانے اور سمجھنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کی۔ وہ بلبلائے نہیں بلکہ تلملائے اور بیدار ہو کر کمربستہ ہو گئے۔ ان کے

بقیہ "بین مذہبی مناکحت" مضمون

کرتا ہے تو دوزخ کے عذاب کی دھمکی دے کر۔ دوزخ کا عذاب حق ہے مگر ایسے نامہ کو لاتقنطوا من رحمۃ اللہ کا ارشاد ربانی نہیں بھولنا چاہیے

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ایسے ملکی قوانین کے خلاف جن کی زد براہ راست یا ضمنی طور پر قوانین شریعت پر پڑتی ہو ہم کو مسلم معاشرے کو باخبر کرنا چاہیے اسپیشل میرج ایکٹ ہی کو لیجیے۔ ہمارے لیے کوئی امر اس آواز کے اٹھانے سے مانع نہیں ہے کہ ہم اس کی بخشی ہوئی آزادی سے محروم کر دیے جائیں۔ اس کے لیے اگر دستور میں ترمیم کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرائی جائے۔

دلوں میں ذاتی اور انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہمدردی کے جذبات کا طوفان امڈ آیا۔ ذاتی اغراض کی جگہ ایثار و قربانی نے لی اور قومی فلاح کی تدبیریں سوچی جانے لگیں۔ سر سید نے ایک موقع پر کہا:

"میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قوم کی حالت درست ہو، دور دراز سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہو سکا ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا۔ سب سے اول یہی تدبیر سوچی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ سے ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔"

یہ صرف ایک رومانی تصور نہیں تھا بلکہ سر سید تحلیل و تجزیہ کے بعد اس علمی نتیجہ تک پہنچے تھے۔ مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی دی گئی انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہر فلاح، ہر بہتری اور ہر خوبی کا سرچشمہ علم ہے اور جب تک علوم کی ترویج عام نہیں ہوگی اس وقت تک کسی بہبود اور ترقی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ یہ امر بھی واضح تھا کہ کسی ایک مدرسہ یا کالج کے قیام سے کوئی ملک گیر فائدہ نہیں حاصل کیا جا سکتا کہ نہ سارے ملک کے طلبا یہاں آ سکتے ہیں اور نہ سب کے لیے یہاں گنجائش نکل سکتی ہے۔ اِس لیے انھوں نے اس مدرسۃ العلوم کو ایک ایسی تعلیم گاہ یا درس گاہ نہیں بنانا چاہا کہ جس کا مقصد مروجہ علوم کی تعلیم دے کر طلبا کو صرف ڈگریاں اور اسناد دینا ہو، جن کے وہ چھوٹی موٹی نوکریاں حاصل کر سکیں بلکہ وہ اسے ایک اعلیٰ علمی ادارہ بنانا چاہتے تھے، جو عالموں کی ٹکسال بن جائے۔ حالی نے لکھا ہے:

"وہ (سر سید) چاہتے تھے کہ اس دارالعلوم میں کیمبرج یونیورسٹی کے موافق فیلو سسٹم جاری کیا جائے اور جو طالب علم فارغ التحصیل ہو جائے اس کو کسی خاص علم میں، جس سے وہ خاص مناسبت رکھتا ہو، مصروف رہنے اور اس میں کمال حاصل کرنے کے لیے فیلو شپ دی جایا کرے اور اس طرح ایک گروہ عالموں اور محققوں کا قوم میں پیدا کیا جائے جو تمام قوم میں علم و کمال پھیلانے کے لیے بمنزلہ آلہ کے ہو۔"

اپنے ابتدائی دور میں اس کالج نے کسی قدر یہ کام انجام بھی دیا یعنی اس نے تعلیم کا اور علم کا ذوق پیدا کیا۔ سر سید اور ان کے رفقاء جو اس کالج کے ساتھ وابستہ تھے، اپنی تحریروں سے قوم کو جھنجھوڑا اور خواب غفلت سے بیدار کیا اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ کالج محض ایک کالج نہ رہ گیا بلکہ ایک ایسی تحریک بن گیا، جس نے مسلمانان ہند کو تعلیم اور وقت کے تقاضوں کی طرف توجہ دلائی مگر اول الذکر خصوصیت زیادہ دیر باقی نہ رہ سکی۔ شاید یہ بات ان انگریزوں کو بھی پسند نہ تھی جو بظاہر کالج کے بہی خواہ تھے اور اسکی تعمیر میں ہاتھ بٹا رہے تھے اور اس کے نظم و نسق کو بھی سنبھالے ہوئے تھے۔ انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نوجوانوں کی توجہ کو کلاس روم — یعنی تعلیم اور علم کی آماجگاہ — سے ہٹا کر کھیل کود کے میدان کی طرف موڑ دیا۔ جس طالب علم نے کھیل کود میں ذرا سی مستعدی دکھائی، اس کی خوب نے سرپرستی کی، طرح طرح سے اسکو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور پھر کہیں ملازمت کے لیے سفارش کر دی۔ چلیے قصہ پاک ہوا۔ اس صورت حال میں نوجوانوں کو بڑی کشش نظر آئی، اسی کو معراج سمجھ لیا گیا اور اسی پر قناعت کر لی گئی۔

پہلے دور کے لوگوں کا قدم درمیان سے ہٹا اور علم و تعلیم کی فضا محدود و مسدود ہوئی تو تحریک نے بھی دم توڑ دیا اور کالج ایک ادارہ سے صرف ایک درس گاہ ہو کر رہ گیا جو بعد میں یونیورسٹی کہلائی اور صرف یونیورسٹی ہو کر رہ گئی۔ کیا یہ یونیورسٹی پھر ایک ادارہ بن سکتی ہے؟ کیا اس میں علم و عمل کی فضا پھر پیدا ہو سکتی ہے کیا اسے پھر ایک تحریک کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا یہ پھر مسلمانان ہند کی تعلیمی سربراہی کا فریضہ انجام دے سکتی ہے؟ ان سوالوں کے مثبت جواب کے لیے حال تقاضا کر رہا ہے اور مستقبل انتظار! ؏

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق!

Regd. No. L/ALG-247

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنه ۱۲۹۰ هجری سنه ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۲

جلد ۱ ۱۶ مارچ ۱۹۸۲ء شمارہ ۴

مدیر : سید حامد وائس چانسلر
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۔

مدیر مسؤل : قاضی معز الدین احمد

فی پرچہ ۷۵ پیسے
سالانہ ۱۵ روپئے
چھ ماہ ۸ روپئے

غیر ممالک سے
فی کاپی ایک ڈالر
سالانہ بیس ڈالر

تربیت ایک ایسی چیز ہے جو تعلیم سے مقدم ہے بغیر تربیت کے تعلیم بیکار اور غیر مفید ہوتی ہے۔ اس کا انتظام جیسا عمدہ عمدہ میں نے اس کالج میں دیکھا غالباً ہندوستان کے کالجوں میں کم ہوگا۔ اور اس کے لئے ضروری تھا کہ سب لڑکے ایک جگہ رہیں ان کے رہنے سہنے کھانے پینے وغیرہ کا انتظام ایک طور پر ہو ان کی جسمانی اور دماغی قوتوں کے بڑھانے کے عمدہ اور مفید ذریعے مہیا کیے جوں چانچہ میں دیکھتا ہوں کہ اس کا انتظام نہایت تشفی اور اطمینان کے لایق ہے جسمانی ورزشوں اور مردانہ کھیلوں میں جس کا اثر صحت اور تندرستی پر ہی نہیں پہونچتا بلکہ جس سے دماغی قوت کو مدد ملتی ہے ہمارے طالب علم ایسے مشتاق ہیں کہ ہندوستان کے دور دراز شہروں میں ان کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اخلاقی اور علمی مضامین پر ڈبیٹنگ اور مباحثہ کے لئے جو یونین کلب قائم ہے اس کی نظیر تو ہندوستان کے کسی کالج میں نہیں ملتی۔

روئداد نمبر ۲۲ ، ۲۵ جنوری ۱۸۹۸ء
تقریر اجلاس ٹرسٹیان (محمڈن اینگلو اورینٹل کالج)

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

مدیر: سید حامد۔
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

جلد نمبر ۱ ۱۶ مارچ ۱۹۸۲ء شمارہ نمبر ۴

یاد رکھو کہ میں یہ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ اگر اور چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ ایسا آوے گا کہ تم چاہو گے کہ اپنے بچوں کو تعلیم دو ان کی تربیت کرو مگر تم سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ مجھ کو کچھ کہو کافر ملحد نیچری۔ میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا۔ میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لیے کہتا ہوں تم انھیں پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ کو پچھتانا نہ پڑے۔۔۔۔۔"

سر سید (لکچروں کا مجموعہ ص ۱۵۹)

"سب ترقی کی جڑ یہی ہے کہ سب سے پہلے علم کے خزانوں کو اپنے قابو میں کر لو"

سر سید (لکچروں کا مجموعہ ص ۲۸)

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

میلاد النبیؐ کی تقریب

میلاد النبیؐ کی تقریب نہ معلوم دنیا دوسرے مسلم ممالک میں منائی جاتی ہے یا نہیں۔ ہندوستان میں وہ بہت دلچسپ صورت اختیار کرتی جارہی ہے اور آہستہ آہستہ ہندوستان کے مزاج کے مطابق ہوتی جارہی ہے۔ ایک زمانہ میں اس محفل میں ولادت نبوی کے بارے میں بہت سی روایات بیان کی جاتی تھیں۔ وہ سبق آموز خواہ نہ ہوں، عوام کے دلوں کو خوب گرماتی تھیں الحمد للہ وہ دور ختم ہوگیا۔ لیکن اب قومی لیڈر، سیاسی رہنما۔ پارلیمنٹ کے ممبر۔ سوشل ورکر۔ شہر کے خوش پوش اور خوش باش معززین۔ مسلمان اور ہندو اور عیسائی سب ہی مدعو کیے جاتے ہیں۔ ان محفلوں میں شرکت کے بعد بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ محفل میں کوئی ایک آدھ مقرر ہی ہوتا ہے جو سیرت پر کچھ کہتا ہو۔ وہی بیچارہ سب سے زیادہ مظلوم ہوتا ہے اور اس کو بہت کم وقت ملتا ہے۔ تمام وقت لیڈران تقاریر کرتے رہتے ہیں سننے والا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے بارے میں کوئی رائے قائم کرسکتا ہے نہ اسلام کے بارے میں

اب یوم النبیؐ کے سلسلہ میں جلوس نکلنا بھی شروع ہوگیا ہے۔ امسال غالباً رامپور کے ایسے ہی جلوس کی تصویر اخبار میں دیکھی۔ خالی پیلی جلوس کیا نکلتا۔ ایک صاحب عربی لباس پہن کر اونٹ پر بیٹھ کر نکلے۔ گویا دورِ نبوی سے مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو وہ دن جلد آئے گا، جب روضۂ اطہر کا غذ کا بنا کر اور اونٹ پر رکھ کر نکالا جائے گا۔ اور خدا پرست موحد اس کو بوسہ دیں گے۔ اس اونٹ کے نیچے سے بیماروں اور بچوں کو نکالا جائے گا۔ منتیں مانی جائیں گی اور وہ سب ہوگا جو ماہ محرم میں تعزیہ داری کے دوران ہوتا ہے۔

فلم بینی

کچھ عرصہ ہوا اخبارات میں یہ خبر دیکھی تھی کہ مہاراشٹر کے کسی مقام پر عورتوں نے سینما دیکھنا ترک کر دیا ہے۔ یہ تحریک تیزی سے پھیلی اور بہت کامیاب ہوئی۔ پھر خواتین کے ایک حلقے میں یہ تحریک ان کی حق تلفی کے مترادف خیال کی گئی اس حق کی بحالی کے لیے تعلیم یافتہ خواتین نے آواز اٹھائی اور احتجاج کیا عورتیں پھر سینما دیکھنے لگیں اور حق تلفی کی شکایت کا تدارک ہوگیا مسلم اخبارات نے اس تحریک

اداریہ

قیمت فی پرچہ	۷۵ پیسے
چھ ماہ	آٹھ روپے
سالانہ	پندرہ روپے
غیر ممالک سے	
فی کاپی	ایک ڈالر
سالانہ	بیس ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ
مدیر مسؤل رسالہ تہذیب الاخلاق
صفدر منزل۔ تار بنگلہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

کو مبارک خیال کیا۔ اس کے خلاف آواز اٹھانے والے ترقی پسندوں کے جرم اور آزاد خیال لوگوں کی بے راہ روی پر محمول خیال کیا
بہر حال خواتین کا سینما دیکھنے کے خلاف اقدام اور پھر اُن کی آزادی کا مطالبہ اور ان کی حق تلفی کے خلاف جدوجہد سبھی باتیں دلچسپ ہیں اور آپ کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔

چند سال ہوئے نئی دہلی کے سوشل حلقوں کی باعزت اور باعظمت خواتین نے سینما کے ان پوسٹروں کے خلاف آواز بلند کی اور ایسے اشتہارات پر جن میں کسی فلم کا تعارف کرانے کی غرض سے ہیروئن کو نیم عریاں لباس میں ایک مرد کے آغوش میں دکھایا گیا تھا ان پر برش سے کالا رنگ لگا دیا۔ اور شہر کے سب ہی فلمی اشتہارات کو داغدار کر دیا۔
ان خواتین نے عورتوں کے سینہ بند لباس کی نمائش کے خلاف بھی آواز اٹھائی اور دلی کے بازاروں کا گشت کر کے ایسے لباس کی نمائش سے دوکانداروں کو روکا۔ یہ خواتین سبھی تعلیم یافتہ تھیں اور اونچے گھرانوں کی تھیں۔ ان کی تحریک کے خلاف نہ کسی ترقی پسند نے آواز اٹھائی اور نہ کوئی آزاد خیال بولا۔ یہ خواتین بھی چند روز احتجاج کر کے خاموش ہو رہیں۔ ظاہر ہے زمانے کی ہوا کے خلاف تحریک چلانا اور اس کو کامیاب بنانا آسان نہیں

سینما بذات خود کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ یہ اصلاح اور ترقی کا ایک ذریعہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جب لوگ جلب منفعت کے لیے فلم بناتے ہیں تو اُن کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمائیں۔ ظاہر ہے یہ مقصد اسی وقت پورا ہوتا ہے جب عوام میں فلم مقبول ہو۔ مقبولیت کے لیے آسان ذریعہ یہی ہے کہ فلم میں خوب مار دھاڑ ہو اور جنسی بے راہ روی کی نمائش ہو۔ نیم عریاں لباس میں عورتیں دکھائی جائیں۔ گویا فلم سازوں کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ فلم میں جنسی اور حیوانی جذبات کو ابھار کر کے عوام میں مقبول بنایا جائے اور نام فن کاری اور آرٹ کا دیا جائے۔

اگر راقم کا یہ تجزیہ صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو فلم عورتوں سے زیادہ مردوں کی بے راہ روی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ مرد عورتوں کو تو فلم بینی سے روکیں اور خود فلم دیکھنے میں دلچسپی لیں۔

حال ہی میں مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ کا بیان قومی آواز مورخہ ۲۸ فروری ۸۲ء میں شائع ہوا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ مدھیہ پردیش میں ہر آٹھ گھنٹے میں ایک عورت کی آبرو ریزی ہوتی ہے۔ ہر بارہ گھنٹے پر ایک عورت خودکشی کرتی ہے۔ ہر تیسرے دن ایک عورت کو قتل کیا جاتا ہے۔ وزیر اعلیٰ شری ارجن سنگھ نے ۱۹۸۱ء کے اعداد و شمار اس طرح پیش کیے ۱۰۵۹ عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی، ۳۹۷ عورتوں نے خودکشی کر لی، ۱۴۰ کو خاندانی جھگڑوں کی بنا پر اور ۹ کو آبرو ریزی کے بعد قتل کر دیا گیا۔ یہ داستان تو آپ کی ایک ریاست کی ہے۔ اگر یہی حال دوسری ریاستوں کا ہوا اور یقیناً ایسا ضرور ہوگا تو پھر سوچیے کہ پورے ملک کا کیا حال ہو رہا ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں

ہمارے ملک میں اس وقت جو انتشار ہے اُس سے کون واقف نہیں۔ جنسی بے راہ روی عام ہے اور روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اس طرح پر لوٹ مار کو فروغ حاصل ہے۔ رشوت سے کون بچا ہوا ہے شاہ و گدا دونوں اس کے مجرم ہیں۔ ہم بربادی کے اس غار کی طرف تیزی سے دوڑ رہے ہیں جس میں گر کر اپنا حال و مستقبل دونوں تباہ کر دیں گے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اور ہماری حکومت دونوں کا نہ کوئی مسلک ہے۔ نہ زندگی کا کوئی مقصد

کسی سماج میں جو رسم و رواج اور زندگی کے مشاغل داخل ہو جاتے ہیں ان کے خلاف آواز اٹھانا آسان ہو، ان کا ترک دشوار ہو جاتا ہے۔ اُن سے بچنے اور اُن کو ترک کرنے کے دو ہی طریقے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ معاشرہ کے ذمہ دار خود قدم اُٹھائیں اور اصلاح کے خواہش مند ہوں۔ ایسی صورت میں قانون کی مدد بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت رائے عام کی تبدیلی ہے اور لوگوں کی توجہ بٹانا ہے۔ اگر مسلمانوں میں اچھی کتابوں کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو جائے تو سینما بینی

شوق کم ہو جائے گا۔ دیکھیں گے بھی تو اُس کے بُرے
ات اُن پر کم پڑیں گے۔ لیکن اگر فحش اور عریاں ناول اور
سانے قصے اور کہانیاں پڑھیں گے تو سینما سے دلچسپی اور
ی ہوگی اور فلم لوگ جلسی تسکین کے لیے دیکھیں گے۔ جنسی
اہش آپ ایک وقت دبا سکتے ہیں لیکن وہ کسی وقت
بھی اُبھر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل جلسی بے اعتدالی
لے واقعات کثرت سے ہوتے ہیں۔ یہی صورت قتل کی وارداتوں
اغوا کے واقعات چوری اور ڈکیتی کی ہے۔ آپ کے تحت الشعور
میں جو بات محفوظ ہو جائے گی وہ کسی وقت بھی رنگ لا سکتی
ہے۔ اس لیے انسان کے لیے اچھا ماحول، اچھی صحبت اور
اچھے ادب کا مطالعہ شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔
اچھے ادب سے مراد یہ نہیں کہ آپ صرف مذہبی کتابیں پڑھیں یا
معیاری ناول اور افسانے، تاریخ، تہذیب سیاسی کتب
وغیرہ سب ہی اچھے ادب میں شمار ہوتی ہیں اور ان سب
سے اچھے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور اور ان ہی سے
شخصیت بنانے میں اور ترقی کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا
پاتا ہے اور جیسا کہ ایک نوجوان اپنے بارے میں سوچتا
ہے ویسی ہی اس کی زندگی بنی جاتی ہے۔ اقبال نے کہا
ہے اس پر بھی غور کیجیے۔

زندگی قطرہ کی سکھلاتی ہے اسرار حیات
یہ کبھی گوہر کبھی شبنم کبھی آنسو ہیں

یہ ہماری زبان اردو

ایک زمانہ تھا کہ اردو تمام ملک کی زبان تھی۔ لکھی پڑھی۔ بولی جاتی تھی۔ پھر وہ فرقہ وارانہ اختلاف پیدا کرنے کا ذریعہ تجویز کی گئی۔ بقول پنڈت سندر لال ایک قدیم متروک رسم الخط کو زندہ کیا گیا۔ آزادی کے بعد ہندی قومی زبان قرار دیدی گئی۔ اردو کو بھی ہندی کہا گیا اور یکایک اردو اپنے وطن میں اجنبی ہوگئی اردو میں درس قطعاً نہیں ترک کی گئی اس کو دفاتر سے خارج کیا گیا تو اردو والوں نے آہ و بکا شروع کر دیا۔ شکوہ شکایت ہونے لگی۔ بحث و تکرار ہوئی تو دل کی بھڑاس نکل گئی۔ اردو کے بارے میں مطالبات شروع ہوئے لیکن اس کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی قدم نہ اُٹھایا گیا۔ اردو والے شیر قالین ہمیشہ سے رہے ہیں۔ بس اُن کا یہی کردار غالب رہا۔

ملک میں ہر سال اردو کانفرنس ہوتی ہے۔ تجاویز پاس ہوتی ہیں۔ حکومت سے مطالبات کیے جاتے ہیں لیکن اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی قدم نہیں اُٹھتا۔ کچھ ہوتا ہے تو بہت محدود پیمانے پر۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے "دس دن میں اردو" کا قاعدہ مرتب کیا۔ بیگم حیات اللہ نے بہت سے لوگوں کو سکھلایا ہوگا۔ کتنوں نے اردو زبان و ادب میں دلچسپی لی ہوگی۔ یو پی میں اردو کے مدرسوں کا تقرر بھی ہوا لیکن اردو زبان کا انحطاط نہ رُکا۔ اب جو اردو جاننے والے نوجوان ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں جو اردو زبان میں اظہار خیال پر قدرت رکھتے ہوں جن اسکولوں میں اردو پڑھائی جاتی ہے۔ ان کے طلبا مشکل سے اردو کے چند جملے صحیح لکھ سکتے ہیں۔ اردو کے شاعر تو بہت ہیں، شعر فہمی بہت کم ہے۔ نثر نگار بھی مل جائیں گے۔ صاحب طرز ادیب شاید ہی کوئی نیا پیدا ہوا ہو۔

اردو کی گزشتہ تیس سال کی تاریخ پر نظر ڈالیے اردو کے سب ناشر بدحال ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کاروباریوں نے اردو کی کتابیں فروخت کرنے کا کام ترک کر دیا ہے۔ بہت سے مشہور کاروبار بند ہو گئے ہیں اردو والوں کو اور اردو کے ادیبوں اور اردو تحریک کے لیڈروں کو بھی اردو کتاب خرید کر پڑھنے کی عادت نہیں اگر ایک نے کتاب خریدی تو دس اس کو مانگ کر پڑھتے ہیں اور اس دوران کتاب گم ہو جاتی ہے۔ ہندوستان بھر میں اردو کی نصابی کتب دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ اردو تحریک کے لیڈر دس برس

سرکار سے درخواست کرتے رہے کہ نصابی کتب شائع کرے۔ اردو کے کسی ناشر نے یہ نہ کیا کہ ان نصابی کتب کی اشاعت کا اہتمام کرتا۔ دشواری صرف یہ تھی کہ اردو اسکول کم ہیں۔ طلبا صرف چند ہوتے ہیں۔ حکومت نصابی کتب کی قیمت بہت کم مقرر کرتی ہے۔ ہندی کی کتاب میں ایک پیسہ اگر ناشر کو بچتا ہے، تو سال میں ایک لاکھ پیسے بچ جاتے ہیں۔ ہندی کا ناشر ہندی کی کتاب چھاپ لیتا ہے۔ اردو کے ناشر کو ایک دو ہزار پیسے سال میں بچیں تو پھر وہ کیوں نصابی کتب شائع کرے۔ اس کو اردو سے ایسی دلچسپی کب ہے کہ وہ یہ نقصان اٹھائے۔ ایک تجویز اردو تحریک کے سب سے بڑے لیڈر مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن صاحب کے سامنے یہ رکھی گئی کہ اردو کی نصابی کتب چندہ سے چھاپی جائیں اور اگر نقصان ہو تو وہ برداشت کیا جائے۔ داستان طویل ہے بیان کیا کروں چند سال یہ سلسلہ رہا۔ پھر بند ہو گیا۔ نہ کسی نے پیسہ دیا نہ کتابیں چھپیں۔ مولانا اللہ کو پیارے ہوئے۔

اب بھی اردو کی نصابی کتب ہر ریاست میں آسانی سے نہیں ملتیں۔ لیکن چھاپے کون اور نقصان کون برداشت کرے؟ مسلم درسگاہوں کی حالت اور بھی بری ہے۔ دس دس سال سے نصابی کتابیں چل رہی ہیں سنا ہے کہ بچے اب بھی یہی پڑھتے ہیں کہ نہرو وزیر اعظم ہیں۔

اب ذرا دیکھیے کہ اردو کی کیسی کتابیں شائع ہوتی ہیں کلام کے مجموعے۔ عام تنقیدی اور "تحقیقی" کتب اور عام ناول وغیرہ۔ کیا وہ زبان جس میں ایسی کتب شائع ہوں اس دور کے نوجوانوں کو وقت کے تقاضوں سے آگاہ کر سکتی ہیں؟ اور ان کے مستقبل کی طرف رہنمائی کر سکتی ہیں۔ کیا وہ کتب جو اس وقت اردو میں شائع ہوتی ہیں انہوں کی حیثیت نہیں رکھتیں؟ سوچیے کہ اردو کا پھر کیا مستقبل ہوگا۔

کب زندگی کے میدان کارزار میں سرگرم اترنے کا جذبہ پیدا ہوگا؟ کب اردو، اردو ہوگی اور ایک زندہ قوم کی زبان ہوگی۔

ضرورت ہے کہ اردو کے جتنے بھی سرکاری اور نیم سرکاری ادارے ہیں اُن کے کارکن اور اردو تحریک کے لیڈر سر جوڑ کر بیٹھیں اور اردو کی ترقی کے مسئلہ پر غور کریں۔ ایسی کتابیں اردو میں شائع کریں (ترجمہ کرکے) جو اُن میں دنیا کے حالات سے واقفیت اور بیداری پیدا کریں۔ اور اردو دنیا سے اپیل کریں کہ لوگ کتابیں خرید کر پڑھیں اور کتابیں خود خریدیں۔ اردو لیڈر ایک مہم چلائیں۔ سرگرم نکلیں۔ جلوس نکالیں، جلسے کریں خود کتابیں خریدیں اور دوسروں کو خریدنے پر آمادہ کریں۔ تب کہیں اردو زندہ ہوگی اور زندہ رہے گی۔ تب کسی علاقہ کی ثانوی زبان ہوگی تو عوام کو بیدار کرے گی اور اپنے ہی نہیں دوسروں کے مستقبل کو روشن کرے گی۔ اگر یہ سب ممکن نہیں تو نعرے اپنی جگہ لگتے رہیں گے اور زبان کا انحطاط ہوتا رہیگا

مسلم نوجوانوں میں بیداری کی لہر ابھر رہی ہے کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اٹھیں، ہر ہر شہر میں بڑے بڑے جلوس نکالیں جلسے کریں۔ ضرورت نہیں کہ کسی لیڈر کی رہنمائی کا انتظار کیا جائے۔ اردو کی کتابیں فروخت کرنا پہلا اور آخری کام نہیں۔ اردو سکھانے اور سیکھنے کی طرف بھی توجہ ہو۔

تہذیب الاخلاق اس سلسلہ میں آواز بلند کرتا رہے گا اور آپ کو متوجہ کرے گا۔ یہ کام نوجوانوں کا ہے کہ وہ اٹھیں اور اپنی بیداری کا ثبوت دیں۔

زندگی کی قوت پنہاں کو کر دے آشکار
تا یہ چنگاری فروغ جاوداں پیدا کرے

مرزا سعید الظفر چغتائی

اعلا تعلیم

علم کے چار درجے ہوتے ہیں۔ خبر، تصدیق، یقین اور عین الیقین۔ (القرآن، سورہ تکاثر ۱۰۲ آیات ۳، ۴، ۵ اور ۶) سب سے اچھی تعلیم وہ ہے جو حتمی معیار پر پوری اُترے۔

علم کی ابتدا ہمیشہ خبر سے ہوتی ہے۔ وہ زبانی افواہ ہو، یا تحریری اخبار۔ پھر ہم اپنی بساط بھر اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس عمل میں خبر دہرائی جاتی ہے اور ہم تاریخی طرز کی تحقیق کرتے ہیں، جس کی سب سے سنجیدہ مثال علماءِ حدیث نبوی کی کاوشیں ہیں۔

یقین مشاہدہ سے ہوتا ہے اور مثل مشہور ہے "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" (سننے اور دیکھنے میں بڑا فرق ہوتا ہے)۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ واقعہ یا تو اُسی وقت پیش آیا ہو یا تجربہ دہرایا جا سکتا ہو۔ سائنسی علوم اسی ذیل میں آتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں مستند وہی بات ٹھہرتی ہے جو بار بار مختلف حالات میں اور دور دور جگہوں پر پرکھی جا سکتی ہو۔ اس لیے اچھی سائنسی تعلیم کو ہر ہر قدم پر مظاہراتی Demonstrative ہونا چاہیے۔ اچھے سکولوں اور کالجوں میں تو فزکس، کیمسٹری اور حیاتیات کی تعلیم اس طرح ہوتے دیکھی ہے کہ مسئلہ بیان کیا جا رہا ہے، اسے کر کے بھی دکھایا جا رہا ہے مگر افسوس کہ ہمارے اوسط کالجوں اور یونیورسٹیوں میں یہ معاملہ اگر کسی حد تک ملتا ہے تو آماریات (Statistics) میں — دوسرے شعبوں میں قول اور عمل کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اوّل تو ہر مسئلہ تجربہ گاہ میں سامنے نہیں آتا اور جو آتے ہیں اُن میں بھی درس (لیکچر) اور عمل (پریکٹیکل) کا ربط اتفاقی ہی ہوتا ہے۔

پچھلے برسوں ترقی یافتہ ملکوں میں سائنس کی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ مظاہراتی بنانے کی بہت کوشش کی گئی ہے اور اس میں نوبل لاریٹ سر ہنری Bragg جیسے زعما نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ ہمارے ملک اور خود مسلم یونیورسٹی میں "تخلیقی تعلیم" کے نام سے یہ کوششیں شروع ہوئیں مگر آگے نہ بڑھ سکیں۔

"تخلیقی تعلیم" نام ہی نہیں، اس میں گہرے معنی موجود ہیں۔ تعلیمی تاریخ میں برابر ایسا ہوتا آیا ہے کہ جب استاد نے صرف حکایت سنانے کے بجائے کر دکھانے کی تیاری کی تو موجود علم کی کمی جا بجا ظاہر ہوتی (کم فہمیاں اور غلط فہمیاں کھل کر سامنے آئیں)۔ ان کا ازالہ ہوا اور علم میں اضافہ ہو گیا۔ اصل تحقیق یہی ہے۔ اور یہی عین الیقین کی منزل بھی ہے۔ اس تحقیق کو "اعلیٰ دانش وری" کہیے۔ اس کے نتیجہ میں نئی [illegible] دریافتیں ہوتی ہیں اور ان دریافتوں کے استعمال سے ایجادیں کی گئی ہیں۔ لیکن یہ سب متعلم [illegible] اور پرخلوص تعلیم کا ثمرہ ہیں، جادو کا کام نہیں۔

تعلیم اچھی ہو تو ابتدائی اور اعلا مرحلوں کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ ابتدائی درجوں میں جو باتیں پڑھائی جاتی ہیں وہ بہت عرصہ سے بہت جانچ پڑتال کر کے دیکھی جا چکی ہیں، اس کے دکھانے کے طریقے بھی اچھی طرح معلوم ہیں اور معیاری بن چکے ہیں۔ مثلاً کیمسٹری میں پانی سے ہائڈروجن اور آکسیجن گیسوں کا نکلنا اور اُن کا ایک دوسرے کے ساتھ خاص امتزاج سے ملنے پر پانی میں تبدیل ہو جانا۔ فزکس میں توانائی کی ایک شکل کا دوسری میں تبدیل ہونا۔ حیاتیات میں جسم کے اعضاء کی تشریح یا شریانوں میں

رشید الوحیدی
اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ

سیرتِ نبوی ﷺ اور ہمارا طرزِ عمل

ماہِ ربیع الاول کی آمد ہمارے لیے جشن مسرت کا ایک پیغام ہے۔ اس خاص مہینے میں شہنشاہ کون و مکاں علیہ الصلوۃ والسلام کی یاد میں آپؐ کی پیدائش کے مبارک موقع کو ہم نہایت شاندار طریقے سے مناتے ہیں بے شک یہ اُس محسنِ انسانیتؐ کی محبت، شیفتگی کا بے پناہ جذبہ ہے جو دنیا میں خدا کی رحمت بن کر جلوہ آرا ہوا جس نے دنیا سے شقاوت و بدبختی کو یکسر مٹا دیا۔ جس کی ایک نگاہ حیات افزا نے ظلم و طغیان، فساد و عصیان کی تہہ در تہہ ظلمتوں کا خاتمہ کر دیا ...

(بقیہ مضمون "اعلا تعلیم")

خون کی روانی وغیرہ۔ اُن کے لیے عام طور پر کسی تحقیق کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اُن سے کوئی نئی بات نکل آنے کی امید کی جاتی ہے۔ حالاں کہ پہلے سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ کون شخص کہاں کتنی گہرائی میں ڈوب جائے گا — لیکن یونیورسٹیوں کی تعلیم نئی دریافتوں اور زمانہ حاضر کے علوم پر دی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ تحقیق کی طرف لے جائے گی اور نئی راہیں کھولے گی۔ اگر ہمارے ساتھ زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا تو نہ صبر کرنے کا موقع ہے اور نہ خود پر ترس کھانے کا بلکہ سدھار کا اور بہتری کی کوششوں کا

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ جس کو خیال ہو خود اپنی حالت کے بدلنے کا

(القرآن سورہ ۱۳ رعد آیت ۱۱)

ہم میں سے بہتوں کو ان باتوں کا پتہ ہے اور احساس بھی۔ لیکن کام کے لیے اپنی محنت اور دوسروں کی ہمت افزائی درکار ہے اور ان دونوں میں سے ایک بھی عنصر موجود نہیں۔ مگر لوگوں نے نامساعد حالات میں کام کیے ہیں اور اسی سے بلندنامی حاصل کی ہے۔ ایک مثال سولھویں صدی کے بلجین سائنس داں آنڈریاس وسالیس (Andreas Vesalius) کی ہے اسے تشریح الاعضاء (Anatomy) سے دلچسپی تھی۔ تاکہ انسانی جسم کو صحیح طور پر سمجھ کے صحیح طریقۂ علاج متعین کیے جا سکیں۔ اس وقت عیسائی معاشرہ اس سے کہیں زیادہ سختی سے انسانی جسم کی چیر پھاڑ کے خلاف تھا۔ جتنا آج ہمارا ہندوستانی معاشرہ ہے۔ لہٰذا وسالیس کو جان پر کھیل کے قبروں میں چھپ کے گھسنا اور وہاں اندھیرے، گھٹن اور بدبو میں اپنا کام جاری رکھنا پڑا ہے۔ پھر پدوا (اٹلی) کے بہتر حالات میں اس نے یونیورسٹی کے پڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنا کام آگے بڑھایا اور علم الاعضاء پر اپنی شہرۂ آفاق کتاب مرتب کی — اور اسی تحقیق کے شوق میں بیس سال بعد اسپین کے شاہی طبیب کا عہدہ چھوڑ کے پھر پدوا لوٹ رہا تھا کہ راستہ میں اس کا جہاز غرق ہو گیا ؎

کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ٹوٹے رشتوں کو پھر سے جوڑ دیا، انسانی اخوت ومساوات، یگانگت ومحبت کی نسیم جانفزا سے دلوں کو مست ومعمور کر دیا، کلمۂ حق وصداقت کا غلغلہ بلند کر دیا۔ ہم اس جذبے کے اظہار کے لیے ذکر کی محفلیں سجاتے ہیں، اس کی آرائش اور زیب وزینت میں خوشبو، شمعوں اور برقی روشنیوں کی ایک پرنور دنیا سجا لیتے ہیں، غرض ان جلسوں کے انتظام اور شان وشوکت کا جو حال ہوتا ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔ ہم اس جذبہ اور رنگ ونور، روشنی اور سجاوٹ کے اس بے پناہ شوق وجذبے کے ساتھ ہی کبھی یہ بھی تو غور کریں کہ ایک باشعور اور ذمہ دار مسلمان ہونے کے ناتے ہم پر کچھ اور ذمہ داریاں بھی تو عائد ہوتی ہیں۔ آیئے ہم سوچیں تو سہی کیا آپ کی تریسٹھ سالہ کی جانفشانیوں، مکی ومدنی قربانیوں کا ہیں یہی ماحصل ہے اور کیا ہم آپ کی مبارک تعلیمات اور اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو گئے کیا زندہ قوموں کا یہی شعار ہے کیا کسی قانون حیات اور دستور زندگی کی بس اسی قدر معمولی پابندی اور اس کا محض اتنا سا اعتراف [illegible] مثبت انقلاب لا سکتا ہے ذرا غور تو کیجیے کہیں یہ دیکھا ہے، سنا ہے اس بات کو عقل سلیم باور کرے گی کہ حکیم کوئی نسخہ لکھ کر دے اور کچھ ہدایات کرے اور نسخے کے مطابق اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے بجائے حکیم ہی کی محبت وعظمت کو اپنایا جائے اور پھر امید رکھی جائے، انتظار کیا جائے کہ اب نسخہ اپنا اثر دکھائے گا اور سارے امراض ختم ہو جائیں گے ایسا تو ناممکن ہے، اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر یہ کیسے ہوگا کہ رسول پاکؐ کے لائے ہوئے نسخۂ کیمیا اور پاکیزہ اصولوں پر عمل کیے بغیر حکیم کے بتلائے ہوئے پرہیز کو نظر انداز کر کے امت اپنے اخلاقی، روحانی اور قلبی امراض سے نجات پا جائے گی،

پھر آپ جبکہ دنیا وآخرت دونوں کے حکیم ہیں۔ نبوت کے لیے کہا گیا سِفَارَةٌ بَيْنَ اللهِ وَبَيْنَ ذَوِي الْعُقُولِ مِنْ عِبَادِهٖ لِإِزَاحَةِ عِلَلِهِمْ فِي أَمْرِ مَعَادِهِمْ وَمَعَاشِهِمْ (دنیا وآخرت کے معاملے میں بندوں کی بیماریاں دور کرنے کے لیے اللہ اور عقل والوں کے درمیان سفارت ہے[1])

حجۃ الوداع کے عظیم موقع پر آپؐ نے جب فرمایا تھا "میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں "کتاب وسنت" تم اس کو تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے" تو گویا آپ کا یہی مطلب تھا، آپؐ کے فرمان کی یہی روح تھی کتاب وسنت کے تھامنے کا یہی مفہوم تھا جو ہمارے عمل سے ظاہر ہے۔

اصل یہ ہے کہ ایک ہوتی ہے کسی سے محبت اور دوسری چیز جس سے محبت ہو اس کی اطاعت، بہرحال اللہ ورسول سے محبت ہو یا اطاعت، اُن میں سے کوئی بھی اگر کتاب وسنت کے خلاف ہوگی تو وہ غلط ہوگی۔

پھر دوسری بات یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلام افراط وتفریط سے ہٹا کر [illegible] یعنی اعتدال اور میانہ روی کا مذہب ہے۔ کتاب وسنت سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے اس لیے زندگی کے تمام دیگر امور کی طرح اگر اللہ اور رسول سے محبت کے اظہار میں یا اس کی اطاعت میں بھی ہم افراط وتفریط سے نہ بچ سکے اور اعتدال پر نہ رہے تو یقیناً جادۂ حق سے بھٹک گئے ہیں، ان اصولوں کی روشنی میں آیئے ہم سیرتِ نبویؐ کا مفصل جائزہ لیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف بنی نوع انسان

---

[1] راغب اصفہانی المفردات فی غرائب القرآن از "حدیث کا درایتی معیار" مولانا تقی امینی ص۲۱

کو ظلم وجہالت شرک وبدعقیدگی کی ظلمت سے نکال کر وحدانیت
اور خدا پرستی کا نور عطا فرمایا تو دوسری جانب وحشت و بربریت
اور درندگی کے قعرِ مذلت سے بچا کر تہذیب و تمدن اور پاکیزہ
زندگی کی دعوت دی۔ یعنی اخلاق و مذہب کے ساتھ ساتھ معاشرت
کی تعلیم بھی عطا فرمائی۔ قرآن پاک نے اسی مضمون کو بتایا ہے۔
لقد کان لکم فی رسول [بہتر تھا تمہارے لیے سیکھنا
اللہ اسوۃ حسنۃ (احزاب) رسول کا طریقہ]

جب ہماری مادی اور دنیاوی زندگی کے لیے بھی نبی ﷺ
کی تعلیمات اور آپ ﷺ کی طرف سے رہبری موجود ہے تو اب ہمیں اپنی
سماجی اور معاشرتی اصلاح کے لیے آپ ﷺ ہی کے بتائے ہوئے
راستہ پر چلنا، آپ ﷺ کی بتائی ہوئی باتوں کو اختیار کرنا، منع کی
ہوئی باتوں سے رُکنا، یہی سعادت، رسول ﷺ سے محبت اور
اپنے دعوئ ایمان میں صداقت کا ثبوت ہے۔ نبی ﷺ سے محبت اور
نبی ﷺ کی اطاعت کا دم بھرنے والوں کے لیے قرآن پاک میں خدا
نے یہی معیار بتایا ہے۔

ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نھاکم عنہ
فانتھوا (اور جو دے تم کو رسول سو لے لو اور
جو منع کرے سو چھوڑ دو۔)

ہم اگر ایسا نہیں کرتے تو قرآن پاک کے اس حکم کی خلاف ورزی کریں
گے اور پھر اس کے علاوہ یہ بھی تو ہے کہ ہم نور سے ظلمت کی طرف
اور تہذیب سے جہالت کی طرف لوٹنے کے مجرم ہوں گے اور
یہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ جیسا کہ قرآن پاک نے کہا ہے

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِہٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَیْھَا
جو اچھا عمل کرے سو اسی کے لیے ہے اور جس نے برائی
کی پس اسی پر ہے۔

کاروبارِ حیات میں اور اپنے معاشرتی معاملات میں
اب ہمیں اپنے عمل اور نبی کریم ﷺ کے اسوہ کا مقابلہ کرنا ہوگا
اور دیکھنا ہوگا کہ ہم آپ ﷺ سے محبت اور آپ ﷺ کی اطاعت میں کہاں
تک سچے ہیں اور ثابت قدم ہیں اور کہاں تک اپنے ضمیر کو دھوکا
دے رہے ہیں غلطی پر ہیں۔ ہمیں یہ فیصلہ ہوجائے گا کہ ہم
جو اتنے شوق اور دھوم دھام سے ربیع الاول کی تقریب مناتے
ہیں، اس میں وہ اصلیت اور صداقت بھی ضروری ہے جو نبی
اکرم ﷺ سے محبت میں ہونی چاہیے۔

سب سے پہلے ہم علم کو لیتے ہیں۔ علم سے مراد علم دین ہے
کیوں کہ خود آپ ﷺ نے فرمایا ہے مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّھْہُ
فِی الدِّیْنِ (جس کے لیے اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس
کو دین کی سمجھ عطا فرما دیتا ہے۔ بخاری ص۱۶ باب العلم) یہی علم
تمام خیر و فلاح کی اصل اور جڑ ہے۔ اسی علم کی فضیلت سے قرآن
وحدیث بھرا پڑا ہے۔ مگر آج ہم میں سے کتنے ہیں جو خود اور
اپنی اولاد کو علم دین سے آشنا کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا
اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْہُ عَمَلُہٗ اِلَّا مِنْ ثَلٰثَۃٍ
صَدَقَۃٍ جَارِیَۃٍ اَوْ عِلْمٍ یُّنْتَفَعُ بِہٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَّدْعُوْ
لَہٗ (جب انسان مرجاتا ہے تو اس کا عمل ختم ہوجاتا ہے
یعنی نہ وہ کوئی عمل کرتا ہے اور نہ اس کو کسی عمل کا نفع پہنچتا ہے
مگر تین چیزیں ایسی ہیں کہ مرنے کے بعد بھی اس کو عمل کا فائدہ
پہنچتا ہے۔ صدقہ جاریہ، علم نافع (علم دین)، اور نیک اولاد
جو اس کے لیے دعا کرتی ہے۔ مسلم شریف، مشکوٰۃ شریف)

غور کیجیے ہم اپنی گاڑھی کمائی کو فضول خرچیوں میں
دنیاوی تعیشات میں کس بے دردی سے خرچ کرتے ہیں مگر
کتنے ہیں جو اس صدقۂ جاریہ کے لیے اپنے مال کو کسی کارِ خیر
میں لگاتے ہیں۔ اسی طرح اپنی اولاد کو ہم میں سے کتنے لوگ
علمِ دین پڑھا کر نیک و صالح بنانے کا سامان کرتے ہیں اور
علم کا خانہ تو خالی ہی پڑا ہے۔ یا تو ہماری اولاد جاہل رہے گی
تعلیم کی طرف توجہ بھی نہیں کرے گی، ہمیں اس کا احساس

بھی نہیں ہو۔ اگر ہماری یہ جاہل اولاد معاشرے میں کیا خرابیاں پیدا کر رہی ہے اور پوری قوم کے لیے کس قدر باعثِ ننگ ہے اور رہا یہ ان کی تعلیم اس نہج پر ہوتی ہے جس میں خدا شناسی اور مذہب آگاہی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ کیا یہی حضورؐ سے محبت اور آپ کی اطاعت کا تقاضا ہے کیا ہم حضورؐ کے حکم اور آپؐ کی مرضی کو پورا کرتے ہوئے علم کی طرف توجہ کرتے ہیں، صدقہ جاریہ کا سامان کرتے ہیں، اپنی اولاد کو نصیحت کرتے ہیں، نماز کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں؟ اور پھر بھی ہم کتنی شان سے آپؐ کی محبت کا جشن مناتے ہیں۔

وعدہ علم کے بعد ہم وعدے کا ذکر کرتے ہیں، وعدہ ہماری معاشرتی زندگی کا ایک عام معاملہ ہے۔ ہم دن رات کسی نہ کسی وعدہ خلافی کرتے ہیں اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ ہم نبی کریمؐ کی محبت کا دم بھرنے والے اور نہایت شان سے آپؐ کی یاد منانے والے ذرا یہ بھی دیکھیں کہ آپؐ کا عمل اور آپؐ کا فرمان کیا ہے۔ بخاری و مسلم میں ایک حدیث عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے مذکور ہے جس میں آپؐ نے منافق کی چار علامتیں ذکر فرمائی ہیں۔ ایک اس میں سے یہ ہے (وَاِذَا عَاهَدَ غَدَرَ) یعنی جب کسی سے عہد و وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرتا ہو۔ قرآن پاک میں ہے۔ (وَاَوْفُوا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا بنی اسرائیل رکوع ۴) یعنی پورا کرو عہد کو بے شک عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا

وعدہ خلافی کرنے والا جھوٹ بھی تو بولتا ہے اس طرح کہ ایک بات کہتا ہے اور اس کے خلاف کرتا ہے۔ اس پر قرآن پاک میں اس طرح تنبیہ کی گئی ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ

سورہ صف رکوع ۱) اے ایمان والو! کیوں کہتے ہو [illegible] تو

وعدہ سے متعلق ابو داؤد اور مشکوٰۃ میں ایک عجیب اور عبرت کی حدیث ہے۔

عَنْ عبد اللہ بن ابی الحسماء قال بایعتُ النبیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قبل ان یبعث وبقیتْ لہ بقیۃ فوعدتُہ اَنْ آتیہ بہا فی مکانہٖ فنسیتُ فذکرتُ بعد ثلاث فاذا ھو فی مکانہٖ فقال لقد شققتَ علیَّ انا ھٰہنا مُنْذُ ثلاث انتظرک۔

عبداللہ بن ابی الحسماء سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعثت سے پہلے ایک معاملہ کیا (اس معاملے میں اور تو ادائیگی ہو گئی) کچھ باقی رہ گیا۔ میں نے وعدہ کیا کہ (جو باقی ہے) وہ لے کر میں اسی جگہ آتا ہوں۔ (آپؐ انتظار فرمائیں) عبداللہ (گھر جا کر) وعدہ بھول گئے۔ تین دن کے بعد مجھ کو یاد آیا۔ (میں وہاں گیا) تو نبی کریمؐ اسی جگہ (جہاں آپ نے ٹھہرنے کو فرما دیا تھا) کھڑے ہوئے انتظار فرما رہے تھے۔ حضورؐ نے (ان کو دیکھ کر) فرمایا۔ تم نے تو مجھ پر بڑی سختی کر دی۔ میں اسی جگہ تین دن سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

اب ذرا اپنا جائزہ لیں تو اس باب میں بھی آپؐ کے قول و فعل اور اپنے عمل میں کتنا بڑا فرق پاتے ہیں۔ ہم کسی سے وعدہ کرتے ہیں۔ قرض کی ادائیگی کا وعدہ، کسی سے ملنے کا وعدہ، کسی جگہ پہنچنے کا وعدہ، کسی کا کوئی کام کرنے کا وعدہ۔ پھر ہم میں کوئی دستکار ہے، کاریگر ہے اس کا وعدہ، غرض تمام امور میں نبی کریمؐ کے عمل اور آپؐ کے حکم سے کوئی مناسبت ہی نہیں، ہمیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ ایک شخص سے کسی خاص وقت پر اس کے قرض کی ادائیگی کو کہہ دیا ہے، وہ غریب نہ صرف یہ کہ انتظار کی زحمت اٹھائے گا بلکہ اس نے ان پیسوں کی بنیاد پر نہ معلوم کیا پروگرام بنایا ہوگا، ممکن ہے اس نے اور کسی سے ان پیسوں کے دینے کا وعدہ کر لیا ہو، اور پھر

ایس۔ ایم۔ وسیم
شعبۂ کامرس

تعلیم۔ مناسب کارکردگی کا مسئلہ

"...اگر تعلیم کی تعریف ایک دو ہی لفظ میں کی جا سکتی ہو تو وہ ہے "مباحثہ"
جہاں "ہم آہنگی" کا بول بالا ہوتا ہے وہاں "علم" مفقود ہوتا جاتا ہے۔ جہاں
"بحث و مباحثہ" سرگرم ہوتا ہے وہاں یہ پھلتا پھولتا ہے۔"

ڈونلڈ موفٹ

اساتذہ، ماہرینِ تعلیم اور منتظمینِ تعلیم سے اکثر گرتے ہوئے تعلیمی معیار، امتحانات اور طلباء کی کارکردگی کے بارے میں سوالات ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے سوالات کرنے والوں میں سے اکثر افراد ذمہ داریوں کا تعین بھی کرتے ہیں۔ کبھی وہ اساتذہ کبھی طلباء اور کبھی سارے سماج کو تعلیمی میدان میں زبوں حالی کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ یہاں یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ اس طرح کی انگشت نمائی سے مسئلہ کا حل نہیں نکل سکتا۔ دراصل ہر ذمہ دار فرد کو مسئلہ کا صحیح حل تلاش کرنے کے لیے خیالات اور اقدامات دونوں ہی میں منصفانہ رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

آج جس دور میں ہم سانس لے رہے ہیں وہ اپنے ساتھ نئے تقاضے لے کر آیا ہے۔ عقل و فہم کی اساس ہمارے لیے اور بھی ضروری ہے۔ کیوں کہ مادیت کے اس ماحول میں اکثر سود و زیاں کے ہاتھوں ہم غلط نتیجے نکال کر منزل سے دور ہی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا تعلیمی مسائل کو سمجھنے اور ان کا مناسب حل نکالنے کے لیے ہمیں مکمل تجزیہ کرنا ہوگا۔

تعلیم اور امتحانات میں گرتی ہوتی کارکردگی کے اسباب کیا ہیں؟ کیا ہم نے تعلیمی نصاب کو نامناسب طور سے بہت بلند کر دیا ہے؟ یا اساتذہ ہی نے خود اپنے طور پر سخت رویہ اختیار کر لیا ہے؟ کیا نصاب میں مضامین اس طرح کے داخل کر دیے گئے ہیں جو نہ اساتذہ ہی اور نہ طلباء ہی

بقیہ مضمون "سیرتِ نبویؐ اور ہمارا طرزِ عمل"

بھی ممکن ہے کہ اس نے جس سے وعدہ کیا ہے وہ ایسا شخص ہو جس کے سامنے وہ اپنی عزت و وقار، زبان اور معاملے میں ضعیف ہونا اور جھوٹا بننا بہت برا جانتا ہو۔ دیکھیے آپ کی ایک وعدہ خلافی نے دوسرے بھائی کو کتنی نوع بہ نوع پیچیدہ الجھنوں میں مبتلا کر دیا اور یہ تو آپ نے اپنا ایک بھائی کا نقصان کیا گویا حقوق العباد میں کوتاہی کے مرتکب ہوئے۔ اس کے علاوہ اللہ کا کتنا بڑا گناہ اور اس کے رسولؐ کی کس قدر نافرمانی کا ارتکاب کیا۔ اسی پر مذکورہ بالا دوسرے معاملات کو قیاس کریں اور اگر ہم نے کاریگر، سنار، دوکاندار یا کسی اور حیثیت کے ذمہ دار ہوتے ہوئے وعدہ خلافی کی تو اپنے کا گاہک و صاحب معاملہ کو کس قدر تکلیف پہنچائی۔ اس کا اندازہ لگایا ہے ہم نے تو کہہ دیا "آج آپ کا کام نہیں ہوا" اور اسکا سارا کام ہی خراب کر دیا اُدھر ہمارے نبیؐ نے کس طرح دل کو دکھنے سے بچایا اپنا اوپر مشقت برداشت کی اور اخلاق کا کمال دیکھیے کہ تین دن کے بعد جب وعدہ کرنے والا آیا تو صرف یہ فرمایا "لقد شققت علی" تم نے تو بڑا تنگ کر دیا۔ عبداللہ ابن ابی حسمار کی حدیث ایک بار پھر ملاحظہ فرمائیں کیا اچھا ہو کہ ہم اس طرح آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنا کر اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کریں۔

(باقی آئندہ)

- یہ سود مند ہیں؟ کیا جسمانی اور ذہنی طور سے ہمارے اساتذہ اور طلباء، دونوں ہی سخت محنت کے عادی نہیں رہ گئے ہیں؟ کیا اب ہم میں باعزت، باہمت اور ذمہ دار اساتذہ نہیں رہ گئے؟ کیا وہ جذبہ جو طلباء کا ماضی میں شایان امتیاز ہوا کرتا تھا اب رخصت ہو چکا ہے؟ اسی طرح کے اور بھی سوالات ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے نظر آئیں گے ان سوالات کے باوجود اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ مسئلہ کا حل نکال کر بات کو اور بھی بگڑنے سے بچانا ہم سب کا فرض ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر ریل کے ڈبہ کے درجۂ حرارت کو موضوعِ گفتگو قرار دیا جائے تو فریقین پانی کو کھولا دینے سے کر اسے منجمد کر دینے والے درجہ حرارت کے حق میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔ اس خیال کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر گفتگو دیانت داری سے نہ کی جائے تو منطق کی کوئی مد نہیں ہے

کیا ہم صرف طلباء کو ذمہ دار ٹھہرا سکتے ہیں؟ کیا ہم اساتذہ کی نامناسب کارکردگی کا شکوہ کرتے رہیں؟ (ہم ایسا کر سکتے ہیں مگر ہمیشہ اور ہر جگہ اس طرح کی صورتِ حال نہیں پائی جا سکتی) کیا ہم والدین اور نگراں حضرات کو اس بحث میں اپنی اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لا کر کھڑا کر سکتے ہیں؟ (بادلِ ناخواستہ ہم ایسا کر سکتے ہیں) اس کے بعد کسی خاندان، سماج اور ساری قوم کا سوال سامنے آتا ہے ان کے الگ الگ تعاون اور اُن کی ذمہ داریوں کا جب خیال آتا ہے تو ہمیں یہ ماننا ہی پڑے گا کہ فرد، خاندان کا، خاندان سماج کا اور سماج سارے ملک اور قوم کا حصہ ہوتے ہیں۔ جب دائرہ بڑھتا ہے اور بین الاقوامی روابط مستحکم ہوتے ہیں تو ایک ملک و قوم ساری انسانی برادری کا ناقابلِ فراموش حصہ بن جاتے ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ طلباء کو اس سلسلہ میں کیا کہنا ہے۔ اُن میں سے بیشتر (اگر وہ دیانتدار محنتی اور فہم رسا رکھنے والے ہیں) کا کہنا ہے کہ اُن کے والدین اور نگراں مضامین منتخب کرتے وقت ان پر دباؤ ڈالتے ہیں یا کم از کم انھیں سمجھا بجھا کر ان کے رجحانات کے برعکس ایسے مضامین پڑھنے پر مجبور کرتے ہیں جن میں اُن کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ انھیں اس کا بھی شکوہ ہوتا ہے، انھیں ان کے تعلیمی رجحانات سمجھنے اور اُن ہی کے بموجب مضامین اختیار کرنے کے لیے مناسب ماہرین اور اداروں کی سہولیات فراہم نہیں کی جاتیں۔ کبھی کبھی وہ اساتذہ کے رویہ اور ان میں سے بعض کے طریقۂ درس و تدریس کی شکایت بھی کرتے ہیں۔ ہمیں یہ کہنے میں کسی طرح کی جھجک محسوس نہیں کرنا چاہیے کہ کبھی کبھی وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ موجودہ دور میں وہ اہم ترین مسئلہ جس سے ہماری یونیورسٹیاں دوچار ہیں، اچھے اساتذہ کی کمی ہے۔ مناسب تعداد میں باصلاحیت اور لگن رکھنے والے اساتذہ کی فراہمی کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

مندرجہ بالا حقیقت اگر زیادہ آمدنی والی یونیورسٹیوں کے لیے سچ ہے تو کم تنخواہ دینے والے اسکولوں اور کالجوں کے لیے یہ اور بھی واضح حقیقت بن جاتی ہے (اور یہی ادارے ہماری یونیورسٹیوں کے لیے طلباء تیار کرتے ہیں)

یہ بات یہاں پر واضح کر دینا چاہیے کہ شکایات کرنے والے یہ طلباء اگر دیانت داری سے اپنے اپنے مضامین پڑھنے میں ٹھیک نہیں ہیں تو یہ کبھی بھی حق بجانب نہیں ہو سکتے۔ بہرحال ہمیں بہتر کارکردگی کے لیے باصلاحیت اساتذہ کی تعداد بڑھانی ہوگی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اس سمت میں ہمیں محنت کرنی ہوگی۔ کیوں کہ جیسا کہ رپورٹ برائے یونیورسٹی تعلیم ۱۹۶۵ء

Report on Standards of University Education, 1965

میں بیان کیا گیا ہے۔ "کسی سماج میں معیاری صلاحیت رکھنے والے افراد کی تعداد کم ہوتی ہے۔ جبکہ مختلف اسامیوں کے لیے مختلف شعبوں جیسے انتظام، تجارت وصنعت اور دوسرے روزگاروں، میں ان کی مانگ ہوتی ہے"۔[1] اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے باصلاحیت افراد تعلیمی اداروں کو چھوڑ کر زیادہ آمدنی کے لالچ میں دوسرے شعبوں میں جاتے رہے ہیں۔

طالب علموں کی طرف سے کتب کی فراہمی، لیب [Lab] کے سامان اور اساتذہ کی طرف سے مناسب ہمت افزائی کی کمی کی شکایت بھی کی جاتی ہے۔ جہاں تک وسائل کا سوال ہے اعداد وشمار سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ جہاں کہیں یہ فراہم ہیں، وہاں بھی اُن کا مناسب اور بھرپور استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔ "کہیں اور کارآمد صلاحیت اور عزم" کا استعمال تعلیمی ادارے میں کرنے والا مدرس دراصل ایک سماجی اور اقتصادی مسئلہ ہے کیوں کہ جب تک ہم "پہلے ملنے والی پہلے منظور کی جانے والی نوکری کے اصول"[2] [First-Come, First-Accepted Theory of Employment] پر خاص کر ترقی پذیر ممالک میں کارفرما نظر آتا ہے، کاربند رہیں گے، یہ مسئلہ بدستور قائم رہے گا۔ بالفاظ دیگر جب تک ہم ذہن رسا رکھنے والے باصلاحیت اساتذہ کی تقرری پر زور نہیں دیں گے اس وقت تک نہ یہ کہ تعلیمی کارکردگی کا مسئلہ بنا رہے گا، بلکہ دیگر مسائل بھی وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہیں گے۔ البتہ وہ طلبہ جو کسی دباؤ یا لالچ کے تحت مضامین اختیار کرتے ہیں انھیں اس وقت اساتذہ کی تعلیمی کارکردگی کی شکایت کرنے کا حق نہیں پہنچتا جب تک وہ اپنے تعلیمی مشاغل میں اظہار دلچسپی نہ رہیں۔ جہاں تک وسائل کی کمی کا سوال ہے، یہ مسئلہ فراہمی مال [Finances] سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا حل ترقی پذیر معیشت میں ڈھونڈتے رہنا چاہیے۔ جس میں یہ جائز طور پر امید کی جا سکتی ہے کہ تعلیمی بجٹ بھی ساتھ ساتھ بڑھتا رہے گا کیوں کہ تعلیم اور قومی فلاح و بہبود کا ایک پُرمعنی رابطہ ہے۔ مناسب نتیجے برآمد کرنے کے لیے پُرمعنی تعلیمی منصوبہ بندی [Meaning-ful Educational Planing] کی ضرورت پر زور دیتے رہنا چاہیے۔ تاکہ ہر سطح پر تعلیمی معیار بلند ہوتا رہے اور مناسب تعداد میں تعلیم وتربیت یافتہ افراد کی فراہمی ہوتی رہے۔ تعلیم کو بامقصد بنانے کے لیے ، مختلف مضامین اس طرح وضع کیے جا سکتے ہیں کہ ہر شخص اپنی پسند و دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے، اپنی تعلیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے اس طرح یہ مسئلہ ملک کی ترقی پذیر معیشت کے تقاضوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔

اسی طرح اگر ہم اساتذہ سے رابطہ قائم کریں تو اُن میں

---

[1] رپورٹ آن اسٹینڈرڈ آف یونیورسٹی ایجوکیشن، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن۔ نئی دہلی ۱۹۶۵ء صفحہ ۶۳

[2] ایضاً صفحہ ۶۳ [3] پس ماندہ معیشت میں اس طرح کے حالات نہیں ہوتے کہ روزگار کے مواقع خاطرخواہ اندازسے مہیا رہیں یہی وجہ ہے کہ بڑھتے ہوئے روزگار کے متلاشی افراد، روزگار کے معاملے میں اپنی پسند کا روزگار حاصل ہونے تک انتظار نہیں کر سکتے کیوں کہ اُن کے معاشی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے کیوں کہ وہ بے روزگاری کی لاگت برداشت نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی کوئی نوکری ان کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے وہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اس طرح ہر فرد پہلے ملنے والی نوکری کو قبول کر کے اپنے کو حالات کے حوالے کر دیتا ہے۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو فوراً اس غلطی کا تدارک کر لیتے ہیں۔ ورنہ زیادہ تر اپنی پسند اور مہارت کے برخلاف کام کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح ترقی پذیر ممالک میں محنت کا ایک بڑا حصہ برباد ہو جاتا ہے۔ [First Come, First Accepted Theory of Employment] مصنف نے ۱۹۷۱ء میں وضع کی تھی۔

سے بعض طلبا کے کاندھوں پر ذمہ داری رکھ کر انھیں مورد الزام ٹھہرائیں گے۔ وہ شاید یہ کہتے ہوئے نظر آئیں گے کہ طلبار کی ایک بڑی تعداد دراصل تعلیم میں دلچسپی ہی نہیں رکھتی، نہ وہ علم رکھتے ہیں اور نہ ہی علم کے خواہاں ہیں۔ وہ درجات میں باقاعدگی سے آتے ہی نہیں اور نہ ہی اپنا کام ذمہ دارانہ طور پر انجام دیتے ہیں۔ اساتذہ کو "خوش" کرنے پھرتے ہیں ان کی "عزت" نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہمارے ملک میں موسم بھی ایک حد تک تعلیمی کارکردگی پر اثرانداز ہوتے ہیں — ان کا اثر ذہن و جسم دونوں ہی پر پڑتا ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر تعلیمی سال وقت پر ختم نہ ہو تو گرما میں جسمانی اور ذہنی کدوکاوشوں سے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ مناسب قیمتوں پر اچھی کتب بھی طلبار کو فراہم نہیں ہیں۔ ان کی نامناسب غذا اور لباس بھی اُن میں سے اکثر کی صحت پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ طلبار میں نظم و نسق کی کمی انھیں ان اقدامات پر اکساتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی نا زیبا شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اساتذہ کا یہ بھی خیال ہے کہ والدین اور نگراں حضرات بھی طلبار کی زندگی میں اکثر دلچسپی نہیں لیتے جبکہ وہ تعلیمی میدان میں مناسب کارکردگی کا شکوہ کرتے رہتے ہیں۔

مندرجہ بالا مسائل کا ہمیں تجزیہ کرنا چاہیے: درجات کو چھوڑنے، اکثر غیر حاضر رہنے یا چھٹیوں کی درخواست دینے تعلیمی کام کو پورا نہ کرنے کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں — صحت، عادت یا گھریلو وجوہات۔ جہاں تک عادت کا تعلق ہے ہمیں روسو (Rousseau) کا ہم خیال ہونا پڑے گا، جس کا کہنا تھا کہ "وہ واحد عادت جس کا بچوں کو عادی ہونا چاہیے وہ بھی کوئی عادت نہ رکھنا ہے"[۱]
The only habit the child should be allowed to contract is that of having no habit.

یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ذہنوں کے ناپختہ ہونے، خیالات کے ہجوم اور اپنے اطراف و ماحول کے اثرات، ہماری عادت کی تشکیل میں کارفرما نظر آتے ہیں۔ ماہرین نفسیات، والدین و نگراں سب ہی کو ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتے چلے آئے ہیں۔ اپنے ماضی کے اثرات قبول کیے ہوئے، اپنی عادت کا شکار معصوم طالب علم جب اساتذہ کے سامنے آتا ہے تو کیا انھیں مایوسی کا شکار ہو جانا چاہیے؟ ہرگز نہیں! ایک طبیب کبھی نا اُمید نہیں ہوتا۔ مگر سماج کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ بیماری کو ہونے سے روکنا اس کے علاج سے بہتر ہے۔ جسمانی اور ذہنی صحت کو برقرار رکھنے اور اس کو بہتر بنانے کا تعلق اپنے اطراف و ماحول کو صاف ستھرا رکھنے سے بھی ہے جس میں والدین، نگراں اور اساتذہ سب ہی برابر کے شریک ہیں۔ اس ذمہ داری کا بوجھ ان پر زیادہ ہے جن کے ساتھ طلبار زیادہ وقت گزارتے ہیں (حالاں کہ ذہنی نشو ونما اور وقت کی ایک مدت کے بعد خود طلبار کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ خود اپنے برے و بھلے کی پہچان کریں) اس طرح تعلیمی اداروں میں اپنے گھروں سے آنے والے طلبار کے سلسلہ میں خود اُن کے والدین و نگراں اور ہالوں (Halls) اور دارالاقامہ (Hostels) میں رہنے والے طلبار کی طرف اُن کے پرووسٹ صاحبان (Provosts) اور وارڈن صاحبان (Wardens) کی بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ انھیں عمل صالح کی ترغیب دیں اور اعمال قبیحہ کے برے نتائج سے آگاہ کرتے رہیں تاکہ طلبار اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر شاندار مستقبل کے حامل بن جائیں۔

"گھریلو وجوہات" کے ذیل میں ہم غیر صحت مند ماحول، والدین اور نگراں حضرات کی طلبار کے تعلیمی مشاغل سے لاتعلق

[۱] جیمس راس "گراؤنڈ ورک آف ایجوکیشنل تھیوری" صفحہ ۸۰

ثریا حسین
شعبۂ اردو

مولانا حسرت موہانی

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کے سن پیدائش کے بارے میں تذکرہ نگار مختلف الخیال ہیں۔ لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ وہ اکتوبر ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اسی مناسبت سے آج کل مختلف مقامات پر صد سالہ جشن ولادت کے جلسے اور مذاکرے ہو رہے ہیں۔ جنگ آزادی کے اس اہم اور غیر معمولی سپاہی کے مجاہدانہ رول کو ہم نے ابتک بھلائے رکھا تھا۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہم نے اب اسے یاد کیا۔

حسرت قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم قدیم طرز کے مکتب میں حاصل کی۔ پھر گورنمنٹ ہائی اسکول فتحپور سے انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا نتیجہ گزٹ کے ذریعہ جب ڈاکٹر ضیاء الدین کی نظر سے گذرا تو انھوں نے اس ہونہار نوجوان کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی۔

وہ ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ آئے اور ایف۔ اے میں داخلہ لیا۔ حسرت جواودھ کی جاگیردارانہ تہذیب کے پروردہ تھے۔ علی گڑھ پہنچے تو ہاتھ میں پاندان تھا، جسم پر نفیس انگرکھا اور پاؤں میں پرانی وضع کا جوتا۔ زندہ دلان علی گڑھ کب چوکنے والے تھے "خالہ اماں" کا خطاب ملا اور سجاد حیدر یلدرم نے ان کی ہیئت کذائی پر اپنی مشہور نظم "مرزا پھویا" لکھی۔ لیکن بہت جلد حسرت اپنی غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر علی گڑھ کے ادبی حلقہ میں مقبول ہوئے اور انقلابی خیالات کی وجہ سے یونیورسٹی کے سامراج نواز ارباب حل وعقد کے لیے ایک مسئلہ بن گئے۔

حسرت اساتذہ اور بزرگوں میں بالخصوص پروفیسر بیکر ورتھ، ڈاکٹر ضیاء الدین، آفتاب احمد خاں، محسن الملک اور وقار الملک کا عقیدت سے ذکر کرتے ہیں۔

انجمن اردوئے معلیٰ کے بانی سجاد حیدر یلدرم

—— بقیہ مضمون "تعلیم مناسب کارکردگی کا متمنی" ——

یا عدم دلچسپی [چاہے وہ جان بوجھ کر ہو یا جہالت کی وجہ سے ہو] رکھ سکتے ہیں۔ یہاں ہم والدین ونگراں حضرات کو ذمہ دار پاتے ہیں۔ انھیں اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے۔ اس کے ماسوا سمینار اور اسی طرح کے دوسرے ذرائع سے انھیں باخبر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ مشترکہ کمیٹی [Joint Committees] کی تشکیل بھی دی جاسکتی ہے۔ تاکہ اساتذہ ووالدین بھی مسئلہ سے باخبر رہیں اور اس کا حل تلاش کرتے رہیں۔ لیکن تعلیم کے پہلے شکار طلباء [First Victim of Education] کا مسئلہ ذرا ٹیڑھا ہے۔ ان کی طرف باخبر پڑوسیوں، سماجی کارکنان اور اساتذہ سب ہی کی ذمہ داری۔ تاکہ وہ اندھیروں کی ڈگر چھوڑ کر علم ونور کی شاہراہ پر گامزن ہوں۔

باقی
آئندہ
شمارہ میں

تھے۔ ان کے بعد حسرت موہانی دو سال تک ناظم رہے۔ ۱۵ مئی ۱۹۰۲ء کے جلسے میں حسرت نے اپنی مثنوی "مشاعرہ شعرائے قدیم در عالم خیال" سنائی۔ جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ اسی جلسے میں فانی نے ایک قصیدہ پیش کیا۔ مہمان شعراء میں میر مہدی مجروح، امیر اللہ تسلیم اور گستاخ رامپوری شامل تھے۔ دن و رات شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتیں اور یونین ہال میں تقریریں ہوتیں۔ سجاد حیدر یلدرم، مولانا شوکت علی قاضی تلمذ حسین اور ابو محمد، حسرت کے معاصرین تھے۔

۱۹۰۳ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج سے بی۔ اے پاس کرنے کے بعد حسرت نے اعلیٰ سرکاری ملازمت کے بجائے اپنے آپ کو ملک و قوم کی خدمت و فلاح اور شعر و فن کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔

علی گڑھ کی ادبی صحبتوں نے بہت جلد ان کے ادبی ذوق میں وہ نکھار پیدا کیا کہ اُن کی ادبی اور سیاسی سرگرمیاں زمانۂ طالب علمی میں ہی شباب پر پہنچ گئیں۔ اُن کے علمی مشاغل میں سے ایک کارنامہ رسالہ "اردوئے معلّیٰ" کا اجراء ہے جس کا ڈیکلریشن انھوں نے بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی داخل کر دیا تھا۔ اسی سال اردوئے معلّیٰ جاری ہونے پر شہر میں ایک مکان کرایہ پر لے کر اقامت اختیار کر لی اور ہمہ وقت ادب و سیاست میں مصروف ہو گئے اردوئے معلّیٰ کسی نہ کسی طرح ۱۹۲۹ء تک جاری رہا۔ اس دوران انھوں نے شعرائے متقدمین کے نایاب دواوین کی تدوین و اشاعت کا کام کیا اور انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو کر آزادی کی جد و جہد میں لگ گئے۔

سیاسی اعتبار سے وہ کانگریس کے گرم دل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ انھوں نے بال گنگا دھر تلک کو اپنا قائد بنایا۔ موتی لال نہرو اور گوکھلے جیسے نرم رفیقوں پر تحریر و تقریر کے ذریعہ نکتہ چینی کرتے رہے۔

۱۹۰۷ء سورت سیشن میں جب بال گنگا دھر تلک کی پارٹی کانگریس سے نکلی تو حسرت بھی اس میں شامل تھے۔ انھوں نے دفاعی مزاحمت کے درمیانی طریقے کو بطور لائحہ عمل پیش کیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ دینے والے ـــ حسرت موہانی تھے۔

۱۹۰۸ء میں مصر کے مشہور لیڈر مصطفیٰ کامل کی موت پر اردوئے معلّیٰ میں ایک گمنام مضمون شائع ہوا جس میں مصر میں انگریزوں کی حکمتِ عملی پر سخت تنقید کی گئی تھی اس پر گورنمنٹ کی طرف سے مقدمہ چلا اور دو سال کی قید ہوئی۔ یہ ہندوستان کا پہلا سیاسی مقدمہ تھا جو ایک سول کورٹ میں چلا۔ جیل خانے میں حسرت نے وہ شعر کہا جو بےحد مشہور ہوا ـــ

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

قیدِ فرنگ سے ان کے سیاسی خیالات میں شدّت پیدا ہوئی۔ انھوں نے تشدد اور گوریلا طریقۂ جنگ کی حمایت کی ملک کی تاریخ آزادی میں یہ شرف حسرت کو حاصل ہے کہ انھوں نے "مکمل آزادی" کی آواز اس وقت بلند کی جب مہاتما گاندھی جیسے رہنما بھی اس کو قبل از وقت خیال کرتے تھے

سودیشی تحریک میں بھی حسرت کی اولیت مسلم ہے کیوں کہ انھوں نے کھدر کا استعمال پہلے ہی سے شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے ابتداء سے اس تحریک کو فروغ دینے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ چھوڑا۔ سودیشی کا پرچار صرف زبانی ہی نہیں تھا۔ بلکہ عملاً سودیشی مال کے استعمال کو عوام میں رائج کرنے کے لیے سودیشی اسٹور کھولا، جو وسائل کی کمی کے باوجود ان کی دوڑ دھوپ سے کامیاب رہا۔

کانپور میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کی کانفرنس
۱۹۲۵ء میں ہوئی۔ مولانا حسرت مجلسِ استقبالیہ کے صدر
تھے۔ خطبہ میں کہتے ہیں۔

"کمیونزم کاشتکاروں اور مزدوروں کی تحریک
ہے...... مگر سرمایہ داری کے خلاف تو اسلام کا
فیصلہ شاید کمیونسٹ عقیدے سے بھی زیادہ سخت
ہے اور فریضۂ زکوٰۃ کا منشا بھی زیادہ تر یہی ہے
کہ خلقِ خدا میں جب تک ایک شخص بھی بھوکا رہے
اس وقت تک مال داروں کو عیش کرنے کا کوئی
حق نہیں ہے۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمیونسٹ تحریک سے وابستگی کے باوجود حسرت راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔

وہ مادرِ درسگاہ کی آزادی اور مخصوص کردار کے لیے بھی کوشاں رہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں جب مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ سامنے آیا تو حسرت نے زور دیا کہ مجوزہ تعلیمی ادارہ آزاد ہونا چاہیے اور ملک کی دیگر مسلم درسگاہوں کے الحاق کا اسے حق حاصل ہو۔

اس سلسلے میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار جوش و خروش سے کیا اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ حکومت کی آنکھوں میں کھٹکنے لگے اور دوسری بار سنہ ۱۹۱۶ء میں للت پور جیل میں قید کر دیے گئے۔

حسرت زندگی بھر چاہے قید خانے کی سلاخوں کے اندر ہوں یا باہر، عشق و محبت کے تجربات خلوص و سادگی سے بیان کرتے رہے۔

حسن بے پرواہ کو خود بیں و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہارِ تمنا کر دیا

ہے زبانِ لکھنؤ میں رنگِ دہلی کی نمود
تجھ سے حسرت نام روشن شاعری کا ہو گیا

مولانا حسرت ایک پرگو شاعر تھے۔ ان کا شعری سرمایہ تیرہ ۱۳ دواوین اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے۔ ہر دیوان کی ابتدا میں شاعر کا لکھا ہوا دیباچہ موجود ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ متعلقہ غزلیات کا زمانہ کیا ہے، کہاں لکھی گئی ہیں اور کن رسائل میں پہلی بار چھپی ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد تقریباً سات ہزار ہے جو آدھے سے زیادہ قید کے دوران کہے گئے۔

حسرت کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ بیشتر وقت پڑھنے لکھنے میں گزارتے تھے۔ انھیں اساتذۂ فن کی تخلیقات سے گہری دلچسپی تھی۔ شعریات سے متعلق نظریات کا اظہار ان کے تین رسالوں "متروکاتِ سخن"، "معائبِ سخن" اور "محاسنِ سخن" میں ہے جن میں مثالوں کے ذریعہ شعر کے حسن و قبح سے بحث کی گئی ہے۔

حسرت پابندی سے ڈائری لکھتے تھے۔ ان روزنامچوں اور مکاتیب سے خود ان کو اور ان کے عہد کے سیاسی اور ادبی فضا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ وہ اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گئے تھے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ ہندوستانی پارلیمنٹ کے ممبر ہوتے لیکن اسی سادگی اور قلندری کی زندگی بسر کرتے رہے جو شروع سے ان کا شیوہ تھا۔ ان کی طبیعت اس اعتبار سے طرفہ تماشا تھی کہ ایک طرف اپنے آپ کو مادرِ وطن کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا تو دوسری جانب اردو غزل کو انھوں نے جو نئی زندگی عطا کی وہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جس کی بنا پر انھیں اردو ادب میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔
علی گڑھ سے حسرت کا بڑا قریبی تعلق رہا ہے۔ ان کی قومی، سیاسی، صحافتی اور علمی و ادبی خدمات اس درسگاہ کی سرخروئی کا باعث بنیں۔ اس مجاہدِ آزادی کی دلآویز و حق پرست شخصیت، بلند افکار اور ان کے منفرد اسلوب متقاضی ہیں کہ ان کی بازیافت کی جائے۔

منظر عباس نقوی
شعبۂ اردو

جوش ملیح آبادی - ایک تاثر

۲۲ فروری ۱۹۸۲ء کو برصغیر ہندوپاک کے نامور شاعر شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کا پاکستان کے دارالسلطنت اسلام آباد میں انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

پچھلے دنوں ہندوستان کے ادبی حلقوں میں یہ خبر کافی گرم تھی کہ عنقریب بغرض علاج ہندوستان آنے والے ہیں۔ لیکن ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

۱۹۲۴ء میں جب وہ بسلسلۂ روزگار دکن جانے پر مجبور ہوئے تھے تو انھوں نے "الوداع" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی اور اپنے وطنِ عزیز ملیح آباد سے مفارقت پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے یہ وصیت کی تھی کہ ؎

حشر تک رہنے نہ دینا تم دکن کی خاک میں
دفن کرنا اپنے شاعر کو وطن کی خاک میں

افسوس کہ اُن کے اہلِ وطن اپنے شاعر کی اِس وصیت کو پورا نہ کرسکے اور جوش "خاکِ وطن" سے محروم رہے

وہ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے اس حساب سے اب اُن کی عمر پچاسی سال سے متجاوز تھی۔ بعض شاعرانہ بےاعتدالیوں کے سوا عمومی طور پر اُن کے مشاغل اور معمولات میں بڑا نظم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کبرسنی کے باوجود ان کی صحت، سوائے آخری چند ماہ کے، بہت اچھی رہی "یادوں کی برات" میں جو صرف چند سال پہلے شائع ہوئی تھی، ایک جگہ لکھتے ہیں "لوگ کہتے ہیں قیامت آئے گی تو کوئی زندہ نہیں رہے گا لیکن مجھے دیکھیے کہ تھارہ قیامتیں (مراد اٹھارہ معاشقے) میرے سر سے گزر چکی ہیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں اور شاخِ حیات پر اونگھتا نہیں بیٹھا بلکہ جی بھر کے آج بھی چہچہا رہا ہوں — ع

آفریں باد بریں ہمتِ مردانۂ ما

جوش صاحب کی شعرگوئی کا آغاز، جیسا کہ خود اُن کا بیان ہے، ۹ سال کی عمر ہی سے ہوگیا تھا۔ ابتدائی کلام تقلیدی اور روایتی رنگ میں ہے۔ پہلا مجموعۂ کلام "روحِ ادب" کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۴ء تک وہ ریاست حیدرآباد دکن میں دارالترجمہ سے وابستہ رہے حیدرآباد چھوڑنے کے بعد سیاسی رنگ کی شاعری کا زور شروع ہوا اور برطانوی سامراج کے خلاف "پیمانِ محکم"۔ "غلاموں سے خطاب" "حسن اور مزدوری"۔ "آثارِ انقلاب"۔ "زوالِ جہانبانی" "بغاوت"۔ "شکستِ زنداں کا خواب" "وطن" وغیرہ جیسی ولولہ انگیز نظموں کے باعث 'شاعرِ انقلاب' کے لقب سے مشہور ہوگئے۔ ایک زمانے میں اُن کا یہ شعر بچے بچے کی زبان پر تھا ؎

کام ہے میرا تغیّر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان میں اُن کی ویسی ہی قدر و منزلت ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ حکومت ہند کے اعلیٰ ترین اعزاز "پدم بھوشن" سے نوازا گیا۔ وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اُن کے قریبی دوستوں اور مداحوں میں سے

ے۔ زندگی میں ہر طرح کی آسائش تھی، لیکن بعض ذاتی وجوہ کی
ا پر انھوں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ اُن کے اس فیصلے
ے ہندوستان میں ہر دل دکھی تھا۔ لیکن مشورہ دینے والے مشورہ
ہی تو دے سکتے تھے مجبور تو نہیں کر سکتے تھے۔ زندگی کے آخری
بچیس سال جوش صاحب نے پاکستان میں گزارے۔ یہ الگ بات
ہے کہ ان کا انتقال ان کے مولد سے بہت دور اسلام آباد میں
ہوا لیکن ہندوستان کے رہنے والوں کو اُن سے جو محبت
اور عقیدت تھی اُس میں کسی وقت بھی کوئی کمی نہیں آئی۔

وہ بلاشبہ علامہ اقبال کے بعد بیسویں صدی میں برصغیر
ہند و پاک کے سب سے مشہور اور ممتاز شاعر تھے۔ اردو میں
نظم جدید کی تحریک جس کی داغ بیل مولانا محمد حسین آزاد اور
خواجہ الطاف حسین حالی نے ڈالی تھی، جوش کی نظم گوئی کو اس کا
نقطۂ عروج کہا جا سکتا ہے۔ ہم مستقبل سے مایوس نہیں لیکن اردو
شاعری میں زبان و بیان اور ہیئت کے جو نت نئے تجربے ہو رہے
ہیں اور جس طرح جدید شاعری صحت زبان، پابندی قافیہ و ردیف
اور التزام وزن و بحر کی قیود سے روز بروز آزاد ہوتی جا رہی
ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے یہ تاثر غلط یا غلط نہ ہو کہ جوش کے ساتھ
اردو شاعری کا وہ دور ختم ہو گیا جس میں تجربہ کا مطلب روایت
سے انحراف نہیں بلکہ روایت کی توسیع ہوتا تھا اور خیال کی
اہمیت کو تسلیم کرنے کے باوجود آداب زبان سے بے نیازی
کسی کو گوارا نہ تھی۔

ہو سکتا ہے کہ ناقدین شعر و ادب کو جوش کے کلام میں
گہری فکر کی کمی نظر آئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کے یہاں کوئی
مربوط و منضبط تصورِ حیات نہ مل سکے لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا
چاہیے کہ ادبیات خصوصاً شاعری میں فکر و فلسفہ کی حیثیت
ثانوی ہوتی ہے۔ ادب کی پہلی شرط صحتِ زبان اور ندرتِ
اسلوب ہے۔ ہم لاکھ فلسفہ بگھارا کریں۔ اگر اپنی بات کو
خوبصورتی سے ادا کرنے کا سلیقہ نہیں آتا تو شاعر ہونے
کے سارے دعوے پوچ اور مہمل ہیں۔ جوش نے اردو زبان
کو الفاظ، تراکیب، استعارات اور تشبیہات کا جو گراں قدر
ذخیرہ عطا کیا ہے اس کی نظیر انیسویں صدی کے انیس اور
اٹھارویں صدی کے نظیر اکبر آبادی کے سوا اور کہیں نہیں
مل سکتی، اور یہی جوش کا وہ شاندار کارنامہ ہے جو دورِ
حاضر میں اُن کی عظمت تسلیم کرانے کے لیے بہت کافی ہے۔

اردو شعر و ادب کا وہ کون سا دیانتدار اور انصاف پسند
قاری ہوگا جو 'روح ادب'، 'شعلہ و شبنم'، 'رامش و رنگ'،
'سموم و صبا'، 'نقش و نگار'، 'عرش و فرش'، 'جنون و حکمت'،
'حرف و حکایت'، 'سیف و سبو'، 'سرود و خروش'، 'فکر و نشاط'،
'آیات و نغمات' اور 'الہام و فکر' کا مطالعہ کرے اور یہ
کہنے پر مجبور نہ ہو کہ بلاشبہ جوش کا شعری سرمایہ، کیا کمیت
اور کیا کیفیت، دونوں اعتبار سے بڑا گراں بہا اور قابل قدر
ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ان کے تصنیفی سرمائے میں نثر
میں "کراچی" یا "یادوں کی برات" ہے تو نظم میں شعری مجموعوں
کا ایسا شاندار کارواں بھی ہے، جس کا طمطراق، آن بان
شوکت و تجمل، طمطراق، خوش سلیقگی، نفاست اور اہتمام
ہمارے ذہنوں کو مسحور کیے بغیر نہیں رہتے اور ہم یہ تسلیم
کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ الفاظ کے تنوع، زبان کے شکوہ
اسلوب کی توانائی اور تشبیہات کی بوقلمونی کے معاملے میں اس
صدی کا کوئی دوسرا شاعر نہیں جسے جوش کا حریف قرار
دیا جا سکے۔

اقبال کو اپنے ملک کے ہنروروں سے
شکوہ تھا کہ ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

جوشؔ نے اپنی شاعری سے اقبال کی یہ شکایت دور کردی۔ اُن کے کلام میں بے ذوقی، مردہ دلی، افسردگی اور آہ وزاری ڈھونڈنے نہیں مل سکتی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بقول اقبال ؎

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

نوائے جوشؔ کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ خواہ وہ اُن کی خمریات ہوں یا شبابیات، رنگ و بو کا تذکرہ ہو یا فکر و حکمت کی باتیں، اسلامی نظمیں ہوں یا سیاسی، ہر جگہ ان کے کلام میں شادکامی، کامرانی، قوت و حیات اور جوش و خروش کی فضا پائی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے نہ کبھی اپنی رندی کو بیماری بننے دیا اور نہ اپنی حسن پرستی کو ایک کمزوری۔ ان کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ بادہ و ساغر کے تذکروں میں حکیمانہ ہوش مندی اور کاکل و رخسار کی داستانوں میں ذہنی صحت مندی اور اعصابی توانائی ہر جگہ فعّال اور کارفرما ہے۔ اسی طرح اُن کی عشقبازی ہو یا مظاہرِ فطرت سے وابستگی، نہ اس میں خواب آوری کی کیفیت ہے اور نہ اس میں مایوسی و محرومی کی فضا۔ ایک زمانہ تھا کہ اُن کی سیاسی اور خطیبانہ شاعری نے ملک میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اس لیے آج بھی جب ہم ان کی اس قسم کی نظموں کو پڑھتے ہیں تو ہمارے کانوں میں "انقلاب، انقلاب" کی صدائیں گونجنے لگتی ہیں۔ اس شاعری کو ہنگامی کہہ کر اس کی قدر و قیمت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ بات یہ ہے کہ کوئی بھی سیاسی یا سماجی تحریک ہو، اس کی اساس کچھ اعلیٰ درجے کی انسانی قدریں ہوتی ہیں۔ تحریکیں وقت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں، لیکن قدریں باقی رہتی ہیں۔ حریت پسندی، حق گوئی، بے باکی، سماجی انصاف یہ وہ قدریں ہیں جن کی اہمیت سے ہم کسی زمانے میں بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اگر ان کی معنویت باقی ہے تو وہ خطیبانہ شاعری بھی جس کی محرک یہ اقدارِ عالیہ ہوں کبھی مُردہ و فرسودہ نہیں ہو سکتی۔

جوشؔ نے حسینؓ اور حسینیت کے موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، بہت خوب لکھا ہے لیکن اُن کی تصنیف میں گریہ وزاری کے بجائے ہمیں اعلانِ کلمۃ الحق کے وہ تیور اور مجاہدانہ سرفروشی کے وہ جلوے دکھائی دیتے ہیں جن کے مجموعے کو اقبال نے اپنے ایک شعر میں "مستیٔ کردار" سے تعبیر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جوشؔ نے مرثیے کی صنف کو ایک نیا آہنگ اور نیا اسلوب عطا کیا ہے اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہو کہ آج چاہے ہندوستان ہو یا پاکستان جہاں بھی انقلابی رنگ کے جدید مرثیے لکھے جا رہے ہیں یہ سب کچھ جوشؔ کی صدائے بازگشت ہے۔

آخر میں اتنا اور عرض کروں گا کہ جوشؔ کی شاعری الفاظ و معانی کی ایک کائنات ہے اور ضرورت ہے کہ ادب کے سنجیدہ طلبہ جوشؔ کی زندگی اور شاعری کا تحقیقی انداز میں مطالعہ کریں اور اس کام کے لیے ہندوستان میں علی گڑھ سے زیادہ موزوں کوئی دوسری جگہ نہیں ہو سکتی۔

(شعبہ تاریخ)

سین ٹیفک سوسائٹی کے مقاصد

کچھ انجمن اور ادارے مستقبل کے نقیب ہوتے ہیں۔ ان کی نوعیت اور نوا کو سمجھنا اور یاد رکھنا اچھے ذوق اور اعلیٰ ذہن کی شناسندگی ہے۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ایک ناکام بغاوت تھی مگر کامیاب احتجاج تھا۔ اس نے استبداد کے پاؤں جما دیے مگر نئے اداروں کو جنم دیا۔ کچھ حضرات مشرق کے آثار علمی اور انداز زندگی کی حفاظت اور بچاؤ میں لگ گئے اور کچھ صاحب نظر اشخاص نئے شعور اور جدید علوم کے استقبال میں منہمک ہو گئے۔ ہندوستان کے مشرق میں عبداللطیف اور ہندوستان کے مغرب میں (سر) سید احمد خاں نے جدید علوم اور نئی اقدار کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۶۰ء کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں میں کچھ انجمنیں قائم کی گئیں جن کے نام ان علاقوں کی تہذیب اور آداب کی بھی نمائندگی کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں ایک انجمن جلسۂ تہذیب کے نام سے قائم ہوئی جس کی لائبریری اور عمارت آج بھی ہے لاہور میں انجمن پنجاب کی بنا ڈالی گئی۔ دہلی اور بریلی میں لٹریری سوسائٹی کے نام سے انجمن بنی۔ اٹاوہ اور میرٹھ میں ڈبیٹنگ سوسائٹی قائم ہوئیں۔ ان انجمنوں کے مقاصد میں نئی تعلیم کی ضرورت اور سماجی اصلاح پر بہت زور دیا گیا تھا۔ یہ بہت ضروری باتیں تھیں اب قدامت کی قسم پائی کا عام احساس ہونے لگا تھا۔ غلامی کے اسباب سمجھ میں آنے لگے تھے مگر ان کا اظہار براہ راست نہ تھا۔

سرسید جو ہمارے قومی قافلے کے دیوپیکر رہنما ہیں انھوں نے ۱۸۶۳ء میں کلکتہ کے سفر کے بعد نئے انداز سے سوچنا اور کچھ کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ان کو شاید معلوم ہو گیا تھا کہ انگریزی حکومت کے جاہ اور جلال کے پیچھے سائنس کا جمال بھی ہے۔ سرسید اصلاح سے زیادہ تبدیلی کے ترجمان تھے۔ انھوں نے غازی پور میں ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی طرح ڈالی اور ہندوستان میں نئے علمی سیکولرزم کی بنیاد رکھ دی۔ اس انجمن میں مسلمان، انگریز اور ہندو برابر کے شریک تھے ذرا ان کے اجزائے ترکیبی ملاحظہ کیجیے۔ ڈبلو۔ جے براملے W. J. Bramley اس کے صدر تھے۔ راجہ جے کشن داس نائب صدر تھے اور سرسید احمد اس کے سکریٹری تھے

مقاصد کی اہمیت اور عظمت کا اندازہ مندرجہ ذیل اصولوں سے لگائیے

"اس مجمع کا نام سین ٹیفک سوسائٹی یعنی علمی سوسائٹی کہا جاوے گا اور مقصد اس کا یہ ہوگا۔

(۱) ان علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کو انگریزی زبان میں یا یورپ کی اور کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے۔ ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں

(۲) جب کبھی سوسائٹی مناسب سمجھے تو کوئی ایسا اخبار یا گزٹ یا روزنامچہ یا میگزین وغیرہ چھاپ کر مشتہر کرنا جس سے ہندوستانیوں کی فہم اور فراست کی ترقی منظور ہو۔

(۳) وقتاً اور فوقتاً اپنے اجلاسوں میں علمی اور مفید مضمونوں پر لکچر دلوانا اور لکچر میں جس ہنر و فن کا بیان ہو اس کو بشرط امکان علمی آلات کے ذریعہ تجربہ کر کے دکھانا۔

(۴) ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب اور نفیس کتابوں کا تلاش کر کے بہم پہنچانا اور چھاپنا۔

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

شہناز ہاشمی۔ کنوینر پلیٹنم جوبلی ویمنس کالج

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ویمنز کالج کی

پچھتر سالہ سالگرہ

ویمنز کالج کی پچھتر سالہ سالگرہ کی تقریبات ۲ر فروری ۱۹۸۲ء سے شروع ہو کر ۶ر مارچ ۱۹۸۲ء تک جاری رہیں۔ جشن کا افتتاح ۲ر فروری کو یوم بانیان کے موقع پر بیگم ممتاز جہاں حیدر (سابق پرنسپل ویمنز کالج) نے فرمایا

جناب سید حامد (وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) اس موقع پر مقرر خصوصی تھے۔ وہ جوبلی کی انتظامیہ کمیٹی کے سربراہ بھی ہیں۔

کالج کی سب انجمنوں نے ان تقریبات میں حصہ لیا اور مندرجہ ذیل پروگرام پیش کیے۔

۴ر فروری ۱۹۸۲ء ہومنیٹیز سوسائٹی کی طرف سے ڈبیٹ کا مقابلہ اور

بقیہ مضمون "سائنٹیفک سوسائٹی کے مقاصد"

سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ ہوگا۔"

کیا آج کے آزاد اور نئے ہندوستان کو اس سے زیادہ جلیل مقاصد اور اعلیٰ افکار کی تلاش نہیں ہے۔ سرسید نے سب کو ساتھ لیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ منزل پر ان کو تنہا جانا پڑا۔ اپنوں کے اعتراض کا نشانہ بنے اور ہم وطنوں کی نظر میں غیر سے ہو گئے تھے۔ حالاں کہ سرسید نے کہا تھا

"سب قوموں کے لوگ سوسیٹی کے ممبر ہو سکیں گے۔"

سرسید نے جو کتابیں چھاپیں ان میں چند کے نام یہ ہیں

(۱) تاریخ مصر۔
(۲) تاریخ یونان
(۳) تاریخ چین

یہ تمام ممالک قدیم تہذیبوں کے مرکز رہ چکے تھے۔

جدید علوم پر چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔

(۱) پولیٹکل اکونمی یعنی علم انتظام تمدن
(۲) علم فلاحت
(۳) رسالہ برقی

ان کتابوں کے ناموں سے اندازہ ہوگا کہ سرسید کی منزل کیا تھی۔ سرسید نے یہ سب کام اردو میں کیا۔ مسلمانوں کو ساتھ لیا۔ مگر نہ مسلمانوں کا نام لیا نہ اردو کا ذکر کیا۔ یہ ان کی عظمت کی دلیل اور وسعت نظر کی موٹی موٹی سی مثال ہے جو اب ماضی کے زنداں میں اسیر ہے۔ نئی نسل سے سرسید کا سوال ہے۔ "کون ہے جو افکار اور علم کی دنیا میں سفر کرے اور علمی آزادی کا طالب بنے۔"

محفل مشاعرہ زیر صدارت پر...
آل احمد سرور صاحب۔

۵ فروری ۸۴ء گرلز ہائی اسکول اور عبداللہ نرسری کی طرف سے کھیل اور تفریحی پروگرام

۷ فروری " موسیقی کلب کی طرف سے قوالی

۸ فروری " سائنس سوسائٹی کی جانب سے لیکچر اور معلوماتی فلم۔

۹ فروری " طالبات کی یونین کی طرف سے انٹر ہال تقریری مقابلہ۔ اس میں اختتامی تقریر پروفیسر اسلوب احمد انصاری صدر شعبہ انگریزی نے کی۔

۱۰ فروری " پاپا میاں اسکول کی طرف سے محفل میلاد۔

۱۱ فروری " اولڈ گرلز ایسوسی ایشن کی جانب سے جلسہ کی صدارت ممتاز اولڈ گرل سوشیلا نندن نے کی۔

۱۲ فروری " سوشل سائنس سوسائٹی کی طرف سے ایک سمپوزیم ہوا جس میں مہمان خصوصی ڈاکٹر گوپال سنگھ (اقلیتی سیل کے صدر) تھے۔

۱۵ فروری " فائن آرٹ سوسائٹی کی جانب سے طالبات کی خواہش پر کالج کے اساتذہ نے فینسی ڈریس پروگرام پیش کیا۔

۱۶ فروری " سے ۲۰ فروری تک۔ اردو اور انگریزی کے ڈرامے۔

۴ مارچ " کالج اسپورٹس

عنوان پر آل انڈیا سیمینار۔ اس کی صدارت مشہور مصنفہ محترمہ قرۃ العین حیدر نے کی۔ مقرر خصوصی مشہور سائنس داں اور C.S.I.R. کے اہم افسر ڈاکٹر عبدالرحمٰن تھے۔ مہمان خصوصی محترمہ محسنہ قدوائی (ممبر پارلیمنٹ) تھیں۔

اس سیمینار کی مختلف نشستوں کی صدارت محترمہ سروجنی وارشنی (پرنسپل ویمنز کالج بنارس ہندو یونیورسٹی) اور ڈاکٹر مظہر علوی (ریڈر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی) نے کی۔

باہر سے آئی ہوئی مندوبین ہیں ڈاکٹر سروجنی بساریہ (ہیڈ شعبۂ تعلیم نسواں، نیشنل کاونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ) ڈاکٹر ماجدہ اسد (لیکچرر دہلی یونیورسٹی) اور محترمہ مسرت انیس (قومی آواز) شامل تھیں۔

مندوبین کا استقبال جناب سید حامد (وائس چانسلر) اور اختتامیہ جلسہ کی صدارت جناب کے۔ ایم بہاء الدین (پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے کی

اس جلسہ میں خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے کئی تجاویز منظور کی گئیں۔

یہ تقریبات کالج کی پرنسپل ڈاکٹر رضیہ خاں کی زیر نگرانی کی گئیں اور کالج کے تمام اساتذہ دفتری عملے اور طالبات نے انتظامات میں نہایت جوش و خروش سے حصہ لیا۔ پرنسپل ڈاکٹر رضیہ خان نے کالج کی آئندہ ترقی کا پروگرام بھی بنایا جو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو پیش

کیا جاتے گا۔

(مرسلہ:- شہناز ہاشمی)

اسلامیات پر ہونے والے عالمی کام کا جائزہ

مسلم یونیورسٹی کے سیمینار کا مقصد

مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامیہ کے زیر اہتمام ایک سہ روزہ سیمینار "اسلامی فکر میں عقلیت اور روایت پسندی" منعقد ہوا۔ جس کی ابتدا تلاوتِ کلام پاک سے ہوئی۔ پروفیسر محمد اقبال انصاری صدر شعبہ علوم اسلامیہ نے سیمینار کے اغراض و مقاصد سے سامعین کو آگاہ کرتے ہوئے سیمینار کے منتظمین کی کوششوں کا ذکر کیا۔ سید حامد وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اسلام اور مسلمان دونوں کو ایک نہیں سمجھا جا سکتا۔ مسلمانوں کے سائنسی علوم میں پیچھے رہ جانے کا سبب اسلام نہیں بلکہ دوسرے عوامل اور محرکات ہیں۔ اسلام کے چند بنیادی اصول اور عقائد ہیں جو ہر طرح کے تغیر سے ماوراء ہیں۔ اسلام کی بنیاد علم پر قائم ہے وہ انسان کو مشاہدہ، تجربہ اور مطالعہ کی دعوت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں مسلمانوں نے سائنسی علوم کے ارتقاء میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا یہاں تک کہ یورپ کا نشاۃ الثانیہ ان ہی مسلمانوں کا رہین منت رہا۔

آیۃ کریمہ "وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" کی تشریح کرتے ہوئے سید حامد نے کہا کہ انسان کو اسماء اور مسمیات کا علم عطا کرنے کا مقصد یہی ہے کہ وہ تمام موجودات عالم اور کل انواع حیات پر حکومت کرے اور ہر ایک کی ماہیت کو اچھی طرح پہچانے۔ اسلام نے ذہن انسانی کو کلی طور پر تعقل اور تفکر کی دعوت دی ہے۔

قرآن حکیم کی بعض دوسری آیتوں سے بھی استدلال کرتے ہوئے سید حامد صاحب وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کہا کہ نظام کائنات میں غور و فکر کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اس کو مختلف حیثیتوں سے ابھارا گیا ہے۔

سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے سید حامد صاحب نے کہا کہ ہم یہ بھی معلوم کریں کہ دنیا میں اسلام پر کہاں کہاں کام ہو رہا ہے اور اس کام کی نوعیت کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کیا جائے کہ اسلام کے متعلق کن گوشوں پر کام ہونا باقی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر بدرالدین طیب جی نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ ڈاکٹر محمود الحق ڈائرکٹر سیمینار نے مسٹر بدرالدین طیب جی، سید حامد صاحب وائس چانسلر اور مسٹر کے۔ ایم۔ بہاء الدین پرو وائس چانسلر نیز تمام شرکاء اجلاس اور مہمان دانشوروں کا شکریہ ادا کیا۔

پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد نے لیتھو کلر پریس میں چھپوا کر صفدر منزل تارنگلہ لسابام بو علیگڑھ سے شائع کیا

«بہت لوگ ہیں جو دنیا کے انقلابوں کو دیکھتے ہیں اور کم ہیں جو اس پر غور کرتے ہیں مگر بہت کم ہیں جو خود اپنے خیالات کے انقلابوں کو دیکھیں اور ان کے سببوں کو سمجھیں اور سوچیں اگر کوئی شخص اپنی تمام زندگی کی باتوں کو یاد کرے اور سمجھے اور جانے گا کہ اس کے خیالات میں ایسے عجیب انقلاب ہوئے ہیں کہ ویسے دنیا کی کسی اور چیز میں نہیں ہوئے۔ اگر پہلا خیال بغیر سوچے سمجھے تقلید و اعتقاد و تمدن و معاشرت کی وجہ سے قائم ہوا تھا پھر اسی طرح اور ان ہی اسباب سے اس میں انقلاب ہوا ہے تو خیال ہو سکتا ہے کہ دونوں بےہودہ اور بے بنیاد تھے اور اگر ان دونوں کے لیے یا دونوں میں سے ایک کے لیے کوئی معقول بنا تھی تو اس کے سببوں پر غور کرنا اور اس بات کو سمجھنا کہ پہلے خیالات کس بات پر مبنی تھے اور حال کے خیالات کس پر مبنی ہیں اور ان دونوں بناؤں میں سے کون سی بنا زیادہ‌تر سچ اور زیادہ‌تر مستحکم ہے انسان کے لیے زیادہ مفید ہے»

(دیباچہ) تصانیف احمدیہ، جلد اول، حصہ اول

علی‌گڑھ ۱۸۸۳ء



THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ھجری سنہ ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۲

جلد ۱ شمارہ ۵، ۶

"جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی، جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا، جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے، جب کبھی عمدہ پھول دیکھے، جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے، یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا تو مجھ ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ جہاں تک ہر موقع پر میں نے قومی ترقی کی تدبیروں پر غور کیا، سب سے اول یہی تدبیر سوجھی کہ قوم کے لیے قوم ہی کے ہاتھ ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا جائے۔"

سرسیدؒ

مدر ٹریسا علی گڑھ میں

۴ر اپریل ۱۹۸۲ء بروز اتوار کو سرزمین علی گڑھ نے ایک فرشتہ صفت کا استقبال کیا۔ نوبل امن انعام یافتہ اور عالمگیر شہرت کی مالک، دُکھے دلوں کی چارہ ساز، زخمی انسانیت کی مسیحا، بے چین روحوں کی ہمدرد، جن کو دنیا مدر ٹریسا کے نام سے جانتی ہے، علی گڑھ کی خوش نصیبی سے چند گھنٹے یہاں گزارنے کے لیے تشریف لائیں۔

کینڈی ہال میں مدر ٹریسا نے معذور بچوں کے اسکول کا افتتاح کیا جس کے روحِ رواں نسیم وارث ہیں۔ شریمتی سمیتا شاہ نے استقبالیہ الفاظ میں کہا کہ مدر ٹریسا کی علی گڑھ میں آمد سے کئی معجزے رونما ہوئے۔ یہ بھی ایک معجزے سے کم نہیں کہ بچوں کے اس اسکول کا افتتاح جو بار بار کسی نہ کسی وجہ سے ملتوی ہوتا رہتا تھا، آج اچانک مدر ٹریسا کے مبارک ہاتھوں سے ہوا۔ کینڈی ہال کے جلسہ کی صدارت یو۔پی معذوروں کی ایسوسی ایشن کی صدر بیگم ثریا حامد نے کی۔ ایسوسی ایشن کے سکریٹری نسیم وارث نے معذور لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایسوسی ایشن کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ معاشیات کے پروفیسر شبیر خاں اور شعبۂ انگریزی کے ڈاکٹر اشتیاق عابدی نے بھی مدر ٹریسا کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

مدر ٹریسا چند الفاظ کہنے کے لیے کھڑی ہوئیں تو جیسے سارا ہال اُن کی معصوم مسکراہٹ اور فرشتہ صورت موجودگی سے جگمگا اُٹھا۔ مدر نے کہا " زندگی میں محبت سے بڑھ کر عظیم جذبہ کوئی نہیں۔ بیمار، معذور، زخمی کی دلجوئی اور چارہ سازی میں

[بقیہ ٹائیٹل کے صفحہ ۳ پر]

تہذیب الاخلاق

پندرہ روزہ

مدیر: سید حامد۔ وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول قاضی معزالدین احمد۔

جلد نمبر ۱
شمارہ ۶
علی گڑھ
یکم، ۱۶ اراپریل ۱۹۸۲ء

قیمت فی پرچہ	۷۵ پیسے
چھ ماہ	۸ روپے
سالانہ	۱۵ ار روپے

غیر ممالک سے

فی کاپی	ایک ڈالر
سالانہ	۲۰ ڈالر

توسیل زر و خط و کتابت کا پتہ،
مدیر مسئول رسالہ تہذیب الاخلاق
صفدر منزل۔ تار بنگلہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ
Aligarh 202001

سامری پھر کوئی سرگرم فسوں ہے شاید

سعدیؔ نے کہا تھا کہ "خوش بخت آں کہ خورد و کشت و بدبخت آں کہ مرد و ہشت۔ جو کھاتا رہا اور بوکر گیا وہ خوش نصیب جو (جمع کرتا رہا اور) چھوڑ کر مرا وہ بدنصیب۔ یعنی زر کا مصرف یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں کو پورا کرے۔ اور حاجت مندوں کی مدد کرے جس نے ایسا نہیں کیا اور دولت جمع کرنے میں لگا رہا، وہ زر کا غلام بن گیا۔ اس کی حالت یونانی کردار "ٹین ٹے لس" [TANTALUS] کی سی ہے، جو پانی میں گھرا ہونے کے باوجود پیاس بجھانے سے محروم رہا۔ ایسے شخص کے لیے روپیہ مقصد بن جاتا ہے۔ وہ روپیہ جو دراصل صرف ایک وسیلہ ہے ضروریات پورا کرنے کے لیے۔ روپیہ اس پر حکومت کرنے لگتا ہے۔ وہ روپیہ کے اشاروں پر چلتا ہے۔ جس کسی میں عزتِ نفس ہو گی وہ روپے کی غلامی کیوں کرنے لگا۔ لیکن ہم آئے دن یہ تماشا دیکھ رہے ہیں کہ اچھے بھلے، شایستہ مہذب لوگ دیوانہ وار زر کا تعاقب، زر کا طواف، زر کی پرستش کرتے رہتے ہیں۔ اس تعاقب، طواف اور پرستش میں وہ عزتِ نفس گنوا بیٹھتے ہیں، انسانیت سے ہاتھ دھو لیتے ہیں، قدروں سے منھ موڑ لیتے ہیں۔ اب تک سنا تھا کہ موجودات میں جمادات سے بڑھ کر نباتات، نباتات سے افضل حیوانات اور حیوانات میں سب سے اعلیٰ انسان ہے۔ اب یہ

ترتیب بدل گئی ہے۔ انسان جمادات کے زیرِ نگیں ہو گیا ہے۔ وہ سونے چاندی کے سامنے سر بسجود ہے

موجودہ تہذیب کی سرحدیں بربریت سے ملنے لگی ہیں اور انسان اُن قدروں اور عادات و اطوار کو چھوڑ رہا ہے جو اُسے تہذیب کے جلو میں ملے تھے اور اُن خصائل اور اطوار کی بازیابی کے لیے کوشاں ہے جو آغازِ داستان اور ابتدائے آفرینش میں اُس کے حلیف تھے۔ لباس اب اس کے تن پر راس نہیں آتا اور وہ اسے مختصر کرنے اور بالآخر اُتار پھینکنے کی فکر میں ہے اس لباس میں حیا کا جامہ اور ادب کی قبا بھی شامل ہے۔ ضمیر نے تہذیب کی مدد سے ہوا و ہوس پر جو پابندیاں لگا دی تھیں وہ ایک ایک کر کے رخصت ہوتی جا رہی ہیں۔ یعنی تہذیب کا قافلہ جہاں سے چلا تھا، پورا چکر لگا کر وہیں واپس ہو رہا ہے۔ ارتقا کا انحطاط جب ساری انسانیت پر محیط ہے تو اس بات پر حیرت کیوں کہ انسان خود کو جمادات سے فروتر سمجھنے لگا ہے۔ نقرہ و زر کی پرستش کرنے لگا ہے۔ گویا ارتقا کی انتہا پستی کی ابتدا بن گئی۔ چکر پورا ہو گیا لیکن شاعر کا ردِ عمل سماج کا پابند نہیں۔ نہ اُس کی آنکھیں طمع سے خیرہ، نہ اُس کی زبان مصلحت کی اسیر۔ چنانچہ زر کی یہ ریل پیل یہ ہما ہمی یہ اقتدار دیکھ کر وہ چلا اٹھتا ہے

سامری پھر کوئی سرگرمِ فسوں ہے شاید
سب کا معبود ہوا جاتا ہے زر کا ہے کو؟

بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ نے توحید کا درس دیا تھا۔ ان کی عارضی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھا کر جادوگر سامری نے سونے کا ایک بچھڑا بنایا اور بنی اسرائیل کو اس کی پوجا میں لگا دیا۔ واپسی پر حضرت موسیٰ نے اپنے غیض و غضب کا اظہار کرنے کے بعد اس طلسم کو توڑا۔ ایک بذلہ سنج کا قول ہے کہ زر کی محبت جو سامری کے فسوں نے ان کے دلوں میں پھونک دی تھی بنی اسرائیل سے زیادہ دن جدا نہ رہ سکی۔ لیکن تاریخ کچھ اور ہی کہہ رہی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ عرب کے ریگ زار، وہاں کے بے آب و گیاہ علاقہ، وہاں کی وادی غیر ذی زرع میں چھٹی صدی عیسوی میں ایک ہادیٔ برحق آیا جس نے ساتویں صدی کے آغاز میں دنیا کی کایا پلٹ دی۔ جس نے مادیت کے اصنام کو توڑ دیا جس نے روح کی بالادستی کو ایک عالم سے منوا لیا۔ جس نے فقر پر فخر کیا اور جس نے زر کی ساکھ چشم زدن میں گرا دی۔ جس نے علم اور اخلاق، اخوت اور مساوات تفکر اور تدبر، حریت اور توحید کا پرچم بلند کیا

سماں "الفقر فخری" کا رہا شانِ امارت میں
بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ اس ہادیٔ برحق کی امت اس کی تعلیمات کو بھول گئی اور اس نے بنی اسرائیل کی طرح سامری کے نقشِ قدم پر چلنا شروع کر دیا۔ زبان پر خدا کا نام اور افکار و اقوال پر سامری کی مہر۔ جسے دیکھیے وہ دینی دنیاوی اور منصبی فرائض کو چھوڑ کر زر کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے۔ غافل اس سے کہ اس حرکت میں ارتفاع نہیں ابتذال ہے۔ ترقی نہیں زوال ہے۔ زر کسی معبود کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ "مشترک ناصیہ" لے کر اس کے حضور میں نہیں جا سکتے۔ زر جہاں ایک دروازہ سے داخل ہوا، معصومیت، پاکیزگی، خدا کا خوف، رسولؐ کی محبت

[redacted]

انسان دوستی، دردمندی، حریت، اخوت، مساوات، غرض کہ ساری صالح قدریں دوسرے دروازے سے نکل گئیں۔ زر جماد سے ہے۔ اس کی محبت دل کو پتھر کر دیتی ہے۔ جو لوگ پہلو میں پتھر چھپائے پھرتے ہیں وہ انسان نام کو ہیں۔

روحانی اور مادی طاقت میں جو فرق ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ آج سے تقریباً تیرہ سو سال پہلے جزیرہ نمائے عرب میں اللہ کا آخری رسول ﷺ پیدا ہوا۔ اور اس نے ساری دنیا کو راستی اور انصاف، علم اور انسانیت کی روشنی سے منور کر دیا۔ عرب جہاں گئے رحمت اور عافیت، علم اور عدالت، اخلاق اور شرافت کے پیامبر بن کر گئے۔ انسانیت ہنوز اُن کی رہین منت ہے۔ اس واقعہ کو تیرہ سو سال گزرنے کے بعد جزیرہ نمائے عرب اور دوسرے عرب ممالک میں سب سے بڑی مادی دولت کا انکشاف ہوا جس کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔ زرِ سیال نے عرب کو ارب پتی بنا دیا۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک عربوں کے دست نگر بن گئے۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا۔ دنیا کو کیا ملا۔ خود عربوں کو کیا حاصل ہوا۔ عربوں کو بے مصرف دولت ملی دنیا کو وقتی تشویش، نتیجہ صفر۔ عرب جب روحانی طاقت لے کر اٹھے دنیا پر چھا گئے۔ انسانیت کو سنوار گئے۔ مادی طاقت ہاتھ میں آئی تو ایک چھوٹے سے ملک سے نبرد آزما اور عہدہ برآ نہ ہو سکے۔ زر کے لیے ہاتھ خالی کرنا تھا، میراث کو ہاتھ سے گرا دیا۔ عجم کو زرِ سیال ہاتھ آیا۔ اُسے بہا لے گیا۔ منصفانہ تقسیم نہ ہو تو زر سمِ قاتل بن جاتا ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ہمارا روئے سخن تو ہندوستانی مسلمانوں کی طرف ہے۔ یہاں رونا اس کا نہیں کہ کثرت زر نے اخلاق کو گرا دیا ہے۔ یہاں شکایت اس بات کی ہے کہ زر کی کمی اور اس کی ہوس نے اقدار کو مسمار کر دیا ہے۔ صہبا کی طرح زر بھی ظرف کا طالب ہے نا اہلوں کے پاس جہاں پہونچا جوتی میں دال بٹی کسی ایک فرد کی جھولی بھر گئی تو وہ جامہ میں نہیں سمایا آنکھوں پر پردے اور عقل پر پتھر پڑ گئے۔ شرافت کام آگئی، انسانیت رخصت ہو گئی۔ مثل ہے کہ اللہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کم ظرفوں کو مل جائے تو چھپر کے ساتھ کلیجہ بھی پھٹ جاتا ہے۔ کردار شق ہو جاتا ہے۔ ہمارے سامنے دو عبرتناک مثالیں موجود ہیں۔

ان سطور کو زر کی ہجو نہ سمجھا جائے۔ موجودہ زمانہ میں جب عالم کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور وسائل کی بدولت ملک باہم اس قدر قریب آگئے ہیں کہ تخلیہ میں خلل پڑتا ہے۔ جب انسان کے انسان پر انحصار کا سلسلہ عالمگیر ہو گیا ہے۔ جب زر کے بغیر داد و ستد ممکن ہی نہیں، ایسی صورت میں زر سے مفر کی تلاش بے سود ہوگی۔ زور زر سے فرار پر نہیں، زر کے صحیح استعمال پر دینا چاہیے۔ اسلام کی تعلیم جہاں رہبانیت کا گزر نہیں، اس باب میں بالکل واضح ہے۔ چنانچہ سعدی نے خوردن کے ساتھ پوشتن، کھانے کے ساتھ بونے پر زور دیا ہے۔ یعنی سمندر میں رہو لیکن پشت پانی سے اوپر رہے۔ کنارے پر کھڑے ہو کر دامن بچانے والے بزدل ہوتے ہیں۔ محنت کرو، کماؤ، خود کھاؤ، حقداروں اور حاجتمندوں کی مدد کرو کہ یہی آخرت کی کھیتی ہے۔ جب تک کہ حق داروں اور حاجت مندوں کی مدد کرتے رہو گے زر کی چھپی نہ تن پر چڑھنے پائے گی نہ آنکھوں پر۔ زر تمہارا خادم رہے گا [illegible] پا سکے گا۔ جہاں تیغ

آقا بن گیا، تم آزاد انسان نہ رہو گے۔ غلاموں
اور چوپایوں سے بدتر ہو جاؤ گے ____
____ زر کو صنم بنایا ہے تو کھل کر پتھر کی پرستش کیوں نہیں کر لیتے
اسلام پہ الزام تو نہ آتا۔

نفسِ ضمیر کے ساتھ، مادیت روحانیت
کے ساتھ، ازل سے ستیزہ کار رہی ہے۔ لیکن مادیت کو
جیسا فروغ بیسویں صدی میں حاصل ہوا ہے، پہلے کبھی
نہ ہوا تھا۔ اور یہ سب کچھ صنعتی اور تکنیکی انقلاب اور
زر کے نظامِ تبادلہ کے ذریعہ ہوا ہے۔ دنیا کی مختلف
بستیوں میں جب فاصلہ تھا تو طاعون کی طرح اخلاقی
فساد بھی محدود ہو کر رہ جاتا تھا۔ صحت مند جزائر
متاثر نہ ہوتے۔ لیکن اب جسمانی بیماریاں ہوں
یا روحانی اور اخلاقی دبائیں، ملکوں کی سرحدوں کا
احترام نہیں کرتیں۔ ہر وبا، ہر برائی جہانگیر ہو جاتی ہے
زر کے ذریعہ ایک خرابی اور آئی۔ جب
تک زر کا چلن اور بین الاقوامی کرنسی اور تبادلۂ زر
کا نظام وجود میں نہ آیا تھا، ہوس پیشہ اور
استیلا آمادہ اور جویائے اقتدار انسان اُن
اشیا کو تصرف میں لا کر مطمئن ہو جاتے تھے۔
جن سے اُن کی انفرادی ضروریات اور ہوس
کی تشفی ہوتی۔ زر نے کاغذ کے جن پرزوں اور
بینکوں کے جن کھاتوں کو جنم دیا ہے، انھوں نے
انسان کی ہوس زر کو بیکراں اور اُس کو دوسرے
انسانوں کے لیے بے حس اور بے درد بنا دیا
ہے۔ زر کی طاقت افراد و اقوام کو ایک طرف
گھمنڈ اور دوسری طرف استحصال کی جانب لے جاتی
ہے۔ پہلے زر اندوزی کی حد بندی چوری اور
ڈکیتی کے خوف سے بھی ہوتی تھی۔ بینکوں نے
یہ خوف بھی دور کر دیا۔

بہر کیف ہمیں یہ مان کر چلنا ہو گا کہ روپیہ
ضروری اور ناگزیر ہے۔ ہمیں آغازِ سفر میں ہی یہ
طے کر لینا ہو گا کہ زر روپیہ کو اُس کی اوقات سے
نہ بڑھنے دیں۔ یعنی اُسے وسیلہ بنا کر رکھیں، مقصد
نہ بننے دیں۔ اور جب یہ طے کر لیا کہ زر صرف
ایک ذریعہ ہے ضروریات کو پورا کرنے کا تو
ہمیں یہ بھی مان لینا ہو گا کہ وہ صرف انفرادی اور
نجی ضروریات کو پورا کرنے کا ذریعہ بن کر
نہیں رہ سکتا۔ اس طرح تو نفسی نفسی کا دور شروع
ہو جائے گا۔ اور تصادم، ہنگامے اور انتشار کی راہیں
کھل جائیں گی۔ صرف زر کو انفرادی ضروریات
کے ساتھ اجتماعی مقاصد کو ملحوظ رکھنا پڑے گا۔
ورنہ زر اور انسانیت میں ضد کا ناتہ قائم
ہو جائے گا۔ اگر وہ رہا تو یہ نہ رہے گی۔
اجتماعی ضروریات کا پاس رکھتے ہوئے حاجتمندوں
کی انفرادی امداد کے علاوہ ان اداروں کی مدد
یا اُن کا قیام لازم ہے جن کا مقصد منظم ڈھنگ سے
بنی نوعِ انسان کے دکھ درد کو دور کرنا، ان کی ہمہ جہت
اصلاح، خوشی اور خوشحالی کے لیے تدابیر کرنا ہے
کارِ خیر گھر سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلام
کی رو سے انسان پر پہلی ذمہ داری اقربا کی
ہے پھر یتیموں، مسافروں اور دوسرے حاجتمندوں
کی۔ زر کی ہوس ساری ذمہ داریوں کی راہ
میں حائل ہوتی ہے۔

دنیا میں کم اجتماع اتنے خطرناک ہوں گے

جتنا زر کے ساتھ بیکاری یا زر کے ساتھ جہالت اور بے خبری کا جمع ہونا۔ ہوئے یہ جمع جہاں آگ لگ گئی گویا گیاہِ خشک و شررِ زر کے ساتھ بے کاری جو روپیہ بغیر محنت کے ہاتھ آگئے وہ جائز ہی کب ہوا

پھر وہ بے شمار برائیوں کو جنم دیتا ہے۔ قمار خانوں، قحبہ خانوں اور شراب خانوں کی آبادی اسی کے دم سے ہے۔ یہ چیز معاشرہ کے لیے اتنی ہی مہلک ہے جیسے ذمہ داری کے بغیر اقتدار۔ اپنے ملک میں دورِ انحطاط کے دولت مندوں یا بعض ممالک کے نو دولتوں پر نگاہ ڈالیے، یہ بات آئینہ ہو جائے گی۔ سود کو حرام اسی لیے کیا گیا ہے۔

زر کے ساتھ جہالت یا بے خبری جمع ہونے کی مثال ہمارے اہلِ حرفہ ہیں جن میں سے ایک کثیر تعداد کو اب اپنی محنت کا معقول اجر ملنے لگا ہے۔ وہ روپیہ پس انداز کر سکتے ہیں اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دے سکتے ہیں۔ اپنی صنعت کی تجدید کر سکتے ہیں۔ نئے ڈیزائنس، نئے ساز و سامان نئے بازار اُن کی دسترس میں ہیں لیکن وہ ہاتھ نہیں بڑھاتے۔ بے خبری ایک نشہ کی طرح ہے جو آگے بڑھنے سے روکتا ہے۔ ہمارے حرفت کار جو پاتے ہیں اُڑا دیتے ہیں۔ اقبال نے کہا تھا۔

دستِ دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

ہمارے اہلِ حرفہ کے حُسن آفریں ہاتھ صورتِ سوال پھیلے ہوئے ہیں، مہاجنوں سے آس لگائے ہوئے۔ ان کی صنعت نہ معلوم کہاں سے کہاں پہونچ جائے اور اُن کے اور اُن کے بچوں کے دن پھر جائیں اگر وہ جہالت کی تفسیلی تیرگی کو چھوڑ کر علم و خبر کی بیدار کن روشنی میں آجائیں۔

کسی شاعر نے زورِ بیان میں زر کو حلّالِ مشکلات بلکہ قاضی الحاجات تک بنا دیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زر سے ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ چنانچہ بہت سی دوسری چیزوں کی طرح زر کی بُرائی یا بھلائی اُس کے محلِّ استعمال پر منحصر ہے۔ ہم اُس کی خواہش کو حدود میں رکھیں۔ اُس کے عناں گیر ہوں۔ اسے کارِ خیر، تحصیلِ علم اور تعمیر اور اصلاح میں صرف کریں تو اس میں دین اور دنیا کی بھلائی ہے اور اگر اسے پاکر نشہ میں بہک جائیں، بے حسی اور بیدردی اختیار کریں، جامہ سے باہر ہو جائیں تو اُس سے بُری کوئی شے نہیں۔ یہیں افراد کا امتحان بھی ہوتا ہے اور جماعتوں کا بھی۔

زر کو رکھ رہے ہیں کسوٹی پہ اہلِ زر
غافل کہ آدمی کی کسوٹی بھی زر میں ہے

اقبال مند قوموں کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ زر کا ناتہ علم سے جوڑتی ہیں۔ ان کے برعکس ادبار آمادہ قومیں زر سے جہالت کی پرورش کرتی ہیں۔ زر کا ناتہ علم سے جُڑتا ہے تو علم اور ٹکنولوجی کو فروغ ہوتا ہے اور یہ فروغ مزید زر کی تخلیق کرتا ہے۔ ایک سے دوسرے کو مدد اور ترقی ملتی ہے۔ تائیوان، جاپان، کوریا اور اسرائیل کی مثالیں سامنے ہیں۔ افسوس کہ امدادِ باہمی کے اس زرخیز اور علم آفریں سلسلہ سے ہم نے دامن کھینچ لیا ہے۔

زر کے خطرات کئی ہیں۔ ایک تو اخلاقی برائیاں مثلاً تن آسانی، عیش کوشی، کمزوری جس کے سایہ میں انسان جفاکشی سے محروم ہو جاتا ہے اس جفاکشی سے جو خدا کی بہت بڑی دین ہے۔ تیسرا خطرہ زیادہ مہیب ہے کہ وہ زرداروں اور بے زروں دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ یعنی

[باقی صفحہ ۲۵ کالم ۲ پر دیکھیے]

ایس ایم وسیم
(شعبۂ کامرس)

تعلیم۔ مناسب کارکردگی کا مسئلہ

آخری قسط

جہاں تک اسٹرائک اور نعرہ بازی کا تعلق ہے انھیں جمہوری نظام میں ایک مقام حاصل ہے۔ مگر طلبار کے لیے اس کی ضرورت کیا ہے؟ کیا اساتذہ تعلیمی اداروں کے منتظمین اور طلبار کے مقاصد میں کوئی تضاد ہوتا ہے؟ (اگر کہیں ایسا نظر آئے تو یہ افسوس ناک بات ہوگی) چاہے ہم پڑھیں یا پڑھائیں۔ ہمارے مقاصد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ چاہے ہم میز کے اس طرف ہوں یا اُس طرف۔ ہمارے مقاصد میں کوئی فرق یا ٹکراؤ نظر نہیں آتا۔ ہمیں یہ ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ تعلیم دراصل "دوستونی" طریقہ کار ہے۔ جہاں ایک شخصیت دوسری شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر تعلیمی مقاصد پورے ہو رہے ہوں تو اسٹرائک اور نعرہ بازی بے معنی ہے۔ ٹھنڈے پانی کے لیے مشین، فرنیچر، پنکھوں اور اسی طرح کی اشیار ضرورت کی مانگ سامنے رکھ کر تعلیمی مقاصد کو پس پشت ڈال دینے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ دراصل ایک دیانت دار انتظامیہ تو خود ہی طلبار کے فلاح و بہبود کی ذمہ داری ہوتی ہے اسے ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خود ہی کوشاں رہنا چاہیے البتہ وسائل کی فراہمی کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ اگر وسائل ہی کم ہوں تو ہمیں اس کا خود بھی خیال رکھنا ہوگا

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر تعلیمی ادارہ دراصل ایک مثالی خاندان تصور کیا جانا چاہیے۔ جہاں اکثر ہم سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ اور مسائل کا تجزیہ کر کے انھیں حل کرنا چاہتے ہیں وہ طلبار جو سیاسی انداز فکر رکھتے ہیں انھیں اپنے ذوق و شوق کو ہم نظر اور ہم فکر افراد تک محدود رکھنا چاہیے۔ علمی سیاست سے شعورِ زندگی کو روشن و منوّر تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کا بے محل استعمال کر کے اپنی ذہنی لذو کاوش کو رائیگاں نہیں کیا جانا چاہیے۔ وزارتِ داخلہ ہند سرکار کے اعداد و شمار کے مطابق تعلیمی اور غیر تعلیمی وجوہات کی بنا پر اگست ۱۹۶۶ء تک مندرجہ ذیل اسٹرائک ظہور پذیر ہوئیں۔

تعلیمی اور غیر تعلیمی ایجی ٹیشن کے اعداد

سال	تعلیمی	غیر تعلیمی	کل اعداد
۱۹۶۳ء	۶	۲۲	۲۸
۱۹۶۴ء	۱۳	۸۷	۱۰۰
۱۹۶۵ء	۲۹	۲۱۱	۲۴۰
۱۹۶۶ء	۱۵	۱۸۷	۲۰۲++

++ سرکاری تجزیہ کے مطابق اس سال (۱۹۶۶ء) تشدد آمیز ایجی ٹیشن میں سے ۵۰ فیصدی کھانے کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے رونما ہوئے۔

مندرجہ بالا وجوہات کے علاوہ اور بہت سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے طلبار اور اساتذہ کے مابین تعلقات پر اثر پڑتا ہے ان کا مجموعی اثر کارکردگی اور

[redacted]

مقاصد کے حصول پر بھی پڑتا ہے ان میں سے ایک اساتذہ
اور طلبار کی شرح بھی ہے۔ کچھ ترقی یافتہ ممالک میں یہ
ایک کے مقابلے میں ۸ سے ۱۳ تک ہے۔ یہ شرح جتنی کم
ہوگی، استاد اتنی ہی اپنے طلبار کی دیکھ بھال کر سکے گا۔
بہر حال" ہر چند کہ ہندوستان میں اس کی صورت حال
اتنی اچھی نہیں ہے جتنی انگلستان یا امریکہ میں ہے۔ اگر پھر
بھی یہ دوسرے ممالک مثلاً فرانس اور جرمنی میں استاد
اور طلبار کی شرح کے مقابلے میں بہتر ہے۔" یونیورسٹی تعلیم
کے معیار پر رپورٹ [۱۹۶۵ء] [REPORT ON -
STANDARDS OF UNIVERSITY EDUCATION
1965] - کے حوالے سے یہ بتا دینا مناسب ہے کہ ٹ کالجوں
کی حالت ابتر ہے۔ ۱۷۷۱ کالجوں میں سے جن ۶۵۳
کالجوں کے بارے میں معلومات فراہم ہوئیں، ان میں استاد
اور طلبار کی شرح ۱: ۲۰ سے بھی زیادہ ہے......"

ہر نظام انسان ہی کی کدو کاوش، اس کے اقدامات
اس کی ترقی، اس کی پذیرائی اور اکثر اسی کی غفلتوں اور
غلط کاریوں کی وجہ سے اٹھتا اور گرتا ہے۔ انسان کو سماجی،
اقتصادی اور سیاسی اداروں کے سہارے آگے بڑھنا نصیب
ہوتا ہے۔ اگر سماج پچھڑا ہوا ہے تو انسان خود توہم [TABOOS]
کا شکار ہوگا۔ اب اگر ہم آبادی کو مختلف گروہوں میں بانٹیں
گے تو ہمیں طلبار، استاد، کاریگر اور صنعت گر وغیرہ نظر
آئیں گے۔ پچھڑا سماج معاشی بدحالی کا شکار رہے گا۔ اس میں
زیادہ تر افراد و خاندان غربت کے شکار رہیں گے۔ انھیں
مناسب مقدار میں ضروری اشیاء ضرورت اور خاص کر
کھانے کا سامان بھی فراہم نہ ہوگا۔ اکثر طلبار اپنے درجوں
میں تھکے ماندے اور کمزور سے نظر آئیں گے۔ قیمتوں میں
اضافے سے بات اور بھی بگڑ جاتی ہے۔

یہی غربت طلبار میں سے اکثر کو آمدنی کی غرض
سے دوسرے کام جو ان کے تعلیمی کاموں میں رخنہ اندازی
کرتے ہیں کرنے پڑتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ ان کے نئے
کام کرنے کے عزم پر بھی اثر پڑتا ہے۔ وہ پژمردگی کے شکار
ہو جاتے ہیں اور ان میں سے تو اکثر ہاتھ پیر ڈال کر بس اپنے
کو تقدیر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہمیں ایسے طلبار کی فلاح
وبہبود کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔

اس کے علاوہ جب معیشت ترقی پذیر ہوتی
ہے تو آگے بڑھتے ہوئے قافلے میں نئے افراد و خاندان شامل
ہوتے جاتے ہیں۔ انھیں "سماجی تال میل" کی دقتیں درپیش
ہوتی ہیں۔ اسی کے ساتھ تعلیم بڑھتی ہے اور افراد سماجی
سطح پر ہر روز نئی سیڑھیوں پر بلند ہوتے جاتے ہیں۔ اب
تک جو پچھڑے تھے یا غیر تعلیم یافتہ تھے آگے بڑھتے جاتے ہیں
ہمیں اس سفر میں ان کی مناسب رہبری کرتے رہنا چاہیے

یہی وجہ ہے کہ ایک ترقی پذیر معیشت میں
طلبار کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی تعلیمی مسائل بھی
اس کے علاوہ امتحانات کے طریقۂ کار پر بھی نظر کرنی ہوگی
سچ تو یہ ہے کہ موجودہ نظام طلبار کے ذہنی اساس اور
ان کی تخلیقی قوتوں کا مناسب امتحان نہیں لیتے۔ بلکہ امتحانات
میں ان کی قوت حافظہ کی جادوگری نظر آتی ہے۔ ہمیں اس
طرف بھی قدم بڑھانا ہوگا اور ساتھ ہی درس و تدریس اور
امتحانات کے طریقۂ کار میں تال میل پیدا کرنا ہوگا۔ ہمیں
اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ امتحانات کی منزل سے
گزر کر ہمارے طلبار ایک روشن دماغ شہری بن جائیں
تعلیمی قومی کمیشن ۱۹۶۴ [NATIONAL COMMISSION -
ON EDUCATION - 1964] نے اس مسئلہ پر
مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی ہے

منظر عباس نقوی
[شعبۂ اردو]

سرسیدؒ کا تعلیمی منصوبہ

اب سے ایک سو پانچ سال پہلے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی رسمِ تاسیس کے موقع پر سرسیدؒ کی جانب سے اُن کے صاحبزادے سید محمود مرحوم نے لارڈ لٹن وائسرائے ہند کی خدمت میں جو ایڈریس پیش کیا تھا اُس کے یہ الفاظ آج بھی اسٹریچی ہال میں نصب پتھر پر پڑھے جا سکتے ہیں:

ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ میں
یہ اول ہی موقع ہے کہ ایک کالج نہ کسی خاص
شخص کی فیاضی یا علمی شوق سے اور نہ کسی
بادشاہ کی تنہا سرپرستی سے بنا ہے
بلکہ کل قوم کی متفق خواہشوں اور مجتمع
کوششوں سے قائم ہوا ہے"

ان چند الفاظ سے کالج کے بنیادی کردار کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ بعد میں بھی سرسید کو جب جب موقع ملا وہ کبھی مجملاً کبھی بالتفصیل اس قومی درسگاہ کے قیام کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے رہے۔ چنانچہ ۲ فروری ۱۸۸۴ء کو لاہور کے ایک مجمع میں خطاب کرتے ہوئے انھوں برادرانِ وطن کے بعض شکوک و شبہات کو دور کرنے کی غرض سے اعلان کیا تھا کہ:

"مجھ کو افسوس ہوگا اگر کوئی شخص یہ خیال
کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے
درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم
کیا گیا ہے۔ خاص سبب جو اس کالج کے
قائم کرنے کا ہوا یہ تھا کہ .... مسلمان
روز بروز زیادہ تر ذلیل اور محتاج ہوتے

بقیہ مضمون "تعلیم۔ مناسب کارکردگی کا مسئلہ"

ہندوستان کی تقدیر اب اُس کے تعلیمی اداروں کے درجات میں تشکیل دی جا رہی ہے۔ یہ کہنا صرف برائے بیان ہی نہیں ہے کیونکہ سائنس اور ٹکنالوجی پر منحصر دنیا میں تعلیم ہی ہمارے عوام کی خوشحالی، فلاح و بہبود اور تحفظ کے معیار کو طے کرتی ہے۔ ہمارے اسکول اور کالجوں سے تعلیم حاصل کرکے باہر آنے والوں کی صلاحیت اور تعداد ہی پر قومی تعمیر کا عظیم کام مبنی ہے جس کا اہم مقصد ہمارے عوام کا معیارِ زندگی اوپر اٹھانا ہے۔

آخر میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ تعلیم ہی ہر تہذیب کی بنیاد ہے اور یہی ہر طرح کی سماجی برائیوں کی مؤثر دوا بھی ہے: رسک [Rusk] کے الفاظ میں یہی "روحانی دائرے کی حدود کو بڑھاتی ہے"۔ اور یہی تعلیم ہے کہ جو ذہنی سطح بلند کرکے انسان کو حق بینی کی دعوت دیتی ہے۔

نپولین [Napoleon] کے ہاتھوں جرمنی کی ہار کے بعد فلسفی فختے [Fichte] نے اپنی تقریروں سے یہ کہہ کر کایا پلٹ دی تھی کہ:

"یہ صرف تعلیم ہی ہے جو
ہمیں ان مصیبتوں سے
چھٹکارہ دلا سکتی ہے، جن کے
ہاتھوں ہم پریشان ہیں۔"

جاتے تھے۔ اُن کے مذہبی تعصبات نے اُن کو اس تعلیم سے فائدہ اُٹھانے سے باز رکھا تھا جو سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں مہیا کی گئی تھی اور اسی وجہ سے یہ امر ضروری خیال کیا گیا کہ اُن کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جاوے۔"

[لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۹۸]

اِس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کالج اگرچہ بنیادی طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ لیکن شروع ہی سے فرقہ پرستی اور علیحدگی پسندی کی لعنت سے کوسوں دور تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ معاشرے کا ایک پسماندہ طبقہ اگر اپنی تعلیم و تہذیب کے لیے کوئی خصوصی انتظام کرتا ہے تو اسے نہ علیحدگی پسندی کہا جاسکتا ہے نہ فرقہ پرستی۔ اور اگر یہ علیحدگی پسندی ہے بھی تو اسی نوعیت کی جیسی ایک اچھے اسپتال میں مزمن مرض رکھنے والے مریض کے لیے روا رکھی جاتی ہے تاکہ اس کی طرف خصوصی توجہ کی جاسکے۔

INTENSIVE CARE UNITS.

یہی کام انجام دیتے ہیں۔ سرسیدؒ نے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"فرض کرو کہ دو بھائی ایسے ہیں جن میں سے ایک بالکل طاقتور اور تندرست ہے اور دوسرا بیمار ہے اور اُس کی تندرستی زوال پر ہے پس اُس کے تمام بھائیوں کا فرض ہوگا کہ اُس بیمار بھائی کی صحت کی تدبیر کریں اور اس کو مدد دیں"

دراصل یہی خیال تھا جس نے سرسید کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام پر آمادہ کیا۔ گویا اس کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔ اس زمانے میں ملک کے مختلف مقامات پر اس طرح کے تعلیمی ادارے وجود میں آرہے تھے جن کے قائم کرنے والے کسی خاص فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن یہ ایک قابلِ فخر حقیقت ہے علی گڑھ نے، اس نوعیت کے دوسرے تعلیمی اداروں کی پالیسی کے برخلاف، فرقہ وارانہ امتیاز کو کبھی روا نہیں رکھا۔ اساتذہ کا انتخاب ہو یا طلبا کا داخلہ، رہائش کی سہولتیں ہوں یا وظائف کی تقسیم، ہر معاملے میں اس ادارے کی پالیسی وہی رہی (اور بحمد اللہ آج بھی ہے) جس کا سرسیدؒ نے اِن الفاظ میں اعلان کیا تھا:

"مدرسۃ العلوم بلاشبہ مسلمانوں کی ابتر حالت کے درست کرنے کے لیے اور جو افسوسناک محرومی اُن کو یورپین سائنس اور لٹریچر کے حاصل کرنے میں تھی اس کو رفع کرنے کو قائم کیا گیا۔ مگر اس میں ہندو مسلمان دونوں پڑھتے ہیں اور تربیت جو ہندوستان میں مقصود ہے دونوں کو دی جاتی ہے..."

(تقریر بر امرتسر ۲۴ جنوری ۱۸۸۹ء)

سرسیدؒ کا عقیدہ تھا کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پس جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پائیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ حاصل کریں اور ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے فراہم نہ کیے جائیں ہماری عزت نہیں ہوسکتی۔ کالج کے سلسلے میں اپنی انتظامی حکمتِ عملی کا انھوں نے واضح الفاظ میں

اعلان کر دیا تھا۔

"کالج کے تمام حقوق جو اُس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا سا بھی امتیاز نہیں ہے۔ صرف وہی شخص انعام کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اپنی سعی و کوشش سے اُس کو حاصل کرے اس کالج میں ہندو اور مسلمان دونوں برابر وظیفوں کے مستحق ہیں اور دونوں کی نسبت بطور بورڈر کے یکساں طور پر سلوک کیا جاتا ہے۔"

(لیکچروں کا مجموعہ ص ۱۹۸)

سرسید کے منقولہ بالا بیانات میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہیں۔ اُن سے صاف طور پر مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ چونکہ یہ ادارہ ہندوستانی معاشرے کے ایک نسبتاً پسماندہ طبقے یعنی مسلمانوں کے لیے قائم ہوا ہے اس لیے یہاں اُن کو داخلوں کے معاملے میں ترجیح دی جاتی ہے

۲۔ اس ادارے کے دروازے غیر مسلموں کے لیے یکساں طور پر کھلے ہیں اور جو غیر مسلم طلبا یہاں داخل ہوں گے اُن سے کسی قسم کا امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا۔

۳۔ کالج میں زیرِ تعلیم تمام طلباء اور طالبات خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، مراعات، انعامات اور وظائف کے یکساں طور پر مستحق ہوں گے۔

۴۔ مراعات، انعامات اور وظائف کا معیار استحقاق طلبا کی لیاقت (MERIT) ہوگی نہ کہ اُن کا مذہب یا عقیدہ۔

بعض لوگ شاید یہ سمجھتے ہوں کہ سرسیدؒ کا کام صرف اتنا ہے کہ انھوں نے انتہائی ناسازگار حالات میں اپنی غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں سے کام لے کر مسلمانوں کے لیے ایک تعلیمی ادارہ قائم کر دیا اور اس کے لیے اسٹریچی ہال، آسمان منزل اور مسجد جیسی شاندار عمارتیں تعمیر کرا دیں۔ یقیناً یہ بھی ایک بڑا کام تھا۔ لیکن سرسیدؒ کا کارنامہ صرف اسی قدر نہیں۔ اُن کے ذہن میں قوم کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک مکمل اور واضح منصوبہ تھا۔ جس کے اشارے ہمیں جا بجا اُن کی تقاریر، خطبات، خطوط اور مقالات میں بہ آسانی مل سکتے ہیں۔

وہ اس بات سے قطعی مطمئن نہیں تھے کہ اُن کی قوم کے بچے چند زبانیں سیکھ لیں اور چند علوم حاصل کر کے سرکاری ملازمتوں کے اہل بن جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اُن کے تعلیمی منصوبے میں اقامتی زندگی پر وہ زور نہ ملتا جس کا اندازہ ہمیں اُن کے اُس مضمون سے بخوبی ہو سکتا ہے جو تہذیب الاخلاق کے ایک شمارے میں شائع ہوا تھا۔ بات یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد بچے کی شخصیت کا ہمہ گیر اور ہمہ جہتی نشو و نما ہے اور یہ نشو و نما صرف کلاس روم کی تعلیم سے ممکن نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ایسی اقامت گاہیں لازمی ہیں، جہاں وہ معاشرتی آداب، اخلاقی تہذیب اور حیاتِ اجتماعی کا سلیقہ سیکھ سکیں۔ تعلیم کے اسی جزو کو تہذیب الاخلاق یا تربیت کردار کہا جاتا ہے۔ سرسیدؒ کے ذہن میں اس تہذیب و تربیت کا ایک واضح تصور تھا جس کو یہاں پیش کرنا دلچسپ بھی ہوگا اور مفید بھی یہ درست ہے کہ ایک صدی کے بعد کے بدلے

ہوئے سماجی حالات میں ہم سرسید کے اصولوں پر اُسی طرح عمل نہیں کر سکتے جیسا سرسیدؒ کے دور میں ممکن تھا لیکن یہ اصول آج کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ایک نیا دستورِ اخلاق Code of Conduct مرتب کرنے میں ہماری رہنمائی ضرور کر سکتے ہیں۔

۱۔ جو لڑکے اِن مکانات (ہوسٹلوں) میں سکونت اختیار کریں گے اُن پر اپنی اپنی مسجدوں میں جانا اور نماز میں شریک ہونا فرض ہوگا۔

۲۔ تمام طالب علم جب مدرسے میں یا کتب خانے میں یا عجائب خانے میں یا اخباروں کے کمرے آئیں گے تو انھیں کالج کی طرف سے مقررہ لباس کی پابندی کرنی ہوگی۔

۳۔ لڑکوں کے پڑھنے اور کھیلنے اور کھانے اور سونے اور نہانے اور کپڑا بدلنے کے سب وقت معین ہوں گے اور ہر ایک لڑکے کو اُس وقت وہی کام کرنا ہوگا جو اس وقت کے لیے مقرر ہے

۴ کھیلنے کے لیے متعدد قسم کے کھیل کے سامان موجود ہوں گے اور جو کھیل جس کو پسند ہوگا اختیار کرے گا۔

۵۔ الفاظِ بد جو لڑکوں کی زبان پر چڑھ جاتے ہیں اُن کو بولنے کی سخت ممانعت ہوگی۔ یہاں تک کہ اگر کوئی لڑکا کسی کو جھوٹا کہہ بیٹھے گا تو وہ بمنزلۂ دشنامِ سخت کے سمجھا جائے گا۔

۶۔ تمام طالب علم ایک کمرے میں ایک جگہ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔

۷۔ لڑکوں کو صفائی سے رہنے کی نہایت تاکید ہوگی۔ کوئی لڑکا ایسا لباس نہ پہنے گا جو تہذیب و شائستگی اور غیرت و حیا کے منافی ہو۔

۸۔ کسی لڑکے کو اجازت نہ ہوگی کہ وہ بہت بڑے بڑے بال جو کان کی لو سے زیادہ نیچے ہوں، سر پر رکھے یا کاکلیں بنائے یا پٹیاں جمائے یا مسّی لگائے یا انگوٹھی و چھلّے پہنے یا کسی انگلی پر مہندی لگائے۔

اس قسم کے ضوابط ہماری اقامت گاہوں کے لیے آج بھی موجود ہیں اور اگر اُن میں کوئی کمی ہے تو نظرِ ثانی کر کے اسے دور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جن کی بنا پر یہ تمام ضوابط بے اثر ہو کر رہ گئے ہیں۔

ضرورت ہے کہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے کوئی سمپوزیم کیا جائے جس میں یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد، اساتذہ منتظمین اور سینیئر طلبا، باہمی اشتراک و تعاون سے اِس مسئلے کا حل تلاش کر سکیں۔ اگر ہم نے اِس کام میں تساہل برتا تو اندیشہ ہے کہ ہماری درس گاہ کی مابہ الامتیاز خصوصیت یعنی اقامتی کردار [RESIDENTIAL LIFE] مہمل اور بے معنیٰ ہو کر رہ جائے گی۔

محمد یونس قاضی

اسلامی معاشیات

کچھ دنوں سے علمی حلقوں میں "اسلامی نظام" کا بڑا چرچا ہے۔ اسلام سے دلچسپی رکھنے والوں میں سب ہی قسم کے لوگ ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو موجودہ سرمایہ داری۔ اور اشتراکیت سے بددل ہیں اور ایسی راہ کی تلاش میں ہیں جو مادی ترقی کے لیے انسانیت کو مسخ نہ کرے۔ یہ لوگ تلاش حق میں نکلے ہیں اور اُن کے عزائم بالخیر ہیں۔ مگر کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو اسلام کو اپنے ذاتی یا گروپ کے عقائد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔ اُن کا مقصد پروپیگنڈا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور کا تخاطب اوّل طبقہ سے ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے ہمیں تھوڑی دیر کے لیے مروجہ علم المعیشت کو نظر انداز کرنا ہوگا اس لیے کہ مروجہ معاشیات کی بنیاد "قلت" اور انفرادی (لاطبقاتی) آپا دھاپی پر ہے۔ اور اس کے مزاج میں دولت کی پرستش ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی معیشت کا خمیر افزائش اور برکت سے بنا ہے اللہ تعالیٰ نے "ہر جاندار" کے رزق کی ضمانت لی ہے اور سب حاجت مندوں کے لیے "زمین" اور پہاڑوں میں "برکت" رکھ دی ہے۔ اسلامی معیشت کا مسئلہ تسخیر کائنات ہے۔ فرد یا فرم [Firm] یا طبقاتی مفاد نہیں۔

اسلام میں "کاروباری" اور "غیر کاروباری" زندگی کی تقسیم نہیں ہے۔ جہاں "خدا کے فضل" یعنی روزی کی تلاش میں زمین پر پھیل جانے کے لیے کہا گیا ہے۔ وہاں "اکل طیبہ" کی بھی قید لگا دی گئی ہے۔ اور انسان کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل سے نہ کھاؤ۔ حلال اور حرام کا فرق صرف انفرادی معیشت کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق پوری قومی معیشت پر بھی ہے۔ مثلاً جو معیشت ذرائع کو خود اس کے تعیش پر صرف کرتی ہے وہ فاسد ہے

اسلامی معیشت کی ایک اور خصوصیت اس کی "اجتماعیت" ہے مگر یہ اجتماعیت مارکس کی اشتراکیت سے جدا ہے جس میں فرد کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے اور نہ تاریخ میں اس کا کوئی رول (اینگلز نے مارکس کے غلو کو دھونے کی کوشش کی ہے اور فرد کے تشخص اور تاریخی رول کا اعتراف کیا ہے)۔ اسلامی اجتماعیت کا مطلب یہ ہے کہ فرد کو جماعت کے پس منظر میں دیکھا جاتا ہے اور اس کے خدوخال کو قائم رکھا جاتا ہے اور "عوام" کے نام پر اُسے فنا نہیں کیا جاتا۔

اسلام میں دولت کو پورے سولہ آنے والی نیابت نہیں دی گئی ہے۔ جائز طریقہ سے کمائی ہوئی دولت پر بھی پابندیاں ہیں اور یہ حکم ہے کہ "حاجت سے زائد مال" کو اللہ کی راہ میں "خرچ کر دیا جائے"۔ مومن کے مال میں مانگنے والوں "کا" اور "معاشی زندگی سے ہارے ہوؤں" کا "حق" ہوتا ہے۔ یہی انفاق فی سبیل اللہ ہے

مختلف وجوہات کی بنا پر اشخاص کی دولت ایک غیر معقول حد تک بڑھ سکتی ہے اور اس طرح معاشرے کے توازن کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ اس کو روکنے کے لیے یہ تدبیر رکھی گئی ہے۔ یا پھر معاشرہ کو بڑی مقدار میں سرمایہ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کا بوجھ ظاہر ہے کہ مضبوط کاندھوں پر ہی ڈالا جا سکتا ہے۔

اسلام دولت کا چند ہاتھوں میں جمع ہونے کے سخت خلاف ہے اور قرآن کریم میں سونے اور چاندی کا خزانہ بنانے سے منع کیا گیا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ معیشت کے پورے ذرائع کام میں لائے جائیں۔ اس لیے اگر کسی وجہ سے وہ ذرائع بیکار ہیں تو ان کے مالک کو چاہیے کہ وہ انھیں آزاد کر دے تاکہ معاشرہ ان سے مستفید ہو سکے۔ ضرورت سے زائد مال اور سونے چاندی کے دفینہ کے متعلق جو احکامات ہیں وہ بظاہر اخلاقی ہیں مگر حقیقتاً ان کا جواز اقتصادی ہے۔ اجارہ داری نہایت غیر صحت مند چیز ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا سطور سے بالکل واضح ہے کہ اسلام کس قسم کا معاشی نظام چاہتا ہے۔ نصب العین ہر جاندار کے رزق کی فراہمی ہے۔ اس کے حصول کے کچھ طریقوں (مثلاً زکاۃ) کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ اور راستے بھی بتلائے گئے ہیں تاکہ معاشرہ کا توازن قائم رہے۔ کچھ علماء کے خیال میں ملت کو حق نہیں ہے کہ افراد کی املاک ان سے لے مگر قرآنی احکامات، احادیث اور صحابۂ کرامؓ کے اقوال اس بارے میں بالکل صاف ہیں اور زمانہ کا تقاضہ بھی یہی ہے۔

اصلی مسئلہ قومی تعمیر ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے علماء صنعتی تہذیب کے مسائل سے بالکل ناآشنا ہیں اس لیے تعمیری کاموں کے لیے وہ قیادت نہیں دے پاتے جس کی ضرورت ہے وقت آگیا ہے کہ علی گڑھ کا شعبۂ دینیات، دیوبند اور ندوہ موجودہ معاشیات کو اپنے نصاب میں مناسب جگہ دیں تب ہی وہ مسائل کو سمجھ سکیں گے اور دوسروں کو راہ دکھا سکیں گے۔

بقیہ مضمون "انجینئرنگ فیکلٹی" صفحہ نمبر ۱۹

الکٹرانکس، فن تعمیر اور خطاطی کے تین سالہ کورس شروع کیے — فن تعمیر کے کورس کو جلد ہی کسی سبب سے بند کر دیا گیا اور اس کی جگہ دفتری کام — [OFFICE — ASSISTANTSHIP & SEC PRACTICE] کا دو سالہ نصاب چلایا۔ اس وقت بھی تین کورس چل رہے ہیں۔ امید ہے عنقریب ایک دو نئے اور ایک بعد از ڈپلوما کا نصاب شروع ہو جائے گا۔ لڑکوں کی طرف بھی بہت سے نئے کاموں اور منصوبوں کو آگے بڑھانے کی جد و جہد جاری ہے۔ چوبیس سال بعد ان کا نصاب بالکل نئے طرز پر اور موثر بنایا گیا ہے۔ طلباء کو تربیت دینے اور یونیورسٹی اور باہر سے کام لینے کے لیے ٹریننگ اور پروڈکشن سینٹر قائم کیا گیا ہے اور کئی لاکھ کے آرڈر بھی مل گئے ہیں۔ لڑکوں کی کتابوں کی سہولت کے لیے کتب خانہ کی توسیع اور بک بینک کا کام شروع ہو چکا ہے۔ کئی مزید کورس بھی اگلے سال کھلنے کی امید ہے۔

ڈرافٹس کورسیز نئے نظام کے تحت چلائے جا رہے ہیں۔ خاصہ فرنیچر اور نئے آلات و اوزار خریدے ہیں۔ ایک بس کی فراہمی بھی ہوئی ہے۔ پرانا اسٹاف ترقی کے راستے بند پاتا تھا اس لیے نو پرانے بیکار۔ نئے ریڈر ہوئے ہیں۔ چھٹے منصوبہ سے بہت سے۔ مزید سہولتوں کی ملنے کی توقع ہے۔

زہرہ بشیر احمد

ایک اجنبی

فلے ڈیلفیا (امریکہ) کی ایک شام تھی۔ سردی خوب پڑ رہی تھی۔ برف سے گاؤں کے مکانات اور درخت ڈھکے ہوئے تھے۔ رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ایک مکان میں روشنی دیکھ کر ایک راہ گیر نے اپنا ٹرک روکا اور گھنٹی بجائی گھر کی مالکن نے دروازہ کھولا اور اجنبی کو دروازہ پر کھڑا دیکھ کر کچھ جھجکی اور دروازہ سے سر نکال کر پوچھا۔ تم کون ہو؟ اجنبی ایک سفید بالوں والا بوڑھا آدمی تھا۔ چہرے سے بھلا مانس تھکا ہوا مسافر لگتا تھا۔ اجنبی نے گھر کی مالکن کو دیکھ کر ٹوپی اُتاری۔ گویا اس کو آداب کیا اور درخواست کی کہ اس کو مکان میں رات گزارنے کی اجازت دے دی جائے۔ مکان کی مالکن نے کچھ روکھے منہ سے کہا کہ "ہمارے پاس جگہ نہیں ہے"۔ پھر سڑک کی طرف دیکھ کر کر چاروں طرف خوب برف گر رہا ہے اس کو ترس آیا۔ اور بولی۔ خیر جگہ تو ہمارے گھر میں نہیں ہے لیکن اس وقت تم اندر آجاؤ۔ میرا شوہر ابھی کھیت سے آئے گا تو وہ بتائے گا کہ تم مکان میں رات گزارنے کے لیے ٹھہر سکتے ہو یا نہیں۔" اجنبی اندر آگیا۔ اور آگ کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی نظر ایک بہت بڑے گھنٹے پر پڑی۔ جو مکان کے ایک کونے میں رکھا تھا۔ لیکن گھنٹہ بند تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ خراب ہو گیا ہے لیکن صرف خوبصورتی کی وجہ سے رکھا ہوا ہے اجنبی نے گھر کی مالکن سے پوچھا۔ کیا گھنٹہ خراب ہو گیا ہے ؟ اس نے جواب دیا۔ ہاں! یہ گھنٹہ برسوں سے بند پڑا ہے اور خراب ہو گیا ہے۔ اجنبی نے درخواست کی کہ میں اس گھنٹہ کو دیکھ سکتا ہوں۔ مالکن نے جواب دیا۔ ہاں ضرور دیکھ سکتے ہو۔ یہ بہت خوبصورت ایک مشہور کمپنی کا بنایا ہوا ہے کئی برس سے بند پڑا ہے۔ اجنبی نے اپنی جیب سے اوزار نکالے اور گھنٹہ کو چند منٹ ہی میں درست کر دیا۔ گھنٹہ چلنے لگا۔ مالکن بہت خوش ہوئی۔ اس کی ٹک ٹک کی آواز سے مالکن کی آنکھوں میں چمک آگئی اور چہرے سے خوشی ظاہر ہونے لگی۔ اتنے میں اسکا شوہر آگیا اور گھنٹہ کی ٹک ٹک سن کر حیرت میں رہ گیا۔

وہ کبھی گھنٹہ کو دیکھتا تھا کبھی اجنبی کی طرف اس کی نظر اُٹھتی تھی۔ کبھی اپنی بیوی کو خوشی سے دیکھتا تھا۔ ایک لمحہ بعد جب اس کی حیرت ختم ہوئی تو کسان نے اجنبی کی طرف دیکھا۔ اسی وقت اس کی بیوی نے اجنبی کا تعارف کرایا۔ اور کہا کہ گھنٹہ انھوں نے درست کیا ہے کسان اور اس کی بیوی گھنٹہ کو چلتا دیکھ بہت خوش تھے اور اجنبی کے بہت شکر گزار نظر آرہے تھے۔ چند منٹ کے بعد مالکن نے کھانا لگایا۔ تینوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران اجنبی کو معلوم ہوا کہ اس گھر کے چولہے اور تندور میں بھی خرابی ہے اور مالکن کو کھانا پکانے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اجنبی نے کھانے سے فارغ ہو کر چولہا اور تندور کو بھی دیکھا اور چند ہی منٹ میں اُن کو بھی درست کر دیا۔ جب کسان کا چولہا اور تندور بھی درست ہو گیا تو اُن کو اس اجنبی کو رات گزارنے کے لیے جگہ نہ دینے کی گنجائش نہ رہی۔ رات گزر گئی۔ اجنبی بھی آرام سے سویا۔ اس کے سفر کی تھکن بھی اتر گئی۔ تینوں نے مل کر ناشتہ کیا۔ ناشتہ کے بعد دیکھا تو دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی۔ فضا بہت صحت بخش تھی۔ اجنبی نے

حمید احمد الہاشمی
پرنسپل پولی ٹیکنک۔

انجینرنگ فیکلٹی

مختصر تاریخ و جائزہ

سر سید نے اپنے انگلستان کے قیام کے دوران ہی اس ملی ادارہ میں تکنیکی تعلیم کے شعبہ کے اجراء کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ رڑکی سے اُس وقت تک کے ۲۲۶ فاضل التحصیل طلبا میں کل دو مسلمان تھے۔ مگر وطن واپس ہونے پر باوجود خواہش اور کوشش کے انگریز کی سیاسی و سرکاری پالیسی کے تحت سائنس اور انجینرنگ میں راہیں نہ نکل سکیں۔ گو ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کے بعد بات بنی۔ اِس طرح جو خواب ۱۸۶۹ء میں دیکھا گیا تھا اُس کی تعبیر سر سید کے مشہور جانشین مرحوم ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے ہاتھوں ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ایک ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ ۱۹۳۵ء میں قائم کیا۔ پیسے اور جگہ کی دشواری کے سبب اس کی تعلیم و تربیت یونیورسٹی کی پُرانی مارکٹ میں کی گئی۔ اُس کی ساری دکانیں خالی کرالی گئیں۔ اُس مارکٹ کی مسجد آج بھی پُرانی عمارت میں قائم ہے اور اُس دور کی نشاندہی کرتی ہے۔ عبید اللہ درانی صاحب کی سرکردگی میں مندرجہ ذیل کورس شروع کر دیئے گئے

بقیہ مضمون "ایک اجنبی"

کسان اور اس کی بیوی کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی۔ کسان نے اجنبی کو اجازت دینے سے پہلے کہا کہ میرے ایک کھیت میں پانی نہیں جاتا۔ کہیں رُک جاتا ہے اگر اجنبی وہ کھیت بھی دیکھ لے تو اچھا ہو۔ شاید وہ اس کو بھی درست کر سکے اجنبی جو رخصت ہونے کی تیاری کر رہا تھا ٹرک سے اُتر پڑا اور اپنا سامان اور دوسرے اوزار نکالے اور کسان کے کھیت کے پانی کا بہاؤ ٹھیک کرنے کے لیے تیار ہو گیا اجنبی ۴۔ ۵ روز کھیت پر کام کرتا رہا اور کسان کے کھیت کے پانی کا بہاؤ اُس نے ٹھیک کر دیا۔ کھیت جو عرصہ سے سوکھا پڑا تھا، یکایک اس میں پانی جانے لگا یہ دیکھ کر کسان اور اُس کی بیوی بہت خوش ہوئے۔ اور آپس میں طے کیا کہ اس اجنبی کو اپنے پاس ہی رکھ لیں۔ ایسا کاریگر کہاں ملتا ہے۔ اجنبی کو کسان کے گھر آئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ دوسرے روز ناشتہ کے بعد اجنبی نے کسان اور اس کی بیوی کو خدا حافظ کہا اور رخصت ہونے کو تیار ہو گیا کسان اور بیوی نے اجنبی کو روکا اور درخواست کی کہ وہ اُن کے یہاں قیام کرے اور کسی جگہ جانے کا خیال ترک کر دے۔ اجنبی نے مسکرا کر کہا کہ میں ضرور ٹھہر جاتا لیکن تمہاری طرح اور لوگ بھی ہوں گے جن کو میری مدد کی ضرورت ہوگی۔ میں دنیا میں تنہا ہوں بس یہ ٹرک میرا گھر ہے اور میری زندگی کا یہی مقصد ہے کہ دوسروں کی مدد کروں۔ اب آپ دونوں کا شکریہ۔ اب میں آگے جاؤں گا۔ آپ کی طرح اور لوگ بھی ہیں جن کو مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر اجنبی نے اپنا ٹرک اسٹارٹ کیا اور اپنی راہ لی۔

(بشکریہ ریڈرز ڈائجسٹ۔)

(۱) فورمین (۲) الکٹریشین (۳) موٹر مکینک۔ (۴) موٹر ڈرائیونگ اور (۵) ٹیلی فون سگنلنگ

ان جماعتوں کے لیے کوئی نصاب، ضابطہ یا داخلہ کا طریقہ وضع نہ کیا گیا بلکہ جسے بھی دلچسپی تھی اُس نے داخلہ لیا اور سند لے کر اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ اُس وقت نہ ہی معلم تھے نہ سامان و آلات، نہ کلاسوں میں فرنیچر۔ دو چار ٹوٹی پھوٹی بجلی کی موٹریں، کچھ زنگ لگے آلات واد نار حنید طلبا اور درانی صاحب بس یہی کائنات تھی۔ پھر بھی ۳۷ء میں ورک شاپ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ۷ جنوری ۳۸ء میں بنگال کے وزیر اعلیٰ فضل الحق مرحوم کی سرکردگی میں ایک کمیٹی جس میں جسٹس امیر علی، حاجی محمد امین، حسن شہید سہروردی، سیٹھ آدم جی داؤد جی وغیرہ شامل تھے، چندہ کی فراہمی کے لیے مقرر ہوئی۔ تھوڑے پیسے ہاتھ لگے تو دیواریں کھڑی ہو گئیں مگر چھت ڈالنے کی صورت نہ بنی۔ گو ۳۹ء کی جنگ عظیم نے یہ صورت بدلی اور تعمیر نہایت تیزی آئی دو بڑے ہال بن گئے پڑھائی میں بھی پیش رفت ہوئی۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے سرکار کو سمجھا بجھا کر ایک کورس کم تعلیم یافتہ بچوں کے لیے WAR TECHNICIANS کے نام سے دلایا۔ ... وہ بھی لائے اور اُن کے لیے جلد ہی امین ہوسٹل بھی بنوا دیا یہ الگ بات ہے کہ اس عمارت میں یہی طلباء نہ رکھے گئے۔ ۴۴ء میں کورٹ نے الکٹریکل، مکینکل اور سول انجینیرنگ کے ڈگری کورس چلانے کی تجویز پاس کی۔ یوں کہ اس سے پہلے ڈپلوما کی انھیں شعبوں کی تعلیم ۳۰ء سے ہی رائج تھی۔ گورنمنٹ کی منظوری کے بعد داخلہ و پڑھائی شروع ہو گئی۔ سرکار نے سند کی منظوری ۱۹۴۴ء کے پہلے ہی کورس سے دے دی۔ مگر انسٹی ٹیوشن آف انجینیرز نے ڈگری کو ۴۸ء سے تسلیم کیا اور نوکری کی راہیں

مزید کھلیں۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کسی کام کے کرنے کے لیے قانونی دشواری کو کبھی آڑے نہ آنے دیتے تھے۔ چنانچہ جنگ کی سنگینی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انھوں نے تین سالہ نصاب کو دو ہی سال میں ختم کر کے فاضل تحصیل طلباء کی تعداد انھیں وسائل میں ایک دم سے ڈیوڑھی کر دی۔ جواز چھٹیاں ختم کر کے اور سال کے کام کے دنوں کو بڑھا کر دیا۔ اُس وقت کے پاس شدہ لڑکے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اور اچھے کام کے سبب اعلیٰ سے اعلیٰ منصب پر فائز ہیں یا رٹائر ہوئے ہیں۔ تو حالات یہ تھے کہ پڑھانے والے خال خال، سامان ضرورت سے بہت کم، کتب خانہ کیا کتابیں بھی معدوم۔ پڑھائی اکثر پیڑوں کے نیچے، پنکھوں کے بجائے لُو سے راحت، مگر ایک لگن تھی کہ کام کرنا ہے۔ وقت سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ مقابلہ سخت ہے نہ آسانی سے کام نہ چلے گا۔ صدیوں کی غفلت یا بزرگوں کی حکومت کام نہ دے گی۔

آزادی سے پہلے پرنسپل صاحبان بڑے تجربہ کار، باصلاحیت و باحیثیت لوگ تھے۔ جیسے شوکت عمر مرحوم، خان بہادر عبد الرحمٰن مرحوم، آنجہانی میتھوین وغیرہ۔ اس کے بعد تو حالات بدل گئے۔ مگر ہماری بھر کم شخصیات جیسے کرنل حیدر خاں مرحوم، ڈاکٹر چاکو، حمید اللہ خاں مرحوم، برگیڈیر منگت رائے، ڈاکٹر سہا، پروفیسر لسین انصاری اس عہدہ پر فائز رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے شیخ الجامعہ ہونے پر یونیورسٹی کی بحالی کی طرف محنت کی، زخموں پر پھایہ رکھا اور تعلیمی نظام و نصاب کو وقت کے تقاضوں کے مطابق کیا۔ اچھے استاد ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے اس سب سے کالج کی بھی امداد خاصی بڑھی۔ جب ۱۹۵۱ء کے ایکٹ کا نفاذ ہوا

اور مولانا آزاد کی وزارتِ تعلیم نے ضروریات کے متعلق ایک بااختیار کمیٹی بھیجی تو اس کی سفارش پر جہاں عمارات سامان اور اسٹاف کے لیے پیسے ملے وہیں اُس نے ڈپلوما کی تعلیم کو ڈگری کی تعلیم سے الگ کر دیا۔ ڈپلوما کی تعلیم ریاستی سرکار کے تحت دینے کی تجویز ہوئی۔ امداد چونکہ مشروط تھی اس لیے تعلیمی نظام اور انتظامی نظام میں بھی تبدیلی آئی اسٹاف اور تجربہ گاہیں مشترک رہیں مگر پرنسپل بدل گئے۔ راقم الحروف نے یکم اپریل ۱۹۵۴ء کو پالی ٹکنیک کا چارج لیا۔ اُس وقت اس عہدہ کا نام سپرنٹنڈنٹ تھا اور ادارہ کا نام انسٹی ٹیوٹ آف پالی ٹکنیک۔ اِسے بدل کر یونیورسٹی پالی ٹکنیک کیا۔ دہلی، لکھنو اور بنارس کی بھاگ دوڑ سے پانچ سالہ منصوبے کے تحت منظوری دموٹی رقم حاصل کی۔ جس نے یونیورسٹی کو اس مالیات کے بوجھ سے آزاد کیا، اچھے استاد رکھے، ضیاء الدین ہاسٹل کے لیے مدد لا کر ہاسٹل کی تکمیل کی۔ نصابِ تعلیم بہتر کیا گیا۔ پھر دوسرے منصوبہ کے تحت مزید کوششوں سے خاصا اسٹاف، سامان اور سہولتیں حاصل کیں، طلبا کی تعداد میں ایک دم سے خاصہ اضافہ ہوا۔ اب پہلے سال میں دو سو چالیس داخلوں کی اجازت ہوئی۔ نئی عمارات کے لیے معقول رقم ملی۔ ان کا سنگِ بنیاد گرانٹس کمیشن کے چیرمین آنجہانی سی۔ ڈی دیش مکھ نے رکھا۔ ڈرافٹس مین کلاسیں جاری کی گئیں۔ اور بغیر مزید اسٹاف یہ کام سر کیا گیا۔ یونیورسٹی نے فیکلٹی نظام کے تحت پالی ٹکنیک کو بھی فیکلٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی کا اہم جز رکھا۔ معلم اپنے شعبوں سے وابستہ رہے۔ اسی زمانہ میں ذاکر صاحب مرحوم بد دل ہو کر علی گڑھ سے مستعفی ہو گئے اور کرنل بشیر حسین زیدی نے چارج سنبھالا۔ پرنسپل کی تقرری کے وقت سید احمد عباس کو چھ ماہ کے لیے منتخب کیا گیا۔ مگر جگہ مشتہر نہ کر کے چند سال بعد انھیں مستقل بھی کر دیا گیا۔

انجینئرنگ کالج اور پالی ٹکنیک کے داخلے ہمیشہ ہی مشکل رہے سوائے شروع کے ایک دو سال کے۔ مقابلہ برابر سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔ اس سال بھی انجینئرنگ کالج کی دو سو ستر جگہوں کے لیے بائیس سو امیدوار تھے جبکہ پالی ٹکنیک کی دو سو چالیس جگہوں کے لیے ۳۵ سو گیارہ نے درخواستیں دیں۔ انتخاب پرچوں اور زبانی امتحان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ انجینئرنگ کالج میں زبانی امتحان نہیں ہوتا۔

تیسرے پانچ سالہ منصوبہ کے طفیل انجینئرنگ کالج کو اپنے قیام کے تیس سال بعد ایم ایس انجینئرنگ کورس کھولنے کی اجازت ملی۔ ساتھ ہی بی ایس انجینئرنگ کے داخلوں کی تعداد میں اضافہ ہوا جس سے گراں قدر مالی امداد حاصل ہوئی۔ سامان، اسٹاف اور عمارات میں معقول اضافہ ہوا۔ چوتھے اور پانچویں منصوبہ میں مزید سہولتیں حاصل ہوئیں۔ کیمیکل انجینئرنگ کا شعبہ کھلا، اسٹوڈنٹس سینٹر اور بک بینک کا انعقاد ہوا۔ امید ہے چھٹے منصوبہ میں پٹرولیم کا شعبہ بھی کھل سکے گا۔ اس کے لیے متحدہ عرب امارات سے ۲۲ لاکھ کے قریب مدد حاصل بھی ہو چکی ہے۔ اِن کے علاوہ اور بھی ترقی کے پروگرام ہیں جن میں نئے آلات کی خرید و تربیت، کمپیوٹر اور زرعی انجینئرنگ کی تعلیم و تربیت تحقیق و تعمیر کے کاموں کو آگے بڑھانا شامل ہے۔

پالی ٹکنیک نے اُس زمانے میں لڑکوں کی طرف تو قابلِ ذکر کام نہ کیا مگر لڑکیوں کی تعلیم کے لیے

اطہر پرویز
شعبۂ اردو

آپ بیتی

ہم اِس کا اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ ہم بوڑھے ہوگئے ہیں۔ حالاں کہ ابھی ہماری مدّت ملازمت میں چند سال باقی ہیں لیکن ہمیں اپنے بوڑھے ہونے کا احساس اس بات سے ہوتا ہے کہ اب ہمارا جی چاہنے لگا ہے کہ نوجوانوں کو نصیحت کریں نصیحت کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے تجربے بتائیں — اپنے اوپر جیسی بیتی — مطلب یہ ہے کہ سب پر نہ بیتے۔ ہم کو اب دوبارہ زندگی گزارنے کا موقع تو مل نہیں سکتا لیکن اگر دوسرے اس سے نصیحت پکڑیں" تو کیا برا — خیر جب ہم اِس سرسیّد کے کالج میں پہلے پہل آئے۔ یہ بات ہے جولائی ۱۹۴۱ء کی۔ دوسری جنگ عظیم کو دو سال ہونے کو آئے تھے۔ سچ پوچھیے قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ آگے پیچھے دیکھ کر چل رہے تھے۔ لیکن یہاں آنے کے چند روز کے اندر اندر ہمیں ایسا لگا کہ ہماری عمر کئی سال بڑھ گئی ہے۔ ہمارے اندر بزرگی کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ کالج کی چھٹی ہو اور ہم گھر جائیں اور گھر والوں پر اپنی بزرگی کا رعب ڈالیں۔ حالاں کہ ابھی ٹھیک سے پڑھائی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے بزرگوں نے — بزرگوں سے میرا مطلب وہ طالب علم ہیں جو ہم سے تین چار سال پہلے یہاں وارد ہوئے تھے۔ ہاں تو اُن میں جو ہمارے بہی خواہ تھے، ہمیں ساری اونچ نیچ سمجھا دی تھی۔ دیکھو ہوسٹل کا جب ذکر آئے تو "منٹو ای" کا نام نہ لینا — "منٹو ای" ہوسٹل کا نام نہیں ہے۔ یہ یونیورسٹی کا قبرستان ہے۔ بڑوں کو سلام کرنا۔ باہر نکلو تو ٹوپی نہ بھول جانا۔ شیروانی کے تمام بٹن لگانا — وغیرہ وغیرہ — لیکن پھر بھی کتنی باتیں تھیں جو ہم کو خود تجربوں سے سیکھنا تھیں۔ اوّل تو ہماری عمر ہی کیا تھی۔ سترہ سال کی عمر میں علی گڑھ میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ ایک عزیز کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے۔ آس پاس کے کچھ لڑکوں سے سلام دعا ہو گئی تھی۔ جو ہمارا بڑا خیال رکھتے تھے اور جن کی بدولت ہم نے علی گڑھ سے محبت کا پہلا سبق سیکھا ہاں تو ہم کو ابھی آئے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ ہم نے سوچا ذرا پڑوس کے کمرے میں چلیں اور کچھ باتیں سنیں۔ ہم نے دروازہ کھولا اور "السلام علیکم" کرکے داخل ہوگئے۔ دو جونیئر بیٹھے باتیں کر رہے تھے ہم بھی ان میں شامل ہوگئے۔ ذرا سی دیر میں بیک روم سے سینیئر پارٹنر نکلے ہم نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ انھوں نے بھی "السلام علیکم" سے جواب دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں وعلیکم السلام کا رواج نہیں۔ پھر بولے — "مجھے پتہ نہیں چلا۔ آپ کب آئے آواز سنی تو میں نے کہا میں بھی آپ لوگوں کی باتوں میں شریک ہو جاؤں — لیکن ایسا تو نہیں کہ میری موجودگی دخل در معقولات ہو۔"

ہم لوگوں نے بیک آواز کہا۔ "نہیں کوئی بات نہیں یوں ہی ذرا جنگ پر باتیں کر رہے تھے۔"

غرض تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر محفل برخاست ہوگئی۔ ہم اپنے کمرے میں آگئے۔ ابھی آئے ہوئے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔ ہم نے کہا "تشریف لائیے۔"

یہ ہمارے وہی پڑوس کے کمرے کے بیک روم پارٹنر تھے۔ کہنے لگے کہ ایک بات کہنا تھی۔" پھر کوئی غیر اہم بات کی اور

چلے گئے اور ہماری سمجھ میں آگیا کہ ان کے آنے کا مقصد کیا تھا
ہمیں معلوم ہو گیا کہ جب کسی کے کمرے میں جاؤ تو دستک دے
کر جاؤ۔ اور صاحب پھر تو ہم نے یہ عادت بنا لی جو سمندر
پار بھی ہمارے کام آئی۔ جب کہ ہمارے کچھ ہندوستانی اکثر
یہ غلطی کر بیٹھتے تھے۔ کیوں کہ وہ علی گڑھ کے راستے سے
زندگی میں داخل نہیں ہوئے تھے۔

ہاں تو شام کو ہمارے ایک اور سینیر طالب علم
آگئے کہنے لگے۔ چلو شمشاد میں چل کر چائے پیئیں۔ ہم ان کے ساتھ
ہو گئے۔ راستے میں ہم حسب عادت بلند آواز سے بول رہے تھے
لیکن وہ آہستہ آہستہ جواب دے رہے تھے۔ پھر ایک جگہ
انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "علی گڑھ میں ہم لوگوں کو رہتے
رہتے یہ عادت ہو گئی ہے کہ ہم سڑک پر چلتے ہوئے آہستہ
آہستہ بات کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ گھر بھی
جاتے ہیں تو آواز نہیں نکلتی۔ خیر سڑک پر تو یہ عادت
یوں اچھی ہے کہ بلا وجہ کیوں دوسروں کو اپنی باتیں سنائیں"
_____ ہمیں احساس ہوا اور ہم نے اپنی آواز کی
لے ہلکی کر دی۔ اب ہم "کیفے ڈی جیل" میں داخل ہوئے
اپنی کیبن میں بیٹھے۔ پارٹنر نے آڈر دیا۔ چائے، نمک پارے
اور برفی" ___ ہمیں یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ علی گڑھ
کی یہ "چائے والے" ہے اور اس پر ہم معمولی کلرک
سے لے کر گورنر جنرل کو بلا سکتے ہیں۔

جب ہم چائے پی چکے تو بیرے نے بل پیش کر دیا
جو شاید پانچ آنے کا تھا۔ ہم نے جیب سے پرس نکالنا
چاہا لیکن پارٹنر نے کچھ اس طرح دیکھا کہ ہمارا ہاتھ جہاں تھا
وہیں رہ گیا۔ پارٹنر نے روپیہ نکال کر رکھ دیا۔ بیرے نے
طشتری میں بقیہ پیسے واپس کیے۔ پارٹنر نے اکنی اس میں
چھوڑ دی۔ اور بیرے نے سیلوٹ دیا۔ اور ہم اپنے
کمرے پر واپس آئے۔ سینیر نے کچھ جھینپتے اور کچھ مسکراتے
ہوئے کہا " پارٹنر ایک بات کہوں بُرا نہ ماننا۔
جب آپ کسی کیفے میں کسی سینیر کے ساتھ ہوں تو کبھی
پرس نہ نکالیے یہ سینیر کا حق ہے۔ آپ کا نہیں۔
جب آپ ماشاء اللہ سینیر ہو جائیں گے تو پھر یہ
سعادت آپ کو انجام دینا ہوگی۔ اس وقت نہیں۔
ابھی تو ہمیں ہمارا فرض ادا کرنے دیجیے۔ جب ہم نئے نئے
آئے تھے تو ہم نے برسوں اپنے سینیر کی چائے پی تھی
اب خدا کے فضل سے ہم چار سال بعد اس لائق ہوئے ہیں
کہ اپنا پرس نکالیں ___ اللہ چاہے گا تو ایک دن
آپ کو بھی یہ سعادت حاصل ہوگی۔

اور اللہ نے اس کے بعد ہمیں یہ سعادت
بھی دی اور آج بھی اپنے جونیرز کی خاطر مدارات کر کے
جو خوشی ہوتی ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں
جو کبھی ہماری طرح جونیر رہے ہوں۔

میں کرنے تو جا رہا تھا نصیحت اور لے
کر بیٹھ گیا اپنی یادیں ___ لیکن اگر ہمارے
نوجوان غور کریں تو نصیحت کی بوندیں ان میں ٹپکتی نظر
آئیں گی ___ باقی باتیں پھر کبھی ہوں گی
___ یار زندہ صحبت باقی ___

مضامین بھیجتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خیال
رکھیے۔
مختصر ہوں اور تعلیم، تہذیب، سماجی اصلاح اور
مسلمانوں کی ترقی سے متعلق ہوں۔
تحریر صاف اور صفحہ کے ایک طرف تحریر ہو۔

آزادی و تقسیم ہند کے بعد جامع مسجد دہلی میں مولانا آزاد کی

تاریخی تقریر

عزیزانِ گرامی!

آپ جانتے ہیں کہ وہ کونسی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہجہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع نیا نہیں ہے۔ میں نے اس زمانے میں بھی کہ اس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمہیں یہیں سے خطاب کیا تھا جب تمہارے چہروں پر اضمحلال کے بجائے اطمینان اور تمہارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد تھا۔ آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔

تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں یہیں سے پکارا، اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔ میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر لیے، میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے، میں نے کروٹ لینی چاہی اور تم نے میری کمر توڑ دی، حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست، جو تمہیں داغ جدائی دے گئی ہے اس کے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں خطرے کی ہر شاہراہ پر جھنجوڑا، لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ نتیجہ معلوم ہوا کہ آج اُن ہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں، یا ایک دور افتاد صدا، جس نے وطن میں رہ کر غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے [illegible] تھا، وہاں [illegible] کاٹ لیے [illegible] یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آگیا؟ یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔ یہ تمہارے اپنے ہی اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ دو قوموں کی حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پہ تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے، نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سنی اَن سنی برابر کر دی۔ اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی رفتار تمہارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے وقت کی رفتار تھمی نہیں۔

تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پہ تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں۔ وہ تقدیر جو تمہارے دماغی لغت میں مشیت کی منشا سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی تمہارے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف اُلٹ گئی اور رہنمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کیے تھے وہ بھی دغا دے گئے۔ حالاں کہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے۔ اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری

زندگی ہے۔

میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں لیکن اگر کچھ دور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ تو تمہارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔

ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا:

"جو ہونے والا ہے، اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں بھی سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلوتہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ:

"تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوا ہوا کرتا ہے۔"

اور آج ہندوستان آزاد ہے اور تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ وہ سامنے لال قلعہ کی دیوار پر آزاد ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے وقار سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق کروٹ نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی اور اس کی جگہ بری شے آ گئی ہے

ہاں تمہاری بے قراری اس لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور بری شے ہی کو ماویٰ و ملجا سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا سمجھ کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب تم کسی جنگ کے آغاز کی فکر میں تھے اور آج اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمہاری اس عجلت پر کیا کہوں کہ ادھر ابھی سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور ادھر گمراہی کا خطرہ بھی پیش آ گیا ہے

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاسیات کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے اور کبھی اس پرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ لیکن آج مجھے جو کچھ کہنا ہے میں اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔

مذہبی اختلافات کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے جو ہم نے اپنی آنکھوں دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات پر ابھی تک رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی خاص فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا سیلاب آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے۔ یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لیے تو موجب حیرت ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پہلے دن ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں سوچ سکتے ہیں یا نہیں! اسی خیال سے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتے میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا

ہے۔ دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ مگر اس کا یہ موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔

میں نے تمہیں ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شکست ہاتھ اٹھا لو اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر بھی غور کرو۔ تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں آخر کہاں جا رہے ہو؟ اور کیوں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو! مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمہیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالانکہ دہلی تمہارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرلو جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش و خروش بے جا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بے جا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمان کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمہیں جانے ہی کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمہارے ہاتھ میں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو کہ تمہارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمہارے پاس ہیں تو ان کو اپنے اس خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک امّیؐ کی معرفت فرمایا تھا:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ہ (جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم)۔

ہوائیں آتی اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی۔ لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں، ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا یہ موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت میں نہ تھے

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں لیکن مجھے تمہاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنے گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمہارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن واقعی تمہارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔

آج بھی کہ ہم ایک دور انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان ہی صفحوں میں زیب عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہیں

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ

نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اُجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسہ سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں جو اُجلے نقش و نگار تمہیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں وہ تمہارا ہی قافلہ لایا تھا۔ انھیں بھلاؤ نہیں، انھیں چھوڑو نہیں۔ اُن کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں تو پھر تمہیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔

آؤ عہد کریں کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

"آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے، آج اندھیروں سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں رہا کہ تمہارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں کی سیل کیا ہے کہ تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائنچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمہارے ہی اسلاف تھے جو سمندروں میں اُتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں تو اُن پر مسکرا دیے، بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا، صرصر اُٹھی تو رُخ پھیر دیا، آندھیاں آئیں تو اُن سے کہا کہ تمہارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جاں کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے آج خود اپنے ہی گریبانوں کے تار بیچ رہے ہیں اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے ہیں کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہ تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ چودہ سو برس پہلے کا پرانا نسخہ ہے وہ نسخہ جس کو کائنات کا سب سے بڑا محسن لایا تھا وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان:

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ
الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم
مُّؤْمِنِينَ ○

آج کی صحبت ختم ہو گئی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا وہ میں اختصار کے ساتھ کہہ چکا۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں اپنے حواس پر قابو رکھو۔ اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمہیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی سے اعمالِ صالحہ کی نقدی پر دستیاب ہو سکتی ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

زباں ز نطق فروماند و آرزو باقی است
بضاعتِ سخن آخر شد و سخن باقی است

بقیہ "اداریہ" صفحہ نمبر ۷

قسمیں بدل جاتی ہیں بکھر جاتی ہیں۔ صالح روایات کھٹکنے لگتی ہیں۔ اچھی قدریں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ تجارتی ذہنیت دل و دماغ کے دریچوں کو بند کر دیتی ہے۔ محبت اور شفقت کی جگہ قساوت اور شقاوت لے لیتی ہیں اور انسان بہرا، گونگا اور اندھا ہو جاتا ہے اور اخلاقی اور پر مفلس اور کنگال۔ خدا ہمیں اس افلاس سے بچائے جو زر نہ ہونے کا دوسرا نام ہے اور اس افلاس اور محرومی سے بھی جو زر کے سایہ میں شروع ہوتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۲-۸۱/۱۷

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقرر شدہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱- پروفیشنل اسسٹنٹس (ایک مستقل اور ایک عارضی) مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

۲- پروفیشنل اسسٹنٹ (مستقل) ذاکر حسین انجینئرنگ کالج لائبریری۔

شرح تنخواہ 550-25-750-EB-30-900 روپیہ معہ الاؤنس

قابلیت (ا) ایم اے/ایم ایس سی/ایم کام مع بی لب سائنس دونوں ڈگریاں سکنڈ ڈویژن ہوں

(ب) یونیورسٹی یا کسی اعلیٰ تعلیمی ادارہ کے ڈویژن/سیکشن میں بحیثیت سیمی پروفیشنل کم از کم تین سال کا تجربہ

(ج) ہندی/انگریزی/اردو میں کیٹلاگ ٹائپ کرنے کا علم اور تجربہ

نوٹ: مولانا آزاد لائبریری میں مستقل اسامی کے لیے ایسے امیدوار کو ترجیح دی جائے گی جسے ہندی ڈویژن/سیکشن میں کام کا تجربہ ہو

۳- سیمی پروفیشنل - شعبۂ اردو

۴ " " شعبۂ نباتات

۵ سیمی پروفیشنلس مولانا آزاد لائبریری

۶ سیمی پروفیشنل انجینئرنگ کالج

۷ " " شعبۂ تعلیمات

۸ " " ویمنس کالج

شرح تنخواہ: 380-12-440-EB-15-560-EB-20-640 معہ الاؤنس

قابلیت

لازمی: بی اے/بی ایس سی/بی کام معہ بی لب سائنس یا لائبریری سائنس میں ایک سالہ ڈپلوما (تمام امتحانات میں فرسٹ ڈویژن یا سکنڈ کلاس)

پسندیدہ: تمام اسامیوں کے لیے

انگریزی/اردو میں کیٹلاگ ٹائپ کرنے کا تجربہ

شعبہ اردو میں (نمبر شمار ۳) اسامی کے لیے ان امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی جنہوں نے بی اے میں اردو بحیثیت اختیاری مضمون کے لی ہو یا اردو میں السنہ شرقیہ کا کوئی امتحان پاس کیا ہو۔

انجینئرنگ کالج (نمبر شمار ۶) کی اسامی کے لیے انجینئرنگ کالج لائبریری میں کام کا قدرے تجربہ

۹۔ سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (مویشی خانہ) شعبہ حیوانیات (عارضی)

شرح تنخواہ: 550-25-750-EB-30-900 روپیہ معہ الاؤنس

قابلیت:

(۱) لازمی: کسی ہندوستانی یونیورسٹی سے حیوانیات کے مضمون کے ساتھ بی ایس سی ڈگری

یا

افزائش مویشیان میں سائنس گریجویٹ یا ویٹیرنری سائنس میں متبادل ڈگری

(۲) پسندیدہ:۔ زیر تجربہ جانوروں کی دیکھ ریکھ کا معتد بہ تجربہ

۱۰ ٹیکنیکل اسسٹنٹ: ڈیپارٹمنٹ آف پریونٹو اینڈ سوشل میڈیسن

شرح تنخواہ: 425-15-500-EB-15-560-20-700 روپیہ معہ الاؤنس

(۱) لازمی: سائنس گریجویٹ اور کسی میڈیکل کالج میں پریونٹو اینڈ سوشل میڈیسن/پیتھالوجی/بیکٹیریالوجی کے میدان میں کسی لیباریٹری میں کام کا تین سالہ تجربہ

(۲) پسندیدہ: پبلک ہیلتھ لیباریٹری میں کام کا تجربہ

۱۱۔ انسپکٹرس (دو اسامی) ڈپارٹمنٹ آف گارڈن اینڈ لینڈس

شرح تنخواہ: 425-15-560-EB-20-701 معہ الاؤنس

استعداد: ایگریکلچر گریجویٹ جس میں ہارٹیکلچر ایک مضمون کی حیثیت سے ہو اور کسی منظور شدہ باغ/فارم میں کام کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ

۱۲۔ آرتھوپٹیشن: ڈیپارٹمنٹ آف اپتھلمالوجی۔

شرح تنخواہ: 425-15-500-EB-560-20-700 معہ الاؤنس۔

استعداد (۱) لازمی: انٹرمیڈیٹ (سائنس) اور آرتھوپٹکس کے ڈپلوما کے ساتھ کسی منظور شدہ ہسپتال

--- مع پیپ

میڈیکل کالج میں عملی کام کا تین سالہ تجربہ

نوٹ: منتخب امیدوار کو کسی کلینیکل سیکشن اور ریکھ آلات کی دیکھ بھال کا کام سپرد کیا جائے گا۔

۱۳- پروجیکشنسٹ: ڈپارٹمنٹ آف آپتھلالوجی

شرح تنخواہ: 425-15-560-EB-20-640 معہ الاؤنس

استعداد: (۱) لازمی: گریجویٹ اور ڈپلوما/آڈیو ویژوئل ٹیکنک کی ٹریننگ نیز آڈیو ویژوئل ٹیکنیشین کے ۵ سالہ تجربہ۔ ان امیدواروں کو جنہوں نے کسی میڈیکل کالج یا ہیلتھ ایجوکیشن دینے والے کسی ڈپارٹمنٹ میں بحیثیت پروجیکشنسٹ کام کیا ہو ترجیح دی جائے گی۔

پسندیدہ: آلات وغیرہ کی دیکھ ریکھ کی ٹریننگ

نوٹ: منتخب امیدوار کو آڈیٹوریم اور آڈیو ویژوئل کے سامان کی دیکھ ریکھ کا کام تفویض کیا جا سکتا ہے

۱۴- سپروائزر (باٹنیکل گارڈن) ڈپارٹمنٹ آف باٹنی

شرح تنخواہ 425-15-560-EB-20-700 روپیہ معہ الاؤنس

استعداد: ہائی اسکول مالی/ہیڈ مالی کی حیثیت سے کام کرنے کا ۱۰ سالہ تجربہ۔

۱۵ سینیئر لیباریٹری اسسٹنٹ۔ ڈپارٹمنٹ آف باٹنی

شرح تنخواہ: 380-12-500-EB-15-560 روپیہ معہ الاؤنس

استعداد (۱) لازمی: سائنس سے ہائر سکنڈری یا باٹنی ایک مضمون کی حیثیت لے کر کوئی متبادل امتحان

(۱۱) پسندیدہ: لیباریٹری میں کام کرنے یا تجرباتی پودوں کو جمع کرنے کا تجربہ

۱۶- سینیئر لیباریٹری اسسٹنٹ (پلانٹ کلکٹر) ڈپارٹمنٹ آف باٹنی)

شرح تنخواہ: 380-12-500-EB-560 روپیہ معہ الاؤنس۔

استعداد: I لازمی: سائنس سے ہائر سکنڈری یا باٹنی ایک مضمون کی حیثیت سے لے کر کوئی متبادل امتحان

(۱۱) پسندیدہ تجرباتی پودوں کو جمع کرنے اور محفوظ رکھنے کا تجربہ

۱۷- سینیئر لیباریٹری اسسٹنٹ (دو اسامیاں) ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی

۱۸ سینیئر لیباریٹری اسسٹنٹ (عارضی) ڈپارٹمنٹ آف سرجری

شرح تنخواہ: 380-12-500-EB-15-560 روپیہ معہ الاؤنس

استعداد: سابقہ تجربہ کے ساتھ سائنس میں ہائر سکنڈری

۱۹ جونیر لیباریٹری اسسٹنٹ (پلانٹ ماونسٹر) ڈپارٹمنٹ آف باٹنی

۲۰ جونیر لیباریٹری اسسٹنٹ (عارضی) میڈیکل کالج ہسپتال

۲۱ جونیر لیباریٹری اسسٹنٹ۔ ڈپارٹمنٹ آف مائیکرو بیالوجی

شرح تنخواہ:- 260 - 8 - 300 - EB - 8 - 340 - 10 - 380 - EB - 10 - 430 روپیہ معہ الاؤنس

استعداد: لازمی: میٹرک یا سائنس کے مضامین کے ساتھ کوئی متبادل امتحان

پسندیدہ: میڈیکل کالج ہسپتال میں جونیئر لیباریٹری اسسٹنٹ پوسٹ نمبر شمار (۲) کیلئے میڈیکل لیب ٹیکنالوجی (پیتھالوجی) میں ڈپلوما ڈیپارٹمنٹ آف مائیکرو بائیلوجی میں جونیئر لیباریٹری اسسٹنٹ زیر شمار (۳) کیلئے مائیکرو بائیلوجی ڈپارٹمنٹ میں کام کا تجربہ

۲۲۔ نرسنگ اسسٹنٹ: اجمل خاں طبیہ کالج

شرح تنخواہ:- 260 - 6 - 326 - EB - 8 - 350 روپیہ معہ الاؤنس

استعداد (۱) لازمی: ہائی اسکول اکزلیری نرسنگ میں ڈپلوما یا اس کے متبادل

(۲) پسندیدہ (i) کسی تسلیم شدہ ہسپتال میں بحیثیت نرسنگ اسسٹنٹ کام کا تین سالہ تجربہ

(ii) اردو لکھنے اور پڑھنے کا تجربہ

۲۳۔ خطاط (عارضی) رجسٹرار آفس کے صیغۂ امتحانات میں

شرح تنخواہ: 425 - 15 - 560 - EB - 20 - 700 روپیہ معہ الاؤنس

استعداد: (۱) لازمی انگریزی زبان میں خطاطی (کیلی گرافک آرٹ) کے علم کے ساتھ کسی مستند یونیورسٹی کا گریجویٹ۔

(۲) تعلیمی ادارہ میں کانفیڈینشل مسودات کو بحفاظت رکھنے کے علاوہ مختلف مسودات و ڈگریاں یا سرٹیفکیٹ) کے تحریر کرنے کا عملی تجربہ

پسندیدہ: آرٹس میں ڈپلوما

۲۴ پلمبر راس مسعود ہال

شرح تنخواہ: 260 - 6 - 290 - EB - 6 - 325 - 8 - 366 - EB - 8 - 390 - 10 - 400

روپیہ معہ الاؤنس۔

استعداد (۱) ہائی اسکول (۲) آئی۔ ٹی۔ آئی۔ (انسٹرومینٹ مکینک) (۳) بحیثیت پلمبر کام کا تین سالہ تجربہ

۲۵ پراکٹوریل اسسٹنٹ (تین اسامیاں) پراکٹر آفس مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

شرح تنخواہ:- 330 - 10 - 380 - EB - 12 - 500 - EB - 15 - 560 روپیہ معہ الاؤنس

استعداد: لازمی (۱) بی اے یا اس کے متبادل (۲) واچ اینڈ وارڈ ڈپارٹمنٹ میں بحیثیت سپروائزر کام کا تین سالہ تجربہ (۳) اچھا تن و توش (۴) عمر ۵۰ سال سے زائد نہ ہو۔

پسندیدہ: کھیل کود میں جانکاری۔

نوٹ: اپائنٹمنٹ کے لیے ضروری ہوگا کہ امیدوار عمر اور میڈیکل فٹنس کا سرٹیفکیٹ پیش کرے اور مندرجہ ذیل جسمانی ورزش کا ٹسٹ پاس کرے۔

۴۰۰ میٹر ۱۵۰۰ میٹر۔ لانگ جمپ، ہائی جمپ۔ اسپاٹ پٹ۔ سابقہ فوجی اور نیم فوجی تنظیموں سے وابستہ افراد اور غیر معمولی تجربہ رکھنے والے موزوں افراد کو عمر اور دوسری استعداد میں نرمی کی جاسکتی ہے۔

۲۶ ٹیلی فون میکینک : ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ : 330-10-380-EB-12-500-EB-560 - روپیہ مع الاؤنس۔

استعداد (۱) لازمی: سائنس کے ساتھ ہائی اسکول اور تین سالہ تجربہ [یا] ٹریڈ سرٹیفکٹ مع دو سالہ تجربہ [یا] دس سالہ تجربہ کے ساتھ نوشت وخواند سے واقف ہو۔ پسندیدہ: ٹیلی فون لائن وائرنگ، آٹومیٹک ایکسچینج اور آٹو ٹیلی فون سیٹس کا تجربہ نوٹ: امیدوار کو عملی تجربہ کا مظاہرہ کرنا ہوگا

۲۷ نقشہ نویس (ٹریسر) عارضی ۔ بلڈنگ ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ : 260-8-300-EB-8-340-10-380-EB-10-430 روپیہ مع الاؤنس

استعداد (۱) لازمی ہائی اسکول اور کسی ڈرائنگ آفس میں کام کا ۱ سالہ تجربہ یا تین سالہ تجربہ کے ساتھ ڈرافٹ مین شپ کا سرٹیفکٹ

(۲) پسندیدہ : تعمیرات کی قابل اعتماد فرم یا کسی متبادل تنظیم میں کام کا تجربہ۔

۲۸ ڈرائیور : پراکٹر آفس۔ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

۲۹ ڈرائیور میڈیکل کالج ہسپتال

۳۰ ڈرائیور انجینئرنگ کالج ورکشاپ

شرح تنخواہ : 330-10-350-EB-10-380-12-500-EB-15-560 - روپیہ مع الاؤنس

استعداد (۱) لازمی۔ خواندہ۔ ہلکی/بھاری گاڑیوں کو چلانے کا لائسنس اور پانچ سالہ تجربہ

(۲) پسندیدہ : اردو ہندی میں کام کرنے کی معمولی استعداد (۲) موٹر مکینک کا تجربہ

غیر معمولی استعداد رکھنے والے اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو اعلیٰ تنخواہ ابتدا سے دی جاسکتی ہے۔ امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انھیں بطور T.A. صرف ایک طرف سکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مطبوعہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) سے ذاتی طور پر یا ذاتی پتہ لکھ کر ۲۳+۰ء۰ × ۲۳ کے لفافہ اور نقد دو روپیہ کی رسید (جو مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس میں جمع شدہ ہو) یا انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو کے ہمراہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۸۲ء ہے۔ تاخیر سے موصول ہونے والی یا نامکمل درخواستیں مسترد کر دی جائیں گی۔

پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد نے یونیورسٹی پرنٹنگ پریس علیگڑھ میں چھپوا کر صفدر منزل تاربنگلہ اے ایم یو علیگڑھ سے شائع کیا۔

روحانی سکون ملتا ہے اور خدا کی قربت نصیب ہوتی ہے۔ یہی محبت اور ہمدردی حضرت عیسیٰ کا پیغام ہے۔ مجھے بھی کسی معصوم بچے نے یا جاں بلب انسان نے امن، محبت اور دوستی کا سبق سکھایا۔ مذہب کی بنیاد صلح و آشتی پر ہے اور انسانوں میں مذہب، نسل یا رنگ کی بنا پر تفریق غلط ہے۔ جو مسرت ہمدردی، دوستی اور محبت میں ملتی ہے وہ دنیا کی عظیم ترین مسرت ہے۔ آیئے ہم سب لوگ مسرت سے اپنی روح کو لبریز کرلیں۔"

چھوٹے بچوں نے، جن میں معذور بچے بھی شامل تھے، مدر ٹریسا کی گل پوشی کی۔ مدر ٹریسا نے سب کو دُعائیں دیں اور خدا کے حضور میں دعا مانگ کر معذور بچوں کے ادارے کا افتتاح کیا۔ مدر ٹریسا کی صورت دیکھ کر، اُن کی خدمات کا تجزیہ کرکے، اور اُن کا محض خیال ذہن میں آتے ہی ایک صرف ایک صدا گونجتی ہے ؎

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے


بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
وغیرہ کی دوا۔
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U.
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یو۔پی

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ہجری سنہ ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۲

"اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کر لی ہے۔ میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔" (لیکچروں کا مجموعہ ص ۲۵۹)

" آپ اس بات کو یقیناً جانتے ہوں گے کہ ہندوستان کی ترقی کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ اہل ہنود اور اہل اسلام باہم مل کر کام کریں۔ جب تک یہ نہیں ہوگا، اس ترقی کو جو ایک قوم کرے گی ہم ہندوستان کی کامل ترقی سے تعبیر نہیں کریں گے۔

سر سید

(سفر نامہ پنجاب ص ۱۴۰)

"تم جس دیس میں یہاں سے نکل کر جا رہے ہو وہ بڑا بدنصیب ملک ہے۔ وہ غلاموں کا ملک ہے، جاہلوں کا ملک ہے، بے انصافیوں کا ملک ہے، بے رحمیوں کا ملک ہے، ظالمانہ رسموں کا ملک ہے، غافل پجاریوں کا ملک ہے، بھائی بھائی میں نفرت کا ملک ہے، بیماریوں کا ملک ہے، سستی کا ملک ہے، افلاس اور ناداری کا ملک ہے، بھوک اور مصیبت کا ملک ہے۔ غرض بڑا کم بخت ملک ہے۔ لیکن کیا کیجیے، تمہارا اور ہمارا ملک ہے۔ اسی میں جینا ہے اور اسی میں مرنا ہے۔ اس لیے یہ ملک تمہاری ہمتوں کے امتحان، تمہاری قوتوں کے استعمال اور تمہاری محبت کی آزمائش کی جگہ ہے"

ذاکر حسین

اقتباس از تعلیمی خطبات ص ۳

(یہ وہ خطبہ ہے جو کاشی ودیاپیٹھ کے جلسۂ تقسیم اسناد میں ۱۴ اگست ۱۹۳۵ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے پڑھا۔

تہذیب الاخلاق

رسالہ

علی گڑھ

جلد نمبر ۱
شمارہ نمبر ۷
یکم مئی ۱۹۸۲ء

مدیر: سید حامد
وائس چانسلر۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

قیمت فی پرچہ	۵۰ پیسے
چھ ماہ	آٹھ روپے
سالانہ	پندرہ روپے
غیر ممالک سے	
فی کاپی	ایک ڈالر
سالانہ	بیس ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ

مدیر مسئول رسالہ تہذیب الاخلاق
صفدر منزل۔ تاربنگلہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

دار المصنفین

اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں دنیا اور خصوصاً ہندوستان میں اہم سیاسی تبدیلیاں ہوئیں۔ اس زمانہ میں مغربی یورپ کا عروج شروع ہوا۔ اس کا بہت گہرا اثر مسلمانوں پر پڑا۔

مسلمانوں کی عہد وسطیٰ میں سیاسی اور تہذیبی اہمیت رہی ہے۔ لیکن سترویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں اُن کا زوال ہوا اور وہ فکری علمی اور عملی اعتبار سے مفلوج ہو گئے اور یورپ کی ترقیات سے اتنے مرعوب ہوئے کہ اپنا ماضی خود اُن کی نظروں میں دورِ تاریکی ہو گیا۔ مسلمانوں کو اس ذہنی غلامی سے آزاد کرنے کے لیے جو کوششیں ہوئیں، ان میں دار المصنفین کا حصہ بہت اہم اور بنیادی ہے

یہ اکاڈمی مولانا شبلی نعمانی نے قائم کی۔ شبلی جدید دور کے سیاسی اور تہذیبی تقاضوں سے واقف تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو یورپ کی ذہنی غلامی سے آزاد کرنے اور اُن میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اُن کو پتہ چلا کہ اُن کی ماضی کا دور، دورِ تاریکی نہیں بلکہ سیاسی اور علمی ترقیات کا ایک روشن مینار ہے اور یورپ نے جو علمی ترقیات کی ہیں، اُن کا سرچشمہ وہ علوم ہی ہیں جو قرطبہ اور غرناطہ کی راہ یورپ پہونچے۔

خوش قسمتی سے شبلی کو سلیمان ندوی جیسے شاگرد بھی مل گئے۔ سید سلیمان ندوی نے شبلی کے مشن کو کامیاب بنایا۔ اور اسلام اور مسلمانوں پر ایسے مضامین لکھے جن کی قدر مسلم ممالک کے اہلِ دانش نے بھی کی۔ اور اُن کے ترجمے دوسری زبانوں میں بھی شائع ہوئے۔

آزادیٔ ہند اور تقسیم ہند کے بعد مولانا سید سلیمان

ترکِ وطن کر گئے۔ دارالمصنفین سے اُن کی علیحدگی اور پھر ترکِ وطن سے اس اکاڈمی کو بہت نقصان پہونچا۔ دارالمصنفین کی مطبوعات کا وہ معیارِ تحقیق نہ رہا جو سلیمانی دور میں تھا۔ بہرحال پھر بھی یہ اکاڈمی علمی خدمت کرتی رہی۔ اور تاریخِ ہند اور تاریخِ اسلام پر اُکی مرتب کردہ کتب شائع ہوتی رہی ہیں

اِس اکاڈمی کے اب روحِ رواں سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن ہیں۔ اُن کا قلم دارالمصنفین کے قیام کے مقاصد کی تکمیل میں انتھک کوشش کرتا رہتا ہے شبلی علیہ الرحمہ کے سامنے مسلمانوں کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ آج اس کی ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے سلسلہ میں وقت کے تقاضوں سے آگاہ ہوں۔ ایک معاشرے کے لوگوں کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے اجداد کے کارناموں سے واقف ہو، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنا مستقبل بنانے کے لیے وقت کے مطالبات کو پورا کرے۔ اِس مقصد کا حصول اسی طرح ممکن ہے کہ مسلمان اُن سماجی علوم و افکار سے واقفیت رکھتے ہوں جن کا تعلق سماج کی تبدیلیوں اور ترقی کے سوالات سے ہے۔ افسوس ہے کہ اردو سماجی علوم اور جدید افکار کی کتب سے بالکل تہی دامن ہے اور اردو کے اہلِ قلم کی تحریرات یہ ظاہر نہیں کرتیں کہ مسلم اکابرِ زمانہ کے مسائل کی نوعیت سے آگاہ ہیں۔ راقم کو اپنی کم مائیگی کا احساس ہے اور ملت کے دانشوروں کے بارے میں لب کشائی کے اِس انداز سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن بعض موقعوں پر بے باکی سے اظہارِ خیال، بشرطیکہ مقصد تعمیری ہو، ضروری ہوجاتا ہے — ضرورت ہے کہ دارالمصنفین سماجی علوم خصوصاً سماجیات [Sociology] اور اقتصادیات پر کتابیں شائع کرے۔ ان کے لکھنے والے مترجم نہ ہوں بلکہ مرتب ہوں۔ تاکہ اُن کتب کا مطالعہ بارِ گراں نہ ہوجائے اور اردو کی کتابیں پڑھنے والے آسانی سے اُن کو پڑھ سکیں بھی اور اُن سے استفادہ بھی کریں۔

حال ہی میں دارالمصنفین میں ایک ملّی بین الاقوامی اجتماع ہوا۔ ایسے اجتماعات بہت مبارک ہیں۔ یہ جہاں علمی تحقیقات کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں، وہاں اِن اجتماعات سے وحدتِ فکر بھی پیدا ہوتی ہے جو کسی ملّی مسئلہ پر غور و فکر میں مدد کرتی ہے۔ لیکن عام طور پر مسلم دانشور جب بھی قلم اُٹھاتے ہیں تو اُن کا موضوعِ بحث دورِ ماضی کا کوئی مسئلہ ہوتا ہے۔ ان کی تصانیف اور تالیفات دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ حال و مستقبل کے مسائل ان کا کم ہی موضوع ہوتے ہیں۔ اور کم ہی حال و مستقبل کے مسائل پر ان کی بحث و تکرار ہوتی ہو

ہم کدھر جا رہے ہیں؟

آپ نے حال ہی میں ہندوستان ٹائمز میں ایک تصویر دیکھی ہوگی۔ اس میں دو پولیس کے سپاہی دو نوجوانوں کو اپنی حراست میں لیے جا رہے ہیں۔ نوجوان اپنے چہروں پر کپڑا ڈالے ہوئے ہیں۔ غالبًا اپنے کیے پر پشیمان ہیں یا گھر والوں کی بدنامی کے خیال سے منہ چھپایا ہے۔ تصویر سے متعلق جو خبر ہے اس میں لکھا ہے

دو نوجوان ڈاکو جنہوں نے دہلی کے ایک بینک میں ڈاکہ ڈالا تھا۔ ایک دولت مند خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ خبر سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ سب ہی ڈاکو نوجوان ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں اور خوش حال ہیں۔ مفلوک الحال نہیں، غریب نہیں، نادار نہیں کہ ڈکیتی پر مجبور ہو گئے ہوں۔

بینکوں میں ڈاکے اکثر پڑتے رہتے ہیں اور یہ ڈاکو عام طور پر کھاتے پیتے گھرانوں کے تعلیم یافتہ نوجوان ہوتے ہیں۔ ایک بار تو ایک نواب صاحب کے نور نظر ڈاکوؤں کے سرغنہ تھے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ نواب صاحب نے فرمایا کہ اگر اتنے روپے یہ لڑکا مجھ سے مانگتا تو میں انکار نہ کرتا۔ حال ہی میں دو ڈاکے ٹرین میں بھی پڑے۔ یہ ڈاکو بھی نوجوان تھے۔ ممکن ہے تعلیم یافتہ ہوں۔ یہ سب کیا ہے ؟ کیوں ہے ؟ اور روز بروز ایسے واقعات کیوں بڑھتے جا رہے ہیں۔ ان کا سبب اگر غربت و افلاس ہوتا تو خیر بات سمجھ میں آتی۔ لیکن اگر یہ صرف خطر پسند طبیعتوں کی جولانی کا اظہار ہے تو پھر بات سوچنے کی ہے اگر فرسٹریشن [Frustration] ہے تو پھر یہ نفسیاتی بیماری کیوں پھیل رہی ہے؟ ایک سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ حکومت کا نظام درست نہیں ہے۔ نوجوانوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ ذہنی انتشار کا شکار ہیں اور اپنے مستقبل کے بارے میں مایوس ہیں۔ یہ خوب دلیل ہے اور اس کا کیا خوب ردعمل ہے یہ بھی تو ایک سبب ہو سکتا ہے کہ نوجوانوں میں جوش ہوتا ہے، ولولہ ہوتا ہے۔ ان کی خطر پسند طبیعت کو تسکین ضرور ہوتی ہے۔ ڈاکہ زنی، اغوا، ان کے جوش کی تسکین کا ذریعہ ہیں۔ لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ آخر مایوسی ہو یا جذبات کی تسکین مقصود ہو، اس کے لیے ڈاکہ زنی، قتل و غارت گری اغوا، آبرو ریزی کیوں ہو؟ یہ سوالات ہمارے قومی لیڈروں کے سوچنے کے لیے ہیں۔ ماہرین تعلیم کے غور و فکر کے ہیں، ملک کے دانشوروں کی بحث و مباحثوں کے لیے ہیں۔ جس قدر جلد یہ سب حلقے مل جل کر سوچیں اور ان نوجوانوں کی بے راہ روی کا علاج تلاش کریں، اسی قدر اچھا ہو۔ ورنہ رات کا چین اور دن کا سکون خطرے میں ہوگا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ سینما نے یہ سبق عام کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سینما نے جرم کے ذوق کی پرورش کی ہے۔ لیکن یہ کہنا کافی نہ ہوگا۔ اگر واقعہ یہ ہے تو اس کا تدارک ممکن کیوں نہیں؟ یہ سب باتیں ہیں جن پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے اور ان کا علاج تلاش کرنے کی ضرورت ہے

ایک زمانہ میں کچھ اخلاقی قدریں تھیں ان کا احساس کسی نہ کسی قدر سب کو ہوتا تھا۔ لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ ان کو توڑنے میں شرم محسوس کرتے تھے۔ اب وہ دور گیا۔ اخلاقی قدروں سے انکار ایک عام بات ہے۔ ان کی اہمیت سے عوام بھی منکر ہیں اور دانشور بھی۔ اخلاقی قدریں کچھ ہی ہوں ان کی اہمیت آپ تسلیم کریں یا نہ کریں۔ لیکن یہ بات ہر شخص کو تسلیم کرنی پڑے گی کہ ایک شہری کو دوسرے شہری کا خیال ہونا چاہیے۔ یہ اگر نہ ہوگا تو پھر معاشرے میں امن و سکون کیسے رہے گا

بالکل SECULAR نقطہ نظر سے اس مسئلے کو دیکھیے۔ بھائی بہن عزیز اقربا پڑوسی راہ گیر کا ہر شخص اگر کچھ نہ کچھ خیال نہ رکھے تو معاشرے کی عمارت منہدم ہو جائے گی۔ سڑکوں پر بے روک ٹوک جھگڑے ہوں گے کسی کی جان کے تحفظ کا سوال ہی باقی نہ رہے گا۔ ہر شخص ایک دوسرے کی جیب کترے گا اور اپنے مقصد براری کے لیے ہر کام کرنے کے لیے تیار رہے گا۔

اسلام نے تو شہری حقوق کو خاص اہمیت دی ہے اور ان کا تحفظ ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے۔ شہری حقوق ایک جدید اصطلاح ہے۔ اس کا مطلب ماں باپ، بہن بھائی، پڑوسی راہ گیر سب ہی ہیں۔ ہماری حکومت سکولر ہے گویا قومی معاملات میں کسی خاص مذہب کی پاسداری نہیں کرتی۔ حقوق کے مسئلے کو آپ بچوں کو سکولر نقطہ نظر سے ذہن نشین کرا سکتے ہیں۔ بنیادی بات یہی ہے کہ آپ اخلاقی قدروں کو اہمیت دیں۔ ان کا احترام کریں۔ جس قدر ان اقدار کی اہمیت آپ کریں گے ملک میں جرائم کا ارتکاب کم ہوگا۔ لیکن اگر آپ اخلاقی قدروں کو اہمیت نہیں دیتے تو کوئی اور راہ تجویز کیجیے جس سے ملک میں جرائم کم ہوں اور ہندوستان کے شہری پرسکون زندگی بسر کر سکیں۔

کیا آپ محنت کریں گے؟

آپ کیا کسی مقابلے کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو گھبرانے اور مایوسی کی کیا بات ہے۔ آپ اگر خدا پرست ہیں تو اللہ پر بھروسہ رکھیے اور اپنے دست و بازو پر، اپنی محنت پر بھروسہ کیجیے۔ اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ پہلے مستحکم ارادہ کرو، پھر جدوجہد کرو اور نتیجے کو اللہ پر چھوڑ دو۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے اور آپ اپنی محنت اور طاقت پر بھروسہ کرتے ہیں تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ محنت کیجیے۔ سر بکف جدوجہد کیجیے۔ آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ آپ اللہ کو بھول سکتے ہیں۔ اللہ آپ کو نہیں بھولتا۔ وہ آپ کی محنت رائیگاں نہ جانے دے گا۔

آپ اپنا جائزہ لیجیے کہ آپ کیوں ناکام ہوئے ہیں ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کی قابلیت اور صلاحیت میں کوئی کمی ہو۔ ٹھنڈے دل سے سوچ سکیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کمی کہاں ہے؟ ہو سکتا ہے کہ آپ کو اظہار خیال پر قدرت نہ ہو اور آپ بہت کچھ جانتے ہوں لیکن اس کا تحریری اظہار نہ کر سکتے ہوں۔ اگر ایسا ہے تو ہفتہ میں ۳ مضمون ضرور لکھا کیجیے۔ مسلسل لکھیے برابر لکھیے۔ یہ سلسلہ بند نہ ہو اور لکھ کر کسی کو دکھایا کیجیے۔ کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو با آواز بلند ایک دو بار پڑھیے۔ پھر اس مضمون کو دیکھیے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ Spelling Mistakes کر جاتے ہوں۔ ممتحن کے نزدیک یہ ایک بہت بڑی خامی ہوتی ہے۔ اس کا خیال کیجیے اور خوب Spellings یاد کیجیے۔ اگر آپ کی معلومات میں کمی ہے تو خوب پڑھا کیجیے فرنچ انقلا

ضروری اعلان: قارئین کے اصرار پر ہم نے رسالہ کے حجم میں ۸ صفحات کا اضافہ کر دیا ہے۔ آئندہ شمارہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ نئے خریدار کے لیے آئندہ قیمت اس طرح ہوگی۔ ایک شمارہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے۔ سالا

سوویت انقلاب، انگلستان کا صنعتی انقلاب، نے دنیا کو متاثر کیا ہے۔ اقوام عالم کو غلام بھی بنایا ہے۔ پھر آزادی کی روح بھی ان میں پھونکی ہے۔ اگر آپ گرفتار طلسم ماہتاب" نہیں ہیں تو پھر ذہن نشین کر لیجیے کہ انسان کی آزادی، حریت اور مساوات کے اصلی بانی محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور اسلام کی فتوحات سے یہ تحریکات قسطنطنیہ، سسلی، قرطبہ اور غرناطہ کی راہ سے یورپ میں پھیلیں اور مغرب کے دانشوروں کو متاثر کیا۔ پھر ہندوستان کی تحریک آزادی کا مطالعہ کیجیے۔ راجہ رام موہن رائے کے کارناموں پر نظر ڈالیے۔ ان سب موضوعات کے لیے آپ کو سیکڑوں کتابیں نہ پڑھنی پڑیں گی۔ چند کتابوں سے کام چل جائے گا۔ لیکن تین چار ہزار صفحات ضرور پڑھنا پڑیں گے۔ اس دور میں یہ زندگی میں یہ مشکل نہیں۔ ورنہ پھر آپ زمانہ کے بھنور میں گرفتار ہو جائیں گے۔ بس ہمت کیجیے اور قدم بڑھایے۔

ایک آخری بات اور عرض کر دوں اس کی طرف بھی غور کیجیے۔ اپنی قابلیت اور صلاحیت کا اندازہ غلط نہ لگایے اور احساس کمتری میں بھی مبتلا نہ ہوئیے۔

مسلم یونیورسٹی کے ایک استاد نے بتایا کہ ایک طالب علم نے مقابلے کے امتحان میں شرکت کا اظہار کیا۔ وہ استاد کہتے تھے کہ اس طالب علم کی استطاعت ایسی نہ تھی کہ وہ آئی۔اے۔ایس میں کامیاب ہو سکے۔ میں نے چاہا کہ وہ کسی اور مقابلے کے امتحان میں شرکت کرے۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ ایسا کرنا اس کی توہین ہوگی۔ وہ طالب علم برابر آئی۔اے۔ایس کے امتحان میں شرکت کرتا رہا اور ناکام ہوتا رہا۔ اور افسوس کہ اس نے میرے مشورہ پر عمل نہیں کیا۔ بس آپ بھی اپنی قابلیت کا صحیح اندازہ لگایے اور پھر آئندہ کی ترقی کی منزلوں کی طرف قدم بڑھایے۔

حکومت کی چند ملازمتوں کی تفصیلات حسب ذیل ہیں وہ دیکھیے۔ اس کے علاوہ Employment News پڑھا کیجیے اور یکسوئی سے اپنی ترقی کی کوشش کیجیے۔ اور اللہ تعالے سے کامیابی کی امید کیجیے۔

۱۔ یو۔پی۔ایس۔سی کے تحت اسسٹنٹ گریڈ کے امتحانات ۵ راکتوبر ۱۹۸۲ء کو ہوں گے۔ تفصیل اور درخواستی فارموں کے لیے ایمپلائمنٹ نیوز مورخہ ۲۴ر اپریل ۸۲ء کو دیکھیے۔ درخواستی فارم یا اس کا چربہ صرف اسی شمارے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ مورخہ ۲۴ر اپریل کے ٹائمز آف انڈیا سے بھی تفصیل مل سکتی ہے

۲۔ مختصر نویس۔ Stenographers کے امتحانات برائے ۸۲ء ۵ر ستمبر کو اسٹاف سلکشن کمیشن کے تحت ہوں گے۔ تمام تفصیل کے لیے ایمپلائمنٹ نیوز مورخہ ۲۴ اپریل ۸۲ء دیکھیے۔ درخواستی فارم صدر ڈاکخانوں سے خریدے جا سکتے ہیں

۳۔ نیشنل سیمپل سروے آرگنائزیشن میں ۱۰۸ (محقق) انوسٹی گیٹر کی جگہیں خالی ہیں جن کے لیے اسٹاف سلکشن کمیشن کے تحت داخلے کا امتحان ہوگا ریاضی، معاشیات اور اسٹیٹسٹکس میں گریجوئٹ لوگ درخواست دے سکتے ہیں۔ کمیشن میں درخواست پہنچنے کی آخری تاریخ ۱۰ر مئی ۸۲ء ہے۔ تفصیل

انا ولا غیری

سید حامد

"ہوں تو میں ہوں، میرے سوائے کوئی نہیں" کسی جماعت میں اگر افراد یہ رُخ اختیار کرلیں تو سمجھ لیجیے کہ اب اس کا شیرازہ بکھرنے میں کوئی دیر نہیں۔

دو باتیں ہیں جو کسی جماعت کو یکجا رکھتی ہیں۔ ایک تو مسلک، مقاصد، مفادات، روایات اور اوصاف کا اشتراک۔ ان کا احترام جماعت کے سب افراد کرتے ہیں اور اُن کی خاطر وہ اپنے ذاتی مقصد اور مفاد کو ثانوی حیثیت دیتے اور بعض صورتوں میں قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اگر افراد کے مقاصد باہم ٹکرائیں تو ہر فرد حریف کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور اپنے مطالبات کو کم کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

ہندوستانی مسلمان ان دونوں شرطوں میں سے کسی ایک کو بھی پورا نہیں کر رہے ہیں۔ وہ اشخاص جو اپنے متعلق حسن ظن میں غلو کرتے ہیں وہ نہ افراد کے جذبات کا خیال رکھتے ہیں نہ جماعت کے مفاد کا۔ انانیت، نخوت اور گھمنڈ کے نشے میں چور ہو کر وہ مصالح اور انجام کار سے تغافل ہو جاتے ہیں۔ زبان پر جو کچھ آیا، کہہ دیا، نوک قلم پر جو کچھ آیا، لکھ دیا، دل میں جو کچھ آیا، کر ڈالا۔

انانیت کی صہبا کا اثر بخواروں پر بقدر ظرف ہوتا ہے۔ ایک طبقہ جو صلاحیتوں میں بالکل کورا ہے۔ بہکنے لگتا ہے۔ کم صلاحیت والوں کے لیے وہی ایک جرعہ کافی ہے۔ باصلاحیت افراد میں سے کچھ تو پھل دار درخت کی طرح انکسار اور تواضع میں جھکتے جاتے ہیں اور کچھ رعونت کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ انانیت کا نشہ جہالت کے ساتھ مل جائے تو دو آتشہ ہو جاتا ہے۔ علم انکسار کی طرف لے جاتا ہے۔

انسان کی فطرت ہے کہ جو شخص اپنی بڑائی کا اظہار (اپنے قول، فعل، طور طریقوں سے) کرے اس کی بڑائی تسلیم نہیں کرتے۔ مشک کی خوشبو عطار کے اعلان کی محتاج نہیں۔ جس نے ڈینگ لی دہی کھوکھلا سمجھا گیا

جو ظرف کہ خالی ہو صدا دیتا ہے اکثر

انانیت کی کئی قسمیں ہیں۔ خود پسندی، خود بینی، خود نمائی، خود ستائی، خود غرضی، خودسر[illegible] ان میں سے خود غرضی اور خود پسندی اسی وقت انا[illegible] کے حدود میں آتی ہیں جب وہ اعتدال کا دامن چھو[illegible] دیتی ہیں۔

خود ستائی اپنی تعریف کرنے کو کہتے ہیں۔ اسے ڈینگ اور شیخی کہہ کر بھی پکارا جاتا ہے۔ خو[illegible] سے سامعین حظ اندوز ہوتے ہیں۔ زیر لب مسکرا[illegible] لیکن جلد ہی لبوں کا تبسم غروب ہو جاتا ہے اور [illegible] پر شکن طلوع۔ جو شخص اپنا تذکرہ اور اپنی تعر[illegible] کرتا رہے بور کہلاتا ہے اور زیادہ دیر تک [illegible]

انگیز کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ سننے والوں
کا پیمانۂ صبر چھلک جاتا ہے اور تفنن کا ظرف ٹوٹ جاتا
ہے۔

انانیت کی مذکورہ قسموں میں سے خودپسندی
بے ضرر ہے، اگر وہ اظہار کے لیے بے تاب نہ ہو جائے
جہاں تک تلافیٔ مافات کے طور پر خود کو پسند کر کے دل
کو خوش کرنے کی بات ہے، کسی کو اعتراض کیوں ہونے
لگا۔ خودغرضی کو بھی دنیا چنداں قابلِ اعتراض نہیں
سمجھتی۔ بہ شرطیکہ وہ خدمت اور خلوص کا دعویٰ
کرتی ہوئی نہ آئے۔ ایک شرط اور ہے خودغرضی کبھی کبھی
کمینہ پن، بے دردی، محسن کشی کی شکل اختیار کر لیتی ہے
ایسی صورت میں اُن کا شمار بدترین برائیوں میں ہوتا ہے
انانیت سے خودغرضی کا تعلق صرف اتنا ہے کہ اس کے
زیرِ اثر انسان کو خود سے اتنا شغف رہتا ہے کہ وہ
دوسروں کو بالکل نظرانداز کر دیتا ہے۔

خودنمائی وہاں تک گوارا بلکہ دلفریب ہوتی
ہے جہاں تک وہ نشو و نما کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے
انسان خودنمائی، خود افزائی کے لیے مجبور رہے۔
حُسن اظہار کے لیے بے تاب رہتا ہے خواہ وہ فطری حُسن
ہو خواہ تخلیقی۔ فنونِ لطیفہ، تحقیق، اختراع، ایجاد،
کشف و ریاضت۔ وہ خودنمائی جس کے سرے عملِ تخلیق
یا اظہار نشو و نما کے حسن سے ملتے ہیں، حسین اور ہوشربا
ہوتی ہے۔ لیکن وہ خودنمائی جس کا مقصد دوسروں
کو مرعوب کرنا ہے نہ مرعوب کر پاتی ہے، نہ متاثر
متنفر ضرور کر دیتی ہے۔

شعر و حکمت سے سرشار ہو کر جوشِ تخلیق میں
فیضی چلا اُٹھا تھا۔

امروز نہ شاعرم حکیم۔ دانندہ حادث و قدیم
بانگِ قلم درین شبِ تار۔ صد معنیٔ خفتہ کرد بیدار

(آج میں شاعر نہیں حکیم ہوں، قدیم اور حادث کا
رمز آشنا۔ اس اندھیری رات میں میرے قلم کی
آواز نے صدہا خوابیدہ معانی کو جگا دیا ہے)

یہی تخلیقی خودنمائی غالب کے یہاں اس
طرح جلوہ گر ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

شاعر نے جوشِ تخلیق میں یہ محسوس کیا کہ اس کے
دل و دماغ پر براہِ راست نزولِ انوار ہو رہا ہے

خودبینی اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان
خود ہی کو دیکھتا ہے اور اس عمل سے حظ اندوز
ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ دوسروں کی طرف نہ جائے
اور اسے دوسروں کے جذبات و احساسات کا
خیال نہ رہے۔ خودبینی کے راستہ سے خودغرضی
کی راہ بھی نکلتی ہے۔ غالب نے خودبینی کی توجیہ اس
انداز سے کی تھی کہ اگر تم اپنی جبیں کا آئینہ میرے سامنے
نہ کر دیتے تو میں خودبینی پر کیوں مجبور ہوتا۔

کہتے ہو کہ خودبیں و خودآرا ہوں نہ کیوں ہوں
بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

خودبینی لطافت کے ساتھ ہو تو گلکاری کرتی ہے اور
بھونڈے انداز سے تو دلآزاری۔ دلآزاری سے
ہی انانیت کی حدیں قائم ہوتی ہیں۔ انا اپنا اظہار
کسی طرح کرے، اس کا بے ضرر اور دلکش روپ
وہ ہے جس میں دل آزاری کا شائبہ نہ ہو اور
بھونڈا اور کریہہ اور کرخت روپ وہ، جس میں

اہانت حقارت اور دل آزاری شامل ہوں۔ انا ایک طرف تخلیقی سرشاری اور فرطِ اعتماد کی خبر لاتی ہے تو دوسرے سرے پر چھچھورے پن، بے حسی، بے دردی بے راہ روی، اکڑ، گھمنڈ اور اتراہٹ کی شکل اختیار کرتی ہے۔

گھمنڈ سے زیادہ مضحکہ خیز کوئی چیز نہیں۔ خود دنیا میں انسان کا وجود مکانی اعتبار سے ایک ذرہ اور زمانی اعتبار سے ایک لمحہ سے کم ہے۔ اور یہ ذرہ ہر وقت حوادث کی زد میں اور لمحہ ایک بلبلہ کی طرح جو بنتے ہی ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر خود یہ دنیا جس کی گولائی کو بھی ہم نہیں دیکھ سکتے نظام شمسی میں ایک بہت چھوٹا سیارہ ہے جو ہمیشہ سورج کے طواف میں مشغول رہتا ہے اور اسی سے گرمی اور روشنی حاصل کرتا ہے۔ غیرت باختگی کا یہ حال کہ طواف بھی سیدھے سادے انداز سے نہیں کرتا بلکہ ناچتے ہوئے اپنی کیلی پر تھرکتے ہوئے۔ اور جیسا ہمارا نظام شمسی ہے کائنات میں ایسے اربوں نظام ہیں۔ چنانچہ ان گنت ستاروں کی روشنی باوجود تیزیِ رفتار کے ابھی تک دنیا میں نہیں پہونچی۔ غور کیجیے اگر کائنات کا نقشہ بنایا جائے تو یہ دنیا اتنی چھوٹی اور حقیر ہے، کہ اسے نقشہ پر دکھایا ہی نہیں جا سکتا پھر دنیا میں پیدا ہونے والے ایک حقیر سے انسان کی کیا اوقات۔ وہ اگر اترائے، گھمنڈ کرے، لقہ کبوتر کی طرح اکڑتا چلے، اڑد کے آٹے کی طرح اینٹھتا جائے تو کس کو ہنسی نہ آئے گی۔ کون اس انسان کی قسمت کو نہ روئے گا۔

انانیت بعض اوقات جھوٹے انکسار کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ شکل بھی تقریباً اتنی ہی مکروہ ہے جیسے ملمع کاری یا ریاکاری جو نفس پرستی کو خدمت اور ہوس کو خلوص کا نام دیتی ہے۔ اس نوع کے انکسار کو افتخار مقلوب کہیے۔ خود کو ہیچ مداں کہیں گے اور توقع کریں گے کہ اس طرح دنیا انھیں فخر العلماء سمجھے خود کو عاصی پُر معاصی لکھیں گے اور امید یہ کریں گے کہ دنیا زاہد پارسا سمجھے۔ جھوٹا انکسار ہر بری چیز اور ہر بے جا تصنع کی طرح بُرا ہے۔ اس میں ایک بُرائی یہ بھی ہے کہ جھوٹے انکسار میں اپنی جھوٹی مذمت اس لیے کی جاتی ہے کہ مخاطب اخلاقاً اور مروتاً جھوٹی مدح سرائی کرے۔ گویا انکسار کے پردے میں جھوٹ کا پرچار کیا جا رہا ہے

انانیت کئی سرچشموں سے پھوٹتی ہے۔

کوئی مال پر افتخار کر رہا ہے کوئی جمال پر، غافل سعدی کی اس تنبیہ سے

بر مال و جمال خویش غرہ مشو
کاں را بہ شبے برند واس را بہ تبے

اپنے مال اور حسن پر گھمنڈ نہ کرو پہلا ایک رات میں لٹ جاتا ہے دوسرا بخار میں جاتا رہتا ہے۔ پرستاران حسن غرور حسن میں افزائشِ جمال کو دیکھ لیتے ہیں غرورِ زر میں البتہ حسن کا کوئی شائبہ نہیں ملتا جو چیز حلق سے نیچے نہیں اترتی وہ علم کا غرور ہے اور اس سے بھی زیادہ پارسائی کا زعم۔ غور کیجیے غرور کرنے والوں نے کیا کھویا کیا پایا۔ انھوں نے شکر کھویا اور جگ ہنسائی پائی۔ اور اگر انکے اظہار میں دل دُکھا دیے تو نفرت اور بد دعائیں لیں اور انتقام کا خوف بھی شاملِ حال ہو گیا۔ ستم ہے کہ

جن خصائل اور خوبیوں، اور نعمتوں پر شکر کرنا چاہیے تھا، ان باتوں پر ہم غرور کرتے ہیں۔ کفرانِ نعمت کا رشتہ بد اطواری سے جوڑتے ہیں۔ دلوں کو بلاوجہ توڑتے ہیں۔

یہاں تک تو انانیت کے انفرادی پہلوؤں کا ذکر تھا۔ اب ہم آغاز داستان کی طرف لوٹتے ہیں ہندوستانی مسلمانوں نے انانیت کے ہاتھوں بہت نقصان اُٹھائے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کی انا اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اُسے ذرا سی ٹھیس پہونچی اور وہ توازن کھو بیٹھا۔ انفرادی انا پر ہم اجتماعی مفاد کو قربان کر دیتے ہیں۔ اور ماتھے پر بل تک نہیں آتا۔ ہم افراد کے متعلق رائے معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز سے قائم نہیں کرتے۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی بُرا، اخلاق باختہ اور سماج دشمن کیوں نہ ہو اگر وہ اپنے برتاؤ سے ہماری انا کی تشفی کر سکتا ہے تو ہم اس کا اس کے مذموم مقاصد کے حصول میں ساتھ دیں گے۔ کوئی شخص کتنا ہی اچھا، پارسا اور انسان دوست ہو اور اس کے مقاصد کتنے ہی ارفع اور اعلیٰ ہوں، اگر اُس نے قصداً یا سہواً ہمیں نظر انداز کر دیا۔ تو ہم اس کی مخالفت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں گے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ جو کام وہ کر رہا ہے وہ ملک و ملت کے لیے بالواسطہ یا بلا واسطہ مفید اور ضروری ہے۔ اکثر اس غریب کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی کہ یہ تغافل یہ عداوت یہ مخالفت آخر کیوں

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ انا دلوں کے درمیان حائل ہوتی ہے۔ شدّت اختیار کرے تو دلوں کو توڑتی ہے، عام ہو جائے تو شیرازہ کو بکھیر دیتی ہے، جمیعت کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ انکسار افراد کو قریب لاتا ہے، دلوں کو جوڑتا ہے، جماعت کی شیرازہ بندی کرتا ہے۔ تلخی کو خوش دلی اور طیش کو محبت میں بدل دیتا ہے۔

آیئے! ہم عہد کریں کہ ان امور میں جو اجتماعی مفاد کے ہیں اپنی ذات کو بیچ میں نہ آنے دیں گے۔ مقاصد و اقدار کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ افراد کی حیثیت ثانوی ہے اور اس سے بھی کم وزن ہے اُن افراد کا ہمارے ساتھ تعلق یا برتاؤ

انا نے ہمیں کبھی مل کر کام نہیں کرنے دیا۔ پیشِ رفت میں سدا ہماری سدِّ راہ ہوئی۔ اُس نے ہمارے نقطۂ نگاہ کو مسخ کر دیا۔ اس کے فریب میں آکر ہم اقدار کو بھول گئے۔ حصولِ مقصد سے ہٹ گئے۔ اتحاد کو اس نے بے دخل کیا۔ نفاق کو تخت پر بٹھا دیا۔ ہمارے دلوں کو کلیوں کی طرح کھلنا تھا، وہ انگاروں کی طرح دہکنے لگے۔ جو کام کرنے کے لیے اُٹھے اُن کی راہ میں ہماری انا نے کانٹے بوئے — اور خود ان کی انا نے انھیں کام سے دست کش کر دیا کہ وہ بُرائی، الزام اور دشنام کی تاب نہ لا سکے۔ انھوں نے اِس مقصد کو جو انھیں عزیز تھا اور جس میں دنیا اور آخرت کی فلاح تھی، اِس لیے تج دیا کہ اُن کی انا نے انھیں گالی کھانے، برائی سننے، رسوائی سہنے کی اجازت نہیں دی۔ مسلمانوں میں سماجی خدمت کی روایت مفقود ہے اور یہ بڑی حد تک اُن کی تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی پسماندگی کا سبب ہے۔ روایت مفقود اِس بنا پر ہوئی کہ جو مقصد لے کر کام کرنے اُٹھے تنگ نظر اور اخلاق باختہ نکتہ چینیوں کی دشنام طرازیوں اور بہتان تراشیوں کی تاب نہ لا سکے۔ انا نے انھیں

خدمتِ خلق اور مقصدِ زندگی سے محروم کر دیا۔

ہمارے افراد کی انا ہمارے ملی اتحاد اور ہماری پیش رفت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ اچھا ہوتا جو اسے ہم راستے سے ہٹا دیتے۔

اقبال نے کہا تھا:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ربطِ ملت کو پراگندہ کرنے والی انا، ہماری نخوت ہماری رعونت ہے۔ اس نے ہمیں دریا سے جدا کر دیا ہماری طاقت کو پارہ پارہ کر دیا۔ انا کی بدولت موجوں نے دریا کا دامن چھوڑ دیا، جھاگ بن کر ہوا میں بکھر گئیں وہ جھاگ جن میں نہ سمندر کا جلال ہے، نہ موج کی طاقت اور اضطراب۔

یہ انانیت اسی جذباتیت کی پروردہ ہے جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ ایک پہلے شمارہ میں آچکا ہے۔ انانیت جہالت کے بطن سے پیدا ہوتی ہے اور عداوت نفاق، نفسانیت اور انتقام کو جنم دیتی ہے۔ ایسے دشمن سے حذر اَولیٰ۔ ہمیں غرور کی تباہ کاریوں سے بچنا چاہیے جس جماعت میں افراد غرور میں گرفتار ہوں اس کو نفاق کی آگ جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ اتحاد کے لیے نسخۂ کیمیا انکسار ہے۔ بے نفسی انفرادی انکسار سے اجتماعی افتخار کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ جماعت کی کامیابی فرد کی بے نفسی پر مبنی ہے۔ انکسار جوڑتا ہے غرور توڑتا ہے۔ انکسار فرد کو مقصد کے تابع کر دیتا ہے۔ انا مقصد کو فرد کے تابع کر دیتی ہے۔ ایک فرد نہیں ہزاروں لاکھوں کروڑوں افراد کی خواہشات اور رجحانات کے تابع۔ جتنے افراد اتنی ہی راہیں۔ ایسی حالت میں

حصولِ مقصدِ معلوم

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ وہ مسلمان جو سرکاری ملازمتوں یا تعلیمی اداروں سے سبکدوش ہوتے ہیں ریٹائر ہوتے ہی خانہ نشین ہو جاتے ہیں اپنی پگڑی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے۔ انھیں یہ اندیشہ ستاتا ہے ہے کہ گھر سے باہر نکلے تو کوئی پگڑی نہ اچھال دے گویا زندگی کا سارا سرمایہ پگڑی میں چھپا ہوا ہے۔ یہ پگڑی، یہ آن، یہ نام نہاد عزت، یہ جھوٹا رعب داب یہ سب انانیت کے دھندے ہیں۔ انانیت نہ رہے تو یہ بھی نہ رہیں۔ اللہ کے بندے یہ نہیں سوچتے کہ اُن کی ساری عمر مزدوری میں گزر گئی۔ مزدوری ملتی رہی کام کرتے رہے۔ زرخرید غلامی ختم ہوئی تو کام کرنا بند کر دیا۔ گویا پیسے کے سوا اُن کے لیے کام کا کوئی محرک نہیں ہے۔ بغیر پیسہ کے لالچ کے کوئی کام کرتے تو یہ بات ثابت ہو جاتی کہ وہ زرخرید غلام نہیں ہیں۔ آزاد اور خوددار اور ذی حس انسان ہیں جن کے دل میں انسانوں کا درد ہے اور جو زر کی طمع اور صلہ کی خواہش کے بغیر خدا کی راہ میں اس کی مخلوق کی خدمت کر سکتے ہیں۔ انھیں ایک موقع ملا غلامی کی زنجیریں توڑنے کا، مخلوق کی خدمت کرنے کا، اپنے بھائیوں کی پسماندگی دور کرنے کا۔ انھوں نے اس زریں موقع کو ہاتھ سے جانے دیا محض اس لیے کہ اُن کی انا نے یہ گوارا نہیں کیا کہ کوئی اُن پر انگلی اُٹھائے، نکتہ چینی کرے، کوئی انھیں بُرا بھلا کہے، کوئی انھیں گالیاں دے، کوئی اُن کی نیت پر شبہ کرے۔ کیوں کہ ایسا ہوتا تو اُن کی عزت چلی جاتی۔ وہ نہیں جانتے کہ عزت اور ذلت

خدا کے ہاتھ میں ہے۔ فیصلہ قادر مطلق ہی کرتا ہے۔
کسی اچھے مقصد کے لیے بدنامی مول لینا، گالیاں کھانا
خطرات سے مقابلہ کرنا اور گالیاں کھا کے بے مزہ نہ
ہونا، خطرات سے سراسیمہ نہ ہونا۔ مصائب و حوادث
سے سینہ سپر ہونا۔ عداوت کے نرغے میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ
سے نصرت کی دعا مانگنا، نماز اور ثابت قدمی کے ساتھ
یہ کسی عبادت سے کم نہیں

حافظ شیراز لکھا تھا۔

اے صاحب کرامت شکرانۂ سلامت
روزے تفقدے کن درویش بے نوا را

یعنی سلامتی کا شکرانہ یہ ہے کہ بے نوا درویش
پر مہربانی کی جائے۔ شکرانۂ سلامت یہ ہے کہ
انسانوں کی بھلائی کے لیے وقت اور پیسہ اور محنت
صرف کریں۔ اجتماعی خیر انفرادی خیر سے بڑھ کر ہے
لہذا اصلاح، تعلیم، تربیت اور امداد کے کاموں میں
بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ پارسیوں، عیسائیوں
اور سکھوں کو دیکھیے، پیشرفت اور اصلاح کے کام
ہر طرف دیکھنے میں آتے ہیں اور یہی حال ہمارے
ہندوستانیوں کا ہے لیکن ہمارے یہاں جہاں
اس طرح کی تحریک شروع ہوتی وہیں پھوٹ پڑ گئی۔ افراد
کی انانیت یہ گوارا نہیں کر پاتی کہ دوسرے افراد کو کارہائے
خیر کے سلسلہ میں کوئی نیک نامی حاصل ہو جائے نکتہ چینی
حسد، الزام، بہتان کا سلسلہ شروع ہو جاتا
ہے۔ یہی راز ہماری پسماندگی کا ہے۔ کاش
اصلاحی مقاصد کے درمیان ہم اپنی ذات کو نہ لائیں
اور خود کو مٹا کر مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش
کریں۔ ہماری پیشرفت کی راہ میں کوہ گراں
ہماری انانیت ہے۔

اپنی ذات کے متعلق ہمارے حس
کی مریضانہ ذکاوت نے ہمیں کسی کام کا نہیں
رکھا۔ ہمارا ردِّ عمل صحت مند نہیں رہا۔ ہم
تدبر اور تفکّر پر جذبات کے دھندلکے کو ترجیح
دیتے ہیں۔ پھر تعجب کیوں کہ ہمارے فیصلے
صحیح نہیں ہوتے۔

انانیت اور عزتِ نفس کے درمیان
بُعد المشرقین ہے۔ عزتِ نفس کا تقاضہ ہے
کہ ذاتی اغراض کے لیے کسی انسان کے سامنے
سر نہ جھکاؤ۔ لیکن انسانی فلاح کے لیے خود
کو جھکانا اور مٹانا بھی پڑے تو اُس سے گریز نہ
کرو۔ یہی فرق دراصل خود غرضی اور خودداری
کے درمیان ہے۔

انا ایک فطری جذبہ ہے۔ ہمیں کوشش
سے اُس کو قابو میں رکھنا ہے، اس کو زیر
کرنا ہے۔ اس کا ارتفاع کر کے اسی تخلیقی کاموں
میں لگانا ہے۔ اسے عزتِ نفس کے منصب پر بٹھانا
ہے۔ دوسری جانب خدمتِ خلق کے لیے
اسے زیر کرنا ہے۔ تاکہ انا اشتراک عمل کا
راستہ نہ روک پائے۔

گذارش

جملہ خط و کتابت مندرجہ ذیل پتہ پر ہی کریں
مدیر مسئول۔ رسالہ تہذیب الاخلاق
صفدر منزل۔ تار بنگلہ۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ

اقتباس از مقالات شبلی

امام وقت ملّا نظام الدین فرنگی محلی

ملّا نظام الدین فرنگی محلی کی دو بیویاں تھیں، دوسری شادی غالباً اس غرض سے کی تھی کہ پہلی سے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ بیماری کو جب اشتداد ہوا تو زوجۂ اولیٰ ملّا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ مجھ سے جو تقصیر ہوئی معاف فرمایئے، فرمایا تم نے کوئی تقصیر نہیں کی، البتہ مجھ سے یہ گناہ ہوا کہ تمھارے ہوتے ہوئے دوسری شادی کی، اس جرم کو معاف کردو تھوڑی دیر کے بعد زوجۂ ثانیہ تشریف لے آئیں اور کہا آپ تو تشریف لیے جاتے ہیں، اولاد کو کس پر چھوڑے جاتے ہیں۔ ملّا صاحب کو سخت رنج ہوا۔ حاضرین سے کہا کہ ان کو اٹھا کر بٹھا دو۔ پھر فرمایا نظام الدین تو جاتا ہے لیکن خدا ہمیشہ رہے گا۔

ملّا صاحب ابتدا ہی سے نہایت غنی النفس اور متوکل تھے۔ اُن کی علمی شہرت اُن کی زندگی ہی میں اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ وہ ذرا سی خواہش کرتے تو ہر قسم کا جاہ و منصب حاصل ہو سکتا تھا، لیکن اس طرف توجہ نہ کی۔ تین تین دن کے فاقے ہوتے تھے اور نہایت استقلال کے ساتھ برداشت کرتے تھے امراء اور اہل دول سے بالکل نہیں ملتے تھے بلکہ اس قسم کے لوگ خدمت میں حاضر ہوتے تو بے التفاتی ظاہر فرماتے۔ شیخ غلام مخدوم کا بیان ہے کہ میں ایک دفعہ ملّا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا اور بیماری کی وجہ سے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اتفاقاً امراء میں سے ایک صاحب ملنے کے لیے آئے۔ میں نے اُن کے لحاظ سے پلنگ پر سے اُترآنا چاہا۔ ملّا صاحب نے فرمایا کہ "سفید پوشوں کو دیکھ کر بدحواس کیوں ہوتے ہو آرام سے لیٹے رہو۔"

امرائے شاہی میں سے ایک رئیس جو ہفت ہزاری کا منصب رکھتا تھا، ملّا صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز جمعہ کے دن عین نماز کے وقت کہلا بھیجا کہ اگر آپ ذرا انتظار فرمائیں تو میں بھی حاضر خدمت ہو کر حضور کی اقتدا کا شرف حاصل کر سکوں۔ ملّا صاحب نے ذرا دیر انتظار فرمایا اور پھر کہا کہ نماز خدا کے لیے ہے، اہل دنیا کے لیے نہیں ہے۔ یہ کہہ کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے بے نفسی۔ لیکن یہ بے نیازی اور بد دماغی امراء اور جاہ پرستوں کے لیے مخصوص تھی۔ ورنہ مزاج میں مسکینی اور تواضع تھی۔ ایک دن ایک ایرانی ابوالعلی نام ملّا صاحب کا شہرہ سن کر ملاقات کے لیے آیا ملّا صاحب درسگاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے رہے تھے۔ اس نے ایرانی علماء کا جاہ و جلال دیکھا تھا ملّا صاحب کی طرف اُس کا خیال نہ جا سکا۔ لوگوں سے پوچھا۔ ملّا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں آپ نے فرمایا۔ مولانا کا حال تو میں نہیں جانتا، لیکن نظام الدین میرا ہی نام ہے۔ اُس نے چند فقہی مسائل پیش کیے کہ اہل حق و شیعہ مذہب والوں کے

نزدیک اس کا کیا جواب ہے۔ ملا صاحب نے اس کا منشا سمجھ کر شیعوں کی روایت کے مطابق جواب دیا۔ نہایت پسند کیا اور کہا کہ ان ہی مسئلوں کو اہل ضلالت و سنیوں کے مذہب کے موافق بیان فرمایئے۔ ملا صاحب نے سنیوں کی روائتیں بیان کیں وہ عش عش کر گیا اور کہا کہ جس قدر سنا تھا اس سے زیادہ پایا۔

علماء کی نسبت عام شکایت ہے کہ علمی مباحثات سے ہمیشہ ان کو فخر و امتیاز مقصود ہوتا ہے۔ اور اس لیے وہ کبھی حریف کے مقابلہ میں سکوت اختیار نہیں کرتے۔ لیکن ملا صاحب اس عیب سے بالکل پاک تھے۔ ایک دفعہ ایک صاحب ان سے بحث کرنے کے لیے تشریف لائے۔ ملا صاحب نے مسئلہ کی تحقیق بیان فرمائی۔ انھوں نے اعتراض کیا ملا صاحب چپ ہوگئے انھوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ میں نے ملا نظام الدین کو بند کر دیا۔ ملا صاحب کے تلامذہ کو ناگوار گزرا۔ اور ایک شاگرد نے جا کر ان صاحب کو زور تقریر سے بالکل ساکت کر دیا۔ ملا صاحب کو خبر ہوئی تو اس قدر برہم ہوئے کہ اس شاگرد کو حلقہ درس سے الگ کر دیا اور کہا کہ میں ہرگز یہ نہیں پسند کرتا کہ میری وجہ سے کسی شخص کی شہرت اور عزت میں فرق آئے۔

درس نظامیہ کی خصوصیات: ملا صاحب کے حالات میں سب سے زیادہ قابل توجہ ان کا مقرر کردہ نصاب ہے جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔

اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ چونکہ اس میں فقہ کی کتابیں بہت کم ہیں اور جو ہیں اُن میں معقولی استدلال سے کام لیا گیا ہے، اس لیے اس نصاب سے وہ تقشف اور ظاہر پرستی اور مذہب کا بیجا تعصب نہیں پیدا ہوتا تھا، جو سطحی فقہاء کا خاصہ ہے اسی کا اثر ہے کہ فرنگی محل میں جو بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے اُن میں کسی نے مذہبی منافرت کی کوئی کتاب نہیں لکھی۔ شیعہ سنی کا جھگڑا سب سے زیادہ لکھنؤ میں پیدا ہو سکتا تھا لیکن یہ صدا دلی سے بلند ہوئی اور گو تمام ملک اس ہنگامہ میں مبتلا ہو گیا اور تحفۂ اثنا عشریہ کے فقرے رجز کی طرح مذہبی پہلوانوں کی زبانوں پر چڑھ گئے۔ تاہم علمائے فرنگی محل اخیر تک اس شورش سے الگ رہے۔ اس نصاب سے اور باتوں کے ساتھ ملا نظام الدین صاحب کی انصاف پرستی اور فراخ حوصلگی کا بڑا ثبوت ملتا ہے علماء میں یہ خصلت بہت کم پائی جاتی ہے کہ اُن کو معاصرین کے فضل کا اقرار ہو۔ لیکن ملا صاحب نے اپنے معاصر علما کی اس وقت عزت کی کہ اُن کی کتابیں درس میں داخل کر دیں۔ — نور الانوار، سُلّم، مسلّم سب اُن کے معاصرین کی تصنیفات ہیں اور درس نظامیہ میں داخل ہیں۔

ملا صاحب کی کسر نفسی اس سے بڑھ کر کیا ہوگی کہ اپنی کوئی تصنیف نصاب میں داخل نہیں کی۔ حالاں کہ اُن کا کوئی معاصر اُن کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

سرفینہ خان
عبداللہ گرلز کالج

بیگم بھوپال کے دور میں

خواتین میں بیداری

عظیم ہستیاں جن سے قوم کو فیض پہونچا ہے اُن کو خراجِ عقیدت پیش کرنا اور اُن کی یاد کو زندہ اور تازہ رکھنا ہمارا فرض ہے۔ ہم کو ایسی ذی شان ہستیوں کا ذکر بار بار کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اُن کا ذکر، اُن کے کارنامے، ان کی جد و جہد سماجی تحریک کو آگے بڑھانے والوں کے لیے مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ میں ایسی ہی ایک ہستی سلطان جہاں بیگم فرمانروائے بھوپال کا ذکر اس موقع پر کرنا چاہوں گی۔

سرکارِ عالیہ ۱۹۰۱ء میں بھوپال کی فرمانروا ہوئیں اور انھوں نے دورِ فرمانروائی میں ریاست میں مختلف قسم کی اصلاحات کے علاوہ تعلیم کی طرف اور خاص طور پر عورتوں کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ فرمائی۔ بیگم صاحبہ کی والدہ شاہ جہاں بیگم اور نانی سکندر بیگم نے اپنے زمانے میں لڑکیوں کے دو مدرسے وکٹوریہ اور بلقیسہ کے نام سے بھوپال میں قائم کیے تھے۔ لیکن ان اسکولوں میں دینی تعلیم اور دستکاری پر زیادہ توجہ تھی

سلطان جہاں بیگم کی خواہش ایک جدید مدرسہ قائم کرنے کے ساتھ ساتھ قدیم مدرسوں کی اصلاحات کرنا بھی تھی۔ چنانچہ مسند نشینی کے تیسرے ہی سال سلطانیہ اسکول قائم کیا[1]۔ اسکول میں اس زمانہ کے منظور شدہ نصاب کے علاوہ قرآن مجید باترجمہ اور قرأت کا بھی انتظام تھا۔ دستکاری اور فرسٹ ایڈ کی تعلیم بھی لازمی تھی۔ کم پڑھی لکھی عورتوں کو ریاست کے چھوٹے مدرسوں میں تعلیم دینے کے قابل بنانے کے لیے ٹریننگ کی بھی ایک شاخ کھولی گئی تھی۔

خطباتِ سلیمانی[2] پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم کو تعلیم و تربیتِ نسواں سے کتنی گہری دلچسپی اور اس کے متعلق کتنی معلومات تھیں۔ استانیوں کی ٹریننگ کی ضرورت کا احساس اور لڑکیوں کے لیے عمدہ نصابِ تعلیم تیار کروانے کا شوق بیگم صاحبہ کو تاحیات رہا۔ وہ معلمی کے پیشے کو بڑی قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں خود پڑھنے لکھنے کا ذوق و شوق تھا۔ اور پڑھی لکھی

---

* یہ مضمون علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ویمنس کالج کی پلاٹینم جبلی کے موقع پر ۵ مارچ ۱۹۸۲ء کو ایک سیمینار کے موقع پر پڑھا گیا۔

1. حیاتِ سلطانی۔ محمد امین زبیری۔ عزیز پریس آگرہ ۱۹۲۹ء۔ اس حساب سے سلطانیہ اسکول ۱۹۰۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔

2. خطباتِ سلطانی۔ علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم کے تمام لکچر، مضامین اور اسپیچوں کا مجموعہ۔

عورتوں کی عزت کرتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ابو الکلام آزاد کی ہمشیرہ آبرو بیگم اور عطیہ فیضی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مدرسہ سلطانیہ پر بیگم صاحبہ کی خاص توجہ اور نظرِ عنایت تھی۔[1] اسکول کی ترقی سے خوش ہوتیں لڑکیوں کی ہمت افزائی کرتیں اور استانیوں کی عزت کرتی تھیں۔ اکثر اپنے ہاتھ سے انعامات تقسیم کرتی تھیں۔ ایسے ہی ایک موقع پر فرماتی ہیں۔

"مدرسہ میں لڑکیوں کی ترقی اور سالانہ امتحان کے نتائج اس امر کو ظاہر کرتے ہیں کہ باشندگانِ بھوپال کو تعلیم کی طرف دلچسپی ہوتی جاتی ہے اور جو لڑکیاں مدرسہ میں داخل ہوتی ہیں وہ دل لگا کر اور شوق سے تعلیم حاصل کرتی ہیں یہ امر میرے لیے مسرت کا باعث ہے جب سے کرسن ملکہ وتی جنا یا جو ایک ہندوستانی عورت ہیں اور جنہوں نے یورپ میں بھی تعلیم پائی ہے، اس مدرسہ کی مدرسہ مقرر ہوئی ہیں اس وقت سے مجھے مدرسہ کی آئندہ حالت کے لیے اور بھی اطمینان ہو گیا ہے۔ کیوں کہ عمدہ تعلیم کے لیے مدرسہ کا لائق ہونا نہایت ضروری ہے۔[2]"

ایک اور جلسۂ تقسیم انعامات کے موقع پر فرماتی ہیں۔

"میں نے یہ اسکول بطور نمونہ کے قائم کیا ہے۔ اس لیے میں یہاں کی ہر طالب علم کو اپنے ہم جنسوں کے سامنے بطور مثال پیش ہونا پسند کرتی ہوں۔ تاکہ تعلیم نسواں کی تحریک عام ہو جائے اور تعلیم مدرسہ کے متعلق جو اعتراضات اکثر لوگ کرتے ہیں ان کے لیے تم ایک مجسم جواب بنو۔"[3]

بیگم صاحبہ نے اپنے یورپ کے سفر کے دوران بچوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق بہت کچھ سیکھا اور سمجھا اور اس کا ذکر جا بجا اپنے مضامین اور تقاریر میں کیا آپ نے ہمیشہ یہی چاہا کہ ریاست کے لوگ اور خاص طور پر وہاں کی عورتیں تعلیم و تربیت میں کسی سے کم نہ رہ جائیں۔ ساتھ ہی ساتھ یورپ کی اندھا دھند تقلید کے خلاف برابر آواز اٹھاتی رہیں۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر گرل گائیڈنگ کی تحریک ہندوستان میں شروع ہوئی سرکار عالیہ نے بھی اس کو مفید سمجھ کر بھوپال کی لڑکیوں کے لیے رائج کیا۔ لیکن ترمیم کے ساتھ۔ کیوں کہ وہ یہ خوب سمجھتی تھیں کہ کوئی بھی تحریک اس وقت تک قبولیت حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ ملک کے رسم و رواج کے مطابق نہ ہو۔

عورتوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ عورتوں اور بچوں کی صحت کا خیال بھی بیگم صاحبہ کو ہمیشہ رہا۔ بچے کی پیدائش کے سلسلہ میں لاپرواہی

---

1. سلطانیہ اسکول میں میں نے آٹھویں کلاس تک تعلیم پائی۔
2. اسپیچ بہ جلسہ تقسیم انعامات مدرسہ سلطانیہ۔ ۱۴ر رجب ۱۳۲۵ھ = ۲۴ر اگست ۱۹۰۷ء خطبات سلطانی صفحہ ۸۱
3. اسپیچ بہ جلسہ مدرسہ سلطانیہ ۲۹ر ذی قعدہ ۱۳۲۷ھ = ۱۳ر ستمبر ۱۹۰۹ء بروز دوشنبہ خطبات سلطانی صفحہ ۱۸۶۔

اور مناسب میڈیکل ایڈ نہ ہونے کی وجہ سے بے شمار عورتوں کا موت کا شکار ہونا لازمی امر تھا۔ یہ باتیں ایسی نہ تھیں کہ بیگم کا دردمند دل گہرے طور سے متاثر نہ ہوتا۔ انھوں نے دائیوں کی ٹریننگ کا انتظام کیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک بڑا جدید طرز کا زنانہ اسپتال بھی عورتوں اور بچوں کے علاج کے لیے کھلوایا۔

اپنی تقاریر کے ذریعہ آپ نے ریاست کے باشندوں میں جہالت مٹانے کی پوری کوشش کی۔ کئی قسم کے مدارس کھلوائے۔ دستکاری کی ٹریننگ دلوائی اور پرنس آف ویلس کلب قائم کیا[1] اس کلب کی بھوپال کی عورتوں کی زندگی میں ایک خاص اہمیت تھی۔ کیوں کہ یہ کلب پردہ نشین عورتوں کے لیے ایک بہترین سوسائٹی کے نمونہ پر قائم کیا گیا تھا جو ریاست کی عورتوں کے تمدن اور معاشرت کو نکھارنے اور جلا دینے کا ایک بہترین ذریعہ تھا۔ بیگم کا خیال تھا کہ ترقی اور شائستگی کا بہت کچھ انحصار اچھی اور شائستہ سوسائٹی پر ہے اور عمدہ صحبت وسیع الخیالی پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے[2]۔ چنانچہ کلب میں قومی اور ملکی جلسے منعقد کیے جاتے تھے۔ تقریری مقابلے ہوتے تھے۔ اکثر کلب میں مینا بازار جن کا کل انتظام عورتوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا، لگائے جاتے تھے۔ اس طرح کام کرنے کا سلیقہ اور عورتوں میں انتظام کی صلاحیت ابھرتی۔ کلب سے بھوپال کی عورتوں کو مالی فائدے بھی خوب پہنچے۔ مینا بازار کے موقع پر عورتیں ہی مختلف قسم کی دکانیں لگاتی اور سجاتی تھیں اور عورتیں ہی خرید و فروخت میں حصہ لیتی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ گرل گائڈ کی لڑکیاں قدم قدم پر انتظام میں شامل رہتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ریاست کی عورتوں میں سماجی بیداری اور خوداعتمادی پیدا ہوگئی تھی۔

بیگم صاحبہ نے کلب کی ایک تقریر کے ذریعہ جو بوقت روانگی سفر یورپ ممبران کلب کو ارشاد فرمائی تھی، فرمایا:

"کبھی کوئی ملک، یا قوم، یا خاندان ترقی یا تہذیب ادعا نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کی عورتیں تعلیم و تربیت میں ...
اس لیے تعلیم نسواں کی اشاعت میں جو کچھ میں کر رہی ہوں وہ میرا ایک فرض ہے اور یہ کام کسی خاص شکریہ یا استحسان عام کی غرض سے نہیں ہے۔ اس کے علاوہ نہ صرف میرے بلکہ ہر ایک حکمراں کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ اپنی رعایا کی علمی و ذہنی ترقی اور تمدن کی اصلاح میں کوشش کرے[3]
میں اب آپ کے سامنے کچھ حصہ اس تقـ

1۔ بھوپال کا زنانہ کلب جس میں پردہ کا پورا پورا انتظام تھا۔
2۔ خطبات سلطانی ص۲۴۲
3۔ خطبات سلطانی ص۲۴۲

محترمہ اُمّ ہانی فخرالزماں
شعبۂ فارسی

اجتماعی اصلاح میں خواتین کی اہمیت

صنفِ نازک پر اسلام کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس کو غارِ مذلت سے نکال مختلف مواقع پر قرآن نے نہایت موثر انداز میں قابل رحم قرار دیا ہے اور اس کی خوبیوں اور خدمات کو سراہتے ہوئے وراثت کا حق دار بنایا اور اُس کی پرورش وپرداخت کی تمام ذمہ داریاں مردوں کے کندھوں پر ڈال دیں، باپ بیٹی، بھائی بہن اور ماں بیٹے کا سابقہ عارضی ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن میں اس کا ذکر اختصار کے ساتھ آیا ہے۔ لیکن زن وشوہر کے تعلقات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ان کو ایک دوسرے کا لباس بتایا ہے جس سے آرام، پردہ پوشی، زینت اور قربت بیک وقت حاصل ہوتی ہے لیکن ان دونوں میں شوہر کو حاکم بتایا ہے اور

"الرجال قوامون علی النساء"

بقیہ "بیگم بھوپال کے دور میں خواتین میں بیداری"

کا جو کہ سرکار عالیہ نے لیڈیز کلب میں متعلق بہ رسوم شادی وغمی ارشاد کیا تھا، پیش کرتی ہوں۔ بیگم کی تقریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو فضول اور غیر شرعی مراسم سے کتنی نفرت تھی۔ لہذا جہالت کو مٹانے کی برابر کوشش کرتی رہتی تھیں۔

"میں نے جہاں تک غور کیا ان فضول اور غیر شرعی مراسم کا میلان عورتوں میں بہت زیادہ ہے۔ اگر عورتیں اِن رسومات کو مٹانا چاہیں تو باآسانی مٹا سکتی ہیں۔ میرا یہ خیال اور یقین نیا نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ سے جس قدر عقل مند لوگ گزرے ہیں اور موجود ہیں، سب کا خیال اور یقین ہے۔ مثلاً لڑکیوں کی شادی کو لیجیے کہ نکاح کرنا واجب اور جہیز دینا مسنون ہے۔ لیکن اس واجب اور سنت کو ادا کرنے کا کیا بُرا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے بجز خاص خاص دولت مند گھروں کے روزمرہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر چھوٹے اور بڑے گھر کی لڑکی کی شادی بغیر قرض کے نہیں ہوسکتی"۱؎

سلطان جہاں بیگم نہ صرف اپنی رعایا میں بلکہ سارے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقے میں بہت ہی ہر دل عزیز اور مقبول تھیں علی گڑھ کی تحریک کو پھیلانے اور علی گڑھ میں تعلیم نسواں کا پرچار کرنے میں آپ نے نمایاں حصّہ لیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے اِس سلسلہ میں سر سید احمد خاں اور شیخ عبداللہ صاحب کو ہر قسم کی امداد فراہم کی تھی اپنی مصروفیات کے باوجود سماجی سدھار کی دھن اور لگن بیسویں صدی کی شروع کی ایک پردہ نشیں فرماں روا کی زندگی کا جزو بن جانا ایک بہت بڑی بات تھی۔ آپ کی مثال موجودہ تعلیمی اور سماجی کام کرنے والوں کے لیے ایک مشعل راہ بن سکتی ہے اور بیگم صاحبہ کی تقریریں ومضامین اور ٹھوس کام آج بھی ہم کو بے لوث خدمت کرنے کی طرف راغب کرسکتے ہیں

۱؎ خطبات سلطانی ص ۲۱۴

کا فیصلہ سناتے ہوئے مرد کو حسنِ سلوک کی تاکید کی
گئی ہے جس سے کہ اس کے اختیارات کا مزید ثبوت ملتا
ہے۔ بیوی کو شوہر کے لیے بیجان مٹی

"حرثٌ لکم"

قرار دیا ہے۔ بیوی کے ناپسندیدہ اعمال پر شوہر کو ترکِ
تعلق اور جسمانی سزا کا بھی اختیار دے دیا ہے لیکن
اس کے برعکس اجازت نہیں دی حالاں کہ ارتکابِ گناہ
دوسری طرف سے بھی ہو سکتا ہے؟ اس کے باوجود بھی
رشتہ کو قائم رکھنے کا اختیار صرف مرد کو ہے۔

بیدہٖ عقدۃ النکاح

جس وقت چاہے اس گرہ کو کھول دے۔ اس کی مرضی
کے علاوہ کسی اور وجہ کی ضرورت نہیں۔ اگر غور سے
دیکھا جائے تو یہ تمام احکام عملی مصالح پر مبنی ہیں۔ مگر
تعلیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ خواتین میں مردوں کی
برابری کا ولولہ پیدا ہو گیا ہے۔ اُن کو یہ خیال ہوتا ہے
کہ اگر شوہر تعلیم یافتہ ہے تو ہم بھی ہیں اگر وہ اپنی روزی
خود کما سکتا ہے تو ہم بھی کما سکتے ہیں۔ اس لیے کوئی
وجہ نہیں کہ اس کی حکومت کو برداشت کریں۔ لیکن
خواتین خواہ کتنی ہی ترقی کر جائیں ان پر خاندان کی
کفالت کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور یہ ایک فرق
بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ایک خاندان کی بنیاد زن و شوہر
پر ہوتی ہے۔ خدا کی خدائی ہو، دنیا کی کوئی سلطنت
ہو یا گھر کا چھوٹا سا کنبہ آخری فیصلہ ایک ہی طرف
سے ہوتا ہے۔ اگر میاں بیوی میں اقتدار کی جنگ
چھڑ جائے تو اختلاف رائے سے معاملہ شروع ہو کر
کشمکش اور منافرت تک پہنچتا ہے۔ جس کا بد زبانی
بدتمیزی، گالی گلوچ اور بسا اوقات زدوکوب

سے اظہار ہوتا ہے اور اُس کے بہت دور رس نتائج
ہوتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ گھر کی فضا مکدر ہو جاتی ہے
بلکہ وہ معصوم بچے جن کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی
ہے، شعوری اور غیر شعوری طور پر اس ماحول سے متاثر
ہوتے ہیں۔ اُن کی زبانوں پر وہی الفاظ چڑھ جاتے
ہیں اور حرکات و سکنات سے وہی انداز ظاہر ہوتا
ہیں اور جب وہ آئندہ درس گاہوں میں جاتے ہیں، اپ
جا اور بیجا مانگیں پوری کرانے کے لیے اساتذہ اور دو
ذمہ داروں سے وہی جنگ شروع کر دیتے ہیں جو گھر
میں دیکھتے ہیں۔ ایسی تعداد خواہ کتنی ہی کم ہو مگر ان کا
طریق اظہار متعدی مرض کی طرح تیزی سے پھیل جاتا ہے
اور تمام ماحول اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ جو بچے گھروں
مناسب تربیت پا کر آتے ہیں وہ بھی اس رنگ میں
جاتے ہیں، یا اس ماحول سے تنگ آ کر کہیں گوشہ عا
اختیار کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گیہوں کے سا
گھن بھی پس جاتا ہے۔ اچھے اور برے دونوں قسم
بچے اپنے حصولِ مقصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ جب
خود اُن کے اور ماں باپ کے منصوبوں پر کڑی ض
لگتی ہے۔ اساتذہ اور دوسرے ذمہ دار بے بس
ان بچوں کی نادانی پر کفِ افسوس ملتے ہیں۔ جہا
تک ممکن ہوتا ہے اصلاح و تلافی کی کوشش کرتے ہ
لیکن کہاں تک۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اب یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اگر ایک ہی کو حاکم مانیں
حکومت کا مستحق کون ہو سکتا ہے۔ خاندان کی
اور پرداخت کی تمام تر ذمہ داری قانون اور
نے مرد پر ڈالی ہے۔ وہ اپنا خون پسینہ ایک

منتظر عباس نقوی
(شعبہ اردو)

اقبال اور سرسید تحریک

۱۸۷۷ء مسلمانانِ ہند کی تاریخ میں وہ یادگار سال ہے جس نے انھیں دو گراں بہا تحفے عطا کیے: ایک اس عظیم المرتبت انسان کی صورت میں جس نے سیالکوٹ کے ایک درویش صفت بزرگ شیخ نور محمد کی آغوش میں آنکھیں کھولیں اور محمد اقبال نام پایا؛ دوسرا اُس رفیع الشان ادارے کی شکل میں جس کی داغ بیل علی گڑھ کے پیرِ دانا سید احمد خاں کے ہاتھوں پڑی، اور آگے چل کر مسلم یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہوا۔ ان دونوں نے جوان ہور ہندوستانی مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکالنے اور اُن کا کھویا ہوا وقار واپس دلانے کے لیے جو جد وجہد کی وہ ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک روشن اور درخشاں باب ہے۔

اقبال کی شخصیت اور شاعری کے نشوونما میں بلاشبہ بہت سے عوامل کار فرما ہیں، جن کی نشاندہی کے لیے متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں اور برابر لکھے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ

بقیہ "اجتماعی اصلاح میں خواتین کی اہمیت"

انتہائی خلوص اور انکساری کے انداز میں اس کو پوری کرتا ہے۔ اگر اس کی وہ شریکِ حیات جو اُس کی زندگی اور خوشیوں کا محور ہے، اس کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دے گی تو وہ کسبِ معاش کی تگ و دو میں پیچھے رہ جائے گا جس کا نقصان اس کے پورے خاندان کو پہنچے گا اور وہ خود مرد کی کوفت اور کلفت کا باعث ہوگا اور اس کے قوائے فکری مفلوج ہو کر رہ جائیں گے۔ حصولِ معاش کی جد و جہد میں اس کو جو پریشانیاں اُٹھانی پڑتی ہیں اس کا گھر والوں کو نہ پوری طرح اندازہ ہوتا ہے اور نہ وہ اس کی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر بے چون و چرا اس کو گھر کا حاکم تسلیم کر لیا جائے تو اس (مرد) کے لیے بہت بڑی تقویت کا باعث ہوگا۔

ایک فلاسفر کا قول ہے کہ انسان زندگی کی تمام جد وجہد اس لیے کرتا ہے کہ گھر میں خوش رہے۔ جب مرد اپنی اس کامیابی کو محسوس کرے گا تو یقیناً اُس کو اطمینانِ خاطر نصیب ہوگا اور وہ باہر کی گتھیوں کو آسانی سے سلجھا سکے گا۔ بچے ایک خوش گوار اور مہذب ماحول میں پرورش پائیں گے اس کے بعد جہاں بھی جائیں گے خاندان اور درس گاہ کا نام روشن کریں گے اور اپنی آئندہ زندگی کی تیاری کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں خواتین کی انا پر شوہر کی اطاعت بار گزرے، لیکن اس کے خوش آئند نتائج دیکھ کر اسی طریقے کو بہتر سمجھیں گی۔

اقبال کے مفسرین اور تذکرہ نگاروں نے اب تک ایک
اہم حقیقت کی طرف بالکل توجہ نہیں دی اور وہ یہ کہ
اقبال کے ذہنی نشو و نما اور سیرت کی تشکیل کا زمانہ
انیسویں صدی کا وہ حصہ ہے جب سرسید تحریک پورے
شباب پر تھی اور سرسید کے افکار و نظریات کو پنجاب
میں خاص طور پر قبول عام حاصل ہو رہا تھا

اقبال اس خوش نصیب نسل سے تعلق رکھتے
ہیں جو علی گڑھ میں براہ راست اور علی گڑھ سے باہر
بالواسطہ سرسید جیسے بلند قامت مصلح قوم کے سایۂ عاطفت
میں پروان چڑھی۔ ہر چند کہ اقبال علی گڑھ کے طالب علم
نہیں رہے اور انھیں سرسید کی حیات میں علی گڑھ آنے
کا کوئی موقع بھی نہیں ملا لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ
سرسید کی شخصیت اور قومی خدمات سے متاثر نہ ہوتے
جبکہ وہ بزرگ جن کے زیر سایہ اقبال کی شخصیت کا
نشو و نما ہوا پنجاب کے اُن چند لوگوں میں سے تھے
جنھیں اُس علاقے میں سرسید کا خلیفہ کہا جا سکتا ہے
ہماری مراد مولوی میر حسن صاحب سے ہے جو سرسید سے
انتہا درجہ کی عقیدت رکھتے تھے اور مذہبی، معاشرتی
تعلیمی معاملات میں پوری طرح سرسید کے ہم خیال تھے۔

مولوی میر حسن صاحب کی سرسید سے پہلی
ملاقات ۱۸۷۳ء میں ہوئی اور پہلے ہی دن سے ایسے
دوستانہ روابط قائم ہو گئے کہ پھر جب تک سرسید زندہ
رہتے مولوی صاحب مرحوم اُن کی دعوت پر ہر سال
محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں پابندی سے
شریک ہوتے رہے۔ اس سلسلہ میں اس واقعہ کا نقل
کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس نے مولوی صاحب
کے دل میں سرسید کے لیے ایسی بے پناہ عقیدت پیدا
کردی کہ وہ مرتے دم تک انھیں کا کلمہ پڑھتے رہے۔

"سرسید مرحوم کی زندگی کے آخری دن
تھے۔ مولوی صاحب کانفرنس کے اجلاس
میں شرکت کے لیے علی گڑھ میں تشریف فرما
تھے۔ رات کو دیر تک کسی اہم مسئلے کے متعلق
گفتگو ہوتی رہی اور پھر دونوں بزرگ سو گئے
آدھی رات کے وقت مولوی صاحب کی آنکھ
کھلی تو سرسید والے پلنگ کو خالی پایا مولوی
صاحب کو کچھ تردد ہوا، باہر نکل کر دیکھا
سرسید برآمدے کے ایک کونے میں کھڑے
آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے دعا کر رہے
تھے کہ خدا اُن کی قوم کو گمراہی سے بچائے
اور ترقی کی طرف لائے۔ اُس نیک مرد
کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے[1]

شیخ اعجاز احمد اپنے مضمون "علامہ
اقبال کے استاد" میں یہ واقعہ نقل کرنے کے بعد
لکھتے ہیں کہ

"سرسید کے اِس اخلاص کا مرحوم پر
اس قدر اثر ہوا کہ تادمِ مرگ اُن کے
مداح رہے۔"

ہمیں معلوم ہے کہ اقبال کی شاعری کا
آغاز اُسی روایتی انداز کی غزل گوئی سے ہوا تھا جس
کی سربراہی اُس دور میں داغ دہلوی کر رہے تھے
چنانچہ فطرتاً انھوں نے تلمذ کے سلسلے میں داغ ہی سے
رجوع کیا اور کچھ عرصہ تک اپنی غزلیں استاد کی خدمت

---

[1] نیرنگ خیال۔ اقبال نمبر۔ ستمبر/اکتوبر ۱۹۳۲ء

میں اصلاح کے لیے بھیجتے رہے، لیکن میر حسن صاحب کا فیضانِ نظر بہت جلد انھیں قومی شاعری کی اس راہ پہ لے آیا جو سرسید تحریک نے شعراء کو دکھائی تھی۔ سرسید نے ادبی موضوعات پر خود تو کم ہی قلم اٹھایا لیکن ان کے شاگرد معنوی مولانا حالی نے اُن کے تصورات اور نظریات کو منضبط کر کے تفصیل کے ساتھ "مقدمہ شعر و شاعری" کی صورت میں پیش کر دیا۔ مقدمہ شعر و شاعری سب سے پہلی بار دیوان حالی کے مقدمہ کے طور پر ۱۸۹۳ء میں شایع ہوا۔ اس میں حالی نے شعر و شاعری کے بارے میں جو اصولی مباحث چھیڑے اور اردو شاعری میں جس تبدیلی پر زور دیا وہ پہلے ہی ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکے تھے اور جدید نظم کی یہ تحریک حالی اور آزاد کی مشترکہ کوششوں سے دھیرے دھیرے فروغ پا رہی تھی۔ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے قیام کا مقصد بھی دراصل اسی تحریک کو فروغ دینا تھا۔ اقبال ابھی عمر کے بائیسویں سال ہی میں تھے کہ اس انجمن کی مجلس انتظامیہ کے رکن منتخب ہو گئے اور اس کے جلسوں میں شریک ہو کر قومی اور وطنی موضوعات پر جدید قسم کی نظمیں پڑھنے لگے۔ "ہمالہ" "نالۂ یتیم" "دردِ دل" "فریادِ امت" یہ سب وہی نظمیں ہیں جو انجمن حمایت اسلام کے پلیٹ فارم سے پیش کی گئیں۔ ان کے موضوعات ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں اقبال، حالی اور سرسید سے کتنے متاثر تھے۔

غرض یہ قومی رنگ بالآخر اُن کی شخصیت کا جزو بن گیا کہ انھوں نے آگے چل کر اپنی تمام تر شعری صلاحیتوں اور فکری توانائیوں کو قومی تعمیر و ترقی کے لیے وقف کر دیا۔ اور سرسید اور حالی نے شاعری میں جس مقصدیت پر زور دیا تھا، وہی اُن کی شاعری کا رہنمایانہ اصول قرار پائی۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی حقیقت کے ترجمان ہیں:

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

صرف یہی نہیں کہ اقبال نے جو شاعرانہ مسلک اختیار کیا اُس میں سرسید تحریک کا بڑا دخل ہے بلکہ اقبال کی بعض نظموں کے مطالعے سے جو اس دور میں لکھی گئیں صاف پتا چلتا ہے کہ انھوں نے سرسید کے سماجی، تعلیمی اور مذہبی نظریات کا ہمدردی سے مطالعہ کیا تھا اور وہ اس روح کو پا گئے تھے جو سرسید کے خطبات مقالات اور دوسری تحریروں میں جاری و ساری تھی۔ اُن کی نظم "سید کی لوحِ تربت" اس کا واضح ثبوت ہے۔

اس مختصر مقالے میں کسی تفصیل کی گنجائش نہیں تھی بہر حال مجملاً ایک ایسے مسئلہ کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے جس پر اقبال اور سرسید دونوں موضوعات پر تحقیقی کام کرنے والے طلبا کو توجہ دینی چاہیے۔

فرخ جلالی
شعبہ تاریخ

عنایت اللہ خاں شروانی

سر سیّد کے ایک ساتھی

علی گڑھ میں سر سید امیدوں کے سہارے کام کرتے رہے۔ یہاں آس کی گھنی چھاؤں کم اور غریب الوطنی کی دھوپ زیادہ تھی۔ انھوں نے نہ ہمت ہاری نہ مایوس ہوئے۔ امید کی خوشی اُن کی سچی رہبر اور اعلیٰ مقصود کی تلاش ان کی آرزو تھی۔

سب کو معلوم ہے کہ سائن ٹیفک سوسائٹی کا تخیل غازی پور میں پروان چڑھا اور علی گڑھ میں اس کی نشو و نما ہوئی۔ سائن ٹیفک سوسائٹی کے قانون ۱۸۶۴ء میں تحریر تھا۔

"مستقل مقام سوسائٹی کا انجام کو الہ آباد میں ہوگا۔ مگر جب تک کہ سوسائٹی بخوبی نہ چل نکلے، اس وقت تک اس کا مقام ان مقاموں پر ہوگا جہاں جہاں سیّد احمد خاں صدر الصدور کا قیام ہوتا رہے گا۔"

سر سیّد کا ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ تبادلہ ہوگیا۔ یہاں کئی حضرات نے سوسائٹی کی مدد کی اور ممبر ہوگئے۔ محمد عنایت اللہ خاں نے سر سیّد کا گرم جوشی سے استقبال کیا اور خود ممبر بنے۔ محمد عنایت اللہ خاں علی گڑھ ضلع کے ممتاز رئیس محمد داؤد خاں کے بیٹے تھے جن کے سر سید سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ محمد عنایت اللہ خاں نے اپنے بھائی غلام احمد خاں سے سوسائٹی کو ڈھائی سو روپیہ دلوائے۔ نواب محمد مزمل اللہ خاں حاجی غلام احمد خاں کے چھوٹے بیٹے تھے۔

۱۶ اگست ۱۸۶۴ء کو سائن ٹیفک سوسائٹی کا جلسہ ہوا۔ اس میں محمد عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور نے ایک تجویز پیش کی۔

اے صاحبو! مجھ کو یاد ہے کہ قانون سوسائٹی میں یہ بات مندرج ہے کہ انجام کو مقام مستقل سوسائٹی کا الہ آباد قرار پاوے گا۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس ضلع کے رئیسوں اور تعلقداروں نے واسطے تعمیر مکان سوسائٹی کے چندہ دینا قبول کیا ہے۔ اس لیے میں تحریک کرتا ہوں کہ آئندہ اجلاس میں حسب ضابطہ تحریک کی جاوے کہ اب سے ہیڈ کوارٹر اس سوسائٹی کا ہمیشہ کے واسطے علی گڑھ قرار پاوے۔"

سر سید کے مشہور دوست راجہ جے کشن داس اس تحریک کی تائید کی اور بالاتفاق یہ تجویز منظور ہوئی۔

اسی جلسہ میں سرسید نے کہا
"سر جمیع قسم کے علوم وفنون کے آلات
جو یورپ میں مروج ہیں اور جن کے
ذریعہ طالب علموں کو ہر قسم کے علوم
وفنون کے تجربے دکھائے جاتے ہیں
سوسائٹی کو جمع کرنا چاہیں۔ کیوں کہ
ابتدا سے سوسائٹی کی خواہش ہے کہ
ہر مہینہ میں دو تین دفعہ بذریعہ لکچروں
اور دکھانے تجربوں کے ہندوستانیوں
کو یورپ کے علوم وفنون کی نئی تحقیقاتیں
بخوبی سمجھائی جاویں۔
سائنٹیفک سوسائٹی کی اسی رویداد میں درج ہے
محمد عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور
نے ان تدبیروں کے پورا ہونے سکے
لیے زیادہ تر اپنا شوق ظاہر کیا اور
یہ صلاح دی کہ ان امور کے انجام
ہونے کے لیے چندہ جمع کیا جاوے
اور انھوں نے خود ایک ہزار روپیہ
دے کر اس چندہ کی فہرست میں اپنا
اوّل نمبر قائم کیا۔"
رو داد نمبر ۶ صفحہ ۴۴

سرسید کی اس وسعتِ نظر اور عنایت اللہ خاں کی تائید اور نذرانۂ زر مقامی انگریز حکام کو پسند نہیں تھا۔ حالی نے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے کہ کمشنر میرٹھ ویلس نے سرسید سے کہا کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے اجلاس میں اگر محمد عنایت اللہ خاں شریک ہوں گے تو وہ نہیں آئیں گے۔ محمد عنایت اللہ خاں کے بارے میں کمشنر کو یہ معلوم تھا کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء میں باغیوں کی خفیہ حمایت کی تھی۔ سرسید نے محمد عنایت اللہ خاں کی عدم شرکت پر اتفاق نہیں کیا۔ محمد عنایت اللہ خاں شریک کیے گئے علی گڑھ کی سرزمین پر سرسید کی یہ پہلی باغیانہ لغزش تھی جس پر وہ بضد رہے۔ یہ سچ تھا کہ محمد عنایت اللہ خاں اور اُن کے نامور والد محمد داؤد خاں نے ۱۸۵۷ء میں باغیوں کی خفیہ مدد کی تھی جس کی وجہ سے باغی دہلی سے روہیل کھنڈ پہونچ سکے تھے۔ اس لیے عنایت اللہ خاں سے اعلیٰ انگریز حکام ناخوش تھے۔ سرسید نے ان حکام کی ناراضگی کو سہا اور ۱۸۸۲ء کے ہنٹر ایجوکیشن کمیشن کے سامنے مفصل شہادت دیتے ہوئے کہا تھا کہ مقامی حکام ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے لیے اعلیٰ مغربی تعلیم کے مخالف ہیں۔

سرسید نے جب ۱۸۷۰-۷۱ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی تحریک شروع کی تو محمد عنایت اللہ خاں نے بڑھ کر حصہ لیا۔ سرسید نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو کالج شروع کیا۔ شمالی ہند کے ممتاز علماء جن میں مولانا عبدالقادر بدایونی، مولانا محمد قاسم، مولانا محمد یعقوب نانوتوی اور دوسرے علماء شامل تھے۔ ان مقدس حضرات سے "کمیٹی مدیران تعلیم اہلِ سنت وجماعت" سے شرکت کی درخواست کی اور تقریباً سب نے شرکت سے انکار کر دیا سرسید نے ایک نئی "کمیٹی مدبران اہل سنت و جماعت" بصدارت محمد عنایت اللہ خاں بنائی جس کے سکریٹری سمیع اللہ خاں تھے۔ جن کے

ایک ممبر مولوی حافظ محمد اسماعیل تھے۔ جن کے
والد مولانا عبدالجلیل علی گڑھی کو ۱۸۵۸ء میں
انگریزوں نے سزائے موت دی تھی۔

اس کے علاوہ محمد عنایت اللہ خاں
محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی "کمیٹی منتظم مدرسۃ
العلوم" کے خاص ممبر تھے۔ انتظامی امور میں شرکت
کے علاوہ محمد عنایت اللہ خاں سرسید کی ہر طرح
مدد کرتے تھے۔

۱۸۸۳ء کی سالانہ رپورٹ میں سرسید
نے لکھا ہے۔

"تعمیر کے کام میں ہم کو زیادہ مشکل
ہے۔ مگر میں ان دوستوں کا دل
سے شکرگزار ہوں، جن کی امداد
سے اس قدر عمارت طیار ہوگئی
ہے۔ ہمارے ضلع کے رئیسوں میں
سے رئیسان بھیکم پور نے سوائے
محمد عنایت اللہ خاں صاحب کے
ہمارے کالج پر کچھ توجہ نہیں کی ہے۔
ان کے دل کے شبہات ابھی دور
نہیں ہوئے ہیں۔ لوگ خیال کرتے
ہیں کہ کبھی دور نہ ہوں گے۔ مگر
میرا یقین ہے کہ کبھی نہ کبھی اُن کا
دل بھی نرم ہوگا۔"

دیکھیے کیسی موہوم امید پر سرسید
جی رہے تھے اور آگے بڑھ رہے تھے ۔۔۔
سرسید کی اسی یقین کی روشنی میں ہم اس یونیورسٹی
تک پہونچنے کے قابل ہوئے ہیں۔

محمد عنایت اللہ خاں کے دو بھتیجے
تھے۔ کوئی بیٹا نہ تھا۔ محمد احمد سعید خاں جو ہمیشہ
سرسید کی نیازمندانہ مدد کرتے رہے اور
دوسرے نواب مزمل اللہ خاں تھے جو زندگی
میں سرسید کے ہر کام میں شریک رہے اور
سرسید کے انتقال کے بیس برس بعد تک کالج
کے اسسٹنٹ سکریٹری رہے۔ دونوں بھائی
سرسید کے ساتھی اور جانثار تھے۔

۱۸۸۶ء میں محمد عنایت اللہ خاں کا
انتقال ہوگیا۔ سرسید کو سخت رنج ہوا۔ ان
کے انتقال کے بعد ۱۸۸۹ء میں سرسید نے جب
قانون ٹرسٹیاں پاس کیا تو علی گڑھ اور آس
پاس کے بعض رئیسوں نے سرسید کی سخت مخا
کی۔ مگر احمد سعید خاں اور نواب مزمل اللہ خ
سرسید کے وفادار رہے اور کھل کر ساتھ
یونین کے سامنے کا فوارہ عنایۃ
اللہ خاں کی یادگار ہے۔ یوں ہماری نئی ا
پرانی نسل محمد عنایت اللہ خاں سے ناواقف
نہیں ہے۔

بقیہ صفحہ ۔۔ "کیا آپ محنت کریں گے؟"
کے لیے امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۱۷ اپریل ۸۲ء دیکھ
۴۔ بھارت ارتھ موورز لمیٹڈ کو الکٹر
الکٹرانکس اور آٹوموبائل کے شعبوں میں ۱۲۰ انج
درکار ہیں۔ تقرر کے لیے امتحان ۳۰ مئی ۱۹۸۲ء کو
مراکز پر ہوگا۔ درخواست بھیجنے کی آخری تاریخ
ہے۔ تفصیل، ۱۷ اپریل کے امپلائمنٹ نیوز میں

[illegible] معزالدین احمد نے [illegible] پرنٹرز میں چھپوا کر صفدر منزل تار بنگلہ علی گڑھ سے شائع کیا

ایک خط !

مکرمی! تسلیم و نیاز و سلام و رحمت

آپ کی خدمت میں ایک بار پھر رسالہ "تہذیب الاخلاق" ارسال ہے۔ یہ رسالہ خدمت کے جذبہ سے چند خادموں نے جاری کیا ہے۔ اس کی اشاعت پر سرکاری رقم خرچ نہیں ہوتی بلکہ آپ سے جو رقم وصول ہوتی ہے وہی اس پر صرف ہوتی ہے۔ رسالہ پر پریس والوں کا بڑا احسان ہے۔ وہ اپنی رقم کی ادائیگی کا شدید تقاضا نہیں کرتے۔ اس گرانی کے زمانہ میں کاغذ کی کثیر رقم خود ادا کرتے ہیں۔ لیکن کب تک ادا کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ کا کرم ہے کہ کاتب بھی ایسے صاحب ملے جن سے کام لینے میں راقم کا خون خشک نہیں ہوتا۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔ الحمد للہ خریدار بھی ایسے ہیں جو چندہ خود آ کر ادا کر جاتے ہیں۔ مضمون نگار بھی تن آسانی سے کام نہیں لیتے۔ لیکن اخراجات پورے کرنے کے لیے آپ سب حضرات کے تعاون کی ضرورت ہے۔ چندہ سے تو رسالہ کی طباعت کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔ آپ سے استدعا ہے کہ آپ ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ رسالہ کے خریدار بنیں اور صرف چندہ ہی نہ دیں بلکہ کچھ اور بھی رحمت فرمائیں۔ رسالہ میں اشتہار دے کر بھی آپ ہماری امداد کر سکتے ہیں۔

نیازمند

قاضی معز الدین احمد مدیر مسئول

رسالہ تہذیب الاخلاق۔ صفدر منزل۔ تار بنگلہ

اے ایم یو علی گڑھ 202001


بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
وغیرہ کی دوا۔
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U.
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ یو پی

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ہجری سنہ ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۲

آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی و افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور اس کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں ان کو بے عزتی کے کام سمجھیں آہ اس قوم پر جو لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مکر و پندار کے کالے سوت سے بنے ہوئے تقدس کے برقع کو اپنے منہ پر ڈالے ہوئے ہوں، مگر اپنی بدصورتی اور دل کی برائی کا کچھ علاج نہ سوچیں۔ آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا ہوا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔ اپنے گھر میں کھلے خزانے ایسے بے شرمی اور بے حیائی کے کام کیے جن سے بے شرمی اور بے حیائی بھی شرما جائے لیکن قوم کی بھلائی کے کام کو شرم اور نفرین کا کام سمجھے۔

سر سید رح

[علی گڑھ نمائش میں تقریر]

ڈاکٹر انجمن آرا انجم

دیپ روشن کرو
ہر طرف اک اندھیرا ہے چھایا ہوا
راستے پُر خطر اور مسدود ہیں
ہر قدم پر یہاں راہزن ہیں کھڑے
مشعلِ عزمِ محکم جلاؤ یہاں
روشنی سے دلوں کو منور کرو
تاکہ نورِ بصیرت ہو پھر جلوہ گر
ادھر جھروکوں سے ماضی کے دیکھو ذرا
تم کبھی جھانک کر
عہدِ نو آج بھی
ہر قدم پر ملے گا تمھیں
عظمتِ رفتہ کے گیت گاتا ہوا
جس چمن کے ہو تم باغباں
وہ چمن آج بھی
منتظر ہے اٹھو
چھانٹ کر خار سب پھینک دو
اور پھولوں کو تم
رنگ دو
آب دو
زندگی بخش دو

تہذیب الاخلاق

پندرہ روزہ علی گڑھ

شمارہ ۸

۱۶ر مئی ۱۹۸۲ء

مدیر: سید حامد وائس چانسلر اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

قیمت فی پرچہ ا۔ روپیہ

چھ ماہ ۱۱ روپیہ

سالانہ ۲۰۔ روپے

غیر ممالک سے۔

فی کاپی

سالانہ

اداریہ

تہذیب الاخلاق ترقی کی راہ پر

رسالہ تہذیب الاخلاق کے شمارہ نمبر ۸ بابت ۱۶ر مئی سے قیمت ایک روپیہ کر دی گئی ہے، سالانہ چندہ بیس روپیہ ہوگا اور رسالہ کا حجم بڑھا دیا گیا ہے۔ ٹائیٹل کے صفحات سمیت رسالہ ۳۶ صفحات پر مشتمل ہوگا اور کوشش یہ کی جائے گی کہ رسالہ میں ایسے علمی مضامین کا اضافہ ہو جو ہمارے فکر اور عمل کی اصلاح کا ذریعہ ہوں اور زندگی کے مسائل کو جذبات کے تحت نہیں علم کی روشنی میں ہم دیکھنے کے عادی ہو جائیں۔ سر سید ؒ نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی۔ وہ جدید علوم کو اردو کے ذریعہ ہندوستانیوں تک پہنچانا چاہتے تھے لیکن انگریز اس تحریک کے مخالف تھے اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستانی جدید افکار سے آگاہ ہوں۔ وہ اس سوسائٹی کی ترقی میں رکاوٹ بنے۔ اب ملک آزاد ہے جدید علوم کی تعلیم ہر یونیورسٹی میں ہوتی ہے۔ اب یہ پڑھنے اور پڑھانے والوں کا کام ہے کہ وہ اس دور کے علوم سے کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن ایک ضرورت یہ بھی ہے کہ علم کی روشنی میں ہم اپنے فکر و عمل کی اصلاح کریں۔ اس دور میں سائنٹفک سوسائٹی کا راقم کے خیال میں یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ہمارے سوچنے کا ڈھنگ اور کام کرنے کا طریقہ بدلے اور ہم جذبات سے کم اور عقل سے زیادہ کام لینے کی عادت ڈالیں۔

ہندوستان ایک بہت وسیع ملک ہے۔ اب بھی اس ملک میں ایسی آبادیاں ہیں جہاں ہزاروں برس پرانی تہذیب کے خد و خال ہی نہیں دیکھے جا سکتے بلکہ اس دور کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور ہزاروں

ترسیل و خط و کتابت کا پتہ

مدیر مسئول رسالہ تہذیب الاخلاق

صفدر منزل۔ تار بنگلہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰۲۰۰۱

سال پرانی تہذیب اور معاشرت کا آپ نمونہ دیکھ سکتے ہیں۔ ہماری عام زندگی اور تہذیب و معاشرت پر عہد وسطیٰ کی چھاپ صاف نظر آجاتی ہے اور شہروں میں بھی ہماری زندگی میں اس دور کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس قدیم میں جدید کی روح پھونکنے کی ضرورت ہے۔ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم جدید تہذیب کی نقالی کریں اور اس نقالی کو ایک مقصد بنالیں۔ ہمیں نقالی کی عادت ترک کرکے جدید افکار سے استفادہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہمارے معاشرہ کی اصلاح و ترقی کا ذریعہ ہو۔ گزشتہ سو سال میں ہم نے جدید تعلیم صرف حصول معاش کے لیے حاصل کی۔ جدید علوم سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے نہیں۔ اسی بنا پر ہم میں ذہنی غلامی بدستور ہے اور اس بھنور سے نکلنا ہمارے لیے دشوار ہو گیا ہے۔ یہ ہماری ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس مرض کے علاج کی طرف کہ ہم قدم اٹھا رہے ہیں۔ آئیے ہم سب مل کر اس کوشش کو کامیاب بنائیں اور ترقی کی اس راہ پر چلنا سیکھیں جس سے ہم دنیا میں باعزت زندگی بسر کرسکیں۔

نشہ آور چیزوں کا استعمال

چند روز ہوئے ہندوستان ٹائمز میں امریکہ جو دنیا کا سب سے زیادہ دولتمند اور ترقی یافتہ ملک شمار کیا جاتا ہے، موٹر کے حادثوں میں مرنے والوں کے اعداد شمار شائع ہوئے تھے اور اس کی وضاحت کی گئی تھی کہ یہ حادثے شراب کے نشے میں بدمستی کے عالم ہوتے ہیں اس خبر کی تفصیلات دیکھ کر ہمیں یہ ڈر ہوا کہ کہیں ہندوستان بھی چند سال میں امریکہ کا ساتھی نہ ہو جائے اور اس کو مات دے کر اس سے آگے نہ بڑھ جائے۔ انسان شراب، سگریٹ اور نشہ آور چیزیں غالباً اس لیے استعمال کرتا ہے کہ وہ اس دنیا کی [illegible] کی زندگی کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔ اور تھکان اتارنے کے لیے وہ نشہ آور چیزیں خصوصاً شراب پیتا ہے۔ اور چند گھنٹے کے لیے دنیا کے کاروبار کے بوجھ کو بھلا کر تسکین حاصل کرتا ہے۔ مذہب نے دنیا کی ان الجھنوں اور بوجھ کو بھلانے کے لیے عبادت کا تصور پیش کیا ہے اور عبادت کرنے کی تعلیم دی ہے

عبادت کا یہ ایک اہم فائدہ ہے کہ انسان جو دنیا کی بہت سی الجھنوں میں پھنس کر بہت سی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، ان سے بچنے کے لیے ان علائق کو بھول جائے اور خدا کی طرف متوجہ ہو جائے۔ خدا پرستی اور عبادت سے زندگی کی کشمکش بھلانا ممکن اس وقت ہوتا ہے جب عبادت خلوص اور سنجیدگی سے ہو۔ ورنہ یہ ایک بے لطف رسم ہو کر رہ جاتی ہے البتہ اگر کوئی اس کو جاری رکھے تو زندگی کے ایک دور میں سکون حاصل کرسکتا ہے۔ دوسری صورت میں زندگی کی کشمکش خودکشی تک انسان کو لے جاسکتی ہے۔

زندگی میں نشہ آور کھانے پینے کی چیزوں کا عادی ہونا ایک متوسط طبقہ کے آدمی کو مالی مشکلات میں ڈال دیتا ہے جس سے زندگی کی تلخی اور بڑھ جاتی اور سماجی زندگی میں انتشار اور پیدا ہو جاتا ہے خانگی زندگی کی خوشیاں ختم ہو جاتی ہیں، میاں بیوی کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی الجھنوں سے سکون حاصل کرنے کا یہ طریقہ زندگی کو اور تلخ کر دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ آدمی عبادت کے ذریعہ زندگی کی تلخیوں کو بھلانے کی کوشش کرے۔

باقی صفحہ ۷ پر دیکھیے

سیّد حامد صاحب
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

خطبۂ افتتاحیہ
ریاستی دینی تعلیمی کانفرنس بہرائچ

منعقدہ ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۸۲ء

۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۸۲ء کو ریاستی دینی تعلیمی کونسل کی پانچویں کانفرنس بہرائچ میں منعقد کی گئی۔ اس کا افتتاح سیّد حامد، وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کیا۔ اور اس کی صدارت مولانا سیّد ابوالحسن علی صاحب ندوی نے فرمائی۔
خطبۂ افتتاحیہ میں سے چند اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

...... یہ بات کم عبرت ناک نہیں کہ سیّد احمد خاں، ان کے رفقاء اور متبعین کی کوششوں کے باوصف ہندوستانی مسلمان ہنوز تعلیمی طور پر پسماندہ ہیں۔ تعلیم کے اعتبار سے ان سے زیادہ بچھڑی ہوئی قوم اس ملک میں نہیں۔ ستم ہے کہ وہ مسلمان جو کبھی علم و جستجو کے کاروان سالار تھے ترقی کے قافلے کی گرد راہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ہندوستان کی یہ دوسری بڑی اکثریت ہندوستان کی قوموں میں سب سے پچھڑی ہوئی اور سب سے زیادہ جاہل ہے۔ حتّٰی کہ ہریجن بھائیوں میں علم کا ذوق اور ترقی کا حوصلہ اور آگے بڑھنے کی لگن اور تعلیم میں اضافہ کی شرح ہم سے بہت زیادہ ہے۔ ہم علم سے غافل ہوگئے ہیں۔ دوسری قومیں علم کا سفر تیزی کے ساتھ طے کر رہی ہیں۔ فاصلہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ دینی تعلیمی کونسل عام طور پر تعلیم کی توسیع کے سندیسہ کو گھر گھر پہنچا سکتی ہے۔ وہ نئی نسل کے دلوں میں یہ بات بٹھا سکتی ہے کہ مسلمانوں پر تحصیل علم فرض ہے، اور اگر ہم جاہل رہے اور ہم نے اپنے بچوں کو جاہل رکھا یا پڑھنے اور پڑھانے یا پڑھوانے کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا تو دنیا میں کم نصیبی اور بے چارگی اور بدنامی کے علاوہ حشر کے روز شرمسار ہونا پڑے گا۔ کسی دین نے تحصیل علم پر اس قدر زور نہیں دیا جتنا اسلام نے۔ اسے تاریخ کا طنز کہیے یا ہماری کج روی اور گمراہی کہ مسلمان ہی علم سے بے نیاز ہو بیٹھے۔ علم کی بازیابی، بالیدگی اور نشاۃ ثانیہ کے فرائض انجام دینے کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے اور عمل نگاہوں سے اوجھل ہوگیا۔ ایک لمحہ کی غفلت سو سال پیچھے کر دیتی ہے۔ حساب لگایئے۔ چار سو سال کی غفلت نے ہمیں کتنے پیچھے ڈال دیا ہوگا۔ بہرکیف کام قسمت کا گلہ کرنے، اپنے زمانہ سے شکوہ سنج ہونے سے نہیں چلتا۔ ہمیں ترقی کرنا اور باعزت زندگی بسر کرنا ہے تو علم حاصل کرنا ہوگا۔ ضرورت ہے کہ ایک عہد ساز، ملک گیر کوشش کی جائے تعلیم کے پیغام کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچایا جائے۔ مسلمان تاریخ کے اس موڑ پر پہنچ گئے ہیں کہ اگر انھوں نے جہالت

کے آسیب سے دامن نہ چھڑا پایا تو جانبر نہ ہو سکیں گے، اور بفرض محال ہو بھی گئے تو عزت کے ساتھ نہ رہ سکیں گے۔ افسوس کہ ہماری آنکھوں پر ابھی تک غفلت اور رعونت کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ ہندستانی مسلمان اس راستے پر چل رہے ہیں جو فنا کی منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ ہر دن جو گزرتا ہے اس عبرتناک انجام کو قریب لا رہا ہے۔ اگر ہم کو سنبھلنا ہے، اگر ہمیں زندہ رہنا ہے تو علم حاصل کرنا ہوگا۔ علم کو عام کرنا ہوگا۔ صدیوں کا قافلہ سالوں میں طے کرنا ہوگا۔ جہالت اس زہر کی مانند ہے جو آہستہ آہستہ رگ و پے میں سرایت کرتا ہے اس طرح کہ آہٹ تک نہیں ملتی اور بالآخر کام تمام ہو جاتا ہے ہماری سب سے بڑی دشمن جہالت ہے۔ اسلام اور جہالت: ہم اضداد کو باہم جمع کرنے کے مرتکب ہوئے ہیں جہالت تو نوتا بہت ہے۔ البتہ وہ اسلام جو جہالت کو گوارا کرے، اس کی رفاقت کو برداشت کرلے اسلام نہیں، اسلام کا مضحکہ خیز اور دردانگیز خاکہ ہوگا۔ دینی تعلیمی کونسل کے پاس اپنا ہی کام بہت ہے لیکن جو لوگ کام کرتے ہیں وہ مقناطیس کی طرح کاموں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ عام تعلیم کی بابت نقطۂ نگاہ درست کرنا اور میدان ہموار کرنا اور اس کی ضرورت کی طرف توجہ دلانا، اتنا کام اور دینی تعلیمی کونسل اپنے ذمے لے لے تو بہت اچھا ہو۔

تعلیم میں دین اور دنیا دونوں کی فلاح ہے۔ علم کے معنی ہیں جاننا۔ جاننے کا نتیجہ ہے پہچاننا۔ جاننے اور پہچاننے سے مراد ہے کسی چیز کی بھلائی اور برائی سے واقف ہونا۔ اور اس کے لیے پرکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ علم کا جوہر حافظہ سے زیادہ غور و فکر میں ہے۔ اسی غور و فکر، اسی تدبر و تفکر کی تائید کلام مجید میں کی گئی ہے ایک بار نہیں سینکڑوں بار۔ اسی غور و فکر نے مسلمانوں کو عالمی علم کا محی اور امین اور داعی بنا دیا تھا۔ اپنے گرد و پیش کا اور ارض و آفاق کا مشاہدہ کرنا، قدرت کے مظاہر، مشاہدات اور تجربات پر غور و خوض کرنا اور غور و خوض کے بعد نتائج تک پہنچنا ہی ہمارے اسلاف کا شعار تھا اور یہی اُن کا نشانِ امتیاز علم میں دین کی بھلائی اس لیے ہے کہ علم نیک و بد میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ ضمیر کے ساتھ مل کر برائی سے روکتا ہے اور بھلائی کی طرف لے جاتا ہے۔ علم میں دین کی فلاح کے شواہد ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ علم شعور کو جلا دیتا ہے زندگی سلیقہ سے بسر کرنے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ بھلے برے کی تمیز اور برائیوں سے بچنا سکھاتا ہے۔ اس کے علاوہ تخصیص کے اس دور میں کوئی شخص اپنے کام میں خواہ اس کا تعلق دفاتر سے ہو، خواہ کارخانوں سے، خواہ کھیتوں اور کھلیانوں سے، خواہ حمل و نقل کے وسائل سے خواہ گھریلو صنعت اور ہنر اور دستکاری سے، بغیر علم حاصل کیے ترقی ہی نہیں کر سکتا۔ یہ دعویٰ کہ علم طاقت ہے اب کسی ثبوت کا محتاج نہیں رہا۔ وہ قومیں علم کی دوڑ میں آگے ہیں طاقتور ہیں، صاحب اقتدار ہیں۔ دنیا میں اُن کا طوطی بولتا ہے۔ ان کے نام کا سکہ چلتا ہے۔ ٹکنولوجی ان کے قبضۂ اختیار میں ہے۔ جو قومیں علم لگن کے ساتھ حاصل کرتی ہیں وہ جرمِ ضعیفی کا ارتکاب کر ہی نہیں سکتیں۔ جس کے سینہ میں علم ہے اس کے ہاتھ میں طاقت ہے شعور اور طاقت کے اس سرچشمہ سے ہم خود کو محروم کیوں رکھیں۔ یاد رکھیے علم فراموشی ا

خودکشی کے مابین زیادہ فاصلہ نہیں رہتا۔

.... حضرات، آپ اس گتھی کو بھی حل کیجیے کہ جن بچوں کو، اور اکثریت اُن ہی کی ہے، دینی تعلیمی مدارس میں جانے کی توفیق نہ ہوگی، ان کو عام اسکولوں میں انگریزی یا ہندی تعلیم کے دوران، دین سے روشناس کرنے اور دین اور روایات سے پیوستہ رکھنے کا طریقہ کیا ہوگا۔ کیا دینی تعلیمی کونسل اس طرف بھی توجہ دے گی۔ کیا یہ ممکن ہوگا کہ ان بچوں کے لیے جزوقتی اور مراسلاتی تعلیم کی سبیل نکالی جائے۔ یہ طبقہ اتنا بڑا ہے کہ ہم اسے نظرانداز نہیں کر سکتے۔ نہ اسے لادینی اور گمراہی اور تشکیک کے حوالے کرکے چین سے بیٹھ سکتے ہیں۔ صورتِ حال کا المناک تقاضا یہ ہے کہ بہتر صلاحیتوں کے بچے دینی تعلیم کی طرف نہیں آتے۔ اگر وہ حالات کے فشار اور والدین کی غفلت کے تحت دینی تعلیم کی طرف نہیں آتے تو ہم سپرانداز کیوں ہوں، کیوں نہ دینی تعلیم کو ان کے پاس بھیجیں۔ میں درخواست کروں گا کہ دینی تعلیمی کونسل اس مسئلہ کی طرف ملتفت ہو۔

.... تعلیمی صورتِ حالات نے ہماری ملت کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔ ایک طبقہ دینی تعلیم حاصل کرتا ہے، دوسرا جدید انگریزی تعلیم۔ ان دونوں کی دنیائیں الگ ہیں۔ دینی تعلیم پانے والے بالعموم جدید تعلیم سے بیگانہ رہتے ہیں اور جدید تعلیم پانے والے عام طور پر مذہب سے بے بہرہ۔ اس طرح ملت دو نیم ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ ہم آہنگی، توازن اور اتحاد سے اس وقت تک محروم رہے گی جب تک کہ دینی اور دنیاوی تعلیم پانے والوں کے درمیان فاصلہ باقی رہتا ہے۔ دنیاوی تعلیم دینے والوں کو یہ فکر کیوں لاحق ہونے لگی کہ اُن کی تعلیم یک رخی نہ رہے۔ یہ کام دینی تعلیم دینے والوں کا ہے کہ وہ اس خلیج کو پاٹیں۔ اوّل تو دینی تعلیم کے نصاب کو اس طرح ڈھالیں کہ اس میں آگے چل کر دنیاوی تعلیم کے ساتھ توام ہونے کی صلاحیت رہے، دوم عام اسکولوں میں تعلیم پانے والوں کو مذہب کی جزوقتی یا مراسلاتی تعلیم دینے کا انتظام کریں۔ یہ کام بہت بڑا ہے لیکن کرنے کا ہے اس سے کونسل کا دائرہ کار بہت وسیع ہو جائے گا۔ اس کام میں اچانک، بے سوچے سمجھے، بنا تیاری کے ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ پہلے وسائل پر غور کرنا ہوگا۔ مالی اور افرادی اور تنظیمی وسائل نیا کام ہاتھ میں لینے سے پہلے یہ اطمینان کرنا ہوگا کہ اس کام میں پڑنے سے کہیں اس ابتدائی اور بنیادی کام میں خلل تو نہیں پڑے گا جو دینی تعلیمی کونسل اب تک کرتی چلی آئی ہے۔

جہاں تک دینی تعلیم کی بنیادی مہم کا تعلق ہے، اس کے نصاب پر وقتاً فوقتاً نظرثانی کی ضرورت ہے۔ اس نصاب کے ساتھ زمانۂ حاضر اور اس کے مسائل کو پیوست کرکے اس کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کرنا مناسب ہوگا۔ عقائد کے علاوہ اعمال پر زور دینے سے بات ذہن نشین کرانے میں مدد ملے گی اور دین کے عملی پہلو کو تقویت ہوگی۔ بچوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دینی چاہیے کہ دین کی قلمرو صرف حافظہ نہیں، صرف دل و دماغ نہیں، اعمال بھی ہیں۔ اسلام کے متعلق دنیا رائے مسلمانوں کے معتقدات کی بنا پر قائم نہیں کرے گی بلکہ اُن کے افعال و کردار

کی بنا پر انسان کے دل میں کیا ہے، یہ صرف خدا جانتا ہے یا خود وہ انسان۔ لیکن وہ کیا کرتا ہے، کیا کہتا ہے، اسے دنیا دیکھتی ہے، جانتی ہے، اس سے متاثر ہوتی ہے اور نتائج نکالتی ہے اور رائے قائم کرتی ہے۔

کسی اقلیت کی باعزت بقا کے لیے تین تدابیر ضروری ہیں۔

۱۔ وہ اپنے مذہب اور تمدن پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔
۲۔ ان تھک ریاضت کر کے اپنے آپ کو اکثریت سے بہتر ثابت کرے۔
۳۔ اکثریت اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ اپنے تعلقات خوشگوار رکھے۔

اس وقت زیر بحث صرف پہلی تدبیر ہے۔

بچوں کے دلوں میں یہ بات شروع سے ہی ڈال دینی چاہیے۔ مذہب کے بنیادی عقائد کے علاوہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے کردار کی بابت ایک جیتا جاگتا تصور ہونا چاہیے۔ کیوں کہ تصورات بالآخر شعور اور تحت الشعور، دل و دماغ اور رگ و پے میں سرایت کر جاتے ہیں اور افعال و اعمال، اقوال و کردار کے برگ و بار لاتے ہیں۔ انھیں سمجھنا چاہیے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ وہ فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس کی پابندیاں بے راہ روی کو روکنے کے لیے ہیں۔ اس کی پابندیوں میں کشائش اور بالیدگی پنہاں ہے۔ کائنات خدا نے بنائی ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ خدا کی طرح اس کی مخلوق بھی ایک ہے، مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ اس لیے ہماری محبت کی مستحق ہے۔ اس کے ساتھ مسلمان نیکی، شرافت، رحم اور نرمی کا سلوک روا رکھتا ہے۔

.... پایان گفتگو میں اجازت دیجیے کہ میں اپنے معروضات کو دہرا دوں۔ دینی تعلیم پر ہماری بقا، پیش رفت اور عزت نفس کا انحصار ہے۔ ہمیں اس کے پیغام کو عام کرنا چاہیے اور اس کی کامیابی اور توسیع کے لیے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھنا چاہیے۔ دینی تعلیم کے نصاب میں عبادات اور عقائد کے علاوہ اطوار، اخلاق اور اقدار پر زور دیا جائے۔ دینی تعلیمی نظام اور مروجہ نظام میں تال میل کی سبیل نکالی جائے تاکہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مروجہ تعلیمی رو میں شریک ہونا دشوار نہ ہو۔ دینی تعلیم جز وقتی اور مراسلاتی فیوض کو بھی اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ منصوبہ بندی کے آلات و ادوات اور اس کی تکنیک کا استعمال اس طرح سے کیا جائے کہ نشانوں تک پہنچنے اور غلطیوں اور کمیوں کو دور کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ تعلیم کے مختلف طریقوں نے ملت کو دونیم کر دیا ہے۔ اس خلیج کو پاٹنے کی ضرورت ہے۔ تمام اسکولوں میں تعلیم پانے والے بچوں کو جز وقتی تعلیم دینے کی اہمیت شایان التفات ہے۔ والدین اور معلمین کی تربیت کو دینی تعلیم کا اہم جز سمجھنا چاہیے۔

نشانوں کا تعین، منصوبوں کی تشکیل پیش رفت کا جائزہ، شرح ترقی کی رفتار یہ سب امور توجہ کے جویا ہیں۔ مزید ترقی اور توسیع میں پیمانہ کار شاید معاون ہو۔

سائنس اور ادب

اندر جیت لال

ادب زندگی کی تفسیر ہے۔ یہ قاری کے جمالیاتی احساس کو بیدار کر کے تفریح کا ذریعہ بنتا ہے۔ شاعرانہ جذبات اُبھار کر انسان کو ذہنی اور روحانی بلندیوں سے ہمکنار کرتا ہے اور زندگی کو حسین و بہتر بنانے میں معاون ہوتا ہے۔ ادب کا تفریحی رجحان اس کو فلسفہ سے ممتاز کرتا ہے۔ ادھر سائنس کو لیجیے۔ سائنس انسان کی مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے مادی اشیاء کی ماہیت تحلیل و تجزیہ کے عمل کے ذریعہ معلوم کر کے اُن کے افادی پہلو کو سامنے لاتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں سائنس صرف چیزوں کے افادی، مادی اور عملی پہلو پر نگاہ رکھتی ہے۔ روحانی و جمالیاتی احساس نہیں اُبھارتی۔ یہ نور ہیں دونوں کی تشریحیں۔ آج کل دونوں اپنے اپنے طور پر تہذیب کا درجہ اور روپ حاصل کر چکی ہیں۔ یوں کہیے کہ سائنس ایک تہذیب ہے اور ادب ایک دوسری تہذیب۔ سائنس بیسویں صدی کے انسان کے لیے ایک دیوتا اور تہذیب کا مرتبہ حاصل کرتی جا رہی ہے۔ ایسا دیوتا جو عجیب و غریب ہے۔ عظیم اور طاقتور ہے اور بعض اوقات خوفناک بھی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام آدمی کے دل میں سائنس کے تئیں خوف و احترام کے ملے جلے جذبات پائے جاتے ہیں۔

سائنس کے تئیں خوف و ہراس کیوں پیدا ہوا ایک مثال کیمیاوی دواؤں کی لیجیے جنہوں نے ایک وقت بے شمار بچوں کو ماں کے بطن ہی میں بدشکل بنا دیا۔ وہ صرف اس وجہ سے کہ ایک تجربے کے غلط اندازے سے بے شمار جاپانی ماہی گیروں کو ریڈیائی شعاع کے مضر اثرات اور ردعمل کا شکار ہونا پڑا اور اس طرح سائنس کا ایک منفی و تخریبی پہلو پہلی بار منظر عام پر آیا۔ اب دوسری مثال لیجیے۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں امریکہ نے ایک میگاٹن بم کا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ بھی مذکورہ

بقیہ ”اداریہ: نشہ آور چیزوں کا استعمال“ صفحہ ۲

شراب نوشی مسلمانوں میں بھی خاصی مقبول ہوتی جا رہی ہے: مسلمانوں کی اصلاح کی طرف مذہبی تنظیمیں بھی کم ہی متوجہ ہیں۔ واعظ اپنی شعلہ بیانی کی داد حاصل کرنے کا زیادہ خواہش مند ہوتا ہے۔ عوام کی اصلاح کی طرف کم متوجہ ہوتا ہے۔ مذہبی تنظیمیں کتابیں لکھنے اور چھاپنے میں زیادہ دلچسپی لیتی ہیں اور یہ نہیں دیکھتیں کہ کتنے لوگ ان کو پڑھتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ راقم کے خیال میں ہونا یہ چاہیے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے نشہ آور چیزوں کے استعمال کے خلاف لکھے جائیں ان میں دینی نقطۂ نظر سے بحث کے ساتھ ساتھ سماجی اور طبی نقطۂ نظر سے بھی بحث ہو۔ تاکہ جذبات، ایمان اور عقل سب کو اپیل کیا جائے۔ غیر مسلموں کے لیے بھی رسائل مرتب کیے جائیں انہیں صرف طبی سماجی اور اقتصادی پہلو سے بحث کی جائے۔ یہ کتابچے بطور ایک تحریک کے سب میں بانٹے جائیں اور تقریریں بھی کی جائیں اور پسماندہ لوگوں کی نشہ آور چیزوں کی عادت چھڑانے کی کوشش کی جائے اور ایسی ہی غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کیا جائے جو نشہ آور چیزوں کے استعمال کے خلاف کام کر رہی ہوں۔ یہاں سوال ہندو مسلمان کا نہیں، سوال ہندوستانی معاشرہ کا ہے۔

ازپر کیا گیا جس کے دھماکے سے پیدا شدہ ریڈیائی اشعاع
بارے میں بھی بم کا تجربہ سے حاصل کرنے والوں نے ایک غلط
زہ لگایا تھا۔ خلاصہ یہ اس بم کے تجربے سے خاطر خواہ
ان ہوا۔ اور بین الاقوامی سطح پر لوگوں کی رائے اور خصوصاً
سائنس دانوں کی رائے ایک حد تک سائنس کے خلاف
ہوگئیں۔

تیسری مثال تنگانیکا میں مونگ پھلی کی کاشت کے لیے
سے متعلق برطانیہ کی ایک اسکیم ٹیکنیکل خامیوں اور اندازے
غلطیوں کی وجہ سے کافی ناکارہ ثابت ہوئی۔ بلکہ اس اسکیم
بھاری مالی خرچ کرنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ ہر سائنسی اسکیم
ہوں سے مبرا نہیں ہوتی ہے۔

ایک مشہور سائنس داں رشیل کارسن اب ایک نئی بات
عام پر لائے۔ اسے آپ سائنس کے خلاف چیلنج قرار
ز ہیں۔ اس سائنس داں کے بقول کیڑا مار دواؤں کے
مادھند استعمال سے لاتعداد پرندے ہلاک ہوگئے اور نظام
ت کا توازن بگڑ گیا۔ جراثیم کش ادویہ کے بھاری پیمانہ پہ
ال سے بھی اس طرح کے رد عمل اثرات پیدا ہو جاتے ہیں۔

روشنی یا تاریکی

کئی سائنس داں اتنے روشن اور آزاد خیال ہیں کہ وہ
نسی تجربات و تحقیق کو نظام فطرت میں دخل اندازی پر محمول
ہیں اور اس دخل اندازی پر خدشات کا اظہار اکثر و بیشتر
تے رہتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل نے ایک بار کہا تھا کہ عام لوگ
اوقات سمجھتے ہوں گے کہ سائنس کی ترقی انسانیت کے
ضروری طور پر ایک نعمت کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر میں خدشہ
وس کرتا ہوں کہ یہ انیسویں صدی کے لوگوں کے لیے
دعوکا کرتی ہے۔ سائنس نے ہمارے دور کی زندگی میں
نازیادہ مایوسی پھیلائی ہے۔ اس لیے اسے انسانی زندگی
سے بے دخل کر دینا چاہیے۔ سائنسی ترقی کے ایک ہی کارنامے
یعنی ہائیڈروجن بم نے انسانیت کو بہت زیادہ خوف میں مبتلا
کر دیا ہے۔

دراصل سائنسی ترقی کی کوکھ سے جنم لینے والی اور بھی چیزیں
ہیں۔ جو فوری طور پر تو خطرناک نہیں محسوس ہوتیں لیکن وہ کم
خوف انگیز نہیں ہیں اور ان کے نتائج بڑے بھیانک ہو سکتے ہیں
یہ دوسری بات ہے کہ عوام کا ایک طبقہ جو کم شعور رکھتا ہو یہ سمجھے
کہ ہائیڈروجن بم نے آخر انسانیت کو بالکل نیست و نابود تو نہیں
کر دیا۔ تصور کیجیے کہ ایک بم کے نتائج اتنے خطرناک ثابت ہوئے
کہ انسانی ارتقار کی رفتار ایک دم رک گئی اور انسانیت بوکھلا
اٹھی۔ یہ یاد رہے کہ اس ارتقار سے ایک فطری ارتقا مراد
نہیں ہے۔ بلکہ انسان کے پیدا کردہ ماحول سائنس۔ انکشافات
اور دوسری جنگ عظیم کے بعد فوجی تحقیق کے ذریعہ حاصل ہونے
والے نتائج کی شکل میں ہونے والا ارتقار مراد ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے دور کی الکٹرانک
مشینوں، اعصابی دواؤں اور دیگر نفسیاتی آلات کے ذریعہ
انسانیت مادی ترقی ضرور کر سکتی ہے لیکن انسان کی موجودہ
روحانی تنزلی اور اخلاقی پژمردگی کو دیکھتے ہوئے کون کہہ
سکتا ہے کہ مستقبل میں سائنسی انکشافات سماج کو روشنی کی
طرف لے جائیں گے یا ایسی تاریکی میں ڈبو دیں گے جس سے انسانیت
آج سے ہزاروں برس پہلے ہم کنار تھی۔

صحت مند تشکیک

ایک نظریہ سے یہ خوش کن بات ہوگی کہ سائنس
کو بطور عقیدہ رد کر دیا جائے اور صحت مند تشکیک کو پروان
چڑھایا جائے۔ ایک خیال ہے کہ ایسی تشکیک کی مخالفت کوئی
سائنسداں نہیں کرے گا۔ وہ صرف اس لیے کہ تشکیک سائنسی
طور طریقوں کا ایک ضروری حصہ ہے۔ سائنس بدلتے اور

بڑھتے ہوئے ظلم کا دوسرا نام ہے۔ اس لیے سائنس اپنے طور پر ایک اعتبار سے بربریت نا سکل کہی جا سکتی ہے اور اس طرح اس میں تکنیک کی گنجائش ہے۔ رنج کی بات یہ ہے کہ علم کے بڑھنے کی وجہ سے انسانی علوم و فنون کی ترقی ہوئی لیکن علوم و فنون (آرٹس) سے حاصل مسلسل کنارہ کشی کرتی۔ اور خود انسان میں اخلاقی پستی سائنس کی وجہ سے دن بدن بڑھتی گئی ان منفی پہلوؤں نے سائنس کو ایک طرح سے بدنام کیا

دوسری طرف اس حقیقت سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ سائنس تہذیب انسانی کی ترقی و اہم انکشافات کا ایک ضروری وسیلہ ہے اور مستقبل میں بھی سائنس کو انسانی کاروبار مشاغل و معاملات میں ایک اہم کردار انجام دینا ہے بلکہ آج کے ٹیکنالوجی کے زمانے میں اس کا قوی امکان ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کی سرپرستی دن بدن کم ہوتی جائے گی اور صنعتی مشینیں اور ٹیکنالوجی مقبول ہوتی جائے گی۔ یہ سائنس کا مثبت پہلو ہے۔

سی۔ پی۔ اسنو نے ادب اور سائنس کے دو کلچروں کے نظریہ پر اپنی نگارشات اور لیکچروں میں ان دونوں کے درمیان واقع وسیع خلیج کی اور اس کے نتیجہ میں جو خطرات پیش آ سکتے ہیں ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔ چند برس پہلے جب انھوں نے کیمبرج میں لیکچر دیے۔ اس وقت دنیا بھر میں اس سوال پر لے دے ہونے لگی۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ لارڈ اسنو نے اپنے سرشتات کا اظہار بڑی بے باکی سے کیا جبکہ اُن سے پہلے کے سائنس داں سائنس کے خلاف کچھ کہنے سے گھبراتے تھے۔ لیکن اسنو نے بڑے استدلال کے ساتھ سائنس کے منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

ایک اور سائنس داں آلڈس ہکسلے نے سائنس اور ادب کے اشتراک پر پورا زور دیا ہے۔ بقول اُن کے "میرے دادا مسٹر ہکسلے چو ڈراوِن کے ہم عصر تھے، کی یہ پختہ رائے تھی کہ سائنس کی ابتدائی تعلیم تاریخ - ادبیات غیر ملکی زبان،

اور انگریزی لٹریچر سے مربوط ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ہکسلے یک طرفہ علم کے حق میں نہیں تھے۔ اب لارڈ اسنو کی رائے ملاحظہ ہو۔ انھوں نے اپنے مضمون "دو کلچر نظر ثانی" میں لکھا ہے کہ "ہم اپنے سماج (ترقی یافتہ مغربی سماج) میں معمول کی زندگی کی شائستگی و آداب و خلوص تک بھول گئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی سائنس داں اخلاقی نقطہ نظر سے آج کی سائنس سے مایوس ہیں

آیئے اب اس موضوع پر کچھ مفصل غور کر لیں کہ ان دونوں کا سنگم کیا ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ آجکل اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ زیادہ مدت تک اپنے ذہنی فکر و شعور کے باوجود ایک دوسرے سے رابطہ نہیں رکھتے ایک طرف سائنس دانوں اور دوسری طرف فن و ادب کے دانشوروں کے درمیان احساسِ رفاقت و بھائی چارگی کے جذبہ کے برعکس ایک طرح کا جذبہ گریز پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں کوئی ترقی پذیر کام کرنا دشوار بلکہ ناممکن سا ہوتا ہے۔ اگر یہ ناممکن عمل بڑھتا رہا تو مستقبل میں ایک وقت ایسا آ سکتا ہے کہ سائنس کے بڑھتے ہوئے قدم ہماری زندگی اور موت کو بھی اپنی تحویل میں لے لیں۔ ایسے حالات میں حکومت کے ارکان سائنس دانوں کے نقطہ نظر سمجھنے سے قاصر ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ دنیا بھر میں زیادہ تر حکومت غیر سائنسی لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جن کے نظم میں سائنس جس کو قومی بنانے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ارکان حکومت روحانی و اخلاقی معاملات کے ساتھ ساتھ سائنسی رجحانات و معاملات کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

تیسرا کلچر۔ لارڈ اسنو کے الفاظ میں اس کا نام تیسرا کلچر ہوگا۔ اور تیسرے کلچر سے مراد ایک ایسا طرز علم

براہ راست انسانی زندگی سے تال میل رکھتا ہو۔ اسے عام زبان میں "سماجیات" کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جس میں سماجی تاریخ، پولیٹیکل سائنس، اقتصادی نفسیات اور علم طب شامل ہو سکتے ہیں۔

یہ تیسرا کلچر دونوں کلچروں کے درمیان فاصلے کو ختم کرنے کے قابل ہو سکتا ہے۔ اس کلچر میں آرٹس اور سائنس دونوں کے مثبت فوائد لیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ یہ تیسرا کلچر دنیا کی زیر ترقی دو تہائی آبادی میں بھوک اور بیماریوں کو ختم کرنے میں معاون ہوگا اور اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں موزوں رد و بدل کرے گا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ دونوں کلچروں کے مابین پل قائم کیا جائے اور یہ تیسرا کلچر ادب اور سائنس کے اشتراک و اختلاط سے قائم ہو کر کامیاب ہو سکتا ہے۔

لارڈ اسنو کے تیسرے کلچر کے نظریے سے پہلے سائنس کے نقاد یہ کہا کرتے تھے کہ دنیا میں صرف دو کلچر ہی موجود نہیں ہیں بلکہ ۲۰۰ کلچر ہیں۔ خود لارڈ اسنو بھی اس رائے کو جزوی طور پر درست مانتے ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ سائنس کے بیسیوں شعبے ہیں۔ علم طبیعیات کے علم بردار اپنی دنیا میں مست ہیں۔ عضویاتی کیمسٹری جاننے والے اپنے نظریات سے چپکے ہوئے ہیں۔ بائیو کیمسٹری والے کسی حد تک آزاد ہیں۔ مگر عام رائے یہ مانی جاتی ہے کہ جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ایک انسان دوسرے انسان سے اختلاف رکھتا ہے، اسی طرح سائنس داں بھی ایسے اختلافات سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مگر یہ بڑا عجیب لگتا ہے کہ ایسے اختلافات کے باوجود فن کاروں اور فلاسفروں کے مقابلے میں سائنس دانوں میں ایک خاص مجلس یکسانیت پائی جاتی ہے۔ سائنس دانوں میں خود پسندی ادیبوں کے مقابلہ میں کم پائی جاتی ہے۔ یہ خود پسندی شاعروں، ادیبوں، مصوروں اور سوسائٹی کے دانش وروں سے زیادہ تر منسوب کی جاتی ہے۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ سائنس دانوں میں بہت ہی کم لوگ پاگل ہوتے ہیں یا خودکشی کرتے ہیں۔ جب کہ آرٹ اور فلسفہ کی صف میں دیوانوں اور خودکشی کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ جذبے اور اصلیت پسندی کا یہ فرق بہت نمایاں ہے۔

ایک اور نکتہ قابل ذکر یہ ہے کہ فن کاروں اور فلسفیوں کے مقابلے میں سائنس دانوں کی اکثریت شادی شدہ ہوتی ہے۔ صرف ایک بڑا سائنس داں نیوٹن غیر شادی شدہ تھا۔ ظاہر ہے کہ عام سائنس دانوں کی زندگی عمل و حقیقت کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نظم و ضبط کی زندگی کو پسند کرتا ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ سائنس داں کا طرز فکر بھی مقصدی ہوتا ہے۔ وہ حقیقت پسندی کا خوب قائل ہوتا ہے اور اس کا طرز فکر اس کی زندگی اور مشاغل دونوں سے خوب ظاہر ہوتا ہے۔

معلومات کا خزانہ: سائنس اور ادب کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی اولین ذمہ داری سائنس دانوں پر آتی ہے۔ اس لیے کہ سائنس داں بآسانی ادب کا مطالعہ کر سکتے ہیں اور ادب کی کچھ فہمیدگی رکھتے ہیں۔ جب کہ سائنس دانوں کی تحریروں کو سمجھنے کے لیے ادیب کو ایک بڑی ڈگری اور تحقیقی زبان کی ضرورت پڑتی ہے۔

ویسے آج کل سائنس کو روز بروز عام فہم اور عوامی بنایا جا رہا ہے اور فی زمانہ ایک عام شخص کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ سائنس کی عجیب و غریب کوششوں و تحقیقات کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرتا ہے

اگر سائنس ہربرٹ اسپنسر کے قول کے مطابق "منظم معلومات" کا ایک سلسلہ ہے۔ یا بقول ٹی۔ ایچ۔ ہکسلے "تربیت یافتہ اور منظم عقل سلیم" کا نام ہے تو سائنسی معلومات کو خوف و ہراس کی نگاہ سے دیکھنے کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیے بلکہ اُن معلومات سے بھرپور واقفیت ہونی چاہیے۔

ہندوستان کے مشہور سائنس داں جے بی۔ ایس ہالڈین نے ایک بار بڑے ہی پتہ کی بات کہی کہ "ایک عام آدمی سائنس کے تمام شعبوں سے معلومات حاصل کرنے کے لیے وقت نکال کر بھی اپنے تمام کاروبار انجام دے سکتا ہے مگر یہ افسوس کی بات ہے کہ آج بھی بیشتر لوگ ایسے ملیں گے جو سائنسی معلومات کا درد سر مول نہیں لینا چاہتے۔ لیکن یاد رہے کہ سائنسی معلومات کے بغیر آج کے زمانے میں کوئی آدمی اتنی تیز رفتار زندگی اور حالات حاضرہ کو بخوبی نہیں سمجھ سکتا اور نہ ہی مکمل انسان کہلا سکتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق آج کل ادب اور آرٹ کی طرف رجحان دن بدن کم ہوتا جا رہا ہے۔ لارڈ آلڈس ہکسلے کا مشورہ ہے کہ زمانۂ جدید کے دانشوروں اور ادیبوں کو سائنس کی نئی نئی انکشافات، پراسرار حقائق اور نظریات سے بخوبی واقف ہونا چاہیے بلکہ ادیبوں کو چاہیے کہ جدید معلومات کو اپنے علمی اور ادبی کارناموں میں سمولیں۔

بد اعتمادی: ایسے نیک کام کی انجام دہی میں ایک طرح کی بداعتمادی کے رکاوٹ بننے کا امکان ہے اور وہ بداعتمادی یہ ہے کہ سائنس پُراسراریت اور تخیل کی دشمن ہے۔ دراصل تخلیقی و اختراعی کاوشوں میں تخیل کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک مثال درخشاں ستاروں ہی کی لیجیے۔ یہ درخشاں ستارے اس وقت اپنی کشش کھو بیٹھتے ہیں جب یہ بات سائنس کے ذریعہ علم میں آتی ہے کہ ستارے تو آگ کے دہکتے ہوئے اجسام ہیں۔

اب شاعر سے پوچھیے تو وہ اپنے تخیل اور زورِ بیان سے وہ منظر یا مرقع پیش کرے گا جو شاید سائنس داں کو بھی عش عش کرنے پر مجبور کر دے

شاعری اور سائنس کے فرق کے لیے دو مثالیں لیجیے۔ ایک کہکشاں کی۔ دوسری تتلی کی۔ ان دونوں پر یوروپی اور ایشیائی شاعر سیکڑوں برس سے طبع آزمائی کرتے آ رہے ہیں اور یہ شاعرانہ موضوع بڑی دلچسپی کا حامل رہا ہے۔ شاعروں کے لیے ان دونوں میں شروع ہی سے بڑی کشش رہی ہے۔ سائنس کی یہ دریافت کہ سفید رنگ سات رنگوں سے مرکب ہے اور ان سب کو تحلیل کیا جا سکتا ہے، شاعر کو سکون نہیں دے سکتی۔ بلکہ شاعر کے حسنِ تخیل پر اس دریافت کا کیا اثر پڑ سکتا ہے تتلی کے خوبصورت اور پرکشش پَر دراصل اس ننھی سی مخلوق کی صرف ایک حیاتی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ شاعر کی نظر میں تتلی کے بازوؤں کو قدرت نے ایسا خوش رنگ بنایا ہے کہ کئی بار شکاری پرندے اس کی خوش رنگی اور دلکشی کی وجہ سے اس ننھی مخلوق پر حملہ آور نہیں ہوتے۔ یہ ہے فرق ایک شاعر کی تخیل پسندی کا اور ایک سائنس داں کی حقیقت پسندی میں! ہندوستان کے مشہور شاعر اور ادیب رابندر ناتھ ٹیگور نے سائنس کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھا۔ انھوں نے زندگی کے ابتدائی دور میں علمِ حیاتیات اور علمِ ہیئت کا خاصا مطالعہ کیا تھا۔ وہ اپنی کتاب "کائنات" میں کہتے ہیں کہ سائنس کے مطالعہ سے ان میں سائنسی مزاج پیدا ہوا اور مذہبی عقیدت کا طلسم ٹوٹا۔ اب مزیدار بات یہ ہے کہ ٹیگور کی شاعری اُ

باقی صفحہ ۱۹ پر دیکھیے

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
شعبہ سیاسیات
اے ایم یو۔

سائنس، سماجی علوم اور ہیومینٹیز کا باہمی فرق

دنیوی علوم کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔

ایک کو علوم طبعی Physical Science کہا جاتا ہے دوسرے کو سماجی علوم Social Science اور تیسرے کو Humanities کا نام دیا گیا ہے۔

پہلی قسم کے علوم میں کائنات Universe کی چیزوں اور قدرتی مناظر کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً نباتات کا، جانوروں، کیڑے مکوڑوں کا، طبقات الارض یا ارضیات یعنی زمین کے متعلق پورا علم اس کی ساخت، اس کی قسمیں علم طبعیات یا Physics علم کیمیا یا Chemistry اور ریاضیات اور معدنیات

ان علوم میں تمام قدرتی مظاہر کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور تجربوں کے ذریعہ جو لیباریٹریوں میں کیے جاتے ہیں، اصول یا نظریے بنائے جاتے ہیں۔ مثلاً کیمسٹری کا ماہر اپنی تجربہ گاہ میں اپنے تجربوں سے یہ باآسانی بتاسکے گا کہ اگر تانبے کا ایک ٹکڑا گندھک کے تیزاب میں ڈال دیا جائے تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا یا نباتات کا ماہر اپنی تجربہ گاہ میں یہ دیکھ سکتا ہے کہ فلاں خاص درجۂ حرارت یا رطوبت کا کسی پودے پر کیا اثر پڑے گا یا ماہر ارضیات یا جیالوجسٹ بہ آسانی یہ بتاسکے گا کہ چٹانی زمین کی کیا خصوصیات ہیں اور ریگ زاروں کی کیا ہیں۔ روزانہ نئے نئے تجربوں کی روشنی میں بنے ہوئے اصول اور نظریے پیش کیے جاتے ہیں۔ ان علوم میں انسانوں کا مطالعہ ضمناً اور ثانوی درثانوی حیثیت سے کیا جاتا ہے

قدرتی مظاہر اور اشیاء کی نوعیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ لہذا اُن کے بارے میں جو بھی نتیجہ نکالا جائے گا وہ ہمیشہ ٹھیک ہوگا۔ مثلاً دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن کے ملاپ سے پانی کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ اسی طرح علم الحیوانات کے ماہر مختلف جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کے بارے میں متعدد تجربات کی وجہ سے ساری معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ان علوم کے ماہرین کے نتیجے قطعی ہوتے ہیں اور اس وقت تک قطعی ہوتے ہیں کہ جب نئے تجربے ان نتیجوں کو غلط ثابت کردیں اس میں اندازے اور تخمینے کو دخل نہیں ہوتا بلکہ قطعیت کو دخل ہوتا ہے۔

غرض کہ سائنس سے مراد وہ علوم ہیں جو منظم اور باقاعدہ ہوتے ہیں جن کے حاصل کردہ نتیجے اور حقائق تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کے اصول منضبط ہوتے ہیں۔ ان علوم کے ماہرین کا نقطۂ نظر سائنٹفک ہوتا ہے۔ یعنی وہ ہر چیز کو تجربوں اور مشاہدوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور اسی بنا

نظریہ قائم کرتے ہیں ان میں ظن یا تخمینے کو دخل نہیں ہوتا اور نہ اُس میں انسانی جذبات یا احساسات کو دخل ہوتا ہے اور نہ اُس میں اندھی تقلید یا تقلید جامد و۔ ہر چیز کو وہ حقائق کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور ہم نتیجوں پر پہنچتے ہیں۔

سماجی علوم وہ علوم ہیں جن میں براہ راست نسان، اس کی فطرت Nature اس کی جبلّت Instinct اور انسانی جماعتوں کا مطالعہ لیا جاتا ہے۔ ان میں معاشیات، نفسیات یا سائیکولوجی تاریخ، عمرانیات یا سوشیالوجی، سیاسیات یا پولیٹیکل سائنس، اخلاقیات Ethics، فلسفہ اور منطق آجاتے ہیں۔ ان علوم کے مطالعہ سے ان تمام باتوں سے ہمیں واقفیت ہوتی ہے جن کا اثر انسانی زندگی پر پڑتا ہے۔ ان علوم کے مطالعہ میں ان تمام عوامل کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ ان علوم کے نظریے یا اصول قطعی نہیں ہوتے اور نہ یہ دائمی اور کلی ہوتے ہیں۔ اور اُن میں تخمینے اور ظن اور جذبات کو بہت زیادہ دخل ہوتا ہے۔ خارجی حالات اور واقعات کا بھی بڑا گہرا اثر پڑتا ہے

سماجی علوم کے ماہرین کو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے مختلف اداروں اور نظریوں کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی ادارے یا کسی نظریے کو اخلاقی اعتبار سے غلط سمجھتا ہے تو پھر اس ادارے یا نظریے کی جگہ دوسرے ادارے یا نظریے معرض وجود میں آتے ہیں۔

ان علوم میں چیزوں کا بالکل صحیح اندازہ انسانی ذہانت سے نہیں لگایا جا سکتا ہے جیسا کہ طبیعی علوم میں ترازو Balance بیرومیٹر اور دوسرے آلوں اور مشینوں کے ذریعہ لگایا جا سکتا ہے

چونکہ سماجی علوم کا تعلق انسانی رجحان اور اُس کی فطرت سے ہے جو مختلف ملکوں اور زمانوں میں الگ الگ ہوتے ہیں۔ اس لیے سماجی علوم میں اٹل یا ناقابل تبدیل یا دائمی اصولوں اور نظریوں کی کوئی جگہ نہیں۔ ہر تھوڑے عرصہ بعد ان اصولوں اور نظریوں میں تبدیلی ہونی بالکل لازمی ہے۔

سماجی علوم کی ایک خصوصیت اور بھی ہے کہ وہ جن حقائق کا مجموعہ ہوتے ہیں وہ بیحد پیچیدہ ہوتے ہیں اور اس طرح وہ عوامل اور وجہیں بھی جو سماجی اور عملی شکلوں کو متاثر کرتی ہیں، بڑی مشکل سے کنٹرول میں لائی جا سکتی ہیں کیونکہ ان میں بڑا ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ ان علوم کا انسانوں پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً فرانسیسی انقلاب اور ۱۹۱۷ء کا روس کا انقلاب میں بڑی حد تک سیاسی مفکروں اور دانش وروں کے خیالات مثلاً والٹیر، روسو اور مارکس اور لینن کے نظریات کو دخل رہا ہے۔

سماجی علوم کے مطالعہ میں عام طور سے قیاس، منطقی اور تاریخی طریقے اور تجرباتی طریقے Experimental Method اور تقابلاتی طریقہ Comparative Method مشاہداتی طریقہ Observation Method اور فلسفیانہ طریقے سے کام لیا جاتا ہے۔ قیاس کے ذریعہ خاص نتیجوں پر پہنچا جاتا ہے مگر اس میں سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ جن اصولوں کو مان کر مطالعہ شروع کیا جاتا ہے اگر وہ حقائق سے مطابقت نہ رکھتے ہوں تو نتیجہ غلط

نشاط ہاشمی۔ ریسرچ اسکالر
شعبۂ عربی۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ

عہد عباسی کی ایک جھلک

عباسی دور مختلف اعتبار سے تاریخ کا ایک
تاز اور نمایاں دور مانا جاتا ہے۔ اس دور
مسلمانوں کو ادبی وسماجی اعتبار سے جو ترقی ہوئی
ہے اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ ان کی ترقی
کا راز استحکام کی حکومت، مال و دولت کی فراوانی
اور فارغ البالی تھا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں بہت
سے اسلامی علوم ایجاد ہوئے اور بہت سے اہم
علم وفن باہر سے عرب میں آئے۔

بقیہ ص ۱۳ "سائنس، سماجی علوم ...."

نتیجوں پر پہنچا جائے گا۔ اسی لیے منطقانہ اور دوسرے
طریقے اختیار کیے گئے لیکن اُن میں سے کوئی بھی طریقہ سو
فیصد صحیح نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ان علوم کے مطالعہ میں
بہت زیادہ ضروری ہے کہ انسان کی نفسیات کو ہمیشہ
سامنے رکھا جائے۔ آنکھ بند کر کے کسی نظریے کو ماننا
شدید گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

علوم کی تیسری قسم Humanities
ہوتی ہے۔ یہ اصلاً کلاسکی، لاطینی اور یونانی زبان
و ادب کا مطالعہ ہے۔ لیکن اب اس کو وسعت دی گئی
ہے۔ اب اس سے مراد یہ ہے کہ مختلف زبانوں اور مختلف
ادب کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ انگریزی، عربی
فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت، جرمن اور دوسری
زبانوں کا مطالعہ اس میں شامل ہے۔ اس میں خصوصی
طور سے ادب عالیہ اور انسانی جذبات کا مطالعہ کیا جاتا
ہے۔ ان علوم کا مطالعہ چوں کہ ادب عالیہ یعنی نظم و نثر
کی اصناف سے ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں بندھے
ٹکے قاعدے ضابطوں اور نظریوں کا مطالعہ نہیں
کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس میں انسانی قوت متخیلہ انسانی
جذبات اور انسانی فطرت کا مطالعہ ہوتا ہے۔ لہٰذا
اس میں معروضی طریقہ یا Subjective Method
استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں Objective طریقہ
استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کا مطالعہ نہ صرف انسانی
جذبات کا مطالعہ ہوتا ہے۔ ایک معنی میں انسانی فطرت
اور اس کے تمام متعلقات کا مطالعہ جن کا تعلق انسان
کے دل اور جذبات سے ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کی
متعدد ایسی چیزیں ہوتی ہیں کہ جو مکان اور زماں کی قید
سے آزاد ہوتی ہیں۔ ان علوم میں علمی تنقید Literary
Criticism بھی شامل ہے جس میں مطلق بے
قیدی کی کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ اس کے ذریعہ کوشش
کی جاتی ہے کہ شعر و ادب مقصدی ہوں اور
بے مقصد نہ ہوں۔

٭٭٭٭

خلفاء کے محلات اس زمانے میں ادباء، شعراء اور علماء سے بھرے ہوتے تھے۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ خود خلفاء بہت علم دوست ہوا کرتے تھے۔ خلافت عباسیہ میں بڑے بڑے جلیل القدر سیاست داں اور بہادر خلیفہ ہوئے ہیں۔ ان کی حکمرانی نے دنیا کی حکومتوں کی رہنمائی کی ہے جو خلیفہ تخت پر بیٹھتا وہ اپنے ساتھ نئی اور مفید ادبی اور سماجی خصوصیات بھی لاتا۔ ان میں چند مشہور خلفا کے نام درج ذیل ہیں۔

خلیفہ ابوجعفر المنصور۔ مہدی، ہارون رشید مامون۔ ابن المعتز وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

خلیفہ منصور کے زمانہ میں جو ترقی ہوئی وہ یہ کہ اس نے 'بغداد' اور 'رصافہ' شہروں کی تعمیر کرائی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے عوام میں تعلیم کو رواج دیا۔ اس کے علاوہ اس نے ثقافت، علوم وفنون کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ اس نے علماء اور شائقین ادب کو علم عام کرنے کے لیے بڑے بڑے انعامات سے نوازا۔ سب سے قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس دور میں عرب کے علاوہ اہل ایران بھی خلیفہ کی سخاوت اور علم دوستی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مختلف علوم وفنون میں ترقی کرنے لگے۔

اس کے بعد خلیفہ مہدی کا دور آیا جس نے اپنے باپ کی چھوڑی ہوئی تحریکوں کو مکمل کیا خوشحالی اس دور میں بہت زیادہ ہوگئی۔ علماء اور شعراء کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی ہونے لگی۔ جس کی وجہ سے عوام میں شعر وشاعری سے دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس زمانہ میں مشہور فلکیات کے عالم نوفیلوس نے فلکیات سے متعلق کتابوں کا سریانی زبان میں ترجمہ کیا۔

خلیفہ ہارون رشید اور مامون کے دور حکومت میں عباسی حکومت ہر اعتبار سے اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی۔ خلیفہ ہارون رشید نے علماء، ادباء اور شعراء کے ساتھ بزرگان دین کی طرف بھی خاص توجہ دی۔ جس کی وجہ سے تقویٰ، پاکیزگی کا سماج میں بہت زیادہ اثر ہوا۔ سماج میں اس کی وجہ سے خدا ترسی زہد وپرہیزگاری کی ایک فضا پیدا ہوگئی۔

بغداد ہر اعتبار سے پوری دنیا کے لیے ایک مینارۂ نور ثابت ہوا۔ اور یہاں ہر شعبہ سے متعلق لوگ فیض اُٹھانے کے لیے آنے لگے۔ اس طرح سے یہ شہر دوسری صدی ہجری کا علم وادب کا سب سے بڑا مرکز مانا جانے لگا اور اس سے خلیفہ کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔

ایک طرف ہارون رشید کے دربار میں ابونواس، ابن عباد جیسے شعراء اور ادباء موجود تھے تو دوسری طرف اس کا دربار سفیان ثوری اور امام ابویوسف جیسے خدا پرست عالموں سے منور رہتا تھا۔ اسی خلیفہ کے زمانہ میں برامکہ خاندان کو عروج ہوا اور ان لوگوں نے تہذیب وتمدن، علوم وفنون میں حکومت عباسیہ کی بہت زیادہ خدمت کی۔ ان میں بڑے بڑے جلیل القدر علماء اور متبحر فضلاء ہوئے جن میں جعفر برمکی سب سے زیادہ لائق وفائق رہا۔

مامون کے دور میں بھی برابر سماجی اور ادبی ترقی کا دور اپنے عروج پر رہا۔ خود خلیفہ

وفنون پر اہل عرب کو متعارف کرانے میں اس کو زبردست دخل رہا ہے۔

اس خلیفہ ہی نے بغداد میں دارالترجمہ کی تعمیر کرائی جس میں مختلف ملکوں کے علماء وفضلاء جن میں ہندوستانی علماء بھی شامل تھے، اپنی اپنی زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ اس کی اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر بغداد میں باہری علوم پر کتابوں کی ایک بڑی لائبریری قائم ہوگئی۔ جس میں ہر موضوع پر کتب موجود تھیں۔

عباسی خلفاء نے اپنی ترقی کی ابتدا میں ہی ہندوستانی طبیبوں کو بلانے کا سلسلہ شروع کر دیا ان میں مشہور اطباء کے نام درج ذیل ہیں۔

'منکہ' 'مخل' اور 'بیدبا' جس نے مشہور کتاب پنچ تنتر لکھی۔ اور اس کا ترجمہ کلیلہ و دمنہ کے نام سے ہوا۔ یہ خاص بات ہے کہ ہندوستانی علوم سے بھی اس زمانے کے خلفاء خاص دلچسپی رکھتے تھے۔ اس دور کی مخصوص سماجی اور ادبی شخصیات کے مختصر حالات میں بھی ترقی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔

ابن عباد: ابوالقاسم اسماعیل بن ابوعباد صوبہ قزوین میں پیدا ہوئے

ابن فارس سے تعلیم حاصل کی۔ بہت ذہین انسان تھے۔ مطالعہ اور کتب جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ خوش کلام ادیب تھے۔

ابن مقفع۔ ان کا نام عبداللہ تھا۔ ایران میں پیدا ہوئے۔ بڑے ہوکر عربی و فارسی میں مہارت حاصل کی۔ اس کی یادگار کتاب کلیلہ و دمنہ ہے

ہوا۔ وہیں پرورش پائی۔ مشہور ادیب اور منفرد نثر نگار گذرا ہے۔ اپنی تحریروں سے اس نے لوگوں کو ایک نئے انداز سے سوچنے اور لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔

۴۔ **امام ابو یوسفؒ:** ان کا نام یعقوب تھا۔ کوفہ میں پیدا ہوئے اور امام ابوحنیفہ سے تعلیم حاصل کی۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ اس طرح انھوں نے حکومت کو دین دار بنانے اور عوام کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنے میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سماجی برائیوں کو کم کرنے کے لیے ہر وقت مصروف رہتے تھے۔ ان ہی بزرگوں کی کوشش سے سماج میں پاکیزگی اور ستھرائی دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ بہت بڑے فقیہ تھے۔

ابونواس: اس کا نام حسن تھا۔ یہ بھی خلیفہ ہارون رشید کے بہت خاص لوگوں میں تھا۔ لغت کا ماہر تھا اور شعراء کا کلام اس کو حفظ تھا۔

ابن رومی: پورا نام ابوالحسن علی تھا۔ بغداد میں پیدا ہوا۔ یہ بھی ان بڑے ادباء میں شمار کیا جاتا ہے جن کے انداز بیان اور طرز تحریر کی لوگ پیروی کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ابن معتز، ابوتمام، متنبی اور بحتری جیسے شعراء عباسی دور کے پیداوار ہیں۔

معذرت

ہمیں افسوس ہے پچھلے شمارہ "" میں محترمہ ڈاکٹر مسز رضیہ خان پرنسپل یونیورسٹی ویمنز کالج کے مضمون میں اُن کے نام کے ساتھ کالج کا نام غلطی سے عبداللہ گرلز کالج چھپ گیا ہے۔

(ادارہ)

مسلم یونیورسٹی، دیوبند اور جامعہ ملیہ میں انتشار

اتنی بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ یہ تینوں ادارے مخصوص حالات میں انتہائی مخلص لوگوں نے قائم کیے تھے۔ ان کے ارادے اور عزائم بہت واضح تھے۔ انھوں نے ملّتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی اور ملّی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ان عظیم اداروں کو بنایا اور سنوارا تھا۔ شروع میں جو اعلیٰ ترین صلاحیتوں کے لوگ ان اداروں سے نکلے ان کو معمولی درجہ کی سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں عمارت پختہ نہیں تھی۔ روشنی کا انتظام نہیں تھا۔ کھانے کے لیے ڈائیننگ ہال نہیں تھا۔ اساتذہ کے لیے آرام دہ مکانات نہیں تھے۔ چمن بندی نہیں تھی۔ غرض کہ راحت و آرام و آسائش کی وہ تمام چیزیں جو آج فراوانی سے مہیا ہیں۔ اس وقت ان کا تصور بھی مشکل تھا۔ لیکن اس پورے ماحول میں کوئی بےچینی نہیں تھی۔ طلبا اور اساتذہ میں باپ بیٹوں کا سا تعلق تھا۔ سب ایک دوسرے کے رفیق، ہمدرد و مونس و غم خوار تھے۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں تھی۔ لیکن اب صورتِ حال بہت بدل گئی ہے۔

دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں کی دیکھا دیکھی ان اداروں میں بھی مطالبات کی کثرت، خامیوں کی نشاندہی اور بات بات پر اُلجھنے کا مزاج بن گیا ہے بلکہ عملی طور پر اس کا رواج ہو گیا ہے۔ یہ احساس ہی رخصت ہو گیا ہے کہ اس کا کوئی اخلاقی جواز بھی ہے۔ مطالبوں کے بھی حدود ہیں اور مطالبوں کو پیش کرنے کا بھی ایک معیار ہے اپنے گھروں پر تنگی اور دشواریوں کی زندگی گزارنے والے بھی یہاں اس طرح آتے ہیں جیسے داماد سسرال میں — شریف داماد تو سسرال والوں کا معاون اور ہمدرد ہوتا ہے۔ لیکن یہاں صرف خامیوں پر نظر رہتی ہے اور صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح ٹکراؤ کی فضا پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔

کیا ان اداروں میں طلبہ کی یہ روش حقیقت پسندانہ ہے؟ کیا یہ ان خوابوں کی صحیح تعبیر ہے جو اس کے بانیوں نے دیکھا تھا۔ کیا اسی ہڑبونگ کے کردار کے لیے انھوں نے اپنی نیندیں حرام کی تھیں؟ اور در در کی بھیک مانگی تھی۔ کیا اسی لیے انھوں نے انتہائی تقوی اور عسرت کی زندگی گزاری تھی۔

وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہاں صرف وہ لوگ آئیں گے جن کے سامنے دنیاوی وجاہت اور ترقی کے سوا کوئی اور مسئلہ ہی نہ ہوگا۔ انھیں صرف مراعات کی ضرورت ہوگی۔

ان اداروں کی تعریف میں حصہ لینے والوں نے تو ایسی مثالیں

بھی مشکل ہے۔ اگر بیوی نے موٹر استعمال کی ہے تو پٹرول کا حساب لگا کر وہ رقم ادارہ کے حساب میں داخل کرا دی۔ تندور کی آنچ سے سالن گرم کر کے کھایا، بعد میں اس کے پیسے بھی داخل کر دیے۔ ذاتی کام کے لیے الگ قلم اور کاغذ اور ادارہ کے کام کے لیے قلم اور کاغذ علیحدہ۔ مہینوں چولہا نہیں جلا۔ چنوں پر گزر کر لی اگر گھنٹہ نہیں لیا تو حساب لگا کر تنخواہ کٹوا دی۔

اس احتیاط سے کام کرنے والے کبھی سوچ سکتے تھے کہ یہاں ایک ایسا دور آئے گا، جب اساتذہ اور ملازمین اچھی تنخواہوں اور ہر قسم کی رہائشی اور دوسری سہولتوں کے باوجود ہر وقت کمی کا شکوہ کریں گے۔ اور ایسے لائق فرزندانِ قوم آئیں گے جو ہر وقت مراعات کا مطالبہ کریں گے امتحان کی چھوٹ، حاضری کی چھوٹ، عمارتوں کا مطالبہ، کھانے کا مطالبہ، داخلوں کا مطالبہ اساتذہ کے خلاف ہنگامہ آرائی، ماں بہن کی گالی سے لے کر ہر قسم کے القاب سے خطاب، اساتذہ اور انتظامیہ کی تضحیک۔ قرآن و حدیث کے طلباء کا بسوں میں بیٹھ کر سرکاری افسران کے سامنے مظاہرہ۔ بلّم چھری، چاقو، پستول کی دھونس۔ اس کام کے لیے بھی شرط نہیں۔ اس کے لیے مسلمان ہونے کی بھی شرط نہیں۔

بہرحال یہ واقعہ پیش آ رہا ہے اور بہت سے لوگ مختلف طریقوں سے اس کی حمایت بھی کر رہے ہیں۔ لیکن کیا یہ صورتِ حال ان اداروں کو باقی رہنے دے گی؟ کیا اس کے نتائج انتہائی سنگین اور بھیانک نہیں ہوں گے۔ کسی ادارے کی ضمانت نہ اس کا بجٹ ہے نہ عمارتیں، نہ طلبا اور نہ اساتذہ کی تعداد۔ کوئی چیز اگر واقعی ضمانت ہو سکتی ہے تو وہاں کا اندر کا ماحول۔ طلباء اور اساتذہ کا تعلق اور بڑے مقصد کے لیے پوری ہم آہنگی۔ اس کے لیے ایثار قربانی اور ہر قسم کی تکلیف اٹھانے کا جذبہ۔

اگر یہ نہیں ہے تو مطالبوں کی فہرست طویل ہوتی جائیگی اور جو قدم اٹھے گا وہ تباہی و بربادی کی طرف بڑھے گا۔ اور ایک دن ایسا آئے گا جب یہ چمن فتنوں کی آگ میں جل کر راکھ ہو جائے گا۔

مبلغ الاسلام
ٹیچر ایم یو سٹی ہائی اسکول

مولانا طفیل احمد منگلوری
بانی یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول علی گڑھ

اگر ہم ایک طرف سرسید احمد خاں کو قائد قوم کہہ سکتے ہیں تو بجا طور پر دوسری طرف ہم مولانا طفیل احمد منگلوری کو معمار ملت کہہ سکتے ہیں۔

مولانا موصوف ۴ر دسمبر ۱۸۶۸ء کو ضلع سہارنپور کے قصبہ منگلور میں پیدا ہوئے۔ آج بھی ان کے خاندان کے افراد تصدیق کرتے ہیں کہ مولانا بچپن ہی سے بہت ذہین اور اپنے ہم عمروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ قوت مشاہدہ اور عمل رکھتے تھے۔ بے شک وہ سیاسی رجحان رکھتے

بقیہ مضمون سائنس وادب صفحہ ۱۱

تخیل کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ بلکہ اُن کی نگارشات میں سائنس کے علم کی وجہ سے جلا ہوئی۔ ایٹم، زمین اور سیاروں کے بارے میں تازہ ترین حقائق کا خوبصورت تذکرہ ٹیگور کی نگارشات میں ملتا ہے جو بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک بڑا شاعر اور ادیب ہی ایسے پیچیدہ سائنسی تصورات کو اپنے تخلیقی شاہکاروں میں خوبصورتی سے سمو سکتا ہے۔ فی زمانہ اس کی ضرورت ہے کہ سائنسی علوم و تحقیقات کے سربراہوں اور ادب اور شاعری کے علم برداروں اور ادیبوں کی کوشش سے دونوں یا دونوں اسکولوں کے مابین ایک شاندار و پائیدار پل تعمیر ہو جو دونوں تہذیبوں کے لوگوں کو نزدیک سے نزدیک تر لا سکے اس طرح دو کلچروں کے قریب سے قریب تر آنے سے ایک تیسرے کلچر کا جنم ہوگا اور اس تیسرے کلچر و تہذیب کی نشوونما کے امکانات روشن کرنا چاہیں تاکہ انسانیت کا مستقبل تابناک ہو۔ سائنس اور ادب کو دو الگ الگ خانوں میں محدود کیا جائے تو اس سے الگ الگ نشوونما سے تہذیب انسانی کی پوری خدمت نہ ہو سکے گی۔

گذارش

مضمون نگار حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اپنی نگارشات دیگر عنوان کے علاوہ ان پر بھی ارسال کریں۔ سائنس۔ قومی تعلیم۔ تہذیب و اخلاق۔ حیات اسلاف۔ موجودہ ترقی کے دور میں مسلمانوں کی ذمہ داری۔ مذہبی تعلیم۔ وغیرہ۔ براہ کرم مضامین زیادہ طویل نہ ہو۔

تھے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ دوسروں سے ہمدردی اور دردمندی بھی ان کی طبیعت کا جزو اعظم تھا۔

ابھی مولانا نے ہوش سنبھالا ہی تھا کہ ان کی نظروں نے ۱۸۵۷ء کے دردناک اور انگریزوں کے منافقانہ عمل کا اثر برادرانِ وطن اور خصوصاً برادرانِ قوم پر دیکھا جس نے اُن کے دل و دماغ پر شدید اثر کیا اور یہی وجہ تھی کہ ان کے ردِ عمل میں اور زیادہ مضبوطی اور قوت آگئی۔ مولانا صرف گفتگو کے ہی غازی نہ تھے بلکہ کردار کے بھی۔ وہ عملی طور پر اپنے برادرانِ وطن اور خصوصاً برادرانِ قوم کے معاشی اور تعلیمی ترقی میں اس طرح لگ گئے کہ یہ ان کا آخری سانس تک اوڑھنا بچھونا رہا۔

مولانا ابھی گیارہ برس کے ہی تھے کہ وہ ۱۸۷۹ء میں برائے حصولِ تعلیم علی گڑھ آگئے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ آنکھ کے مرض میں ایسے مبتلا ہوئے کہ صرف ۱۱ سال بعد ۱۸۹۱ء میں اُن کو اپنی تعلیم ختم کرنا پڑی۔ منقطع تعلیم کے وقت وہ بی۔ اے کے طالب علم تھے اور حسنِ اتفاق سے اس مردِ مجاہد کو جو آئندہ قوم کے لیے تعلیمی مسیحا بننے والا تھا، کو علی گڑھ ہی میں سب رجسٹراری مل گئی۔ یہ عہدہ اس وقت کے لحاظ سے کافی باوقار اور آزمائش طلب تھا لیکن مولانا موصوف نے اس عہدہ پر فائز رہتے ہوئے بھی قوم کے درد کو کبھی بھی اپنے سے جدا نہ ہونے دیا جو بڑی بات تھی کہ ایک سرکاری ملازم ایک مخصوص اور وہ بھی مسلمانوں کی طرف کھل کر جھکا رہے نہ صرف ساری ملازمت بلکہ ساری زندگی راست بازی بلا مصلحت بینی کے صاف گوئی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے کھلم کھلا کام کرتے رہے

یوں تو انھوں نے اور بھی بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے لیکن مسلم یونیورسٹی سٹی ہائی اسکول کا قیام ۱۹۲۸ء میں ان کی اس لگن کے عملی تشکیل کی صحیح شبیہ ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے فیروز آباد، مظفر نگر اور خود اپنے وطن عزیز منگلور میں تعلیم نسواں کے لیے ادارے کھولے۔

مولانا نے جس وقت ملازمت سے قبل از وقت پنشن لی۔ اس وقت ملک میں ہر طرف افراتفری اور ہراس و خوف کا ماحول طاری تھا۔ اس کے ساتھ خلافت تحریک بھی اپنے عروج پر تھی۔ مولانا ملک کی سیاست میں بھرپور حصہ لینا چاہتے تھے لیکن عجلت میں نہیں لہٰذا وہ خوب سوچ سمجھ کر بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر کوئی پارٹی ملک کو غلامیِ فرنگ سے نجات دلا سکتی ہے تو وہ صرف کانگریس پارٹی ہے۔ لہٰذا وہ اس پارٹی کے سرگرم رکن ہوگئے۔ کانگریس پارٹی میں شمولیت کے بعد اپنی راست بازی، صاف گوئی، ایمانداری اور غیر جانب دارانہ مثبت رائے دینے کی عادت کی وجہ سے بہت جلد صوبہ کی مجلس قانون ساز کے ممبر ہوگئے۔ اور اس حیثیت سے بھی انھوں نے "کلمۃ الحق" ادا کرنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ جیسا اوپر عرض کیا جاچکا ہے بے باک مثبت رائے دینا ان کے کردار کی اہم خصوصیت تھی جو ان کی تصانیف "مسلمانوں کا روشن مستقبل" اور "روح روشن مستقبل" میں بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔ اسی طرح قوم کی معاشی ضرورت کے پیش نظر انھوں نے بینکوں وغیرہ سے منافع و سود کے استعمال کا بجا طور پر جواز نکالا اور رسالہ "سود ہند" کے نام سے اس موضوع پر بڑی مدلل تصنیف کی۔ اسی طرح وہ میدانِ سیاست میں بھی اسی بے باکی اور آزادیٔ رائے کے ساتھ ایک

علیم مجاہد کی طرح کام کرتے رہے۔

مولانا کے اوپر کبھی بھی زمانہ کے بااثر اصحابِ اقتدار کی بے جا خوشنودی حاصل کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا بلکہ ان لوگوں سے کھل کر اختلاف رائے کیا کرتے تھے۔ چنانچہ صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب سے "مخلوط چناؤ" کے سلسلہ میں بے حد اختلاف رائے ہو گیا۔ اس کے باوجود مولانا نے اپنی تصنیف مسلمانوں کا روشن مستقبل" صاحب زادہ آفتاب احمد خاں صاحب کے نام ہی سے معنون کیا۔ یہ عمل بین طور پر اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ اختلاف بلکہ خود 'اختلاف' بھی الگ الگ اور مخصوص خانوں میں رکھنا چاہیے اور اس اختلاف کے باوجود تعلق نجی پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ مولانا موصوف کے یہاں ۸۷ سال کی لمبی مدت عمر میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں نظر آتا جس میں اُن کے کردار و گفتار میں تضاد دیکھے۔ افسوس یہ چیز بھی دور حاضر میں مفقود ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے یہاں خود نہیں ملتی جو اس کی نہ صرف تقریراً بلکہ تحریراً تلقین بھی کرتے ہیں۔

ایثار برائے قوم' درد قوم اور خدمتِ قوم کا جذبہ ان کے دل میں کس درجہ تھا اس واقعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ جس سال مولانا نے حج بیت اللہ شریف کا ارادہ کیا' اسی سال اُن کے کچھ مخلص دوستوں نے علی گڑھ میں ان سے یہ خواہش ظاہر کی کہ آفتاب ہوسٹل کی تعمیر کے لیے وہ ملک گیر دورہ کر کے چندہ جمع کریں اگرچہ مولانا کا انتظام سفر بیت اللہ شریف تقریباً مکمل ہو چکا تھا لیکن آپ نے ارادہ سفر ملتوی کر دیا اور پورے ملک میں دورہ کر کے ایک کثیر رقم اکٹھی کر لائے۔ یہ کہنا تو مذہبًا درست نہ ہوگا کہ مولانا کو اس کے عوض حج اکبر کا ثواب ملا ہوگا جیسا یاد پڑتا ہے کہ کسی مصنف نے "مولانا طفیل احمد منگلوری" کے نام کے ایک مضمون میں لکھا ہے؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ خدائے قدوس کے ہاں ان کی نیکیوں کے کھاتے میں اس مخصوص عمل صالح سے مزید وزن ضرور بڑھا ہوگا۔ نیز جہاں تک آفتاب ہوسٹل کی حیثیت کا تعلق ہے میں اس سے بھی اتفاق نہ کروں گا کہ اس کی حیثیت پہاڑی مقامات میں مسوری جیسی یا تاریخی عمارات میں تاج محل کی طرح ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے صحت مند عمارتی جسم میں آفتاب ہوسٹل کو مولانا نے ایک مصفا خون کے دورہ کرنے والا "دل" عطا کیا۔

اسی طرح خدمتِ قوم کے جذبہ کے تحت مولانا نے اپنے ہونہار فرزند جناب محمد احمد صاحب کاظمی جو باقاعدہ رڑکی انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل انجینئر تھے' کو مشورہ دیا کہ قوم کی خدمت ایک انجینئر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک وکیل کی حیثیت سے ہی ہو سکتی ہے۔ آپ کے مودب اور فرماں بردار صاحب زادہ نے نہ صرف اس پر عمل کیا بلکہ الہ آباد ہائی کورٹ کی قانونی تاریخ مکمل ہی جب ہوتی ہے جب محمد احمد صاحب کاظمی مرحوم کا نامِ نامی بھی اس میں شامل کر دیا جائے۔ یہی نہیں بلکہ بعد میں تمام ملک کی قانونی کارکردگی میں بھی محمد احمد صاحب کاظمی بار ایٹ لا کا ایک نمایاں مقام رہا ہے۔ کیوں کہ ہندوستان کے آئین کی تشکیل کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں محمد احمد صاحب کاظمی بھی ایک رکن بنائے گئے تھے۔ اسی طرح انھوں نے اپنے والد ماجد کی طرح

گیا۔ اس بیچاری نے طرح طرح کے ظلم و ستم سہہ کر بھی اس ملک میں آباد رہی۔ کتابوں کے ذریعہ اسے اس کی سنتانوں سے نہیں ملنے دیا گیا۔ محبت نے مجبور کیا تو سنیما کے پردوں پر آکر ملی۔ درسی نظموں، غزلوں اور مضامین کی حیثیت سے طالب علموں سے ملنے نہیں دیا گیا تو گانوں اور قوالیوں کے روپ میں اپنے چاہنے والوں سے ملی۔ لیکن یہی وطن میں۔ وقار بڑھایا وطن کا۔ "پھر بھی یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں"

اس کا رشتہ عربی و فارسی سے بھی جوڑا جاتا ہے، کیوں کہ اس کا رسم الخط عربی فارسی سے ملتا ہے ہندوستان کی کئی دیگر زبانوں کا رسم الخط بھی اسی جیسا ہے آخر یہ الزام صرف اسی پر کیوں؟ اس پر یہ بھی الزام ہے کہ اس میں کثرت سے عربی فارسی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں یہ سچ ہے، صرف عربی و فارسی کے ہی نہیں بلکہ ہندی، انگریزی اور سنسکرت کے بھی الفاظ استعمال ہوتے ہیں بلکہ ہندی کے تو افعال بھی استعمال ہوتے ہیں اور یہ ایک زندہ زبان ہونے کی نشانی ہے۔

اس کی دلکشی اور رنگینی کو ختم کرنے کے لیے اسے قید میں ڈالا گیا۔ اس کے خلاف ہونے والے ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کے منہ بند کر دیئے گئے۔ اس کی داستان ایک طویل داستان، اس کی داستان وطنیت کی داستان ہے۔ اس کی داستان ہندو مسلم اتحاد کی داستان ہے۔ اس کی داستان گنگ و جمن کی داستان ہے۔ اس کی داستان ہمالیہ کی داستان ہے۔ اس کی داستان رام اور لچھمن، کرشن، گرونانک اور بدھ کی داستان ہے اس کی داستان، ظفر، گاندھی، جوہر، اور آزاد کی داستان ہے۔ ہمیشہ ان زندہ داستانوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن اس کے رنگ و روپ اور دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی اور وہ فخر میں بھی مسکراتی رہی

۳۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء کے وزیر اعلیٰ اتر پردیش کے بیان سے اردو داں طبقہ کے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اور لگتا تھا کہ ناانصافیوں کے دور کا خاتمہ اور ایک نئے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس دور میں اب مزید ظلم و زیادتی نہیں ہوگی اور انصاف ملے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری خوشیاں اور امیدیں خوش فہمی کا شکار ہیں۔

جب بھی الکشن قریب آتا ہے تو اس وقت سیاسی پارٹیوں کے لوگ اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا تذکرہ جگہ جگہ کرتے ہیں اور اپنے الکشنی منشور میں بھی اس بات کا وعدہ کرتے ہیں کہ اب مزید ناانصافی نہیں ہوگی۔ اس کا فائدہ اٹھا چکنے کے بعد ان کا وعدہ صرف وعدۂ محبوب ہی بن کر رہ جاتا ہے بدقسمتی اس ملک کی ہے کہ جہاں حکمراں طبقہ کے لوگ بھی غیر ذمہ دارانہ اور ہوائی باتیں کرتے رہتے ہیں اور ملک کے بھولے بھالے عوام کو جان بوجھ کر گمراہ کرتے ہیں۔

ہمیں پردیش کے وزیر اعلیٰ کی توجہ ان کے اس اعلان کی طرف مبذول کرانا چاہیے کہ وہ اپنے وعدہ کے مطابق اسمبلی کے اجلاس میں اس کے متعلق بل پاس کرا کے اس کو قانونی شکل دیں۔ تاکہ محبان اردو مطمئن ہوں۔ اور اردو کے ساتھ ہونے والی مسلسل ناانصافیوں کا خاتمہ ہو۔

ہمیں امید ہے کہ جناب وزیر اعلیٰ اس سلسلہ جلد کاروائی کریں گے۔ تاکہ ہم اردو اور ہندی کو دو سگی بہنوں کے روپ میں دیکھ سکیں اور یہ دونوں باہمی میل جول سے پروان چڑھیں

[redacted]

قیصر نقوی
علی گڑھ

علی گڑھ تحریک کی ایک کھلی راہ

سماج! تہذیب کا وہ دھارا ہے جو ہمیشہ تغیر و تبدل کی راہ اختیار کرتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج کی صالح تبدیلی میں ایک مسلسل جدوجہد کارفرما رہتی ہے ہندوستانی سماج آج جس راہ سے گزر رہا ہے، اس رہگزر کو بڑے نشیب و فراز کا سامنا ہے۔ اس لیے کہ ہندوستان مختلف تہذیبوں اور نسلوں کا مالک ہے اور یہاں کی گوناگوں روایات کی جکڑبندیوں کے ساتھ ساتھ تیزی سے بدلتی ہوتی قدریں سماج کو واضح شکل میں پیش نہیں کر پا رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد جو تبدیلی سماج میں آنا چاہیے تھی وہ نہیں آسکی۔

ہر قوم کی طرح ہم ہندوستانیوں کا بھی ایک قومی مزاج ہے جس میں کوئی تبدیلی آسانی سے نہیں کی جاسکتی۔ اس پر مزید یہ کہ کثرت آبادی۔ مذہبی تہذیبی علاقائی عصبیت اور سیاسی انتشار نے ہمارے لیے اور بھی دشواری پیدا کر دی ہے

آزادی سے قبل جنگ آزادی دو محاذوں پر لڑی جا رہی تھی۔ ایک بدیسی حکومت کے خلاف اور دوسرے سماجی برائیوں کے خلاف۔ آزادی حاصل کرنے کے بعد چونکہ بدیسی حکومت کے خلاف ہمارا محاذ ختم ہوگیا تھا تو ہم سب کو مل جل کر سماج سدھار کی طرف لگ جانا چاہیے تھا۔ مگر بدقسمتی سے ایسا نہ ہو سکا۔ جس کی بڑی وجہ ہماری حکومت کی ملی جلی اقتصادی پالیسی بھی ہے۔ جس میں دھن اور دھنوان کا بول بالا ہے جس کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہر شخص اپنی مالی پوزیشن کو مضبوط اور بہتر بنانے ہی کو اپنی منزل مقصود سمجھے ہوئے ہے۔ جبکہ سماج وہی اچھا سمجھا جاتا ہے جس میں اجتماعی فلاح و بہبود کا جذبہ ہر شخص کے دل میں کارفرما ہو۔ یوں تو حکومت کی طرف سے بڑے بڑے فلاحی منصوبے تیار ہو رہے ہیں اور حکومت اپنی سی کر بھی رہی ہے۔ لیکن یہ کام صرف حکومت ہی کی ذمہ داری نہیں ہے! سماج جب ہی پنپ سکتا ہے جب ہر شخص بنیادی طور پر ایک دوسرے کی بھلائی کا خیال رکھے

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا زندگی کے اس رواں دواں دھارے میں سماج کا جو طبقہ اور فرقہ اپنی صحت مند قدروں کے ساتھ قافلے میں قدم بقدم چلے گا۔ وقت اس کا ساتھ دے گا اور جو ملک اور قوم کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرے گا وہی کارواں سالار ہوگا

یہ ایک کلیہ ہے کہ جب بھی دو یا دو سے زیادہ چیزیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں تو ایک نئی اکائی بناتی ہیں اور اس نئی اکائی کی اہمیت و قیمت اس کے اس جزو پر منحصر ہوتی ہے جس جز کا اس اکائی پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ اس میں کثرت و قلت کا سوال پیدا نہیں ہوتا اثر و نفوذ کا ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب مختلف تہذیبیں اور مذاہب مل جل کر ایک سماج بنائیں تو وہ تہذیب جس کی قدریں زیادہ جاندار اور وقت کے مطابق ہوں گی اور ساتھ ہی ساتھ انسانی فطرت بھی انھیں قبول کرے گی اور ان قدروں کے حامل ان پر خلوص با وثبات قدمی

سے عمل پیرا بھی ہوں گے تو وہ زیادہ سے زیادہ سماج کو متاثر کرے گی اور نئے سماج میں اس کا ایک خاص مقام ہوگا۔ اس کی مثال ایک شربت کے گلاس سے دی جا سکتی ہے کہ شربت جس میں زیادہ مقدار میں پانی اور اس سے کم مقدار میں شکر اور اس سے بھی کم مقدار میں وہ خوشبو ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ شربت پہچانا جاتا ہے

ہندوستانی مسلمان ملک میں دوسرے نمبر پر اکثریت میں ہیں اور ان پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بھی سماج میں اپنا بھرپور حصہ شامل کریں اور اس طرح شامل کریں کہ اس کے تہذیبی اقدار سماج کو نیا رنگ و بو عطا کریں اور مشترکہ سماج کی تشکیل میں اپنا اہم کردار ادا کریں اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ملت کا ہر شخص اپنی ذات کے خول سے باہر آکر دوسروں کے دکھ درد کو سمجھے اور نہ صرف اپنی بلکہ سماج کے دوسرے افراد کی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے سرگرم عمل ہو جائے

ہندوستانی مسلمان کو دنیا کے تمام مسلمانوں سے زیادہ ایک چیلنج کا سامنا کرنا ہے اور وہ چیلنج ہے کسی جمہوری ملک میں اپنے لیے صحیح مقام حاصل کرنا یہاں ہر مذہب کو پوری آزادی ہے کہ وہ اپنی مذہبی تعلیمات اور اقدار کو دوسروں تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ جس مذہب میں دوسروں کو متاثر کرنے کی جس قدر صلاحیت ہوگی وہی اپنا اثر زیادہ ڈال سکے گا۔ اس لیے کہ چودہ سو سال میں یہ حالات کہیں بھی پیدا نہ ہو سکے تھے۔ مسلمان یا تو اقتدار میں رہے جہاں سیاسی مجبوریوں نے انھیں محدود کر دیا۔ یا پھر محکوم رہے جہاں انھیں اپنی پوری قوت صرف اپنے زندہ رہنے پر صرف کرنا پڑی۔ مگر ہندوستانی مسلمان کو خوش قسمتی سے ایسی کوئی مجبوری نہیں ہے اور موقع ہے کہ وہ وقت کے اس چیلنج کو پورے ہوش و گوش سے قبول کرے اور خود ساختہ احساس برتری کو ترک کر کے اسلام کے دیے ہوئے صلح و آشتی کے درس کو اپنی مشعل راہ بنائے اور پوری قوم کے ساتھ قدم بہ قدم آگے بڑھے تو وہ نہ صرف ملک کی بلکہ اسلام کی بھی بہت بڑی خدمت انجام دے سکتا ہے۔

اسلام کے معنی ہی سلامتی کے ہیں اور اگر مختصر سے مختصر اسلام کی کوئی تعریف کی جا سکتی ہے تو وہ خدا کی عبادت اور مخلوق خدا کی خدمت ہی ہے مخلوق خدا کی خدمت کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ تمام بنی نوع انسان اور کل کائنات کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ چنانچہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو مسلمان پبلک کے ہاتھوں دی گئی تکلیفوں پر صبر کرتا ہے اور پھر بھی پبلک کی خدمت سے کنارہ کش نہیں ہوتا وہ مسلمان ان مسلمانوں سے بہتر اور افضل ہے جو عوام کے ہاتھوں پہنچنے والی تکالیف سے گھبرا کر عوام کی خدمت سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔"

ہمارے سامنے ایک واضح تصویر پیغمبر اسلام کی موجود ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے نبوت ملنے سے پہلے تیس پینتیس سال تک انسانی حقوق کے لیے اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے مسلسل جدوجہد کی اور نبوت ملنے کے بعد اس جدوجہد کے ساتھ ہی ساتھ توحید اور آخرت پر ایمان، عقائد کی تعلیم بھی شامل کی اور اس طرح رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی انسانی فلاح و بہبود کی صبر آزما جدوجہد

یں گزری۔ سیرت رسول صلعم اور اسلامی تعلیمات حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی مبلغ و مفسر ہے اور تمام دنیا کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

علی گڑھ تحریک کے بانی سر سید رحؒ جو آج مسلمانوں کی ترقی کی راہ کے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ابتدائی زندگی کے کارناموں پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو مختلف راہوں میں پرخلوص اقدام سے شروع ہوتی ہے اور ایم اے او کالج جو آگے چل کر مسلم یونیورسٹی تک پہنچا۔ ان کے اس طویل سفر میں ان کے بہت سے چھوٹے موٹے منصوبے جو انھوں نے مختلف اوقات میں اور مختلف مقامات پر شروع کیے جن کے باقیات اور نشانات اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کی عملی زندگی ابتداء ہی سے مختلف راہوں میں پرخلوص اقدام سے شروع ہوتی تھی ان کی سرگرمیٔ عمل نے بتدریج ترقی کرکے انھیں اس مقام تک پہنچایا تھا کہ اس پُرآشوب زمانہ میں بیمار قوم کی مسیحائی کا بار اپنے کاندھوں پر اُٹھایا۔ مگر جو منزلِ مقصود سر سید کے پیشِ نظر تھی اور جس راہ پر وہ سرگرم سفر تھے کیا وہ منزل مقصد کے پیش نظر اور وہ جادۂ سفر قوم کے زیرِ قدم ہے؟ سر سیدؒ کی تحریک اصلاح قوم ابھی آخری منزل تک نہیں پہنچی ہے۔ اگر قوم نے بالفرض اس کو آخری منزل سمجھ لیا ہے تو پھر یہ بھی کلیہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر چیز اپنے آخری نقطہ پہ پہنچ کر منزل کی طرف لوٹتی ہے۔

علی گڑھ تحریک تو مسلمانوں کے روشن مستقبل کی [illegible]

کی آخری منزل صرف مسلم یونیورسٹی ہی نہیں ہے بلکہ تمام مسلمانوں کو سرگرم عمل اور روشنی فکر و نظر دیگر ان کو تمام بنی نوعِ انسانوں کو فلاح و بہبود کا ضامن بنانا ہے۔

بیشک مسلمانوں کو اپنی عبادت گاہوں اور اپنے مذہبی تعلیمی اداروں کی بقا اور تحفظ پر توجہ دینا لازمی ہے اور وہ اس طرف متوجہ بھی ہیں۔ مگر فلاح عامّہ سے متعلق ایسے اداروں، سماجی اصلاحی مرکزوں کے قائم کرنے یا ان پر توجہ دینے کے معاملے میں مسلمان ابھی بہت پیچھے ہے۔ جب کہ برادرانِ وطن اس میدان میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

آج ہندوستان میں سماج کی فلاح و بہبود کے جتنے منصوبے چل رہے ہیں، ان میں ہمیں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینا چاہیے اور بستی بستی اپنے طور پر تعلیمی مرکز قائم کرکے اس علاقے کے عوام کی ہر پہلو سے خدمت کرنا چاہیے۔

اس کام کی آج مسلمانوں کو اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کسی زمانے میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کی تھی۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تحریک ہی کا ایک حصّہ ہے اور اس تحریک میں آج سماج سدھار کا میدان ہی کام کرنے کی ایک کھلی راہ ہے۔ جس سے مسلمانوں کی سماجی پسماندگی اور وہ احساسِ کمتری جو بعض اوقات جذبۂ برتری بن کر ابھرتا ہے، دُور کی جاسکتی ہے۔ اور آج کے نئے سماج میں انھیں شایانِ شان مقام مل سکتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۳-۸۲/۱

درج ذیل اسامی کے لیے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں

پرنسپل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گرلس ہائی اسکول

تنخواہ ۱۱۰۰-۵۰-۱۶۰۰ معہ الاونس

اہلیت

A ۱۔ ماسٹرس ڈگری یا کسی بیرونی یونیورسٹی سے آنرس کی ڈگری جو یونین پبلک سروس کمیشن سے کسی ہندوستانی یونیورسٹی کی ماسٹرس ڈگری کے مساوی ہو یا کسی ہندوستانی یونیورسٹی کا آنرس جسے یو.جی.سی نے ایم. اے کے مساوی تسلیم کیا ہو۔

۲۔ تعلیمات میں ڈگری یا ڈپلوما یا اس کے مساوی کوئی اور تدریسی ڈگری

۳۔ مندرجہ ذیل کسی ایک شق کا تجربہ

(ا) کسی تسلیم شدہ کالج میں کام کا انتظامی تجربہ جس میں انٹرمیڈیٹ یا اعلیٰ کلاسیں ہوں۔

(ب) کسی تسلیم شدہ ہائی اسکول میں کام کا پانچ سالہ تجربہ

(ج) کسی تسلیم شدہ کالج یا ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کا پانچ سال کا تجربہ یا اتنی ہی مدت کا کسی ٹیچرس ٹریننگ کالج میں تدریس کا تجربہ

(د) کسی منظور شدہ ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کا ۸ سالہ تجربہ

(ھ) پانچ سالہ تجربہ جس میں کسی منظور شدہ ہائی اسکول یا ہائر سکنڈری اسکول یا ٹیچرس ٹریننگ کالج میں تین سالہ انتظامی اور دو سالہ تدریسی تجربہ

ﮦ کسی منظور شدہ ہائی اسکول کا سربراہ جو ٹرینڈ گریجویٹ ہو اور ۴۵ سال کی عمر تک پہنچ چکا ہو۔ اور اسکول میں تدریس کا ۱۵ سالہ تجربہ ہو جس میں کسی منظور شدہ ہائی اسکول کی سربراہی اور انتظام کا ۵ سالہ تجربہ بھی ہو

یا

ح وہ افراد جو ماسٹرس ڈگری کے علاوہ کسی تسلیم شدہ ہائر سیکنڈری اسکول / یا تسلیم شدہ کالج میں تدریس کا ۱۵ سالہ تجربہ رکھتے ہوں اور ۴۵ سال کی عمر تک پہنچ چکے ہوں

یا

ﮦ کسی تسلیم شدہ مڈل اسکول کا ٹرینڈ پوسٹ گریجویٹ سربراہ ادارہ جسے سربراہ کی حیثیت سے مڈل اسکول کے انتظام کا ۸ سالہ تجربہ ہو۔

یا

ع وہ افراد جو تعلیمات میں ماسٹرس ڈگری رکھتے ہوں اور A سے D تک مطلوبہ خصوصیات رکھتے ہوں

نوٹ : جہاں A کی دفعہ (ج) 3 اور (د) کے تحت تجربہ کا تعلق ہے ان میں سے دو یا زیادہ کیٹاگریز یکجا کی جاسکتی ہیں جو 8 : 5 یا 5 : 9 کے تناسب سے ہوں گی۔

غیر معمولی استعداد اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو اعلیٰ تنخواہ سے ابتداء دی جاسکتی ہے جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انھیں بطور ۸۰٪ صرف سیکنڈ کلاس کا یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مطبوعہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی) سے ذاتی طور پر یا ذاتی پتہ لکھ کر 10cm x 23 کا لفافہ اور نقد دو روپیہ کی رسید جو مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس میں جمع شدہ ہو] یا انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو کے ہمراہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ ۷ جون ۱۹۸۲ء
تاخیر سے وصول ہونے والی یا نامکمل درخواستیں مسترد کردی جائیں گی۔

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۳-۸۲/۲

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ جو اشخاص ایک سے زائد اسامیوں کے امیدوار ہوں۔ ان کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر پوسٹ کے لیے جداگانہ درخواست دیں۔

پروفیشنل اسسٹنٹ [تین اسامی۔ ایک مستقل۔ ۲ عارضی] انجینئرنگ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

شرح تنخواہ 550 - 25 - 750 - EB - 30 - 900 روپیہ مع الاؤنس

اہلیت : لازمی

(۱) ایم۔ اے/ایم ایس سی/ایم کام مع بی لب سائنس [دونوں ڈگریاں سیکنڈ ڈویژن میں ہوں]

(ب) یونیورسٹی یا کسی اعلیٰ تعلیمی ادارہ کے ڈویژن/سیکشن میں بحیثیت سمی پروفیشنل کم ازکم تین سال کا تجربہ

(ج) انگریزی میں کیٹلاگ ٹائپ کرنے کی صلاحیت اور تجربہ

پسندیدہ انجینئرنگ کالج لائبریری میں کام کا قدرے تجربہ

نوٹ: جو افراد اشتہار نمبر ۸۲-۱۷/۸۱ کے تحت انجینئرنگ کالج میں پروفیشنل اسسٹنٹ کے لیے درخواست دے چکے ہوں انھیں ازسرنو درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔

ریسرچ انجینئر۔ فزکس ڈپارٹمنٹ

شرح تنخواہ ۱۵-700 - 40 - 900 - EB-40 - 1100 - 50 - 1300 روپیہ مع الاؤنس

اہلیت لازمی

۱۔ کسی ہندوستانی یا بیرونی یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس سی یا کوئی مساوی امتحان پاس ہو۔

۲۔ سامان کی خریداری، اسٹور کیپنگ اور عام دفتری کاموں کا عملی تجربہ

۳۔ بی۔ ایس سی اور ایم۔ ایس سی کلاسوں کی تدریس کا تین سالہ تجربہ

پسندیدہ ریسرچ کا تجربہ

نوٹ: جو افراد اشتہار نمبر 80-79/7 کے تحت درخواست دے چکے ہیں انھیں نئے سرے سے درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔

[۴] سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید) شعبۂ لسانیات

تنخواہ 550-25-750-EB-30-900 روپیہ معہ الاؤنس

اہلیت (۱) لازمی۔ متعلقہ مضمون میں لیبارٹری ٹیکنیک کی جانکاری کے علاوہ سائنس گریجویٹ

پسندیدہ

(۱) الیکٹریکل یا میکنکل انجینرنگ میں ڈپلوما

(۲) صوتیاتی چارٹ اور ہینڈآوٹ ٹائپ کرنا

(۳) صوتیاتی لیباریٹری کا تجربہ

(۴) الیکٹرونکس کا بیک گراونڈ

سینئر ٹیکنیکل اسسٹنٹ (ریکارڈنگ) ڈپارٹمنٹ آف سرجری (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)

تنخواہ : 550-25-750-EB-30-900 روپیہ معہ الاونس

اہلیت متعلقہ مضمون میں لیبارٹری ٹیکنک کی جانکاری کے علاوہ سائنس گریجویٹ

پسندیدہ ؛ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے منظور شدہ کوڈنگ سسٹم کے طرز پر میڈیکل ریکارڈنگ کا تجربہ یا لائبریری سائنس کوڈنگ، لائبریری کتب کی کیٹلاگنگ یا الیکٹرونک میکینکل ڈیٹا پروسینگ مشین کے استعمال کا ڈپلوما۔

سینئر ٹیکنکل اسسٹنٹ (عارضی) اناٹمی ڈپارٹمنٹ

تنخواہ : 550-25-750-EB-30-900 روپیہ معہ الاؤنس

اہلیت (لازمی) متعلقہ مضمون میں لیبارٹری ٹیکنکس کی جانکاری کے علاوہ بی ایس سی میں زولاجی بحیثیت ایک مضمون

بائنڈنگ اسسٹنٹ (عارضی) مولانا آزاد لائبریری

تنخواہ: 260-6-290-EB-6-326-8-366-EB-8-390-10-400 روپیہ معہ الاؤنس۔

اہلیت؛ لائبریری کتب کی جلد بندی کی اہلیت اور شکستہ اور خستہ کتابوں اور مسودات کی جز بندی۔ ہائی اسکول پاس شدہ ہو اور لائبریری یا کسی دوسرے ادارے میں کام کا پانچ سالہ تجربہ ہو۔

جونیر لیبوریٹری اسسٹنٹ (دو آسامیاں۔ ایک مستقل اور ایک عارضی جس کے مستقل ہونے کی امید ہے) ڈپارٹمنٹ آف مائکروبیالوجی۔

تنخواہ 260-8-300-EB-8-340-10-380-EB-10-430 روپیہ معہ الاؤنس

اہلیت۔ سائنس کے مضامین کے ساتھ میٹرک یا کوئی متبادل امتحان

پسندیدہ:۔ ڈپارٹمنٹ آف مائیکرو بائیلوجی میں کام کا تجربہ

نوٹ:۔ جن افراد نے اشتہار نمبر ۸۲-۱۸/۰/۸ کے تحت ڈپارٹمنٹ آف مائیکرو بیلوجی میں جونیئر لیبوریٹری اسسٹنٹ کی اسامی کے لیے درخواست دی ان کو از سر نو درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔

[۶] جونیئر لیبوریٹری اسسٹنٹ [دو اسامیاں] ڈپارٹمنٹ آف فزکس۔

تنخواہ:۔ 260-8-300-8-340-10-380-EB-15-430 روپیہ مع الاؤنس

اہلیت

[ایک اسامی کے لیے]

۱۔ لازمی۔ میکینیکل انجینرنگ میں ڈپلوما۔ یا سائنس کے مضامین کے ساتھ میٹرک

۲۔ پسندیدہ:۔ مشین شاپ میں کام کرنے کا تجربہ

[دوسری اسامی کے لیے]

۱۔ لازمی: ڈپلوما الیکٹریکل انجینرنگ یا سائنس کے مضامین کے ساتھ میٹرک

۲۔ پسندیدہ: الیکٹریکل انسٹرومینٹس کو مرمت کرنے کا تجربہ

غیر معمولی استعداد رکھنے والے اور تجربے کے حامل امیدواروں کو تنخواہ ابتدا سے اعلیٰ دی جاسکتی ہے جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انھیں بطور T.A. صرف سیکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مطبوعہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سلیکشن کمیٹی] سے ذاتی طور پر یا ذاتی پتہ لکھ کر 23x10cms کا لفافہ اور نقد دو روپیہ کی رسید [جو مسلم یونیورسٹی کے فائنانس آفس میں جمع شدہ ہو] یا انڈین پوسٹل آڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، کے ہمراہ حاصل کی جاسکتی ہیں۔

درخواستیں وصول ہونے کی آخری تاریخ ۷ رجون ۸۲ء ہے تاخیر سے موصول ہونے والی یا نامکمل درخواستیں مسترد کر دی جائیں گی۔

رجسٹرار

پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد نے مطبوعہ کلکتہ پرنٹرز میں چھپوا کر رسالہ تہذیب الاخلاق صفدر منزل تار بنگلہ اے ایم یو سے شائع کیا

سرکاری ملازمتوں کے لیے درخواست دیجیے اور برابر لکھنا پڑھنا جاری رکھیے۔ اہم ہندی اور انگریزی کی بہت برابر پڑھاتے رہیے۔ لیکن اپنی تہذیبی اور مادری زبان اردو کو نہ بھولیے۔ ہمیشہ اچھی کتابیں اور اچھے رسالے پڑھیے۔ آپ کو ایسی کتابیں انگریزی میں کثرت سے ملیں گی۔ لیکن اردو میں بھی اب مل جاتی ہیں

اسسٹنٹ گریڈ کے امتحانات جو پبلک سروس کمیشن کے تحت ۱۵ر اکتوبر ۸۲ء کو ہونے والے ہیں اس کے لیے اگر آپ نے فارم نہیں بھرا ہے تو اب بھر دیجیے اس کی درخواست جمع ہونے کی آخری تاریخ ۷ر جون ۱۹۸۲ء ہے۔ تفصیل کے لیے ۲۴ر اپریل کا روزگار سماچار [Employment News] اور ٹائمز آف انڈیا ضرور دیکھیے۔
یکم مئی کے روزگار سماچار [Employment News] کے شمارے میں انکم ٹیکس اور سینٹرل اکسائز کے امتحانات برائے سال ۸۲ء کے سلسلے میں پوری تفصیل شائع ہوئی ہے۔ گریجویٹ ہونا اس امتحان میں بیٹھنے کے لیے ضروری ہے۔ وقت کافی ہے۔ فارم ضرور بھریے۔ درخواستیں جمع ہونے کی آخری تاریخ ۱۴ر جون ۸۲ ہے اور امتحان اکتوبر میں ہوں گے
سینٹرل ریزرو پولس فورس کو سپاہی کانسٹبل اور نائیک کی جگہوں کے لیے بھرتی کرنا ہے۔ کل اسامیوں کی جگہ تقریباً ایک سو ہے۔ ان جگہوں کے لیے ہائی اسکول یا اس کے مساوی امتحانات پاس کیے ہوئے لوگ درخواستیں داخل کر سکتے ہیں۔ تفصیل ۸ر مئی کے روزگار سماچار کے شمارہ سے حاصل کریں۔
ایگریکلچر سائنٹسٹ رکروئٹ منٹ بورڈ نے [ICAR] بہت سی جگہوں کے لیے درخواستیں طلب کی ہیں تفصیل کے لیے ۸ر مئی کے روزگار سماچار [Employment News] کے شمارہ کو ضرور دیکھیں
لائبریرین کی جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں جن کا امتحان وغیرہ اسٹاف سلکشن کمیشن کے تحت ہوگا۔ فارم بھرنے کی آخری تاریخ ۲۹ر مئی ۸۲ء ہے تفصیل کے لیے ۸ر مئی ۸۲ کا روزگار سماچار ضرور دیکھیے۔
اے۔ بی۔ سی کنسلٹنٹ پرائیوٹ لمیٹڈ کو بغیر کسی تجربہ کے گریجویٹ انجینیرز مطلوب ہیں۔ درخواستیں بھیجنے کی آخری تاریخ ۲۱ر مئی ۸۲ء ہے۔ یہ اشتہار ۱۱ر مئی کے ٹائمز آف انڈیا میں شائع ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے ضرور دیکھیے۔


بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت نزلہ
کھانسی، زکام بنزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی دوا۔
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ یو۔پی

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ہجری سنہ ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۲

جلد نمبر ۱ یکم جون سنہ ۱۹۸۲ء شمارہ نمبر ۹

"..... پس یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب تک ہمارے ہم وطن
اپنے علم کے موجودہ ذخیرے میں اور کچھ نہ بڑھا دیں گے اور کاہلی
اور سستی اور خود مطلبی اور ہم وطنوں کی خیر خواہی سے
بے پروائی کی حالت میں جیسے وہ اب دکھائی دیتے ہیں،
اور جس میں بدبختی سے وہ آ پڑے ہیں، پڑے رہنے پر راضی
رہیں گے، اس وقت تک ان کو کسی طرح ترقی کرنے کی
توقع نہیں ہو سکتی۔"

سرسید

(التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند، غازی پور ۱۸۶۳ء)

ڈاکٹر اطہر پرویز
شعبۂ اردو

یونیورسٹی کا معیارِ تعلیم بہتر بنانے کے سلسلے میں چند تجاویز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اب باقاعدہ ایک اقلیتی ادارہ ہو گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب ہم سنجیدگی سے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور کریں۔ یہ ادارہ اب ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر حصہ لے سکتا ہے۔ اس سلسلے میں میری چند تجاویز ہیں جن پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔ اس یونیورسٹی کو علی گڑھ اور اس کے گرد و نواح کے نوجوانوں تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ بلکہ اس کا کل ہند کردار قوم کے سامنے آنا چاہیے۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں جو نوجوان اپنی ریاستوں میں ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ، یا کسی یونیورسٹی کے امتحانات اعزازات سے پاس کریں، انھیں یہاں پڑھنے کی دعوت دی جائے۔ ایک زمانہ کی بات ہے جب مولانا حسرت موہانی نے ہائی اسکول کا امتحان اعزاز سے پاس کیا تھا تو ان کو یہاں آنے اور پڑھنے کی دعوت دی گئی تھی۔

۲۔ فی الحال ہر ریاست کے امیدواروں کا کم سے کم کوٹہ مقرر کر دیا جائے تاکہ ہم یہ دعویٰ کر سکیں کہ ہماری یونیورسٹی میں ہندوستان کے ہر علاقے کے نوجوان تعلیم پا رہے ہیں۔

۳۔ جن طالب علموں کو ہم یہاں اعلیٰ تعلیم کے لیے دعوت دیں۔ اُن کی تعلیم مفت ہونا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں دلچسپی سے حصہ لے سکیں۔

۴۔ جو طالب علم دوسری ریاستوں سے یہاں آئیں ان کے لیے ہوسٹل کی سہولت فراہم کی جائے۔ یہ نہ ہو کہ ہم ان کو حالات کے رحم و کرم پر ڈال دیں۔

۵۔ جو طالب علم یونیورسٹی کے امتحانات میں نمایاں کامیابی حاصل کریں ان کی حوصلہ افزائی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کاموں کی باقاعدہ تشہیر کی جائے تاکہ ان کو یونیورسٹی میں عزت ملے۔

۶۔ یونیورسٹی میں ڈبیٹس کا معیار خاصا گر گیا ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ نوجوانوں کو مقابلے کے لیے تیار کریں اور انھیں دوسرے اداروں میں شرکت کے لیے بھیجیں۔

۷۔ کھیلوں کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ کی ضرورت ہے۔ اچھے کھلاڑیوں کو جو کسی اچھے تعلیمی ادارے سے وابستہ نہیں ہیں، یہاں آنے کی دعوت دی جائے۔ انھیں یونیورسٹی کی ٹیم میں جگہ دی جائے اور ان کی پڑھائی کا بھی خیال رکھا جائے۔ مختلف صنعتی اداروں اور کل ہند سروسز سے ربط قائم کیا جائے اور جو کھلاڑی ہمارے یہاں سے فارغ التحصیل ہوں، ان کی ملازمت کے لیے کوشش کی جائے۔

تہذیب الاخلاق

پندرہ روزہ — علی گڑھ

جلد ۱ شمارہ نمبر ۹

یکم جون ۱۹۸۲ء

مدیر: سید حامد

وائس چانسلر۔ اے ایم یو

مدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

چھ ماہ ۱۱ روپیے

سالانہ ۲۰ روپیے

غیر ممالک سے

فی کاپی ایک ڈالر

سالانہ ۲۰ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ

مدیر مسئول رسالہ تہذیب الاخلاق

سعد منزل۔ تارنگلہ۔ علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

اداریہ

مسلم نوجوان اور روزگار کا سوال!

مسلم تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مستقبل کا مسئلہ کافی پریشان کن ہے۔ بی۔اے کرنے کے بعد ملازمت کی تلاش ہوتی ہے، وہ ملنا آسان نہیں۔ فرقہ وارانہ تعصبات اگر رکاوٹ نہ بھی ہوں تب بھی کہاں نوکری ملتی ہے پھر مسلمان نوجوان بی اے کرنے کے بعد ایم۔اے کی طرف قدم اٹھاتا ہے ایم اے کرنے کے بعد وہ سوچتا ہے تو صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ پھر وہ بیچارہ ریسرچ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کو اگر کچھ وظیفہ مل گیا تو کوشش کرتا ہے کہ وظیفہ ملتا رہے اور ریسرچ کا کام ختم نہ ہو۔ یہ کہانی تو ایک بہت چھوٹے حلقہ کی ہے۔ بیشتر طالب علم بی اے کر کے سرگرداں پھرتے رہتے ہیں اور برسوں ملازمت نہیں ملتی!

ملک کی اقتصادی حالت جو بھی ہے وہ سامنے ہے اس کی اصلاح کی توقع نہ کیجیے جب تک پھر کوئی گاندھی نہ پیدا ہو ہندوستان کی حالت درست نہ ہوگی۔ ہمارے امراض مادی کم، اخلاقی اور روحانی زیادہ ہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ ہمارے لیڈران کی طرف توجہ کریں۔ فارسی کی ایک مثل ہے۔ " او خویشتن گم است کرا رہبری کند" جو خود گمراہ ہو کب کسی کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

مسلمان نوجوانوں کو مایوس نہ ہونا چاہیے۔ راقم ایک لڑکے سے واقف ہے۔ اس نے بی اے کیا۔ پھر اخبار میں ایک اشتہار دیکھا کہ کاروباری کو ایک ایجنٹ کی ضرورت ہے۔ تنخواہ کے علاوہ کمیشن ملے گا۔ وہ لڑکا کارخانہ کے مالک سے ملنے گیا۔ لڑکا مسلمان

[illegible] ہے۔ لیکن اس نے اس [illegible]
سے گفتگو کی اور ایک بہت معمولی تنخواہ پر اس کو ایجنٹ
بنالیا۔ وہ لڑکا روزانہ صبح جاتا، دن بھر گھر گھر مال
فروخت کرتا اور گھر واپس آجاتا۔ چند ماہ یہ سلسلہ
رہا۔ پھر ایک روز اخبار میں اشتہار دیکھا۔ وہاں
بھی درخواست دیدی۔ اتفاق دیکھیے کہ ایک اخبار
کے دفتر میں چھ سو روپیہ کی جگہ مل گئی۔ دو سال اس
اخبار میں کام کیا۔ برابر اس کے لیے مضامین لکھے۔
رسالہ کے ایڈیٹر نے پہلا مضمون سب کاٹ دیا۔ دوبارہ
لکھوایا۔ پھر بھی بہت زیادہ اصلاح کی لیکن مضمون
چھاپ دیا اس پر لکھنے والے کا نام نہیں دیا۔ یہ
نوجوان مایوس نہیں ہوا اور کوشش جاری رکھی۔
چند ماہ کے اندر اس کے مضامین رسالے میں شائع
ہونے لگے۔ اسی دور میں اس نے مقابلے کے امتحانات
میں بیٹھنا شروع کیا۔ متعدد بار ناکام رہا پھر
یکایک تین امتحانات میں یکے بعد دیگرے کامیاب
ہوگیا۔ ایک امتحان معمولی کلرک کی کا تھا۔ اس میں
کامیاب ہوا، پھر ایک آل انڈیا ریڈیو کا تھا،
اس میں بھی کامیاب ہوگیا۔ پھر ایک اور سرکاری
امتحان میں کامیاب ہوا۔ تینوں نوکریوں سے
تقرر کے خط آئے۔ سب سے پہلے معمولی کلرک کی
ملازمت ملی، اس نے وہی قبول کرلی۔ پھر دوسری
اور آخر میں سب سے بہتر ملازمت ملی۔ اب ماشاء
اللہ ٹریننگ لے کر ملازم ہے اور خوش ہے۔

یہ قصہ اس لیے لکھا کہ وہ لڑکا بہت
محنتی ہے۔ کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اور برابر جدوجہد
کرتا رہا۔ بس یہی کامیابی کی شرط ہے۔ ہمارے
طلباء کو محنت اور جدوجہد کرنے کی عادت ہونی چاہیے
یہ عادت ڈالیے۔ زندگی میں کامیابی یقینی ہے۔ پھر
ایک مسلمان کو تو اللہ پر بھروسہ کرکے اور اس کی
مدد کی توقع پر محنت کرنا چاہیے۔ اگر وہ اللہ پر
بھروسہ کرکے جدوجہد کرے گا تو اس کو ایسی راہوں
سے امداد ملے گی جس کا اس نے خواب بھی نہ دیکھا ہو۔

ہمارے دو مضمون نگار اصحاب کا تعارف

شاغل صاحب اور قاضی صاحب دونوں آفتاب ہوسٹل
کے دور اول کے طالب علم ہیں۔ آفتاب ہوسٹل اولڈ بوائز
نے بنوایا تھا۔ مولانا طفیل احمد صاحب مرحوم، ڈپٹی حبیب
اللہ صاحب مرحوم اور سید ولایت علی مرحوم اس کے روح
رواں تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ایک ہوسٹل ایسا ہو جس میں
درجہ اول میں کامیاب ہونے والے طلبا داخل کیے جائیں۔
یہ دونوں حضرات ان طلبا میں سے ہیں۔ دونوں نے
اقتصادیات میں ایم اے کیا۔ اور اعلیٰ مقام حاصل کیا
شاغل صاحب کافی عرصہ امریکہ میں رہے۔ آزادی
کے بعد دہلی آگئے اور پلاننگ کمیشن کے کسی اعلیٰ عہدے
سے ریٹائر ہوئے۔

قاضی صاحب ملک آزاد ہونے کے بعد اقوام متحدہ
میں ملازم ہوئے۔ اور اقوام متحدہ کی اقتصادی امداد
کے سلسلہ میں کابل میں آٹھ دس برس رہے اور
آپ بھی پلاننگ کمیشن کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں
شاغل صاحب نے مضمون انگریزی میں
لکھ کر مرحمت فرمایا۔ اس کا ترجمہ قارئین کے لیے
پیش کیا جارہا ہے۔

پروفیسر عبدالرحمٰن
سی۔ ایس آئی آر۔ نئی دہلی۔

ترجمہ
شہناز ہاشمی

ہندوستانی سائنس اور بیرونی اساطیر

پہلی قسط

سائنس اور صنعت کی تاریخ اگرچہ بلالحاظ جغرافیائی
قوں اور اقوام، انسانی فکر و دانش کی سرگرمیوں کی صحیح
سو پیش کرنا چاہے تو اسے یورپین تعصب اور سابق نوآبادیاتی
قتوں کے سیاسی مقاصد کے لیے پھیلائے ہوئے
بالات سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔ ان خیالات کی
ِو دنما، افریقہ اور امریکہ میں یورپین طاقتوں کی نوآبادیاتی
ششوں کا ایک حصہ تھی۔ ہر چند کہ ہم یورپین نشاۃ ثانیہ
ے مقروض ہیں لیکن یورپ کی جدید سائنس اپنے آغاز کے
ے عربوں کی مرہونِ منت ہے۔ قدیم اور قرونِ وسطیٰ کے
نیا اور افریقہ کا مجموعی علم یورپ کے علماء نے پہلے حاصل
ا اور بعد میں رد کر دیا۔

سائنس کی تاریخ کا مرکز یورپ رہا
۔۔ وجہ یہ ہے کہ آج کی دنیا میں سائنس اور صنعت
رفت میں یورپین تہذیبی رقبہ کا بہت بڑا حصہ ہے بہرحال
نس اور صنعت کی تصویر یورپین روایت کی حیثیت سے
ں کرنے کا عمل بڑی حد تک سیاسی اغراض و مقاصد پر
ی ہے۔ میکالے کی مشہور تحریر سے یہ بات واضح
جاتی ہے۔ "اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک اچھی
پین لائبریری کی الماری کا صرف ایک خانہ ہندوستان
ر عرب کے تمام دیسی لٹریچر پر بھاری ہے۔"

میکالے ہندوستان کی سائنٹفک اور
منتی کارناموں کی وسعت سے واقف نہیں تھا۔ اس نے
دانستہ ان کامیابیوں سے چشم پوشی کی۔ تاکہ مغربی علم
کی برتری ثابت کر سکے۔ اور ہندوستانیوں کے دماغوں
میں احساسِ کمتری نقش کر دے۔ یورپین نوآبادیاتی
حاکموں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ یورپین خاص کر
انگریزوں کے برعکس ہندوستانی بلکہ تمام ایشیائی صحت
بیان ربط اور عقل کے معاملے میں قطعی نااہل ہیں۔ لہٰذا
وہ سائنس داں بھی نہیں ہو سکتے۔ ایک طرف یہ حکایت
فروغ پا رہی تھی اور اس کا خوب پرچار کیا جا رہا تھا
اور ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی غور و فکر کے اساطیری
اور صوفیانہ فلسفے اور اس کی وسعتوں کو تاریخی اور
سماجی سیاق و سباق سے جدا کر کے ہندوستانی روایت
کی اصلیت کے طور پر بے جا زور دے کر نمایاں کیا
جا رہا تھا۔ یہ دوسرا طرزِ عمل غالباً دوسرا مقصد حاصل
کرنے کے لیے اختیار کیا گیا تھا۔ ظلمت، کم عقلی اور توہمات
پھیلانا اور ہندوستانیوں کو پسماندہ کر کے ان کی سائنٹفک
اور صنعتی روایات کا ان کی تہذیب سے رشتہ توڑنا۔
ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ان کا ذہن سائنس اور حکمت
کی طرف سے ہٹا دیا جائے اور وہ برطانیہ کے دستِ نگر
رہیں۔ آخر الذکر بات کی وضاحت اس سے بھی ہوتی
ہے کہ یونیورسٹیوں میں سائنس اور انجینئرنگ کی تعلیم کی
مخالفت کی جاتی رہی۔ سائنس کے شعبے انسانیات اور
قانون کے شعبوں کے بہت بعد میں قائم کیے گئے

توہینے فرسودہ روایات اور نام نہاد فلسفیانہ علوم کی
تعریف کے پل باندھنے کی باقاعدہ کوششیں سامنے آتی
ہیں۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایشیائی تہذیب جو خود
اپنی طبیعیاتی و صنعتی روایات اور وراثت سے ناواقف
تھی، صرف یورپین لوگوں کے پڑھائے ہوئے سبق کے
مطابق صنعت و حرفت کو سمجھتی ہے۔ درحقیقت یہ کہنا
غلط نہ ہوگا کہ غیر یورپی تہذیبی حلقے کے لوگ سمجھتے ہیں کہ
کہ اُن کی تہذیب روایات اور بود و باش صرف اُسی
چیز تک محدود ہے جس کو "روحانی" روایت کہا جاتا ہے
اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم از سر نو اپنے
ماضی پر نگاہ ڈالیں اور اپنے حال کا جو اس وقت
دو رنگی کا شکار معلوم ہوتا ہے ماضی سے رشتہ جوڑیں
اس عمل میں ہم کو بہرحال یورپ سے ایک سبق سیکھنا
ہے کہ حال کو ماضی کی سائنٹفک اور منطقی روایت سے
منسلک کریں نہ کہ اس قیاسی اور غیر منطقی روایت
سے جس کے متعلق ہمیں بتایا گیا ہے کہ صرف وہی ہماری
ہے اور ہم صرف اُسی قدیم علم کے دعوے دار ہو سکتے ہیں
ایشیائی ممالک کو جو اب آزادی حاصل
کر چکے ہیں اور اپنی آرزؤں اور تمناؤں کے راستے پر
رواں دواں ہیں، اپنے ماضی پر نظر ثانی کی ضرورت
ہے تاکہ ان کی موجودہ ارتقا کا رشتہ ابتدائی روایت
سے قائم ہو سکے۔ ایسا کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔
مغربی دنیا میں سائنٹفک اور صنعتی فکر کی دوبارہ جانچ
ہو رہی ہے۔ جو عناصر پہلے یورپین سائنس اور
صنعت کے احاطے سے باہر سمجھے جاتے تھے، جیسے سماجی
مذہبی اور اخلاقی امور، وہ اب متعارف کیے جا رہے

... ایشیائی سائنٹفک اور صنعتی
کا اہم جز رہے ہیں۔ اس لیے اس روایت کو سمجھنے کی
ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ یورپین علمی حکمرانی کے زیر اثر
ایشیائی ممالک اپنے آپ کو مغربی انداز نظر سے دیکھنے
لگے۔ ان کی اپنی سائنٹفک اور صنعتی روایت کو از سر نو
دریافت کرنے اور صدیوں تک اس کے اثرات پر نظر
ڈالنے سے نہ صرف انھیں علمی محکومی سے آزاد ہونے
میں مدد ملے گی بلکہ وہ اپنے گمشدہ علمی ورثہ کو پھر سے
پا سکیں گے اور آئندہ ترقی کی کوششوں میں معاون
و مددگار ثابت ہوں گے

سائنس اور صنعت کے ارتقا میں ایشیا
اور افریقہ کے بہت سے ممالک کا بے حد اہم حصہ رہا
ہے۔ تاریخ میں ان ممالک کو ان کا حق ملنا ہی چاہیے
یورپ کے علاوہ کچھ خاص علاقے سائنٹفک روایات میں
گردانے جاتے ہیں۔ شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا عربی
زبان کے علاقے، ایران، افغانستان اور وسط ایشیا
فارسی اور ہم آہنگ زبانوں کے علاقے، ہندوستان پالی
سنسکرت، عربی، فارسی اور بڑی تعداد میں علاقائی
زبانوں کا حلقہ، چین کوریا، جاپان اور جنوب مشرقی
ایشیا کے دیگر علاقے، عثمانی سلطنت اور ترکی خاص زبان
اور افریقہ اور لاطینی امریکہ جن کی کوئی تحریری روایت
نہیں۔ ضروری ہے کہ قدیم ورثہ کی جانکاری اور تجزیے
کے لیے بڑے پیمانے پر کوشش کی جائے اور اسے سائنٹفک
اور صنعتی علم کے مرکزی دھارے میں شامل کیا جائے

ہندوستانی روایت بے حد اہم ہے
کیوں کہ وہ ایشیائی مجموعی روایت کا ایک حصہ ہے۔ خاص
کر اس لیے کہ اس نے نہ صرف چینی، کوریائی، جاپانی علمی

روایت بلکہ وسطی اور مغربی ایشیائی روایت کو بھی
نویت بخشی اور اپنے طور پر بھی بہت کچھ حاصل کیا
ں روایت کی ابھی تک صحیح طریقہ سے تفتیش نہیں کی
ئی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا
تی ہے۔

سائنٹفک علم اور صنعتی ارتقاء پر ایک
سرسری نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان
اور وسطی و مغربی ایشیا ایک دوسرے کے ارتقائی عمل
مسلسل اثر انداز ہوتے رہے ہیں اور اسے پروان چڑھانے
مالا مال کرنے میں کوشاں رہے ہیں۔ علمی اضافے کی یہ کوشش
دور کے سیاحوں اور عالموں کے ذریعہ پروان چڑھیں جو تلاش
اور سرپرستی یا ہجرت کی خاطر آئے۔ یہ روایت زمانہ
کے غبار میں پنہاں ہے اور ایک دور سے دوسرے دور
حرکت پذیر ہے۔ اس کا واسطہ مذہب سے بھی ہے۔ پہلے
یعہ بدھ مت پھر اسلام

ہندوستانی علم حاصل کرنے کی پہلی منظم کوشش
ہمارے ضبط تحریر میں ہے وہ چین میں چینی سیاحوں اور
راہبوں کے توسط سے ہوئی جو علم و عرفان حاصل کرنے
ہندوستان آئے۔ جو کچھ علمی سرمایہ وہ اپنے ساتھ لے گئے وہ اُن کے
مستقبل پر گہرا تاثر چھوڑ گیا۔ مغربی ایشیا میں یہ کوشش بیت الحکما
کے ذریعہ بغداد میں دور عباسی میں ہوئی۔ اسی زمانے میں
نجوم ریاضی اور طب سے متعلق ہندوستانی کتابوں کا عربی میں
ترجمہ کیا گیا جو عربی نشاۃ ثانیہ اور وسطی و مغربی ایشیا اور شمالی
افریقہ میں علمی فروغ کا باعث ہوا۔ سائنٹفک اور صنعتی ربط و ضبط
اور اس کے اثرات کے معیار کا اندازہ ابن سینا کے بیان
سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ایک اسماعیلی مبلغ کی شخصیت
سے متعلق دیا۔ "دیکھتے ہی دیکھتے وہ مجھے تحریک میں شرکت کی دعوت

دینے لگے۔ زبان کو حرکت دینے لگے اور فلسفہ اور علم ہندسہ
و ہندوستانی ریاضی پر گفتگو کرنے لگے۔ میرے والد نے مجھے
ایک سبزی فروش کے پاس بھیجا تاکہ میں اس سے کچھ سیکھ سکوں"
یہ حقیقت ہے کہ ایک سبزی فروش ہندوستانی ریاضی
سے واقف تھا اور اسے استعمال بھی کرتا تھا۔ یہ واقعہ ہندوستانی
سائنس کے اثرات اور سماج کے تہذیبی درجہ کو ظاہر کرتا ہے جہاں
سبزی فروش جیسے لوگ مخصوص علوم پر قدرت رکھتے تھے۔ دل
چاہتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں بھی تعلیم کا معیار اتنا ہو جائے
کہ مخصوص مضامین کا علم عوام کی تہذیب کا حصہ بن جائے۔
ابن سینا کے ہم عصر اور واقف کار البیرونی —
[۹۷۳ - ۱۰۴۸ء] نے "کتاب الہند" نامی ایک علمی کتاب
لکھی تھی جو ہندوستانی سائنس کا خلاصہ کہی جا سکتی ہے
یہ نہ صرف ہندوستانی ریاضی اور دیگر علوم پر قرون وسطی
کی بہترین تصنیف ہے بلکہ غالباً ہندوستانی یونانی اور مغربی
ایشیائی سائنس کا اولین تقابلی جائزہ ہے۔ اُس زمانے
کے رجحانات اور تعصبات کے باوجود مصنف نے یہ علم ہندوستان
آ کر ہندوستانی عالموں کے قدموں میں بیٹھ کر حاصل کیا

یہ مضمون دو قسطوں میں انگریزی روزنامہ
"انڈین ایکسپریس" کے شمارہ مورخہ ۱۳، ۱۴ اپریل
۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔ ہم مصنف اور معاصر
جریدے کے شکریہ کے ساتھ یہاں پیش
کر رہے ہیں۔
دوسری قسط اگلی اشاعت میں ملاحظہ
فرمائیں۔

[مدیر مسئول]

[redacted]

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو

سائنسی طرزِ عمل

کوئی کام خوبصورتی سے کرنا آرٹ ہے اور باقاعدگی سے کرنا سائنس۔ سائنسی طرزِ عمل کا معروضی ہونا ضروری ہے، جس میں ہماری ذاتی پسند یا ناپسند کو دخل نہ ہو، بلکہ چیزوں کے اپنے خواص کو ہی دخل ہو۔ اس کی بنیاد موٹے طور پر دو تین ہزار سال ہوئے بعض یونانی شخصیتوں نے رکھی، جس میں ارسطو کا نام خاص طور پر لیا جاتا ہے۔ ارسطو نے بھی بہت سی باتوں کو غلط سمجھا اور بیان کیا تھا۔ جس سے بعد کے لوگوں کو بہت دنوں تک مشکلیں پیش آتی رہیں۔ اور بہت سے پُرخلوص تجربوں اور قربانیوں کے بعد غلطیاں عمل کے سامنے آئیں اور ترک کی جا سکیں۔

جب سے انسان نے ہوش سنبھالا
ہو بات نظر آئی۔ اس کا کوئی سبب قیاس کرنے لگا۔ پھر ختلف مشاہدوں اور ان سے متعلق قیاسوں کو باہم بط دینے کی کوشش کی۔ تاکہ کم سے کم اصولوں کی مدد ے زیادہ سے زیادہ باتیں سمجھی جا سکیں۔ اس طرح زومنہ سے نظریہ تک پہنچے۔

بعد میں منطق کا فن وجود میں آیا۔ جس کا عد ذہن کو غلطی سے محفوظ رکھنا تھا۔ استقرائی اور ستخراجی منطق نے فکر کے تضاد کو کم کرنے میں خاصی کی اور باقاعدگی کے ساتھ سوچنے کی بنیاد پڑی ن اب بھی بڑی غلطیاں ہوتی تھیں۔ ہم استدلال سکتے تھے تو چیزوں کے کیفیتی خواص کی حد تک ان کی مقدار کی تبدیلی اور ان بدلتی مقداروں کے باہمی رشتوں پر صحیح غور و فکر ریاضیاتی منطق کی ایجاد کے بعد ہی ممکن ہوا۔ ریاضیاتی مساواتیں وہ تنہا ذریعہ ہیں جو متغیروں کے حرکی رابطوں کا کوئی اصول بیان کر سکیں۔

ریاضی کے استعمال کے بعد بہت جلد معلوم
ہو گیا کہ محض رائج ریاضی اور منطق کی مدد سے بہت دور تک نہیں جایا جا سکتا۔ بلکہ سائنسی طرزِ عمل مشاہدہ اور نظریہ کے ہر ہر قدم پر تعاون کا نام ہے۔ جس نظام کو سمجھنا ہو، اس کے سادہ ترین نمونہ پر گہری نظر ڈالیں۔ جو کچھ نظر آئے یا محسوس ہو، اس سے ایک نظریہ مرتب کریں۔ اب اسے وسعت دے کر تھوڑے پیچیدہ نظام پر عاید کریں۔ اور دیکھیں کہ کن نظریاتی پیش گوئیوں کی نئے تجربوں اور مشاہدوں سے تصدیق ہوتی ہے۔ اور کس حد تک جو فرق ملے، اس کی روشنی میں ترمیم و اصلاح کے ذریعہ نظریہ حقیقت سے زیادہ قریب لایا جائے۔ پھر اسی طرح ایک ایک قدم آگے بڑھتے رہیں۔

ایک مثال یہ ہے کہ ایٹموں کا مطالعہ
ہائڈروجن سے شروع ہوا جس میں صرف ایک پروٹون اور ایک الکٹرون ہوتا ہے۔ بوہر نے ۱۹۱۳ء میں اس سادہ ترین ایٹم کی ساخت نظریہ پیش کیا تھا۔ جب سے اسے ترقی دے کر سائنس داں اب اتنی دور نکل آئے ہیں کہ یورانیم جیسے پیچیدہ اور سیکڑوں گنے وزنی ایٹموں کی ساخت پر کام کر رہے ہیں اور ان

کی توانائی کی تہوں کو دس لاکھ میں ایک عدد کی صحت کے معیار پر متقین کرتے جارہے ہیں۔

نظریہ تجربہ کی کسوٹی پر پورا اترے تو قانون بن جاتا ہے۔ لیکن بعد میں اس کی بھی حدیں دریافت ہوتی ہیں کہ کہاں تک یہ قاعدۂ کلیہ ہے اور کہاں سے محض تخمینہ۔ اچھے قانون کی خوبی یہ ہے کہ اس کے اطلاق کی حدیں خوب واضح ہوں سماجی قانون کی بھی یہی خوبی ہوتی ہے۔ ورنہ عدالتیں اُسے لایعنی اور بے مصرف قرار دے دیتی ہیں۔

ریاضی کو سائنس کی ملکہ کہتے ہیں کیوں کہ اس نے سائنسی استدلال کو اتنا وقار بخشا ہے لیکن پچھلے پچاس سال سے یہ طبیعیات [فزکس] ہے جو ریاضیات کو زندہ رکھے اور باوقار بنائے ہوئے ہے طبیعیاتی تحقیق کی بدولت ریاضی کا نہ صرف نمو قائم رہا بلکہ وہ زندگی کے زیادہ قریب آ گئی اور محض دماغی کھیل بن کر نہیں رہ گئی۔

صراحت کی بنا پر فزکس، کیمسٹری، جیولوجی ریضیات] فلکیات اور جغرافیہ وغیرہ کے وہ حصے جن پر ریاضیاتی اصول عاید ہوتے ہیں، زیادہ قابلِ اعتبار، زیادہ بنیادی اور زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ حیاتیاتی سائنس، جن پر ریاضی نہیں لگایا جاتا، کم ترقی یافتہ ہیں۔ کیوں کہ ان مضامین میں نظریوں کی مقداری جانچ ممکن نہیں۔ سماجی سائنس ابھی زینہ کی پہلی سیڑھی پر ہی ہیں۔ کیونکہ ان میں پیمائش کے نظام تک ابھی پوری طرح متقین نہیں ہو سکے ہیں۔ ان پیمائشوں میں رشتہ کیا ہے، اس کا سوال بعد کی بات ہے۔ فنِ معاشیات جس حد تک پیمائش

اور ریاضی کے ضابطوں پر بیٹھ جاتا ہے، اس حد تک قطعی سائنسوں کی فہرست میں آتا ہے۔

طبیعیاتی سائنسوں میں بھی نئی فلکیاتی دریافتوں اور تحت نیو کلیائی ذرّوں یا میدانوں کی بابت کہی جانے والی باتیں شبہ کے ساتھ لی جانی چاہیں۔ کیونکہ ان کے لیے کی جانے والی محنت کے پورے احترام کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان میدانوں میں بہت ہی کم نظریہ قاعدہ کلیہ یا قانون کا حکم رکھتے ہیں۔

سب ہی سائنسی ترقیوں سے ہمیں عام زندگی میں فائدہ پہنچا ہے۔ طبیعیات کی بدولت فطرت سے متعلق ہمارے توہمات دور ہوئے۔ ہم حقیقت سمجھ کے ہم بہت سے خطروں سے اپنا بچاؤ کر سکے۔ اور سو طرح سے قدرتی وسائل کو اپنے استعمال میں لائے۔ علم کیمیا نے دواسازی اور صنعت کو فروغ دیا۔ تحلیل نفسی کی بدولت ذہنی بیماریاں کم ہوئیں۔ حیاتیاتی سائنسوں نے ہمارے ماحول کے متعلق صحیح باتیں بتائیں کہ فطرت میں ہمارے دوست اور دشمن کون ہیں۔ اس طرح زراعت غذا اور صحت کے معاملوں میں فائدہ اٹھایا جا سکا۔

تازہ حیاتیاتی تحقیق سے جینس آر ان اے، ڈی ان اے اور ان کے اعمال کا علم ہوا ہے جس سے اور باتوں کے علاوہ یہ پرانی بحث ختم ہو گئی ہے کہ ماحول اہم ہے یا ورثہ۔ دونوں اہم ہیں۔ بچہ اپنے ورثہ میں کچھ صلاحیتیں لے کے پیدا ہوتا ہے۔ اچھا ماحول انھیں پوری طرح بروئے کار لانے اور درجۂ کمال پر پہنچنے میں مدد دیتا ہے بُرا ماحول انھیں برباد کر ڈالتا ہے۔ یا پوری طرح

نہیں اُبھار سکتا جو ورثہ میں نہ ملی ہو اور نہ ورثہ میں ملنے والی صلاحیتوں کو ان کی حد سے زیادہ پروان چڑھا سکتا ہے۔

سائنسی طرزِ فکر و عمل کا ہم اپنی زندگی پر اطلاق کریں تو کچھ عام نتیجے نکلتے ہیں۔ ہمارے سوچنے اور غور کرنے کا ایک ہی ڈھنگ ہونا چاہیے جو نئے معلومات کی روشنی میں ترقی کرتا ہے۔ ہم اپنے دماغ کو خانوں میں نہ بانٹیں کہ تعلیم کے لیے یہ طرزِ فکر ہے، تجربہ کے لیے یہ دوسرا، سماجی تعلقات میں یہ تیسرا اور رسم و رواج کے معاملہ میں یہ چوتھا۔

کسی کتاب میں زندگی کے تازہ مسائل اور معاملات کا من و عن حل نہیں لکھا ہوتا ہے ہر شخص کی اپنی زندگی ہوتی ہے جس کے اجزائے ترکیبی اس کے ورثہ اور ماحول پر منحصر ہوتے ہیں۔ اس لیے جب کوئی دقت آپڑے تو تجزیہ کرنا چاہیے کہ مشکلیں کیا ہیں، کیوں ہیں اور کہاں سے ہیں۔ اتنا پتہ چل جائے تو تدارک سوچا جا سکتا ہے۔ پھر غور کرنے سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ فلاں مرض کا پورا علاج ممکن ہے۔ فلاں کا صرف ادھورا اور فلاں کا کوئی علاج ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ دریافت خود ایک ترقی ہے جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے

آتا ہو تو ہاتھ سے جانے نہ دیجیے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجیے

یہ صورتِ حال ریاضیات کے عین مطابق ہے۔ بعض مساواتوں یا ریاضیاتی مسئلوں کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے اکثر ... ہوتے ہیں۔ جن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکتا۔ گروپ تھیوری یا مجموعتی نظریہ کے استعمال سے زیادہ محنت کیے بغیر یہ پتہ چلا لیا جاتا ہے کہ وہ چند شکلیں کون سی ہیں، جن کے فائدہ مند جواب نکل سکتے ہیں اور پھر صرف انھیں کے مفصل حل تلاش کرنے پر محنت کی جاتی ہے۔

اب رہا کتاب اور کتابِ زندگی کا تعلق، تو جزوی مماثلتیں برابر ملتی رہتی ہیں۔ کتابوں میں لکھی بہت سی باتیں ایک حد تک ہماری زندگی میں پیش آتی ہیں۔ ان کی حد تک دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اُٹھا لینا دانش مندی ہے لیکن دانش مند یہ بھی سمجھتا ہے کہ تجربے کہاں تک مشترک ہیں اور کہاں سے ہم کو اپنی نئی راہ نکالنی چاہیے اس کی مثال شطرنج سے دی جا سکتی ہے کہ ایک بازی دوسری سے از اول تا آخر نہیں ملتی لیکن آغاز، درمیان اور انتہا میں اکثر ایسی مشکلیں پیش آجاتی ہیں جیسی پہلے کسی کو پیش آ چکی تھیں اور جن کے ماہرانہ حل موجود ہیں۔ اگر شاطر نے پہلے سے ان کا مطالعہ کر رکھا ہے تو اس کا وقت بھی بچتا ہے اور لگتا ہے کہ ... وہ آن پرانی ... بھی کر لیتا ہے۔

معذرت

رسالہ تہذیب الاخلاق کے شمارہ نمبر ۸ ج ۱۹ [مئی ۱۹۸۲ء] میں ایک مضمون "عہد عباسی کی ایک جھلک" کے صاحبِ مضمون کا نام "نشاط ہاشمی" کے بجائے "نشاط حسام الدین فاروقی" پڑھا جائے۔

جراثیمی تعدیہ اور مرض

نقیب الاسلام
۶۱۔ سیفی ہوسٹل

[Bacterial Infection & Disease]

قدیم زمانہ میں بھی لوگ اِس بات سے واقف تھے کہ مریض سے قریبی ربط ضبط رکھنے، اس کی روزمرہ کی استعمال کی اشیاء استعمال کرنے سے بیماری پھیل سکتی ہے۔ اس لیے وہ مریضوں کو علیحدہ رکھتے تھے۔

تعدیہ [Infection]

تعدیہ کا مطلب ہے جسم میں جرثومے کی موجودگی نہیں بلکہ اس سے پیدا شدہ سمی اثرات کے نتیجہ میں عوارضات۔ کیوں کہ تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ بہت سے جراثیم جسم کے مختلف حصوں [عموماً سطحوں پر] پڑے ہیں۔ یہ جراثیم ایسے بھی ہوتے ہیں، جو بیماری کی مخفی صلاحیت رکھتے ہیں اور بیماری پیدا کرتے ہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب جسم اور ان جراثیم کے درمیان میزبان طفیلی رشتہ [Host Parasite Relation] گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ عموماً جراثیمی امراض باہر سے آنے والے جراثیم کی وجہ سے ہی لاحق ہوتے ہیں۔

کسی بھی جراثیمی مرض پھیلنے کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں۔

۱۔ صلاحیت انتقال [Communicability]

یہ ایسی خصوصیت یا صلاحیت ہے جس کی وجہ سے جراثیم ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں۔

۲۔ جارحیت [Invasiveness]

جراثیم میں یہ بھی صلاحیت ہونی چاہیے کہ جب انھیں مناسب نسیج [Tissue] مل جائے تو اس میں داخل ہو جائیں جہاں موزوں حالات ملنے پر نمو پذیر ہو سکیں اور ان میں کچھ مدافعتی ردعمل پیدا ہو سکے۔

۳۔ مرض پیدا کرنے کا عمل:

[Pathogenic Action]

جراثیم جب جسم میں داخل ہو جائیں تو ان میں ایسی صلاحیت بھی ہونی چاہیے کہ وہاں عرضی کیفیت پیدا کر سکیں۔

صلاحیت انتقال [Communicability]

جراثیم مندرجہ ذیل طریقوں سے منتقل ہوتے ہیں

(۱) ذخیرہ تعدیہ [Reservoir of Infection]

بہت سے متعدی امراض [Infection-] [Diseases] میں ایک انسان دوسرے صحت مند انسان کو متاثر کر سکتا ہے۔ کچھ امراض ایسے ہیں جو ایک جانور سے انسان میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

(۲) ذریعہ انتقال Mode of Transmission

امراض منتقلہ [Communicable Diseases]

ایک انسان سے دوسرے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ مندرجہ ذیل طریقوں سے منتقل ہوتے ہیں۔

(الف) [Contact Transmission]

بلاواسطہ Direct Contact اس میں مرضی جرثومے ایک مریض کے دوسرے صحت مند انسان

Biological Transmission کو ہم
کہتے ہیں۔ مثلاً ملیریائی اجسام نا ملیریائی اجسام
جو مچھروں میں پائے جاتے ہیں۔

(د) [Air borne Transmission]

اس صورت میں مختلف طریقوں سے بیماریاں
پھیلتی ہیں۔ جب ایک مریض کھانستا ہے، بات
کرتا ہے یا چھینکتا ہے تو اس کے منہ سے تھوک
نکل کر باہر ماحول [فضا] میں آتا ہے۔ جس
میں متعدد مرضی اجسام موجود ہوتے ہیں۔ جب
ایک صحت مند اس ماحول میں سانس لیتا ہے
تو وہاں پر موجود اجسام سانس کے ذریعہ اس کے
جسم میں داخل ہو جاتے ہیں اور مناسب صورت
میں مرضی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس طرح پھیلنے
والی بیماریوں کو Droplet Infection
کہتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مریض
چھینکتا یا کھانستا ہے تو زیادہ مقدار میں تھوک
پھوہارے کی طرح منہ سے نکل کر سطح زمین پر
پھٹتا ہے، کچھ بوندیں اس کی کپڑے وغیرہ پر
بھی پڑتی ہیں اور جب کوئی اس کے تعلق میں
آتا ہے تو اس میں وہ بیماری کے اجسام
داخل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح پھیلنے والی
بیماری کو ہم INFECTED DUST
کہتے ہیں۔ چنانچہ ٹی۔بی و نمونیا کے اجسام اسی
طرح پھیلتے ہیں۔

[ر] Transplacental Transmission

کچھ مخصوص بیماریاں ایسی ہیں جو جنینی زندگی میں

Venereal diseases ...

ہیں اس سے پیدا ہوتی ہیں۔

بالواسطہ Indirect Contact اس میں
مرض کسی چیز کے درمیان میں حائل ہونے پر منتقل ہوتا
ہے۔ مثلاً ہوٹل وغیرہ میں برتنوں سے جو بیماریاں پھیلتی
ہیں۔ اس میں دق Tuberculosis - خناق Diphtheria
خسرہ Measles - چیچک Small pox وغیرہ
بیماریاں آتی ہیں۔

[ب] [Vehicle Transmissions]

اس میں مرضی اجسام یا تعدیہ کسی چیز کے ذریعہ منتقل
ہوتا ہے۔ اکثر پانی، برف، دودھ، غذا اور ہم وغیرہ
کے ذریعہ منتقل ہو جاتا ہے۔ پانی ایک بہت ہی خاص
ذریعہ کچھ مخصوص بیماریوں کے پھیلنے کا مثلاً Cholera
Typhoid Fever اور التہاب جگر
[Hepatitis] وغیرہ۔

[ج] [Vector Transmission]

وہ کیڑے مکوڑے جو بیماری پھیلانے کا سبب بنتے ہیں
جنہیں ہم [Vectors] کہتے ہیں۔ یہ Vectors
تو اپنے ڈنک کے ذریعہ تعدیہ جسم میں چھوڑتے ہیں
پھر وہاں کاٹ کر سمی اثرات داخل کر دیتے ہیں
اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ صرف اپنے پیروں کی مدد
سے مرضی اجسام پھیلاتے ہیں جن کو ہم Mech-
-anical Transmission کہتے ہیں
مثلاً زحیر یا اسہال وغیرہ جو مکھیوں سے پھیلتا ہے۔
کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مرضی اجسام جسم
میں داخل ہو کر مختلف طریقوں سے منقسم اور نمو پذیر

ماں کے خون سے جنین میں منتقل ہو جاتی ہیں
اس ماں کی منتقل شدہ بیماریاں اس بچے میں
تاعمر موجود رہتی ہیں۔ جن کو ہم خلقی بیماریاں
Congenital Diseases بھی کہتے
ہیں۔ مثلاً آتشک [Syphilis] اور
سوزاک [Gonorrhea] وغیرہ

مدت حضانت Incubation Period

یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جرثومہ کے جسم میں داخل
ہوتے ہی مرضی کیفیت پیدا ہو۔ بلکہ یہ جرثومے یا
مرضی اجسام جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک مخصوص
وقت گزارتے ہیں۔ پھر مرضی کیفیت پیدا کرتے ہیں
اس وقت کو مدت حضانت کہتے ہیں۔ مختلف مرضی
اجسام میں یہ مدت مختلف ہوتی ہے جب جرثومے
اپنی سمیت چھوڑتے ہیں تب مرضی کیفیات شروع
کرتے ہیں

جرثومہ اپنی مدت حضانت میں
منقسم [MULTIPLY] ہوتا رہتا ہے
اور جب بہت سے مرضی اجسام بن جاتے ہیں
جسم کی مد… قوت اس پر حاوی نہیں
ہو پاتی اور مرضی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے
اگر مدت حضانت کی تاریخ
معلوم ہے تو ہم اس کی بنیاد پر یہ اندازہ
لگا سکتے ہیں کہ بیماری شروع ہوئے کتنے
ایام گزرے ہیں۔ عموماً بیماریاں مدت حضانت
میں منتقل نہیں ہوتی ہیں۔ مگر کبھی کبھی ہو بھی
سکتی ہیں مثلاً خسرہ۔ چیچک۔ کالی کھانسی وغیرہ
میں۔

اب تک تو مختلف متعدی امراض
پھیلنے کے ذرائع اور اسباب
کا مختصر سا ذکر چل رہا تھا
اب آئندہ آپ ملاحظہ فرمائیں
گے کہ کون کون سی تراکیب
اور تدابیر اختیار کی جائیں،
جن سے ان امراض سے
ہم سب لوگوں کو چھٹکارا
مل سکتا ہے۔ اس سلسلہ
آئندہ شمارہ میں بحث کی
جائے گی۔

بقیہ مضمون۔ میری نظر میں ہندوستانی مسلمان متعلقہ صفحہ ۲۲

کی خاطر کسی ایک زبان کو مسلط کرنا ملک کی سالمیت کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ ہمارے ملک کو لسانی
نزاعات سے نجات ملنی چاہیے۔ تاکہ ہم دوسرے سماجی اور معاشی مسائل کی طرف یکسوئی سے متوجہ
ہو سکیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں میں جہاں اسی طرح کے لسانی مسائل درپیش تھے، وہاں کسی ایک زبان کو
مسلط نہیں کیا گیا ہے بلکہ بہت سی زبانوں کو پھلنے پھولنے اور استعمال کیے جانے کے مواقع فراہم کیے گئے ہیں
مثلاً سوئٹزرلینڈ میں فرانسیسی، اطالوی اور سوئز زبانیں بیک وقت رائج ہیں

[redacted]

صدر شعبہ فارسی

اجتماعی اصلاح میں خواتین کی اہمیت

اس زمانے میں خواتین حکومت سے حقوق مساوات حاصل کرنے کے بعد بھی پریشان اور غیر مطمئن نظر آتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ پریشانیاں حق بجانب ہیں مثلاً جہیز اور مردوں کا تعدد ازدواج۔ جہیز اس وقت خود خواتین کے لیے زہر قاتل بنا ہوا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ مصیبت کس کی لائی ہوئی ہے اور دفع کون کرسکتا ہے۔ عام طور سے گھروں میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کے یہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے تو خواتین واویلا مچا دیتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو مسرت لڑکے کی پیدائش پر ہوتی ہے وہ لڑکی کی پیدائش پر نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ اگر کسی سے کہا جائے کہ تمہارے یہاں ایک بادشاہ آیا ہے اور دوسرے سے کہا جائے ایک کنیز آئی ہے تو یقیناً دونوں کے احساس میں فرق ہوگا۔ مگر جو ہونا تھا، ہوگیا۔ واویلا مچانے سے اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ خالق کی مرضی تھی۔

ہرچہ از دوست می رسد نیکو است

بزرگانِ دین نے اس موقع پر صبر و شکر کی مثالیں قائم کی ہیں لیکن خواتین اس نقصان کا بدلہ لاشعوری طور پر شوہر سے لیتی ہیں یعنی اس کو جہیز دینے پر مجبور کرتی ہیں۔ جہیز کی ابتدا تو ہوتی ہے مگر انتہا نہیں ہوتی۔ خواتین اپنا اور کنبے کا پیٹ کاٹ کے جہیز کی طرف متوجہ ہوجاتی ہیں۔ شروع اس طرح ہوتا ہے کہ لڑکی کو ضرورت کی چیزیں مہیا کردی جائیں لیکن وہ ضروری چیزیں بہتر معیار کی ہونا چاہیں۔ اس لیے کہ محفل میں جہیز سجایا جائے گا اس کے بعد شوق اور عیش کی چیزوں کی باری آتی ہے۔ پھر خیال ہوتا ہے کہ داماد کیا کہے گا۔ جو کچھ دیا لڑکی کو دیا۔ لہذا اس کے لیے بھی اتنا نہیں تو اس کے لگ بھگ ضرور ہوجائے۔ اور سمدھیانے والے کیا کہیں گے! لہذا کچھ تحائف ان کے لیے بھی ضروری ہوجاتے ہیں۔ غرض کہ سلسلہ لامتناہی ہوجاتا ہے۔ سمدھیانے والے اور خود داماد لڑکی والوں کا یہ رجحان دیکھ کر خوب پھیلتے ہیں اور شادی کے دوران کیا معنیٰ اس کے بعد بھی "ہل من مزید" کی صدائیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔ لڑکی والے جو صاحب ثروت ہیں کہتے ہیں کہ نہ ہم نے کسی سے مانگا نہ قرض لیا۔ جو کچھ ہمارے پاس تھا اولاد کو نہ دیتے تو کیا کرتے۔ تو اولاد کو دینے کے اور بھی طریقے ہوسکتے ہیں۔ زندگی میں کبھی بھی دیدیں۔ لیکن اس موقع پر مخصوص طور پر دینے میں متوسط اور غریب طبقہ بھی اس رسم کو ادا کرنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ امیروں کو دیکھ کر وہ لوگ بھی حوصلہ کرتے ہیں جن کے پاس کافی دولت نہیں ہے۔ سوچتے ہیں کہ دنیا کیا کہے گی کہ فلاں نے تو اتنا دیا تھا اور دوسرے نے اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں دیا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواتین خاندان کے کفیل کو مجبور کرتی ہیں کہ جس طرح بھی سوسائٹی اور سمدھیانے والوں کو مطمئن کرنا چاہیے۔ لہذا

ہ پہلے تو اپنا وہ اندوختہ نکالتا ہے جس کو اس نے جوانی کے زمانے میں بڑھا دینے کے لیے ا تھا۔ اگر اس سے بھی خواتین مطمئن نہیں نہیں تو سودی قرضے پر تان ٹوٹتی ہے۔ یہ قرضہ ا نہیں ہو پاتا کہ عید، بقرعید، محرم، چھوچھک (بچے پیدائش پر ننھیال کے تحائف) کے اخراجات شروع جاتے ہیں۔ غرض کہ لڑکی کے ماں باپ کا بڑھاپا ضے کی نذر ہو جاتا ہے۔ اور اس لامتناہی مصیبت حاصل کیا ہوتا ہے؟ جو مہمان وقتی طور پر اس پر یں طائرانہ نظر ڈال لیتے ہیں۔ ان میں شاید دو تین مد کوئی تعریفی جملہ کہہ دیتے ہیں۔ سمدھیانے والے ر لالچی نہیں ہیں تو وہ بھی اپنے چہرے بشرے سے ہار مسرت کر دیتے ہیں۔ اگر لالچی ہیں تو وہیں سے ڑے شروع ہو جاتے ہیں اور لڑکی کے لیے ایک ستقل کوفت کا سامان ہو جاتا ہے۔

قانون انسداد جہیز کی تدبیر بھی نکالی ، مگر وہ تو صرف ظاہری حالات کے لیے ہے، قلوب حکومت نہیں کر سکتا۔ لوگ چوری چھپے بھی دینے یں یعنی ان عارضی تعریفوں سے بھی محروم ہو جاتے یں، جو جہیز کی نمائش سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس لیے لڑکی والوں کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر ہم فلاں کے کو منہ مانگی دولت نہیں دیں گے تو وہ کسی دوسری کی سے شادی کرے گا اور ایک اچھا داماد ہاتھ نکل جائے گا۔ لیکن یہ کوئی نہیں سوچتا کہ وہ داماد چھا کیسے ہو سکتا ہے جو دوسروں کا خون چوس کر پنی زندگی اور تعیش کا سامان مہیا کرے، اس کی یرت مردانہ پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے اور وہ ایک خاندان کی پرورش کے قابل نہیں رہتا۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لہٰذا اس کا صرف ایک علاج ہے کہ سب خواتین اس پر متفق ہو جائیں کہ وہ کسی ایسے آدمی کو اپنی دامادی یا شوہری کے لیے قبول نہیں کریں گی جو جہیز کا مطالبہ کرے۔ بلکہ بہتر یہ ہوگا کہ شادی سے پہلے ہی دونوں طرف سے لین دین کے مسائل طے ہو جائیں۔ جہیز کے علاوہ مسلمانوں میں دوسری طرف سے مہر کا جھگڑا ہوتا ہے۔ بھری محفل میں اس کی فضیحت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کا بہترین حل یہی ہے کہ رشتے کی تجویز کے ساتھ مہر کی رقم اور اس کی شرائط بھی طے ہو جائیں اس میں لڑکی والوں کو توازن قائم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اکثر خواتین یہ سوچتی ہیں کہ ہم کو اپنی سہیلیوں کے سامنے کم مہر بتلانے میں شرم آئے گی۔ لہٰذا اس کی تعداد زیادہ ہونا چاہیے لڑکے والے یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ تو محض کاغذی کاروائی ہے۔ عملاً اس کے کوئی معنی نہیں۔ حالانکہ محض تعداد مہر سے کسی کی حیثیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ حیثیت چھپی نہیں رہتی۔ رہ گیا یہ کہ شوہر اس کو اہمیت نہ دے تو اس کے بہت برے نتیجے ہوتے ہیں۔ مہر معاہدۂ ازدواج کا جزو ہوتا ہے۔ اگر نیت ٹھیک نہیں تو نکاح میں نقص واقع ہو جاتا ہے اور اس سے آئندہ نسلیں متاثر ہوتی ہیں۔ لہٰذا اس کو بھی قابل عمل بنانا خواتین کا کام ہے۔

تیسرا مسئلہ جو خواتین کے لیے حل طلب ہے وہ یہ کہ ان کے شوہر ایک سے زیادہ شادیاں

محمد یونس قاضی

دو عظیم ہستیوں کی یادیں

تقسیم ہند کے بعد شملہ مشرقی پنجاب کی صوبائی راجدھانی بن گیا تھا- اور وہاں اب ایسے لوگوں کا رہنا سخت ناخوش گوار ہو گیا تھا جو بربریت کو بربریت ہی کہیں خواہ وہ اپنوں کی ہو یا پرایوں کی۔ ایک غیر مسلم دوست نے جو میرے حالات سے باخبر تھے مشورہ دیا کہ تبادلہ کرالوں اور اس کے لیے دہلی جا کر قدوائی صاحب (رفیع احمد قدوائی اس زمانہ کے مرکزی وزیر مواصلات) سے ملوں۔ میں ایک تو ہمیشہ کا گھر گھسنا اور بڑے لوگوں سے ملنے کے آداب سے قطعاً ناواقف۔ اوپر سے یہ ڈر کہ کہیں اس سودے میں بقول شخصے "عزتِ سادات" بھی ہاتھ سے نہ چلی جائے۔

کوئی ایک سال کے پس وپیش کے بعد ایک دن دہلی پہنچ ہی گیا- اتنی ہمت تو نہیں تھی کہ اکیلا ہی قدوائی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہو جاؤں۔ اس لیے قریب کے ٹریفک کے گول پتھر پر جا کر بیٹھ گیا تھوڑا دم لینے اور جرأت پیدا کرنے کے لیے۔ کچھ دیر بعد چار پانچ آدمیوں کا گروپ آیا اور بغیر کسی توقف و تردد کے کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ میں بھی اُن کے پیچھے پیچھے ہو لیا کوٹھی کا کمپاونڈ بہت بڑا تھا اور اُسے طے کرنے میں کافی وقت لگا- جوں ہی ہال میں داخل ہوا، جہاں ملاقاتی بٹھلائے جا رہے تھے، میری تمام ذہنی پریشانیاں کافور ہو گئیں۔ ملاقاتیوں میں مجھ سے کم درجہ کے لوگ بھی تھے پہاڑی علاقے کے ہرکارے مع اپنے بلم (گھنگرو دار) کے، بادردی ڈاکیے وغیرہ وغیرہ۔ یقین آ گیا کہ نکالے

بقیہ مضمون اجتماعی اصلاح میں خواتین کی اہمیت

کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر مرد کئی بیبیاں رکھنے اور انصاف کی شرائط کو پورا کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ حکومت نے بھی کسی حد تک اس کی روک تھام کی ہے۔ اپنے ملازمین پر پابندی لگا دی۔ مگر ایسے لوگ بہت مل جائیں گے جو چوری چھپے یہ قانون توڑ کر مذہبی قانون کی پناہ لے لیتے ہیں کہ ہم کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہیں لہٰذا یہاں بھی قانون پوری طرح کامیاب نہیں ہوتا اور خواتین کے تعاون کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اگر تمام خواتین عہد کریں کہ وہ کسی ایسے مرد سے شادی نہیں کریں گی جس کی بیوی موجود ہو تو مسئلے کا براہِ راست حل نکل آئے گا۔

غرض یہ کہ خواتین کی بیشتر مشکلات ایسی ہیں جن کا وہ خود حل نکال سکتی ہیں۔ بیرونی امداد کافی نہیں ہو سکتی۔

سالہا دل طلب جام جم از ما میکرد
آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا میکرد

نہیں جائیں گے۔

جب بیٹھی ہوئی تو میں نے عرض مدعا کیا

"تبادلہ چاہتے ہیں کہ کچھ اور بھی؟"

"صرف تبادلہ"

"کہاں کا؟"

"ہو سکے تو دہلی کا۔"

"اپنا بایوڈیٹا (Bio data) میرے پرائیویٹ سکریٹری کو دیتے جایئے۔ اس میں یہ بھی بڑھا دیجیے تاکہ کن دفتروں میں آپ کی کھپت ہو سکتی ہے؟"

گفتگو کے دوران قدوائی صاحب نے صرف ایک مرتبہ نظر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس لیے میں کچھ اندازہ نہ لگا سکا کہ ان کا رویہ ہمدردانہ ہے کہ نہیں اور آیا کام ہو جائے گا یا نہیں: پہلے سے مجھے کوئی واقفیت تھی نہیں صرف یہ سنا تھا کہ نہایت لائق ایڈمنسٹریٹر ہیں۔

ضروری کارروائی کے بعد یکایک بھوک کی شدت کا احساس ہوا اور میں نہایت تیزی سے کناٹ پلیس کے ارادہ سے باہر نکلا۔ صدر دروازے پر پہنچا ہی چاہتا تھا کہ ایک چپراسی دوڑا ہوا آیا اور راستہ روک کر کہنے لگا "صاحب کہہ رہے ہیں کہ کھانا کھا کر جایئے۔"

میں قتل و غارت اور بہیمیت کا عادی ہو چکا تھا یقین نہ آیا۔

"کسی اور کو بلایا ہوگا۔ وہ مجھ سے واقف تک نہیں ہیں۔"

"ارے صاحب، آپ ہی کو بلایا ہے۔ آپ شملہ سے آئے ہیں نا؟"

"اس ملک سے انسانیت ابھی ختم نہیں ہوئی ہے" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ اور میں بری طرح رونے لگا۔ وہ آنسو میرے نہ تھے۔ اس بدنصیب کشمیری "ہانو" (قلی) کے تھے جسے میں نے ذبح ہوتے دیکھا تھا۔ اس سفید ریش گرینڈ ہوٹل میں کام کرنے والے کے تھے جو شملہ میں پیدا ہوا تھا۔ اور جس نے شملہ سے باہر کبھی قدم نہیں رکھا تھا اور اس لیے یہ بتانے سے قاصر تھا کہ لاہور جانا چاہیے گا کہ کراچی، سونی پت کے اس ضعیف باپ کے تھے جس کی لڑکی کو اغوا کر لیا گیا تھا اور وہ اس کی بازیابی کے لیے کوشاں تھا اسپیشل ٹرین کے چلے جانے سے پہلے۔

کھانے میں سالن، دال، چاول اور روٹی تھی۔ میز سے اُٹھنے سے پہلے قدوائی صاحب نے مجھے اشارہ کیا اور اپنے سکریٹری کو بلوا کر کہا

"قاضی صاحب کو وہ والا لفافہ دے دو" اور جب وہ لفافہ آ گیا تو مجھے ہدایت دی کہ شملہ جا کر اسے پوسٹ کر دوں مگر تاریخ اور وقت پوسٹنگ بالکل صحیح درج کیجیے گا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ شملہ سے دہلی خط کتنے وقت میں پہنچتا ہے۔" اس وقت میں نے دیکھا نہیں۔ جب شملہ پہنچ کر لفافہ پر نظر ڈالی تو کسی غیر معروف انسان کا نام اور پرانی دہلی کی کسی گلی کا پتہ نکلا۔

قدوائی صاحب کو کسی نے جو ہارون الرشید کا لقب دیا تھا، وہ یوں ہی نہ تھا۔

قدوائی صاحب کے انتقال کے کئی سال بعد ایک سرکاری کام سے بنگلور جانا ہوا۔ وہاں ریاست کے چیف انجینئر کے گھر پر ایک صحبت میں کسی نے قدوائی صاحب کا ذکر چھیڑ دیا۔ میزبان نے اپنے ایک عزیز کا ذکر کیا جو کسی زمانہ میں کانگریس کے دفتر میں کلرک

ی حیثیت سے کام کر چکا تھا۔ اور آزادی سے بہت پہلے مفلوج ہو گیا تھا۔ آزادی کے بعد قدوائی صاحب کا بنگلور آنا ہوا۔ انھوں نے اس شخص کا نام لیا اور کہا کہ وہ اس سے ملنا چاہیں گے۔ چیف منسٹر نے اس کا سراغ لگوایا۔ قدوائی صاحب اس کے گھر گئے اور اس کی حالتِ زار دیکھ کر کہا: "تم نے یہ کبھی نہ لکھا کہ اس حالت میں ہو۔" ان کے دہلی جانے کے بعد ہر ماہ اس شخص کو پانچ سو روپے کا منی آرڈر آنے لگا۔ ہمارے میزبان کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ قدوائی صاحب نے ایسے شخص کی مدد کی جو اُن کے کسی کام نہیں آسکتا تھا۔ جب کہ سیاسی لوگ صرف اس کا خیال کرتے ہیں جو الیکشن میں اُن کے کام آسکے۔

قدوائی صاحب کی سوجھ بوجھ اور انتظامی صلاحیتوں کے واقعات ہزاروں ہیں۔ میں صرف ان کا ذکر کروں گا جو میرے علم میں ہیں۔ انھوں نے "All up Air Mail Scheme" نکالی۔ تاکہ ہندوستان کے پانچ بڑے شہروں کے درمیان ڈاک اگلے دن پہنچ جایا کرے۔ ٹاٹا ایرویز نے سخت مخالفت کی اور اسکیم کو ناقابلِ عمل قرار دیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کی رائے میں ہوائی کمپنیوں کو جو ڈاک لے جانے کا معاوضہ دیا جا رہا تھا وہ کم تھا۔ معاملہ کابینہ کی ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا مگر معاملہ بغیر میٹنگ کے ہی طے ہو گیا۔ ایک ڈیڑھ صفحے کا نوٹ وزارت مراسلات کی طرف سے آیا جس میں ٹاٹا ایرویز کا کچا چٹھا تھا اور سفارش کی گئی تھی کہ جتنی رعایت حکومت کی طرف سے اسے ملتی ہے اس سے کم پر حکومت خود اپنی ایک کمپنی چلا سکتی ہے۔ وزارت سے ٹاٹا والوں نے معافی مانگی اور اس کا باقاعدہ اخبارات میں اعلان۔

بحیثیت وزیر غذا قدوائی صاحب کنٹرول کے خلاف تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کنٹرول خود قلت کا باعث بن جائے گا۔ کابینہ کو ان کی رائے سے اتفاق نہ تھا۔ بلا ٹالنے کے لیے معاملہ کمیشن کے سپرد کر دیا گیا۔ مگر کسی کی ہمت نہ تھی کہ قدوائی صاحب سے ٹکرے۔ دہلی کے ایک پروفیسر کو جو بے باکی اور زبان درازی میں ثانی نہ رکھتے تھے پس پردہ تیار کیا گیا۔ جب میٹنگ ہوئی تو پروفیسر صاحب نے دھواں دھار تقریر کی اور کنٹرول ہٹا لینے کے خطرات سے آگاہ کیا۔ قدوائی صاحب نے صرف دو باتیں کہیں " پلاننگ کمیشن صرف دس آدمی ایسے دیدے جو کنٹرول کو ایمانداری سے چلا سکیں۔ رہا غریب آدمی کے مفاد کا سوال، اس کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اسے بھوکا مرنے نہیں دیا جائے گا۔" اسی شام کو خبر آئی کہ مدراس کے چیف منسٹر نے شہر مدراس سے کنٹرول ہٹا لیا ہے۔ قدوائی صاحب نے پس پردہ تمام انتظامات مکمل کر لیے تھے۔ لہٰذا حالات قابو میں رہے۔ قدوائی صاحب کی کامیابی کے وجوہات مختلف لوگوں نے مختلف بیان کیے ہیں۔ میرا اپنا تجربہ یہ ہے کہ وہ عوام کے بہت قریب تھے۔ اس لیے انھیں حقیقت کا پتا رہتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ گورنمنٹ کی مشین کے قیدی نہ تھے بلکہ ان پر حاوی تھے۔ فائلوں سے انھیں چڑ تھی اور وہ زبانی حکم صادر کرتے تھے۔ اور روز مرّہ کے کام کی رپورٹ سینیئر افسران سے زبانی ہی سنتے تھے۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ انھیں غلط رپورٹ دے۔

دہلی آ جانے کے بعد مجھے اجمل خاں
صاحب کی ہمسائیگی کا فخر حاصل ہوا۔ وہ مولانا آزاد
کے پرائیویٹ سکریٹری تھے اور برسوں سے ان کے
معاون۔ مولانا کے وہ بہت قریب تھے اور ان کی
بے لوث خدمت کرتے تھے۔ مولانا کے یہاں سے ان
کے اور ان کے بچوں کے لیے اکثر تحفے تحائف آیا کرتے
مگر ایک بات میرے لیے بڑے اچنبھے کی تھی۔ وہ دفتر
پیدل ہی آتے جاتے۔ حالاں کہ وہ دیر سے کام سے واپس
آتے۔ اور کبھی کبھار تو رات کے بارہ بجے۔ یہ صحیح ہے
کہ آزادی کے اس ابتدائی دور میں سرکاری گاڑی
کا استعمال اتنا عام نہ تھا جتنا کہ اب ہے۔ مگر وزرا
کے پرسنل اسٹاف کو اجازت تھی اسٹاف کار سے
سے آنے جانے کی۔

ایک دن اجمل خاں صاحب نے بتایا
کہ مولانا نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ مجھے خوشی سے زیادہ
حیرت ہوئی۔ مولانا طبعاً تنہائی پسند تھے اور اپنی
مقبولیت کی کوئی تمنا نہ تھی۔ جو عام طور سے تمام سیاسی
لیڈران میں ہوتی ہے۔ کانگریس میں بھی ان کے تعلقات
صرف مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، سی۔ آر۔ داس
آصف علی اور بولا بھائی ڈیسائی تھے۔ چند علمی
لوگوں سے جو مثلاً حبیب الرحمن خاں شیروانی ہے سے
بھی ان کے قریبی مراسم تھے۔ میں نے اجمل خاں صاحب
سے بار بار کرید کر پوچھا کہ کس سلسلہ میں میری طلبی
ہوئی ہے۔ مگر انھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور
صرف اتنا کہا کہ ایک بار کسی موقع پر میرا تذکرہ ہوا تھا۔
میرے کچھ بزرگ اور میرے
دو بھائی مولانا کے بہت قائل تھے۔ اور ان سے
میں نے مولانا کے علم و فضل اور خودداری کے واقعات
سنے تھے۔ انھیں کے طفیل میں نے الہلال کی پرانی
کاپیاں دیکھی تھیں اور مولانا کی مشہور تصنیف ترجمان
القرآن بھی۔ اس لیے مجھے بھی مولانا سے بڑی عقیدت تھی
اور میں ان کے سیاسی موقف کو سولہ آنے صحیح سمجھتا تھا
میرے نزدیک یہ مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی تھی کہ جذبات
میں آ کر انھوں نے غلط لوگوں کی قیادت قبول کر لی

مقررہ تاریخ اور وقت پر میں مولانا
کے دولت خانہ پر حاضر ہو گیا۔ اجمل خاں صاحب نے
مشایعت کی۔ ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی تھے کہ مولانا
تشریف لے آئے۔ بیٹھتے ہی وہ خاں صاحب سے مخاطب
ہوئے اور کہا: خاں صاحب آپ کو تکلیف کرنے کی
ضرورت نہیں ہے۔ میں ششدر رہ گیا۔ خاں صاحب
سے اتنے دیرینہ تعلقات۔ پھر یہ کہ ان ہی کے ذریعہ تو
میرے وجود کا علم ہوا۔ پھر یہ کہ پرائیویٹ سکریٹری سے
تو کوئی بات راز نہیں رکھی جاتی۔ میں حکومت میں کام کرتا
تھا اور مجھے خوب معلوم تھا کہ وزیر کا پرسنل اسٹاف
بہت منھ چڑھا ہوتا ہے۔

خاں صاحب کو رخصت کر کے مولانا میری
طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ کابینہ کے دفتر میں کام کرتے ہیں؟"

"جی ہاں"

"ذرا یہ بتلائیے کہ آپ کے دفتروں کے کاغذات
کس طرح ٹائپ اور اسٹینسل (stencil) ہوتے ہیں
اور فائل کیسے گھومتے ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہماری
راز کی باتیں اخبارات میں آ جاتی ہیں۔"

میں نے مولانا کے تمام سوالات کے مناسب

جوابات دیے۔ دوران گفتگو میں چائے آئی۔ ملازم نہایت تربیت یافتہ تھا۔ اس کے آنے کی کوئی آہٹ نہیں ہوئی اور اس کی موجودگی کا علم مجھے اس وقت ہوا جب اُس نے چائے کی ٹرے مولانا کے سامنے لا رکھی۔ چائے پہلے سے تیار نہ تھی۔ مولانا نے چائے کی پتی کیتلی میں ڈالی اور خود دو پیالی چائے انڈیلی۔ ملازم ٹرے رکھ کر چلا گیا تھا اور فرائض میزبانی خود مولانا نے انجام دیے۔

جب گفتگو ختم ہوگئی تو مولانا اُٹھنے لگے۔ مجھے یکایک یہ احساس ہوا کہ یہ موقع دوبارہ نہ ملے گا۔ اس سے کچھ فائدہ اُٹھالو۔

مجھے یہ شرف دوبارہ تو حاصل نہ ہو، میرے ذہن میں کچھ سوالات تھے اجازت ہو تو........"

کوئی چوتھائی سیکنڈ کے لیے مولانا کچھ ٹھٹکے پھر نہایت شفقت سے بولے "پوچھیے"۔

"جب بھی کسی انقلاب کے بعد ایک نئی حکومت آتی ہے تو نوکر شاہی کو برخواست کر دیتی ہے اور اپنے مطالب کی سول سروس ٹرین کرتی ہے۔ انگریزوں کا چھوڑا ہوا انتظام اسی طرح قائم ہے۔"

میں سمجھ رہا تھا کہ مولانا تجاہل عارفانہ سے کام لیں گے اور چلتا ہوا سا جواب دے دیں گے۔ مگر جو جواب انھوں نے دیا وہ میری توقعات سے اس قدر بلند اور صادق تھا کہ دل ہی دل میں میں نے کہا زہی آواز مکے اور مدینہ" جواب یہ تھا

بھائی میرے چاہیے یہ سمجھو کہ ہم بڈھے ہوگئے یا یہ سمجھو کہ ہمیں اپنے اوپر اعتماد نہیں رہا۔ اس وقت کانگریس ہائی کمانڈ یہ محسوس کرتی ہے کہ اگر ایک اینٹ ہٹائی تو پورا ... نہ آن گرے گا"

دوسرا سوال یہ تھا

"آپ کی رائے میں تقسیم محض مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے صحیح ہوئی کہ غلط؟

"بھائی میرے، ۲۰ جون ۱۹۴۷ء کو مسلمانوں کی جو ساکھ اس برِ اعظم صغیر میں تھی وہ ختم ہوگئی اور تجربہ نے یہ بتایا کہ ساکھ ہی ساکھ تھی اور کچھ نہ تھا۔ میں نے یہ چاہا کہ وہاں تو ایک نقشہ بن ہی گیا یہاں کا بھی بنا رہے۔ مسٹر جناح اور لیاقت علی خاں کو پیغامات بھجوائے سب مسلم ملازمین کو مت لے جاؤ۔ مگر مجھ سے کہا گیا کہ کس منہ سے روکیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کم از کم فوج اور پولیس تقسیم نہ ہو مگر کامیابی نہ ہوئی۔

پاکستان بن گیا اور اس کی مخالفت کرنا اب بے سود ہے۔ اگر پاکستان کے لوگوں میں عقل ہے تو انھیں چاہیے کہ ایک نہایت مضبوط معاشی بنیاد ڈالیں۔ اسی میں بقا ہے۔"

مولانا کا ہر لفظ میرے دل و دماغ پر کندہ ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے تاریخ پکار پکار کر کہتی ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا وہ بالکل صحیح تھا۔ آئندہ نسلوں کے سامنے یہ سوال بار بار اُٹھے گا کہ تقسیم کے بُرے نتائج کا ازالہ کیا ہو؟ جس منطق پر تقسیم ہوئی اس کو خود مسٹر جناح نے ۱۴ اگست ۴۷ء والی تقریر میں جو انھوں نے گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے کی ان الفاظ میں رد کر دیا۔ "آج سے نہ مسلمان مسلمان ہے نہ ہندو ہندو........ ہم سب پاکستانی ہیں"۔ بہ دیگر الفاظ انھوں نے مولانا آزاد کے موقف کی تصدیق کر دی

[illegible]

بقیہ مضمون "دو برگزیدہ ہستیوں کی یادیں" صفحہ ۲۴

پر مبنی نہیں بلکہ اقتصادیات پر مبنی ہوں گی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اپنے آخری ایام میں مولانا کو اپنے سیاسی رفقائے کار سے شدید اختلاف ہو چلے تھے۔ اور اکثر اہم معاملات میں اُن کا نفی کا ووٹ ہوتا تھا۔ انتقال بھی ناخوش گواری کی حالت میں ہوا۔ مسئلہ زیرِ بحث یہ تھا کہ ایسے ایک وزیر رہنے دیا جائے جس کی دیانت کے متعلق عام پبلک میں شبہات ہو چلے ہوں؟ مولانا اکیلے ایک طرف تھے اور اُن کے تمام ساتھی دوسری طرف۔ رات کے بارہ ایک بجے تک بحث چلتی رہی اور بالآخر بادلِ ناخواستہ اکثریت نے ان کی رائے مان لی۔ میٹنگ سے واپسی پر مولانا کو دورہ پڑا اور مختصر علالت کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ دورانِ علالت ایک بار انھیں ہوش آیا اور جب انھوں نے وہ تمام آلات دیکھے جو اُن کی بازیابیِ صحت کے لیے استعمال کیے جا رہے تھے تو صرف اتنا کہا "اللہ پر چھوڑو"

ختم کرنے سے پہلے مولانا کے تدبّر کا ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ مولانا پنجاب کی سیاست دیکھا کرتے تھے ان کے رفقاء کو یہ شکایت ہوئی کہ مولانا ماسٹر تارا سنگھ اور ان کے ایجی ٹیشن سے نرمی کا برتاؤ کر رہے ہیں۔ جب یہ خبر مولانا کو ملی تو انھوں نے وزیرِ اعظم سے درخواست کی کہ اب پنجاب کے معاملات کوئی اور دیکھے۔ ایک ہی ہفتہ [illegible] ہو گئی کہ یا تو حکومت ہتھیار ڈال دے یا پھر [illegible] نہرو پنجاب کا فائل مولانا کو واپس کرنے آئے۔ فائل کو دیکھ کر مولانا نے مسکرا کر کہا۔ یہ فائل تو جانا پہچانا ہے۔ نہرو خاموش رہے چلتے وقت پوچھا: مولانا آپ کیا کیجیے گا۔ مولانا کا جواب یہ تھا "بھائی میرے، اس فائل پر باسی پانی کا ایک چھینٹا مارونگا اور اس میں جان آجائے گی۔

اگلی صبح تمام اخبارات نے جلی الفاظ میں یہ خبر شائع کی کہ ماسٹر تارا سنگھ نے ایجی ٹیشن واپس لے لیا مولانا نے انھیں اپنے یہاں رات کی خاموشی میں بلوایا انھیں قائل معقول کر دیا۔ فائل میں پھر سے واقعی میں جان آ گئی۔

بقیہ مضمون "سرسید کی وفات کی دو الہامی تاریخیں"

کی روشنی میں دیکھیے تو سرسید کی وفات کے موقع پر یہ دونوں تاریخیں نہ صرف الہامی ہیں بلکہ بہترین معنی خیز اور موزوں بھی۔ ساتھ ہی ساتھ سرسید جیسی عظیم ہستی کے لیے احترام و عقیدت کی روشنی کی دلیل۔

معذرت

ہم معذرت خواہ ہیں کہ ۱۶ ارمئی ۸۲ء کے تہذیب الاخلاق میں شائع مضمون "سائنس اور ادب" از اندرجیت لال کے بارے میں وضاحت نہ کرسکے۔ یہ مضمون ہم نے قومی آواز لکھنؤ سے لیا ہے۔

[ادارہ]

محمد شاغل

میری نظر میں ہندوستانی مسلمان

اکثریت کا مسئلہ ہیں

۱۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسئلے کو جب دیکھیے تب اقلیت کا مسئلہ سمجھا جاتا رہا ہے۔ میرے خیال میں صرف جزوی طور پر یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن بنیادی طور پر یہ اکثریت کا مسئلہ ہے۔

۲۔ ہندوستان میں مسلمان اعداد و شمار کے لحاظ سے ۵، ملین ہیں جو دنیا کے کسی بھی آزاد ملک میں پائے جانے والی۔ سب سے بڑی جماعت کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر آتے ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کی تعداد پاکستان یا ہندوستان کی مغربی سمت کے کسی عربی مسلم ملک سے زیادہ ہے۔ ہندوستان کی مشرقی سمت میں بے شک انڈونیشیا اور بنگلہ دیش میں یہاں کی بہ نسبت مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔

۳۔ ہندوستانی مسلمان ایک غیر مسلم ملک میں مسلمانوں کی سب سے بڑی اکثریت ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان کی ایک اقلیتی جماعت ہیں جو یہاں کی آبادی کا ۱۲-۱۳ فی صد پر مشتمل ہے۔ مسلمان ہر ریاست میں اقلیت کے اندر ہیں سوائے جموں و کشمیر کے۔ آزادی سے پہلے یعنی غیر منقسم ہندوستان میں یہ لوگ کشمیر، پنجاب سندھ اور بنگال کے صوبوں میں اکثریت میں تھے۔ آزادی کے بعد یہ لوگ صرف جموں و کشمیر میں اکثریت میں ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آزادی کے بعد سے ان کا تناسب ہندوستانی ریاستوں میں بشمول جموں و کشمیر گھٹتا جا رہا ہے۔

۴۔ ان کے مذہب کی مقدس کتابیں عربی میں ہیں ان کی مادری زبان زیادہ تر اس ریاست ہی کی مقامی زبان ہے جس سے ان کا تعلق ہے۔ شمالی ریاستوں میں کم و بیش اردو ان کی مادری زبان ہے۔ سب ہی ہندوستانی ریاستوں کے مسلمانوں میں اردو کی فی الواقع ایک خاص حیثیت ہے۔ اردو کا رسم الخط فارسی ہے جو مغلوں کی درباری زبان تھی۔ درحقیقت اردو (اور کسی حد تک فارسی) کی شمالی ہند اور جنوبی ہند (دکن) کے حصوں میں رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں میں نہ صرف مغل دور میں بلکہ برطانوی عہد حکومت میں بھی لسانی حیثیت سے ایک امتیازی شان رہی ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد (آندھرا پردیش) میں اردو تعلیم کا ذریعہ رہی ہے۔ پوسٹ گریجویٹ کے درجے تک آرٹس اور سائنس کے تمام مضامین متعلقہ فیکلٹیوں میں اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ ہر ذات پات کے طلبہ ان کلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔

۵۔ آزادی کے بعد اردو کی امتیازی حیثیت میں کمی آگئی لیکن اردو کی شاعری، غزلوں اور گیتوں کی مقبولیت نے اردو کی آن بان کو قائم رکھا یہ بات ان منتخب افراد اور عوام دونوں ہی کے لیے

طور پر کہی جاسکتی ہے جو ہندی فلموں کی سرپرستی
ے ہیں۔ حالاں کہ ہندی فلم اردو کے لفظوں محاوروں
کانوں سے بھرپور ہوتی ہیں۔ اور دیانت داری
انھیں کسی طرح بھی ہندی فلموں میں شمار نہیں کیا
سکتا۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اردو فلم کا نام
ں دیا جاسکتا۔ بلکہ بڑے محتاط طریقہ پر اس کے نام کو
انداز کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہندی کے کٹر حامی
ں ہندوستانی فلم بھی قرار دینے کو تیار نہیں۔ یہ بات
روشن کی طرح عیاں ہے کہ اردو کے بہت سے
ہور و معروف شاعر اور ادیب ماضی اور حال
غیر مسلم حضرات رہے ہیں۔ مثال کے طور پر چند
ِ ذکر نام یہ ہیں۔

برج نرائن چکبست، درگا سہائے سرور،
ی پریم چند، کشن چند، گوپی ناتھ امن، آنند نرائن
، راجندر سنگھ بیدی، رتن ناتھ سرشار اور رگھوپتی
ئے فراق گورکھپوری۔ آریہ سماج کا بہت سا
پر جرائد و رسائل اور کتابوں کی صورت میں اردو
ہے۔ پارلیمنٹ کے بہت سے ممبران اپنے معروضات
یادہ واضح کرنے کے لیے کسی خاص نکتہ پر زور
ینے کے لیے یا کسی بحث میں کامیابی حاصل کرنے کے
ی تقریر کو اردو کے ایسے برمحل اور برجستہ مقولوں
آراستہ کرتے ہیں جو اسلوب اور فکر کے لحاظ
عنی خیز اور تہ دار ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر
، وطن کے جذبات کے لحاظ سے عدیم النظیر، حسن و
ری اور روانی میں اقبال کا قومی ترانہ لاجواب
ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

۶۔ اردو بنیادی طور پر ایک ہندوستانی زبان ہے۔ اس کی پیدائش کی جگہ ہندوستان ہے۔ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کے مخصوص حالات و کوائف میں اس کا ارتقا ہوا۔ اور یہ مشترک زبان کی حیثیت اختیار کرتی چلی گئی۔ فوج کی بارکوں سے نکل کر یہ بازاروں میں پھیلی اور اہلِ علم کی کاوشوں سے مالا مال ہو کر یہ درباروں اور شریف و مہذب طبقے کے لوگوں میں بلا امتیاز مذہب پسند کی گئی اور بہت جلد ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی مستقل اور مشترک زبان بن گئی۔ اس کی فرہنگ بہت سی زبانوں سے ماخوذ ہے۔ ہندی، فارسی، عربی، ترکی سنسکرت، مراٹھی، گجراتی اور یہاں تک کہ پرتگالی، ہسپانوی، فرانسیسی اور انگریزی۔ اس کو اردو کہا گیا [فوج کی بارکوں کی ملی جلی زبان] اس کی ابتدا کے لحاظ سے اسے ہندوستانی بھی کہا جاسکتا ہے [ہندوستانی عوام کی روزمرہ کی زبان]

۷۔ ہندوستانی موسیقی بھی عہدِ وسطیٰ میں دو تہذیبوں کے تال میل کی ایک دوسری مثال ہے۔ ہندوستانی روایتی موسیقی خواہ وہ گلوکاری سے متعلق ہو یا سازوں سے متعلق ہو، یا رقص کی جملہ اقسام ہوں، ان سب پر مسلمانوں کی گہری چھاپ ہے۔ موسیقی اور رقص کے جتنے بھی مشہور و مقبول آہنگ اور اشکال ہیں وہ اتنے ہی مسلمانوں کے ہیں جتنے کہ ہندوؤں کے۔ اور ہندوستانی موسیقی کے غیر معمولی فنکاروں کی بہت بڑی تعداد مسلم جماعت سے تعلق رکھتی ہے۔ عہدِ وسطیٰ کا مغل فنِ تعمیر و عمارت سازی [بھی ایک مجسم شہادت ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں فنی کمالات کے آمیزش کی۔

اپنی مادری زبان یا مادر وطن کے لیے جذباتی ہو جانا ایک فطری بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمان اور بہت سے غیر مسلم حضرات اردو کے حال و مستقبل کے لیے فکر مند ہیں۔ آزادی سے پہلے اردو کی جو حیثیت تھی اسے آہستہ آہستہ ختم کیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ آزادی سے پہلے ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ اور گریجویٹ کلاسوں کے امتحانات میں مادری زبان ایک لازمی مضمون کی حیثیت رکھتی تھی یہ مادری زبان خواہ ہندی ہو یا اردو یا بنگالی مراٹھی، گجراتی، اڑیا، تیلگو، تامل، یا انگریزی وغیرہ۔ مادری زبان کے علاوہ کلاسیکی زبانوں سنسکرت، فارسی، عربی یا لاطینی میں سے کوئی ایک زبان بھی لازمی مضمون کی حیثیت رکھتی تھی۔ انگریزی بہر حال سب کے لیے لازمی تھی۔ اس طرح سہ لسانی فارمولا رائج تھا۔ تعلیمی اور تہذیبی پس منظر میں اس سے بہتر اور کیا طریق کار ہو سکتا ہے۔ آزادی کے بعد ملک کی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے اس فارمولے پر عمل نہیں کیا گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ہندی اور اردو کی آسان شکل ہندوستانی زبان کو جو ہندوستان کی گلی گلی میں بولی اور سمجھی جاتی ہے رومن رسم الخط میں لکھنا شروع کر دیا جاتا اور رومن رسم الخط کی وجہ سے ہندوستانی بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لیتی۔ مگر ہندی کے استعمال پسند کٹر حامیوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ اور ہندی کو نامناسب طریقہ سے لوگوں پر تھوپنا شروع کر دیا۔

ہندوستان کی معروف زبانوں میں انگریزی ہی اس قابل تھی کہ اسے آزاد ہندوستان کی دفتری زبان قرار دیا جاتا۔ کیوں کہ آزادی سے قبل ہندوستان میں یہ ایک مکمل زبان کی حیثیت سے استعمال کی جاتی رہی اور بعد میں بھی انگریزی ہی رابطہ کا عملی ذریعہ رہی آج بھی لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں انگریزی سیکھ رہے ہیں اور امید ہے کہ ان کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جائے گی۔ ہندوستان میں آج بھی کسی ہندوستانی زبان کے مقابلے میں انگریزی میں زیادہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ جو فائدے ہم انگریزی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ وہ ہندوستان کی کسی زبان سے نہیں۔ یہی زبان ہمیں جدید سائنس اور ٹیکنالوجی سے متعلق روز افزوں معلومات فراہم کر سکتی ہے اور جدید سیاسی سماجی اور معاشی علوم کے خزانوں کی طرف رہنمائی کر سکتی ہے۔ یہ دنیا کی مسلّمہ تجارتی زبان ہونے کے علاوہ وسیع پیمانے پر دنیا کے ممالک کے سفارتی روابط کی بنیاد ہے انگریزی کو چھوڑ دینا سب سے بڑی بدقسمتی ہوگی۔

جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے وہ ہندی کو قومی زبان کی حیثیت سے اختیار کرنے کے لیے بلا تامل تیار ہیں لیکن وہ اردو کو کسی حال میں ترک کرنے کے لیے آمادہ نہیں اور اس کے خلاف کسی طرح کا علانیہ یا خفیہ تعصب بھی برداشت نہیں کر سکتے اردو مدت دراز تک عدالتی زبان رہنے کی وجہ سے قانونی اصطلاحات میں دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ مالا مال ہے۔ عدالتوں میں اس کا استعمال ترک کرنا تعصب کی کھلی ہوئی مثال ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ہندی اور انگریزی کے علاوہ مقامی زبانوں کو بھی دفتری حیثیت حاصل ہونی چاہیے تاکہ عوام و خواص کو آسانیاں فراہم ہو سکیں۔ چند لوگوں

باقی صفحہ ۱۱ پر دیکھیے

سرسید کی چند اہم تجاویز

فرخ جلالی
شعبۂ تاریخ

نظر، ذوق اور ایثار کا اجتماع کم ہوتا ہے لیکن سرسید کی ذات میں یہ سب خوبیاں جمع ہو گئیں تھیں یہ وہ خوبیاں ہیں جو کسی قومی رہبر میں جمع ہو جائیں تو اس قوم کے بڑھنے اور ترقی کرنے کے امکانات ہمیشہ روشن رہتے ہیں۔

سرسید نے اجتماعی ترقی کا اہم ترین کام سائنٹفک سوسائٹی کے پلیٹ فارم سے ۱۸۶۴ء میں شروع کیا۔ اس میں کچھ کامیابی اور بیشتر ناکامی ہوئی۔ سرسید مایوس نہیں ہوئے۔

۱۸۷۰ء سے ایک اور تعلیم اور اجتماعی ترقی کا کام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام کے لیے شروع کیا۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا افتتاح ہوا۔ سرسید نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں تعلیم کے دروازے سب قوموں کے لیے کھول دیے تھے۔

۱۸۸۲ء کے ہنٹر تعلیمی کمیشن کے سامنے سرسید کی خصوصی یادداشت نظر، ذوق، بصیرت اور ایثار قومی کی بہترین مظہر ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب یو۔پی کے بعض اضلاع سے طالب علم کا ملنا بھی مشکل ترین کام تھا۔ سرسید نے ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو علی گڑھ میں قومی تعلیم کے سلسلہ میں ایک بڑا جلسہ کیا۔ اس اجتماع کا نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس رکھا گیا۔ پہلے اجلاس کی صدارت مولوی سمیع اللہ خاں کے سپرد تھی۔

سرسید کی زندگی میں اس کانفرنس کے گیارہ اجلاس ہندوستان کے مختلف مقامات پر ہوئے ٹھہرے ہوئے پانی میں موجیں اٹھیں۔ سوتے ہوئے کچھ کلبلائے، بے خبروں نے کچھ سوچنا شروع کیا۔ ان مجالس میں سرسید، ان کے رفیقوں، دوستوں اور شناساؤں نے کچھ تجاویز رکھیں۔ یہ تجاویز اس دور کے بےچین اور مضطرب ذہن اور ذکاوت کے بہترین مرقعے ہیں۔ ان تجاویز میں درد قومی سمٹ کر اور احساس ترقی و تعلیم بن کر سامنے آگیا تھا۔

اس سلسلہ میں سرسید کی چند تجاویز کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ یہ تجاویز آج بھی قابلِ عمل اور غور و فکر کی طالب ہیں۔

موجودہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اصل نام محمڈن ایجوکیشنل کانگریس رکھا گیا تھا۔

سرسید کی طرف سے پہلی تجویز یہ تھی:

"مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیمی تنزل کا لحاظ کر کے اور اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی تعلیم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے جو

محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" کے نام سے
موسوم ہو یہ جلسہ کسی خاص مقام پر مخصوص
نہ ہوگا۔ بلکہ ہر سال کسی ایسے مقام میں
جہاں کے لوگ اس جلسہ کے منعقد ہونے
کی خواہش کریں گے اور اس کا انتظام
فرماویں منعقد ہوا کرے گا۔"

سرسید کے اس رزولیشن کی تائید محمڈن
اورینٹل کالج کے سابق طالب علم محمد رفیق بار ایٹ لا
نے کی۔ اور اس موقع پر سرسید نے جو تقریر کی،
وہ اُن کی شاہکار تقریروں میں سے ہے۔ سرسید
نے اس تقریر میں ایک جگہ کہا

"....آپس میں ملنے سے اور مختلف
امور پر جو قومی تعلیم اور قومی ترقی سے
علاقہ رکھتے ہیں، بحث و مباحثہ یا تذکرہ
و مذاکرہ کرنے سے ضرور ہے کہ کوئی
عمدہ راہ قومی ترقی اور قومی تعلیم کی
بات آوے۔"

[مرقع کانفرنس مرتبہ انوار احمد صفحہ ۴]

۱۸۹۳ء میں کانفرنس علی گڑھ میں منعقد ہوئی
اس جلسہ کی صدارت سید مہدی علی محسن الملک نے
کی۔ اس موقع پر سرسید کے عزیز پوتے سید راس
مسعود کی رسم بسم اللہ خوانی ہوئی اور سرسید نے
اس کی خوشی میں پانچ سو روپیہ کالج کی نذر کیے۔
اس کانفرنس میں سرسید نے ایک اہم
تجویز پیش کی جس کی تائید کانفرنس کے صدر محسن
الملک نے کی۔ وہ تجویز یہ ہے۔

" اس کانفرنس کی یہ رائے ہے
کہ درباب ترقی تعلیم و تربیت مسلمانان
کے جو کچھ اب تک ہو چکا ہے وہ محض ناکافی
ہے اگر یہی حالت رہی تو صدیوں کے
گزرنے پر بھی تبدیلی حالت کی توقع
نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ اعلیٰ سے
اعلیٰ درجۂ تعلیم کا اور اس سے بھی زیادہ
تربیت کا جمہور ہی متفقہ کوشش سے
انتظام کر کے نہ کیا جاوے۔ اگر اس
طرح نہ کیا جاوے گا تو کانفرنس کی
رائے میں ترقی تعلیم اور ترقی حالات
مسلمانان سے بالکل مایوسی ہے۔"

سرسید کی زندگی میں کانفرنس کا
آخری اور گیارہواں اجلاس میرٹھ میں ۱۸۹۶ء میں
ہوا۔ سرسید کے عزیز دوست نواب عماد الملک
اس جلسہ کے صدر تھے۔ جن کی بابت سرسید نے
ایک موقع پر کہا تھا کہ میں علی گڑھ کالج سے ایسے
طالب علم پیدا کرنا چاہتا ہوں جیسے عماد الملک ہیں
میرٹھ میں سرسید نے دو تجاویز پیش
کیں جس میں سے ایک یہ تھی کہ مسلم طلبا کو اضلاع سے
وظائف دیے جائیں جس کی آج بھی ضرورت ہے

" اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ
جس جس ضلع میں لوکل اسٹینڈنگ کمیٹیاں
قائم ہوتی جائیں ان سے درخواست کی
جائے کہ اپنے ضلع سے دس روپیہ
ماہوار کا چندہ جس طرح ہو سکے ایک
مسلمان طالب علم کی اسکالرشپ کے
لیے جو کسی کالج کلاسوں میں پڑھتا ہو

ضرورت ہے پھر ایک سرسیّد کی

ڈاکٹر فوق کریمی
علی گڑھ

"قافلہ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں"

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ہندوستانی مسلمانوں پر جو مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے، وہ اَن گنت حیثیت رکھتے تھے۔ ایک طرف انگریز جو مسلمانوں کی ناعاقبت اندیشی کی بنا پر اس ملک کے حاکم بن گئے تھے وہ مسلمانوں کے سخت دشمن تھے۔ ان کا خیال تھا کہ غدر کے بانی صرف مسلمان ہیں۔ اس خیال کے مطابق حکومت مسلمانوں کی جانی دشمن تھی اور حکمراں طبقہ بڑی سفاکی سے دل کھول کر ۱۸۵۷ء کا بدلہ مسلمانوں کو تختۂ دار پر چڑھا کر دے رہا تھا۔

دوسری طرف مسلمانوں کی اقتصادی حالت اس قدر خراب تھی کہ دہلی اور اس کے مضافات میں لاکھوں مسلمان نان شبینہ کو محتاج تھے۔ ان کی اس اقتصادی بدحالی سے عیسائی مشنریز نے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسیحی مذہب کی تبلیغ شروع کردی اور اس کے ساتھ ساتھ ہندو اور مسلمانوں کی مالی امداد بھی کرتیں اور ان کو عیسائی مذہب قبول کرنے کی دعوت دی جاتی۔ دلی کالج کے دیوان چمن لال اور مولوی کریم الدین مصنف واقعات ہند کے بھائی عماد الدین نے بھی عیسائی مذہب قبول کرلیا

مسلمانوں کے مقابلہ میں برادران وطن نہ صرف خوش حال تھے بلکہ وہ تعلیم اور جدید علوم کو ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی لڑائی کے بعد اپنا چکے تھے۔ اس اعتبار سے مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے کافی بچھڑے ہوئے تھے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے اثرات شمالی ہند میں عرصہ تک رہے۔ جس کی وجہ سے شمال کے مسلمان مسلسل حکومت کی انتقامی آگ میں جلتے رہے اور اس وقت دور دور تک ہندو اور مسلمانوں میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو مسلمانوں کو حکومت کے

بقیہ مضمون "سرسیّد کی چند اہم تجاویز"

یا پڑھنا چاہتے اور ذہین اور لائق اور قابل امداد ہو وصول کرسکیں اور جن کے لڑکے ہیں وہ پڑھنا چاہتے ہیں اور لوکل اسٹینڈنگ کمیٹی اس بات پر غور کرتی رہے کہ وہ محنت اور کامیابی اپنی تعلیم میں صرف کرتے یا نہیں۔

اس تجویز کی تائید سید علی اوسط بار ایٹ لاء نے کی جو کالج کے نامور طالب علم رہ چکے تھے۔ میں نے آج مرحوم کی چند تجاویز کی طرف توجہ دلائی۔ قومی ترقی اور تعلیم کے جلسے بہت کم ہو چکے ہیں۔ ضرورت ان تجاویز کو تابندہ اور ان جلسوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے۔

انتقامی جذبہ سے بچاتا۔ ایسے مایوس کن حالات میں اللہ نے ایک مرد مجاہد کو پیدا کر دیا جس کو آج بڑے ادب و احترام کے ساتھ سرسید کہا جاتا ہے۔

سرسید کا جب نام آتا ہے تو ان کے نام کے ساتھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ سرسید نے مسلمانوں کے لیے علی گڑھ میں ایم اے او کالج جو آج مسلم یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا، قائم کیا۔

اس میں شک نہیں کہ سید احمد خاں نے مسلمانوں کو جدید علوم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج برصغیر میں لاکھوں مسلمان جدید علوم سے آشنا ہیں۔ سرسید کا ایک دوسرا عظیم الشان کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد جو مصیبت مسلمانوں پر پڑی، نہ صرف اس کو محسوس کیا بلکہ اس کو دور بھی کیا ایسے نامساعد حالات میں مسلمانوں کی رہنمائی اور دستگیری کی جب کہ کوئی شخص کلمۂ حق زبان پر نہیں لا سکتا تھا۔ اس مرد مجاہد نے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر غدر کے حالات ایک کتابی شکل میں اسباب بغاوت ہند کے نام سے لکھے اور حکمراں طبقہ کو بتایا کہ ۱۸۵۷ء کے بانی مسلمان اور ہندو نہیں ہیں بلکہ حکمراں طبقہ کا وہ امتیازی سلوک ہے جس نے انگریزوں کے مقابلہ ہندوستانیوں کو کمتر سمجھا۔ دوسرے ہندوستانیوں کے عقائد اور مذہب میں براہ راست مداخلت شروع کی جس کی وجہ سے ہنگامہ ہوا۔ سرسید نے صاف صاف حکومت کے ذمہ داروں کو بتایا کہ حکومت نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ غدر کے بعد ہندوستانیوں اور بالخصوص مسلمانوں پر کیا گزری۔ اس لیے مسلمان جو صدیوں اس ملک پر حاکم رہے وہ آج محکوم بھی ہیں اور مجبور بھی۔ سرسید نے بلا کسی جھجک مصلحت و سیاست کے مسلمانوں کے مسائل حکومت کے سامنے رکھے اور بالآخر حکومت کو ان پر سوچنا پڑ گیا۔ خدا خدا کر کے ۱۸۵۷ء کی انتقامی آگ کے شعلے ارباب حکومت کے ذہنوں سے ۱۸۶۷ء میں جا کر سرد پڑے۔

دوسرے سرسید نے اسباب بغاوت ہند میں انگریزوں کو یہ توجہ بھی دلائی کہ عیسائی مشنریز اس ملک میں ہندو اور مسلمانوں کے مذاہب کے مقابلہ میں عیسائی مذہب کو ترجیح دے رہی ہے اور اپنے مذہب کی جا بجا تبلیغ کر رہی ہیں۔ یہ بات ہندوستانیوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔ حکومت نے سرسید کی اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے پادریوں کو عیسائی مذہب کی تبلیغ سے روک دیا۔

سرسید نے جب دو مورچوں پر کامیابی حاصل کر لی تو بدقسمتی سے انھیں ۱۸۶۷ء میں ایک ایسے عظیم ذہنی سانحہ سے گزرنا پڑا جب برادران وطن کے کچھ فرقہ پرست عناصر نے بنارس میں اردو کی مخالفت میں حکومت پر دباؤ ڈالا کہ سرکاری دفاتر میں اردو کی جگہ ہندی کو اپنایا جائے اور دیوناگری رسم الخط میں دفاتر میں کام ہو۔

برادران وطن کی اس مانگ پر سرسید کا ذہن متزلزل ہو کر رہ گیا۔ وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے ہندو بھائی اردو کے ساتھ

اس قدر تنگ نظری کا ثبوت دیں گے۔

سرسید نے ہندو اور مسلمانوں کو ہمیشہ ایک قوم ہی نہیں کہا بلکہ یہاں تک کہا کہ ہندو اور مسلمان میری ایک آنکھ ہیں اور اس فرق کو بھی پسند نہیں کیا کہ کسی کو دائیں یا کسی کو بائیں آنکھ کہتے۔

جب بنارس میں اردو مخالف تحریک کو فرقہ پرستوں نے آگے بڑھایا تو انھوں نے دل برداشتہ ہوکر بنارس کے کمشنر سے دورانِ ملاقات کہا تھا کہ "اب مجھے دل سے یقین ہو چلا ہے کہ اس ملک میں ہندو اور مسلمان باہم شیر و شکر ہوکر ایک قوم کی حیثیت نہیں رہ سکیں گے۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا۔ ابھی کیا ہے۔ آئندہ بہت سے اختلافات ہوں گے۔

جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا تو سرسید کی پیش گوئی کتنی صحیح ثابت ہوئی۔ آج ہندوستان کو آزاد ہوئے ۳۳ سال گزر گئے، مگر سرسید کی پیش گوئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ہندو اور مسلمانوں کا مقدر بن گئی ہے بلکہ اب تو ملک کا ہر طبقہ وہی بات کر رہا ہے جو سرسید نے ۱۱۴ سال قبل کہی تھی۔

آزادی کے بعد ہر ہندوستانی مسلمان اس ملک میں نہ حاکم ہیں نہ محکوم۔ ہاں حکومت کی تشکیل میں ووٹ کی ان کا ایک بڑا حصہ رہتا ہے اور ان کو دستورِ ہند سے وہ تمام حقوق بھی ملے ہیں جو کسی ملک کے شہری کو حاصل ہوتے ہیں۔ مگر ہم ان گزشتہ ۳۳ سال کی زندگی میں دستورِ ہند کے آئینہ میں ان کے حقوق کو دیکھتے ہیں تو ہمیں انوری کا یہ مطلع یاد آجاتا ہے ؎

ہر بلائے کز آسماں آید
خانۂ انوری کجا باشد۔

۳۳ سال کے درمیان مسلمان دو بار اس ملک کے سربراہ بھی بنائے گئے ہیں۔ مرکز اور صوبوں میں مسلمان منسٹر اور ڈپٹی منسٹر بھی ہوئے ہیں۔ پارلیمنٹ میں ایم۔پی اور اسمبلیوں میں ایم ایل اے بھی چنے جاتے ہیں۔ مگر ان میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں ہوتا جو مسلمانوں کے ۳۳ سالہ قتل عام اور ان کے اوپر ٹوٹنے والے ان گنت پہاڑوں کا ذکر ایوانِ حکومت میں کرتا اور حکومت کو بتاتا کہ ۳۳ سال سے جس کرب کی زندگی یہاں کے مسلمان گزار رہے ہیں، اس کا مداوا کیا جائے۔

آج اگر کوئی سرسید پیدا ہوا ہوتا تو وہ اربابِ حکومت سے کہتا کہ ہمیں اس ملک کا صدر، وزیر، پارلیمنٹ کا ممبر یا ایم ایل اے بننا پسند نہیں، ہم تو اس ملک میں سکونِ قلب چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ہم اس ملک کے شہری ہوکر بھی شہری نہیں ہیں۔ اس لیے کہ یہاں کے فرقہ پرست جب چاہتے مسلمانوں کے جان و مال کو کھلونا سمجھ لیتے ہیں جب چاہتے ہیں مکانوں اور دوکانوں کو لوٹتے جلا دیتے ہیں۔

بظاہر مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی جماعتیں اور تنظیمیں بھی ہیں لیکن ان کے بطن سے ۳۳ سال کے درمیان سرسید تو کجا کوئی سرسید کا بیٹا بھی پیدا نہیں ہوا۔

آج ہمیں کسی مسلمان کے صدر، وزیر، ایم ایل۔اے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس سرسیّد کی ضرورت ہے جو حکومت کو بتائے کہ ۳۴ سال میں ہم پر کیا بیتی ہے۔ ہمارے بچے تعلیم سے کیوں محروم رہتے ہیں اور جو تعلیم یافتہ ہیں وہ در در کی ٹھوکریں کیوں کھاتے ہیں۔ ہمارے صنعت کاروں نے اپنے فن سے دنیا کو متاثر کیا اور ہر سال اربوں ڈالر ہمارے خون و پسینہ کی بدولت ہمارے ملک کو زرمبادلہ کی صورت میں ملتے ہیں۔ پھر بھی ہم نادار ہیں۔ ہمارے لاکھوں نوجوان اپنے سینوں پہ دشمنوں کی گولیاں کھانا چاہتے ہیں۔ مگر فوج کے دروازے ان کے لیے بند ہیں۔ ہمارے بچوں میں انتظامی صلاحیتیں ہیں پھر بھی یہ ملک کی انتظامیہ نظر انداز کیے جاتے ہیں۔ کاش پھر کوئی سرسیّد مسلمانوں میں پیدا ہو اور اب اسباب بغاوت ہند کے بجائے یہ لکھے کہ "آزاد ہندوستان میں مسلمان" اور ارباب حکومت کو بتائے کہ اس ملک میں مسلمان بھی رہتے ہیں اور ان کے نام اس ملک کے وفاداروں کی فہرست میں پیچھے نہیں ہیں۔ بلکہ گزشتہ ۳۴ سال کی تاریخ میں جب بھی کوئی ملک کے لیے خطرہ نظر آیا تو انھوں نے پشت نہیں دکھائی۔ اپنی سرفروشی اور مجاہدانہ عمل سے اس کا مقابلہ کیا۔

آج مسلمانوں میں ایک سرسیّد کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کی وکالت کرتے ہوئے ملک کی تعمیر نو کے لیے اپنی زندگی وقف کر دے۔

درسِ عبرت

:- انجمن آرا انجم

منصور نے عمرو بن عبید سے کہا "مجھے کچھ نصیحت کی بات بتاییے"۔ جواب میں انھوں نے کہا "وہ بات بتاؤں جو میں نے دیکھی ہو یا وہ جو میں نے سنی ہو" منصور نے کہا۔ جو کچھ آپ نے دیکھا اس کو بیان کیجیے۔

عمرو بن عبید نے کہا "جب عمر بن عبدالعزیزؒ کا انتقال ہوا انھوں نے لڑکے چھوڑے اور ترکے میں صرف سترہ دینار۔ ان سترہ دیناروں میں سے پانچ دینار ان کی تجہیز و تکفین میں صرف ہوئے۔ دو دینار میں ان کی قبر کے لیے جگہ خریدی گئی اور باقی رقم میں سے ان کی اولاد میں سے ایک کو دس دس قیراط ملے۔ لیکن جب ہشام بن عبدالملک کی وفات ہوئی۔ انھوں نے گیارہ بیٹے چھوڑے جن میں سے ہر ایک کو ایک ایک ہزار دینار ترکے کے طور پر ملے۔ بعد میں میں نے دیکھا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک بیٹے نے جہاد کے لیے صرف ایک دن میں سو گھوڑے دیے۔ اور ہشام کے ایک بیٹے کو دیکھا کہ راستے میں بھیک مانگ رہا تھا۔

[عربی سے ترجمہ]

عبدالغفار شکیل
[شعبہ لسانیات]

سر سید کی وفات کی دو الہامی تاریخیں

مسلمانانِ ہند کے محسن، مربی، مصلح، قوم و ملک کے ہمدرد اور عظیم رہنما سر سید احمد خاںؒ نے ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء مطابق ۱۳۱۵ھ بروز اتوار رات کے دس بجے اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ اُن کے پیچھے ان کے کتنے رفقا، کتنے عقیدت مند، کتنے مداح اور کتنے غمگسار اشکبار ہوگئے ہوں گے اس کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں۔

سر سید کی وفات ایک ایسے وقت میں ہوئی جبکہ اُن کے خواب، اُن کی آرزوئیں اور اُن کی شب و روز کی مساعی کوششیں علی گڑھ تحریک کی شکل میں بار آور ہونے لگی تھیں۔ ایک طرف سر سید جیسی ہستی کا اُٹھ جانا اور دوسری طرف اُن کے ادھورے خواب جن کو ابھی شرمندۂ تعبیر ہونا تھا، یہ دو باتیں ایسی تھیں جن کے غم نے سر سید کے رفقا کو اور ان لوگوں کو جو سر سید کے شاندار و جاندار کارناموں کی اہمیت سمجھتے تھے انتہائی رنج و غم میں مبتلا کر دیا۔ سر سید کی وفات پر اہلِ قلم نے نہایت دلسوز انداز میں مضامین لکھے۔ حالی نے "حیاتِ جاوید" لکھ کر سر سید کے نام اور کام کو زندۂ جاوید کر دیا۔ ان گنت شاعروں نے مرثیے کہے۔ وفات کی تاریخیں نکالیں۔ ان سب کو پڑھیے تو اندازہ ہوتا کہ سر سید سے لوگوں کو کتنی محبت، عقیدت تھی، کتنا خلوص تھا اور کتنا احترام!

سر سید کی وفات کو چوراسی سال ہو گئے۔ [illegible] سر سید کے مزار پر نہ معلوم کتنی مرتبہ فاتحہ پڑھ کر چلے آئے۔ باہر سے آنے والے بھی مزارِ سر سیدؒ پر حاضری دے کر اُن کے لیے دعائے مغفرت مانگتے اور اپنی عقیدت کے پھول مزار پر چڑھاتے ہیں۔ لیکن بہت ہی کم لوگوں کی نظر سر سید کے مقبرے پر لکھی ہوئی اُن کی وفات کی تاریخوں پر پڑتی ہے جو سر سید کی شخصیت کے سلسلہ میں عجیب و غریب ہیں۔ ہم شاذ ہی ان تاریخوں کی معنویت پر غور کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں یہ تاریخیں کن لوگوں نے نکالی ہیں۔

مولانا حالی "حیاتِ جاوید" میں لکھتے ہیں:

> "اگرچہ سر سید کی وفات کی بے شمار تاریخیں لکھی گئیں لیکن دو عربی مادے عجیب و غریب نکلے ہیں۔"

یہ دونوں عجیب و غریب مادے سر سید کے مقبرے کے دروازے کے اوپر کی دیوار پر لکھے ہوئے ہیں۔ یہ دونوں مادے کس نے نکالے۔ مولانا حالی نے ان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس کا انکشاف مرزا عبدالمجید سالک نے کیا ہے۔[۱] یہ دونوں تاریخی مادے دو ایسے ذہنوں کی کاوش کا نتیجہ ہیں جو آپس میں استاد اور شاگرد ہیں۔ استاد مولوی سید میر حسن شاہ ہیں اور شاگرد علامہ اقبال۔

ان تاریخی مادوں کا شانِ نزول یہ ہے کہ

۱ـ ذکرِ اقبال

سرسید کی وفات کی اطلاع لاہور میں مولوی سید میر حسن شاہ کو بذریعہ تار ملی۔ مولوی صاحب سرسید کے گہرے دوست، عقیدت مند اور علی گڑھ تحریک میں سرسید کے ممد و معاون تھے۔ انھیں سرسید کی وفات پر بڑا دکھ ہوا۔ وفات کی اطلاع انھیں اس وقت ملی جب وہ کالج جا رہے تھے، جہاں یہ وہ ملازم تھے۔ راستے میں اُن کے شاگرد اقبال ان سے ملے۔ اُس وقت اقبال نوجوان تھے اور ایم اے کے طالب علم۔ سرسید کے مذہبی، سیاسی قومی و ملی کارناموں کے چرچے ہندوستان کے طول و عرض میں عام ہو چکے تھے۔ اور سرسید کی تحریک سے اس وقت کے انگریزی تعلیم یافتہ ذہن کافی متاثر تھے۔ اقبال بھی اُن میں سے ایک تھے۔

اقبال کو طالب علمی کے زمانے ہی سے سرسید سے بڑی عقیدت تھی۔ اس عقیدت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ علامہ اقبالؒ کے استاد مولوی سید میر حسن اور سرسید میں دیرینہ مراسم تھے۔ چنانچہ استاد نے اپنے شاگرد کو سرسید کی وفات کی اطلاع دی۔

دونوں پر اس سانحۂ عظیم کا بڑا گہرا اثر تھا استاد نے شاگرد سے کہا کہ وہ مادۂ تاریخ کے لیے فکر کریں۔ استاد کی ہدایت نے علامہ اقبالؒ کے تاثر غم کو اور گہرا کر دیا۔

استاد اور شاگرد دونوں نے الگ الگ مگر عجیب و غریب تاریخیں نکالیں جو اپنی جگہ عجیب و غریب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوب مناسب اور موزوں بھی تھیں اور یہ دونوں مقبرۂ سرسید کے لیے منتخب کر لی گئیں۔

علامہ اقبال کے استاد کی نکالی ہوئی تاریخ ہے

غُفِرَ لَہٗ

[ترجمہ:- اس کی مغفرت کی گئی]

علامہ اقبالؒ کی نکالی ہوئی تاریخ قرآن مجید کی ایک آیت سے ہے۔

اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ
اِلَیَّ وَمُطَهِّرُکَ

[ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا " میں تم کو پوری عمر کو پہنچاؤں گا اور پھر تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا اور تم کو الزاموں، بہتانوں سے پاک کر دوں گا۔]

یہ آیت سورۂ آل عمران کی ۵۵ ویں آیت ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف خطاب ہے۔ جب یہودی ان کے قتل کا منصوبہ بنا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تم کو پوری عمر کو پہنچاؤں گا۔ یہود تم کو قتل نہ کر سکیں گے اور پھر تم کو اپنی طرف اٹھا لوں گا۔ اور اُن کافروں کی صحبت بد اور اُن کے گندے ماحول سے تم کو پاک کر دوں گا۔

سرسیدؒ کی پوری زندگی، حالات و واقعات جن سے وہ دوچار ہوئے، ان کی جد و جہد، ان کے ساتھ اپنوں اور غیروں کا برتاؤ اور رویہ، موافق اور ناموافق حالات، ان کی مخالفت و مزاحمت ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر علامہ اقبالؒ اور ان کے استاد کی نکالی ہوئی وفات کی تاریخیں جو اوپر دی گئی ہیں ان کے معنی و مفہوم کو ذہن میں رکھ کر سرسید کی زندگی اور واقعات

سید احمد خاں کی قائم کردہ

سائنٹفک سوسائٹی کا احیاء

خلائی پروازکے ذریعہ سیارتی تحقیق

تقریر از ڈاکٹر فاروق الباز

ارضی وسیاراتی مطالعات کے مرکز (واشنگٹن) کے ریسرچ ڈائرکٹر، ڈاکٹر فاروق الباز نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سائنٹفک سوسائٹی کے زیر اہتمام ۲۸ اپریل ۸۲ء کو ایک جلسہ میں "خلائی پروازوں کے ذریعہ سیارتی تحقیق" کے موضوع پر تقریر فرمائی۔ یہ موضوع جتنا جدید ہے، اتنا ہی دلچسپ بھی ہے اور مقرر کے انداز بیان نے اس کو اور شگفتہ بنا دیا۔

ڈاکٹر فاروق نے بتایا کہ سورج اور اس کا سیاراتی نظام ایک ہی مادہ سے وجود میں آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سیاراتی اجسام کم از کم ساڑھے چار کھرب سال سے ایک ہی مدار میں گھوم رہے ہیں۔ ان میں کچھ دور افتادہ اجرام کو ساکت ہوئے لاکھوں سال گزر چکے ہیں۔ زمین جیسے بعض دیگر اجرام آج بھی متحرک ہیں۔ ان اجرام کی مدت حیات کے فرق اور امتزاجی عدم یکسانیت کے باعث ان کا ثقل اصل مادہ سے مختلف ہو گیا۔ بعید ترین سیاروں کا مادہ نہایت ہلکا ہے اور جو سیارے جتنے قریب ہیں، ان کا مادہ اسی قدر بھاری ہے۔ ان سیاراتی اجسام کی دوری حرکات ہلکے سیاروں کے حرنیوکلیائی (تھرمونیوکلیر) ردعمل سے متعین ہوتی ہیں۔ ان کا ریڈیو ایکٹو انتشار بھاری اندرونی سیاروں سے کہیں پہلے ختم ہو چکا ہے۔ اپنے مادہ اور اصل کے اشتراک کے باعث ہی ان اجرام کی سطحوں کی صورت حال ہیئت، مزاج اور تشکیلی اکائیوں میں بڑی مماثلت ہے۔

گزشتہ تین دہائیوں سے خلائی پروازوں کے دوران مختلف سیارتی سطح لونی ثقل، برق مقناطیسی طیف کی مختلف النسل لہروں کی ساخت اور انداز کے اندراجات کیے جا رہے ہیں۔ ان سب کو سیاراتی سطحیاتی مناظر کی توجیہات کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ سطح زمین کے لونی ثقل، ساخت اور انداز کی علامات سے فوق ارضی اجسام کے لیے تحقیقاتی رہنمائی کا کام لیا جا رہا ہے۔

سیاراتی تحقیق کے لیے خلائی پیکروں کے استعمال کی آزمائشی مثال کے طور پر ڈاکٹر فاروق نے ارضی صحراؤں کے مائکرو سلائڈ دکھائے اور پھر لون، ساخت اور انداز کی ایسی ہی ان علامات سے ان کا موازنہ کیا جو مریخ کی سطح سے حاصل ہوئی ہیں۔ تحقیقات کے ان نتائج کا مغربی راجستھان اور صحارا کے ریگستانوں میں موجود ارضی صداقتوں سے موازنہ کیا گیا۔ ان حاصل شدہ نتائج سے مریخ کی سطح کے صحراؤں کی نشاندہی کی گئی۔

[redacted]

یونیورسٹی کے شب و روز

از: غزالی خاں - شعبہ صحافت

ڈرامہ کلب

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ڈرامہ کلب کے زیر اہتمام Ensemble 82 کے نام سے ڈرامائی مقابلہ منعقد کیا گیا جو ۵ رمئی سے شروع ہو کر ۹ رمئی ۸۲ء کو اختتام کو پہونچا۔ اس پروگرام کے تحت مختصر ڈراموں، پینٹو مائم، اسٹیج کرافٹ، "یہ تفریح ہے" اور فی البدیہہ اداکاری کے مقابلوں میں مختلف ہالوں اور شعبوں سے تعلق رکھنے والے طلبا اور طالبات نے حصہ لیا۔ جج کے فرائض محترمہ شہناز ہاشمی، محترم مقبول محمود اور فلائٹ لفٹیننٹ سراج مہدی نے انجام دیے۔ پروگرام کی اناونسر فوزیہ ناہید اور یاسمین ہاشمی تھیں۔ ڈرامہ کلب کے سکریٹری قیصر جمال اور ریسرچ اسکالر سرور رئیس نے انتظامات کیے۔ مہمان خصوصی کے فرائض ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جناب راجیو رتن شاہ اور شریمتی سمیتا شاہ نے انجام دیے اور مقابلوں میں جیتنے والوں کو بیگم ثریا حامد نے انعامات تقسیم فرمائے۔

اسٹوڈنٹس یونین الیکشن

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے انتخابات ۱۸ رمئی ۸۲ء کو زیر نگرانی چیف الیکشن آفیسر پروفیسر سلیم صدیقی بخیر و خوبی منعقد ہوئے۔ کامیاب امیدواروں میں علی امیر صدر۔ خلیق احمد خاں نائب صدر۔ سید عرفان علی سکریٹری کے علاوہ سینیر کیبنٹ شرافت اللہ خاں اور ایک فلسطینی طالب علم فاتح دیب شامل ہیں۔

قومی یکجہتی پر سمینار

۲۵ رمئی ۸۲ء کو قومی یکجہتی سمتی کے زیر اہتمام ایک کل ہند سمینار کینیڈی ہال میں منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر کے ایم بہاء الدین پرو وائس چانسلر علی گڑھ مسلم نے کی۔

سمینار میں ہندوستان کے مشہور صحافی کلدیپ نیر، جناب راجندر پوری۔ ماہر تعلیم جناب احمد رشید شروانی، ممبر پارلیمنٹ جناب سید شہاب الدین، اور علی امیر صدر اسٹوڈنٹس یونین نے قومی یکجہتی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رول پر اظہار خیال کیا۔

شام کو شہر کے ممتاز صنعت کار جناب پرمود کمار نے شرکاء کو عصرانہ دیا۔

بقیہ "سید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی کا احیاء"

ڈاکٹر فاروق نے اس امر کی وضاحت کی کہ خلائی شبیہیں کس طرح فضائی تبدیلیوں کے علم میں مفید ہوتی ہیں۔ مصر کے دریائے نیل کے ڈیلٹا کی مثال لے کر انھوں نے ترقیاتی منصوبوں میں ان کی افادیت کو دکھایا۔ وہاں ان شبیہی توجیہات کی بدولت ہی انسان نے صحرا پر قابو پالیا۔ ڈاکٹر فاروق کی تقریر میں اس بات پر زور تھا کہ کسی علاقے یا ملک کی وسائلی ترقی اور منصوبہ بندی کے لیے جو تفصیلات درکار ہوتی ہیں، خلائی شبیہیں ان میں ایک اہم ذریعہ بن سکتی ہیں۔

ملازمت کے لیے درخواست دیجیے

۱۔ ریلوے سروس کمیشن الہ آباد کو تقریباً نو سو پچاس سینیر کلرک اور اکاؤنٹس گریڈ کے لوگوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں اور مختلف شعبوں میں انجینیر اور اوورسیئر بھی درکار ہیں۔ تفصیل کے لیے روزگار سماچار [Employment News] مورخہ ۲۲ رمئی ۱۹۸۲ء ضرور دیکھیے

۔ حکومت ہند کے مختلف شعبوں میں ہندی کے مترجم درکار ہیں Hindi Translator اس سلسلہ میں روزگار سماچار مورخہ ۲۲ رمئی ۸۲ء ضرور ملاحظہ کریں۔

۱۔ ایرانڈیا کو گریجویٹ انجینیر ٹرینیز درکار ہیں۔ روزگار سماچار [Employment News] مورخہ ۲۲ رمئی ۸۲ء میں اس کی تفصیل ملاحظہ کریں

۔ ڈی۔ اے۔ وی پبلک اسکول دہلی کو ٹرینڈ ٹیچرس درکار ہیں۔ تفصیل کے لیے ۲۶ رمئی کا ٹائمز آف انڈیا ضرور دیکھیے

۔ اسکول آف پلاننگ اینڈ آرکیٹیکچر نئی دہلی میں مختلف کلاسز میں داخلے ہو رہے ہیں۔ تفصیل کے لیے ۲۶ رمئی ۸۲ء کا ٹائمز آف انڈیا ضرور دیکھیے۔

پبلک سروس کمیشن اترپردیش کے تحت مشترکہ اسٹیٹ سروسیز مقابلہ کا امتحان برائے سال ۱۹۸۲ء کا اشتہار قومی آواز لکھنو مورخہ ۲۳ رمئی ۸۲ء ایڈیشن ۱۲ میں شائع ہوا ہے۔ تقریباً پونے دو سو لوگ مختلف شعبوں میں درکار ہیں۔ درخواست ۵ رجولائی ۸۲ء تک کمیشن کو ضرور پہنچ جانا چاہیے۔ ۲۱ سے ۲۸ سال کی درمیانی عمر کے حضرات ہی اس میں درخواست دیں امتحانات ماہ ستمبر ۸۲ء کو مختلف مراکز پر منعقد ہوں گے۔

مرتبہ :۔ انور حبیب علوی (ہلال)
۴۵۔ امین ہوسٹل۔
ایم۔ ایم۔ ہال

Regd. No. L/ALG-247

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

[جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ہجری سنہ ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۲

جلد نمبر ۱ ۱۶ر جون ۱۹۸۲ء شمارہ نمبر ۱۰

اے حضرات گو میں نے اس وقت قوم ہی کا گیت گایا
ہے مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم کو اور قوموں سے محبت اور
برادرانہ محبت نہیں ہے. ہماری قوم خراب حالت میں ہے. اس لیے
اس کا گیت گایا جاتا ہے ورنہ اور قوموں سے بھی ایسی ہی محبت
رکھتے ہیں جیسے اپنے عزیزوں سے . سرسید

(ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک جلسہ میں تقریر)

اقتباس از
"مسافران لندن"
مرتبہ: سرسید احمد خاں

از مرتبہ:
شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی
مجلس ترقی ادب لاہور ص ۵-۷

یو۔ پی کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے یورپین مصنفین اور عیسائی پادریوں کی تقلید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات اور حضور علیہ السلام کے کارناموں پر ایک تنقیدی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے نام سے چار جلدوں میں لکھی۔ جس میں جگہ جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی پاک اور بے عیب زندگی پر ناواجب اور نامناسب الفاظ میں اعتراضات کیے۔ جنھیں دیکھ کر سرسید کی دینی غیرت اور مذہبی حمیت سخت جوش میں آئی۔ اور انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اس کتاب کا مکمل، مدلل اور تسلی بخش تحقیقی جواب دیا جائے۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اس کا جواب دینے کے لیے جن مستند کتابوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں ناپید تھیں اور صرف یورپ میں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ یا انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کے کتب خانوں میں محفوظ تھیں۔ اس لیے ضروری ہوا کہ کتاب کا حوالہ لکھنے کے لیے انگلینڈ کا سفر کیا جائے اور وہاں بیٹھ کر ان کتابوں سے فائدہ حاصل کرنے کے بعد سر ولیم میور کی کتاب کا جواب تیار کیا جائے

سفر کی تقریب کس طرح پیدا ہوئی؟ اس سفر کی تقریب اس طرح پیدا ہوئی کہ

جلد ۱ شمارہ ۱۰
۱۶ر جولائی ۱۹۸۲ء
مدیر: سید حامد
وائس چانسلر اے ایم یو۔
مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

تہذیب الاخلاق

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ
چھ ماہ ۱۱۔ روپے
سالانہ ۲۰ روپے
غیر ممالک سے
فی کاپی ۱۔ ڈالر
سالانہ ۱۵۔ ڈالر
ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا
مدیر مسئول رسالہ تہذیب الاخلاق
صفدر منزل۔ تار بنگلہ۔ اے ایم
یو۔ علی گڑھ 202001

اداریہ

قومی یکجہتی

[National Integration

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بھی ایک قومی یکجہتی سمیتی ہے
ں کے کارکن ملک میں یکجہتی پیدا کرنے کے سلسلہ میں خاصے سرگرم
لوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے چھ ماہ میں دو سمینار اس موضوع کو مقبول
نے کے لیے کر ڈالے۔ دونوں جلسوں میں صحافی اور سیاست کار شریک
ے۔ سنا ہے دھواں دھار تقاریر ہوئیں۔ ممکن ہے تجاویز بھی پیش
ی اور منظور ہوئی ہوں۔ لنچ کھایا گیا۔ چائے کے دور چلے۔ جلسہ
واست ہوا۔ حاضرین اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔ قومی یکجہتی
سئلہ جہاں تھا وہیں رہا۔

بھارت واسیوں میں یکجہتی نہیں ہے تو کیوں
ں ہے۔ یہ مسئلہ سوچنے اور حل کرنے کا زیادہ ہے محفل آرائی کا کم
۔ بس یہی بات ہے جس کی طرف توجہ نہ لیڈر کی ہے اور نہ جنتا کی۔
اجہ کی نہ پرچا کی اس کو ذہن نشین کر لیا جائے۔ لیڈر اور عوام
ک کے بارے میں مخلص ہوں تو پھر یکجہتی بلا سمینار بلائے ہی پیدا ہو جائے
۔ اور اگر خلوص نہیں ہے تو پھر کسی سمینار سے کسی تقریر سے، کسی کوشش
قومی یکجہتی حاصل نہ ہوگی۔ یہ ایک خواب رہے گا جو شرمندۂ تعبیر
وگا۔ ملک میں فسادات ہوتے رہیں گے عورتیں اور بچے بے سہارا
تے رہیں گے۔ ملک کا لاکھوں کا نقصان ہوتا رہے گا۔ لیڈر کی قیادت

... ہی پر میدار ہوتے رہیں گے۔ نتیجہ جو نکلتا آیا ہے وہی نکلے گا۔

انگریزوں کی حکومت کا آغاز ہوا تو نئے حاکم نے یہ محسوس کیا کہ ہندو اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ اختلافات نہ پیدا ہوں گے اور نہ بڑھیں گے، اس وقت تک انگریزوں کی حکومت ہندوستان میں مستحکم نہ ہوگی۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندو مسلمان خواہ شیر و شکر نہ بھی ہوں لیکن متحد ضرور تھے کہ نئے حاکم وقت کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس اتحاد کو توڑا جائے۔ انگریزوں کا اقتدار جوں جوں مستحکم ہوا، ہندو مسلم اختلافات بڑھتے گئے۔ پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی۔ جنگ کے دوران حکومت کو ضرورت تھی کہ ملک میں امن و امان رہے۔ چنانچہ ہندو مسلم فساد نہ ہوا۔ نہ گائے کے ذبیحہ کا سوال اٹھا۔ نہ کسی مسجد کے سامنے باجے کا واقعہ ہوا۔ جنگ بخیریت ہوتی رہی۔ یہی صورت دوسری جنگ عظیم میں بھی ہوئی۔ پانچ سال خوب جنگ رہی۔ لاکھوں کا خون بہا۔ لیکن ہمارے ملک میں جھگڑا نہ ہوا۔ نہ کسی کا گھر لٹا، نہ ہی کوئی عمارت جلی۔

جنگ کے بعد تحریک آزادی شباب پر پہنچی۔ تقسیم ہند کا سوال زبانوں پر آنے لگا۔ ہندو مسلم اختلافات بڑھے۔ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ انگریز چلے گئے، لیکن جو آگ وہ لگا گئے تھے وہ برابر پھیل رہی ہے۔ دلوں میں ایسی کدورت پیدا ہو گئی ہے کہ نکالے نہیں نکلتی۔ قومی یکجہتی کا سوال اہم ہے۔ لیکن سوال زبان پر ہے۔ تقریر زیادہ ہوتی ہے۔ دل کی کدورت ایسی ہو گئی ہے۔ وہ نکالے نہیں نکلتی۔

کچھ سوچتا نہیں ہیں دل زار کے لیے
جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کیلیے

بلا عنوان

مسلم دانشوروں کو جو مذہبی خیال کے ہیں یہ عام شکایت ہے کہ مسلمانوں نے یا علمائے اسلام نے غیر مسلم حلقوں میں اسلام کے بارے میں ضروری معلومات کی اشاعت نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں اور اسلام کے بارے میں ان میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ اس خیال کا اظہار اکثر ہوتا رہتا ہے اور بہت ٹھنڈے سانس بھر کر افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں مسلمانوں سے یہ توقع کرنا کہ وہ کم از کم غیر مسلم خواص کو ہی اسلام سے متعارف کرانے کی خدمت انجام دیتے، کچھ مناسب نہیں۔ جب علمائے اسلام نے خود مسلمانوں کو اسلام سے متعارف کرانے کی ذمہ داری پوری نہیں کی تو پھر ان سے یہ توقع کیسے کی جائے کہ غیر مسلم حلقوں میں اسلام کا تعارف کراتے پھریں اور ان کی زبانوں میں اسلام پر کتابیں لکھ کر شائع کریں۔

مسلمانوں کا اپنے دین سے جذباتی تعلق تو ضرور ہے، لیکن اسلام کا پیغام سمجھنے اور اس کی تعلیمات کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کی خواہش ان میں کم رہی ہے۔ ان کے ہاں اسلام

ہر عمل کے سلسلہ میں عقل کو ... جوش کو زیادہ۔ اسی بنا پر آپس میں ... رہتے ہیں۔ یہی جھگڑے اور تکرار ہیں جن سے دوسرے لوگ اسلام اور مسلمانوں کے بارے رائے قایم کرتے ہیں۔

مسلمانوں میں گروہ بندی اور آپس کے جھگڑوں کو بہت ناپسند کیا جاتا ہے اور ہر مسلمان ان اختلافات پر بہت افسوس کرتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کے درمیان اختلافات کم نہیں ہوتے بلکہ بڑھتے ہی رہتے ہیں۔

مسلمانوں کا رہنما خواہ وہ مسٹر ہو یا مولانا، اپنا جھنڈا کسی دوسرے جھنڈے کے مقابلہ میں نیچا کرنے کا قائل نہیں ہے۔ تو پھر اتحاد کیسے ہو۔

راقم مسلمانوں کے ایک کل ہند اجتماع میں شریک تھا۔ جلسہ دہلی میں بچوں کے گھر میں ہو رہا تھا۔ صدارت کے فرائض ایک دینی رہنما انجام دے رہے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی دو تنظیموں میں اتحاد کیسے ہو۔ اور چوں کہ مقاصد ایک ہیں۔ دونوں تنظیموں میں سے ایک کام کرے اور سب اس میں شریک ہو جائیں۔ اس طرح سے آپس کے اختلافات ختم کریں۔ بات بظاہر معقول تھی۔ حاضرین میں شیخ محمد عبداللہ بھی تھے اور ہر ریاست کے مسلم اکابر بھی تھے۔ سب نے بہت دھواں دھار تقریریں کیں۔ کلام مجید کی آیات اور احادیث کا بے تکلفی کے ساتھ استعمال ہوا اور تمام دن بحث و تکرار میں صرف ہو گیا۔ نتیجہ

کچھ نہ نکلا۔ لوگ اپنے گھروں کو سدھارے اور مسلمانوں میں آپس کے اتحاد و اتفاق کا سوال جہاں تھا وہیں رہا۔ دنیا نے دیکھا کہ مسلمان ایک دوسرے سے خوب نبرد آزما ہیں۔ ریل میں سفر کے دوران ایک تعلیم یافتہ ہندو خاتون کو کہتے سنا۔ اونہہ! یہ مسلمان تو آپس میں لڑتے ہی رہتے ہیں۔ نئی کیا بات ہے۔

افسوس ہے کہ گذشتہ شمارہ پانچ روز کی تاخیر سے خریداروں کی خدمت میں ارسال کیا گیا۔ اور چونکہ ۶۔ تاریخ کو اتوار تھا۔ اس لیے بعض حضرات کو سات روز کی تاخیر سے پرچہ بھیجا گیا۔

اس تاخیر کے اسباب متعدد تھے۔ کسی کا بیمار پڑ جانا، کسی کے یہاں شادی ہونا، کسی سبب سے پریس بند ہو جانا، وغیرہ وغیرہ

اس تاخیر کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جائے اور کس سے جواب طلب کیا جائے اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے۔

تہذیب الاخلاق کے قارئین سے راقم معذرت خواہ ہے۔ آئندہ کوشش یہی رہے گی کہ رسالہ تہذیب الاخلاق وقت مقررہ پر سپرد ڈاک کر دیا جائے۔

[ق م ۔ ا ۔]

ہماری آنکھیں

ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر
اوپتھلمولوجی۔ اے ایم یو

ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر دنیا کی مشہور ماہران چشم میں شمار کی جاتی ہیں۔ حال میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے ویمنز کالج نے اپنی گولڈن جوبلی کے موقع پر آپ کو "ممتاز خاتون" کا اعزاز دیا ہے۔ آپ انسٹی ٹیوٹ آف اوپتھلمولوجی اے ایم یو میں پروفیسر ہیں] [مدیر مسئول]

آنکھیں انسان کے لیے بڑی نعمت ہیں اور خوبصورتی بھی اُن کی صحت اور چمک سے وابستہ ہے۔ جب کسی شخص کی طبیعت ذرا بھی گری گری ہوتی ہے، تو سب سے پہلے اُس کی آنکھوں میں تھکاوٹ اور پلکوں میں بھاری پن دکھائی دیتا ہے جس کو دیکھ کر لوگ اندازہ لگالیتے ہیں کہ آج ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ تو یہ تو رہی ایک عام سی بات

ہاں تو آپ کیا پوچھ رہے تھے ؟

س۔ کسی نے کہا کہ

"آنکھ انسان کے دماغ کی کھڑکی ہے"

کیوں جناب یہ کیسی بات کہدی انھوں نے ؟ کیا دماغ کی بھی کوئی کھڑکی ہوسکتی ہے ؟

ج اس کہاوت کا مطلب یہ ہے کہ آنکھ کی بناوٹ اور دماغ کی بناوٹ کا بہت نزدیکی رشتہ ہے۔ اسی لئے جب ہم کسی چیز کی طرف دیکھتے ہیں تو اُس کی تصویر یا عکس [Image] آنکھ کے پردے [Retina] پر بن جاتی ہے۔ یہ تصویر الٹی [INVERTED] ہوتی ہے، اس طرح دونوں آنکھوں کے پردوں پر ایک ایک تصویر بنتی ہے جو کہ دماغ تک ایک خاص نس [Optic-Nerve] کے ذریعہ سے پہنچتی ہے۔ دماغ ان دونوں تصویروں کو ایک کر دیتا ہے۔ [Fuses the Images] اور پوری تصویر کو سیدھا بھی کر دیتا ہے۔ [Interprets the Image as right way-up]

س۔ یہ تو بہت ہی کمال کی بات ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے ؟

ج اس کے بارے میں ابھی تحقیقات چل رہی ہے۔ مگر جب اس طریقہ سے سامنے کے نظارے آنکھوں کے راستے سے دماغ کو دکھائی دیتے ہیں تو آنکھیں کھڑکی نہیں ہوئیں تو کیا ہوئیں۔ اب ایک دوسرے طریقہ کی کھڑکی بھی ملاحظہ فرمایئے ! ہم ڈاکٹر آپ کی آنکھ میں دوا ڈال کر اور پتلی [Pupil] پھیلا کر اپنے آلوں Opthalmoscope سے آپ کی آنکھ میں تیز روشنی ڈالتے ہیں۔ تو آپ کو یہ

کیا چوند ناگوار معلوم ہوتی ہے۔ مگر ہم آپ کی
آنکھ کے پردوں کی تصویر [Fundus Picture]
دیکھ کر خوش یا پریشان نظر آتے ہیں۔
س۔ اس کمزوری کا تصور کیسے ہوتا ہے۔
ج۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دماغ کی نسوں
اور رگوں میں جو بھی خرابی ہوتی ہے وہ سب سے
پہلے آنکھوں کے پردوں پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس
کے علاوہ آنکھ کے پردے کو دیکھ کر ڈاکٹر کو کئی قسم
کے جسمانی مرض کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔ مثلاً خون کے
دوران گردوں کی خرابی۔ اور دیگر کئی امراض کا راز
جلد از جلد کھل جاتا ہے۔
س۔ اچھا یہ تو مان لیا کہ آنکھ کئی طریقہ سے
دماغ کی کھڑکی ہے۔ مگر اب آنکھوں کے بارے
میں اور کچھ بھی بتایئے۔ مثلاً یہ "جھڑ" یا "پھلی"
کیا ہوتی ہے؟
ج۔ آنکھ کے سامنے والا شیشہ [Cornea]
معمولی طور سے بالکل صاف [Transparent]
رہتا ہے۔ مگر جب اس میں دھندلاہٹ یا سفیدی
آجاتی ہے تو اس کو پھلی کہتے ہیں۔ اور بچوں میں
اس کی سب سے اہم وجہ مناسب غذا کی کمی [Mal-
nutrition] ہے جس میں وٹامن
'Vitamin A' کی کمی کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے
س۔ تو اس 'Vitamin A' کی کمی سے بچوں
کو کس طرح بچایا جا سکتا ہے؟
ج۔ سب سے ضروری بات یہ ہے کہ خود
ماں کی صحت جو بچے کو دودھ پلاتی ہو، اچھی
ہونی چاہیے اور اس کی غذا میں دودھ، ہری سبزی
کچی گاجر اور دیگر اشیاء ہونی چاہییں۔ جس سے کہ
بچے کی خوراک بھی مناسب رہے اور اس کے بعد
جب اوپر کا دودھ دیا جائے تو پھر برتن کی صفائی
اور احتیاط کے ساتھ ساتھ دودھ بنانے کا صحیح طریقہ
بھی معلوم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر بچے کو دست
اور پیچش ہو جائے تو اس کا بہت جلدی علاج
ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ایسی حالت میں چھوٹے بچے
بہت تیزی سے کمزور ہو جاتے ہیں اور ٹھیک ہونے
پر اکثر ان کی آنکھوں پر پھلی [سفیدی] آجاتی ہے۔
اگر ایسا ہو تو فوراً آنکھ کے ڈاکٹر کو دکھا کر علاج شروع
کر دینا چاہیے ورنہ آنکھ میں زیادہ خرابی آنے کا ڈر
ہے۔
س۔ اگر بچے کی آنکھیں لال ہو جائیں اور
ان میں سے پانی یا کیچڑ آنے لگے تو اس کی کیا وجہ
ہو سکتی ہے اور کیا کرنا چاہیے؟
ج۔ اس کو "آنکھ آجانا" یا "دکھنا" کہتے ہیں اور
یہ کیفیت زیادہ تر برسات کے موسم میں ہوتی ہے
جب مکھیوں اور گندگی کی زیادتی ہوتی ہے۔ اس
بیماری کو Conjunctivitis بھی کہتے ہیں۔
اور یہ ایک دوسرے کو جلدی لگ جاتی ہے۔ اس
لیے جس کی آنکھیں دکھ رہی ہوں۔ اس کی تولیہ، تکیہ
رومال وغیرہ علیحدہ کر دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ
آنکھوں کو دن میں کئی بار صاف پانی یا [Boric
lotion] سے دھونا بہت ضروری ہے۔ تاکہ
آنکھیں چپکے نہیں۔ اگر ایک دو دن میں فائدہ نہ
ہو تو کسی ماہر چشم سے مشورہ کرنا ضروری ہے
اور ان کی رائے سے ہی Antibiotic

کا استعمال کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ان کے غلط استعمال
سے آنکھ کو نقصان بھی ہو سکتا ہے۔
Conjunctivitis کے علاوہ بھی
بہت سی بیماریوں میں آنکھ سرخ ہو جاتی ہے۔ اور
سرخی کے ساتھ آنکھ میں درد بھی ہوتا ہے۔ اگر کیچڑ
یا پانی آئے بغیر آنکھ لال ہو جائے تو ماہر چشم کو فوراً
دکھانا چاہیے۔

س۔ میں نے سُنا ہے کہ کالا پانی ایک بہت
خطرناک بیماری ہوتی ہے جس میں آنکھ کی روشنی چلی
جاتی ہے کیا یہ سچ ہے؟ اور کیا یہ بھی ٹھیک ہے
کہ یہ صرف چالیس سال سے زیادہ عمر کے لوگوں
میں پائی جاتی ہے۔

ج۔ کالا پانی یعنی Glaucoma
دراصل کئی طرح کا ہوتا ہے اور ان میں سے ایک قسم
میں آنکھ لال ہو جاتی ہے، شدید درد ہوتا ہے اور
مریض بے چین ہو کر فوراً ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اس
کو Acute Glaucoma کہتے ہیں۔ اور یہ
زیادہ تر بڑی عمر کے لوگوں میں ہوتا ہے۔
ایک اور طرح کا Glaucoma
آہستہ آہستہ شروع ہوتا ہے اور جس میں آنکھ کا دباؤ
[Pressure] بڑھتا جاتا ہے۔ اس کو Elar-
-nic Glaucoma کہتے ہیں اور یہ اس معنی
میں زیادہ خطرناک ہوتا ہے کہ مریض کو شروع میں
کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی ہے اس لیے ڈاکٹر
کے پاس جانے میں تاخیر ہوتی ہے اور جب مرض بڑھ
جاتا ہے تو آنکھ کی روشنی میں کمی کا احساس ہوتا ہے
اسی لیے یہ ضروری ہے کہ چالیس سال کے اوپر کے
لوگوں کو اپنی آنکھ کا مکمل معائنہ [Checkup] کروانا
چاہیے۔

س۔ کیا Glaucoma چھوٹے
بچوں میں بھی ہو سکتا ہے؟

ج۔ ہاں! ایک قسم کا Glaucoma
پیدائش ہی سے ہو سکتا ہے۔ یہ Infantile
Glaucoma] بہت خطرناک ہوتا ہے
کیوں کہ اس کی علامتیں والدین ہی کو پہچان کر
اس کو ماہر چشم کے پاس جلد از جلد لیجانا چاہیے۔

س۔ ان ننھے بچوں کے Glaucoma
کی کیا علامت ہے؟

ج۔ سب سے نمایاں بات تو یہ ہے کہ
ایک یا دونوں آنکھیں معمول سے اتنی بڑی ہوتی
ہیں کہ بچے کی شکل ذرا عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔
یہاں تک کہ اس بیماری کو بزرگوں سے "بیل کی آنکھ"
[Ox-eye] کا قرار دیا ہے۔ دوسری
علامت یہ ہے کہ آنکھ کا شیشہ [Cornea
دھندلا ہوتا جاتا ہے اور اس کی چمک کم ہو جاتی ہے۔
اس کی وجہ سے بچے کو روشنی ناگوار ہوتی ہے۔ Photo-
phobia] -- اور آنکھ سے تھوڑا پانی
بھی نکلتا ہے۔ مگر کیچڑ بہت آتا ہے۔

س۔ کیا موتیا بند بھی بچوں میں ہو سکتا
ہے؟ یا صرف بڑی عمر کے لوگوں کی بیماری ہے۔

ج۔ چھوٹے بچوں میں پیدائش سے
موتیا بند ہو سکتا ہے۔ اس کو Congenita
[Cataract کہتے ہیں۔ اس لیے جب
کبھی بچے کی پتلی Pupil [illegible]

ئی سفیدی دکھائی دے تو فوراً کسی ماہر چشم کی
ے لے لینی چاہیے۔ کیوں کہ یہ موتیا بند کے علاوہ
ر بھی کئی خطرناک امراض کی علامت ہو سکتی ہے۔
عمر رسیدہ لوگوں کے موتیا بند کو Senile
Cataract کہتے ہیں۔

س۔ دراصل یہ موتیا بند ہے کیا؟

آنکھ کے جس شیشہ [Cornea]
پہلے ذکر ہوا تھا اس کے پیچھے ایک اور شیشہ یعنی
[Lens] ہوتا ہے۔ یہ عام طور سے بالکل
Transparent ہوتا ہے۔ مگر بڑھتی عمر
ساتھ یا کسی خاص بیماری یا غذائی کمی کی وجہ سے
میں موٹاپن [Thickeness] یا
دلاہٹ Cloudiness آجاتی ہے اور
شنی کو آنکھ کے پردے پر پڑنے میں رکاوٹ
تی ہے۔ اس کو موتیا بند کہتے ہیں۔ کیوں کہ
موتی سے مشابہت رکھتا ہے۔

س۔ اس بڑھتی ہوئی سفیدی کو دور
نے کا کوئی طریقہ بھی ہے؟

ابھی تک اس کے لیے کوئی خاص
ایجاد نہیں ہوئی ہے جس سے یہ سفیدی دور
سکے۔ لہذا اس کا واحد علاج آپریشن ہی ہے۔

کبھی کبھی بچے کی آنکھ کچھ ٹیڑھی معلوم
تی ہے۔

اس کو بھینگا پن یا [Squint]
ہیں۔ یہ پیدائشی بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کبھی کبھی
بیماری۔ مثلاً میعادی بخار [Typhoid]
خسرا [Measles] کے بعد نمایاں

ہو جاتا ہے۔

س ایسا کیوں ہوتا ہے۔

ج یہ آنکھوں پٹھوں [Muscles]
کی کمزوری سے ہو سکتا ہے۔ اور اگر بچّے کی نظر
بھی کمزور ہو تو آنکھ پر زیادہ زور پڑنے سے یہ
[Squint] ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بہت ضروری
ہے کہ اسکول جانے والے بچوں کی آنکھ کا معائنہ
[Eye test] ہر سال ہونا چاہیے اور اگر
نظر کمزور ہو تو صحیح چشمہ پہنایا جائے۔

س تو کیا یہ Squint چشمے ہی سے
ٹھیک ہو جاتا ہے؟

ج اگر ٹھیک وقت پر علاج شروع ہو جائے
تو کسی کسی میں چشمے ہی سے 90% فائدہ ہو جاتا
ہے۔ باقی علاج ورزش Special eye
[exercises] سے ٹھیک ہو سکتے ہیں
یا آپریشن کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ علاج میں
تاخیر کرنے سے اکثر ایک آنکھ کی روشنی میں کافی کمی
ہو جاتی ہے [Lazy eye]۔ اس کے لیے کبھی
کبھی کمزور آنکھ سے کام کروانے کے لیے اچھی آنکھ
کو چند دن تک بند رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے

س یعنی بچّے کی اچھی آنکھ پر پٹی باندھ
دی جاتی ہے۔

ج نہیں پٹی سے تو نقصان ہوتا ہے لہذا
بچے کے چشمہ کے اوپر Patch tape لگا دیتے
ہیں۔ تاکہ اس میں سے دکھائی نہ دے سکے۔ وقتاً
فوقتاً اس Tape کو بدلنا پڑتا ہے۔ اور اس علاج
سے بچے کی کمزور آنکھ کی روشنی دھیرے دھیرے

بڑھ سکتی ہے۔

س   سنا ہے کہ چھوٹے بچوں کو چشمہ نہیں لینا چاہیے۔ ورنہ آنکھ اس کی عادی ہو جاتی ہے۔ اور کمزوری بڑھتی ہے۔

ج   یہ ہمارے یہاں کی عام غلط فہمی ہے جیسا کہ میں نے بتایا چشمہ کا صحیح استعمال Squint کے علاج میں بہت اہم ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر نظر کمزور ہو تو چشمہ سے آنکھ کو سکون ملتا ہے اور دور یا پاس کی چیزیں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ اکثر شروع میں بچے چشمہ لگانے سے گھبراتے ہیں کیونکہ دوسرے بچے اُن کو چھیڑتے ہیں۔ مگر جب ان کو خود زیادہ آرام ملتا ہے تو وہ خوشی سے چشمہ استعمال کرنے لگتے ہیں۔ چشمہ سے بذات خود نظر کی کمزوری میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا ہے۔

س   اچھا یہ بتایئے کہ آنکھوں میں کاجل یا سرمہ لگانا چاہیے یا نہیں۔

ج   کاجل یا سرمہ اگر صفائی سے بنا کر لگایا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور خوبصورتی کی خاطر لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے آنکھ کی روشنی کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا ہے۔ ہاں اگر صفائی سے نہ لگایا جائے تو آنکھ کو نقصان ہو سکتا ہے

س   کھیل کود وغیرہ سے بچوں کی آنکھ میں اکثر چوٹ لگ جاتی ہے۔ اور سنا گیا ہے کہ ایک آنکھ میں چوٹ لگنے سے دوسری آنکھ کو خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے۔

ج   بندوق [Air gun] آتشبازی گلی ڈنڈا، تیر کمان وغیرہ جیسی خطرناک چیزوں کو چھوٹے بچوں کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہیے۔ اسی طرح قینچی، سوئی، چھری وغیرہ بھی بچے سے دور رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اگر اُن سے آنکھ چھد جائے تو اس سے آنکھ میں شدید نقصان ہو سکتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر اس کا فوراً صحیح علاج نہیں ہوا تو دوسری آنکھ پر بھی خراب اثر پڑ سکتا ہے

س   کیا اس طرح کی بگڑی ہوئی آنکھ کی جگہ دوسرے کی آنکھ لگائی جا سکتی ہے

ج   پوری آنکھ تو نہیں بدلی جا سکتی ہے مگر سامنے والا شیشہ [Cornea] کسی دوسرے کے Cornea سے بدلا جا سکتا ہے۔ اس آپریشن کو Corneal Grafting کہتے ہیں اور یہ کامیاب ہو جائے تو آنکھ کی نظر اچھی ہو جاتی ہے

س۔   آخر میں آنکھ کو صحت مند رکھنے کے لیے تھوڑی سی ضروری باتیں بتا دیجیے!

ج   سب سے اہم بات یہ ہے کہ آنکھوں کی صفائی رکھی جائے اور آنکھ کو گندگی دھول اور مٹی سے بچایا جائے۔ سفر وغیرہ کے بعد آنکھوں کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے سے اچھی طرح دھویا جائے۔

بچوں کو اچھی اور مناسب غذا دینی چاہیے اور کوئی بھی غیر معمولی تکلیف ہو تو جلد از جلد کسی ماہر چشم ڈاکٹر کے پاس مریض کو لے جانا چاہیے۔

ڈاکٹر ایس۔ ایم وسیم
شعبہ کامرس

معذور افراد

ان کی فلاح وبہبود اور بحالی

دنیا میں جہاں صحت مند اور تندرست لوگ بستے ہیں وہاں اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں جو اپنی روزی خود پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ وہ اپاہج ہیں۔ ان کے ایک یا دونوں ہاتھ نہیں ہیں یا ٹانگیں کٹ گئی ہیں۔ لیکن زندہ ہیں۔ یا آنکھیں کھو بیٹھے ہیں اور نابینا کہلاتے ہیں۔ یا کسی مرض میں مبتلا ہیں اور اپنی روزی پیدا کرنے کے لیے جس کوشش کی ضرورت ہوتی ہے وہ کر نہیں سکتے۔ افسوس ہے کہ ہمارے سماج میں ان کو بنظر تحقیق دیکھا جاتا ہے۔ لوگ ان کے نام رکھتے ہیں۔ لنگڑا یا کانا کہتے ہیں۔ کچھ رحم دل ان کو دیکھ کر افسوس کرتے ہیں۔ چند پیسوں سے ان کی مدد کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کی کوشش کم ہی ہوتی ہے کہ ان کو اپنی مدد آپ کرنے کے قابل بنایا جائے۔

آزاد ہندوستان میں ان مجبور اور معذور لوگوں کی فلاح وبہبود کا کچھ کام حکومت کر رہی ہے لیکن ہم ہر کام میں سست رفتار ہیں۔ یہی حال دوسرے پسماندہ ملکوں کا ہے۔ انجمن اقوام متحدہ نے اسی بنا پر ۱۹۸۱ء معذور لوگوں کا سال قرار دیا تھا اور تندرست لوگوں کو ان معذور لوگوں کی بھلائی کی طرف متوجہ کیا تھا۔ علی گڑھ میں ان اپاہج لوگوں کی ایک سوسائٹی نے مجلس مذاکرہ بلائی۔ اس میں بہت کم لوگوں نے حصہ لیا۔ لیکن پھر بھی کچھ تو ہوا۔ ڈاکٹر ایس ایم وسیم صاحب نے اس سیمینار میں حصہ لیا تھا۔ انھوں نے معذور لوگوں کے سوال پر ایک مضمون لکھا وہ ہم شائع کر رہے ہیں۔

مدیر مسئول

معذور لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں (۱) ایک جو پیدائشی معذور ہوں اور (۲) دوسرے، وہ جو پیدا تندرست ہوئے ہوں لیکن بعد میں کسی حادثے یا بیماری کی وجہ سے معذور ہوگئے ہوں۔

رحم انسان کا فطری جذبہ ہے۔ اسی لیے یہ امر بالمعروف ہے۔ صحیح وسالم جسم والے جب کسی معذور کو دیکھ کر بجائے اس کے مددگار ہونے کے اس پر فقرے چست کرتے ہیں یا بے اعتنائی کے ساتھ منہ موڑ لیتے ہیں تو یقیناً یہ عمل قبیحہ کے مرتکب ہوتے ہیں۔

[redacted]

سماج کے نظریہ میں تمام خواہ تبدیلی اور معذور افراد کی فلاح وبہبود اور ان کی بحالی کے کاموں میں تیز رفتاری لانے کی غرض سے اقوام متحدہ نے ۱۹۸۱ء کو بین الاقوامی سال برائے معذور افراد“ مانا تھا۔ حکومت ہند نے بھی اسے معذور افراد کا سال مانا تھا۔ اس سال کے دوران بہت سے کام ہوئے لیکن معذور افراد کی تعداد اور کام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی رہ گیا ہے۔

National Arts a   امریکی

Handicapped Information Service کے اندازے کے مطابق ہندوستان میں شدید جسمانی معذوری کے شکار افراد کی تعداد ۵۰ سے ۶۰ لاکھ کے درمیان ہے۔ دستیاب اعداد و شمار کے مطابق معذور بچوں کی تعداد ۳۰ لاکھ کے آس پاس ہے۔

ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں آبادی کا ۷-۶ فی صد حصہ کسی نہ کسی طرح کی معذوری کا شکار ہے۔ طبی تحقیق کی ہندوستانی کونسل کے مطابق ملک میں نابینا افراد کی کل تعداد ۸ لاکھ کے قریب ہے جس میں سے تقریباً تین لاکھ بچے ہیں۔ ذہنی معذوری کے شکار افراد کی تعداد تقریباً ۲۰ لاکھ ہے اور بہرے گونگوں کی تعداد ۲ لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔

معذور افراد کی فلاح و بہبود اور ان کی بحالی کا کام سائنسی اور تکنیکی ترقی کے ساتھ ساتھ زیادہ آسان ہوتا جا رہا ہے۔ بہت پہلے ہنری فورڈ نے اپنی کمپنی میں ایک ایسا شعبہ قائم کیا تھا جہاں مختلف قسم کے معذور لوگوں کے لیے کام مہیا کیا جاتا تھا۔ تاکہ زندگی کی شاہراہ پر انھیں بحال کیا جا سکے۔

امداد کا اپنا ایک مقصد ہے۔ لیکن محض ہمدردی اور رحم سے معذور افراد کی زندگیوں میں درد رنگ نہیں بھر سکتے ہیں۔ انھیں باہمت اور باصلاحیت انسان کی طرح عمل پیرا ہونے کا حوصلہ عطا کرنا ہے۔ ان معذور افراد کو مجبور اور بے سہارا سمجھ کر انھیں سماج پر ایک بوجھ تصور نہیں کیا جانا چاہیے۔ ہمیں کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ بحالی کے مواقع فراہم کر کے معذور لوگوں کو بھی ملک کی ترقی اور تعمیرِ نو کے کاموں میں برابر کا شریک کیا جائے۔

معذور لوگوں کی فلاح و بہبود اور ان کی بحالی کے مقاصد کے پیشِ نظر ہمیں مندرجہ ذیل نکات پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔

۱۔ قومی سطح پر ایک کمیٹی کی تشکیل کی جانا چاہیے جس میں سرکاری اور نجی صنعتی علقے کے نمائندوں کے علاوہ سرکار کے نامزد نمائندے بھی ہوں۔ اس کمیٹی کا کام ان کاموں کا پتا لگانا ہونا چاہیے جنھیں معذور لوگ خوبی انجام دے سکتے ہوں۔ ایسے مناسب اوزاروں اور مشینوں کی فراہمی اور ایجاد کے منصوبے بھی تیار کرنے چاہییں۔ تاکہ ان کی مدد سے مختلف قسم کی معذوری کے شکار افراد کے لیے کوئی نہ کوئی کام مہیا کیا جا سکے۔ کمیٹی کو محدود وسائل کے پیشِ نظر معذور افراد کی فلاح و بہبود اور ان کی بھلائی کے کاموں کو ان کی اہمیت کے حساب سے درج فہرست کرنا چاہیے تاکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام ہو سکے۔

۲۔ ایسے مالکوں اور اداروں کی فہرست شائع کی جانا چاہیے جو مہارتی [SKILLED] اور نیم مہارتی [SEMI-SKILLED] اور غیر مہارتی [UNSKILLED] کاموں پر معذور لوگوں کو لگانا چاہتے ہیں۔ ساتھ ان کاموں اور روزگار کے مواقع کو بھی درج کیا جانا چاہیے۔

۳۔ آبادی کے اعداد و شمار (Census) کے فارم میں معذوری سے متعلق معلومات کے لیے ایک کالم کا اضافہ کیا جانا چاہیے۔ تاکہ معذوروں

سے متعلق سب ہی معلومات حاصل کی جا سکیں۔

۴۔ ایک قومی فنڈ [NATIONAL FUND FOR THE REHABILITATION AND WELFARE OF THE DISABLED.] قائم کیا جانا چاہیے۔ ایسا فنڈ صوبائی حکومتوں کو بھی قائم کرنا چاہیے۔

۵۔ یونیورسٹیوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں سماجی اور دیگر علوم کے شعبوں میں معذور لوگوں کے مسائل اور ان کے حل تلاش کرنے کی غرض سے معذور افراد کی تعلیم و تربیت کے لیے یونیورسٹیوں کو خاطر خواہ امداد دیتے رہنا چاہیے۔

۶۔ یونیورسٹیوں میں [جیسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں] ایک شعبہ معذوروں کی پیشہ ورانہ تعلیم اور بحالی [Dept. for Vocational Education and Rehabilitation of the Disabled] کے لیے قائم کیا جانا چاہیے۔

۷۔ مختلف یونیورسٹیوں میں اور ہر یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں معذور افراد کے مسائل اور ان کے حل سے متعلق اسباق ہوئی تحقیق کی قومی فہرست [National Bibliography] تیار کی جانا چاہیے تاکہ مزید تحقیق اور غور و فکر میں مدد مل سکے۔

۸۔ اخبارات کو ایک کالم معذور لوگوں اور ان کے مسائل سے متعلق خبروں کے لیے مخصوص کر دینا چاہیے۔

۹۔ خود سماجی کارکنوں، تربیت دینے والوں اور معذور لوگوں کی فلاح و بہبود اور بحالی کے کام کرنے والوں کو تربیت دینے کے لیے ایک ادارے کی تشکیل کی جانا چاہیے تاکہ مقاصد کے خاطر خواہ حصول میں کم سے کم وقت صرف ہو۔

۱۰۔ ایک قومی جریدے کا اجراء ہونا چاہیے جو معذور لوگوں کی فلاح و بہبود اور ان کی بحالی کی ملکی، صوبائی اور مقامی خبروں کو شائع کرے اور ان کے مسائل پر روشنی ڈالے اور ساتھ ہی بین الاقوامی سطح پر کیے جانے والے کاموں کا جائزہ بھی لے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اگر ہم سب مل جل کر اپنی ذمہ داری کا احساس کر لیں تو معذور اپنی منزل آپ ہی تلاش کر لیں گے اور ہم صحت و سلامتی کے لیے خالق کے شکر گزار ہوں گے۔

لائقِ توجہ

ہمارے بہت سے کرم فرما حضرات ڈرافٹ بھیجتے وقت اس میں کچھ ایسے اضافے کر دیتے ہیں جن سے ہمیں کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

درخواست ہے کہ چیک یا ڈرافٹ پر صرف "نام" قاضی معزالدین احمد تحریر فرمائیں۔

مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی

اسلام کا نظامِ شوریٰ

اسلامی حکومت کے اصولِ شوریٰ کے بارے میں عرض ہے کہ شوریٰ در حقیقت رائے عامہ کے اظہار کا نام ہے۔ اور شوریٰ کا مقصد ہے لوگوں کی رائے معلوم کی جائے اور یہی اصول ہے جو موجودہ زمانے کے پارلیمانی نظام کی بنیاد ہے۔

جس کی داغ بیل اسلام نے اس وقت ڈالی تھی جب یورپ جمہوریت اور پارلیمنٹ کے مفہوم سے بھی نا آشنا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ارشاد ہے شاورهم في الامر۔ یعنی حکومت کے معاملات میں شوریٰ اختیار کیجیے اور مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کے بارے میں یہ اصول طے کر دیا گیا کہ "امرهم شوریٰ بینهم" یعنی ان کے تمام کام شوریٰ کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔

اسلامی قانون کے ماہرین اور علماء اسلام کے نزدیک یہ بات مسلّمہ ہو چکی ہے کہ شوریٰ ہی اسلامی حکومت کی اساس اور اس کے فیصلوں کی بنیاد ہے۔

حضرت ابن عباس نقل کرتے ہیں کہ جب شوریٰ کا حکم آیا تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگرچہ اللہ اور اس کا رسولؐ شوریٰ سے مستغنی ہے مگر یہ حکم امت کے لیے رحمت ہے اور جو اس کے حکم پر عمل کرے گا وہ اعلیٰ درجے کی رہنمائی سے محروم نہ ہوگا اور جو شوریٰ کو ترک کرے گا وہ غلط راہ روی سے نہ بچ سکے گا۔ (روح المعانی)

ابن جریرؒ کی روایت ہے۔ قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ کو وحی نازل ہونے کے باوجود اپنے اصحابؓ سے مشورے کا حکم ملا تھا اور یہ اس لیے تھا کہ قوم کو پورا اطمینان حاصل ہو جائے اور یہ کہ شوریٰ امت کے لیے قانون بن جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اپنے رفقاء سے مشورہ کرنے میں اتنا زیادہ سرگرم ہو جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (ترمذی)

اسی مفہوم کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو تحریری یہ ہدایت کی کہ رسول اللہؐ عام قانون شوریٰ پر عامل تھے۔ تم بھی لازماً اس پر عمل کرنا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ حضرت عمرؓ کے تعامل سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ عورتوں سے بھی مختلف معاملات میں رائے لیتے تھے۔

تفسیر مظہری جلد دوم ص ۱۶۱ از مولانا قاضی

ثناء اللہ پانی پتی نے ضحاکؒ کا ایک بیان نقل کیا ہے کہ فاروق اعظمؓ نے عورتوں کو بھی حق رائے دہی دیا تھا۔

ان امور کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امیر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے لیے ایک مجلس شوریٰ بنائے۔ کیونکہ ایک شخص ہر معاملہ میں اتنی واقفیت اور مہارت نہیں رکھتا جتنا معاشرے کے دوسرے افراد رکھتے ہیں۔ مکی دور میں اجتماعی مشوروں کے لیے دار الارقم کو مجلس شوریٰ کا ایوان بنایا گیا تھا مدنی دور میں حضورؐ کے زمانہ تک کھلے میدانوں کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور مسجد نبوی میں بھی اس طرح کے اجتماعات ہوتے تھے۔ خلافت راشدہ میں سب سے پہلے سقیفہ بنی ساعدہ سے ایوان شوریٰ کا کام لیا گیا۔

جب اسلامی حکومت کے ایک اصول کی حیثیت سے شوریٰ کا مسئلہ زیر بحث آتا ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امیر حکومت خلیفہ وقت یا امام المسلمین اس کا پابند ہے یا نہیں۔ ہم اس مقالہ کو اس بحث پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں اور یہ اس لیے کہ اسلامی نظام حکومت میں امیر کی حیثیت اور اس کے اختیار متعین ہو جائیں۔ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ امیر آزاد ہے اور شوریٰ کے فیصلے کا پابند نہیں۔ اس اعتبار سے امیر کی حیثیت ان کے نزدیک آمر مطلق یعنی ڈکٹیٹر کی ہو جاتی ہے اور شوریٰ کی اہمیت اور حیثیت صفر کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔

اسلامی حکومت شورائی حکومت ہے اور امام اس کا با اختیار رہنما اور صاحب تنفیذ قوت ہے اس لیے قدرۃً امام شوریٰ کے اختیارات کا نمائندہ ہے اور انتظامی معاملات میں مجلس شوریٰ کے فیصلوں کا ترجمان ہے۔

قرآن کریم میں ہے [وامرھم شوریٰ بینھم] یعنی مسلمانوں کے معاملات اور انتظامی امور آپس کے مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ یہ حکم عام ہے کہ حکومت کے صدر نشین کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجلس شوریٰ کے فیصلہ دینے کے بعد بھی اپنی اس ذاتی رائے پر عمل کرے جو مجلس شوریٰ کے فیصلے کے خلاف ہو۔ حکومت کے امیر اور سربراہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ارباب حل و عقد سے مشورہ لے اور اس مشورہ کی پابندی کرے۔

بہت سے حضرات کو قرآن مجید کی ایک دوسری آیت سے غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے اس سے غلط نتیجہ نکالا ہے وہ آیت یہ ہے۔

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ

معاملات میں اپنے اصحاب سے مشورہ کر لیا کیجیے اور جب آپ معاملہ متعلقہ میں عزم کر لیں تو اعتماد خدا ہی پر رکھیے۔

ان الفاظ سے بہت سے لوگوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مشورہ کرنا تو امام کے لیے ضروری ہے مگر مشورے کی پابندی ضروری نہیں۔ آیئے غور کریں کہ عزم سے پیدا ہونے والی رائے شوریٰ کے فیصلے کی پابند ہے یا نہیں۔ غور فرمایئے کہ قرآن میں شوریٰ کا پہلے ذکر کیا گیا ہے اور عزم کا بعد میں اور اس لیے منشا اور مقصد یہ ہے کہ کسی معاملے کو

طے کرنے کے لیے مجلسِ شوریٰ طلب کی جائے اور یہ
مجلس جو فیصلہ کر دے وہ عزم کی بنیاد بن جائے۔ ظاہر
ہے کہ اگر امیر یا امام شوریٰ کے فیصلے کو نظر انداز کر دیا
کرے گا اور ذاتی و شخصی رائے پر عمل کرتا رہے
گا تو یہ بات مجلسِ شوریٰ کے لیے ازالۂ حیثیت عرفی
کے مترادف ہوگی اور ایسے امیر اور ڈکٹیٹر کے درمیان
کیا فرق رہ جائے گا۔

دوسری بات یہ ذہن میں رکھنی ہے
کہ اس آیت میں خطاب بطور رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے ہے اور پیغمبر کے احکام شوریٰ کے
باوجود واجب التعمیل ہوتے ہیں۔ کیونکہ پیغمبر
کی ایک حیثیت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ اس زمین
پر خدا کی آواز ہوتا ہے۔ اس آیت کی رو سے
کسی صدرِ حکومت کو وہ اختیارات حاصل نہیں
ہو سکتے جو آپؐ کی ذات کو مخاطب کر کے آپؐ کے
ساتھ مخصوص کر دیے گئے ہوں۔ ہمارا مقصد اس
بحث سے یہ ہے کہ اس بات سے اگر کسی کو انکار
ہے کہ عزم کا تعلق شوریٰ کے فیصلے سے ہے تو بھی
یہ بات نظر انداز کرنے کی نہیں کہ یہ حکم آپؐ کی
پیغمبرانہ حیثیت کی وجہ سے آپؐ کے ساتھ مخصوص
ہے۔ امرھم شوریٰ بینھم یعنی مسلمانوں کے
کام شوریٰ سے طے پاتے ہیں۔ قرآن میں یہ الفاظ
ایک مستقل دفعہ کی صورت میں موجود ہیں اور اس
کے خلاف کسی حکومت کا کوئی امیر حرکت نہیں کر سکتا
چنانچہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں آیت عزم کی تشریح
کرتے ہوئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ
روایت نقل کی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت
کیا گیا کہ عزم سے کیا مراد ہے تو آپؐ نے
ارشاد فرمایا کہ اہلِ رائے کا باہمی
مشورہ اور اس کے بعد شوریٰ کے
فیصلے کی پیروی۔

معلوم ہوا کہ عزم حقیقت میں وہ ارادہ ہے جو
امام کے دل میں شوریٰ کے فیصلے پر کاربند ہونے کے
لیے پیدا ہوتا ہے۔ اس آیت عزم کے سلسلے میں احکام
القرآن میں امام ابوبکر الجصاص نے واضح طور پر لکھا
ہے۔ قرآن میں عزم کا ذکر شوریٰ کے بعد آیا ہے
اور یہ اس کی دلیل ہے کہ فیصلہ اور عزم وہی معتبر ہے
جو شوریٰ کے فیصلے کا نتیجہ ہو اور یہ شوریٰ سے صادر
ہوا ہو۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی بات لکھی ہے۔
ان تمام تصریحات کے بعد امام کے شخصی فیصلے کو شوریٰ
کے فیصلے پر ترجیح دینا درست نہ ہوگا۔

اگر کسی کا ذہن ان تصریحات سے
مطمئن نہیں ہوتا اور اس کا یہ اصرار قائم رہتا ہے
کہ امام کے شوریٰ کے فیصلے کے پابند ہونے پر کوئی
نص یا اشارہ موجود نہیں ہے تو وہ اس بات کا اقرار
کم سے کم کریں گے کہ اس دائرہ خاص میں کوئی واضح
اور متعین حکم نہیں ہے۔ ان اصحاب کے لیے اکیلے
سوچنے کی بات ہے کہ نبوت اور خلافت راشدہ
کے عہد کو چودہ سو سال گزر چکے ہیں۔ خلفاء راشدین
کا درجہ تو بہت اونچا ہے۔ اب جو لوگ مسلمانوں
میں ہیں۔ وہ تقویٰ، خوفِ خدا اور احساسِ ذمہ داری
میں ان کے خاکِ پا کے برابر بھی نہیں۔ کیا ایسے
معاشرے میں کسی فرد واحد کو بے لگام اور مطلق العنان

بنا دینا درست ہوگا۔ کیا تنہا ایک فرد کو ارباب حل و عقد کے فیصلوں سے آزاد اور مسلمانوں کے معاملات کا تنہا ذمہ دار بنا دینا مناسب ہوگا؟

بعض لوگوں کو اس معاملے میں جو غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے سربراہ حکومت کو مختار مطلق مان لیا ہے۔ اس کی وجہ سیرت و تاریخ کے تین واقعات ہیں جنھیں صحیح ڈھنگ سے نہیں سمجھا گیا۔ ایک صلح حدیبیہ کا واقعہ دوسرے حضرت ابوبکر کا جیش اسامہؓ کو رخصت کرنا۔ تیسرے مرتدین زکوٰۃ کے بارے میں آپ کا عمل

اس سے پہلے کہ ان تینوں واقعات کی صحیح تصویر پیش کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علماء اسلام کی ایک تصریح کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں دو قسم کی ذمہ داریوں پر فائز تھے ایک منصب رسالت دوسرے منصب امامت یہی ذمہ داریاں ہیں جن سے آنحضرت صلعم کے طرز میں فرق ہو جاتا ہے۔ آپ منصب رسالت کا کام خدا کے حکم کے مطابق انجام دیتے تھے اور منصب امامت کا کام شوریٰ کے ذریعے سے۔ منصب رسالت کے کام کو ادا کرنے میں آپ مشورہ کر لیتے تھے لیکن یہ مشورہ لینا صرف تعلیم امت کے لیے تھا۔ مشورہ طلب کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری نہ تھا۔ یہاں صرف خدا کا حکم واجب التعمیل ہوتا تھا۔ البتہ اس متعین شکل کے علاوہ آپ نے کبھی اپنے عزم کو شوریٰ کے خلاف استعمال نہیں کیا۔ شوریٰ کی پابندی کرنے کی مثالیں سیرت میں بہت سی ہیں۔ مثال کے طور پر آپؐ کا اپنی خواہش کے علی الرغم مدینہ سے باہر نکل کر ۳ھ میں جنگ کرنا جو غزوۂ احد کے نام سے جانا جاتا ہے اور غزوۂ بدر کے موقع پر آپؐ نے اپنی خواہش کے خلاف دوسروں کے مشورہ پر دوسری جگہ محاذ قائم کیا۔

آپ صلح حدیبیہ کے واقعہ کو لیجیے یہ ان واقعات میں سے ہے جن کو امام کے اختیار مطلق کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ صلح عام رائے کے خلاف صرف پیغمبرانہ ذمہ داری کے ماتحت طے پائی۔ رائے عامہ بڑی چیز ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی ہر چیز سے بلند و بالا ہے جب عام لوگوں نے یعنی صحابہ کرام نے اس صلح پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمایا کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ میں اس کے حکم کے خلاف کچھ نہ کروں گا۔ مجھے یقین ہے کہ خدا میرے عمل کو ضائع نہ کرے گا۔"

ان الفاظ سے یہ بات ظاہر ہے کہ رائے عامہ کے احتجاج کو آپؐ نے کس لیے نظر انداز کر دیا۔

دوسرا واقعہ جیش اسامہؓ کا ہے جو ۱۱ھ میں پیش آیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صدیق اکبرؓ نے آنحضرت کی وفات کے بعد حضرت اسامہؓ کی فوج کو شام کے محاذ پر روانگی کا حکم دیا۔ حالاں کہ اسلامی حکومت کا پایۂ تخت مدینہ قبائل کی بغاوت کی وجہ سے سخت خطرات سے دوچار تھا۔ اور صحابہ کرامؓ کا مشورہ یہ تھا کہ

اس وقت اس فوج کو باہر نہ روانہ کیا جائے۔
اس واقعہ سے امیر وقت کو آمر مطلق قرار دینا تاریخ کے واقعہ کی غلط تعبیر ہوگی۔ اس معاملہ میں صدیق اکبرؓ نے جو کچھ بھی کیا اس میں مطلق انسانی کو ذرا بھی دخل نہ تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ وہ فوج ہے جس کو محاذ پر جانے کا حکم خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے۔ اور اس لشکر کو بھیجنا حضورؐ کی آخری وصیت اور آخری حکم پر عمل کرنا ہے۔ اور صحابہؓ کے مشورہ کے مقابلہ میں پیغمبر کا حکم زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

تیسرا واقعہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کا عمل جہاد ہے۔ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد مدینہ کے اطراف میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے خلاف بغاوت پھیل گئی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ نماز تو ہم پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ لوگوں نے یہ مشورہ دیا کہ حالات کا تقاضا ہے کہ نرمی سے کام لیا جائے اور مانعین زکوٰۃ سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ صدیق اکبرؓ نے اس مشورہ کو رد کردیا۔ اور انھوں نے ارکان شوریٰ کو یاد دلایا کہ زکوٰۃ خدا کے حکم سے واجب ہے اور خدائی احکام میں شوریٰ کو کمی بیشی کا اختیار نہیں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی تقریر کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی شرح صدر ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے صحیح ہے اور اللہ نے ان کا دل جہاد کے لیے کھول دیا ہے۔ اس [illegible] سے میں علامہ نوویؒ نے شرح مسلم میں بحث کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی تقریر کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کی دلیل کے قائل ہو گئے تھے۔

یہ بڑی نادانی ہوگی کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ لوگوں کے سامنے شریعت کے اصول پیش کر رہے ہوں اور اس واقعہ کو سامنے رکھ کر کچھ لوگ یہ بات دماغوں میں بٹھانے کی کوشش کریں کہ خلیفہ اول شوریٰ کے فیصلوں کو رد کر کے اپنے شخصی عزم پر عمل کرنے کے عادی تھے اور مطلق العنان آمر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔

اسلام نے جمہوریت کا جو مزاج بنایا ہے وہ آج بھی دنیا کی قوموں کے لیے نمونہ اور نشان کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج مدتوں کے بعد دنیا نے اسلام میں اسلامی نظام کو اپنانے اور غیر اسلامی نظاموں کو رد کر دینے کی خوش آئند اور خوش گوار لہر چل پڑی ہے۔ اس لیے اسلامی نظام کے مطابق دستور سازی کے مرحلے بھی پیش آئیں گے۔ اور دستور سازی میں یہ مسئلہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے کہ سربراہ حکومت اپنی شوریٰ کا پابند ہے یا شوریٰ کے فیصلے سے آزاد یہ باتیں جو گوش گذار کی گئی ہیں امید ہے کہ بہت سے دماغوں پر دستک دیں گی۔ اور اہل الرائے اس کے بارے میں غور و فکر سے کام لیں گے۔

***

(بہ شکریہ ندائے ملت۔ لکھنؤ)

پروفیسر اے۔ رحمٰن
سی۔ایس آئی۔آر سی دہلی

ترجمہ: شہناز ہاشمی

ہندوستانی سائنس اور بیرونی اساطیر

آخری قسط

سائنس کی تاریخ میں بہت سی اساطیر یا دیومالائیں ہیں۔ خاص کر ہندوستان میں سائنس کی نشو ونما کے متعلق۔ ان میں سے چند حکایتیں یہ جتاتی ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کی سائنس اور صنعت میں ہندوستان کی کوئی خاص شرکت نہیں رہی۔ مثلاً سائنس کی تاریخ کے مشہور عالم جارج سارٹن مرحوم کہتے ہیں۔

"ہندو تہذیب کو روزِ اول سے مسلمان فاتح لوگوں نے اکثر مقامات پر مجبور و مغلوب کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ مسلم درباروں میں مسلم علماء کی سرپرستی کی گئی...... مسلم حملہ آوروں نے اگرچہ ہندو تہذیب اور کبھی کبھی بدھ تہذیب کو برباد نہ بھی کیا تب بھی وہ اسلامی تہذیب کے علاوہ ہر تہذیب سے بے نیاز رہے۔ انھوں نے صرف اپنے دانشوروں کی ہمت افزائی کی اور مغربی ذرائع سے فیض یاب ہوئے۔ یعنی بذریعہ عربی اور فارسی"

"تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی جو پالیسی علم ودانش کے میدان میں اختیار کی گئی اس نے ہندوستانی سائنس کی روایت کا صحیح تجزیہ کرنا اتنا مشکل کر دیا کہ اس کا مطالعہ کبھی مجموعی طور پر نہ ہو سکا۔ زبانوں کی بہتات اور ان میں سے کچھ کا کسی نہ کسی مذہب سے رشتہ، جیسے پالی کا بدھ مت سے، سنسکرت کا ہندو مذہب سے اور عربی و فارسی کا اسلام سے، ایک ایسا آسان آلہ بن گیا جس کے ذریعہ ایک روایت کو دوسری سے علیحدہ کر دیا گیا اور ایک زبان کے علماء کو دوسری زبان کے علماء کے مخالف سمت میں کھڑا کر دیا گیا۔ اس پالیسی نے یہ مفروضہ قائم رکھا کہ سائنس کا ارتقاء صرف قدیم ہندوستان میں ہوا لیکن قرونِ وسطیٰ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ اس طرح جہاں ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کے مخالف ہو گئے، وہاں یہ مقصد بھی حاصل ہوا کہ ہندوستانیوں کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان میں سائنس کا وجود نہ تھا جب تک کہ انگریزوں نے اسے انگریزی تعلیم کے ساتھ جدید سائنس اور تعلیم کے نام سے متعارف نہ کرایا۔

قرونِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے تحقیقی مطالعہ سے جو تصویر ابھرتی ہے وہ اس نو آبادیاتی نظریہ کے بالکل برعکس ہے جو انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے سیاسی مقاصد کے پیش نظر تعمیر کیا تھا۔ اور جو یورپین نظریات اور علوم میں بھی سرایت کر گیا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں سائنس اور صنعت پر ہندوستانی مسودات سے متعلق حال ہی میں ترتیب دی ہوئی ایک،

فہرست پر نظر ڈالنے سے سارٹن اور دوسروں
کا قائم کیا ہوا تاثر زائل ہو سکتا ہے۔
ان مسودات کے مطالعہ سے
اندازہ ہوتا ہے کہ قرون وسطیٰ کے ہندوستان
میں سائنس نے کافی ترقی کی تھی اور اس کا اتنا
ہی اظہار عربی و فارسی میں ہوا، جتنا سنسکرت
میں ہوا۔ اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ سنسکرت
سے عربی اور فارسی میں ترجمے کیے گئے اور کسی
قدر کم تعداد میں ترجمے عربی اور فارسی سے سنسکرت
میں کیے گئے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جتنے تراجم
موجود ہیں ان سے کہیں زیادہ معلومات و خیالات
کے تبادلے ان زبانوں میں ہوئے۔ کیوں کہ اس
زمانہ میں زبانی مباحثوں کا رواج تھا۔ اس کا ثبوت
ان مسودات سے بھی ملتا ہے جن میں بیشتر کا پورا
مطالعہ آج تک نہیں ہوا ہے۔ ان کے مطالعہ سے باہمی
ربط و ضبط، استفادہ، تصرف اور امتزاج خیالات
پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔
استاد احمد الامار (معمار) لاہوری
کے خاندان کو سنسکرت پر خوب عبور حاصل تھا۔
اور کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے سنسکرت کی بہت
سی تحریروں کا ترجمہ کیا۔ جس سے دونوں روایتوں
کا امتزاج ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح راجہ سوائے
جے سنگھ دوئم کو علم نجوم میں جو مہارت حاصل
تھی، وہ دونوں روایات کی ہم آہنگی کی نمائندگی
کرتی ہے۔ صنعت کے میدان میں دربار اکبر
کی آرائش میں شیرازی کی فن کاری کے نمونے
دونوں صنعتی روایتوں کے سنگم کی مثال پیش

کرتے ہیں جس نے دیسی طور پر مزید ترقی کی
سائنس اور صنعت کی صحیح تاریخی آگہی
کے لیے اور یورپین تعصب کو جو اب تک اس مطالعے
پر حاوی رہا ہے دور کرنے کے لیے ایشیائی عملی
کاوشوں کا مطالعہ اشد ضروری ہے۔ ایشیائی
تہذیب کے علاقے جو وسط ایشیا سے انڈونیشیا
تک پھیلے ہوئے ہیں اور جن میں مغربی ایشیا
بھی شامل ہے (جو اب روس کا حصہ ہے)
واحد علاقہ تسلیم کر لینا چاہیے۔ حالاں کہ ان
کی زبانیں اور مذاہب مختلف ہیں جو قرون وسطیٰ
کے مختلف زمانوں میں مختلف حصوں پر حاوی رہے
ہیں۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور دوسری زبانوں
میں اس زمانے کے ادب کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات
واضح ہوتی ہے کہ یہ سارا زمانہ مسلسل ربط و ضبط کا
زمانہ تھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں یورپین
نوآبادیاتی اثرات نے یہ سلسلہ منقطع کر دیا جب
چند خطوں کے علاوہ زیادہ تر ممالک نوآبادی
یا نیم نوآبادی ممالک بن گئے اور یورپ کی صنعت
کو خام اشیاء فراہم کرنے میں مصروف ہو گئے۔
ایشیا کے مختلف علاقوں میں قرون وسطیٰ کی
سائنس و صنعت کی روایتوں کا تقابلی مطالعہ
نہ صرف یورپین ترقی کی رفتار کو پرکھنے بلکہ
جدید ارتقائی مسائل کو سمجھنے میں بھی معاون
ثابت ہوگا۔

(بہ شکریہ "انڈین ایکسپریس")

محمد یونس قاضی

خوفِ خدا

" بڈھا مجھ سے چبتا نہیں
جوان میرے بس کا نہیں
بچہ مجھے ملتا نہیں
ہُوہُو، ہُوہُو، ہُوہُو....."

بھیڑیے کی کہانی نہ جانے کتنی مرتبہ بچوں نے آپا فاطمہ سے سنی۔ مگر کبھی سیری نہیں ہوئی۔ ایک تو بھیڑیے کا تصور ہی شجاعت کو للکارتا تھا' ادپر سے آپا کا طرز بیان' اکثر گمان ہوتا کہ آیا" اور قریب ہی سے بول رہا ہے۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی کہ آنکھ کھول کر گرد وپیش نظر ڈال لے کہ حقیقت کیا ہے

اصلی مزہ تو اس وقت آتا جب بھیڑیا بھوک سے بے تاب ہو کر بکری کے تینوں بچوں کو چٹ کر جاتا اور بکری انصاف کی دہائی دیتی ہوئی قاضی صاحب کی عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کرتی۔ تین پیادے بھیڑیے کو پکڑنے کے لیے بھیجے جاتے اور جب وہ عدالت کے سامنے آتا تو قاضی صاحب کڑک کر اس سے پوچھتے۔

" تم نے اس کے بچے کھائے ہیں؟"

" قسم کھڑ بنے کی' میں نے نہیں کھائے"

بھیڑیا جواب دیتا۔ مگر اتنے میں اس کے پیٹ میں سے "میں میں" کی آواز آنے لگتی۔ اور یہ ثابت ہو جاتا کہ بھیڑیا جھوٹ بول رہا ہے خوب پٹائی ہوتی اور بھیڑیے کو بکری کے بچے واپس کرنا پڑتے۔ کہانی سننے والے اسی خاتمہ بالخیر کے منتظر رہتے۔ ان کے ننھے دل ظلم سے آشنا نہ تھے اس لیے اس بھیڑیے کو سزا ملنے پر بڑی خوشی ہوتی اور وہ اس یقین کے ساتھ سوتے کہ ظلم پھر سر نہ اٹھائے گا۔

رفتہ رفتہ کہانی سننے والے بڑے ہو گئے اور اسکول جانے لگے۔ اب بجائے دوسروں سے کہانیاں سننے کے آپا فاطمہ ہی کو کتاب سے کہانیاں سنانے لگے۔ ماحول کا جب شعور آیا تو انھیں یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا کہ آپا فاطمہ ان کی سگی بہن نہیں تھیں۔ مگر جو دلی رشتہ بچپن میں آپا سے قائم ہو گیا تھا وہ بدستور قائم رہا۔

ایک مرتبہ آپا اپنے گاؤں گئیں اور وہیں یکایک ان کا انتقال ہو گیا۔ انتقال کے کچھ دن بعد یہ طے پایا کہ ان کے کپڑے وغیرہ پڑوس کے ایک غریب خاندان کو دے دیے جائیں۔ مگر جب آپا مرحومہ کا صندوقچہ کھولا گیا تو اس میں کپڑوں کے علاوہ سونے کے زیورات اور سونے کی ڈلیاں نکلیں۔ میرے والد کو اطلاع دی گئی۔ انھوں نے فرمایا کہ چونکہ ہم میں سے کوئی مرحومہ کا شرعی وارث نہیں اس لیے ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ ان کی قیمتی چیزوں کا لے لینا تو درکنار

خیرات میں بھی کسی کو دیں۔

آپا مرحومہ کے شوہر برس ہا برس سے لاپتہ تھے۔ بمبئی نوکری کی تلاش میں گئے تھے پھر نہ کوئی خط آیا اور نہ وہ خود آئے۔ اولاد کوئی تھی نہیں۔ البتہ ان کے اپنے حقیقی چچا زندہ تھے۔ جنھوں نے مرحومہ کو کبھی نہ پوچھا کہ کس حال میں ہو میرے والد نے انھیں خط لکھا کہ مرحومہ کی چیزیں آ کر لے جائیں۔ جب کوئی جواب نہیں آیا تو دوبارہ لکھا گیا اور یہ وضاحت کردی گئی کہ چیزیں قیمتی ہیں

جون کا مہینہ تھا اور سخت لو چل رہی تھی

بمبئی آپا فاطمہ کے چچا آئے۔ والد صاحب نے پورا واقعہ سنایا اور کہا کہ اگر انھیں ذرا بھی شائبہ ہوتا کہ صندوق میں یہ سب کچھ ہے تو وہ ہرگز اسے کھولنے کی اجازت نہ دیتے۔ بہرحال "حق بہ حق دار رسید" یہ کہہ کر والد صاحب نے چچا جان صاحب کو دے دی۔ ظاہر ہے کہ اس غیر متوقع دولت کو دیکھ بہت خوشی ہوئی۔ کھانا کھانے ہی اصرار کرنے لگے کہ وہ تین بجے والی گاڑی سے واپس چلے جائیں گے۔

چلتے وقت انھوں نے میرے والد سے کہا۔

"ممی میاں! یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے کیوں لکھا؟ کون سوچ سکتا تھا کہ فاطمہ کے پاس یہ سب کچھ ہوگا۔ پوری زندگی تم نے اس کی مدد کی تم اپنا حق سمجھ کر اگر رکھ لیتے تو کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوتی۔ تم نے مجھے کیوں بلایا

میرے والد نے جواب میں کہا۔

"آپ صحیح فرماتے ہیں۔ میں دنیا سے چھپا سکتا تھا۔ مگر اس سے کیسے چھپاتا جو دیکھ رہا تھا!"

میں شاید چوتھی جماعت میں تھا جب یہ گفتگو میری موجودگی میں ہوئی۔ اس وقت اس کی اہمیت کو نہ سمجھ سکا۔ جب عملی زندگی میں داخل ہوا تب احساس ہوا کہ میرے والدین مجھے کتنی بڑی دولت دے گئے

خوفِ خدا صرف خدا کے ماننے والوں ہی کے دل میں نہیں ہوتا ہے۔ اپنے غیر محتاط یا یوں کہیے کہ غیر وکیلانہ لمحات میں کارل مارکس نے بھی ضمیر [Conscience] اور "حق" [The Truth] کا سہارا لیا ہے۔ حالانکہ ان کے اپنے فلسفہ میں ان دونوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مزید برآں انھوں نے انگریز فیکٹری انسپکٹروں کی غیر جانب داری اور راست گوئی کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ اپنے سے یہ پوچھنا بھول گئے کہ انگریز فیکٹری انسپکٹروں کے یہ اوصاف کہاں سے آئے؟ مارکسی فلسفہ کے مطابق تو انھیں اپنے طبقاتی مفاد کے تحفظ میں جھوٹ بولنا اور مزدوروں کا دشمن ہونا چاہیے تھا

ذاکر صاحب

اشتیاق محمد خاں
بمبئی

ذاکر صاحب سے میرا تعلق تقریباً بائیس سال تک رہا۔ جامعہ ملیہ کی طالب علمانہ زندگی سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تک۔ یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے بعد ذاکر صاحب بہار کے گورنر مقرر کیے گئے۔ پھر نائب صدر اور پھر صدر جمہوریہ کے عہدوں پر فائز رہے۔ یہ مدت تقریباً دس سال کی ہوتی ہے۔ اس میں میرا اور ان کا تعلق خط و کتابت کے ذریعہ برابر قائم رہا۔

ذاکر صاحب کی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول جامعہ ملیہ سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی تک یعنی تیس سالہ تعلیمی دور، دوم سرکاری عہدوں (گورنر سے صدر جمہوریہ تک) کا دور۔

لیکن سچ تو یہ ہے کہ ذاکر صاحب کے پہلے دور کی "شخصیت" کے نقوش اتنے موثر، مثبت، عملی، بھرپور اور گہرے ہیں کہ دوسرا دور ماند پڑجاتا ہے۔

جامعہ ملیہ میں ذاکر صاحب شیخ الجامعہ یا وائس چانسلر تھے۔ لیکن انھوں نے کبھی اپنے ساتھی استادوں کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ وہ اُن سے کسی لحاظ سے برتر یا بڑے ہیں۔

جامعہ کے پرائمری اسکول میں جب جاتے تو بچوں میں بچّہ بن جاتے تھے۔ ان کے ساتھ کھیلتے، کہانیاں سناتے۔ شام کے وقت اکثر ثانوی اسکول کے بچوں کے ساتھ لان میں بیٹھے ہوئے نظر آتے۔ خود کم بولتے لیکن بچّوں کو زیادہ سے زیادہ بولنے کے لیے اُکساتے۔

[ایک اچھے معلم یا ٹیچر کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ وعظ و نصیحت کے بجائے اپنے عمل سے بچوں کی تعلیم و تربیت کرے۔]

جامعہ کو صاف ستھرا رکھنے کے لیے ذاکر صاحب نے کبھی کوئی تقریر نہیں کی اور نہ نصیحت۔ ان کا روزمرّہ کا ایک معمول یہ تھا کہ اسکول کے احاطہ میں آتے ہی جہاں کوئی کاغذ کا ٹکڑا یا تنکا پڑا ہوا دیکھا، اس کو اٹھا کر شیروانی کی جیب میں رکھ لیتے تھے۔ جب جیب بھر جاتی تھی تو اس کو کوڑے دان میں پھینک دیتے تھے۔ نتیجۃً تمام طلباء میں ایک ایسی اسپرٹ پیدا ہو گئی تھی کہ جسے بھی کوئی کاغذ کا ٹکڑا کہیں نظر آیا، اس نے دوڑ کر اسے اٹھایا اور کوڑے دان میں پھینک دیا۔

آج تک یہ خادم بھی اس کا عادی ہے کہ ہوسٹل میں کہیں بھی کوئی کاغذ کا ٹکڑا نظر آیا اور فوراً اس کو کوڑے دان کی نذر کر دیا۔

عملی تربیت کی ایک دوسری مثال بھی ملاحظہ فرمایئے۔

دوسری جنگِ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ۱۹۴۵ء کا زمانہ تھا۔ کیا غلہ کیا ترکاری ہر چیز مہنگی ہو گئی تھی

ڈائننگ ہال میں کھانا بھی ناپ تول کر ملتا تھا۔
بچت اور کفایت کی زبانی تلقین و نصیحت کے بجائے قرآن کی یہ آیت ترجمے کے ساتھ ایک خوبصورت فریم میں جلی حروف میں لکھ کر ڈائننگ ہال کی ایک دیوار پر آویزاں کردی گئی تھی۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا - کھاؤ پیو، لیکن
اسراف مت کرو

ایک دن دوپہر کے کھانے کے وقت ذاکر صاحب ڈائننگ ہال میں چلے آئے۔ سب طلبا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ذاکر صاحب ٹیبل پر جاتے اور سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے جاتے ساتھ ساتھ کھانے کی کوالٹی کے متعلق بھی پوچھتے۔ اچانک دیکھا کہ ایک ٹیبل کے پاس ذاکر صاحب رک گئے اور ہڈی پلیٹ کو بغور دیکھنے لگے۔ ان کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ وہ ذرا جھکے اور ہڈی پلیٹ میں پڑے ہوئے ایک عدد آلو کو اٹھا لیا۔ وہیں پانی سے دھویا اور کھڑے کھڑے کھانا شروع کردیا سب لڑکے حیرت سے ذاکر صاحب کو دیکھ رہے تھے۔ ذاکر صاحب طلبا کے حیرت کے احساس کو بھانپ گئے۔ کہنے لگے "میاں! میرا منہ کیوں تک رہے ہو؟ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں دانہ دانہ پر کھانے والے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ آج ہمارے ملک میں لاکھوں آدمیوں کو ایک وقت کی روٹی میسر نہیں" پھر مسکرا کر کہنے لگے "یہ ادھ کچا آلو آپ ہی میں سے کسی نے ہڈی پلیٹ میں پھینک دیا تھا۔ میں نے جب غور سے دیکھا تو اپنا نام لکھا پایا۔ اس لیے اٹھا کر کھا لیا۔"

تمام طلبا کو جو اس وقت ڈائننگ ہال میں کھانا کھا رہے تھے، ایسا محسوس ہوا کہ گویا کسی نے ان سب کے چہرے پر بھرپور تھپڑ مارا ہو۔ اس دن کے بعد سے کھانے کی ٹیبل پر روٹی کے ٹکڑے یا ادھ کچے آلو پھر کبھی ہڈی پلیٹ میں نہ دیکھے گئے۔

تو یہ تھا جناب ذاکر صاحب کا طرز تربیت ان کی تربیت کا ایک ایک عمل ہزار وعظ و نصیحت پر بھاری تھا

جامعہ ملیہ کے دور کا ایک اور ناقابل فراموش واقعہ میرے ذہن میں ابھی تک محفوظ ہے۔
نومبر ۱۹۴۶ء میں جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی منائی گئی ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۶ء تک کا دور ہمارے ملک کی تاریخ میں بڑا ہی ہنگامہ خیز دور تھا۔ مسلم لیگ اپنے شباب پر تھی۔ ہر طرف قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد کے نعرے گونج رہے تھے۔ پاکستان بنانے کا مطالبہ زوروں پر تھا۔ کانگریس ملک کی تقسیم کے خلاف تھی۔ دونوں پارٹیاں اپنے اپنے موقف کے لیے زیادہ سے زیادہ تائید اور حمایت حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ یوں سمجھیے کہ دو زبردست پہلوانوں کے درمیان ٹکراؤ تھا۔ مصالحت کی تمام راہیں مسدود ہوتی جا رہی تھیں۔ دونوں جماعتوں کے قائدین کا کسی ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن یہ ذاکر صاحب کی شخصیت کا کمال کہیے کہ اسی ہنگامہ خیز دور میں جامعہ کی سلور جوبلی کے موقع پر ذاکر صاحب نے دونوں جماعتوں کے لیڈران کو یکجا کردیا۔

میں اس وقت نویں جماعت کا طالب
تھا۔ وہ منظر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے
ہے جب جامعہ کے جشن سیمیں کے موقع پر ایک ہی
پنڈال میں ایک اسٹیج پر ایک طرف قائد اعظم محمد علی
جناح اور لیاقت علی خاں تھے اور ان کے مقابل
دوسری طرف صوفوں پر مولانا ابوالکلام آزاد اور
پنڈت جواہر لال نہرو رونق افروز تھے۔

اسی موقع پر ذاکر صاحب
نے جامعہ کی پچیس سالہ روداد پیش کرتے ہوئے جو
تاریخی خطبہ نذر سامعین کیا تھا وہ طلائی حروف میں
لکھے جانے کا مستحق ہے۔ اس خطبہ کا وہ حصہ جس
میں سیاست و تعلیم کا موازنہ کیا گیا تھا، آج
بھی میری ڈائری میں محفوظ ہے۔

"سیاست خصوصاً ہمارے ملک میں ایک
پہاڑی نالہ ہے۔ آناً فاناً چڑھتا ہے اور دیکھتے
دیکھتے اُتر جاتا ہے۔ تعلیمی کام ایک دھیرے دھیرے
بہنے والا میدانی دریا ہے جو برسات ہی میں
نہیں بہتا۔ گرمی میں بھی پہاڑوں کے برف جیسے
دل کو پگھلا کر اپنی روانی کا سامان پیدا کرتا ہے
سیاست ان کی تنظیم اور حفاظت کرتی ہے اس
لیے وہ مخدوم اور یہ خادم۔ سیاست شدت چاہتی
ہے اور تعلیم مدت۔ سیاست کے پروگرام آئے
دن بدلتے رہتے ہیں۔ تعلیم کا پہلا منصوبہ اتنا
ہمہ گیر ہے کہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس کی منزل
پہونچنے کے لیے نہیں ہے۔ رہرو کا رُخ
متعین کرتی ہے۔"

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ

۱۹۴۶ء کا دور بڑا ہی ہنگامہ و قیامت خیز تھا
ملک میں بالخصوص شمالی حصہ میں فسادات کا لاوا
پھوٹ پڑا تھا۔ اسی خطبے میں آخر میں ذاکر صاحب
نے بڑے بیباکانہ انداز میں قومی رہنماؤں سے
مخاطب ہوتے ہوئے کہا تھا۔

آپ سب صاحبان آسمانِ سیاست کے
تارے ہیں۔ لاکھوں نہیں کروروں آدمیوں
کے دل میں آپ کے لیے جگہ ہے۔ آپ کی
یہاں موجودگی کا فائدہ اٹھا کر میں تعلیمی کام
کرنے والوں کی طرف سے بڑے ہی دکھ کے
ساتھ چند لفظ عرض کرنا چاہتا ہوں

آج ہمارے ملک میں باہمی نفرت کی
جو آگ بھڑک رہی ہے۔ آج ہمارا چمن بندی
کا کام دیوانہ پن معلوم ہوتا ہے۔ یہ آگ
شرافت اور انسانیت کی سرزمین کو جلائے
دیتی ہے۔ آج نیک اور متوازن شخصیتوں
کے تازہ پھول کیسے پیدا ہوں گے۔ حیوانوں
سے بھی پست تر سطح اخلاق پر ہم انسانی
اخلاق کو کیسے سنواریں گے؟ بربریت کے
اس دور دورے میں تہذیب کو کیسے
بچائیں گے۔ یہ لفظ شاید کچھ سخت معلوم
ہوتے ہوں لیکن ان حالات کے لیے جو
روز بروز ہمارے چاروں طرف پھیل رہے
ہیں۔ اس سے سخت لفظ بھی نرم ہوتے
ہم جو اپنے کاموں کے تقاضوں سے بچوں
کا احترام کرنا سیکھتے ہیں۔ آپ کو کیا
بتائیں کہ ہم پر کیا گزرتی ہے جب ہم سنتے

ہیں کہ بہیمیت کے اس بحران میں معصوم بچے بھی پوری طرح محفوظ نہیں۔

شاعر ہندی نے کہا تھا کہ ہر بچہ جو دنیا میں آتا ہے اپنے ساتھ پیام لاتا ہے کہ خدا ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ مگر کیا ہمارے دیس کا انسان اپنے سے اتنا مایوس ہو چکا ہے کہ ان معصوم کلیوں کے کھلنے سے پہلے ہی مسل دینا چاہتا ہے۔

خدا کے لیے سر جوڑ کے بیٹھے اور آگ کو بجھایئے۔ یہ وقت اس تحقیق کا نہیں کہ آگ کس نے لگائی، کیسے لگی؟ آگ لگی ہوئی ہے اسے بجھایئے۔ یہ مسئلہ اس قوم کے زندہ رہنے کا نہیں ہے۔ مہذب انسانی زندگی اور وحشیانہ زندگی کے انتخاب کا ہے۔ خدا کے لیے مہذب زندگی کی بنیادوں کو کھودنے نہ دیجیے۔"

ذاکر صاحب کو شاید ہی کسی نے غصہ میں دیکھا ہو۔ بجز ایک موقع کے جب وہ ۔۔۔گڑھ میں وائس چانسلر تھے۔ قصہ یوں ہے کہ ۔۔۔ستان کے وزیر اعظم لیاقت علی خاں کے انتقال ہونے ۔۔۔کچھ فرقہ پرست اخباروں نے، یہ خبر اخبار میں اڑا ۔۔۔ کہ لیاقت علی خاں کی موت پر یونیورسٹی میں ۔۔۔ن بجائے گئے اور دو دن یونیورسٹی کو بند ۔۔۔ا گیا۔ یہ خبر بالکل بے بنیاد اور جھوٹی تھی سارے ۔۔۔ کے اخباروں میں چھپنے ہونے لگے۔ طلبا جا کر ۔۔۔ صاحب سے ملے اور اس جھوٹے پروپیگنڈے ۔۔۔خلاف اخبارات میں تردیدی بیان کی سفارش ۔۔۔ لیکن ذاکر صاحب نے ہنس کر ٹال دیا کہ کتے بھونکتے ہیں تو بھونکنے دو۔ ہم کو اپنا کام کرتے رہنا چاہیے"۔ لیکن طلبا اور اساتذہ بھی ذاکر صاحب کی رائے سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اور سمجھنے لگے کہ ذاکر صاحب تو حکومت کے آدمی ہیں حکومت سے ڈرتے ہیں اور فرقہ پرستوں سے بھی۔

بہر حال اتفاق سے اسی عرصہ میں علی گڑھ کے آس پاس فسادات ہو گئے۔ امن و امان قائم کرنے کے لیے ونوبا بھاوے جی کو علی گڑھ آنا پڑا۔ ذاکر صاحب نے بالخصوص ونوبا بھاوے جی کو یونیورسٹی میں مدعو کیا۔ اسٹریچی ہال میں ونوبا بھاوے جی کا استقبال کیا گیا۔ اسٹریچی ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس موقع پر ذاکر صاحب نے جو فرقہ پرستوں کو لتاڑا ہے۔ بس نہ پوچھیے۔

انھوں نے کہا۔ "ونوبا بھاوے جی تنگ نظر، گندہ ذہن اخبار والوں نے ہمارے خلاف کچھ عرصے سے ایک مہم شروع کر رکھی ہے"۔ ذاکر صاحب نے غصے سے بھرپور بلند آواز میں کہا۔

کون بھڑوا کہتا ہے کہ ہم ملک کے وفادار نہیں۔ یہ کسی کو حق حاصل نہیں کہ ہماری وفاداری کا ثبوت ہم سے مانگے"

غرض کہ اس تقریر سے طلبا کی تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور ذاکر صاحب کی مقبولیت میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا۔

ذاکر صاحب کو دین سے بھی لگاؤ تھا جامعہ کی زندگی میں جب کبھی وقت ملتا وہ نظام الدین ضرور جاتے اور مولانا الیاسؒ کی تبلیغی جماعت کے جلسوں میں شرکت کرتے۔ مذہبی ہونے کے

باوجود ان میں کٹر ملائیت کبھی نہیں آئی۔ ان کو فنونِ لطیفہ، بالخصوص پینٹنگ، شعروشاعری اور موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ تعلیم کے بنیادی اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے وہ طلبا کی تمام صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے کوشاں رہتے۔

ذاکر صاحب سے پہلے مسلم یونیورسٹی میں کوئی کلچرل پروگرام کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان ہی کے زمانہ میں طلبا نے یوتھ فیسٹول کے مقابلوں (دہلی) میں حصہ لینا شروع کیا۔ ڈرامے اور موسیقی کے مقابلوں میں طلبا نے انعامات بھی حاصل کیے۔

ہمارے ملک میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہلی یونیورسٹی ہے جس کا اپنا ایک ترانہ ہے۔ یہ ترانہ مجاز کی نظم "نذرِ علی گڑھ" ہے۔ جس کو مجاز نے اپنے زمانہ طالب علمی ۱۹۳۶ء میں لکھا تھا۔ ذاکر صاحب نہ ہوتے تو یہ نظم ترانہ نہیں بن سکتی۔

یہ بات ۱۹۵۴ء کی ہے جب میں بی ایڈ کا طالب علم تھا۔ یونین کا الیکشن ہوچکا تھا۔ مسند نشینی کی رسم باقی تھی۔ میں ذاکر صاحب کے پاس گیا اور بتایا کہ میں نے مجاز کی نظم (نذرِ علی گڑھ) کی دھن تیار کی ہے اور اس کو یونین کے جلسہ مسند نشینی کے موقع پر کورس میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ذاکر صاحب نے کہا "آپ یونین کے صدر کے پاس جایئے۔ اس لیے کہ جلسہ یونین کا ہے۔ یونیورسٹی کا نہیں۔"

میں یونین کے صدر کے پاس پہنچا۔ وہ حضرت اپنے کٹر سیاسی پن اور ملائیت کے لیے مشہور تھے مجاز کا نام سنتے ہی چراغ پا ہوگئے۔ فرمانے لگے "مجاز ترقی پسند ہے اور دہریہ بھی۔ جب تک میں اس کرسی پر ہوں، کسی دہریہ کو یونین کے پلیٹ فارم پر نہیں آنے دیا جائے گا۔"

میں خاموشی سے اٹھا اور دوبارہ ذاکر صاحب کے پاس آیا اور یونین کے صدر کے انکار سے آگاہ کیا۔ ذاکر صاحب نے فرمایا۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ یونین والے آپ کو وہاں پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں تو آپ سرسید ڈے میں پیش کیجیے۔ یہ یونیورسٹی کا فنکشن ہے۔"

۱۷ اکتوبر ۱۹۵۴ء کا وہ "سرسید ڈے" تاریخی حیثیت سے ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ جب میں نے چار ساتھیوں کے ساتھ کورس کی شکل میں مجاز کی نظم "نذرِ علی گڑھ" کو پہلی مرتبہ علی گڑھ کا ترانہ کہہ کر اسٹریچی ہال میں پیش کیا تو اس کی دھن اور موسیقی سے ہزاروں کی تعداد میں طلبا اور اساتذہ صاحبان اتنے متاثر اور محظوظ ہوئے کہ "برسے گا، برسے گا، برسے گا" کے اختتام پر صدائے تحسین اور تالیوں سے دیر تک اسٹریچی ہال گونجتا رہا۔

ذاکر صاحب نے اٹھ کر میری پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا:

> "آپ نے ترانہ کی صورت میں مادر درسگاہ کو یہ بہت بڑا اور اچھا تحفہ دیا ہے۔ جو ناقابلِ فراموش ہے۔ اللہ آپ کو ہمیشہ تندرست اور خوش و خرم رکھے۔"

یونیورسٹی کے شب و روز

مرتبہ
محمد غزالی خاں۔
شعبہ صحافت

سعودی عرب کے سرکردہ صنعت کار اور ذلہ گروپ کے منیجنگ ڈائرکٹر مسٹر حسن کمال علی گڑھ تشریف لائے۔ اپنے مختصر قیام کے دوران آپ اسٹوڈنٹس یونین بھی تشریف لائے جہاں ایڈہاک اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری جناب معراج الدین احمد نے آپ کو عبدالبصیر خاں اسکول کا معائنہ کرایا۔ یہ اسکول یونین درجہ چہارم کے ملازمین کے بچوں کے لیے چلاتی ہے۔ طلباء کے اس جذبہ کو سراہتے ہوئے معزز مہمان نے اسکول کی عمارت کی توسیع و تعمیر کے لیے ایک ہزار ڈالر کے عطیہ کا اعلان کیا۔ ایڈہاک یونین کے صدر مسٹر [illegible] نے آپ کا اس عطیہ کے لیے شکریہ ادا کیا

مسلم یونیورسٹی گیمس کمیٹی کے زیر اہتمام یونیورسٹی ٹینس کلب کے سابق کپتان اور ہندوستان کے مایہ ناز کھلاڑی جناب غوث محمد خاں کے انتقال پر ایک تعزیتی جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت وائس چانسلر سید حامد صاحب نے کی۔ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ مخالف کے کھیل کی تعریف کرنا مرحوم کی وسیع قلبی کا اعلیٰ ثبوت ہے۔ آپ نے مزید اعلان کیا کہ امسال یونیورسٹی غوث محمد یادگاری ٹرافی ٹورنامنٹ کا اہتمام کیا کرے گی۔

گیمس کمیٹی کے سکریٹری پروفیسر اسلم قدیر صاحب نے بتایا کہ مرحوم کے خطوط سے یونیورسٹی سے ان کی والہانہ دلچسپی اور لگاؤ کا اندازہ ہوتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی میں منعقدہ ایک علمی اجتماع میں وائس چانسلر سید حامد صاحب نے ایک کتاب کا افتتاح کیا۔ یہ کتاب ان مقالات و مضامین پر مشتمل ہے جو گزشتہ دنوں ایک مجلس مذاکرہ میں پڑھے گئے تھے۔ اس مجلس مذاکرہ کا اہتمام سنٹر آف پروفیشنل کورسز کی جانب سے کیا گیا تھا

وی۔ ایم۔ ہال کے نصر اللہ ہوسٹل میں ۲۳ مئی ۱۹۸۶ء کو ہاؤس مانیٹر مسٹر وسیم احمد قادری صاحب نے ایک مذاکرہ بعنوان "یونین الیکشن کا تنقیدی جائزہ" کا اہتمام کیا۔ جس میں شفیق استاد حمید احمد ہاشمی صاحب بدست وی ایم ہال کی موجودگی میں نہایت خوشگوار ماحول میں ممبران ہوسٹل نے جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا اور الیکشن کے دوران شرپسند عناصر کی ناکام تخریب کاری کی زبردست مذمت کی۔ یہ مذاکرہ ہر پندرہ دن بعد ہونے والے مذاکرے کی ایک کڑی تھا۔ آخر میں وسیم صاحب نے تجویز پیش کی کہ اب ہر مہینہ طلوع مشاعرہ کا بھی مقابلہ منعقد کیا جائے جس کی سب نے پرزور تائید کی۔

ہوسٹل کا یہ شاندار ماحول ہاؤس مانیٹر وسیم احمد قادری کلچرل و لٹریری سکریٹری سید [illegible] حسین

محمد شاہد خاں ایڈیٹر وقار میگزین اور نوحیا علم سہسرامی جیسے سینئر طلبا کی کوششوں کا نتیجہ ہے

وائس چانسلر سید حامد صاحب اپنے آل انڈیا دورے سے واپس تشریف لائے۔ آپ ۲۲ مئی کو اس دورہ پر نکلے تھے۔ جس کے دوران آپ ناگپور، بمبئی، حیدرآباد، بنگلور، میسور، اور مدراس وغیرہ تشریف لے گئے۔ ان جگہوں پر آپ نے مسلم علما اور لیڈران سے ملاقاتیں کیں اور مسلمانوں کے علمی، سماجی اور معاشی مسائل پر بات کی۔ مسلم یونیورسٹی اور ہندوستان کے دیگر مسلم اداروں کے مسائل پر بالخصوص بات چیت کی۔

کینیڈی ہال میں منتخب طلبا یونین کی رسم تنصیب شاندار اور روایتی انداز میں منعقد ہوئی۔ وائس چانسلر سید حامد صاحب کی موجودگی میں نو منتخب نمائندوں اور معزول ہونے والے نمائندوں کے درمیان گاؤن کا تبادلہ کیا گیا۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا اور یونیورسٹی ترانے کے ساتھ اختتام ہوا۔

اس موقع پر ہارنے اور جیتنے والے دونوں نمائندوں نے تقاریر کیں۔ سب سے آخر میں صدر یونین مسٹر علی امیر نے وائس چانسلر اور طلبا کے درمیان ماضی کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا اور اساتذہ کا تعلق باپ اور بیٹے کا ہے۔ بیٹا کتنی ہی غلطی کرے مگر شفیق باپ بیٹے کو سزا دینے کے بعد پھر گلے لگا لیتا ہے۔

ضروری اعلان

تہذیب الاخلاق کا سالانہ چندہ پندرہ روپیہ سالانہ تھا۔ شمارہ نمبر ۸ یعنی ۱۵ مئی کے بعد چندہ سالانہ بیس روپے کر دیا گیا۔ بعض خریداروں نے اب بھی پندرہ روپے کے حساب سے چندہ بھیجا ہے۔ ان سب حضرات کی خدمت میں رسالہ صرف نو ماہ بھیجا جائے گا۔

بیرون ہند کے خریداروں سے چندہ سالانہ بیس ڈالر کے اعلان کیا گیا تھا۔ اس کو کم کر کے پندرہ ڈالر کر دیا گیا ہے۔ جن حضرات نے بیس ڈالر مرحمت فرمائے ہیں ان کے پانچ ڈالر آئندہ سال کے چندہ میں شمار کر لیے جائیں گے بیرون ہند کے بعض خریداروں نے چندہ پندرہ روپیہ ادا کیا ہے ان سے درخواست ہے کہ راقم کے نام باقی رقم بذریعہ ڈرافٹ ارسال فرمائیں۔ ورنہ رسالہ صرف دو ماہ بھیجا جائے گا۔

مدیر مسئول

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۳-۸۲/۴

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مطلوبہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱- اسسٹنٹ رجسٹرار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی [۷ اسامیاں ۵ مستقل - ۲ عارضی. جگہ مستقل ہونے کی امید ہے]

شرح تنخواہ:- ۷۰۰- ۴۰- ۹۰۰ ای بی ۴۵- ۱۱۰۰- ۵۰- 1300 روپیہ معہ الاونس

اہلیت: کسی تسلیم شدہ ہندوستانی یا بیرونی یونیورسٹی کی ایک ڈگری اور کسی یونیورسٹی میں انتظامی اہمیت کے ایک عہدہ پر کام کرنے کا سات سالہ تجربہ

نوٹ: جو لوگ اشتہار نمبر ۸۱-۸۰/۲۴ - ۸۱-۸۰/۳۹ اور ۸۲-۸۱/۶ کے تحت ذاکر حسین انجینیرنگ کالج میں ایڈمنسٹریٹو اسسٹنٹ، جواہر لال میڈیکل کالج کے پرنسپل آفس میں اسسٹنٹ رجسٹرار اور جے این میڈیکل کالج ہسپتال میں ایڈمنسٹریٹو آفیسر کی اسامیوں کے لیے پہلے ہی درخواستیں دے چکے ہیں۔ ان کو از سر نو درخواستیں دینے کی ضرورت نہیں۔ اسسٹنٹ رجسٹرار کے لیے ان کی سابقہ درخواستیں ہی کافی ہیں۔

۲- پرائمری ٹیچر [میتھیمیٹکس] عبداللہ نرسری اسکول

شرح تنخواہ:- ۳۳۰- ۱۰- ۳۵۰- ای بی ۱۵- ۵۶۰ روپیہ معہ الاونس

استعداد: (۱) لازمی ہائر سکنڈری (ٹرینڈ) مہارت اور روانی کے ساتھ انگریزی بولنے پر قادر ہو۔

(۱۱) اضافی گیمس - فزیکل ٹریننگ (پی. ٹی) رقص اور ڈرامہ وغیرہ منعقد کرنے کی صلاحیت

(۱۱۱) کسی انگریزی میڈیم اسکول میں اس مضمون کی تدریس کا کم از کم پانچ سالہ تجربہ

نوٹ: خواتین اور مرد دونوں اس جگہ کے لیے امیدوار ہو سکتے ہیں۔

غیر معمولی استعداد رکھنے والے اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو اعلیٰ تنخواہ ابتدا سے دی جا سکتی ہے۔

امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا۔ انھیں بطور T.A. صرف ایک طرف سکنڈ کلاس کا کرایہ ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مطبوعہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار [سیلکشن کمیٹی] سے ذاتی طور پر یا ذاتی پتہ لکھ کر 23×10cm کے لفافہ اور دو روپیہ نقد کی رسید [جو مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس میں جمع شدہ ہو] یا انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، کے ہمراہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔

درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۰ر جون ۱۹۸۲ء ہے

تاخیر سے موصول ہونے والی

یا

نامکمل درخواستیں مسترد کر دی جائیں گی۔

رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

اشتہار 83-5/82

درج ذیل اسامیوں کے لیے مطلوبہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں

۱. پرنسپل یونیورسٹی پالیٹکنک۔
شرح تنخواہ 1500 - 60 - 1800 - 100 - 2000 - 2/125 - 25
2500 روپیہ معہ الاؤنس۔
اہلیت ۱. انجینرنگ یا ٹیکنالوجی میں ماسٹرس ڈگری
۲. تدریس کا دس سالہ تجربہ
۳. ان افراد کو ترجیح دی جائے گی جنہیں کسی انجینرنگ ادارہ میں انتظامی کام کا تجربہ ہو۔

۲. پرنسپل ویمنس کالج
شرح تنخواہ: 1500 - 60 - 1800 - 100 - 2000 2/125
2500 روپیہ مع الاؤنس
اہلیت:۔ امیدوار کو لازم ہے کہ وہ آرٹس/سائنس کے مضامین میں اعلیٰ تعلیمی استعداد کا حامل ہو۔ اس کے علاوہ کسی ویمنس کالج میں تدریس اور انتظامی عہدہ پر کام کرنے کا تجربہ بھی ہو۔
نوٹ صرف خواتین امیدوار ہی درخواست دیں۔

۳۔ پرنسپل اجمل خاں طبیہ کالج

شرح تنخواہ :— 1500 - 60 - 1800 - 100 - 2000 - 125/2 - 2500 روپیہ معہ الاؤنس

اہلیت ۱۔ کسی تسلیم شدہ یونیورسٹی یا انڈین میڈیسن کے امتحانات کے لیے قانون کے تحت قائم شدہ کسی بورڈ / فیکلٹی یا ادارہ سے حاصل شدہ ڈگری / ڈپلوما [یا] کوئی متبادل امتحان

ب بحیثیت پروفیسر کام کا مناسب تجربہ

ترجیحی میڈیکل کالج میں انتظامی تجربہ۔

۴ پروگرامر کمپیوٹر سینٹر ۴ اسامیاں ۔ ۲ مستقل ۔ ایک عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید۔ ایک عارضی اسامی تعطیل کے دوران خالی

شرح تنخواہ ۔ 700 - 60 - 900 - 40.EB - 1100 - 50 - 1300 روپیہ معہ الاؤنس

اہلیت [لازمی] سائنس میں ماسٹرس ڈگری یا انجینیرنگ میں بی۔ایس سی ڈگری اس کے ساتھ ہی کسی کمپیوٹر سینٹر میں بحیثیت پروگرامر کام کرنے کا تین سالہ تجربہ

یا

کمپیوٹر سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما یا ڈگری اور بحیثیت پروگرامر یا کسی متبادل جگہ پر کسی کمپیوٹر سینٹر میں کام کرنے کا دو سالہ تجربہ

ترجیحی :۔ کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ ڈگری یا کمپیوٹر کے نازک آلات و سامان کی دیکھ ریکھ کے علاوہ اس کے آپریٹنگ سسٹم کی جانکاری

کام کی نوعیت

۱۔ کمپیوٹر کے کثیر النوع پروگرام چلانے میں مدد دینا۔

۲۔ پروگرام کے ڈویلپمنٹ میں کمپیوٹر پر کام کرنے والے کی مدد کرنا۔

۳۔ سینٹر کے تدریسی اور دوسرے تعلیمی پروگرام میں شرکت کرنا۔

۴۔ کمپیوٹر سینٹر کے کاموں میں ہاتھ بٹانا اور وقتاً فوقتاً جو ذمہ داریاں تفویض

کی جائیں انھیں سرانجام دینا۔
غیر معمولی تعلیمی صلاحیت اور تجربہ کے حامل افراد کو ابتدا میں ہائر اسکیل بھی دیا جاسکتا ہے
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بلایا جائے گا، انھیں ریلوے کا سکنڈ کلاس کا
یک طرفہ کرایہ ادا کیا جائے گا۔
درخواستوں کے مطلوبہ فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی)
کے دفتر سے دو روپیہ نقد کی ادائیگی پر (جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فائننس آفس
کے کیش سیکشن میں جمع کیے گئے ہوں) یا انڈین پوسٹل آرڈر (جو فائننس آفیسر
مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو) کے جمع کرنے پر ذاتی طور پر یا بذریعہ ڈاک
حاصل کیے جاسکتے ہیں جس کے لیے 23x10 cm کا لفافہ جس پر امیدوار کا پتہ لکھا ہوا
ہو۔ فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ ۳۰ جون ۱۹۸۲ء ہے
نامکمل یا دیر سے آنے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا

رجسٹرار

اتفاق سے ان ایام میں انگریزی حکومت نے ہندوستان کے ہونہار اور ہوشیار طلبا کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے چھ چھ ہزار روپیہ کے ۹ وظیفے دینے منظور کیے۔ اس کے علاوہ ہر طالب علم کے لیے تین ہزار روپے اخراجات آمد و رفت بھی منظور کیے۔ چنانچہ ہر صوبے کی گورنمنٹ نے اپنے ہاں کے لائق طلبا کو اس سرکاری عطیہ سے فائدہ اٹھانے کے لیے انتخاب کیا۔ اس سلسلہ میں یوپی گورنمنٹ نے سرسیّد کے فرزند سید محمود کو اس وظیفے کے لیے موزوں سمجھا اور ان کو اس کی اطلاع دے دی۔

اس خلاف توقع امداد سے سرسید سے ارادہ کو زبردست تقویت پہنچی اور یہی سرکاری عطیہ اس بات کا باعث بن گیا کہ وہ سید محمود کے ساتھ خود بھی عازم ولایت ہوں اور لندن پہنچ کر اپنی پرانی آرزو پوری کریں۔

مگر دقت یہ تھی کہ یہ روپیہ جو گورنمنٹ نے دیا تھا، خود سید محمود کی تعلیم کے لیے بھی کافی نہ تھا، سرسید کی پوری کس طرح پڑتی؟ اس مشکل کا حل انھوں نے یہ سوچا کہ سخت ایثار سے کام لیتے ہوئے اپنے نایاب اور قیمتی کتب خانے کو کوڑیوں کے مول بیچ ڈالا، اپنے آبائی اور جدّی مکان کو رہن رکھ دیا، اپنی تنخواہ وصول کی اور سب کچھ لے کر سفر پر روانہ ہو گئے۔


جہاں نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
وغیرہ کی دوا۔
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U.
ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یوپی

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ھجری سنہ ۱۳۰۳ نبوی | نمبر ۲

جلد نمبر ۱ | یکم جولائی ۱۹۸۲ء | شمارہ نمبر ۱۱

شرح چندہ

فی پرچہ	ایک روپیہ
ششماہی	۱۱ روپے
سالانہ	۲۰ روپے

بیرون ہند سے

سالانہ	۱۵ ڈالر

ایک ڈالر بذریعہ چیک یا ڈرافٹ وصول ہونے پر ایک پرچہ بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاسکتا ہے۔

تبادلے کے پرچے اور تمام خط وکتابت حسب ذیل پتہ پر کیجیے۔

مدیر مسئول تہذیب الاخلاق۔
مقصد منزل، تار بنگلہ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم و تہذیب

جس زمانے میں ہماری قوم کی تعلیم بھی عمدہ تھی ہم میں بھی یہ سب خوبیاں موجود تھیں اور جب سے ہماری تعلیم ناقص ہو گئی، وہ سب خوبیاں ہم میں سے جاتی رہیں۔ ہماری قوم نے ایک وقت میں علوم و فنون میں ایسی ترقی کی تھی اور ایسی فیاضی سے اپنے علوم سے یورپ کی قوموں کو نفع پہنچایا کہ بڑے بڑے مصنفوں نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اگر مسلمان ان علوم میں ایسی ترقی نہ کرتے اور ان سے اور قوموں کو ایسا فائدہ نہ پہنچتا جیسا پہنچا تو آج دنیا میں ان علوم و فنون کا نام بھی نہ ہوتا۔ قرطبہ کی یونیورسٹی نے اور ہماری بغداد کی یونیورسٹی نے اپنے علوم و فنون کی ترقی کی وجہ سے تمام دنیا میں علم کا آفتاب روشن کر دیا۔

یہ انگریزوں کی قوم جو آج ایسی اعلیٰ درجہ کی شائستگی میں

پندرہ روزہ
تہذیب الاخلاق
علی گڑھ

جلد ۱ شمارہ ۱۲
ا؍ جولائی ۱۹۸۲ء

مدیر سید حامد
وائس چانسلر اے ایم یو
مدیر مسئول
قاضی معزالدین احمد

مسلمانوں کی ترقی و تعلیم کا مسئلہ

مسلمانوں کی ترقی کے مسئلہ پر اگر کچھ سوچا یا لکھا جائے تو مسلمانوں کی تعلیم کے سوال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا گزشتہ سو سال کی تاریخ اس بات کو واضح کرتی ہے کہ مسلمانوں نے جدید تعلیم کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ صرف ملازمت پیشہ مسلمانوں نے جن کی فلاح و بہبود سرکاری ملازمت پر منحصر تھی، جدید تعلیم حاصل کی۔ عام مسلمانوں نے اس کو نظر انداز ہی کیا اور دینی تعلیم حاصل کرتے رہے یا پھر کسی نہ کسی سبب سے تعلیم سے محروم رہے۔

مسلمانوں کے جہاں جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اسکول و کالج قائم ہوئے وہیں دینی علوم کی درسگاہیں بھی کثرت سے ملک میں قائم ہوتی رہیں۔ اور ہزاروں طلباء نے ان میں تعلیم حاصل کی اور آج بھی کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کے اسباب پر یہاں کچھ لکھنا مقصود نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ ان دونوں نظام تعلیم سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر کیا اثر پڑا۔ اور ان دونوں میں سے کس نظامِ تعلیم کو مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیے۔

اب آزاد ہندوستان میں جب کہ مسلمانوں کی ترقی کا مسئلہ اور ان کے ملک کے تعمیری

کاموں میں اہل وطن کے شانہ بہ شانہ کام کرنے کی قابلیت اور صلاحیت پیدا کرنے کا سوال توجہ طلب ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے تعلیم کے سوال پر غور کیا جائے تاکہ ان کے مستقبل کی تعمیر میں مدد ملے اور اپنے وطن میں باعزت زندگی گزار سکیں

جس روز سے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری ہوا، خواہش تھی کہ مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ پر لکھا جائے اور اصحاب فکر کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ کیا جائے لیکن راقم کی مسلسل بیماری اس خواہش کی تکمیل میں رکاوٹ رہی۔ الحمدللہ اب مرض میں کچھ افاقہ ہے۔ راقم کا ایک مختصر مضمون مسلمانوں کی تعلیم کے مسائل پر اس شمارہ میں شامل ہے۔ آئندہ اس موضوع پر مضامین ملاحظہ فرمائیں گے۔

انگریزی دور میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کی ا کی جانب قدم اٹھایا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ ان کی تم تھی۔ انگریزوں کی حکومت کے دور میں ملک کے تعلیم میں تبدیلی غیر ممکن تھی۔ لیکن اب ملک آزاد ہے تعلیم نصاب کے تحت حاصل کرنا ہر طالب علم کے لیے لازمی نہا ایسی ہونی چاہیے کہ جس سے ایک طالب علم کی شخصیت کی تر اور اس میں حصول معاش کی صلاحیت پیدا ہو۔ اس سلہ ذاکر صاحب اور عابد صاحب کے افکار قارئین تہذ الاخلاق کے سامنے آئندہ شمارے سے پیش کیے جا

ضروری اعلان

رمضان المبارک اور عید الفطر کی وجہ سے رسالہ تہذیب الاخلاق کا شمارہ نمبر ۱۲ بابت ۱۶ جولائی ۱۹۸۲ء اپنی مقررہ تاریخ کے بجائے ۲۰ جولائی ۱۹۸۲ء کو شائع ہوگا قارئین کی خدمت میں ۲۲ جولائی تک پہنچ جائے گا اور ۲۴ جولائی کو عید متوقع ہے، اس لیے یکم اگست کا رسالہ شائع نہ ہوگا

(مدیر مسئول)

تعلیم کے چند بنیادی مسائل

انیسویں صدی میں انگریزوں نے نہ صرف ملک پر فتح پائی بلکہ ہندوستانیوں کے ذہن و دماغ پر بھی قابض ہوگئے۔ سائنس کی ترقیات، مشین کی ایجادات اوزار کا استعمال، ریل کا ملک میں جاری ہونا، ٹیلی فون، ٹیلی گراف کی ایجاد اور ان کا استعمال، بجلی کی روشنی پھر انگریزوں کی زندگی میں نظم، وقت کی پابندی۔ ان سب کا اثر ہندوستانیوں پر ایسا پڑا کہ ہر فرد مغربی تہذیب کا مداح ہوگیا۔ سید احمد خاں مرحوم انگلستان گئے تو انھوں نے صنعتی دور کی تہذیب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگر ہمارے ملک میں جدید تعلیم جاری ہو جائے، جدید علوم سے نوجوان متعارف ہو جائیں تو پھر وہ بھی ترقی کر سکتے ہیں۔ حکومت اور مسلمانوں کے درمیان جو خلیج پیدا ہو گئی تھی، مسلمانوں کی ترقی کے لیے یہ بھی ضروری تھا کہ اس خلیج کو پاٹا جائے۔ مسلمان حکومت کو اپنے تعاون کا یقین دلائیں اور حکومت و مسلمانوں کے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ رفع ہوں تاکہ مسلمان ملک کی تعمیر نو میں پوری طرح حصہ لے سکیں۔ ان کی مایوسی اور ان کی بیزاری ختم ہو۔

سید احمد خاں کی کوشش اور بڑی کشمکش کے بعد علی گڑھ میں جدید علوم کی درس گاہیں قائم ہوئیں پہلے اسکول اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج قائم کیا گیا۔ لیکن سید احمد خاں مرحوم نے جس قسم کی جدید تعلیم کا اور آزاد یونیورسٹی قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا وہ پورا نہ ہوا۔ انگریزوں نے اپنی ایک اسکیم کے تحت ملک میں جدید تعلیم کی درس گاہیں قائم کیں اور ہندو مسلمانوں کو قائم کرنے کی اجازت دی۔ اس تعلیم نے ہندوستانیوں میں احساس کمتری اور بڑھایا۔ ان کے دلوں پر یورپ کی عظمت کا سکہ بٹھایا اور سرکار انگریزی کی حکومت کی مشین کا ان کو ایک پرزہ بنا دیا۔

ان درس گاہوں سے تعلیم حاصل کرکے جو لوگ نکلے ان کے نزدیک ماضی کے سب ادوار دور تاریکی تھے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ ان کے ورثہ اور قوم میں کوئی صاحب علم اور باکمال فرد پیدا ہی نہیں ہوا۔ خود ان کا مبلغ علم اس قدر پست تھا کہ انگریزی زبان بول لینا اور انگریزی کے ناول پڑھ لینا ان کے لیے معراج کمال تھا۔ پورے سو سال کی مسلمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ کتنے صاحب علم ان میں پیدا ہوئے۔ کتنے تھے جن کی تحریر و تقریر میں خیال کی ندرت اور فکر کی آزادی جھلکتی ہے۔ کتنے لوگوں نے تاریخ کے صفحات پر غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں۔ بس آپ کو اس پورے سو سال کی تاریخ میں چند نفوس کے علاوہ کوئی نظر آئے گا جو قابل ذکر ہو۔ وہ بھی ایسے نہ تھے کہ

[redacted]

اگر نہ ہوتے تو مسلم معاشرے میں کوئی خاص کمی رہ جاتی۔ ان کے خلوص سے انکار نہیں۔ لیکن معاشرہ کے مسائل وہ کبھی حل نہ کر سکے۔ سر جوڑ کر بیٹھنے اور غور و فکر کی ان کو عادت نہ تھی۔ بزرگانِ ملت جب تک جیے ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہی رہے اور کوئی تعمیری کام نہ کیا

یہ تو حالت ہمارے جدید تعلیم حاصل کرنے والے گروہ کی تھی۔ اب دینی علوم کے پاسبانوں کو دیکھیے۔ یہ گروہ زمانہ سے بے تعلق، زمانہ کی رفتار سے ناواقف۔ مدرسہ سے نکلے مسجد میں داخل ہو گئے اور خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات کی عادت ڈالی مسلمانوں کے عام مسائل سے دور ہی رہے ان کی تعلیم نے نہ اُن کی شخصیت کو ابھارا ہے نہ اُن کی صلاحیتوں کی پرورش کی ہے قدیم تعلیم حاصل کرنے والوں میں گو اہلِ علم پیدا ہوئے اور انھوں نے دینی مسائل پر خاصی لگن سے کام کیا اور بہت قیمتی سرمایہ چھوڑا۔ لیکن صنعتی سرمایہ داری تہذیبی کشمکش کی زندگی میں وہ مسلمانوں کی رہنمائی تو کیا کرتے خود بھی اس کا شکار ہو گئے۔ آج بڑے بڑے مفتی اور مولانا کی اولاد جدید دور کی کشمکش کا شکار ہے مسلمانوں کا عام حال یہ ہے کہ وہ زندگی کی الجھنوں میں پھنسے ہوئے ہیں ایک طرف غیروں سے دوسری طرف خود اپنوں سے دست و گریباں ہیں۔ جو صاحب ثروت ہیں ان کو نہ اپنی خبر ہے نہ زمانے کی۔ شاید اب اسرائیل کے بم سے ان کی آنکھ کھلے۔ بس ڈر یہ ہے جب آنکھ کھلے گی تو معلوم ہوگا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔

ہندوستان آزاد ہوا تو خیال تھا کہ ملک کے تعلیمی نظام کی بھی اصلاح ہوگی۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا اب تک نہ ہوا اور اگر ہوا بھی تو اس پر اکثریت کی تہذیب کی ایسی چھاپ پڑی ہے کہ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ مسلمان بھی یہاں بستے ہیں۔

تعلیم کے دو ہی مقصد ہوتے ہیں ایک یہ کہ تعلیم یافتہ لوگ اپنے معاشرے کے اچھے افراد ہوں اور ان کی صلاحیتوں کی نشو و نما ہو تاکہ اپنی زندگی کامیابی کے ساتھ گزار سکیں۔ ان کی شخصیت کی تربیت ہوئی ہو۔ لیکن جدید تعلیم کے حصول سے یہ دونوں فائدے حاصل نہ ہوئے۔ نصاب تعلیم ایسا رکھا گیا جس سے مسلمان بچے پر یہی اثر پڑتا ہے کہ اس کے اجداد کا ملک کی تہذیب کی تعمیر میں کوئی حصہ نہ تھا اور اگر ہے تو برائے نام ہے گویا تعلیم سے احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔ خود اعتمادی نہیں پیدا ہوتی۔

جہاں تک حصول معاش کا سوال ہے حکومت نے نظام تعلیم میں اب تک ایسی اصلاحات نہیں کیں کہ ایک نوجوان اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ اور اپنی روزی پیدا کر سکے۔ گو اب تعلیم کے اس پہلو کی طرف حکومت کی توجہ ہے۔ لیکن حالات ایسے ہیں کہ مسلمان اس سے پوری طرح فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

جو تعلیم حکومت کے زیر نگرانی ہو رہی ہے مسلمان اس تعلیم کا نظام تو بدل نہیں سکتے البتہ ان کو اس نظام کی اصلاح کی کوشش ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ [illegible]

نقیب الاسلام
۶۱ سینی ہوسٹل

متعدی امراض کے روکنے کی تدابیر

حصہ دوم

(Method Of Controlling Of Infectious Diseases)

کسی بھی مرض کو روکنے کے لیے اور علاج کرنے کے لیے مختلف تدابیر اختیار کرتے ہیں۔ سب سے پہلے مرض کی تشخیص کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس کی مدد سے مرض کی نوعیت اور سبب معلوم ہوتا ہے۔ نیز اس سے بیماری کا تعین بھی ہوتا ہے۔ ہم اس عمل میں کوشش یہ کرتے ہیں کہ تشخیص پہلے ہی مرحلے میں ہو جائے۔ اکثر اس تشخیص کے دوران ہم ایک عارضی تشخیص (Provisional Diagnosis) کرتے ہیں جس میں ایک اندازے کے مطابق کسی بھی مرض کے بارے میں ساری تحقیق اسباب اور Patho-logical Test وغیرہ کرتے ہیں پھر اسی صورت میں آئی رپورٹ سے صحیح تشخیص کر لیتے ہیں۔ اس کو ہم تشخیص ابتدائی (Early Diagnosis) بھی کہتے ہیں

اب مرض کا تعین ہو جانے پر اس کے روکنے کی ساری تدبیریں کریں گے۔ اگر مرض متعدی ہے تو مندرجہ ذیل تدابیر حفظ ماتقدم کے طور پر اختیار کریں۔

PREVENTION OF SPREAD - 1

اس میں حاملین تعدیہ (Reservoirs of Infection) کو تباہ کر دیتے ہیں اور ایسے ذرائع کو بھی ختم کر دیتے ہیں جن سے بیماریاں پھیلتی ہیں

(ii) (میزبان Host) کی ضرورت مدافعت (Resistance Power) بڑھا دیتے ہیں۔

(iii) بیماری پھیلانے والے جراثیم یا اجسام تباہ و برباد کر دیے جاتے ہیں۔

بیماری پھیلنے کی روک تھام (Prevention of Transmission) — کسی متعدی مرض کی روک تھام کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف تدابیر اختیار کی جائیں اس میں یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے مرض کا تعین کریں جس کے لیے اس کی تشخیص ضروری ہے۔ اس تشخیص سے مرض کی نوعیت اور سبب معلوم ہو گا اور اگر سبب معلوم ہو گیا تو سبب کو دور کریں اگر مرض حاملین کے ذریعہ منتقل ہو رہا ہے یا اس ذریعہ یا حاملین تعدیہ (Reservoirs of Infection) کو علیحدہ کر دیں۔ اگر حاملین کو علیحدہ کر دیا گیا ہے تو تعدیہ نہیں پھیلے گا۔ بیماری کے پھیلنے کی روک تھام ذریعہ انتقال تعدیہ (Transmitter of Infection) کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ مرض جاندار اور غیر جاندار دونوں چیزوں کے ذریعہ منتقل ہوتا ہے

اعلان (Notification) اب جب کہ کوئی مرض متعین ہو گیا اور وہ متعدی ہے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کی اطلاع محکمہ حفظان صحت یا طبی افسران

کو خبر کر دیں کہ فلاں علاقے میں فلاں متعدی بیماری وبائی شکل میں پھیل گئی ہے۔ تاکہ وہ مناسب اقدامات کر سکیں اور مزید بیماری پھیلنے کی روک تھام کر سکیں۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ تمام اعلانیہ بیماریوں ۔۔ (Notifiable Diseases) کے بارے میں معلومات فراہم ہو جاتی ہیں، کہ آیا پھیلنے والی بیماری کی مدت کیا ہے اور کس ذرائع سے پھیلتی ہے۔ اس سے یہ بھی فائدہ ہوتا ہے کہ اگر چیچک وغیرہ ہے تو ایسی صورت میں ٹیکہ وغیرہ لگائے جا سکیں۔ اس دوران ہم علاقہ کی صفائی وغیرہ کا انتظام بھی کرتے ہیں۔ علاقے کے پینے کا پانی صاف کرتے ہیں اور دوسری استعمال کی اشیاء بھی صاف کر دیتے ہیں۔ اور وبائی شکل میں پھیلنے والی بیماریوں کی روک تھام کے لیے مناسب اقدامات کرتے ہیں۔

امراض کے انتقال میں کمی (Reduction of Communicability of Diseases)

اس سے مقصد یہ ہے کہ متعدی مریض کو عوام سے اس طرح علیحدہ کر دیا جائے کہ وہ دوسرے صحت مند لوگوں کو متاثر نہ کر سکے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اپنائے جاتے ہیں۔

علیحدگی (Isolation) اس میں ہم کوشش کرتے ہیں کہ متعدی مریض کو بیماری کے دوران (Period of Communicability) دوسرے تمام لوگوں سے علیحدہ رکھیں۔ بیماری کے متعدی ہونے کا جیسے ہی ہمیں علم ہو، ہم مریض کو علیحدہ کر دیں اور اس کو اسپتال پہنچا دیں جہاں متعدی امراض سے متعلق علاج ہو سکے۔ اگر کسی علاقہ میں اسپتال کی سہولت نہیں ہے تو مریض کو گھر میں ہی بالکل الگ کمرے میں رکھتے ہیں۔ مگر کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس کمرے میں کوئی دوسرا نہ جائے صرف طبیب جو علاج کر رہا ہے جائے۔ اس کی استعمال کی اشیاء بالکل الگ تھلگ رکھیں۔ اس کے بول و براز الگ برتن میں جمع کر کے بستی سے دور یا تو جلا دیں یا زمین میں دفن کر دیں۔ اس کے لیے تازہ ہوا کا بہترین انتظام کر دیں اور اگر پہلی صورت میں اسپتال میں ہے تو وہاں پر ساری سہولیات تو میسر ہوتی ہی ہیں۔ یہ علیحدگی دو طریقوں سے کرتے ہیں۔

۱۔ دوران مرض علیحدگی (Concurrent - Isolation) ۔ اگر مریض زندہ ہے تو اس کو بالکل ہی علیحدہ رکھیں گے۔ نیز اس کی کھانے پینے کی ساری اشیاء اور کپڑے بستر وغیرہ سب ہی الگ رکھیں گے اس کو ہم مکمل علیحدگی (Complete-Isolation) ۔ کہتے ہیں۔

۲۔ بعد الموت علیحدگی :- (Terminal - Isolation) خدا کرے کہ مریض نہ مرے اور اگر مر گیا ہے تو بھی اس کو بالکل علیحدہ رکھیں گے۔ ایسی صورت میں اس کی ساری استعمال شدہ اشیاء پاک کریں گے پھر استعمال میں لائیں گے۔ اگر مریض اچھا ہو گیا تو بھی اس کے سارے کپڑے برتن اور دوسری استعمال کی ہوئی اشیاء پاک کریں گے اور اس شخص کو علیحدہ رکھیں گے۔ کیوں کہ اب وہ حامل تعدیہ (Carrier of Infection) ہو گیا اور وہ دوسروں کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔

علاج (Treatment)

۱- Prophylactic Meas

مرض کے متعدی ہونے کے تعین کے بعد حفظ ماتقدم اقدامات کریں گے۔ اس میں مرض مخصوص کے پھیلنے سے ۶ ماہ یا ایک سال قبل ٹیکہ وغیرہ کا استعمال تدابیر کے طور پر کریں گے۔ مثلاً ہیضہ میں ۶ ماہ قبل ہی عام طور پہ ٹیکہ لگا دیتے ہیں جس کو عام ٹیکہ (Mass Vaccination) کہتے ہیں۔ یہ چونکہ صرف حفظ ماتقدم کے طور پر کرتے ہیں۔ اس لیے ٹیکہ کی بہت تھوڑی ہی مقدار استعمال کرتے ہیں۔

ا/ مناعت (IMMUNITY) کسی بھی جراثیمی تعدیہ سے متاثر نہ ہونے کی صلاحیت و مناعت کہتے ہیں۔

مناعت دو طرح کی ہوتی ہے۔

۱۔ مناعت اضافی (Passive Immunity)

اس قسم کی اکتسابی مناعت (Acquired-Immunity) میں مدافعتی مادے جسم میں وجود نہیں ہونے اور نہ ہی پیدا ہوتے ہیں بلکہ بیرونی جسم سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ اس وقت ہوتے ہیں جب کسی مرض کا تعین ہو چکا ہوتا ہے اس میں ٹیکہ کی شکل میں وہ مادے جسم میں داخل کیے جاتے ہیں۔

مناعت فاعلی Active Immunity

جب ہم مختلف طریقوں کے سیرم (Serum) جسم میں داخل کر کے مرض کا علاج کرتے ہیں۔ جو صرف حفظ ماتقدم کے طور پر ہوتا ہے۔ مثلاً

اے۔ ٹی ایس (Anti Toxin Serum)
اے۔ ڈی (Anti Diphthena) اور
اے پی (Anti Pertussis) وغیرہ

اگر عمل مناعت Immuni-zation سے فائدہ نہیں ہوتا ہے تو اس مرض میں اس سے متعلق ادویہ (Drugs) کا استعمال کراتے ہیں۔ تاکہ مرض بالکل دور ہو جائے۔ یہ تمام دوائیں (Chemo-Therapic) کہلاتی ہیں۔ اور اس طرح کا علاج Chemo-Therapy کہلاتا ہے۔

نوٹ

۱. خط کتابت کرتے وقت اپنا نام، پتہ اور پن کوڈ ضرور استعمال کریں۔

۲. منی آرڈر میں بہت سے قارئین رقم کی وضاحت نہیں فرماتے ہیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

مضمون نگار حضرات اپنے مضامین روانہ کرتے وقت اس کو دھیان میں رکھیں کہ تحریر صاف ستھری ہو۔ تاکہ رسالہ میں اغلاط سے بچا جا سکے۔

زہرہ عزیز
علی گڑھ

بچے کی شخصیت پر ماحول کا اثر

شخصیت بہت وسیع لفظ ہے۔ جب
ہم کسی شخصیت کا ذکر کرتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے
ہیں اس شخص کی تمام خصوصیات اور قابلیت۔ یعنی
اس کی ذہنی اور جسمانی خصوصیات۔ شخصیت کو ابھارنے
میں ماحول بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ایک طرح سے شخصیت
اور ماحول کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔

دنیا میں انسان کے علاوہ کسی اور
جاندار کا بچہ شاید اتنا بے بس نہیں ہوتا ہے اور نہ
اس کو اتنے عرصہ تک اپنے والدین کی مدد کی ضرورت
رہتی ہے اور نہ ہی وہ اپنی ساری قوتوں کو ترقی دینے
میں اتنی دیر لگاتا ہے۔ چونکہ قدرت کو انسان کے
بچے سے بہت کام لینا ہوتا ہے اس لیے اس کا انصاب
نیم لمبا رکھا گیا ہے۔ اس کے جسم کی ترقی تک میں خدا
نے خاص اہتمام کیا ہے۔

لیکن قدرت کے اس تمام اہتمام
کے باوجود بڑوں کی لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے
قدرت کا منشا پورا نہیں ہو پاتا اور اکثر والدین اور
استادوں کی غفلت بچے کو بے راہ روی کی طرف لے
جاتی ہے۔ یہی ماحول ہے جس کے اثر سے یا تو بچے کی
شخصیت ابھرتی ہے یا پھر پستی کی طرف جاتی ہے۔
اس سے ثابت ہوا کہ بچے کی شخصیت بنانے کی اوّل
ذمہ داری والدین پر اور پھر استاد پر ہوتی ہے۔ ہمارے
دیس کے لاکھوں بچے والدین کی لاپرواہی
اور نانی دادی کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے برباد
ہو جاتے ہیں۔ ان کے کچے ذہن میں طرح طرح کی گتھیاں
ڈال دی جاتی ہیں جو عمر بھر سلجھائے نہیں سلجھتیں۔ اس
سے اگر کوئی بچ جاتا ہے تو اسکول میں ایک سے ایک
بقراط استاد پڑا ہے۔ وہ انھیں آدمی بنانے کی کوشش
میں جانوروں سے بدتر درجے پر پہنچا دیتا ہے اور
جب یہ بچے عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو اُن کا نہ
تن درست ہوتا ہے نہ من، نہ ان میں ولولہ ہوتا
ہے نہ امنگ۔ نہ ہمت اور نہ یقین۔ ڈرے ڈرے
سہمے سہمے۔ ہر چیز سے خوف۔ ہر چیز پر شبہ۔ نہ
کسی سے لگاؤ اور نہ کسی پر بھروسہ، نہ کام
کرنے کا شوق، کچھ کام کرتے بھی ہیں تو سزا کے ڈر
سے یا انعام کے لالچ سے۔ ایسے بچوں کی زندگی
عذاب بن جاتی ہے۔ ان کی تمام صلاحتیں ختم ہو جاتی
ہیں۔ اور ان کی اپنی شخصیت ختم ہو کر مصنوعی
لبادہ بن جاتی ہے۔

بچے کی جسمانی نشوونما اس کی ذہنی
ترقی اور نفسیات کے موضوع پر بہت تحقیقات
ہو چکی ہیں اگر والدین اور استاد اپنے کام کی
اہمیت کو سمجھیں اور سوچیں کہ ان کی تھوڑی سی
توجہ سے دنیا میں مصیبتیں گھٹ سکتی ہیں اور
کتنی خوشیاں بڑھ سکتی ہیں اور اس تحقیقات
سے فائدہ اٹھا کر اپنا کام سمجھ بوجھ کر انجام

دیں تو بہت سی زندگیاں تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔

والدین کی طرف سے تربیت کی بنیادی غلطی یہ ہوتی ہے کہ وہ یا تو بچے میں کمی اور گھٹیا پن کا احساس غیر ضروری شدت سے پیدا کر دیتے ہیں یا تلافی کی کوششوں میں حائل ہوتے ہیں۔ انھیں غیر معمولی طور پر اکسا کر غلط راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کا صحیح احساس اور تلافی کی مناسب تدبیر بچے کی شخصیت کو ابھارنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کسی میں زیادتی ہوئی اور توازن بگڑا تو بچے کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔ والدین کی بات چیت سے، ان کے عمل سے، ان کی سختی اور لعنت وملامت سے اکثر بچے میں احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس سے بچنے کی نئی نئی تدبیریں کرتا ہے، آگے بڑھنا چاہتا ہے، بہتر بننا چاہتا ہے، توجہ اپنی طرف منعطف کرانا چاہتا ہے لیکن اگر احساسِ کمتری حدِ مناسب سے بڑھ جائے تو اس سے بچے میں کینہ، بغض اور حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے اپنے مقابلے والوں کی بھائی بہنوں کی اور دوسرے بچوں کی برائیاں چاہنے لگتے ہیں۔ اپنی قدر بڑھانے کے لیے دوسروں کی چغلیاں کھاتے ہیں، ان پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔ یہ عادتیں بچے کی شخصیت بنانے میں روڑا ڈالتی ہیں۔

اکثر والدین اپنے بچے کے آگے بڑھنے کی خواہش کو بے جا طور پر ابھار کر اس کے حوصلے کی شدت کو دوسروں سے بڑھ چڑھ کر رہنے کی خواہش کو مرض کے درجہ تک پہنچا دیتے ہیں۔ اپنے بچے کو درجہ میں اوّل نمبر پر رہنے اور امتحان میں امتیازی نمبر لانے کی خواہش میں بچے کو صرف جزوی مقصد حاصل کرنے کی راہ پر ڈال دیتے ہیں۔ یہ بچہ اپنی ساری قوت اور دھیان امتحان میں اول آنے پر صرف کرتا ہے اور کتابیں ا[...] کا مقصد رہ جاتی ہیں۔ کھیل کود اور ورزش سب کچھ وہ اول مقصد کے حصول میں تج دیتا ہے اس طرح بچے کی شخصیت پوری طرح نہیں ابھرتی، اس میں کچھ کمی رہ جاتی ہے۔

کچھ والدین ایسے ہوتے ہیں جو سب کے سامنے اپنے بچے کے عیب گنواتے رہتے ہیں اس سے بچہ ذلت محسوس کرتا ہے جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ ڈھیٹ اور بے حیا ہو جاتا ہے۔ ایسے بچے بڑے ہو کر کسی چیز کو اچھا نہیں سمجھتے اور نہ کسی کی تعریف کرتے ہیں۔ بچپن میں انھیں ذلیل کیا گیا تھا۔ اب یہ اس کا بدلہ لیتے ہیں اور سب کو برا سمجھتے ہیں۔ اس طرح بچپن میں بچے کو ذلیل کر کے والدین اس کی ساری شخصیت کو ختم کر دیتے ہیں۔ ان تجربات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بچے کی نہ تو ضرورت سے زیادہ تعریف اچھی ہے اور نہ بے جا مذمت، نہ اپنے بچے کو اتنا گرائیے کہ پھر قدم ہی نہ اٹھا سکے اور نہ اتنا چڑھا[ئیے] کہ زمین پر قدم نہ رکھ سکے

بچے کی شخصیت بنانے کی جتنی ذمہ[داری] والدین پر ہے، اتنی ہی استادوں پر بھی ہے۔ مگر [...] کی تعلیم و تربیت کا فرض پوری طرح انجام نہیں دے سکتا ہے۔ اس لیے بچے کو اسکول بھیجا جاتا ہے۔ یہاں استادوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بچے کی مخصوص ضرورتوں کا خیال رکھیں۔ استاد

بقیہ مضمون بقیہ مضمون

بچوں کی شخصیت پر ماحول کا اثر

تھوڑی سی توجہ یا غفلت بچے کی شخصیت کو سنوار سکتی ہے یا ختم کر سکتی ہے

ننھا بچہ بھی ایک شخصیت رکھتا ہے، وہ کوئی بے جان چیز نہیں، کھلونا نہیں۔ وہ بچپن سے چپ چاپ اپنے لیے کوئی مقصد کوئی منزل مقرر کر لیتا ہے اور اس تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ منزل وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہو کر مقرر کرتا ہے۔ اپنی مقرر کرد منزل تک پہونچنے کے لیے ساری دنیا کو اس مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ اگر اپنے ار کے حالات کو غلط سمجھ کر یہ مقصد مقرر کر لیتا ہے تو ساری دنیا کو غلط سمجھنا پڑتا ہے۔ او تمام عمر وہ اس سے نجات نہیں پا سکتا۔ وہ اپنی تمام عمر حالات کو سدھارنے میں اور اپنی حیثیت کو ابھارنے میں لگ جاتا ہے۔ کمی کا احساس اور اس کی تلافی یہ دو چیزیں اس کی زندگی کا مر بن جاتی ہیں۔ ان میں اگر غلطی ہوتی ہے تو ساری زندگی غلط راہ پر پڑا رہتا ہے اور اس کی شخصیت اندھیرے میں بھٹکتی رہتی ہے۔

بقیہ مضمون "تعلیم کے بنیادی مسائل"

ہندوؤں کی بھی یہ خواہش ہوگی کہ یہ نصاب بدلے اور ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب کی تعمیر میں مسلمانوں نے جو حصہ لیا ہے۔ اس کو نظر انداز نہ کیا جائے اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں اس پر بھی روشنی ڈالی جائے۔ اس سے نہ صرف مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا ہوگی بلکہ ایک متحدہ قومیت کا تصور بھی نشوونما پائے گا۔

مسلمانوں کو اپنے نصاب تعلیم کی اصلاح کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اس تعلیم کا تعلق موجودہ زمانہ سے بھی ہونا چاہیے اور ہر طالب علم کو اپنی روز پیدا کرنے کے قابل بنانا چاہیے۔ آزاد ہندوستان میں روزی کرنے کے لیے کسی ڈگری یا سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں بلکہ طالبعل میں اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی صلاحیت کی ضرورت ہے یہ سرکاری درس گاہ میں تعلیم حاصل کرنے سے بھی پیدا ہو سکتی ہے ا غیر سرکاری درس گاہ میں تعلیم حاصل کرنے سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان ان تعلیمی مسائل کی طرف توجہ کر اور اپنے مسائل خود طے کریں۔ تہذیب الاخلاق میں ا موضوع پر اب انشاء اللہ مسلسل لکھا جائے گا۔

[illegible]
شعبہ اردو۔

اردو اور سفارشات

مختلف نسلوں، تہذیبوں اور مذہبوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان مختلف زبانوں کا بھی گہوارہ رہا ہے۔ عرصۂ دراز سے یہاں مختلف زبانیں پروان چڑھتی اور ترقی کرتی رہی ہیں۔ جدید ہندوستانی زبانیں جو ۱۹۴۷ء تک تعلیمی اور سرکاری طور پر انگریزی کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں، آزادی کے بعد ان کو پنپنے کا موقع ملا۔ عوامی اور سرکاری پشت پناہی سے ان کی رفتار ترقی تیز ہوتی گئی۔ مگر ٹھیک اسی وقت ملک میں اردو دشمنی کی ایک ایسی فضا قائم ہوئی جس نے اردو کی بیخ کنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اردو کے ساتھ غیر ملکی زبان سے بھی بدتر رویہ اختیار کیا گیا دوسری زبانوں کی ترویج و ترقی کے لیے جس قدر کوششیں جاری تھیں، اسی قدر اردو کو دبانے اور مٹانے کی بھی تدابیر کی جارہی تھیں۔ اردو کو اسکولوں سے خارج کر دیا گیا، سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر میں اس کا داخلہ ممنوع ہوگیا۔ عدالتوں اور کچہریوں میں اس سے اجنبیت برتی جانے لگی۔ نجی اداروں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس کے نشانات کو کھرچ کھرچ کر مٹایا جانے لگا۔ مغایرت بلکہ منافرت کے جذبات کو اس طرح بھڑکایا گیا کہ اردو دوستی اور وطن دشمنی و فرقہ پرستی مترادف سے الفاظ قرار دیے جانے لگے۔ اردو والے اس پیچیدہ صورت حال سے بوکھلا گئے۔ ہر طرف مایوسی کی تاریکی پھیلتی گئی

لیکن اس تاریکی میں امید کی ایک کرن بھی تھی — اور وہ تھا آئین ہند۔ جس نے جمہور کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی تھی۔ اور جس کی آٹھویں فہرست میں مندرج ہندوستان کی چودہ بڑی زبانوں میں اردو بھی شامل تھی۔ ارباب بست و کشاد میں سے گنتی کے چند افراد دل سے اردو کا تحفظ چاہتے تھے۔ مگر ان کے لیے دوسرے مسائل زیادہ اہمیت رکھتے تھے۔ ان کی آواز اس شور و غوغا میں دب کر رہ گئی، شاید اس لیے بھی کہ انھوں نے اردو کے معاملے میں اپنی آواز کو پوری توانائی کے ساتھ بلند بھی نہیں کیا۔ یعنی دل کی خواہش کو زیر لب ہی کہہ کر رہ گئے کچھ لوگوں نے زبانی جمع خرچ تو بہت کی، اردو کی اہمیت کا بھی اظہار و اعتراف کیا، اس کی شان میں قصیدے بھی پڑھے، لیکن اس طرح کہ اس کا کوئی عملی نتیجہ نہ مرتب ہو۔ یہ وہی طریقۂ کار تھا جسے ہمارے سیاست داں عوام کو خوش کرنے اور ان کی ہمدردی اور ووٹ حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے رہے ہیں۔ مخالفتوں کے طوفان تباہی مچاتے رہے اور اردو کی ایک ایک بنیاد کو مسمار کرتے رہے۔ لیکن مذکورہ دونوں گروہوں اور آئین میں درج ضمانت کی بدولت اردو کے تحفظ کے بارے میں کانفرنسیں بھی ہوتی رہیں، کمیٹیاں بھی قائم ہوتی رہیں، کمیشن بھی بنتے رہے۔ تجاویز اور سفارشیں بھی پیش ہوتی

رہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ ان میں سے کسی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی اور نہ ان کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہوا۔

مرکزی اور ریاستی حکومتیں

درج آئین زبانوں کی ترویج و ترقی کی پابند تھیں ۱۹۵۳ء میں لسانیاتی بنیادوں پر ریاستوں کی تنظیم نو کے لیے کمیشن قائم ہوا۔ اس کی رپورٹ کے بعد تمام زبانوں کے علاقے متعین ہو گئے اور ہر ریاست نے اپنی زبان کی ترقی کے لیے اقدامات کرنا شروع کر دیے۔ اردو کا ایسا کوئی مخصوص علاقہ نہ تھا اور وہ اس سرپرستی سے محروم رہی۔ ان علاقائی زبانوں کی ترقی کا وقتاً فوقتاً مختلف سطحوں پر جائزہ لیا جاتا رہا ۱۹۶۸ء میں مرکزی پارلیمان کے دونوں ایوانوں سے لسانی پالیسی کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ "ملک کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی کے لیے لازم ہے کہ ہندی کے ساتھ ساتھ باقی چودہ زبانوں کی ترقی کے لیے بھرپور اقدامات کیے جائیں"۔ اسی قرارداد میں مرکزی حکومت سے اصرار کیا گیا تھا کہ وہ ریاستی حکومتوں کے اشتراک سے ایسے پروگرام بنائے اور ان کو نافذ بھی کرے کہ جن سے ان تمام زبانوں کی ہمہ جہت ترقی ہو تاکہ ان کا دامن جلد از جلد مالامال ہو جائے اور یہ جدید علوم کے اظہار کا موثر ذریعہ بن سکیں۔

ریاستی تمام وسائل — مالی اور دیگر — ان علاقائی زبانوں کے لیے پہلے ہی استعمال ہو رہے تھے۔ مرکزی حکومت نے ہر زبان کے لیے ایک ایک کروڑ روپے کی مزید امداد دی۔ اردو کو بھی اس کا واجب ایک کروڑ روپیہ دیا گیا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس ایک کروڑ روپیہ کا لینے والا کوئی نہ تھا۔ دینے والوں کو بھی اس کا پورا اندازہ پہلے ہی تھا۔ ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان اردو کہی گئی تھی۔ اس نے بھی اس بارِ گراں کا متحمل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس لیے مجبوراً مرکزی حکومت کو یہ ذمہ داری قبول کرنی پڑی چنانچہ ۱۹۶۹ء میں ترقی اردو بورڈ کے نام سے ایک مرکزی بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ وزیر تعلیم اس کے چیرمین بنائے گئے۔ علمی سائنسی اور بچوں کے ادب سے متعلق کتابیں تیار کرنے کی ذمہ داری اسے سونپی گئی۔ مگر اس سوال کا کوئی معقول جواب نہ تھا کہ یہ کتابیں کس مقصد سے تیار کی جا رہی تھیں، ان کا پڑھنے والا کون ہوگا، ان کو کہاں پڑھایا جائے گا۔ گویا اردو کی تمام ترحق تلفیوں کی تلافی یہ تھی کہ اس کے نام پر ایک کروڑ روپیہ خرچ کر دیا جائے۔

۱۹۷۲ء میں جناب اندر کمار گجرال (ریاستی وزیر برائے تعمیرات و مکانات) کی سربراہی میں ایک اور کمیٹی قائم کی گئی کہ وہ حکومت کو اس بارے میں مشورہ دے کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں اور اردو بولنے والوں کو تعلیمی ثقافتی اور انتظامی امور میں کیا مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں"۔ ۱۶ افراد پر مشتمل اس کمیٹی کو ہدایت کی گئی کہ چھ ماہ کے اندر اندر اپنی رپورٹ پیش کر دے۔ اس کمیٹی نے کچھ ذیلی کمیٹیاں قائم کیں تاکہ مختلف میدانوں کی ضرورتوں کا جائزہ لیا جا سکے ان ذیلی کمیٹیوں نے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے

لق رکھنے والے ۳۵۰ افراد کے بیانات قلم بند کیے
ٹی کا کام پھیلتا گیا اور وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک
ئی چھاپیاں گزر گئیں۔ بالآخر تین سال بعد ۱۹۷۵
یں کمیٹی نے تفصیلی اور ہمہ گیر قسم کی رپورٹ اپنی سفارشات
ے ساتھ پیش کردی اور حکومت نے حسب معمول اسے
سردخانہ میں ڈال دیا۔ ۱۹۷۷ء میں سیاسی انقلاب
ے نتیجہ میں جنتا پارٹی برسر اقتدار آئی۔ اس مختصر مدتی
قتدار کے دوران حکومت نے رپورٹ کو سردخانہ
سے نکالا اور پارلیمنٹ کے سامنے پیش کردیا۔
لاں کہ شاید اس سے مدعا کچھ بھی نہیں تھا۔ ۱۹۸۰ء آیا
ور دوسرا انقلاب برپا کرکے چلا گیا۔ ان انتخابات کے
وقت ہر پارٹی نے اردو اور اقلیتوں کے حقوق کو بطور
خاص اپنے منشوروں میں شامل کیا تھا۔ اس رپورٹ
کے بارے میں ابھی تک مکمل خاموشی ہے۔ جیسے اسے کلیتاً
فراموش کردیا گیا ہو۔ کانگریسی حکومت نے اس کمیٹی
کو قائم کیا تھا۔ انقلاب سے گزر کر اب پھر کانگریس
ہی برسر اقتدار ہے۔ اس رپورٹ کو فراموشی کی نذر
کردینے کا مطلب اس کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے کہ
یہ طفل تسلی تھی جو اردو والوں کو بہلانے کے لیے دے
دی گئی تھی۔ وقت گزر گیا۔ جذبات میں قدرے خنکی
آگئی اور اس رپورٹ کو "زیب طاق نسیاں" کردیا
گیا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے اردو کے
تن نیم مردہ میں روح پھونک جاتی لیکن اس میں
ان کمیٹی سے مطالبات کو ہمدردی کے ساتھ
دیکھا گیا اور پھر ان کے بارے میں سفارشات کی
گئی ہیں۔ ذیل میں ان سفارشات کا خلاصہ
پیش کیا جارہا ہے۔ تاکہ اہل اردو کو معلوم

ہوسکے کہ کمیٹی جس نے اردو کے مطالبات کو ہمدردی
کے ساتھ سنا اور سمجھا، وہ کس نتیجے پر پہنچی اور اب عوام
فیصلہ کریں کہ ان میں سے کون سے مطالبات کو حکومت
سے منوانے پر وہ اصرار کرسکتے ہیں۔

۱۔ سرکاری زبان زبانوں سے متعلق ریاستی
قوانین میں لسانی اقلیتوں کا تحفظ کرنے کے لیے ریاستوں
اور مرکزی علاقوں کو آئین کی دفعہ 345 کے تحت عمل درآمد
کرنا چاہیے اور خود قوانین میں اس بات کی وضاحت ہونی
چاہیے کہ ریاست متعلقہ اقلیتی زبان کو کن مقاصد اور معاملات
کے لیے استعمال کی اجازت دیتی ہے۔

۲۔ مرکز اس امر کو یقینی بنائے کہ ریاستوں
اور مرکزی علاقوں میں لسانی اقلیتوں کے تحفظات کا
موثر اور مکمل نفاذ ہو۔

۳۔ ہر ریاست کے وزیر اعلیٰ کی صدارت
میں ریاستی سطح پر کمیٹیاں قائم کی جائیں جو نومبر ۱۹۶۱ء
کی سفارشات کی روشنی میں اردو بولنے والے لوگوں
کی شکایتوں پر غور کریں۔

۴۔ پرائمری سطح پر اردو تعلیم کے موجودہ
انتظامات ناکافی ہیں۔ ریاستوں مرکزی علاقوں
اور مقامی تنظیموں کے سررشتہ ہائے تعلیم آئین کی دفعہ
350 A کے تحت ان لوگوں کے لیے جو اردو کو اپنی
مادری زبان کہتے ہیں، اردو تعلیم کے ضروری انتظامات
کریں۔

۵۔ موجودہ ضوابط کی رو سے ان
مدارس میں جہاں ایک جماعت میں دس یا کل اسکول
میں چالیس طالب علم ہوں، پرائمری سطح پر اردو کے
ذریعہ تعلیم ہونی چاہیے۔ یہ فارمولا اردو بولنے والوں

ی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس فارمولے کے بجائے سفارش کی جاتی ہے کہ

i جس علاقے میں اردو بولنے والوں کی تعداد کل آبادی کا دس فیصدی یا اس سے زیادہ ہو ضرورت کے مطابق ایک یا زیادہ اردو میڈیم پرائمری اسکول قائم کیے جائیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ایسے اسکولوں میں ذریعہ تعلیم ایک ہی ہو علیحدگی پسندی سے بچنے کے لیے اردو اور غیر اردو والے طالب علموں کو ایک ہی اسکول میں رکھا جائے

ii ایسے علاقے میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد کل آبادی کے دس فی صدی سے کم ہو، ان اسکولوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد دس ہو سکتی ہو ایک اردو استاد مقرر کیا جائے اس امکان کا تعین اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ اسکولی عمر کے اردو بولنے والے بچوں کی تعداد اس علاقے میں کیا ہے۔

iii فوری مقاصد کے لیے مذکورہ بالا اسکولوں میں دو لسانی استادوں کا تقرر کیا جائے ایسے اسکولوں کے موجودہ اساتذہ کو بھی اردو سیکھنے کی ترغیب دی جا سکتی ہے

۶۔ ثانوی درجات میں موجودہ فارمولے کے مطابق اقلیتی زبان کی تعلیم کی سہولت فراہم کرنے سے پہلے کسی لسانی اقلیت سے متعلق ہر کلاس میں کم از کم پندرہ اور آخری چار جماعتوں میں ساٹھ طالب علم ہونے چاہییں۔ عملاً اس سے بڑی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس فارمولے کے بجائے یہ مان لینا چاہیے کہ پرائمری اسکولوں سے نکلنے والے بچوں کی تعداد میں سے دو تہائی اگلے درجات میں آنا چاہیں گے۔ اس بنیاد پر موجودہ ثانوی اسکولوں میں اردو سیکشن کھولے جائیں اور اردو میڈیم اختیار کرنے والے طالب علموں سے پہلے اردو داں اساتذہ مقرر کیے جائیں۔ اس بات پر زور دیا جائے کہ ایک ہی اسکول میں مختلف زبانوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم ہوں۔

ایسے شہروں میں جہاں اردو بولنے والوں کی کافی تعداد ہو، ہر آٹھ دس پرائمری اسکولوں کے لیے ایک ہائر سکنڈری اسکول اردو میڈیم کا کھولا جائے۔

۷۔ ریاستی حکومتوں کو ایسے اردو میڈیم ہائر سکنڈری اسکولوں کے تعلیمی معیار کو بڑھانے میں مدد کرنی چاہیے جنھیں خود لسانی اقلیتیں چلا رہی ہوں

۸۔ اردو ہائر سکنڈری اسکول اور اردو سیکشن قائم کرنے کی اجازت کے لیے اگر کوئی شرائط ہوں، تو لسانی اقلیتوں کے سلسلے میں ان کو نرم کر دینا چاہیے اور طریقہ کار کو اتنا آسان کر دینا چاہیے کہ درخواست کی تاریخ سے دو مہینے کے اندر اجازت مل جائے۔

۹۔ قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۶۸ء کی قرارداد میں جو سہ لسانی فارمولا پیش کیا گیا۔ اس میں درج ذیل ترمیم کر دی جائے۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

علیاحضرت سلطان جہاں بیگم و علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ام ہانی فخر الزماں
صدر شعبۂ فارسی
اے ایم یو

دوردستان را باحساں یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلی بپای خود ثمر می افگند۔

اس یونیورسٹی کا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جس نے یہ نام نامی نہ سنا ہو، سلطانیہ ہاسٹل سلطان جہاں منزل اور نصر اللہ ہاسٹل کی عمارتیں مادی صورت میں دعوت نظر دیتی رہتی ہیں۔ بھوپال میں یکے بعد دیگرے چار خواتین، قدسیہ بیگم، سکندر جہاں بیگم، شاہجہاں بیگم اور سلطان جہاں بیگم نے فرمانروائی کی۔ مگر موخر الذکر کو امتیازی شان حاصل ہے۔ انھوں نے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی زبان حال سے اعلان کر دیا تھا

بیا تا گل برافشانیم و می در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم وطرحی نو در اندازیم

اس میں شک نہیں کہ علیاحضرت کے تمام اوصاف اور کارناموں کا احاطہ کرنا کسی ایک مضمون کیا معنی ایک ضخیم کتاب میں بھی ممکن نہیں اور ہر کارنامہ اتنا مہتم بالشان ہے کہ انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

آغاز حکومت کے وقت کچھ تو شاہجہاں بیگم کی طویل علالت اور کچھ صدیق حسن خاں (سلطان [redacted]

جہاں بیگم کے سوتیلے والد یعنی شاہجہاں بیگم کے شوہر ثانی جن پر راقمۃ الحروف کا ایک مضمون "مجموعۂ نفائس" میں شائع ہو چکا ہے) اور ان کے خاندان والوں کی مداخلت بیجا سے ریاست کی حالت بہت سقیم ہو چکی تھی۔ سمند ناز پر تازیانہ یہ ہوا کہ صدر نشینی کے ساتویں مہینے نواب سلطان دولہا المخاطب باحتشام الملک نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ وزیر ریاست عبد الجبار خاں نے استعفیٰ دے دیا۔ ان حوادث نے علیاحضرت کی ہمت زیادہ بلند کر دی اور وہ بغیر کسی شریک و سہیم کے امور ریاست پر حاوی ہو گئیں۔ ملک محروسہ کے دورے کیے، بندوبست و مال گزاری، ذرائع تردد آراضی، معافی بقایا، قوانین و عدالت، پولیس اور جیل صنعتی و حرفتی تدابیر، اصلاح معیار ملازمت، جنگ عظیم میں سلطنت برطانیہ کی امداد، بلدۂ بھوپال میں میونسپلٹی کا قیام، سڑکیں اور تعمیرات، انتظام ڈاک، تعلیمات عامہ، وظائف اور امداد تعلیم، گرل گائڈ، پرنس آف ویلز لیڈیز کلب کا قیام، نمائش مصنوعات خواتین ہند، ہائی کورٹ اور جوڈیشل کونسل کا قیام۔ غرض کہ ہر شعبہ کے احیاء اور اصلاح کا بیڑا اٹھا لیا اور کامیابی میں خدا کی مدد شامل حال رہی۔ لیکن کسی رئیس کی تعریف کے لیے

یہ کافی نہیں کہ اس کی مساعیِ جمیلہ اسی کے حلقہ ریاست میں محدود رہیں یہ تو ایسا ہی ہے کہ جیسے کسی عام آدمی کے لیے کہا جائے کہ وہ اپنے گھر کی نگرانی بہت اچھی طرح کرتا ہے اور اپنے گھر والوں کا بہت خیال کرتا ہے۔ اور اگر خدانخواستہ اس کی یہ توجہ صرف اس کی جنس ہی تک محدود ہے تو وہ اپنی غیر منصفانہ روش پر مذمت کا مستحق ہوگا نہ کہ تعریف کا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا کوئی فرد اس ذات سراپا صفات پر قلم اٹھائے تو اس کا اولین فرض ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھے کہ انھوں نے اس مادرِ درس گاہ کے لیے کیا کیا ہے۔

من لا یشکر الناس لا یشکر اللہ

علیا حضرت دنیا کی پہلی خاتون ہیں جو کسی یونیورسٹی کی چانسلر مقرر ہوئیں۔ اور اس طرح انھوں نے ایک طرف تو پوری یونیورسٹی کو جو اس وقت انتہائی نازک دور سے گزر رہی تھی، اپنی آغوشِ شفقت میں لے لیا اور دوسری طرف ہندوستان کی تمام خواتین کا عموماً اور بھوپال کی خواتین کا خصوصاً تمام دنیا میں سربلند کر دیا۔ اس یونیورسٹی کو خود یہ فخر حاصل ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے اس نے ایک خاتون کو اپنی حکومت کے لیے انتخاب کیا اور دنیا نے اس کے حسنِ انتخاب پر خراجِ تحسین پیش کیا۔

ہر کس کہ دید روی تو بوسید چشم من
کاری کہ کرد دیدۂ من بی نظر نہ کرد

یہ عہدہ پہلی مرتبہ ہز اکسیلنسی وائسرے گورنر جنرل ہند نے اپنے قانونی اختیار سے علیا حضرت کو پیش کیا۔ ان کی کامیابی کا یہ بیّن ثبوت ہے کہ اس کے بعد دو مرتبہ یونیورسٹی کورٹ نے ان کو چانسلر مقرر کر دیا۔ یونیورسٹی میں علیا حضرت کا سب سے بڑا کارنامہ تحقیقاتی کمیشن کا تقرر ہے۔ جس کو ابن زبیری کے الفاظ میں احیات سلطانی ص ۱۷۴ میں ذیلاً پیش کیا جاتا ہے۔

"یونیورسٹی کی بنیاد ایک ایسے زمانہ میں قائم ہوئی تھی جو کہ قومی اختلال کا زمانہ تھا۔ اسی سبب سے جس وقت مجلس واضع قوانین میں یونیورسٹی کا بل پیش ہو رہا تھا، اس کے آئین و قواعد پر کچھ زیادہ تنقید نہ ہو سکی اور ایک ایسا بل پاس ہو گیا جس میں بہت سی اساسی خرابیاں رہ گئیں اسی طرح یونیورسٹی کے مصارف کے تعین میں اقتصادی حالت اور آئندہ ضرورتوں کا اندازہ نہیں رکھا گیا۔ جس کے باعث پہلے ہی سال تخفیف مصارف کا ایک کمیشن مقرر کرنا پڑا ان اصولی اور اساسی خرابیوں اور ارکانِ یونیورسٹی کی غیر مآل اندیشانہ کارروائیوں نے بعض مقتدر اصحاب کی پارٹی فیلنگ کے ساتھ مل کر یونیورسٹی کی شہرت و عزت پر خراب اثر ڈالا اور یہ اندیشہ قوی ہو گیا کہ لارڈ ریکٹر کو مجبوراً دست اندازی کرنا پڑے۔ سرکارِ عالیہ کا یہ خیال مبارک اگرچہ بہت پہلے

اصلاح کی طرف رجوع تھا لیکن نہایت
اہم مصروفیتوں کی وجہ سے وہ عملی شکل
میں نہ آسکا۔ اب اولین فرصت میں
حضور ممدوحہ نے اس طرف توجہ کی اور
ماہرینِ تعلیم کا ایک مقتدر کمیشن مقرر
کیا جس کے تمام مصارف خود عنایت
فرمائے اور علی گڑھ کے دورانِ قیام
میں اس کو اپنا مہمان بنایا۔ اس کمیشن
کے ارکان آنریبل سر ابراہیم رحمت اللہ
سر فلپ جوزف ہارٹوگ ممبر آف انڈین
پبلک سروس کمیشن اور سر جارج انڈرسن
ڈائرکٹر تعلیمات صوبۂ پنجاب نامزد کیے
گئے۔ جنہوں نے تحقیقات کر کے ایک مفصل
رپورٹ سرکارِ عالیہ کے ملاحظہ میں پیش
کی۔ اور حضورِ ممدوحہ نے اس کو اپنے
نوٹ کے ساتھ ممبران کورٹ کے پاس
ارسال فرمایا۔ جس میں یونیورسٹی کے
وجوہ، اختلافات، ڈسپلن وغیرہ کا
تذکرہ کر کے اپنے فرض اور اختیارات کو
ظاہر کیا اور کمیشن کی سفارشوں پر
توجہ دلائی۔ اس کے بعد کورٹ کے سالانہ
اجلاس منعقدہ ۹ فروری ۱۹۲۹ء کی
صدارت کے لیے تشریف لے گئیں جو
نہایت اہتمام بالشان تھا جس میں جدید
وائس چانسلر کے انتخاب کا مسئلہ
بھی طے ہوا اور ہمارے نواب سر
مزمل اللہ خان صاحب کے ڈاکٹر

سید راس مسعود (نواب مسعود
جنگ) کا تقرر عمل میں آیا۔"

علیا حضرت یونیورسٹی کانووکیشن میں پہلی بار ۱۹۲۲ء میں تشریف لائیں۔ اس موقع پر ممدوحہ کی تقریر کا اقتباس پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ شاعر ہو یا نثر نگار قائل کی بڑائی کا معیار یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا قول ہر زمانے میں معنی خیز اور سود مند ہو۔ چنانچہ علیا حضرت نے ارشاد فرمایا:۔

"صاحبو! یاد رکھو کہ آپ کی کامیابی کامل شوق و محنت، حسنِ اخلاق اور کفایت شعارانہ زندگی پر منحصر ہے ان باتوں کے ساتھ ہر طالبِ علم کو ایک خاص بات اور بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ وہ استادوں کا ادب ہے اور ان کے ساتھ محبت۔ تحصیلِ علوم کے سلسلے میں ہماری معاشرتی اور اسلامی روایات میں یہ ادب اور محبت بہت ضروری اور اہم ہے۔ جب آپ اسلامی تاریخ پڑھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ امرا و سلاطین و خلفا تک نے اپنے زمانہ طالب علمی میں استادوں کا کیسا ادب ملحوظ رکھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا یہ قول لوحِ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے کہ جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا اس نے مجھے اپنا بندہ بنا لیا۔"

پھر یونیورسٹی کے سرمایہ کے متعلق قوم کو توجہ دلائی اور یونیورسٹی کی اقتصادی حالت درست رکھنے اور

خراجات بانداز ۂ آمدنی کی نصیحت فرما کر مذہبی تعلیم
لے لیے ارشاد فرمایا :۔

اس امر کی تمام عالم اسلامی کو مسرت ہوگی
کہ ہماری یونیورسٹی میں ہر امتحان کے ساتھ
مذہبی تعلیم لازمی ہے لیکن یہ ضروری امر
ہے کہ اس تعلیم کا معیار ایسا اعلیٰ اور مکمل
ہونا چاہیے کہ واقعی طور پر یہاں کا گریجویٹ
مذہبی تعلیم میں اتنی ہی دستگاہ رکھتا ہو جتنی
اور علوم میں اس کو حاصل ہوتی ہے اور
اس کے ساتھ ہی وہ عملی طور پر بھی اپنے
مذہب کا سچا نمائندہ ہو !

اس کے بعد نتائج اور معیار تعلیم
بث فرما کر ارشاد کیا ،

لے عزیزان قوم ! آپ کی جماعت وہ
جماعت ہے جس کا نام اس یونیورسٹی
کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی تقویم
میں سب سے پہلے آپ ہی کے نام نظر
آئیں گے ۔ ہم سب کو آپ سے یہ قوی
امید ہے کہ آپ اپنی یونیورسٹی کی
ڈگریوں کے وقار کو ہر طریقے سے قائم
رکھیں گے اور جن مقاصد کی تکمیل کے لیے
یہ یونیورسٹی قائم کی گئی ہے ان کا عملی
نمونہ بنیں گے ۔ آپ پر اپنے مذہب کے
لینگ کے، اپنی قوم و وطن کے اپنے والد
کے اور اپنی حکومت کے جو فرائض ہیں

کہ ان کو کس طریقہ سے ادا کرتے ہیں
آپ کو ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ علم
اور اخلاق دو بڑی قوتیں ہیں جو
خالق ذوالجلال نے انسان کو عطا
کی ہیں اور دین و دنیا کی کامیابی
ان دونوں قوتوں میں مضمر رکھی ہے
لیکن ان دونوں قوتوں میں اخلاق
کی قوت بہت زبردست ہے ۔
اور جو علم مصلح اخلاق نہیں وہ
حقیقت میں اس نام کے شایاں
نہیں ۔ ایک مسلمان کے لیے تو
مکارم اخلاق جوہر انسانیت
اور اسلام ہیں ۔ ہمارے نبی
کریم نے اپنی بعثت کا منشا ہی
مکارم اخلاق کی تکمیل قرار دیا ہے
اور کلام مجید میں آپ کی تعریف
یہ ہے :

اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیم

اخلاق کے ساتھ آپ کی زندگی
کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ ہم
دنیا کو اس سے بہتر حالت میں
چھوڑ کر جائیں جس میں کہ ہم نے اس کو
پایا تھا ۔

صدی تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

(اقتباسات ماخوذ از حیات سلطانی
مصنفہ [illegible])

اقتباسات

کانووکیشن ایڈریس

مولانا آزاد نے ۲۰ فروری ۱۹۴۹ء کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھا۔

.... موجودہ زمانے میں جب کہ مغربی علوم کی تعلیم ہندوستانی زندگی کی ایک عام حقیقت بن گئی ہے، اور ہم تعلیم کے لفظ کا اطلاق صرف اس تعلیم پر کرنے لگے ہیں، بہت کم لوگ اس جدوجہد کی دشواریوں کا صحیح اندازہ کر سکیں گے، جو آج سے ۱۰۰ برس پہلے نئی تعلیم کے حامیوں کو پیش آئی تھیں۔ انھیں صرف ایک نیا راستہ ہی نہیں دکھانا تھا۔ اس راستہ میں قدم قدم پر لڑنا تھا۔ ان کی راہ قدامت پرستی کی بیشمار قوتوں سے رکی ہوئی تھی جو ہمیشہ نئی تبدیلیوں کی راہ روکنا چاہتی ہیں

.... دراصل یہ جنگ فکر انسانی کی تاریخ کا ایک عالمگیر خاصہ تھی۔ یورپ میں یہ کشاکش سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ہوئی۔ اور مشرقی ممالک کا اس سے سامنا انیسویں صدی میں ہوا۔ ہندوؤں میں یہ جنگ جلد شروع ہوئی۔ اور جلد ختم ہو گئی مگر مسلمانوں میں اس نے بہت زیادہ وقت لیا بالآخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوا ہے۔ وقت کے تقاضے ح مند ہوئے اور قدامت پرستی کو اپنی ہار ماننی پڑی۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ف و ڈر کہا جا سکتا ہے کہ اس فیصلہ کن گ کا مرد میدان وہی شخص تھا جو اس یونیورسٹی ہ جنگ اسی علی گڑھ میں لڑی گئی، اور یہی علی گڑھ اس کی فتح مندی کا یادگاری منارہ ہے۔

زمانۂ حال کے بعض اہل قلم نے سرسید مرحوم کو راجہ رام موہن رائے سے تشبیہ دی ہے۔ اور یہ بہت حد تک صحیح ہے۔ راجہ رام موہن رائے نے جو کام بنگال میں کیا، وہی ان سے چالیس برس بعد سرسید نے شمالی ہند میں کیا، اور خاص طور پر مسلمانوں میں کیا

.... یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ سرسید مرحوم نے ملک کی سیاسی تحریک کی مخالفت کی تھی۔ لیکن ان کی مخالفت میں ہندو مسلم سوال کا کوئی رنگ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی مخالفت کی سرگرمیوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو یکساں طور پر شریک کیا تھا۔ وہ مدت العمر ہندو مسلم یگانگت کے حامی رہے اور ہمیشہ ایسی باتوں کی مخالفت کرتے رہے جن سے دونوں جماعتوں کے باہمی نفاق و یک جہتی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا تھا انھوں نے اپنی تقریروں میں بار بار یہ خوبصورت استعارہ دہرایا تھا کہ مادر ہند کی دو آنکھیں ہیں۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ اگر دونوں میں سے کوئی ایک آنکھ بھی بگڑ جائے گی تو اس کے چہرے کا سارا حسن بگڑ جائے گا۔

.... مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کے لیے ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کر دیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی شخصیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستان کے کسی موقت الشیوع رسالے نے شاید ہی ایسے گہرے اثرات وقت کی دماغی رفتار پر ڈالے ہوں گے جیسے کہ "تہذیب الاخلاق" سے مرتب ہوئے۔ یہ رسالہ انھوں نے انگلستان کی سیاحت کے بعد نکالا تھا اور اس میں ان کے حلقے کے رفیقوں کے مضامین نکلا کرتے تھے۔ فی الحقیقت جدید اردو علم و ادب کی بنیادیں اسی رسالہ نے استوار کیں اور اسے اس قابل بنا دیا کہ آج ہر طرح کے علمی و ادبی مطالب ادا کرنے کی اس میں صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس عہد کا شاید ہی کوئی قابلِ ذکر اہلِ قلم ایسا ہوگا جو اس مرکزی حلقے کے اثرات سے متاثر نہ ہوا ہو۔ جدید ہندوستان کے بہترین مسلمان مصنف اسی حلقہ کے زیرِ اثر پیدا ہوئے اور یہیں سے نئے قسم کی اسلامی تحقیق و تصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں۔

.... انیسویں صدی کا آخری نصف حصہ اکثر مشرقی ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ایک طرح کا انتقالی دور تھا۔ اس دور میں ملک کی دماغی زندگی کے پرانے سانچے ٹوٹ رہے تھے اور نئے سانچے ڈھلنا شروع ہو گئے تھے۔ پرانے ہندوستان میں ایک نئے ہندوستان کا ڈھانچہ [illegible] ابھر رہا

نئی اور پرانے موسم کا اختتام ایک نئے موسم کی آمد کا اعلان تھا۔ جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے کہا جاتا ہے کہ اس انتقالی دور کا سب سے زیادہ موثر عمل یہیں انجام پایا۔

.... آپ کے اسٹریچی ہال کی دیواروں پر جو کتبے کندہ ہیں، ممکن ہے کہ وہ کسی وقت مٹ جائیں، لیکن آپ کی درس گاہ نے زمانے کے لازوال صفحوں پر جو کتبے ثبت کر دیے ہیں وہ کبھی مٹ نہیں سکتے وہ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ اور ہندوستان کے آنے والے مورخ ان سے اپنی کہانیوں کے لیے مواد حاصل کریں گے۔

ایک ایسا تعلیمی ادارہ جو اپنی ماضی کی ایک ایسی شاندار داستان رکھتا ہو، قدرتی طور پر اس کا مستحق ہے کہ ایک شاندار مستقبل اپنے سامنے دیکھے۔ مجھے معلوم نہیں اس وقت آپ کے احساسات کیا ہیں۔ آپ اپنے مستقبل کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو وہ کس رنگ و روپ میں آپ کے سامنے آتا ہے؟ آپ کو دروازوں کے بند ہونے کی آواز سنائی دے رہی ہے یا کھلنے کی؟ میں نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی نگاہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ لیکن میں آپ کو بتلا سکتا ہوں کہ میری نگاہیں کیا دیکھنے لگی ہیں۔ آپ شاید دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے پرانے دروازے بند ہو گئے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بہت سے نئے دروازے کھل گئے۔

تفاوت ست میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

فرخ جلالی
شعبہ تاریخ

عہدِ سرسید کا ایک چیلنج

انجمن الفرض

سرسیّد نے تعلیم کے کام کو قومی خدمت بنادیا۔ اِس باغ میں دیر سے پھل آتے ہیں۔ تعلیم کے کام زر اور زمانہ کا طرح ہے۔ سرسیّد نے جب کالج کھولا تو خوشحال خاندان اپنے بچے کالج بھیجنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وسط یوپی (U.P) یعنی اودھ کے علاقہ سے طالب علم ملنا مشکل ترین کام تھا۔ غریب طلبا اگر آتے تو اُن کی تعلیم کا خرچ کون اُٹھاتا سرسید اوران کے دوستوں نے غریب طالب علموں کی بڑی مدد کی۔ مگر اس مدد کے جذبہ کو عام کرنے کی ضرورت تھی۔ کالج کے قیام کے پندرہ برس کے بعد ٹی ڈبلیو آرنلڈ کی سرکردگی میں نومبر ۱۸۹۰ء میں انجمن الفرض نے کام کرنا شروع کردیا۔ آرنلڈ نے جس طرح اپنے آپ کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے مفادات اور مقاصد سے ہم آہنگ کرلیا تھا۔ وہ سرسیّد کی سحر آفریں شخصیت اور آرنلڈ کی موہ لینے والی شخصیت کے بہترین مظاہر ہیں۔ شبلی اور اقبال کو آرنلڈ کی ادبی محفلوں میں ادبی دنیا دیکھ چکی ہے

انجمن الفرض چار کمیٹیوں میں منقسم تھی۔

۱۔ اسکالرشپ کمیٹی جو غریب طلبا کی امداد کے واسطے روپیہ جمع کرتی تھی۔

۲۔ "فری بورڈنگ ہاؤس کمیٹی جو کہ بے مقدور اسکول کے طالب علموں کے رہنے کے لیے فری بورڈنگ ہاؤس بنانے کو روپیہ جمع کرتی" تھی۔

۳۔ "تجارتی کمیٹی جس نے کہ کالج کے احاطہ میں ایک مستقل دکان قائم کی ہے اور جو مختلف موقعوں پر مندرجہ بالا مقاصد انجام دینے کے واسطے چار وغیرہ کی دکانیں کھولتی" تھی۔

۴۔ کمیٹی مسجد۔ جو کہ کالج کی مسجد کے واسطے روپیہ جمع کرتی تھی۔

(نوٹ۔ یونیورسٹی کی موجودہ مسجد نواب محمد اسحاق خاں کے عہد میں ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔ یہ مسجد چالیس برس میں تیار ہوئی)۔

یہ مقاصد کتنے جلیل تھے۔ ان مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا کتنا مشکل تھا، اس کا اندازہ اِس بات سے کیجیے کہ جب ملک چین سے ہانگ کانگ رجمنٹ نے ۱۴ روپیہ بھیجے تھے تو رپورٹ میں اس کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔

انجمن الفرض کے سالانہ جلسے میں مولوی بہادر علی ایم اے نے جو تقریر کی تھی اس کے مندرجہ ذیل الفاظ بہت اہم ہیں۔

"صاحبو! اس سے زیادہ پست خیال کیا ہو سکتا ہے کہ ہمارے ہندو اہل حکومت کریں۔ [illegible] خاص

رعایتیں کیجاویں جس سے ہم میدانِ مقابلہ میں گو
خود برابری نہ کرسکیں، برابر کر دیے جاویں۔ کیا وجہ
ہے کہ ہم خود اپنی مصیبت کو دور کرنے کا خیال نہ کریں
یا اپنے جسموں کا بوجھ اپنے پیروں پر سہارنے اور
عارضی سہاروں پر بھروسہ کرنے کی قوت پیدا نہ کریں"

۸ راگست ۱۸۹۳ء کو انجمن الفرض کا
دوسرا سالانہ جلسہ تھا۔ اس میں اساتذہ اور طلبار
کے علاوہ حالی بھی تھے۔ انھوں نے دو باتوں پر خاص
طور سے توجہ دلائی۔ حالی سے زیادہ موثر طریقہ بیان
کس کو نصیب ہو سکتا ہے۔ حالی نے کہا۔

"اول سکا (سرسید احمد خاں کا) سب سے عظیم
الشان کام جو اسلام کی تاریخ میں نہایت عجیب اور
حیرت انگیز ہے وہ یہی ہے کہ ایک قومی کام کے لیے
انہوں نے مسلمانوں کی خالی جیبوں میں سے بیس لاکھ
روپیہ نکلوایا ہے۔ انجمن الفرض نے بھی ان کے
عظیم الشان کام کی پیروی اختیار کی ہے۔ پس اسکے
ممبروں کو سوچنا چاہیے کہ انھوں نے کس شخص کی
پیروی اختیار کی ہے اور کیسے مشکل کام کا بیڑا اٹھایا
ہے لیکن ان کو ہرگز مایوس نہ ہونا چاہیے اور سرسید
کی ابتدائی کوششوں پر غور کرنا چاہیے"

اس سے آگے بڑھ کر حالی نے ایک قسم
کا چیلنج دیا کہ

"اے ممبران انجمن الفرض اگر بالفرض
محمڈن کالج مسلمانوں میں بڑے بڑے فاضل اور اسپیکر
اور مصنف پیدا کر دے اور اس کے طالب علم بڑے
بڑے بیرسٹر اور پلیڈر اور جج جمع ہو جائیں لیکن اون
سہاریسے اولوالعزم قوم کے خدمت گزار پیدا نہ ہوں
جو قوم کی بھلائی میں دل وجان سے کوشش کریں تو
سمجھنا چاہیے کہ محمڈن کالج سے کوئی نمایاں کام نہ
کر دیا اور اس کی تعلیم سے براہ راست کسی کو کچھ
فائدہ نہ پہونچا"

کیا آج کے طالب علم اس چیلنج کو قبول کرنے
کو تیار ہیں۔ بھائیو! نعرے آسان اور کام
مشکل ہے۔ اہل کار ہر دور میں مشکل اور مایوسی
کا مقابلہ کرتے رہے ہیں۔

جلالی صاحب کا مضمون دیکھ کر شاید یہ خیال ہو
کہ انجمن الفرض یعنی ڈیوٹی سوسائٹی کا زمانے کے ہاتھوں وہ
حشر ہوا جو سرسید کے دور کے قائم کردہ دوسرے اداروں
کا ہوا ہے۔ لیکن الحمدللہ ایسا نہیں ہے۔ انجمن الفرض اب
بھی قائم ہے اور گو عمل میں سرگرم نہیں لیکن بے عمل بھی نہیں
ہے۔ اس انجمن کا بنیادی کام یہی تھا کہ وہ اُن طلبار کو مالی
امداد دے جن کو تعلیم جاری رکھنے کے لیے مالی مدد کی ضرورت
ہے۔ طلبا کی یہ خدمت یہ انجمن اب بھی کرتی ہے اب بھی
ضرورت مند طلبا کو ہزاروں نہیں تو چند سو روپے امداد
کے طور پر قرض حسنہ دیے جاتے ہیں۔

انجمن کی آمدنی کا ذریعہ ایک ہوسٹل ہے لیکن
یہ آمدنی بہت قلیل ہے۔ بعض اہل خیر بلا طلب کچھ رقم بھیج
دیتے ہیں۔ بعض سابق طلبا جنھوں نے قرض حسنہ لیا تھا
وہ قرض کی ادائیگی کے ساتھ کچھ اور روپیہ بطور عطیہ انجمن
کو بھیج دیتے ہیں۔ انجمن کی آمدنی بڑھانے کی خواہش سب
وابستگانِ انجمن کی ہے۔ لیکن سرگرمی پیدا ہونا بھی
آسان نہیں۔ پھر ماضی کے تجربات خاصے تلخ ہیں۔ اور
چندہ جمع کرنے میں ایک مانع یہ بھی ہے۔

تبصرہ

چودھری رحم علی الہاشمی

آئینۂ حرم

مصنف: جناب محی الدین قادری الرزاقی

ناشر: رزاقیہ کتاب گھر بانسہ شریف۔ ضلع بارہ بنکی۔ یو۔پی۔

صفحات ۲۲۰

قیمت ۲۵- روپے۔

یہ کتاب حضرت محی الدین قادری الرزاقی کی مجتہدانہ کاوشوں اور کاتبوں کا نتیجہ ہے اور اس کے تمام صفحات اور متعدد نقشہ جات میں جمع کردہ ضروری اور مفید معلومات نہ صرف عازمین حج کے لیے بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی کارآمد ہیں۔ کتاب چار حصوں

بقیہ مضمون انجمن الفرض صفحہ نمبر سے

بہرحال جو رقم دفتر میں آتی ہے وہ یقیناً محفوظ رہتی ہے اور پوری احتیاط سے صرف ہوتی ہے۔ رقم کسی بینک میں جمع
ہے۔ انجمن الفرض کے ارکان خادم (SERVANTS) کہلاتا ہے جو حضرات انجمن کے لیے ایک مقررہ رقم جمع کراتے ہیں
ام شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ خادم ایک مجلس منتظمہ منتخب کرتے ہیں۔ انجمن کا ایک صدر ہوتا ہے ایک محافظ (Keeper) اور نائب
محافظ (Assistant Keeper)۔ حاجی عبیدالرحمن خاں شروانی انجمن کے صدر ہیں اور ہاشم قدوائی صاحب keeper ہیں
الفرض کو عام طور پر ڈیوٹی سوسائٹی کہا جاتا ہے۔ اس کا دفتر سابق انگلش ہاؤس یعنی تار والے بنگلہ کے علاقے میں ہے۔
سید حامد صاحب موجودہ وائس چانسلر بڑی امیدیں لے کر علی گڑھ آئے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ درسگاہ ایک مثالی
رسٹی ہو جائے اور معیار تعلیم یونیورسٹی اور اس کی دوسری درسگاہوں کا بڑھے۔ بہرحال کوشش جاری رہنے کو کام
ئے سٹیر کا لانا ہے۔ اس ملک کا جو حال ہے وہی اس یونیورسٹی کا بھی ہے۔ اس یونیورسٹی کے طلبا دوسری
رسٹیوں کے طلباء کی نقل کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ وہ کس دنیا میں ہیں۔ سید صاحب نے یوم سرسید پر اعلان
سید احمد خاں مرحوم نے اپنے افکار کی اشاعت کے لیے ایک رسالہ نکالا تھا جس کا نام تہذیب الاخلاق تھا۔ اس
کا مقصد اجرا ہونا چاہیے۔ چنانچہ ۱۷ فروری ۸۲ء کو نائب صدر جسٹس ہدایت اللہ صاحب نے اس از سالہ کا
کیا۔ پھر یونیورسٹی میں سائنٹفک سوسائٹی کا احیا ہوا۔ توقع ہے کہ انجمن الفرض (ڈیوٹی سوسائٹی) میں بھی جان پڑے
دیکھیے اس کا وقت کب آتا ہے۔ سوسائٹی بہرحال قائم ہے اور زیادہ نہیں کم ہی سہی کچھ نہ کچھ تو کرتی ہے۔

ق۔م۔ا۔

پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں ولادت باسعادت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ابتدائی زندگی، بعد نبوت ۱۲۔ سالہ مکی زندگی اور ہجرت اور مدینۃ النبیؐ میں قیام، تعمیر و توسیع مسجد نبوی و دیگر عمارات اور مختلف مقامات کے فضائل و برکات، تاریخ مدینہ منورہ کے اہم مقامات و زیارات۔ حصہ دوم میں آداب حاضری مدینہ منورہ اور مختلف مواقع کی دعائیں حصہ سوم میں جنت البقیع میں مدفون حضرات محترم و معظمات کے مختصر حالات مع تاریخ وفات۔ مثلاً: حضرت عثمان غنیؓ حضرت ابوسعید خدری۔ حضرت سیدہ فاطمہ زہراؓ، حضرت فاطمہ بنت اسدؓ حضرت ابراہیم ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت امام مالکؒ، حضرت عباسؓ عم رسول اللہ وغیرہ۔ حصہ چہارم میں زیارات بیرون مدینہ منورہ اور مشہور مساجد و متبرک مقامات مثلاً ثقیفہ بنی ساعدہ، مسجد ال سمک، مسجد سلمان فارسی۔ کتب خانہ جات، دار الیتامیٰ، دار الصدقہ، شفاخانہ۔ مدینہ میں پیدا ہونے والے پھل پھول اور ترکاریاں وغیرہ۔ آخر میں ان تبرکات کی تصاویر اور ذکر ہے جو سلاطین نے جمع کرکے مطلا و مزین بیش قیمت صندوقوں اور صندوقچیوں میں محفوظ کیے ہیں۔ ان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی تلواریں، مہر نبوت، دندان مبارک حضور، جو جنگ احد میں شہید ہوا تھا۔ ہرن کے چمڑے پر خط کوفی میں لکھا ہوا قرآن، جسے حضرت عثمان غنیؓ شہادت کے وقت تلاوت فرما رہے تھے جس پر خون کے دھبے نمایاں ہیں روئے مبارک، موئے مبارک، قدم رسول، باب توبہ نبیؐ پاک کا روضہ اقدس۔ تمام تبرکات قیمتی جواہرات سے مرصع کر دیے گئے ہیں۔ اور بیش قیمت صندوقوں اور صندوقچیوں میں رکھے ہیں۔ یہ فوٹو آرٹ پیپر پر چھپے ہیں۔ اور کتاب کی عام طباعت و کتابت اعلیٰ ہے۔ چنانچہ ۲۵ روپیہ میں یہ بہت ارزاں ہے۔

تہذیب الاخلاق کے بعض مخلصین تبصرہ کے لیے اپنی تصانیف ارسال فرماتے ہیں۔ کتاب وصول کرنے کے بعد ہمارا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ کتاب پر تبصرہ کریں اور دیانت داری سے کتاب کا مطالعہ کرکے اظہار خیال کریں۔ ہمارے اس خیال سے مصنفین خود متفق ہوں گے لیکن یہ خدمت بہت دشوار ہے۔ دیانت داری خود ایک درد سری ہے۔ اگر دیانت داری برتی جائے تو اس دنیا میں زندگی حرام ہو جاتی ہے۔ اور اگر نہ برتی جائے اور مصنف کی خوشنودی کا خیال رکھا جائے تو نہ معلوم آخرت میں کیا حشر ہو گویا ؎ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ اس کوہ گراں دشواری کے علاوہ ایک دشواری یہ ہوتی ہے کہ تبصرہ نگار کے پاس بہت سی کتابیں برائے تبصرہ ہوتی ہیں اور تبصرے لکھنے کے علاوہ بھی ان کو کچھ کام ہوتا ہے۔ وہ تبصرہ کرنے میں بہت وقت لیتا ہے۔ تبصرہ میں تاخیر ہوتی ہے تو مصنف کو شکایت ہوتی ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ رسالے والے کتاب کھا گئے بڑے بد دیانت ہیں۔ ایک دشواری یہ بھی ہے کہ مصنف ہمیشہ کتاب کا ایک نسخہ بھیجتا ہے۔ کتاب بھیجتے وقت اس کی نظر کتاب کی قیمت ہی پر ہوتی ہے۔ وہ یہ خیال نہیں کرتا کتاب پر تبصرہ کرانے اور پھر اس کی اشاعت پر کیا خرچ ہوجاتا ہے تبصرہ نگار کو کتنی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ یہی اسباب ہیں جن کی بنا پر رسالہ تہذیب الاخلاق میں تبصرے شائع کرنے کا سلسلہ ابھی تک شروع نہیں کیا گیا۔ بہرحال اس وقت چند کتابیں تبصرے کے لیے ہمارے پاس ہیں جن پر بوقت فرصت تبصرہ کر دیا جائیگا۔ مخلصین اور قارئین تہذیب الاخلاق سے گزارش ہے تبصرہ کے لیے اپنی تصانیف نہ ارسال فرمائیں۔ ہم تبصرہ کرنے سے معذور ہیں

ہمارے اوپر حکومت کر دی ہے، انھیں یونیورسٹیوں اور مدرسوں سے اس کو علوم و فنون کی ادنیٰ پہنچی۔ آج اتفاق سے ہم اور وہ قوم جس نے ایک زمانہ میں ہم سے علم حاصل کیا اور ہم سے بہت اعلیٰ درجے پر پہنچ گئی ہے۔ اتفاق سے ملک ہندوستان میں جمع ہو گئے ہیں۔

پس ہمارا ان سے یہ دعویٰ ہے کہ جو قرض ان لوگوں نے ہم سے لیا تھا، وہ اب ہم ان سے وصول کریں اور میں نہایت سچے دل سے شکر کرتا ہوں کہ وہ قوم اس قرض کو مع سود دینے کے لیے بڑی فیاضی سے حاضر ہے یعنی جو بہت سے علوم و فنون خود اپنی محنت اور تلاش سے مستزاد کیے ہیں وہ ہم کو سود میں دینے کے لیے حاضر ہے۔ مگر ہم اپنے تعصب اور جہالت اور نالائقی کی وجہ سے ان سے محروم ہیں۔

پس میری خواہش یہ ہے کہ ہماری قوم اپنے خستہ حال کو دیکھے اور جو عمدہ موقع اس کو اتفاق سے ہاتھ آیا ہے اس سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی نہ کرے اور سب ایک دل ہو کر اس میں کوشش کریں اور آپس کی ضد اور بغض اور حسد سے برباد نہ کریں۔

(اقتباس از "مسافران لندن" مرتبہ سر سید احمد خاں۔ (ص ۱۹۲-۱۹۱))

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ھجری سنہ ۱۳۰۳ نبوی [نمبر ۲

جلد نمبر ۱ ۱۶ جولائی ۱۹۸۲ء شمارہ نمبر ۱۲

"یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہ
ہے۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر
تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ
رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ بس
امید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام)
کے نمونے ہوگے اور جبھی ہماری قوم کو عزت ہوگی۔"

سید احمد

(مدرسۃ العلوم کے طالب علموں سے)

خطباتِ احمدیہ کی تالیف کے متعلق بعض حالات

میں روز و شب تحریر کتاب سیرِ مصطفوی صلعم میں معروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے۔ ادھر فکر ترتیب مضامین کتاب، ادھر فکر جواب اعتراضات۔ ادھر فکر تنقیح و تصحیح روایات صحیح میں مبتلا رہتا ہوں اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے۔ ادھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے کہ الٰہی لکھنا اور چھپوانا تو شروع کر دیا، روپیہ کہاں سے آوے گا۔ مسلمان البتہ آستینیں چڑھا کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچائیں گے

دوسرا باب جس میں عرب کا جغرافیہ اور وہاں کی قوموں کا اور حضرت اسمٰعیلؑ کے وہاں آکر آباد ہونے کا ذکر ہے، چھپ رہا ہے۔ عرب میں ایک کتبہ نکلا ہے جو یہاں کے برٹش میوزیم میں موجود ہے وہ کتبہ آنحضرت صلعم سے بہت پہلے کا ہے اور اس سے حضرت ہودؑ کا عرب میں پیغمبر ہونا اور قوم عاد کے مکانات کا وجود بخوبی ثابت ہوتا ہے! چنانچہ وہ کتبہ بعینہٖ اسی خط میں مع ترجمہ میری کتاب میں مندرج ہوگا۔ —— میری دانست میں نہایت خیر خواہی اسلام کی اور سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی تھی کہ یہ کتاب انگریزی زبان میں چھاپی جائے۔ اس لیے انگریزی چھاپنا شروع کر دیا اور اردو ابھی ملتوی ہے۔ علاوہ اس کے انگریزی عبارت لکھنے والے عمدہ اور کم قیمت یہ یعنی بہ نسبت ہندوستان کے کم قیمت پر ملے ہیں، ہندوستان میں ممکن نہ تھا۔ جو شخص کہ میری کتاب انگریزی میں لکھتا ہے اس کی لیاقت کا کوئی انگریز ہندوستان میں نہیں ہے۔ پس ایسا شخص ہندوستان میں کہاں ملتا؟ اگر میری یہ کتاب تیار ہو گئی جس میں دس باب ہیں تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا۔ خدا قبول کرے۔ آمین!

سید احمد

خط بنام محسن الملک از لندن

انتخاب از مسافران لندن مرتبہ سید احمد خاں

(ناشر: مجلس ترقی ادب۔ لاہور)

تہذیبُ الاخلاق

نئی

پندرہ روزہ

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱۲

۱۶ رجولائی ۱۹۸۲ء

مدیر: سیّد حامد

وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

نکتہ چیں ہے غم دل....	سید حامد صاحب
کمپیوٹر	حمید احمد الہاشمی
مسلم خواتین اور معاشرہ	انجمن آرا انجم
جاپان کے کچھ تاثرات	محمد یونس قاضی
اردو اور سفارشات	عتیق احمد صدیقی
بچوں کے سامنے دوسروں کی برائی	
حسرت کی زندگی کے کچھ دلچسپ واقعات	
	ریحانہ سہیل

قیمت فی پرچہ	ایک روپیہ
ششماہی	۱۱ روپے
سالانہ	۲۰ روپے

بیرون ہند سے

ایک پرچہ	ایک ڈالر
سالانہ	۱۵ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا

مدیر مسئول۔ رسالہ تہذیب الاخلاق

صفدر منزل۔ تار بنگلہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ (۲۰۲۰۰۱)

ہمارے معاونین

اردو زبان انگریزی دور میں پلی بڑھی۔ اس دور میں عدالتی زبان اور درسی زبان ملک کے بڑے حصہ میں اردو ہی تھی لیکن یہ ملک آزاد نہ تھا۔ ملک کے باشندوں کا دائرہ فکر و عمل محدود تھا۔ قوائے عمل مضمحل تھے۔ لکھنے والے کیا لکھتے کس موضوع پر لکھتے۔ کچھ کہنے اور کرنے کی جگہ لوگ شعر کہہ کر اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار کرتے تھے اور افسانے اور ناول بھی دلچسپی کے لیے لکھتے تھے کسی مقصد کے لیے نہیں۔ بدقسمتی سے ہماری معاشرتی زندگی میں غلامی کی رسوم و قیود چلی آرہی ہیں معاشرہ کا کوئی مقصد متعین نہیں۔ بس ؎ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ

جب تہذیب الاخلاق جاری ہوا تو خیال ہوا کہ رسالہ کے موضوعات پر کون لکھے گا۔ سیّد حامد صاحب (وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے جو سیّد احمد خاں مرحوم کے مقاصد کی تکمیل کے خواہاں ہیں تقریباً سو دانشوروں کو خطوط لکھے اور تہذیب الاخلاق کیلیے مضامین لکھنے کی دعوت دی۔ جن حضرات کو رسالہ کے مقاصد سے ہمدردی تھی انھوں نے مضامین لکھے اور اشاعت کے لیے ہمیں بھیجے۔ گزشتہ چھ ماہ میں انہی دانشوروں کے مضامین شائع ہوئے ہیں رسالہ نے اردو مضمون نگاری کے نئے دور کا آغاز کیا ہے اور بڑی دلچسپی سے پڑھا جا رہا ہے خریدار برابر بڑھ رہے ہیں تعریفی خطوط آ رہے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ رسالہ کے مقاصد کا دائرہ محدود ہے۔ رسالے میں نہ ادبی مضامین شائع ہوتے ہیں نہ نظمیں اور غزلیں۔ ہماری خواہش یہی ہے کہ رسالہ کم قیمت ہو۔ ہر آدمی آسانی سے خرید لے اور استفادہ کرے۔ اسی لیے رسالہ بہتر پر چھاپتے ہیں آفسٹ پر نہیں اور لاگت سے کم پر فروخت کر دیتے ہیں مقصد مسلمانوں کو بیدار کرنا ہے مالی فائدہ نہیں۔ رسالہ خدمت کے لیے شائع کرتے ہیں دولت کمانے کیلیے نہیں ہماری کوشش ہے کہ رسالہ بہتر سے بہتر ہو جائے بس ہمارا کام کوشش کرنا ہے کامیابی اللہ کے ہاتھ ہے۔

ہم ان مضمون نگاروں کے مرہون منت ہیں جنھوں نے قلمی تعاون کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور وہ ہمارا ہاتھ بٹاتے رہیں گے۔

(ق۔م۔ا)

نکتہ چیں ہے غمِ دل.....

غالب کو محبوب سے سدا شکایت رہی: غم کا مداوا نہ کرتا تو صبر کر لیتے، ظلم کی تلافی نہ کرتا تو بھی برداشت کر لیتے، بے اعتنائی برتتا تو وہ بھی کسی صورت گوارا ہو جاتی، لیکن ستم تو یہ ہے کہ وہ اُن کا حالِ زار سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔ جہاں انھوں نے غمِ دل سنانا شروع کیا، اس نے بال کی کھال نکالی۔ الفاظ پر اعتراض، مفہوم پر استہزا، خود ان کی ہیئتِ کذائی پہ ابتسام۔ بات آگے کیوں کر بڑھتی۔ گئے تھے دردِ دل بیان کرنے، محبوب کی نکتہ چینیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ ایک قدم آگے نہ بڑھا سکے، بات بننے اور مراد پانے کا ذکر کیا۔ خدا نے سخن کو بات [illegible] نہ دیا گیا۔

یہ تو ذکر تھا "اس بیری دشمن کا اور [illegible] محبوب کی نکتہ چینی میں شوخی اور ستمگری، حاضر جوابی اور بذلہ سنجی چھیڑ چھاڑ [illegible] تفننِ طبع شامل [illegible] لیکن نکتہ چینی کا ذکر ہم کرنے [illegible] ہیں [illegible] شوخی اور شگفتگی ظرافت اور زندہ دلی [illegible] نہیں، اس کا مدعا دل [illegible] اور جان بچانا نہیں، اس [illegible] عیب تلاش کرنا اور جراحت [illegible] پہنچانا ہے۔ اس [illegible] ہے برائی ڈھونڈنے کا جذبہ

فارسی کی ایک مثل ہے۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز۔ انگریزی زبان میں بھی ایک مثل بالکل اسی مضمون کی ہے۔ اس مثل کو ذرا پھیلایے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ دوسروں میں برائی وہی شخص ڈھونڈے گا جس کی طبیعت میں بدی ہے۔ جس انسان کی طبیعت میں بھلائی اور اچھائی ہوتی ہے، اس کی نگاہ دوسروں کی اچھائیوں پر پڑتی ہے۔ انگریزی ناقد اور شاعر کولرج نے اپنے رفیق ورڈز ورتھ سے کہا تھا کہ ہم وہی پاتے ہیں جو کچھ ہم نے دیا ہے۔ یعنی ہر شخص اپنے دل میں جھانکتا ہے اور دنیا اسے ویسی ہی نظر آتی ہے۔ برائی ڈھونڈنے والے کو ہر طرف برائی ملتی ہے اور بیرونِ در کی برائی سے درونِ خانہ کی برائی کو کمک اور غذا ملتی ہے۔ داخلی برائیوں اور خارجی برائیوں میں لین دین کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اکثر عمر بھر بعض منقاریں گلی سڑی چیزوں کو کریدتی رہتی ہیں۔ وہی فضا اُن کو راس آتی ہے۔ صاف ستھری اشیا اور تازہ ہوا میں ان کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ سور صاف شفاف ہری بھری گھاس کو حقارت سے چھوڑتا ہوا غلاظت کی جانب دوڑتا ہے کہ یہی اس کی فطرت کا ناصیہ، یہی اس کی ترجیحات کا تقاضا ہے۔ وہ

غریب مجبور ہے۔ لیکن کیا عیب جو انسان بھی اسی طرح مجبور ہے۔ کیا شعور اس کی رہنمائی نہیں کرسکتا۔ کیا ضمیر اسے برائیاں ڈھونڈنے اور غلاظت کریدنے سے نہیں روک سکتا۔

انسان کا دل آئینہ کی طرح ہے اس میں جس طرح کا عکس پڑے گا وہی شکل اس کی ہو جائے گی۔ لوگوں میں اچھائیاں دیکھیے خوبیاں ڈھونڈیے تو ان اچھائیوں کی صحبت میں آپ کا دل بھی اچھائیوں کی طرف مائل ہوجائے گا۔ برائیاں ڈھونڈیے گا تو برائی دل پر چھا جائے گی، رگ و پے میں سرایت کر جائے گی۔ لیکن اس کو کیا کیجیے کہ عیب جوئی صرف انفرادی نہیں اجتماعی بیماری ہے۔ ایک تو یہ متعدی ہے، دوسرے انجمن میں فروغ پاتی ہے۔ جہاں دو آدمی جمع ہوئے کسی تیسرے پر نکتہ چینی شروع ہوئی۔ مصرع پر مصرع اور گرہ پر گرہ لگتی چلی گئی۔ یہ سب فرصت اور بے ضمیری کے مشغلے ہیں۔ فرصت اور بے کاری ہی اس بری عادت کی طرف لے جاتی ہے جسے لوہ کہتے ہیں۔ لوہ کا پہلا تختۂ مشق پڑوسی ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ دائرہ پھیلتا چلا جاتا ہے۔ کون ہے جو اس کی زد میں نہیں آتا۔ شاعر چلاتا ہی رہ گیا۔

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

لیکن عیب جوئیوں کی جس انجمن میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی ہو وہاں شاعر کی آواز کون سننے لگا۔

ترتیب کا فرق ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ شروع میں تفنن طبع کے طور پر نکتہ چینی شروع کرتے ہیں، زبان کا چٹخارہ جلد ہی انھیں عیب جوئی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ اور پھر جس دن انھیں کسی میں برائیاں نظر نہ آئیں انھیں چین نہیں پڑتا۔ ان کی طبیعت کو برائیوں کی طلب اسی طرح ہونے لگتی ہے جیسے عادیوں کو تنباکو، شراب یا دوسرے نشوں کی طلب۔ یہ ایک مریضانہ حالت ہے۔ جیسے جیسے اس کو غذا ملتی ہے مرض زور پکڑتا جاتا ہے

نکتہ چینی اور عیب جوئی کو بڑھاوا دو چیزوں سے ملتا ہے۔ جن میں ایک داخلی ہے، ایک خارجی۔ یعنی طبیعت کی کجی یا تنگ دلی یا بخل اور فرصت یا بے کاری۔ بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں جو دوسروں کی اچھائی یا ان کی نیک نامی کو گوارا نہیں کر پاتیں۔ وہ دوسروں کی اچھائیاں اور کامیابیاں دیکھ کر جلتی ہیں اور دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے ان میں کوئی پہلو برائی کا نکال لیتی ہیں۔ دوسروں کی مصیبت یا برائی پر خوش ہونا سنگین اخلاقی مرض ہے۔ اس نوع کی خوشی اکثر نکتہ چینی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اگر تنگ دلی کا ساتھ وقت کی وسعت دے دے تو گویا سونے پہ سہاگہ ہو گیا۔ وہ لوگ جو گاڑھے پسینہ کی کمائی کھاتے ہیں جو شام کو تھک ہار کر گھر آتے ہیں انھیں کہاں اس کی فرصت، کہاں اس کا ولولہ کہ دوسروں کے مزاج اور چال چلن میں عیب

ڈھونڈنے نکلیں۔ وہ لوگ جن کی نظر وسیع ہے اور جو بنی نوع انسان کے مسائل سے ناآشنا نہیں، انھیں فرصت اگر ملتی ہے تو عالمی یا ملکی یا ملّی یا مقامی مسائل کی نذر یا تخلیقی اور تہذیبی اور خدمتی اور فلاحی کاموں میں صرف ہو جاتی ہے۔ نکتہ چینی اور عیب جوئی کے ہنر کو برتنے والے تو وہ لوگ ہیں جو یا تو کسب معاش یا حلال کی کمائی سے بے نیاز ہیں۔ آخر الذکر گروہ ان لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اس کی تعداد روز افزوں ہے۔ جو دفاتر یا اعلیٰ تعلیمی اداروں میں کام کرتے ہیں لیکن صرف اتنا کہ ملازمت محفوظ رہے۔ روزی پر آنچ نہ آسکے۔ اپنی ذمہ داریوں سے بے نیاز ہو کر وہ دوسروں میں کیڑے ڈالتے ہیں۔ ان پر تہمت دھرتے ہیں۔ ان کی ہر طرح کی بے راہ روی کی داستانیں تراشتے اور سناتے ہیں۔ رائی کا پہاڑ بناتے ہیں اور اپنی تخلیقی طاقت پر ناز کرتے ہیں۔ کوئی انکشاف کرتا ہے کوئی اختراع۔ اللہ تعالیٰ ستّار ہے گنہگاروں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اسی اللہ کے یہ بندے پردہ دری سے لذت اندوز ہوتے ہیں۔ ذرا دیر کے لیے یہ نہیں سوچتے کہ دوسروں کی پردہ دری کرنے والا اس کا مستحق نہیں رہتا کہ پروردگار اس کے عیوب اور بداعمالیوں کی پردہ پوشی کرے۔

ہمارے معاشرہ میں بے تکلّف دوستوں میں جو باتیں ہوتی ہیں، اس کا برجستہ ایک نمونہ لیجیے۔ ٹیپ کر لیجیے اور تجزیہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ یہ گفتگو زیادہ تر افراد کے متعلق ہے جن میں مزے لے لے کر برائیاں کی گئی ہیں۔ اگر کسی ایسے آدمی میں جس کی شہرت اچھی ہے کوئی برائی نظر آگئی تو گویا کشف و کرامات کی منزل پر پہنچ گئے۔ ایک نیا براعظم دریافت کر لیا۔ کولمبس کو امریکہ دریافت کرنے پر کب اتنی خوشی ہوئی ہوگی جتنی ان محفل ساز عیب جویوں کو کسی بھلے آدمی کی کسی دیرینہ یا حالیہ لغزش کا سراغ لگانے پر۔ انسان خطا اور عصیان کا بنا ہوا ہے۔ بہتان پرداز اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں جہاں کوئی خطا نظر آئی بغلیں بجانے لگے، رنگ رلیاں منانے لگے۔ ہاں، ان کی نکتہ چینی سے ایک ذات محفوظ ہے۔ ان کی اپنی ذات۔

نکتہ چینی جن لوگوں کی خو بن جاتی ہے وہ اپنے آپ کو فراخ دلی، عالی ظرفی اور حلم سے تو محروم کرتے ہی ہیں، سچائی اور سنجیدگی کے دروازے بھی اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔ خامیاں نہیں ملتیں تو انھیں وضع اور اختراع کرتے ہیں۔ نکتہ چینی کو دلکش بنانے کے لیے وہ داستان طرازی، دروغ بافی اور مبالغہ سے کام لینے لگتے ہیں اور وہ حجاب جو فطرتاً انسان کو جھوٹ بولنے میں ہوتا ہے اس طرح اٹھ جاتا ہے اور زبان رواں ہونے لگتی ہے۔ مبالغہ اور جھوٹ کی سان پر ایک دفعہ زبان چڑھ گئی، پھر سچائی کی لکنت اور ضمیر کی روک اور حقیقت کی بے کیفی اسے گوارا

نہیں ہوتی۔

نکتہ چینی اور عیب جوئی، غیبت اور بدگوئی کو بازگشت سے کوئی نہیں روک سکتا۔

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

یہ بھی کلیہ ہے کہ آپ جس شخص سے کسی کی برائی کریں گے وہ سامنے ہاں میں ہاں ملائے گا اور پھر جاکر نمک مرچ لگاکر اس شخص سے کہہ دے گا کہ فلاں تمھیں بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس کی بُرائی کی جا رہی ہے یہ سب کچھ سن کر وہ کیوں نہ پیچ و تاب کھائے گا اور دندان شکن جواب کیوں نہ دے گا۔ گیند کے اکثر کھیلوں خصوصاً ٹینس اور کرکٹ میں فریق مخالف نے گیند جس شدت سے پھینکی ہو، اس میں جتنی طاقت بھر دی ہو اتنے ہی زور اور اتنی ہی طاقت سے اچھا کھلاڑی بغیر اپنی طاقت استعمال کیے اسے واپس بھیج سکتا ہے۔ باہمی نکتہ چینی اور ہجاجات کا بھی کچھ ایسا ہی طریق ہے۔ سبکدستی کے ساتھ ایک کنکری پانی کی سطح کے متوازی پھینکیے، ایک چھوٹے دائرہ کو حصار میں لیتے ہوئے بہت سے بڑے دائرے بنتے چلے جائیں گے۔ بدگوئی بھی اپنے آپ کو اسی طرح پھیلاتی چلتی ہے۔ ایک تیسری مثال اس سلسلہ کی اور سن لیجیے۔ وہ ہے بوم رینگ کی یعنی ایسا تیر جو چلانے والے کے پاس واپس آجائے۔ نکتہ چینی اور بدگوئی سے زیادہ سچا کوئی بوم رینگ نہیں۔ یہ ہدف سے زیادہ خود چلانے والے کو گھائل کرتی ہے۔ یہ بھی دو طرح: ایک تو اس عنوان کہ سیر بھر بُرائی کے جواب میں سوا سیر بُرائی حصہ میں آتی ہے۔ دوسرے اس طرح کہ بُرائی کرنے والا صرف ایک بات ثابت کر پاتا ہے۔ وہ یہ تو ثابت نہیں کرسکتا کہ جس شخص میں وہ کیڑے ڈال رہا ہے وہ دراصل ہے بھی ویسا ہی۔ البتہ وہ یہ ضرور ثابت کردیتا ہے کہ وہ خود بُرا ہے۔ نکتہ چین ہے، عیب جو ہے؛ دوسروں کی تعریف سن کر وہ جل بھن کر کباب ہوجاتا ہے۔ دوسروں کی اچھائیاں اسے گوارا نہیں۔ اس کی طبیعت برائیاں ڈھونڈنے میں لگی رہتی ہے۔ یہ سب کچھ طبیعت کی کجی پر دلالت کرتا ہے۔

اسی پر بس نہیں، جو لوگ نکتہ چینی کا روگ پکڑ لیتے ہیں ان میں عمل کی صلاحیت مفلوج ہوجاتی ہے۔ حرکت کا مفہوم ان لوگوں کی نظر میں صرف زبان چلانا رہ جاتا ہے۔ جو زیادہ گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ جو زیادہ بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں۔ جو زیادہ باتیں کرتے ہیں وہ کام کم کرتے ہیں۔ جو شخص دوسروں کی ٹوہ میں رہتا ہے وہ خود کو سنبھال نہیں پاتا، سدھار نہیں سکتا، سنوار نہیں پاتا۔ نکتہ چینی اور خوردہ گیری کی طرف طبیعت جھک جائے تو اقدامیت اور عمل کی طاقت سلب ہوجاتی ہے۔ ایسا انسان بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرسکتا ہے، چٹپٹی، مزیدار، لچھے دار باتیں؛ لیکن ذرا دیر کے لیے اٹھ کر کام نہیں کرسکتا۔ زبان چلانے پر وہ قادر ہے مگر کرنا اس کے بس کا نہیں۔ زبان کے رسیا کسی کام کے نہیں رہتے۔ انسان کے پاس صرف زبان

بنا نہیں ہے۔ خدا نے اسے دماغ بھی دیا ہے، ہاتھ بھی دیے ہیں اور پاؤں بھی۔ چنانچہ جو آدمی باتیں زیادہ کرتا ہے، پہلی ملاقات میں ہی آپ کی نگاہ میں اس کی عملی صلاحیت مشتبہ ہو جاتی ہے گفتار کے غازی کو دنیا حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ گفتگو کی آبرو عمل سے ہے۔ جہاں اس نے عمل کو بے دخل کیا، خود بے جان ہو گئی۔ فارسی مثل ہے: کردن صد عیب نکردن یک عیب۔ کچھ نہ کرنا تو صرف ایک برائی ہوئی، کرنے میں سو برائیاں ہیں۔ گفتار کے غازی شاید اسی کہاوت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ زبان چلاتے ہیں ہاتھ پیر چلانے سے پرہیز کرتے ہیں۔ فقدانِ استعمال سے ہاتھ پیر کی طاقت، کام کرنے آگے بڑھنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔

آپ نے دیکھا نکتہ چینی کے یہ چٹخارے
عیب جوئی کی یہ پھلجھڑیاں، بدگوئی کے لطیفے کتنے
مہنگے پڑتے ہیں۔

زبان کا گھاؤ بہت گہرا ہوتا ہے
کبھی نہیں بھرتا۔ نکتہ چیں اٹھتے بیٹھتے دل دکھاتا رہتا ہے۔ بجائے اس کے کہ تحسین کے کلمے، تعریف کے جملے سے دل بڑھائے، ڈھارس بندھائے وہ برائی کرکے دلوں کو توڑتا چلتا ہے۔

جو شخص اپنی زبان کے سحر میں
گرفتار ہو گیا وہ خود اپنے دل سے دور ہو جاتا ہے۔ اس کے جینے کی سطح زبان سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ عیب چٹخارتا رہتا ہے، داستان بنتا رہتا ہے۔ دل کو وہ طاق پر بٹھا دیتا ہے۔ زبان کی سطح پر جینے کا نتیجہ معلوم۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ برا بنانے یا بتانے سے طبیعت میں کمی آتی ہے۔ برائی کی گفتگو میں گھر جانے سے جینے کی سطح اتھلی ہو جاتی ہے۔ شخصیت تہ دار نہیں بننے پاتی، بے تہی رہ جاتی ہے۔

نکتہ چیں، عیب جو، خوردہ گیر، الزام تراش، غیبت آشنا، بدگو، بدزبان، دریدہ دہن کج بیں انسان (یہ سب ایک ہی سفر کی منزلیں ہیں) خود محروم جیتا ہے اور محرومی کا کاروبار اور تہی مائگی کی اشاعت کرتا ہے۔

جو شخص گفتگو کو عمل کا بدل
سمجھنے لگے، جو اپنے معائب سے غافل ہو کر دوسروں کی خامیوں میں گم ہو جائے، اس میں عمل کی صلاحیت تو ختم ہوتی ہی ہے اصلاح کے امکانات بھی معدوم ہو جاتے ہیں۔ جو اوقات خود کو سنوارنے میں صرف ہونے چاہیں وہ دوسروں کے عیب ڈھونڈھنے میں ضائع ہو جاتے ہیں

فرصت ملی جو تزکیۂ نفس کے لیے
وہ صرف نکتہ چینیٔ اغیار ہو نہ جائے

نکتہ چینی، خردہ گیری اور زباں درازی کی تباہ کن عادت اگر فرد سے جماعت میں پھیل جائے تو حالت بہت تشویش ناک ہو جاتی ہے۔ پھر اس بری عادت سے کوئی بچ نہیں پاتا۔ اس حمام میں سب ننگے ہو جاتے ہیں۔ سارے خربوزے رنگ پکڑنے لگتے ہیں۔ جو افراد کا رج

خود ناروا جستجو اور نازیبا گفتگو کی طرف نہیں ہوتا۔ وہ بھی معاشرہ اور ماحول سے متاثر ہو کر اس بُری عادت، اس مہلک روگ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کسی قوم میں اگر نکتہ چینی اور یاوہ گوئی کا چلن عام ہو جائے تو سنبھلنے اور ترقی کرنے کی راہیں اس پر بند ہو جاتی ہیں غور کیجیے جس جماعت سے ہمارا تعلق ہے، اس نے ہندوستان بھر میں بالعموم اور شمالی ہندوستان میں بالخصوص اپنا دامن زبان کی دراز دستی اور عمل کی کوتاہی کے ساتھ جوڑ دیا ہے ارزاں اور لذّت خیز نکتہ چینی اور محنت اور عمل سے محرومی ہمارا شعار بن گئی ہے۔ نکتہ چینی نے دل توڑے ہیں۔ اور اتحاد کے شیرازہ کو بکھیر دیا ہے۔ غالب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں نکتہ چینی کا عمل ہو وہاں نہ فرد کی بات بن سکتی ہے نہ قوم کی ـــ وہاں کاہل وجودی، دلشکنی، اور نفاق، اور دروغ کا دور دورہ ہوتا ہے۔

اجتماعی زاویہ سے

دیکھیے نکتہ چینی نے یقین کو مجروح کر دیا ہے۔ اب ہم ہر شخص کی نیت اور خلوص پر شبہ کرنے لگے ہیں۔ اس لیے نہ ہم کسی فرد کی قیادت کو قبول کر سکتے ہیں نہ کسی ادارے کو ہم آہنگی، خوش دلی اور خوش اسلوبی کے ساتھ چلا سکتے ہیں۔ کسی اجتماعی مقصد کے لیے سر جوڑ کر ہم نہیں بیٹھ سکتے۔ نہ قدم ملا کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔

اور اس تباہ کن نقطۂ نگاہ

اس مہلک جنبشِ زبان، اس تفرقہ پرداز افتادِ طبع، اس حوصلہ شکن زیاں کاری کی انتہائی عبرتناک مثالیں ڈھونڈنے ہمیں زیادہ دور جانا نہیں پڑے گا۔

نکتہ چینی اور عیب جوئی کا

سرچشمہ یا نخوت ہے یا حسد یا شرارت یا محض بے کاری۔ اور اس کی رفیقِ راہ بے دردی ہے اور بے حسی۔ وہ لوگ زیاں کار ہیں جو ذرا سی لذّت کے لیے دوسروں کی شہرت اور اپنے سکون کو برباد کرتے ہیں جو چلتے پھرتے نفاق کا بیج بوتے ہیں۔ جو برائیوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ جو سنجیدگی، وزن اور وقار اور گہرائی اور انضباط سے اپنی شخصیت کو محروم کر دیتے ہیں، جو بے دردی کو شعار بنا لیتے ہیں اور جو اپنے اور دوسروں کے لیے تلخی کی کاشت کرتے ہیں۔ ایک پل کی ارزاں لذّت کے بدلے کیا یہ سودا گراں نہیں؟

ق۔ م۔ ل

قومی ترقی پر زبان و ادب کا اثر

کسی زبان کی تصانیف و تالیفات رسالے اور اخبار، ناول اور افسانے اور عام دلچسپی کی کتابیں دیکھ کر اس زبان کے بولنے والوں کا حال و مستقبل علم و دانش، فہم و فراست کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آپ اپنی زبان اردو کی طرف توجہ کیجیے اور دیکھیے کہ اس میں علمی دولت کتنی ہے اور خاص و عام کے مطالعہ کی کیا کتابیں ہیں۔ اردو کی مطبوعات میں آپ کو شعراء کے کلام کے مجموعے بکثرت ملیں گے۔ ایسا محسوس ہوگا کہ ان مجموعوں کے علاوہ اردو کی کوئی کتاب چھپتی ہی نہیں۔ مایوسی اور ذہنی انتشار کی حالت میں نوجوان شعر ہی کہتے ہیں۔ اور شعر کہہ کر تسکین حاصل کر لیتے ہیں۔ گویا حالات کا مقابلہ کرنے کی ان میں طاقت نہیں۔ اردو کے ناول اور افسانے پڑھ کر بھی یہی محسوس ہوگا۔ پورا اردو والوں کا معاشرہ ایک بھنور میں پھنسا ہوا ہے ترقی کے لیے جدوجہد کرنے سے بچ کر جمود سے لطف اندوز ہونے کے لیے کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ نہ کسی کو اپنے سماج کے حال کا احساس ہے نہ مستقبل کا۔ نوجوانوں کے لیے یہ کتابیں افیم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے نہ ان میں ترقی کی امنگ پیدا ہوتی ہے نہ تلاش و جستجو کا جذبہ۔ نہ ان کا سماجی شعور (Social Sense) ابھرتا ہے، نہ ملک کا ایک اچھا شہری بننے کی خواہش ان میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ تو اردو کی عام کتابوں کا نتیجہ ہوا۔ نصابی کتب دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کتابوں کا ایک طالب علم کو تھوڑی بہت معلومات فراہم کرنا ہی مقصد ہے طالب علم کی شخصیت کا نشو و نما نہیں۔ اسکولوں کی جو حالت ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طالب علموں میں قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔ اپنے ماحول سے بیگانہ ہی رہتے ہیں۔ ریل کا ٹائم ٹیبل مشکل ہی سے کسی کو دیکھنا آتا ہے۔ اگر سامان کے سلسلہ میں سواری یا مال گاڑی سے سابقہ پڑ جائے تو ان کی سمجھ ان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ ڈاک تار کے معاملات سے واقفیت کی وہ ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ پیرس اور نیو یارک کہاں ہیں اس سے بحث ہی نہیں۔ محمد علی کلے سے تو واقفیت ہے مولانا محمد علی کو نہیں جانتے مہاتما گاندھی کا نام کان میں پڑ گیا ہے واقفیت ان کی شخصیت سے بھی نہیں۔ ہندوستان کے صدر کا نام پوچھیے تو چکرا

جائیں گے۔ پہلے جواہر لال تھے، اب اندرا ہیں۔ یہ مبالغہ نہیں مشاہدہ ہے۔ ایک بار یہ سن کر تعجب ہوا کہ تحریک آزادی سے کس کو دلچسپی ہے۔ جب اس سے دلچسپی نہیں تو انقلابِ فرانس، انگلستان کے صنعتی انقلاب، سوویت یونین کے اشتراکی انقلاب سے کون واقف ہوگا پھر زمانہ کے آج و کل سے واقف ہونے کی توقع کس سے کیجیے؟

کسی قوم یا تہذیبی فرقہ کا تعلق صرف تعلیم سے نہیں ہے۔ تعلیم و تربیت دونوں سے ہے۔ تعلیم و تربیت مل کر آدمی کو انسان بناتے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے سے مراد چند نصابی کتابیں پڑھنا نہیں ہے عام معلوماتی اور تہذیبی کتابوں کا مطالعہ بھی ہے۔ ان کتابوں سے معلومات بڑھتی ہے۔ طالب علم میں خود اعتمادی اور وسعت نظر پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے کارنامے پڑھتا ہے تو اس کا سر فخر سے بلند ہوتا ہے۔ جمود کی جگہ اس میں جد و جہد کی خواہش پیدا ہوتی ہے یہی وہ خصوصیات ہیں جو پسماندہ قوموں سے ترقی یافتہ قوموں کو نمایاں کرتی ہیں۔ اگر کسی قوم یا تہذیبی فرقہ کو ترقی کرنا مقصود ہے تو ترقی یافتہ قوموں کی راہوں پر چلنا ہوگا۔ مغرب سے کوئی اچھی بات سیکھنا مغرب پرستی نہیں۔ اپنی اصلاح کے لیے ایک قدم اٹھانا ہے۔ انگریزی زبان میں نصابی کتب کے علاوہ ہر عمر کے بچوں نوعمر لڑکوں کے لیے مفید معلوماتی کتابیں ہیں۔ اور ایک دو نہیں بلکہ بیسوں اور سیکڑوں ہیں۔ یہی کتابیں ہیں جن سے بچوں کی اور نوعمر لڑکوں کی تربیت اور تعلیم ہوتی ہے۔ ان ہی کتابوں اور رسالوں نے مغربی اقوام کی قسمت بنائی ہے اور ان ہی کی بدولت یورپ اور امریکہ کی قوموں کی تہذیب دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔

مسلمانوں نے کبھی اپنے نظام تعلیم و تربیت اور ترقی کے مسائل کی طرف توجہ نہ کی۔ ہندوستان آزاد ہوا تو ضرورت تھی کہ نظام تعلیم و تربیت کے مسئلہ پر غور و فکر کیا جاتا۔ اور ترقی کی راہیں تلاش کی جاتیں اب ایک ضرورت تو یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کے سوال پر غور ہو اور ایسی آزاد درس گاہیں قائم کی جائیں جہاں طالب علم کی شخصیت کی پرورش ہو وہ اچھا شہری بھی بنے اور اس میں روزگار پیدا کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ ایسی کتابیں اور رسالے شائع کیے جائیں جو نوعمر لڑکوں اور بچوں کے مطالعہ کے لیے ہوں تاکہ وہ بے مقصد ادب پڑھنے سے بچیں۔ ایسی کتابیں نفع و نقصان کے خیال سے آزاد ہو کر شائع کی جائیں۔ ذاکر صاحب مرحوم کے ذہن میں یہی خیال تھا اور اسی مقصد سے مکتبہ جامعہ قائم کیا گیا تھا لیکن وہ حالات سے مجبور ہو گئے۔ پھر جو مکتبہ جامعہ بنا وہ ہم سب کے سامنے ہے وہ ایک اچھا ادارہ ہے اور بہت دیانت دار لوگوں کے ہاتھ میں ہے لیکن تعلیمی ضرورت کی جن کتابوں کی اشاعت کی ذاکر صاحب کو خواہش تھی وہ ذاکر صاحب خود بھی پوری نہ کر سکے۔

پرنسپل یونیورسٹی پولی ٹیکنک
اے ایم یو

کمپیوٹر

اس کے بارے بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ کچھ اسے بڑا اعلیٰ اور ارفع ذہن سمجھتے ہیں اور کچھ اسے دوسرے آلات کی طرح ایک آلہ ہی سمجھتے ہیں۔ موجودہ کمپیوٹر اپنی پہلی شکل سے بالکل مختلف اور بہت کارآمد سہولت ہے جو آج ہمیں میسر ہے اور اگر یہ کہا جائے تو ذرہ برابر بھی مبالغہ نہیں کہ اس کے بغیر بہت سے کام، ترقیاں، پیشین گوئیاں، فیصلے ممکن نہ تھے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس کا استعمال ایک فلسفہ اور استدلال ہی پر مبنی ہے۔

آج کا کمپیوٹر دراصل ارتقا کی وہ چوٹی ہے جو ابھی منزل کو نہیں پہنچی اور نہ ہی شاید پہنچ سکے۔ اور جو اپنی پہلی شکل میں انسانی انگلیوں سے شروع ہوئی۔ جب ہی انسان کو گنتی کا شعور ہوا اس نے انگلیوں اور پھر پوروں سے کام لیا۔ بعد کو کنکریوں، پتھروں اور روڑوں اور منکوں کے حساب تک پہنچا۔ گنتی مشینوں کی تعداد اور نوع بیچ سکے ہاتھوں کی تعداد سے حساب کا طریقہ سوا [illegible] طریقہ آج [illegible] وقت ضرورت مانا جاتا ہے، [illegible] بابل اور مصر والوں نے [illegible] وضع کیا اور [illegible] اب شماریوں سے

لینے شروع کیے۔ چونکہ مشین جھوٹ نہیں بولتی رشوت نہیں لیتی، سفارش نہیں قبول کرتی، ما و ماحول کا اثر نہیں لیتی، جذباتی نہیں ہوتی ان اوصاف سے جو فیصلے ہوں گے وہ خاصے پائدار ہوں گے اور صحیح رُخ پر چلنے میں بڑی مدد دیں گے۔ یہ درست ہے کہ مشین اپنے چلانے والے کی صلاحیت کی محتاج ہوتی ہے۔ یہی مجبوری کمپیوٹر کی بھی ہے۔ اس کے فیصلے پر بھروسہ تب ہی ممکن ہے جب اسے ہدایت دینے والا ٹھیک کام کرے۔ اسے اس کی زبان سے پوری واقفیت ہونی چاہیے تب ہی کام بنے گا۔

کمپیوٹر اپنی اصلی حیثیت سے اعداد و شمار کی مختلف ترکیبوں کا ایک مجموعہ ہے جو ان تمام باتوں کو جو پہلے حقیقت ہو محفوظ رکھتا ہے اور وقت ضرورت انھیں کی مدد سے جواب دیتا ہے۔ شروع کے کمپیوٹر خاصے بڑے اور مختلف دالانوں کی گراری کی طرح کے تھے مگر آج کل کمپیوٹر اکثر ایسے ہیں جو نہ صرف بجلی کم خرچ کرتا ہے بلکہ جگہ بھی کم گھیرتا، کام بھی زیادہ کرتا ہے اور وقت بھی بہت کم لیتا ہے۔ اس دوران دوریوں میں بھی سہولت ہے کہ کمپیوٹر تک جائے بغیر ٹیلی فون کی مدد سے دور دراز سے اپنی مشکل حل کرے۔ بظاہر یہ کشف و کرامات

کے کرشمے دیکھتے ہیں۔ مگر یہ انسان کی محنت
منطق اور صلاحیت کا پھل ہے اور کچھ نہیں۔ یہ
بھی ضرور ہے کہ اب ہماری صنعت و حرفت سرکار
و تجارت سب اس کے دستِ نگر اور غلام سے
ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کا استعمال اب اس
قدر عام ہو چکا ہے کہ یہ افسروں کی میزوں پر
گھڑیوں میں، ڈائریوں میں بھی جوہر دکھا رہا ہے
شروع میں صرف دو طرح کے نسخوں پر مبنی کمپیوٹر
جاری کیے گئے۔ مگر اب دونوں کو مدغم کر کے ایک
کر لیا گیا ہے۔ تاکہ کام میں رکاوٹ نہ پڑے۔ ایک
تو وہ تھے جو گنتی کے سادے طریقے پر بنائے گئے
اور دوسرے جو کسی فارمولے کے مطابق۔ مثال
یوں سمجھیے کہ سڑک پر بچھانے کے لیے کنکر یا اینٹیں
آتی ہیں۔ ایک طریقہ تو انھیں ایک ایک کر کے گننے
کا ہے اور دوسرا طریقہ انھیں ایک خاص شکل
میں ڈھیر لگا کر اس ڈھیر کے حجم سے تعداد نکالنا
یہی منطق بالترتیب مذکورہ بالا ڈیزائنوں میں رکھی
گئی۔ اب بہرحال شکل جدا ہے۔ ایک ہی کمپیوٹر اب
ہدایت کے بموجب دونوں کام بخوبی و بعجلت کر سکتا
کام کرنے کی رفتار کے پیمانے۔ دقیقہ، ثانیہ، گھڑی
پل سب پرانے ہو گئے۔ اب کام آناً فاناً بلکہ سیکنڈ
کی لاکھوں کسر میں ہوتا ہے۔ دیر صرف آپریٹر
کے سوچنے، زبان میں بدلنے اور مشین کو تیار
کرنے میں لگتی ہے۔ جواب میں نہ دیر نہ اندھیر
اس فیضِ باطنی کو نہ الہام کہہ سکتے ہیں نہ ہی معجزہ
صرف انسان کی حس کی طرح کمپیوٹر نے بھی اپنی
حس سے کام لیا اور بہت زیادہ حساس ہونے

کے سبب سے بہت جلد جواب فراہم کر دیا۔ اب
یہ ہماری سمجھ ہے کہ ہم اسے کیسے استعمال کریں
مجھے نومبر ۵۷ء میں پہلی دفعہ کمپیوٹر
سے سابقہ پڑا تھا وہ ان کی پہلی نسل کا تھا اور
امریکہ کی ریاست جیارجیا کے جیارجیا انسٹی ٹیوٹ
آف ٹکنالوجی میں نصب تھا۔ میرا ایک سوال تھا
جس کا جواب تو معلوم تھا مگر راستہ نکالنا ممکن
نہ تھا۔ وہ سوال اس نے سرِ دست فوراً ہی حل
کر دیا اور کارڈ پر چھپا ہوا جواب بھی مل گیا
پھر میں نے دو ایک امتحان اور بھی لیے وہ بھی
ٹھیک نکلے [illegible] نہ کی میلا آیا۔ اس کے بعد بھی
صنف MIT اور CALTECH میں بھی ملی
M.I.T میں تو اس قدر لمبی قطار رہتی تھی قدردانوں
کی کہ کوئی دس روز میں نمبر نہ آیا۔ ایک ایک
منٹ وقف تھا۔ لوگ آتے کرایہ ادا کرتے اور
اپنے مسائل کے حل لے جاتے تھے۔ وہاں اس وقت
بھی اور آج بھی کمپیوٹر خریدے نہیں جاتے بلکہ
کرایہ پر لیے جاتے ہیں اور جلد ہی نئے ماڈل آنے
پر بدل لیے جاتے ہیں یا اضافی حصہ شامل کر دیتے
ہیں۔ ہمارے یہاں کام کی نوعیت ذرا مختلف
ہے۔ پھر کمپیوٹر کی رفتار بھی کم تھی۔ اس لیے ہمیں
خریدنا ہی سود مند رہتا ہے۔ اس وقت سب
سے زبردست کمپیوٹر سعودی عرب میں لگا
ہوا ہے۔

کمپیوٹر کی صلاحیت کا اندازہ اس
سے لگایا ہے کہ اگر آپ چاہیں کہ قرآن حکیم میں کتنی
بار لفظ اللہ آیا ہے [illegible] زیر ہیں۔

علی گڑھ

مسلم خواتین اور معاشرہ

جس طرح خاندان کی اساس مرد اور عورت پر قائم ہے، اسی طرح معاشرے کی تشکیل و تعمیر میں یہ دونوں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ معاشرے کو سدھارنے، سنوارنے اور اسے اعلیٰ اخلاقی اقدار کا نمونہ بنانے میں دونوں کا برابر کا حصہ ہے مگر قوم و ملت کے ننھے ننھے پودوں کی نگہداشت و پرداخت میں عورت کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ اس کی گود میں پرورش پانے والا بچہ، اس کے مزاج اخلاق و عادات اور خیالات کو شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنے کردار اور اپنی ذہنیت میں اس طرح سموتا ہے کہ اس کا مستقبل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس لیے اس پہلو معاشرے میں ایک عورت کی ذمہ داریوں اور فرائض کی جو اہمیت ہے اور ہونا چاہیے اس سے کسی قیمت صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

اس دور میں عورت نے اپنی صلاحیت و اہلیت کا جو مظاہرہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کیا ہے، اس سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ بڑی خوبصورتی سے کام کر سکتی ہے بلکہ بعض کاموں میں تو اس کی کارکردگی مردوں سے

بقیہ مضمون "کمپیوٹر"

تو جواب کو ایک عمر چاہیے۔ لیکن یہی جواب قرآن کو کمپیوٹر کے حافظے میں دینے کے بعد چند لمحوں میں مل سکے گا۔ اسی طرح وہ عقدے جو انسان آج تک حل نہ کر سکا پلک جھپکانے میں حل ہو جاتے ہیں۔ بشرطیکہ کہ ان کے پیچھے کوئی فلسفہ ہو۔ یہ بھی ضرور ہے کہ غلط فلسفے سے آرام سے غلط جواب بھی لیے جا سکتے ہیں۔ یہ کمپیوٹر ہی ہے جس نے فضا اور خلا کی تسخیر ممکن کی۔ آج کل تو تشخیص و تجویز بھی اس کی مدد سے ہو رہی ہے۔ قومی بجٹ اور منصوبہ بھی بنا رہا ہے پڑھانا، ترجمہ کرنا، چھاپنا، کارخانوں، ریلوں، ہوائی جہازوں وغیرہ کو ٹھیک طور پر چلانے میں بھی حضرت کام آ رہے ہیں۔ طولِ شب بحر کو نہ صرف ناپ دینا بلکہ پیش گوئی کر دینا اب ناممکن نہیں رہا۔

انسان اپنی فطری درندگی سے اب بھی باز نہ آیا ہے۔ چنانچہ کمپیوٹر کا استعمال آلات حرب کے ساتھ بڑی فراوانی اور فراخدلی سے ہو رہا ہے اور تہذیب اپنے خنجر سے آپ خودکشی کی تیاری کر رہی ہے۔

اللہ بس باقی ہوس

ہیں زیادہ ہے۔ مگر توجہ طلب بات یہ ہے کہ اس کی صلاحیت اور قابلیت کس طرح اور کن کاموں میں صرف ہوتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے اور تاریخ اس کی شاہد ہے کہ قوموں کے عروج و زوال اور بناؤ بگاڑ میں عورت کا بڑا حصہ رہا ہے۔ وہ چاہے تو قوم کو ایک مثالی نمونہ بنا دے اور چاہے تو گمراہی کے راستہ پر ڈال دے۔ وہ چاہے تو ملت کی شیرازہ بندی کر دے ورنہ اس کی بنیادوں کو ہلا دے۔ وہ چاہے تو طارقؔ، اقبالؔ اور جوہرؔ جیسی ہستیاں پیدا کرے اور چاہے تو ظالموں، بے ایمانوں اور ضمیر فروشوں کو جنم دے۔ گویا کسی نسل کی نشو و نما اور اس کی ذہنی تشکیل میں جو کردار کسی عورت کو ادا کرنا ہوتا ہے اس کے پیشِ نظر اس کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ انتہائی توجہ کا مستحق ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت اور خصوصاً تربیت ایسے خطوط پر ہونی چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا استعمال تعمیری اور تخلیقی نہج پر کر سکے۔

آج کے زمانے میں تو عورت کی صحیح تربیت کا مسئلہ اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ اسکولوں اور کالجوں میں تو اخلاقی اور مذہبی تعلیم کا کوئی خانہ ہوتا نہیں ہے۔ گھروں کا ماحول بھی باہر کی مسموم فضا سے متاثر ہو رہا ہے نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کے موجودہ گہواروں میں ایسی تعلیم تو حاصل ہو جاتی ہے جس کے ذریعہ انسان ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کے ڈھنگ سیکھ لیتا ہے مگر ذہنی طور پر وہ انسانی صفات سے متصف نہیں ہو پاتا جو زندگی کا اصل جوہر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کی مادہ پرستانہ ذہنیت کی بدولت فکر و نظر کے زاویے بدل گئے ہیں۔ سوچنے کے انداز میں نمایاں تبدیلی آگئی ہے۔ کبھی جن اقدار پر انسانی فلاح و بہبود کا انحصار تھا وہ فرسودہ سمجھی جانے لگی ہیں۔ دولت کی افراط ظاہری شان و شوکت اور دنیوی آسائش کے حصول کو انسانی مسرت کی معراج تصور کیا جاتا ہے۔ جب ذریعہ مقصد اور مقصد ذریعہ بن جائے تو کردار میں پختگی، نظر میں وسعت، نیت میں خلوص، انسانی ہمدردی اور اخلاقی بلندی کا فقدان کوئی تعجب کی بات نہیں۔

ان حالات میں مسلم خواتین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنی ذمہ داری محسوس کرتے ہوئے معاشرے کی اصلاح میں تعمیری کردار ادا کریں۔ خوش نصیبی سے مسلم خواتین کے پاس ایک مکمل اخلاقی نظام موجود ہے۔ قرآنِ مقدس اور نبی کریمؐ کی حیاتِ طیبہ کی روشنی میں وہ زندگی کے بڑے سے بڑے .. چھوٹے سے چھوٹے مسئلے اور معاملے میں رہنمائی حاصل کر سکتی ہیں۔ ایک صالح معاشرے کی بنیادوں کو مستحکم اور مضبوط بنانے کے لیے اس سے اعلیٰ، تفصیلی اور قابلِ عمل ضابطۂ اخلاق کی مثال انھیں اور کہاں مل سکتی ہے۔ اِس انمول خزانے سے وہ خود فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کو فائدہ پہنچائیں۔ اپنے بچوں کو شروع ہی سے کہانی کی شکل یا دلچسپ گفتگو کے ذریعہ اخلاقیات کا درس دیتی رہیں۔ اسلاف کے کارناموں اور دنیا کی نامور شخصیتوں سے روشناس کراتی رہیں۔ تاکہ ان کے ذہن اپنی شخصیت اور صلاحیت کے اظہار کے لیے ایک صحیح اور موزوں راہ ہموار کرنے میں دشواری محسوس نہ کریں۔

م[illegible] ٹی وی، سستے اور فحش لٹریچر کے
مطالعہ کے شوق سے اپنی اولاد کو دور ہی رکھیں۔ کیوں کہ اس دور کے نوجوانوں کی گمراہی اور تباہی کے نقصان دہ اسباب یہی ہیں جو معصوم ذہنوں کو تخریبی کارروائی کا مواد فراہم کرتے ہیں اور ان کے کردار کو بگاڑنے کے ذمہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ سماج میں جو غلط اور تباہ کن رسوم مروج ہیں، ان کو ختم کرنے میں تعلیم یافتہ خواتین کو پیش پیش ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر جہیز کی مانگ کی رسم، شادی پر بے جا اسراف، عقیقہ اور ختنہ کے مواقع پر پُرتکلف دعوتیں وغیرہ چوں کہ مردوں کی بہ نسبت خواتین رسومات کی زیادہ پابند ہوتی ہیں۔ اس لیے ان کو ختم کرنے میں بھی وہی سب سے اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔

مسلم خواتین کو رفاہِ عام کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کم تعلیم یافتہ اور کم آمدنی والی خواتین کے لیے ایسے مراکز کھولنے چاہییں جو عزت و شرافت کے دائرہ میں رہتے ہوئے محنت کرکے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرسکیں۔ جن خواتین پر زکوٰۃ دینا واجب ہے۔ وہ اس رقم سے بہت سے ضرورت مندوں کی مدد کرسکتی ہیں۔ بینک سے حاصل ہونے والے سود کی رقم ناجائز ہونے کی وجہ سے وہ خود پر تو استعمال نہیں کرسکتی ہیں، ہاں وہ اس رقم بینک کے پاس چھوڑنے کی بجائے مجبوروں، معذوروں اور حاجت مندوں میں تقسیم کردیں۔

مسلم خواتین معاشرے کی اصلاح میں ایک مثبت کردار ادا کرکے قوم و ملک کی ترقی میں ایک نمایاں خدمت انجام دے سکتی ہیں۔ قوم کی صحیح تعلیم و تربیت، اس کی تعمیری صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور اسے اخلاقی خوبیوں سے سنوارنا ان کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

محمد یونس قاسمی
دھلی۔

جاپان کے کچھ تاثرات

بچپن میں پڑھا تھا۔

دریا کی طرح جو چلتا ہے چلتا ہی وہ رہتا ہے
کوہساروں کو میدانوں کو خاطر میں کب لاتا ہے

مگر اس کے معنی برسوں بعد سمجھ میں آئے جب جاپان کی جیتی جاگتی مثال سامنے آئی۔

درس و تدریس کا سلسلہ ٹوکیو پہنچتے ہی شروع ہو گیا۔ دیکھا کہ ہوٹل کے سامنے والی سڑک بجلی کی روشنی سے جگمگ ہے اور آدمیوں اور مشینوں کی مدد سے قد آدم کھودی جا رہی ہے۔ صبح جب چہل قدمی کے لیے نکلا تو سڑک تیار ہو چکی تھی اور اس پر سے ٹریفک گزر رہی تھی۔ ملبہ تو کیا گرد تک کا نشان نہ تھا۔ خدایا، کیا ان لوگوں کے پاس علاء الدین کا چراغ ہے؟

ایک بار کھانا کھانے ایسے وقت پہنچا جب بڑے ڈائننگ ہال کے اوقات ختم ہو چکے تھے۔ ہال میں کوئی نہ تھا۔ صرف خزانچی (Cashier) کاؤنٹر پر بیٹھی روپیہ گن رہی تھی۔ میں تذبذب میں تھا کہ کیا کروں اتنے میں خاتون کی نظر مجھ پر پڑی۔ مجھے اشارہ کیا اور پینٹری میں گئی اور وہاں سے ویٹروں کا سفید براق جھالر (Apron) لگا کے آرڈر لینے آ گئیں۔ آناً فاناً میز سجا دی اور کھانا لے آئیں اور پھر اپنے کام جا مشغول ہو گئیں۔ کچھ وقفہ کے بعد پھر آئیں اور گلاس میں دوبارہ پانی بھرا اور پوچھ کر کہ کچھ اور تو نہیں چاہیے اپنی جگہ جا کر اپنے کام میں مشغول ہو گئیں۔ جوں ہی میں نے کھانا ختم کیا، بل لے آئیں۔ شاید مجھے یہ سبق دینا مقصود تھا کہ جاپان میں کام مقدس فریضہ ہے۔ میں ایسے ملک سے آیا تھا جہاں "نیچ" کام "نیچ" ہی لوگ کرتے ہیں۔ اور اگر گرمی کی شدت سے کوئی خاتون بمبئی کے کسٹم ہاؤس میں بے ہوش ہو جائے تو ہر شخص "پانی' پانی" کی صدا لگاتا رہے گا، مگر پانی اسی وقت آئے گا جب چپراسی آ جائے مشہور مصنف نائی پال (Naipaul) نے اس واقعہ کو اپنی ایک کتاب میں نہایت غصہ سے درج کیا ہے۔

اگر یہ جاننا ہو کہ تاریخی عمارات کی کیسے دیکھ بھال کرنی چاہیے تو جاپان جائیے ایک ہزار سال سے زیادہ عمر کی عمارات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی بنی ہیں۔ بدھ مذہب کے ایک ذین عبادت خانے کے کمپاؤنڈ میں دریا سے نکلے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پتھروں کا ایک "باغ" ہے۔ پتھروں کو کسی راہب نے ایسا سجایا ہے کہ

ہے جو رسے دیکھیے تے ڈیزائن بنتے چلے جاتے ہیں۔ گزشتہ نو سو سال میں کروڑوں بچوں اور بڑوں نے اِس باغ کو دیکھا ہوگا۔ مگر وہ جوں کا توں اپنی اصلی شکل میں قائم ہے۔ ہر عمارت پر بڑے بڑے الفاظ میں لکھا ہے "ہمارے بزرگوں نے ہمیں یہ عطا کیا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس کی دیکھ بھال کریں"۔ کہاں جاپان اور کہاں ہم۔ لائبریری کی کتابوں کے صفحے کے صفحے غائب کرنے سے نہیں چوکتے۔

قرآن حکیم میں حکم ہے کہ باہمی مشورہ سے کام کرو۔ ہمارا عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ مگر جاپان میں اس قرآنی حکم کی پوری تعمیل ہوتی ہے۔ فیصلے رائے شماری سے نہیں اتفاق رائے سے طے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش ہوتی ہے اور اگر اختلاف بہت شدید ہو جائے تو کسی بزرگ کو بیچ میں ڈالا جاتا ہے وہ مختلف نقطہ ہائے نظر میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور لوگوں کو ایک متفقہ فیصلے پر پہونچنے میں مدد دیتا ہے وہ اپنا فیصلہ دوسروں کے سر نہیں تھوپتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ طرزِ حکومت کچھ ہی ہو، حکومت کسی بھی پارٹی یا دھڑے کی ہو، جاپان میں فیصلے باہمی مشورہ سے ہوں گے اور یہ کہنا مشکل ہوگا کہ وہاں آمریت ہے کہ جمہوریت۔

پس پردہ حکمراں پارٹی میں خوب زوروں کی چلتی ہے اور ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں کوئی تکلف نہیں برتا جاتا۔ مگر کچھ کرسیاں ایسی ہیں کہ ان کے لیے نہیں لڑا جاتا

مثلاً ایک ہی شخص ہے جو کابینہ کی اقتصادی سب کمیٹی کا چیرمین ۱۹۵۸ء سے چلا آرہا ہے۔ ایک ہی شخص ہے جو ۱۹۴۹ء سے وزیر اعظم کا مشیر چلا آرہا ہے۔ دونوں میں سے کوئی نہ پارلیمنٹ کا ممبر ہے اور نہ سیاست داں۔ اس تسلسل کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں حضرات معلومات کا خزانہ ہیں جو بڑھتا رہتا ہے۔ وہ اپنے عہدے سے اسی وقت ہی ریٹایر ہوں گے جب وہ کہیں کہ اب ہم کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ ہمیں رخصت کیجیے۔ پھر بھی انھیں مکمل طور پر جانے نہیں دیا جائے گا۔ ہفتہ دس دن میں ایک بار وہ خود اپنے دفتر مشورہ کے لیے آئیں گے یا لوگ ان کے پاس اسی غرض سے جائیں گے

جاپان میں تن آسانی حرام ہے۔ اور "براہ راست برو اگرچہ دور است" پر عمل ہوتا ہے۔ ۱۸۸۰ء میں سخت مالی بحران آیا اور کابینہ میں شدید اختلافِ رائے ہوگیا کہ آیا بیرونی قرضہ لیا جائے جیسا کہ ایک گروپ کا اصرار ہے۔ معاملہ بادشاہ کے سامنے رکھا گیا۔ "آج کی مشکلات ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ مگر ہمیں چاہیے کہ مستقبل کے نصب العین کی بھی سوچیں اور اس کے حصول کے لیے پوری جد و جہد کریں ...... میری مرضی تو یہی ہے کہ آپ محنت شاقہ کے راستے اقتصادی حل تلاش کریں"

بادشاہ کے اس فیصلے کے بعد نہ صرف مزید قرض نہیں لیا گیا، پرانے قرضوں کی بھی ادائیگی کر دی گئی۔ جاپان کی اس خود انحصاری

ہی نے اُسے بچالیا۔ عین اُس زمانہ میں جب
ایشیائی ممالک یکے بعد دیگرے بیرونی طاقتوں
کے غلام ہو رہے تھے، جاپان اپنی آزادی
قائم رکھ سکا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد بھی
وہ اپنے زورِ بازو کو کام میں لایا۔ بجائے
پکی پکائی روٹی Turnkey project کے جس کو
دیگر ایشیائی ممالک ترجیح دے رہے تھے
جاپان نے نہایت سستے داموں سیکنڈ گریڈ
کی ٹیکنالوجی خریدی اور اس کو بہتر سے بہتر
بنایا۔ تھوڑے ہی دن میں اوّل گریڈ
کی ٹیکنالوجی کے چشمے ابلنے لگے اور یورپ
اور امریکہ پیچھے رہ گئے۔ آج فولاد، الومنیم
بھاری کیمیات (Heavy Chemicals) کے دنیا
کے عظیم ترین کارخانے جاپان میں ہیں۔ یورپ
اور امریکہ میں نہیں۔ اور بجلی کے سامان
(Electronics) اور ٹیکنالوجی میں جاپان
سب سے آگے ہے۔

کسی نے کہا ہے کہ چوٹی پر
پہونچ جانا آسان ہے۔ مگر وہاں ٹکے رہنا
مشکل ہے۔ جاپان کو اس کا شدت سے
احساس ہے۔ اس کی سب سے بڑی کمزوری
یہ ہے کہ اس کے پاس نہ قدرتی وسائل
(معدنیات وغیرہ) ہیں اور نہ امریکہ جیسا اندرونی
مارکیٹ۔ ہر خام مال باہر سے آتا ہے اور
صنعتی پیداوار کا بیشتر حصہ باہر بھیج دیا جاتا
ہے۔ ۱۹۶۶ء میں یہ مسئلہ سامنے آیا۔ ۱۹۷۰ء
میں دانشور اس نتیجہ پر پہونچے کہ آئندہ
کی سب سے بڑی صنعت "اطلاعات کی صنعت"
ہوگی۔ جس کا کام دوسروں کی رہبری کرنا ہوگا
ان تمام صنعتوں سے دست بردار ہو جانا
چاہیے جن کا انحصار بیرونی خام مال پر
ہے۔ اس مشورہ پر عمل شروع ہو گیا
ہے اور آہستہ آہستہ جاپان متعلقہ کارخانے باہر
کے ملکوں کو بھیج رہا ہے۔ وہ دن دور نہیں
ہے کہ ہندوستان میں بنی ٹیوٹا (Toyota)
گاڑیاں امریکہ اور یورپ میں چل رہی ہونگی۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے
کہ مروجہ نظریات کے بالکل برعکس جاپان
میں جدید صنعت اور صنعتی انقلاب لانے والے
سرمایہ دار نہیں، جاگیردارانہ نظام کے جنگجو
خاندان (Samorai) تھے! جب ایڈمرل پیری
(Admiral Perry) نے جاپان کے دروازے
کھٹکھٹائے تو ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ سمورائے
نے چیلنج قبول کیا اور جدید صنعت قائم کی۔
اور معاشرہ میں وہ سب تبدیلیاں کیں جو
صنعتی انقلاب کے لیے لازمی تھیں۔ (کاش کہ
آج کے عرب ممالک کے شیوخ اور حکمراں
اس سے نصیحت پکڑیں!) فرسودہ نظام جاگیرداری
کے ادارے ختم کر دیے گئے اور مزدوری زرعی
اور ایڈمنسٹریٹو اصلاحات نافذ کی گئیں۔ آج کے
سب بڑے بڑے جاپانی بین الاقوامی فرم (firm)
مثلاً متسوبشی (Mitsubishi)، متسوئی (Mitsui)
(Sumitomo) ان سمورائے خاندانوں کے نام ہیں
جنھوں نے انھیں قائم کیا۔

قسط نمبر ۲

ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی
شعبۂ اردو
اے ایم یو

اردو اور سفارشات

ہندی ریاستوں میں
موجودہ فارمولا۔
(i) ہندی
(ii) انگریزی
(iii) جدید ہندوستانی زبان (ترجیح جنوب کی کسی زبان کو)

مجوزہ فارمولا۔
(i) ہندی (سنسکرت بھی اس نصاب کا حصہ ہو)
(ii) اردو یا کوئی دوسری جدید ہندوستانی زبان (i) کو الگ کرکے۔
(iii) انگریزی یا کوئی اور جدید یوروپی زبان

غیر ہندی ریاستوں میں۔
موجودہ فارمولا
(i) ہندی
(ii) انگریزی
(iii) علاقائی زبان۔

بقیہ مضمون "جاپان کے کچھ تاثرات"

یہ سب انیسویں صدی میں ہوا۔ بیسویں صدی میں بھی اسی حقیقت پرستی سے کام لیا گیا۔ دوسری جنگِ عظیم میں ہارنے کے بعد سب سے اہم اور فوری مسئلہ غذا کا تھا۔ ملے پایا کر غلّہ کی تجارت سو فیصد حکومت ... میں ہوگی اور زمین کاشتکار کی ہوگی تھوڑے ہی دن میں ملک نہ صرف خودکفیل ہوگیا بلکہ زائد غلّہ رکھنے کی جگہ نہ رہی۔ کسی نے اعتراض نہ کیا کہ "اشتراکیت" لائی جا رہی ہے۔۔ حب الوطنی اور اجتماعی شعور (ہمارے مارکسٹ اور غیر مارکسٹ اصحاب نوٹ فرمالیں) ذہنی تعصبات اور ذاتی منفعت پر غالب آگئے!

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج جاپان ترقی یافتہ ممالک میں سرفہرست ہے۔ ایٹمی جنگ سے متاثر ہونے کے باوجود اس نے جدید ٹیکنالوجی حاصل کی اور اس میں مزید ترقی حاصل کی۔ اور ایک شکست خوردہ قوم کی طرح اپنے مستقبل کو تباہ نہیں کیا۔ بلکہ مستقبل کی تعمیر میں تن من دھن کی بازی لگادی۔

آج دنیا کے تمام بچھڑے ممالک کے لیے یورپ اور امریکہ میں جاپان مشعلِ ہدایت ہے ہم ہندوستان کے مسلمانوں کو جاپان کے طریقۂ تعلیم کو اپنانا چاہیے۔ تاکہ ہم بیکاری سے نجات پاسکیں۔

(ا) مجوزہ فارمولا۔

(i) علاقائی زبان

(ii) ہندی

(iii) اردو یا کوئی جدید ہندوستانی زبان ماسوا (i) اور (ii) کے

(iv) انگریزی یا کوئی اور جدید یورپی زبان

غیر ہندی ریاستیں متبادل طور پر
رجہ ذیل فارمولا اختیار کرسکتی ہیں جو آندھرا
پردیش میں اردو آبادی کے لیے نافذ کیا گیا ہے۔

(i) اردو اور ہندی (ملا جلا نصاب)

(ii) علاقائی زبان

(iii) انگریزی یا کوئی اور جدید یورپی زبان

۱۰۔ جن طالب علموں کی مادری زبان اردو ہے، ان کو ہندی سیکھنی چاہیے اور جن کی مادری زبان ہندی ہے ان کو اردو سیکھنے کا موقع ملنا چاہیے

۱۱۔ استادوں کے تربیتی اداروں میں اردو مادری زبان والے امیدواروں کے داخلہ کی ضمانت ہونی چاہیے تاکہ ایسے استاد کافی تعداد میں مہیا ہوسکیں جو اردو کے ذریعہ مختلف مضامین پڑھا سکتے ہوں

۱۲۔ اردو زبان کے اساتذہ کی تربیت کے لیے مندرجہ ذیل سفارشات کی جاتی ہیں۔

(i) ریاستوں میں تربیتی سہولتوں میں اضافے کے لیے فوری اور موثر اقدامات کیے جائیں تاکہ تربیت یافتہ اردو اساتذہ کی ضرورت پوری کی جاسکے۔

(ii) آندھرا پردیش، بہار، گجرات، کرناٹک، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، راجستھان، اتر پردیش اور مغربی بنگال ایسے مراکز قائم کریں جن میں اردو اساتذہ کو مختصر مدتی تربیت دی جاسکے۔ مرکزی حکومت اس کی مالی کفالت کرے۔

(iii) دوسری ریاستوں میں موجودہ تربیتی مراکز میں اردو میڈیم سیکشن کھولے جاسکتے ہیں۔ مرکزی حکومت بھی ایسی ریاستوں کے لیے مناسب مقامات پر مراکز قائم کرسکتی ہے۔

۱۳ ریاستی حکومتیں جلد از جلد اس امر کا جائزہ لیں کہ تعلیم کے مختلف مدارج کے لیے ان کو کتنے اردو اساتذہ کی ضرورت ہوگی۔

۱۴۔ ریاستی حکومتیں اس بات کو یقینی بنائیں کہ اسکولوں سے متعلق اردو نصابی کتابیں تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے فراہم ہوجائیں

۱۴ ریاستی حکومتیں اردو نصابی کتابوں کی تعلیمی تنظیم کو بہتر بنائیں۔

۱۵ کتابوں کی لاگت میں زبردست اضافہ کے پیش نظر حکومت اردو نصابی کتابوں کی تیاری میں مدد دینے پر بھی غور کرسکتی ہے۔

۱۶ ریاستی حکام اس بات کا جائزہ لیں کہ آیا نجی ناشرین اور دوسری ریاستوں کی تیار کردہ کتابیں اُن کی ریاستوں کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں

۱۷ سرکاری اور مقامی اداروں کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی تنخواہوں کے گریڈ ہمسر تعلیمی استعداد رکھنے والے اساتذہ کے برابر ہونے چاہئیں۔

[illegible]

میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد کافی ہو ایک جوائنٹ ڈائریکٹر (اردو) کا تقرر ہونا چاہیے۔ یہ افسران اردو جاننے والے ہونا چاہیں

۱۹ ایسی ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والی آبادی کافی تعداد میں ہے اور جہاں تعلیم بالغان کے مراکز چلائے جارہے ہیں اردو تعلیم کی کلاسیں بھی کھولی جائیں۔

۲۰۔ ریاستی حکام آندھرا پردیش بہار، ہریانہ، ہماچل پردیش، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر پنجاب اور مغربی بنگال کی کم از کم ایک ایک یونیورسٹی کو اردو میں مراسلاتی کورس جاری کرنے کے لیے آمادہ کریں۔

۲۱۔ اسکول اور کالج کی لائبریریوں میں کتابیں ڈھنگ سے رکھی جائیں اور ان کی فہرستیں تیار ہوں، لائبریریوں کے اردو سیکشن کی دیکھ بھال کے لیے اردو داں عملہ مقرر کیا جائے۔ اداروں میں موجودہ اردو اساتذہ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے فاضل کام کے لیے ان کو کچھ معاوضہ دیا جائے۔

۲۲۔ ریاستی حکومتیں اس امر کو دیکھیں کہ اسکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کو اردو کتابوں کی خریداری کے لیے کافی رقم مہیا کی جائے۔

۲۳۔ ریاستی اور یونیورسٹی لائبریریوں میں اردو کتابوں کا ایسا ذخیرہ ہو جس میں نئی مطبوعات بھی شامل ہوں۔ لائبریریوں کے عملے کو اردو داں حضرات سے تعاون لینا چاہیے۔

۲۴ اردو بولنے والوں کی کافی تعداد والے علاقوں میں واقع کالج اور یونیورسٹیاں اردو تعلیم کی سہولتیں فراہم کریں۔

۲۵ اردو ادب اور زبان کے اعلیٰ تحقیقی کاموں کو فروغ دینے کے لیے دو تحقیقاتی ادارے قائم کیے جائیں ان میں سے ایک شمال میں ہو اور ایک جنوب میں۔ ان میں لائبریری کی مناسب سہولتیں فراہم ہوں۔ اس طرح کے دوسرے اداروں کے نمونہ پر ان اداروں میں وظائف دیے جائیں۔

۲۶۔ اردو میڈیم سے گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ مطالعات کے لیے جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کو مالی امداد دی جائے اور دیگر سہولتیں فراہم کی جائیں

۲۷۔ گریجویٹ سطح تک اردو ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے ہر ریاست میں کم از کم ایک کالج قائم کیا جائے۔

۲۸ ترقی اردو بورڈ کو مزید تقویت دی جائے اور تعلیمی میدان میں ریاست اور مرکز میں اردو کی ترویج و ترقی کے کاموں میں رابطہ کی ذمہ داری اس کے سپرد کی جائے۔

۲۹۔ مرکزی حکومت اور ریاستی وزرائے اعلیٰ پہلے ہی اس بات پر اتفاق کر چکے ہیں کہ جہاں جہاں لسانی اقلیتیں کل آبادی کا پندرہ فی صدی ہوں گی، وہاں اُن کو مخصوص سہولتیں بہم پہونچائی جائیں گی۔ انتظامی امور کے دائرہ میں اردو جیسی زبانوں کے لیے اس کو کم کرکے دس فیصدی کردیا جائے

قوانین و ضوابط اور اسٹاٹوٹ

۳۰۔ کے اردو ترجمہ کے لیے ترجماتی شعبے بیورو اکثر ریاستوں میں نہیں ہیں اور آندھرا پردیش، اترپردیش، بہار، مہاراشٹرا جیسی ریاستوں میں جہاں یہ مرکزی صورت میں موجود بھی ہیں مناسب عملہ نہ ہونے کی وجہ سے بے کار پڑے ہوئے ہیں، ترجماتی شعبے بیورو ریاستی ضلعی صدر مقامات میں یا اور جہاں ضروری ہو قائم کیے جائیں۔ ان میں کافی عملہ ہو تاکہ مذکورہ بالا ترجمہ کا کام کرنے کے علاوہ جوابات بھی اردو میں بھیجے جا سکیں۔ تاہم کفایت کے پیش نظر غیر اردو داں عملہ کو اردو سیکھنے کی ترغیب دی جائے کہ وہ ان شعبوں بیوروں میں کام کریں۔

۳۱۔ آئین کی دفعہ 350 میں ہر شخص کے اس حق کو غیر مشروط طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ مرکز یا ریاست میں استعمال ہونے والی کسی بھی زبان میں اپنی شکایت کے مداوے کے لیے اظہارِ مدعا کر سکے۔ انتظامی طور پر اس بات کو بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جس زبان میں خط لکھا گیا ہے اسی میں جواب بھی ملے۔ ان حقوق کا پورا احترام ہونا چاہیے۔

۳۲۔ ہندی بولی ریاستوں میں ہر سطح کے انتظام سے متعلق لوگوں کے لیے اردو جاننا لازمی قرار دیا جائے

۳۳۔ حکام کو مقامی اقلیتی زبان سے واقفیت ہونی چاہیے۔ ریاست کی کم از کم ایک اقلیتی زبان سیکھنے کے لیے حکام کو ترغیب دی جائے بالخصوص ہندی بولی ریاستوں میں افسران کو اردو جاننی

چاہیے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانیں جاننے والوں کو مناسب طور سے نوازا جائے

۳۴ بہت سی ریاستوں میں اردو ٹائپسٹوں کی تربیت کا انتظام مفقود ہے۔ یہ ریاستیں اردو ٹائپ اور اسٹینوگرافی مختصر نویسی کے مراکز یا تو خود قائم کریں یا ایسے مراکز کو مدد دیں۔ اس تجویز سے متعلق یہ امر بھی ہے کہ ملک میں اردو ٹائپ مشینوں کی کمی ہے۔ اس کمی پر قابو پانے کے لیے اردو ٹائپ مشینوں کی درآمد کے لیے لائسنس فراخ دلی سے دیے جائیں اور ایسی ٹائپ مشینیں ملک میں بنانے کے سوال پر بھی غور کیا جائے۔

۳۵ ریاستی ملازمتوں کے امیدواروں کو اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ شیڈول ہشتم میں شامل زبانوں میں متعلقہ امتحان دے سکیں

۳۶۔ جس ریاست یا ضلع میں کل آبادی کا دس فی صدی یا اس سے زیادہ مقامی سرکاری زبان کے علاوہ کوئی اور زبان استعمال کرتا ہو، اس اقلیتی زبان کو ریاستی یا ضلعی ملازمتوں کے امتحان کے لیے تسلیم کیا جانا چاہیے۔

۳۷۔ ریاست کی سرکاری زبان سے عدم واقفیت کو ریاستی ملازمت میں داخل ہونے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے بلکہ ایسے امیدوار جو سرکاری زبان نہ جانتے ہوں، ملازمت میں آنے کے بعد سرکاری شعبہ جاتی امتحان پاس کریں

۳۸ وزارتِ قانون و انصاف قوانین وغیرہ کا اردو میں جلد از جلد ترجمہ کر لے۔ حکومت جموں و کشمیر نے جو ادارہ اس مقصد سے قائم کیا

ہے ان کے ذریعہ یہ کام بھی ہو سکتا ہے ضرورت ہو تو اس کام کے لیے ضروری روپیہ فراہم کیا جائے۔

۳۹۔ ضلعی اور تحصیلی سطح پر یہ انتظام ہو کہ عدالتوں میں جو دستاویزات اردو میں داخل ہوں ان کا مقامی سرکاری زبان میں ترجمہ ہو جائے اور اس ترجمہ کا مالی بوجھ فریق متعلقہ کے بجائے سرکاری طور پر برداشت کیا جائے۔

۴۰۔ بعض ریاستوں میں اردو میں لکھی ہوئی پرانی دستاویزوں کی نقلیں ہندی میں مہیا کی جا رہی ہیں۔ ایسی نقول اس رسم خط میں مہیا کی جانی چاہییں جس میں وہ اصلاً لکھی گئی ہوں۔

۴۱۔ قانون ساز اداروں میں اردو کے استعمال اور ان سے متعلق ایجنڈے اور دوسرے کاغذات کی اردو میں اشاعت کے سوال پر مرکزی حکومت وزرائے اعلیٰ اور اسپیکروں سے بات چیت کرے۔

۴۲۔ ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد دس فیصدی یا اس سے زیادہ ہو انتخابی فہرستیں اردو میں شائع کی جائیں۔

۴۳۔ بعض ریاستوں میں عدالتی نوٹس اردو اخباروں میں ہندی رسم الخط میں شائع ہوتے ہیں۔ ایسے نوٹس اردو رسم الخط میں شائع کیے جائیں۔

۴۴۔ ڈاک اور تار کے فارم بشمول منی آرڈر فارم اردو میں بڑی تعداد میں شائع کیے جائیں اور ان علاقوں میں فراہم کیے جائیں جہاں کی آبادی دس فیصدی یا اس سے زیادہ اردو بولنے والی ہو۔

۴۵۔ لسانی اقلیتوں کے اجتماعی مرکزوں کے لیے اطلاعات کے ترجمہ کا جو اصول وزارت داخلہ نے بنایا ہے اور دس فی صدی آبادی کے معیار کی جیسی سفارش کیٹی نے کی ہے۔ اس کے مطابق ڈاک و تار کے محکمہ کو بھی عوامی اطلاعات اردو میں مہیا کرنی چاہییں۔

۴۶۔ آندھرا پردیش، بہار، ہماچل پردیش، ہریانہ، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، راجستھان اور مرکزی علاقے دہلی میں ریلوے اسٹیشنوں کے نام اردو میں لکھے جائیں۔

۴۷۔ اگر کوئی ریلوے اسٹیشن ایسے علاقے میں واقع ہو جہاں دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ اردو بولنے والے ہوں تو کرایہ روانگی اور پہنچنے کے اسٹیشنوں کے نام بھی اردو میں چھاپے جائیں۔ دوسری درج فہرست اقلیتی زبانوں کے سلسلے میں بھی ایسا ہی کیا جانا چاہیے۔

۴۸۔ خاص علاقوں میں جن میں طبیاتی علاقے بھی شامل ہیں، سرکاری دفتروں، ڈاکٹروں اور افسروں کے نام کی تختیوں، عمارتوں، اسپتالوں، فیکٹریوں، بس اڈوں، میل پتھروں، بس کے ٹکٹوں، گاڑیوں وغیرہ کے نام اردو میں لکھے جانے کے سوال پر ہمدردی سے غور کرنا چاہیے۔ کمیٹی اس سلسلہ میں کوئی ہمہ گیر سفارش نہیں کرنا چاہتی

۴۹۔ مقامی [illegible]

رکھتے ہوئے جالندھر۔ لکھنؤ۔ پٹنہ۔ شملہ۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ ناگپور۔ رانچی۔ رامپور۔ بنگلور۔ دھارواڑ اور متھرا کے آل انڈیا ریڈیو کی نشریات کے وقت اور تواتر میں اضافہ ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اردو داں ضروری اسٹاف جیسے اردو پروڈیوسر وغیرہ کا تقرر ہونا چاہیے۔

۵۰. اردو نشریات میں جو غیر ضروری مرصع زبان ہوتی ہے۔ اس کے پیش نظر ماہرین کی ایک کمیٹی بنی چاہیے جس میں ماہر لسانیات بھی شامل ہوں، وقتاً فوقتاً نشریات میں مستعمل زبان کا جائزہ لے اور بہتری کی تجاویز پیش کرے۔

۵۱. اردو کے ریڈیو پروگراموں میں زیادہ ندرت ہوتی چاہیے۔ ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسیوں کے تیوہاروں سے متعلق معلومات اور پروگراموں میں شامل ہونی چاہیں۔

۵۲. ڈراموں اور فیچروں کے قومی پروگراموں میں اردو ڈراموں کو مناسب مقام ملنا چاہیے۔

۵۳. عورتوں، بچوں، نوجوانوں، مزدوروں اور کسانوں کے پروگراموں میں اردو کا زیادہ استعمال ہونا چاہیے۔

۵۴. پرانے مشاعروں کے بار بار نشر کرنے سے اجتناب کیا جائے۔ اس کے علاوہ اہم علاقائی مرکزوں میں پرائیوٹ تنظیمیں جو مشاعرے کرتی ہیں ان کو ریکارڈ کر کے دوسرے علاقوں میں نشر کیا جائے۔

۵۵. شاعر اپنی تخلیق پیش کرنے کے لیے یا ادیب کوئی ادبی مباحثہ میں حصہ لینے کے لیے ٹیلیویژن پر آئے تو اس کا نام اردو میں نشر کیا جانا چاہیے۔

۵۶. پریس انفارمیشن بیورو کی طرف سے اردو پرچوں کو جو مواد مہیا کیا جائے وہ صرف مسلمانوں کی دلچسپی تک محدود نہ ہو۔ ایسی چیزیں سیکولر اور ترقی پسندانہ تصورات پر مبنی ہونی چاہیں۔ بیورو کو چاہیے کہ وہ اردو کے کاموں کے ترجمہ کو خیرباد کہہ دے اور اصلاً اردو میں مواد تیار کرلے۔ اس مقصد کے لیے نئے عملہ کا تقرر بھی حق بجانب ہوگا۔

۵۷. ہندوستانی اور غیر ملکی پریس میں خارجہ معاملات پر جو مواد شائع ہوتا ہے اس کے تراجم پریس انفارمیشن بیورو اردو اخبارات کو فراہم کرے۔

۵۸. پبلی کیشن ڈویژن ایک ایسا اردو رسالہ نکالے جس میں وہ اطلاعات یکجا ہوں جو مختلف وزارتوں سے شائع ہونے والے مختلف رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔ رسالہ یوجنا اردو میں بھی شائع ہو

۵۹. پبلی کیشن ڈویژن تحریک آزادی میں حصہ لینے والے اردو ادیبوں، شاعروں کے بارے میں اردو میں ایک کتاب شائع کرے

۶۰. حکومت کی طرف سے شائع ہونے والی اردو مطبوعات کی تقسیم کے نظام کو بہتر بنایا جائے

۶۱. فلم ڈویژن ایسی فلموں کی تخلیق کی حوصلہ افزائی کرے جو سادہ زبان میں ایسے موضوعات پر ہوں جن میں اردو والوں کو دلچسپی ہو۔

۶۲. جن ریاستوں میں اردو بولنے والی آبادی کافی تعداد میں ہو۔ وہاں ریاستی گزٹ اردو میں شائع کیا جائے

۶۳. لسانی اقلیتوں کے لیے جو تحفظات طے

بچوں کے سامنے دوسروں کی برائی

نزہت ملت
لکھنؤ

بچوں کے سامنے برائی ہرگز مت کیجیے کیونکہ بچے ہر بات کا اثر بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ناپختہ ذہنوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

پچھلے دنوں ایک گھر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈرائنگ روم میں کچھ سردی محسوس ہوئی۔ ہیٹر جلانے سے میں نے منع کیا۔ لہٰذا انھوں نے صحن میں کرسیاں نکلوالیں۔ ہم لوگ دھوپ میں بیٹھ گئے۔

ابھی کسی موضوع پر بات شروع ہی ہوئی تھی کہ ساتھ والے گھر سے ایک بڑی سی گیند آئی اور ہم لوگوں کے بالکل قریب ہی گری۔ ہم لوگ چونک گئے۔ ارے بچے کھیل رہے ہوں گے۔ گیند اچھل کر ادھر آگئی۔ کچھ دیر بعد ایک چھوٹا سا بچہ مسکراتا ہوا آیا اور کوئی بات کیے بغیر گیند اٹھا کر لے گیا ابھی اسے گئے ہوئے پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک پتھر ہم لوگوں کے قریب گرا۔ خدا کا شکر ہے کہ پتھر ہمارے سروں سے اوپر ہوتا ہوا ذرا آگے جا کر گرا اور ساتھ ہی اس گھر کی چھت سے تین چار بچوں کے ہنسنے کی آوازیں آئیں۔ خاتون خانہ بولیں "کیا بتاؤں ان لوگوں نے کھانا پینا حرام کر رکھا ہے۔" "کیوں؟" میں نے حیرانی سے دریافت کیا۔ بس کیا پوچھتی ہو۔ ہماری ہمسائی عجیب عورت ہے۔ دراصل جہالت کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس لیے مجھ سے وقتاً فوقتاً چیزیں منگواتی رہتی ہے۔ سالن سے لے کر سوئی تک غرض ہر چیز۔ مجھے دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مگر پچھلے دنوں انھوں نے سلائی مشین مانگی تھی۔

بقیہ مضمون "اردو اور سفارشات"

ہو جائیں، ان کے مکمل نفاذ کو یقینی بنانے کے لیے ریاستی حکومتیں ان افسران کا تعین کریں جو اس نفاذ کے ذمہ دار ہوں۔ یہ افسران قدرے اونچے اور نیچے درجے کے ہوں تاکہ حکومت کے مختلف محکموں اور مرکزی وزارتوں کے ساتھ موثر انداز میں تال میل قائم رکھ سکیں۔ ریاستوں میں ایسے افسران کے تقرر کا عام اعلان اخبارات اور گزٹ کے ذریعہ ہونا چاہیے۔ تاکہ افراد اور تنظیمیں ضرورت کے وقت ان سے رابطہ قائم کریں

۶۴ مرکزی وزارت داخلہ خاص طور پر لسانی اقلیتوں کے معاملات سے متعلق ایک افسر مقرر کرے۔ دوسری وزارتوں اور محکموں سے تال میل رکھنا بھی اسی کی ذمہ داری ہو۔

۶۵ سابقہ دو پیروں میں جن افسران کا ذکر ہوا ان کی مدد کے لیے ریاستوں اور وزارت داخلہ میں صیغے قائم کیے جائیں۔

(باقی آئندہ شمارہ میں)

مجھے اتفاق سے ان دنوں خود کام تھا۔ بچوں کے کپڑے سینے تھے، میں نے انکار کر دیا۔ بس وہ دن اور آج کا دن۔ ان کے بچوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ میں نے کہا۔ تو آپ ان کے والدین سے شکایت کریں۔ یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔" ارے آپ بھی کیا بات کرتی ہیں۔ یہی تو رونا ہے۔ ماں نے ان بچوں کے سامنے مجھے بُرا بھلا کہا ہوگا؟ یا اپنے شوہر سے غلط طریقے سے بچوں کے سامنے شین نہ دینے کے بارے میں بتایا ہوگا۔ بس بچے تو بچے ہوتے ہیں ناپختہ ذہن کے، کم سن۔ یہ تو ماؤں کا فرض ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے سامنے کسی کی بُرائی نہ کریں بچوں کا کیا ہے انھیں تو شغل چاہیے۔ چاہے کسی کی جان جائے۔" خاتون خانہ نے کہا۔

میں اس وقت سے یہی سوچ رہی ہوں کہ بچہ بچہ ہے۔ اس کے سامنے کبھی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس میں کسی شخص کی مذمت ہو یا بُرائی کا پہلو ہو کیوں کہ بچے بہت جلد ہی اثر لیتے ہیں۔ مجھے اس وقت اپنی ڈھائی سالہ بھانجی یاد آ رہی ہے۔ جو اپنے والدین کے ساتھ نماز پڑھتی ہے۔ بھلا اتنی چھوٹی سی بچی نماز کیا پڑھے گی۔ مگر وہ ایسا کرتی ہے کہ اپنے ابو، امی کی جانماز کے برابر کوئی کپڑا بچھا کر سر پر رومال باندھ کر وہی انداز اختیار کرتی ہے جو ابو، امی نماز کے دوران کرتے ہیں

بچوں کے سامنے جو کام کیا جائے وہی کرتے ہیں اسے ہی دہراتے ہیں۔ لہذا بچوں کے سامنے اچھی باتیں کیجیے۔ تاکہ ان کا ذہن بھی اچھا بنے۔ عزیزوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ ان کے بھائی، بیٹوں، بہنوں کے بچے ان سے دور رہتے ہیں۔ ان سے بے تکلف نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ بھی میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ بچوں کے سامنے ان کے ماں یا باپ برائیاں کرتے ہیں۔ آپ لوگ تو پھر ایک ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ رشتے ٹوٹتے نہیں مگر بچوں کا ذہن اس قدر اثر لینے والا ہوتا ہے کہ کہ ان میں نفرت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور نفرت جلد سے بڑھ کر دیوانگی اختیار کر سکتی ہے۔

بچوں کی تربیت کا مسئلہ خاصہ پیچیدہ ہے پیچیدہ اس لیے نہیں ہے کہ یہ کام مشکل ہے بلکہ اس لیے کہ بزرگوں کی عادتیں خود قابل اصلاح ہوتی ہیں۔ بزرگ اگر توجہ کریں تو اپنی اصلاح بھی کر سکتے ہیں اور بچوں کی بھی۔ ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ اپنے گھر کے بچوں سے گفتگو میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ جب بچہ کوئی سوال کرتا تو اس کو خود توجہ سے سنتے اور دوسروں کو توجہ سے سننے کے لیے کہتے اور اس کا جواب دیتے۔ وہ کہتے تھے کہ بچہ جب سوال کرے اور آپ اس کی طرف متوجہ نہ ہوں تو اس کو بڑا احساس ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت اتنی اہم نہیں کہ وہ بڑوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے اور وہ ایسی صلاحیت نہیں رکھتا ہے کہ جب وہ سوال کرے تو بڑے دلچسپی سے سنیں۔ وہ کہتے تھے کہ بچوں کی بات توجہ سے سنو گے اور اس کا جواب دو گے تو ان میں خود اعتمادی پیدا ہو گی اور وہ

ریسرچ اسکالر (اردو)
اے ایم یو۔

حسرت کی زندگی کے کچھ دلچسپ واقعات

مولانا حسرت موہانی کی زندگی مجموعۂ تضاد ہے۔ جس میں مختلف نشیب و فراز ملتے ہیں۔ وہ جیسے نڈر، حق گو اور بے باک تھے، ویسے ہی آلامِ حیات پر مسکرانے بلکہ قہقہہ لگانے کی بھی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کے بعض واقعات جو ہمیں مختلف مضامین سے دستیاب ہوئے ہیں۔ یا بزرگوں کی زبانی ہم تک پہونچے ہیں۔ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں اگرچہ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں لیکن ان سے لوگوں کو حسرت کی شخصیت کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

۱۔ میں اپنی مرضی سے جیل نہیں جاؤں گا:

حسرت کا جذبۂ انقلاب اتنا مکمل تھا کہ وہ جیل جانا "سکا ئرتا" سمجھتے تھے۔ وہ حریت کے نشہ میں سرشار رہتے تھے۔ وہ برٹش سامراج کی غلامی سے نجات حاصل کرنے اور دنیا کے غریبوں کی سلطانی قائم کرنے کے لیے اسلامی خلافت، جدید جمہوریت اور اشتراکیت کے بنیادی اصولوں کو اپنا رہنما سمجھتے تھے۔ وہ گاندھی جی کی تحریک ستیہ گرہ کو نہیں مانتے تھے۔ وہ باپو کے رام راج کو بھی ملک کی آزادی کے منافی سمجھتے تھے۔ حسرت سماجی خوش حالی کے لیے سائنسی سوشلزم پر ایمان رکھتے تھے۔ وہ جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کے مخالف تھے۔

حسرت اپنی مرضی سے کبھی جیل نہیں گئے۔ برٹش سرکار کو جب کبھی مولانا کی پیشی مطلوب ہوتی، چار پولیس کہار ان کو لینے کے لیے بھیجے جاتے جو مولانا کو اسٹریچر یا چارپائی سمیت کاندھوں پر اٹھا کر لے جاتے تھے۔

بقیہ مضمون "بچوں کے سامنے دوسروں کی برائی۔"

بڑے ہو کر خود اعتمادی کے ساتھ اپنے کاموں میں لگیں گے۔ ایک اور ان کی خصوصیت دیکھی۔ وہ بچوں سے پورے احترام کے ساتھ باتیں کرتے تھے۔ کبھی کسی کو "تو" یا "ابے" نہ کہتے تھے۔ ہمیشہ "آپ" کہہ کر مخاطب کرتے۔ صبح کے وقت خود السلام علیکم کہتے اور اس کا انتظار نہ کرتے کہ دوسرے پہلے سلام کریں۔ چنانچہ گھر کے سب لوگ سلام میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے اس عادت سے گھر کی فضا بہت اچھی رہتی۔ ہر سلام کرنے اور ہر سلام لینے والے کا موڈ [illegible] اچھا ہو جاتا۔

(ن۔ م۔ ل)

۲. واقعہ کباب سیخ کا:

مولانا احاطہ کمال خاں کانپور میں کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ ایک بار مولانا کی چارپائی نئی سڑک سے گزر رہی تھی۔ گرجا گھر کے قریب سیخ کباب کی مشہور دکان تھی۔ مولانا کو اس طرح جاتے دیکھ کر دکان دار نے ایک ڈش مولانا کی طرف بڑھا کر کھانے کے لیے اصرار کیا مجبور ہو کر پولیس والوں کو مولانا کی چارپائی زمین پر رکھ دینا پڑی اور کھانے کے بعد ہی وہ مولانا کی چارپائی کو دوبارہ ہاتھ لگا سکے۔

۳. غلط غلط ہے، غلط صحیح کیسے ہو جائے گا:

مولانا بہت صاف گو انسان تھے۔ وہ مصلحت کوشی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کسی کے کلام پر تنقید کرتے وقت اس کی ناراضگی کا اثر نہیں لیتے تھے۔ ایک مشہور خوش گو شاعر جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شاعروں میں بہت مقبول ہیں، اس بات پر بضد ہو گئے کہ انھوں نے جو شعر کہا ہے اس میں کوئی فنی غلطی نہیں ہے۔ مولانا بپھر گئے "واہ صاحب واہ! غلط غلط ہے۔ غلط کیسے صحیح ہو جائے گا۔"

۴ گونگا مولوی:

ایک بار مولانا کسی شاعر کے کلام پر تنقید کر رہے تھے۔ شاعر موصوف کو یہ دعویٰ تھا کہ انھوں نے کتاب میں اسی طرح پڑھا ہے۔ مولانا اپنی مخصوص آواز میں بولے "کتاب گونگا مولوی ہے۔ آپ اس سے جرح نہیں کر سکتے اس کے لیے علم مجلس اور صحبت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

۵. اپنے بچوں کو آتش بازی خرید کر دیں:

خلافت کی تحریک شباب پر تھی۔ پورا ملک انقلاب کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔ جمیعۃ العلماء کے کچھ جید علما مولانا کے پاس پہونچے اور ان سے اصرار کرنے لگے کہ وہ شب برات کے موقع پر قوم کو آتش بازی جیسے شیطانی کھیل سے باز رکھنے کے لیے بیان دیں۔ مولانا نے پہلے تو ان علماء کو بغور دیکھا۔ پھر اپنی بوسیدہ شیروانی میں ہاتھ ڈال کر کچھ پیسے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیے اور بولے۔ "یہ پیسے لیجیے اور جائیے اس کی بارود خرید کر نونہالوں کو دیجیے۔ ان کو بارود کا استعمال سکھایئے اور ان سے تھ گولے پھنکوایئے۔ برطانوی سامراج سے لڑنے کے لیے جدید لڑائی کی ٹیکنیک سے واقفیت ضروری ہے۔"

۶. مصر جانے کا واقعہ

مولانا کے نزدیک کوئی بات مشکل نہیں تھی وہ پیرانہ سالی میں بھی باحوصلہ اور سخت مصائب جھیلنے کے عادی تھے۔ ان کے لیے یورپ کا سفر اسی طرح تھا جیسے کانپور رہتے لکھنؤ کا سفر۔

مولانا کا مکان، جو پانچ روپیہ کرایہ پر تھا ایک ڈیوڑھی دالان اور چھوٹے چھوٹے تین کمروں پر مشتمل تھا۔ بیٹھک کے ایک کونے میں مولانا کا ریڈی میڈ بستر دیوار کے سہارے کھڑا رہتا تھا جس میں ایک پھٹی دری، مارکین کی میلی چادر، ایک تکیہ گولائی سے لپٹا رہتا تھا۔ جس کے بیچوں بیچ ان کی چھتری گھسی ہوتی تھی۔

ایک بار مولانا عجلت کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے اور زور زور سے بیگم کو آواز دینے لگے۔ ان کی بیگم نشاط النساء بھی بہت انقلابی عورت تھیں۔ مولانا نے ان کو خردہ سنایا "بیگم مجھے ذرا باہر جانا ہے جلدی واپس آجاؤں گا

یہ کہہ کر مولانا نے کونے میں رکھے ہوئے بستر کو بغل میں داب لیا۔ بیگم نشاط النساء ان کی عادت سے واقف تھیں۔ کیوں کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خلافت تحریک میں شانہ بہ شانہ رہتی تھیں۔ بیگم نے وضاحت چاہی تو مولانا نے بہت سادگی سے فرمایا کہ عرب ممالک کی کانفرنس کے لیے مصر سے دعوت نامہ موصول ہوا ہے اور مجھے اسی وقت جانا ہے یہ کہہ کر مولانا اپنا بستر دبائے گھر سے ناشتہ کا انتظام ہوئے بغیر نکل کھڑے ہوئے۔

۷۔ کانپور میں مزدور سبھا آفس کا قیام:

کانپور (یو۔پی) کا مانچسٹر ہے

اس شہر میں آبادی دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے ایک مل مالکان دوسرے ان ملوں میں کام کرنے والے لاکھوں مزدور جو کہ روزگار رہائش اور تعلیم کے مسائل سے دوچار تھے۔ یہ غریب مزدور حق محنت سے محروم اپنے جینے کا حق مانگتے تھے۔ مولانا کا چوں کہ کان پور سے تعلق تھا، اس لیے انھوں نے گوالٹولی میں ملوں کے درمیان علاقہ میں ۱۹۲۵ء میں مزدوروں کا پہلا دفتر قائم کیا۔ جہاں مختلف ٹریڈ یونین کے دفتر آج بھی قائم ہیں۔ مولانا نے یہ کارنامہ برطانوی سامراج کے دور میں انجام دیا تھا۔ جہاں اشتراکیت ممنوع تھی۔ مزدوروں کو اپنی ٹریڈ یونین قائم کرنے کا اختیار نہیں تھا۔

۸۔ حریت کا علمبردار

مولانا مزاجاً انقلابی تھے۔ ۱۹۱۷ء میں روس میں پہلی بار مزدوروں، کسانوں، اور انقلابی دانشوروں نے سامراجیوں اور اُن کے ایجنٹوں کا تختہ الٹ دیا۔ مولانا اس انقلاب سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ مارکس ازم کے اقتصادی اصولوں کو پسند کرتے تھے۔

برطانوی سامراج کا وجود ختم کرنے کے لیے وہ ملک اور بیرونِ ملک تحریکوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کو آزادی اور انصاف دلانے کے لیے پوری قوت سے جدوجہد میں حصہ لیتے تھے۔

۱۹۲۰ء میں وہ عرب سربراہ کانفرنس میں شریک ہوئے جہاں مولانا نے پہلی بار کھل کر برطانوی سامراج اور ان کے حاشیہ نشینوں کو بے نقاب کیا۔ برطانیہ کی سازش تھی کہ اس کانفرنس میں عرب بادشاہوں کو علاقائی حقوق دے کر عرب کی تقسیم پر آمادہ کر لیا جائے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۱

سیشن ۔ ۸۳-۱۹۸۲ء

۸۳-۱۹۸۲ء سیشن کے لیے مندرجہ کورسیز میں داخلے کے لیے مستحق اہل امیدواروں سے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ یونیورسٹی کے ایڈمیشن آفس میں مکمل طور پر پر کی ہوئی درخواستوں کے لیے وصولیابی کی آخری تاریخ ہر کورس کے آگے درج کر دی گئی ہے۔

نمبر شمار	نصاب	درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ
۱	پری یونیورسٹی (آرٹس، سوشل سائنس، سائنس اور کامرس)	۱۶ر اگست ۱۹۸۲ء
۲	الیکٹرونک انجینئرنگ میں ڈپلوما (صرف خواتین کے لیے)	"
۳	کاسٹیوم ڈیزائن اور ڈریس میکنگ (صرف خواتین کے لیے)	"
۴	آفس اسسٹنٹ شپ اور سکریٹریل پریکٹس میں ڈپلوما (صرف خواتین کے لیے)	"
۵	ڈرافٹ مین شپ میں سرٹیفکٹ (سول/میکینکل)	"
۶	اردو تدریس میں ڈپلوما	
۷	بی اے (آنرز) پارٹ I اور II (آرٹ اور سوشل سائنسز)	۱۱ر ستمبر ۱۹۸۲ء
۸	بی ایس سی (آنرز) پارٹ I اور پارٹ II	"
۹	بی کام (آنرز) پارٹ I اور پارٹ II	
۱۰	پری میڈیکل کورس	

کورسیز، فیس کی ادائیگی اور درخواستیں روانہ کرنے کے طریقہ اور ضوابط وغیرہ سے متعلق جملہ معلومات و تفصیلات ایڈمیشن گائڈ میں درج ہیں۔ داخلہ فارم اور ایڈمیشن گائڈ تین روپیہ نقد جمع کر کے یا تین روپیہ کا کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو فائنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو بھیج کر اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یونیورسٹی کے انٹرنل (داخلی) طالب علم اپنے متعلقہ ہالوں کے پرووسٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔ بذریعہ ڈاک درخواست فارم حاصل کرنے کے خواہش مند امیدوار کے لیے ۲۸×۱۲ سینٹی میٹر سائز کا لفافہ جس پر اس کا اپنا پتہ تحریر ہو اور اس پر ۹۰/۱ روپیہ کے ٹکٹ چسپاں ہوں بھیجنا ہوگا۔ جو امیدوار فارم رجسٹرڈ پوسٹ حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ لفافہ پر ۶۵/۴ روپیہ کے ٹکٹ چسپاں کریں۔

... ہر طرح سے پُر شدہ مکمل فارم مع پانچ روپے فیس (ناقابل واپسی) بذریعہ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر کے جو فائنینس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو اس طرح روانہ کریں کہ اسسٹنٹ رجسٹرار ایڈمیشن پوسٹ بکس نمبر ۲۵ اے ایم یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے پاس ہر کورس کے مقابل تحریر شدہ آخری تاریخ کو شام ۵ بجے تک لازماً پہنچ جائے۔ یونیورسٹی کے مقامی طلباء کے اپنے داخلہ فارم متعلقہ پرووسٹ کے پاس آخری تاریخ سے کم از کم دو روز قبل جمع کر دیں۔

بیرونی یونیورسٹی - بی اے (آنرز) (آرٹس، سوشل سائنس) غیر میڈیکل اور بی ایس سی (آنرز) کورسیز میں داخلہ کی خواہش مند خواتین امیدوار اپنے فارم پرنسپل ویمنس کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو راست روانہ فرمائیں جو متعلقہ تاریخ کے اندر ہی دفتر میں وصول ہو جانے چاہئیں۔

جو خواتین امیدوار ڈپلومہ برائے الیکٹرونک انجینئرنگ، ڈپلوما برائے کاسٹیوم ڈیزائن و ڈریس میکنگ اور ڈپلوما ان آفس اسسٹنٹ شپ و سکریٹریل پریکٹس میں داخلہ کی خواہش مند ہوں وہ اپنی درخواست مع فیس کے اس طرح روانہ فرمائیں کہ وہ پرنسپل ویمنس پالی ٹیکنک کے دفتر میں آخری تاریخ سے قبل وصول ہو جائے۔

نامکمل اور تاخیر سے وصول ہونے والی درخواستوں کو قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسی درخواستوں کے لیے کوئی مزید خط و کتابت نہیں کی جائے گی۔

امین موئیدین
کنٹرولر آف اگزامینیشن اینڈ ایڈمیشن

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۲

برائے جولائی ۱۹۸۲ء سیشن

مندرجہ ذیل مضامین میں ایم۔ ڈی/ ایم۔ ایس اور ڈپلوما کورسیز میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

ڈگری کورسیز

(۱) فزیالوجی۔ فارمیکولوجی۔ پیتھالوجی۔ مائیکروبیالوجی۔ پی ڈی آٹرکس۔ پریونٹو اینڈ سوشل میڈیسن۔ آبسٹٹرکس وگائنکولوجی۔ اور بایوکیمسٹری میں ایم ڈی

(۲) اناٹمی۔ جنرل سرجری۔ آرتھوپیڈک سرجری اور آفتھلولوجی میں ایم۔ایس

ڈپلوما کورسیز

آفتھلولوجی۔ آرتھوپیڈک سرجری۔ انستھیسولوجی۔ لیرنگولوجی و اوٹولوجی اور گائنکولوجی اور آبسٹٹرکس میں ڈپلوما

جو امیدوار داخلہ کے خواہش مند ہوں وہ اپنی درخواست سادہ کاغذ پر مندرجہ ذیل پروفارما میں اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ باکس نمبر ۲۰ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے پاس بیس جولائی ۱۹۸۲ء تک بھیج دیں

امیدوار کا فوٹو جو حال ہی میں لیا گیا ہو اور پاسپورٹ سائز کا ہو، درخواست پر چسپاں ہونا چاہیے۔ پانچ روپے کا ایک پوسٹل آرڈر بھی جو فائننس آفیسر، اے ایم یو کے حق میں ہو درخواست کے ساتھ آنا چاہیے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی

امیدواروں کی گزشتہ کارکردگی اور ہر شعبے میں لیے جانے والے ٹیسٹ کے نتائج کی بنا پر داخلے

داخلہ چاہنے والے سبھی امیدواروں کو چاہیے کہ وہ ٹیسٹ میں شریک ہونے کے لیے ۲ اگست ۸۲ء کو دن کے دس بجے میڈیکل کالج اے ایم یو کے متعلقہ شعبہ میں حاضر ہوں۔

درخواست کا پروفارما

۱۔ کورس کا نام

۲۔ امیدوار کا نام

۳۔ والد/شوہر کا نام

۴۔ تاریخ پیدائش

۵۔ قومیت اور اسٹیٹ

۶۔ موجودہ پتہ

۷۔ کیا (۱) سیڈولڈ کاسٹ/شیڈولڈ ٹرائب ہیں
(۲) پسماندہ طبقے کے ہیں

۸۔ اگر ملازمت میں ہوں تو ایمپلائر کا نام و پتہ

۹۔ عہدہ اور تنخواہ

۱۰۔ رجسٹریشن نمبر

۱۱ تعلیمی ریکارڈ:

برائے ایم۔بی بی ایس فرسٹ پروفیشنل، سیکنڈ پروفیشنل،
فائنل پروفیشنل پارٹ ۱
فائنل پروفیشنل پارٹ ۲

امتحان	جس سال پاس کیا	درس گاہ کا نام	کتنی بار میں پاس کیا	پوزیشن اگر ہو	ڈسٹنکشن۔ اگر ہو	میرٹ اسکالرشپ کی تفصیل۔

۱۲۔ جس مضمون میں داخلہ کے لیے درخواست دی ہے اس میں نمبروں کا فیصد

۱۳۔ پروفیشنل امتحان کے کل میزان میں ۵۰ فیصد سے اوپر حاصل شدہ نمبروں کا فیصد

۱۴۔ شائع شدہ/ریسرچ کا کام اگر کوئی ہو۔

۱۵۔ (۱) روٹیٹری انٹرن شپ اور (۲) ہاؤس جاب کی تفصیلات معہ سرٹیفکٹ

۱۶۔ امیدوار کے دستخط معہ تاریخ۔

این موئیدین
کنٹرولر آف اگزامینیشنس اینڈ ایڈمیشنس

پبلشر قاضی معزالدین احمد نے لیتھو کلر پرنٹرز میں چھپوا کر صفدر منزل تارا بنگلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا

خدا بخش لائبریری کی مطبوعات

- خدا بخش لائبریری جرنل (سہ ماہی تحقیقی مجلہ) ۱۹۷۷ء سے جاری: اب تک ۲۰ شمارے چھپ چکے ہیں۔ فی شمارہ ۱۵ روپے
- ڈسکرپٹو کیٹلاگ (خدا بخش کے عربی، فارسی مخطوطات کی توضیحی فہرست انگریزی میں) شعر فارسی، تاریخ ہند، فقہ اسلامی، قرآنیات، حدیث، تذکرہ = ۱۴ جلدیں۔ فی جلد ۲۵ روپے
- خدا بخش مخطوطات کی مجمل فہرستیں (فارسی ۳ حصے؛ عربی ۳ حصے، اردو ۱ حصہ) مجموعی قیمت ۶۵ روپے
- شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان (شاہ عالم کے عہد میں مرزا جان طپش دہلوی کی لکھی ہوئی محاورات اردو کی لغت: ۵ روپے
- تصویر محبت (شمس الدین فقیر کی فارسی مثنوی جو میر کی "شعلۂ عشق" کا ماخذ بنی) ۵ روپے
- بارھویں صدی کے شعرائے فارسی کے معاصر تذکرے: ▪ خان آرزو کا مجمع النفائس؛ ▪ نقش علی کا باغ معانی ▪ علی ابراہیم خلیل کا صحف ابراہیم: ہر ایک ۱۰ روپے
- خدا بخش خطبات: فارسی اور ہندوستان (نذیر احمد) ● میری تنقید — ایک باز دید (کلیم الدین احمد) ہر ایک ۱۰ روپے ● افکار رومی (عبد السلام خاں مکتبۂ جامعہ) ۴۰ روپے
- خدا بخش خطبات (انگریزی میں): عہد نبوی کی تقویم کی تشکیل نو (ہاشم امیر علی) ● صوفی لٹریچر عہد سلطنت میں (بروس لارنس) ● صوفیہ کے مکتوبات و ملفوظات: سماجی، سیاسی تاریخ کا ایک اہم ماخذ (سید حسن عسکری) ہر ایک ۱۰ روپے ● فارسی ادبیات میں ہندوستان کا حصہ جدید تحقیقات کی روشنی میں (امیر حسن عابدی) ● اسلام کی چودہ صدیاں پوری ہونے پر چند خیالات ہند و مسلم کے بارے میں، اور اسلام و عصر جدید (بدر الدین طیب جی) ہر ایک ۵ روپے
- خدا بخش و صلاح الدین خدا بخش — سچدانند سنہا اور جادو ناتھ سرکار کے قلم سے: ۵ روپے
- خدا بخش لائبریری: ایک تعارف (اسکاٹ او کونر کے قلم سے) ۱۰ روپے
- تاریخہائے پیدائش و وفات (شمس العلما محمد سعید حسرت عظیم آبادی م ۱۳۰۴ھ کے قلم سے) ۵ روپے
- یوپی کانگریس کے پہلے اجلاس کا خطبۂ صدارت (موتی لال نہرو) ۵ روپے
- فرہنگ آصفیہ: ایک جائزہ (قاضی عبد الودود) ۵ روپے
- رسائل کے دفینوں سے اردو ادب کی بازیافت: پہلی جلد ادیب (الہ آباد)؛ دوسری جلد العصر؛ تیسری جلد صبح امید؛ چوتھی جلد معیار: ہر ایک ۴۵ روپے
- تدوین متن کے مسائل (خدا بخش سمینار) ۱۵ روپے


بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی دوا۔
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ یو پی

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ہجری سنہ ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۲

جلد نمبر ۱ یکم اگست سنہ ۱۹۸۲ء شمارہ نمبر ۱۳

”محبت کے بے شمار درجے ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ اور افضل درجہ یہ ہے کہ تمام موجودات عالم کو ہم حقیقت کی آنکھ سے دیکھیں۔ یعنی اگر ہمیں نظر آئے کہ ایک گھاس کے تنکے کو ناحق توڑا گیا ہے تو ہمارے دل میں ایسا درد پیدا ہو کہ گویا ہمارے ہاتھ اور پاؤں کے ناخنوں میں سے ایک ناخن کاٹ ڈالا گیا ہے۔ مگر محبت کا یہ درجہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک خداوند عالم اپنی رحمت کا دروازہ کسی پر نہ کھولے۔“

سر سیدؒ

۱۶ راکتوبر سنہ ۱۸۶۳ء بمقام کلکتہ۔

ایک مدت دراز سے ہماری قوم کی ترقی مثل ایک ایسی بند جھیل کے ہو گئی تھی جس کا نہ کوئی پانی بہتا ہوا اور نہ اس میں کوئی حرکت ہوا اور نہ اس میں کسی اور طرف سے پانی آتا ہو۔ تند ہوا کے جھونکوں اور آفتاب کی گرمی سے اس کا پانی روز بروز خشک ہو جاتا ہو۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ چند سال سے اس بند پانی میں کچھ حرکت آئی ہے۔ تمام ممالک میں، کیا بنگلہ کیا ہندوستان، کیا پنجاب اور کیا دکن سب کی زبان پر سب کے قلم پر یہ بات جاری ہے کہ مسلمانوں کی حالت خراب ہے وہ روز بروز تنزل کرتے جاتے ہیں ان کو کچھ کرنا چاہیے۔ وہ لوگ صرف کہنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ کچھ کچھ کرتے بھی جاتے ہیں۔ جا بجا انجمنیں قائم ہوتی ہیں۔ اخباروں میں آرٹیکل پر آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔ مدرسہ اور اسکول بنائے ہیں۔ یہ نہایت عمدہ نشانیاں ہیں۔ جس قوم کو یہ خیال ہوا کہ ہم تنزل کی حالت میں ہیں اور اس کے ساتھ اس میں کچھ تحریک بھی پیدا ہوئی تو پہلی سیڑھی ترقی کی ہے۔ ایسی حالت میں یہ امر بھی لازمی ہے کہ ترقی کرنے والوں کے خیالات مختلف ہوتے ہیں کوئی کچھ کرنے لگتا ہے کوئی کچھ۔ اپنی قوتوں کو بجائے اس کے کہ ایک جگہ جمع کر دیں پریشان کر دیتے ہیں جو کام اصلی ہے اس کو چھوڑ دیتے ہیں اور جو اس کی فرع ہے اس کو اختیار کرتے ہیں جس کے سبب سے کسی میں بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ اس زمانہ میں یہی حال ہماری قوم کا ہے۔

مگر پانی کا خاصہ ہے کہ جب وہ بہتا ہے تو چاروں طرف پھیلتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ جو ٹھیک راستہ ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے اس لئے ہم کو اپنی قوم سے امید ہے کہ رفتہ رفتہ وہ بھی ٹھیک رستہ قومی ترقی کا پائے گی اور تمام مختلف خیالات ایک اصلی مرکز کی طرف جمع ہوں گے۔

لیکچر سر سید رح

بمقام لدھیانہ

۲۲ جنوری سنہ ۱۸۸۴ء

روزروزہ

تہذیب الاخلاق علی گڑھ

جلد نمبر ۱ — شمارہ نمبر ۱۳

یکم اگست ۱۹۸۲ء

مدیر: سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

قیمت فی پرچہ - ایک روپیہ ششماہی - ۱۱ روپے

سالانہ - ۲۰ روپیے

بیرون ہند - ایک پرچہ ایک ڈالر - سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ - مدیر مسئول - رسالہ تہذیب الاخلاق - صفدر منزل تاربنگلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
(۲۰۲۰۰۱)

اداریہ

محترم مدیر مسئول کی معروفیت کی بنا پر مدیر محض کو یہ سطور لکھنا پڑ رہی ہیں۔ اعلان کیا گیا تھا کہ یکم اگست کا شمارہ شائع نہ ہو سکے گا لیکن یہ خیال آیا کہ اس کا تسلسل ایک بار شروع ہوا تو اس کی گردان سے ہمیں کون روک سکے گا اور یہ قارئین کے ساتھ ناانصافی ہوگی چنانچہ یہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس میں کچھ صفحات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

ہمارا ارادہ تھا کہ تہذیب الاخلاق میں چند موضوعات پر سلسلہ وار مضامین لکھے جائیں افسوس ہے کہ یہ ارادہ ابھی تک پورا نہیں ہو سکا۔ امید ہنوز باقی ہے کہ یہ رسالہ اس ڈھرے پر بالآخر پڑ جائے گا جو اسے شروع کرتے وقت ملحوظ خاطر تھا۔ ایک موضوع کا آغاز اس شمارہ سے ہو رہا ہے یعنی اکابر عالم کی داستانیں۔ امید ہے کہ یہ داستانیں دلچسپی سے پڑھی جائیں گی اور ان سے ذہن، حوصلہ اور بصیرت کو تحریک ہوگی۔ ایک دوسرا سلسلہ سائنسی تحقیقات و انکشافات کا اگلے پرچے سے شروع ہوگا۔ قارئین نے ملاحظ

کیا ہوگا کہ تہذیب الاخلاق میں سائنس سے متعلق مضامین کا انعکاس برابر ہو رہا ہے یہ رنگ گہرا ہوتا جائے گا تاکہ سائنس سے دلچسپی عام ہو اور سائنسی نقطہ نگاہ کو فروغ ملے۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر سایہ علی گڑھ تحریک پروان چڑھی۔ سید احمد خاں علیہ الرحمۃ نے یہ ادارہ اسی لئے وضع کیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے جملہ مسائل پر بالعموم اور تعلیمی مسائل پر بالخصوص غور و خوض ہو سکے اور ہندوستان بھر کے اسلامی تعلیمی ادارے ایک لڑی میں پروئے جا سکیں۔ اس کانفرنس کے سالانہ اجلاس مسلمانوں کی ترقی بالخصوص ان کی تعلیمی پیش رفت میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس شمارہ میں ایسے ہی ایک اجلاس کا خطبۂ صدارت نقل کیا گیا ہے جو نواب محسن الملک مرحوم نے دیا تھا۔ قارئین کرام کی نظروں سے اس بڑے انسان کا درویشانہ انکسار مخفی نہ رہے گا۔ ایسی پُرخلوص بے تصنع خاکساری پر مٹنے کو کس کا دل نہ چاہے گا۔ پھر استدلال کی سادگی اور کارگری پر غور کیجیے۔ خطبے سے ایک بار پھر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تن آسانی، کاہلی، کارناکردگی اور نخوت جیسی ایک عرصہ سے مسلمانوں کی خو رہی ہے زوال اچانک نہیں آگیا۔

ایک سلسلہ یونیورسٹی کے اہم اداروں کے تذکرہ کا اگلے شمارہ سے شروع ہوگا پہلے مضمون کا عنوان ہوگا مولانا آزاد لائبریری۔

"تہذیب الاخلاق" شروع کرتے وقت ہم نے ان حضرات سے جنھیں مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی ہے قلمی تعاون کی درخواست کی تھی اس درخواست کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوئی۔ ہم دوبارہ ان سطور کے ذریعہ وہی استدعا کر رہے ہیں۔

ایک التماس اور!۔ قارئین کرام تہذیب الاخلاق کے متعلق اپنی رائے اور تجویزیں لکھ کر ہمیں بھیج دیں تو ہمارا کام بہت آسان ہو جائے۔

چند ماہ گذرے دارالمصنفین اعظم گڑھ نے ایک سہ روزہ سیمینار کا انعقاد کیا۔ موضوع تھا مستشرقین اور اسلام۔ اردو عربی اور انگریزی میں مقالے پڑھے گئے۔ اور تقریریں ہوئیں۔ ترجمے کا معقول انتظام تھا۔ سوال و جواب کے ذریعہ توضیحات ہوئیں۔ سیمینار میں ہندوستان، پاکستان، جاپان، انڈونیشیا، عرب ممالک کے علماء اور محققین نے شرکت کی۔ سامعین کی ایک بڑی تعداد نے مقالوں، تقریروں اور توضیحوں کو ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔

یہ اپنی نوعیت کا پہلا جلسہ تھا یہ اس بات کا غماز ہے کہ مسلمان اہل فکر مستشرقین کی ریشہ دوانیوں اور ناانصافیوں کا شکوہ کرنے کے بجائے ان کے مدلل جوابات دینے کے لئے کمر کس رہے ہیں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں۔ جگر آزما ریاضت اور عرق ریزی کا طالب ہے۔ یہ کام نہ تین دن میں ہو سکتا ہے

زمین ساں ہیں۔ اس کے لئے سالہا سال کی لگاتار
محنت درکار ہوگی۔

سمینار میں یہ احساس عام تھا کہ بیشتر مستشرقین
نے مذہبی اور نسلی تعصبات کی بنا پر مشرق کے ساتھ
انصاف نہیں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض نے کھل کر بھونڈے
انداز سے دروغ و اختراع کے ذریعہ اسلام اور
مسلمانوں پر حملے کئے۔ بعض نے زیادہ چابکدستی کے
ساتھ وار کئے۔ کچھ نے اپنی معروضیت اور انصاف
پسندی کا تاثر قائم کرنے کے لئے کتاب کے آغاز میں
اسلام اور مسلمانوں کے ان پہلوؤں کا ذکر کیا جو ان
کی نگاہ میں روشن تھے اور ستائش کرتے کرتے
خاموشی اور سرسری انداز سے کوئی ایسی بات کہہ گئے
جو آگے چل کر سم قاتل ثابت ہوئی۔

مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں اور مشرق
کی یہ خدمت ضرور انجام دی کہ بہت سی قیمتی کتابوں
اور مخطوطات کو برباد ہوتے سے بچالیا۔ ہماری کتابوں
کو ایڈٹ کیا اور منظر عام پر لائے۔ اور اسلام اور
مسلمانوں کے متعلق مختلف شعبوں میں تحقیق کا کام
کیا۔ کچھ مستشرقین ایسے بھی ہوئے ہیں جن کا ڈھنگ
واقعی منصفانہ اور معروضی تھا۔ ان کی جرأت اور دیانت
کی داد دینی چاہیے۔ لیکن ہمیں یہ توقع اہل مغرب
اور عیسائی اور یہودی اہل قلم سے نہ کرنی چاہیے کہ
وہ ہمیں اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں گے جس سے کہ ہم
خود کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے صدیاں گذریں علم اور تحقیق کے
میدان کو چھوڑا۔ اور گویا اسے مستشرقین کے حوالے
کر دیا۔ خانۂ خالی پر دیو کا قبضہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ سادہ
لوحی کی انتہا ہوگی اگر ہم خود کچھ نہ کریں اور دوسروں سے
یہ امید رکھیں کہ وہ سب کچھ کریں گے جو ہمیں کرنا
چاہیے تھا، ہمیں اسی نگاہ سے دیکھیں گے جس سے
ہم دیکھتے۔ اگر ہم تحقیق اور محنت سے جی نہ چراتے تو
یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ ستم ہے کہ ہمارے تمدن، ہماری
تہذیب، ہمارے جغرافیہ، ہماری تاریخ بلکہ ہمارے
بیشتر علوم کی صورت گری اغیار کریں۔ غور فرمایئے
مستشرقین کا ہر طرف تذکرہ ہے مستغربین کا کوئی ذکر
ہی نہیں کرتا۔ ذکر تو جبھی ہوتا جب یہ طبقہ معرض وجود
میں آیا ہوتا۔

لہٰذا کوشش اس امر کی ہونی چاہیے کہ منظم طریقہ
پر سنجیدہ اور دانشمندانہ اور غیر جذباتی انداز سے
تذکرہ تعبیر اور تفسیر کی غلطیوں کی تصحیح کی جائے۔ مستشرقین
کے اعتراضات اور اتہامات سے قطع نظر اسلام اور
تمدن اسلام پر آزاد تحقیق کے معنی خیز کام کو منصوبہ بند
طریقہ سے انجام دیا جائے اور اس بڑے کام میں مختلف
ادارے اور افراد اشتراک عمل کریں۔

دارالمصنفین کو اس سمینار کی تنظیم میں ندوۃ العلماء
کی عملی تائید اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی
رہبری حاصل تھی۔ دو بڑے اداروں کے درمیان تعاون
ایک نیک فال ہے۔ کاش اس کو اس طور سے وسیع
کیا جائے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

(جن کی موثر نمائندگی سیمینار میں ہوئی تھی) اس تحقیقی مہم
میں شریک ہو جائیں۔

سیمینار نے فیصلہ کیا کہ یہ کوشش یک وقتی نہیں
دوامی ہوگی۔ اور کام کا خاکہ بنانے اور پیش رفت کا
جائزہ لینے کے لئے دو سال میں ایک سیمینار مختلف
ممالک میں منعقد کیا جائے گا۔ سیمینار کی روداد سے ان
امور اور لائحہ عمل کی وضاحت ہوگی۔

ماضی کو چھوڑ کر حال کی جانب آئیے تو حالت
عبرتناک اور زہرہ گداز ہے۔ افغانستان اغیار کے
قبضہ میں چلا گیا اور دنیا مطمئن بیٹھی رہی مسلمانوں نے
کہیں کہیں دھیمی سی صدائے احتجاج بلند کی اور خاموش
ہو بیٹھے۔ عراق اور ایران ایک عرصہ سے برسرپیکار
ہیں اور دونوں برباد ہو رہے ہیں۔ فلسطینیوں کو
اسرائیل صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹانے
پر تلا ہوا ہے اور اپنے اور بیگانے تڑپ اٹھنے
کا کیا ذکر ہے ٹس سے مس تک نہیں ہوئے۔ بنی نوع انسان
کا ضمیر سو رہا ہے دونوں بڑی طاقتیں سفاکی
بربریت اور جارحیت کے اس مظاہرے کو جس کا
تختۂ مشق پی۔ ایل۔ او بنا ہے طمانیت کے ساتھ
دیکھ رہی ہیں۔ مسلمانوں کے لئے خصوصاً اس
بڑے سانحہ میں عبرت کا تازیانہ ہے۔ اتحاد،
محنت، جاں فشانی اور جدید علوم پر تصرف
اور جدید ترین وسائل دفاع سے لیس ہوئے بغیر
اس بے رحم دنیا میں جاں بر ہونے کا سوال ہی
نہیں اٹھتا۔

اس شمارہ کے ساتھ "تہذیب الاخلاق"
نے عمر کے چھ ماہ پورے کر لئے ہیں۔ ہم اس
موقع پر قارئین اور معاونین کا شکریہ ادا کرتے
ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ "تہذیب الاخلاق" کے
معیار کو بلند کرنے کی کوشش بارآور ہوگی۔

پروفیسر عتیق احمد صدیقی

نمودِ ہستی (مشاہیرِ عالم)

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

دنیا کی اس زندگی میں کسی فرد کو سراب کی طرح نمائش کا موقع ملے یا نہ ملے لیکن اس کی ناقابلِ اعتباری اور ناپائیداری کے باعث اس کی حیثیت ایک بلبلے سے زیادہ واقعی نظر نہیں آتی۔ زندگی کے اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی سطح پر انسان بلبلے کی طرح ابلتا ہے اور آناً فاناً غائب ہو جاتا ہے۔ ایسے کتنے بلبلے ہر روز نمودار ہوتے ہیں اور کتنے ہی ہر روز ختم ہو کر اپنے وجود کے فانی ہونے کی شہادت دیتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ کچھ اس طرح جاری ہے کہ ہم ہر روز یہ تماشا دیکھتے ہیں اور اس کا احساس بھی نہیں کرتے، لیکن اسی آنی و فانی مخلوق میں کبھی کوئی ایسا گوہرِ یکتا بھی ابھرتا ہے کہ اگرچہ وہ حیات و ممات کے اس مادی نظام کی گرفت سے نہیں بچ سکتا، لیکن اس کے نقش صفحۂ ہستی پر اس طرح ثبت ہو جاتے ہیں کہ زمانہ کے طوفان اور فنا کی آندھیاں ان کو ختم نہیں کر سکتیں۔ یہ نقش ان کارناموں سے پیدا ہوتے ہیں جو اس فردِ فرید نے اپنی محدود و مختصر سی زندگی میں انجام دیے۔ اس کا مادی وجود تو سبھی دوسرے انسانوں کی طرح ختم ہو جاتا ہے لیکن اس کے زندۂ جاوید کارنامے پکار پکار کر کہتے ہیں۔ ع

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوامِ ما

ایسے ہی افراد کے نام سے انسانیت کا شرف و افتخار باقی ہے۔ ایسے ہی افراد کا وجود انسان کے "احسن تقویم" ہونے پر شہادت دیتا ہے۔ ایسے ہی افراد سے اس چمن زارِ جہاں کی رونق قائم ہے اور ایسے ہی افراد کاروانِ حیات کے قافلہ سالار بنتے ہیں۔

مگر یہ کون لوگ ہیں! نظر دوڑائیں تو اس فہرست میں سب سے پہلے انبیاء (علیہم السلام) دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے اپنے دور میں انقلابات برپا کیے اور زمانے کے دھارے کا رُخ موڑ دیا، انسانیت کے قافلہ کو شر کی راہوں سے ہٹا کر خیر کی راہوں پر ڈالنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ ان کے علاوہ وہ عظیم فرمانروا ہیں جنہوں نے اپنی تدبیر گری سے عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں، وہ

سورما ہیں جنھوں نے دادِ شجاعت دے کر اپنی دھاک بٹھادی۔ وہ عالم ہیں، جنھوں نے اپنے علمی انکشافات سے انسانی ارتقا کے لیے شاہراہیں پیدا کیں اور قدرت کے سربستہ رازوں کو آشکار کر کے انسان کی آسودگی، قوت اور دسترس میں بے پناہ اضافہ کیا، انھیں کی بدولت ستاروں پر کمندیں ڈالنا محض شاعرانہ تخیل نہیں رہ گیا، بلکہ انسان نے واقعی ستاروں تک رسائی حاصل کر لی، وہ مصلح و مفکر ہیں جنھوں نے اپنی فکر اور جوشِ عمل سے عظیم قوموں کی تشکیل و تعمیر کی۔ وہ مدبر ہیں، جنھوں نے اپنی تدبیر سے پچھڑے اور کمزور لوگوں کو وہ قوت بخشی کہ انھوں نے ظالموں کے چنگل سے نجات پائی، وہ فن کار ہیں، جن کا فن رُخِ انسانی کا غازہ بن گیا۔ اس فہرست میں ایسے ہی اور بھی بہت سے زمروں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک تاریخ انسانی کے آسمان پر روشن ستارے کی طرح جگمگاتا نظر آتا ہے۔

یہ کیسے افراد ہیں؟ کیا ان کو کچھ غیر معمولی قوتیں حاصل تھیں جن کی بدولت وہ اپنی زندگی میں غیر معمولی کارنامے انجام دے سکے؟ دیکھیے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی عام انسانوں جیسے ہی انسان تھے۔ انبیاء کی بات جداگانہ ہے کہ وہ مامور من اللہ ہوتے ہیں اور ان کو اللہ کی طرف سے براہِ راست رہنمائی حاصل ہوتی ہے اور ان کو معجزاتی قوت بھی حاصل ہوتی ہے، حالاں کہ نبی کو بھی حکم ہوا کہ "آپ کہہ دیجیے کہ میں تم جیسا انسان ہی ہوں، بس اتنا ہی کہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے" اور وحی کا نازل ہونا انسانی کوشش کے دائرے سے باہر کی چیز ہے۔ باقی لوگ سب ہم اور آپ جیسے ہی ہوتے ہیں۔

کیا یہ سب بڑے خاندانوں اور عظیم المرتبت والدین کی اولاد تھے؟ کیا ان کو ایسے وسائل اور ذرائع میسر آئے جو دوسروں کے لیے ممکن نہیں تھے! کیا ان کو ایسے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہوئی جن کے سہارے وہ اوپر اٹھ سکے؟ ان سوالوں کا جواب بھی نفی میں ملتا ہے۔ ان افراد کی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر نے اپنی زندگی کا آغاز نہایت گم نامی کی حالت میں کیا وہ ان وسائل و ذرائع سے بھی محروم رہے جو عام آدمی کو میسر ہوتے ہیں، عسرت و افلاس کی ایسی حالتوں سے گزرے کہ انسان کا پتہ پانی ہو جائے، ایک عرصہ تک طعنہ نادارں سنتے رہے، پھر مخالفتوں کے طوفان! خدا کی پناہ! دنیا کا دستور ہی کچھ ایسا ہے کہ کسی جوہر قابل کی تابانی کا آغاز ہوتا ہے تو اس کو مخالفت اور سب و شتم کے گرد میں دبا دینا چاہتے ہیں، ان میں سے کم و بیش ہر ایک اس صورتِ حال سے دوچار ہوا، قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کیا اور ان پر قابو پایا وہ کسی بھی مشکل سے شکستہ دل نہ ہوئے، بلکہ ہر نئی

مشکل نے ان کے عزم کو اور زیادہ پختہ، ان کی ہمت کو اور زیادہ بلند کر دیا۔ قدرت نے ان کو جو صلاحیتیں دی تھیں ان کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ اٹھا رکھا اور قدرت صلاحیتیں کس کو نہیں دیتی، نہ اس کے خزانوں میں کمی ہے نہ بخل اس کا شیوہ! اس کا فیضان عام ہے خاص نہیں! مگر ہم عطیاتِ الٰہی کا بڑا حصہ ضائع کر دیتے ہیں، ان کو بروئے کار لانے کے لیے جس مسلسل عمل اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہے اس سے گریز کرتے ہیں اور یوں خود اپنے جوہرِ طبع کو بروئے کار آنے کا موقعہ نہیں دیتے۔ علامہ اقبالؒ نے ایسی ہی کیفیت کے اظہار کے لئے کہا تھا ؎

نہ بچا بچا کے تو رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

ہاں تو جن افراد نے اپنی صلاحیتوں کے استعمال میں بخل سے کام نہ لیا اور ان کا ایک ایک قطرہ کسی عظیم مقصد کے لیے صرف کر دیا، قدرت نے انھیں جو کچھ دیا، انھوں نے وہ سب کچھ اپنے ملک، اپنی قوم اور پھر عامۃ الناس کے لیے لٹا دیا، اپنے مقصد کے لیے بڑے سے بڑے خطرات مول لیے اور ناسا عد حالات کے سامنے سپر انداز ہونے کے بجائے بے جگری سے ان کا مقابلہ کیا۔ داد و تحسین اور طعن و تشنیع سے بے نیاز ہو کر اعلیٰ مقاصد کے لیے جدوجہد کرتے رہے وہی صفحۂ عالم پر ایسے نقش ثابت کر سکے جو دوام حاصل ہے۔ ماہ و سال کا چکر، موسموں کا انقلاب زمانہ کی گردش کوئی بھی اس رنگ کو دھندلا نہیں سکتا، ایسے افراد کی زندگیاں سبق آموز بھی ہیں اور ولولہ انگیز بھی، کاروانِ حیات میں ان کی حیثیت ان مشعلوں کی سی ہے جو اندھیری راہوں کو روشن رکھتی ہیں، ان کی حیثیت مینارۂ نور کی سی ہے جو رات کی تاریکیوں میں سفینوں کو راستہ دکھاتے ہیں اور اس سبب سے یہ زندگیاں متقاضی ہیں کہ گاہ گاہ ان کا مطالعہ کیا جاتا رہے تاکہ آنے والی نسلیں ان سے روشنی حاصل کرتی رہیں۔ تہذیب الاخلاق کے ان صفحات میں ایسے افراد کے سوانحی خاکے پیش کیے جاتے رہیں گے جنھوں نے کسی شعبۂ زندگی میں کارنمایاں انجام دیے اور تاریخِ انسانی کے صفحات میں ایک روشن صفحہ کا اضافہ کیا۔ ابراہام لنکن سے اس سلسلہ کا آغاز ہو رہا ہے۔

ابراہام لنکن

لنکن نے اپنی زندگی کے ابتدائی واقعات کو "غریبوں کی سادہ مختصر کہانی" سے تعبیر کیا تھا یہ بھی درست ہے کہ وہ ایک معمولی گھرانے میں ایک جھونپڑے میں پیدا ہوا تھا اور ابتدائی زندگی نہایت عسرت میں گزاری لیکن اپنی ذاتی صلاحیت اور محنت کے سہارے امریکہ کا صدر بنا [illegible]

اُس کا شمار ہوتا ہے۔

۱۲ فروری ۱۸۰۹ء کو ایک چھوٹی سی کٹیا میں رہنے والے ٹام لنکن کے گھر لڑکا تولد ہوا اور ابراہام لنکن اس کا نام رکھا گیا۔ ٹام کھیتی باڑی کرتا، شکار کھیلتا اور ضرورتاً بڑھئی کا کام بھی کر لیتا تھا۔ ٹام کو سارا کام خود ہی کرنا پڑتا۔ کم مائیگی کے باعث وہ کھیتی کے لیے غلام بھی نہیں خرید سکتا تھا اسے زراعت میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی وہ عسرت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہتا۔ اسے کئی بار قسمت آزمائی کے لیے خانہ بدوشوں کی طرح ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں بھی منتقل ہونا پڑا۔ ٹام اور اس کی بیوی میں سے کوئی بھی تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہوا تھا۔ پھر بھی ابراہام کی ماں کی خواہش تھی کہ اس کا بچہ تعلیم حاصل کرلے، لیکن باقاعدہ تعلیم کا موقع حاصل نہ ہوسکا۔ ابراہام ابھی سات برس ہی کا تھا کہ ٹام نے انڈیانا کے علاقے میں منتقل ہونے کی ٹھان لی۔ وہاں کی زمینیں تو زرخیز تھیں لیکن وہاں درختوں کی کثرت سے زندگی دشوار تھی مچھروں کی بھی کثرت تھی۔ ٹام پختہ ارادہ کا انسان تھا اُس نے وہاں رہنے کی ٹھان لی سب سے پہلا کام سر چھپانے کے لیے جگہ تیار کرنا تھا۔ چنانچہ کچھ لکڑیاں کھڑی کرکے اور ان کو گھاس پھوس سے چھپا کر ایک جھونپڑی بنائی۔ ننھے ابراہام کو بھی لکڑیاں کاٹنے میں باپ کی مدد کرنی پڑی۔ باپ کے ساتھ اس کی مشقت کا بھی دور شروع ہو گیا تھا۔ یہاں سے ابراہام نے جو کلہاڑی سنبھالی تو ۲۳ برس کی عمر تک وہ اس کا ساتھ دیتی رہی۔ اسے باپ کے ساتھ درختوں کے لٹھے کاٹنے پڑتے تھے۔ میل بھر فاصلے پر واقع چشمے سے پانی لانے کے لیے بھی دن میں کئی چکر کرنے پڑتے تھے۔ جنگلی جانوروں کے شکار میں بھی وہ باپ کے ساتھ رہتا کہ جنگلی پرندوں کے شکار اور خشک میووں یا پھلوں کے علاوہ گزر بسر کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔

ابراہام کی عمر ابھی نو سال ہی کی تھی کہ موسم کی شدت کی تاب نہ لاکر اس کی ماں کا انتقال ہو گیا وہ نہ صرف ماں کی شفقت سے محروم ہو گیا بلکہ گھر کے وہ بہت سے کام جو ماں انجام دیتی تھی وہ بھی رک گئے اور بچپن کے یہ دن کس مپرسی کے عالم میں گزرے۔ ٹام نے ایک بیوہ سے شادی کرلی۔ تو گھر ایک بار پھر جم گیا۔ سوتیلی ماں نے سلیقہ سے گھر چلایا اور بچوں کو ایسی شفقت دی کہ وہ اپنی حقیقی ماں کو بھول گئے۔

ابراہام کے بچپن کے بارے میں جو باتیں لوگوں کو یاد ہیں ان میں سے ایک تو اس کا قد جو اس کی عمر سے ہمیشہ زیادہ رہا۔ دوسرے یہ کہ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی کتاب ضرور رہتی تھی۔ اس

ذہانت کا ابھی اظہار نہیں ہوا تھا مگر قیادت کے آثار ظاہر تھے۔ اکثر وہ کسی اونچے ٹیلے پر چڑھ جاتا بچوں کو اپنے گرد جمع کرتا اور پادری صاحب کے وعظ کی نقل اتار کر سب کو محظوظ کرتا۔ وہ اپنی پڑھی ہوئی کتاب کے صفحے کے صفحے دہرا کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتا اسے سیکڑوں لطیفے یاد تھے۔ طبعاً شرمیلا ہونے کے باوجود وہ ایسے موقعوں پر بہت بے باکی کا ثبوت دیتا اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لیتا۔

باقاعدہ تعلیم کے نام پر اس نے جو کچھ حاصل کیا اس کی مدت بمشکل سال بھر ہوتی ہے جس میں اس نے چند ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اسکول آنے جانے کے لیے اسے روزانہ ۹ میل کا سفر کرنا پڑتا تھا لیکن موسم کی شدت کے باوجود وہ ذوق و شوق سے اسکول جاتا۔ لیکن اس نے جو کچھ حاصل کیا وہ اپنے ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر تھا۔ مطالعہ کے اس شوق سے اس کا باپ ناراض تھا کہ اسے زمین کی کھدائی کرنے، ہل چلانے، لکڑیاں چیرنے اور ایسے ہی دوسرے مشقت کے کاموں کی ضرورت تھی۔ ابراہام یہ سب کام بھی انجام دیتا، لیکن کتاب اس سے نہ چھوٹتی تھی۔ ہل چلانے جیسے کام کے ساتھ وہ کتاب بھی پڑھتا رہتا تھا۔ جب ذرا فرصت ملتی دوسرے لڑکے سستانے اور وہ ٹیک لگا کر کتاب کا مطالعہ کرتا۔ چنے اور کتاب پڑھتا رہتا

کتابوں اور اخباروں کے حاصل کرنے کے لیے اسے دور دور کا چکر لگانا پڑتا، لیکن اس کے دل کا تقاضا اس کو اس طرح مجبور کرتا کہ وہ یہ سب زحمت خوشی خوشی برداشت کر لیتا۔ اسے اپنے کھیتوں کے علاوہ دوسرے کھیتوں میں مزدوری کے کام بھی کرنے پڑتے تھے۔ اناج صاف کرنا، غلہ جمع کرنا، لکڑیاں چیرنا اور ڈھونا اور ایسے دوسرے کام جن میں محنت ہوتی اس کو بہت پسند تھے۔ ان میں بھی وہ دوسروں سے زیادہ کام کر کے اپنی برتری ثابت کرتا۔ نہ صرف بلکہ کام کے دوران وہ نقلیں بھی بناتا، لطیفے بھی سناتا اور اس طرح لوگوں کی تفریح کا سامان بھی مہیا کرتا۔ اپنے کھیل کود، گانے بجانے، کشتی لڑنے اور دوڑ لگانے کے شوق کو بھی وہ ایسے ہی مواقع پر پورا کر لیتا۔

سولہ سال کی عمر میں ابراہام لنکن کا قد چھ فٹ تھا اس کو کشتی رانی کا شوق ہوا کہ پانی کی لہروں پر دریا کے سینے کو چیرتے ہوئے کشتی کھینا بڑا ولولہ انگیز معلوم ہوتا تھا۔ اس نے یہ فن بھی سیکھا وہ دریائے اوہیو میں کرایہ پر کشتی چلانے کے لیے مزدور رکھ لیا گیا لیکن اس سے پہلے اسے خود کشتی بھی تیار کرنی پڑی۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ اور یہ اس کا مزاج تھا کہ کام جتنا سخت اور مشکل ہوتا اس کی ہمت اسی قدر بڑھتی۔ اس نے لکڑیاں چیر چیر کر کشتی تیار کی اور پھر اسے

کرایہ پر چلانے لگا اس کی اجرت اس کو ملتی تھی فقط ۳۰ سینٹ یومیہ۔ یہاں بھی اس نے خود کو بہت جفاکش، ایماندار اور قابلِ اعتماد ثابت کیا۔ اسی سے متاثر ہو کر ایک بڑے تاجر نے اس کو پیش کش کی کہ وہ ایک بڑی کشتی تیار کرے اور پھر اس میں سامانِ تجارت بھر کر نیو اورلینز لے جائے۔ لنکن کے لیے یہ ایک مژدۂ جانفزا تھا وہ فوراً تیار ہو گیا۔ چھوٹی کشتیاں بنانے کا اس کو تجربہ تھا، لیکن بڑی کشتی بنانے کا پہلا اتفاق تھا۔ اس نے پوری تندہی سے خود کو اس کام میں لگا دیا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس طویل سفر میں جگہ جگہ ڈاکوؤں کے گروہ موجود ہیں جو جہازوں اور کشتیوں کو لوٹ لیتے ہیں اور مقابلہ کرنے والوں کو اذیتیں دے کر مار ڈالتے ہیں لیکن اس کی ہمت، دشواریپسندی نے اس کا کوئی اثر نہ لیا اور وہ کشتی تیار کر، سامانِ تجارت لے تاجر کے بیٹے کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ لنکن کی عمر اس وقت ۱۹ سال تھی۔ دونوں دن بھر کشتی کھیتے رہتے اور رات کو باری باری سے اونگھ لیتے۔ اور پھر راستے میں ایک جگہ واقعی انھیں ڈاکوؤں نے گھیر لیا۔ دونوں نوجوانوں نے پامردی سے ان کا مقابلہ کیا اور ڈاکوؤں کے گروہ کو مار بھگایا۔ لنکن کا گٹھا ہوا جسم اور اس کی درازیٔ قد اس کے کام آئی۔ اسی لڑائی میں اس کی آنکھ کے اوپر زخم آیا جس کا نشان ساری عمر باقی رہا۔ نیو اورلینز

پہونچ کر زندگی کی جو چہل پہل، بھانت بھانت کے لوگ چھوٹی بڑی کشتیاں، بڑے بڑے دخانی جہاز لنکن نے دیکھے تو ساری کوفت دور ہو گئی۔ اور اس کے دل میں ولولہ پیدا ہوا کہ وہ کسی بڑے دخانی جہاز کا کپتان بن جائے۔ اس کے لیے اس نے کوشش بھی کی مگر ابھی وہ اکیس سال کا نہیں تھا اور یہ بات اس کے ارادے کی تکمیل میں رکاوٹ بن گئی۔

انڈیانا کی زندگی میں بھی اس خاندان کو فراغت نصیب نہیں ہوئی، مفلسی اور غربت کا وہی عالم رہا ادھر یہاں بیماری پھیلنا شروع ہوئی تو عاجز آ کر ایک بار پھر ۱۸۲۰ء میں رختِ سفر باندھا اور انڈیانا کو خیرباد کہہ کر یہ خاندان الی نوائے کو روانہ ہو گیا۔ سفر خود بڑا تکلیف دہ تھا۔ برفیلے میدانوں، جنگلوں، اور دلدلوں سے گزرتا ہوا یہ قافلہ دو ہفتے میں اپنی منزل پر پہونچ گیا اور اس غیر آباد علاقے کی آبادکاری میں مصروف ہو گیا۔ تمام نے یہاں فصل بوئی، ابراہام نے دوسرے کاموں کے ساتھ درخت کاٹ کر لٹھے چیرے تاکہ کھیت کی چار دیواری بنائی جا سکے، اپنے ہی لیے نہیں بلکہ اجرت پر دوسرے لوگوں کے لیے بھی اس نے ہزاروں لٹھے چیرے۔ پھر سردی کا موسم آیا تو ایسا غضبناک کہ ہر چیز برف میں دب کر رہ گئی۔ جنگلی جانوروں کا شکار ملنا مشکل ہو گیا لیکن اب اکیس سال کا ہو گیا تھا اور اپنے والدین سے آزاد ہو سکتا

تھا۔ چنانچہ وہ قسمت آزمائی کے لیے گھر سے روانہ ہوگیا۔ اسے ۱۲ ڈالر ماہانہ کی ایک نوکری مل گئی کہ وہ کشتی بنا کے اور سامانِ تجارت لے کر دوسرے مقامات تک لے جائے۔ ایک بار کی سخت محنت میں اس نے کشتی بنائی اور سامانِ تجارت لے کر روانہ ہوگیا۔ لیکن نیو سیلم کے پاس جا کر اس کی کشتی بند میں پھنس گئی۔ گاؤں کے لوگ کنارے سے تماشا دیکھ رہے تھے اور لنکن اپنی کشتی کو بچانے کے لیے جان توڑ کوشش کر رہا تھا۔ کشتی میں پانی بھر رہا تھا اور خدشہ تھا کہ کسی بھی وقت یہ ڈوب جائے گی۔ لیکن لنکن نے بڑی جانفشانی اور تدبیر سے اس کو بچا لیا۔ گاؤں والوں پر اس کا بڑا اثر ہوا اور لنکن کو آئندہ اس کا فائدہ ہوا۔ اسی سفر میں اس نے ایک لڑکی کو نیلام ہوتے دیکھا اس سے متاثر ہو کر اس نے دل میں عہد کر لیا کہ کبھی بھی موقع ملا تو وہ غلامی اور بردہ فروشی کا انسداد کرے گا۔

اس سفر سے واپسی پر تاجر نے اسے اپنی دکان کے لیے منشی مقرر کر دیا جو وہ نیو سیلم میں کھولنے والا تھا لنکن وہاں پہونچ گیا اور قبل اس کے کہ دکان کا مالک وہاں سامان پہونچائے اور دکان شروع ہو اس نے گھوم پھر کر قصبہ کے لوگوں سے واقفیت پیدا کرلی اور اپنی لطیفہ گوئی اور ظرافت سے لوگوں میں رسوخ حاصل کر لیا۔ دکان کھل گئی تاجر آفٹ بھی وہاں پہونچ گیا۔

بستی کے آس پاس آوارہ گرد نوجوانوں کا ایک گروہ تھا جس میں اچھے پہلوان، شہسوار، شکاری، جنگجو اور دلیر جوان تھے۔ یہ بے فکرے لوگ بات بات پر دنگا فساد کرتے۔ آفٹ کو ان سے اپنی دکان کے لیے خطرہ تھا۔ اس نے بڑی چالاکی سے یہ اعلان کر دیا کہ اس کا ملازم ابراہام ان میں سے ہر ایک کو پچھاڑ سکتا ہے۔ پانچ ڈالر کی شرط بھی رکھ دی۔ اس گروہ کے سب سے مضبوط نوجوان جیک نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ کشتی ہوئی، لنکن نے اس کو سچ مچ پچھاڑ دیا۔ یہ دیکھ کر قریب تھا کہ گروہ کے سب لوگ لنکن پر ٹوٹ پڑیں اور اس کی تکا بوٹی کر دیں کہ خود جیک نے ان کو روک دیا اور لنکن کو مردانہ وار مبارکباد دی اور ہاتھ ملایا۔

اب وہ دونوں دوست تھے اور یہ دوستی بہت پائدار ثابت ہوئی۔ لنکن نے اپنی معلومات، ذہانت اور ظرافت کے ساتھ شہسواری اور دوسرے مردانہ کرتبوں میں بھی خود کو سب سے برتر ثابت کر دیا۔ یہ سب ہوا لیکن دکان ٹھپ ہوگئی کہ اس دوران میں بھی اسے سامان کی خرید و فروخت سے زیادہ کتب بینی سے دلچسپی تھی۔ آفٹ نے دکان بند کر دی اور لنکن پھر بے کار ہوگیا۔

یہیں رہ کر اس نے کچھ ریاضی اور قواعد بھی سیکھی یہیں اس نے پہلی بار جلسوں میں تقریریں کرکے اپنی قوت تقریر کے جوہر دکھائے۔ اس نے بہت جلد تمام لوگوں کا اعتماد حاصل کر لیا جس کی بدولت اس کی مقبولیت میں

برابر اضافہ ہوتا گیا۔ اس کی شخصیت کا اپنا سکہ بستی کے لوگوں پر بیٹھا کر اسے مجلس قانون ساز کا انتخاب لڑنے پر مجبور کیا۔ اب اس کی حیثیت بستی کے لیڈر کی تھی۔ اسی دوران اس نے رضاکاروں کا ایک دستہ تیار کرکے دریائے سنگامون کے کنارے کنارے درختوں کی شاخوں کو صاف کر دیا۔ اس سے اسٹیمر کی آمدورفت میں آسانی ہوگئی اور سامان تجارت آنے لگا۔ اس سے بستی کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوئی۔ اسی زمانہ میں لنکن نے اس فوجی دستہ کی بھی قیادت کی جو مقامی قبائل کی بغاوت ختم کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ مگر وہ انتخاب میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ایسی بستی سے باہر لوگ اس سے واقف نہ تھے۔

اس نے خود اپنی دکان چلانے کی کوشش کی؛ لیکن اس کا بھی وہی حشر ہوا اور وہ مقروض بھی ہوگیا۔ بعد میں وہ کافی عرصہ تک یہ قرض ادا کرتا رہا۔ ۱۸۳۳ء میں اسے بستی کے پوسٹ ماسٹر کی جگہ مل گئی۔ اس سے اسے پانچ ڈالر ماہانہ ملتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی فائدہ تھا کہ بستی میں آنے والے سارے اخبارات وہ مفت پڑھ سکتا تھا۔ وہ ڈاک تقسیم کرتے ہوئے اخبارات پڑھتا اور دوسروں کو خبریں سناتا۔ اس سے اسے ملکی مسائل کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ یہاں اس نے ایک ملازمت کی ضرورت سے علم مساحت زمین بھی سیکھا اور پھر قانون کا بھی مطالعہ کیا۔ ۱۸۳۴ء کے انتخابات میں وہ کامیاب ہوگیا۔ اسی وقت اس نے قرض لے کر اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ایک سوٹ خریدا۔ وہ آٹھ سال تک مجلس قانون ساز کا رکن رہا۔ اس دوران اس نے وکالت بھی شروع کر دی تھی۔ مجلس میں اس کی زبردست تقریروں کی دھاک بیٹھ گئی اور اس کا حلقہ اثر بہت وسیع ہوگیا۔ اس نے اسپرنگ فیلڈ کو ریاست کا صدر مقام بنوایا تو اس کی مقبولیت میں اور اضافہ ہوگیا۔ ۱۸۳۷ء میں وہ یہیں منتقل ہوگیا اور وکالت شروع کر دی۔ اسپرنگ فیلڈ اپنی کچی سڑکوں اور نیم پختہ مکانوں کی وجہ سے اچھی خاصی گندی بستی کا نمونہ پیش کرتا تھا۔ لیکن یہاں تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ یہاں اس کی سیاسی زندگی کے ساتھ قانونی زندگی بھی خوب چمکی۔ اس نے مقدمات کی تیاری میں زیادہ غور و خوض اور محنت سے کام لیا۔ یہیں اس نے ایک تعلیم یافتہ خاندان کی خاتون میری ٹاڈ سے شادی کی۔ ۱۸۴۶ء میں وہ مرکزی ایوان نمائندگان کا رکن منتخب ہوا۔ اب اس نے واشنگٹن میں رہائش اختیار کرلی۔ یہاں اس نے غلامی اور بردہ فروشی کے انسداد کے لیے جان توڑ کوشش کی۔ امریکہ کی مختلف ریاستیں اس مسئلہ پر بٹی ہوئی تھیں۔ جنوبی ریاستوں میں غلامی کا رواج تھا اور شمالی ریاستوں میں غلامی اور بردہ فروشی ممنوع تھی۔ اس سلسلے میں دونوں علاقوں کا

روّیہ اتنا شدید تھا کہ کبھی کبھی وفاق کے ختم ہونے کا خدشہ ہونے لگتا تھا۔ اس موقعہ پر لنکن نے معتدل روّیہ اختیار کیا کہ اس مسئلہ پر وفاق کو قربان نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن غلامی کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برقرار نہیں رکھا جا سکتا تھا اور وہ خود غلامی کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اسے سخت کاوش کرنی پڑی بیچ بیچ میں ایسے بھی زمانے آئے جب وہ اپنی وکالت کی طرف توجہ نہ کر سکا اور سارا وقت محض سیاسی مصروفیت میں گزر گیا۔ اسپرنگ فیلڈ اس کا مرکز تھا۔ یہاں سے وہ ملک کے مختلف حصوں کے دورے کرتا رہا۔ اسے اپنے زبردست حریفوں کا سامنا تھا جن کی سیاسی بصیرت اور مقبولیت اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ لیکن اس نے اپنی عوام دوستی، ملک کی سچی خیر خواہی اور مدلل اور دلکش تقریروں کی بدولت اپنے حریفوں پر سبقت حاصل کی، اس کا وہ مشہور قول اسی زمانہ کی تقریروں سے ماخوذ ہے جس میں اس نے کہا تھا۔

"آپ زیادہ لوگوں کو کچھ عرصہ تک یا کچھ
لوگوں کو زیادہ عرصہ تک بے وقوف
بنا سکتے ہیں لیکن تمام لوگوں کو تمام زندگی
بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا۔"

لنکن کی قانونی مہارت نے اس وقت اس کو بڑا فائدہ پہنچایا وہ اپنی تقریروں کے ذریعہ اپنے نقطۂ نظر کو زیادہ سے زیادہ واضح اور دل نشیں انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتا تھا۔ بالآخر ۱۸۶۰ء میں وہ امریکہ کا صدر منتخب ہو گیا۔ وہ بچہ جو ایک معمولی سے جھونپڑے میں پیدا ہوا تھا، اپنی مسلسل محنت، جانفشانی اور مقصد کی سچی لگن کی بدولت امریکہ کے ایوانِ صدارت میں پہونچ گیا۔

امریکہ کی تاریخ میں یہ بڑا نازک موڑ تھا، سارا ملک خانہ جنگی کے دہانہ پر کھڑا تھا۔ لیکن لنکن طبعاً نرم دل اور صلح جو تھا۔ اس نے عہد کیا کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے ملک کو کشت و خون سے محفوظ رکھے گا، مگر اس کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ پہلے کچھ عرصہ تک ریاستوں میں آپس میں کشت و خون ہوتا رہا اور پھر ۱۸۶۳ء میں جنگ کا رخ وفاقی مرکز کی طرف مڑ گیا۔ لنکن نے اس وقت تمام غلاموں کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اس سے جنوبی ریاستوں میں مخالفت کا طوفان اور شدید ہو گیا ساتھ ہی اس کا یہ اعلان بھی گونجا۔

"ہم نے غلاموں کو آزاد کر کے تمام آزادوں
کی حریت کی ضمانت دی ہے۔"

اور یہ کہ

"تمام انسان پیدائشی طور پر یکساں حقوق
کے مالک ہیں۔"

[illegible]

کی بغاوت ختم ہوگئی۔ جنگ کے خاتمہ کی شمال وجنوب سارے ملک میں خوشی منائی گئی۔ لیکن انھیں ایام میں ایک قاتل کی گولی نے لنکن کو ہمیشہ کی نیند سلادیا۔ اور اسی کے ملکی تعمیر کے خواب ادھورے رہ گئے۔ اس طرح اس زندگی کا خاتمہ ہوا جو محض اپنے بل بوتے پر غربت، جہالت اور گمنامی کی زندگی سے نکل کر ایک ایسے رہنما کے درجہ تک پہونچا جو دنیا کے عظیم ترین رہنماؤں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

پروفیسر نسیم انصاری

اپنڈیسائٹس

اپنڈکس کی سوزش (یا التہاب) کو اپنڈی سائٹس کہتے ہیں۔ اپنڈکس دستانہ کی انگلی کی شکل کا ایک چھوٹا سا عضو ہے جس کا تعلق آنتوں کے اس حصہ سے ہے جہاں چھوٹی آنت ختم ہوتی ہے اور بڑی آنت شروع ہوتی ہے۔

بڑی اور چھوٹی آنت کی تفصیل یہ ہے کہ معدہ سے غذا آنتوں کے جس حصہ میں جاتی ہے وہ چھوٹی آنت ہے۔ اس کے ۶ میٹر کے بعد بڑی آنت شروع ہوتی ہے جس کی لمبائی چھوٹی آنت کے مقابلہ میں بہت کم یعنی صرف ڈیڑھ میٹر لیکن چوڑائی زیادہ ہوتی ہے اور اسی مناسبت سے اسے بڑی آنت کہتے ہیں۔ بڑی آنت کا وہ حصہ جو چھوٹی آنت سے ملا ہوا ہے اسے سیکم کہتے ہیں اس میں ایک طرف تو چھوٹی آنت کا منہ کھلتا ہے اور دوسری طرف بڑی آنت کی شروعات ہے۔ چھوٹی آنت کے منہ کے قریب دستانہ کی انگلی کی شکل کے ایک اور عضو کا منہ بھی سیکم میں کھلتا ہے اسی کو اپنڈکس کہتے ہیں۔

اپنڈکس عموماً چار پانچ سینٹی میٹر لمبی ہوتی ہے۔ گو اسکی لمبائی کبھی کبھی زیادہ بھی ہوتی ہے۔ اس کا قطر ایک یا ڈیڑھ سینٹی میٹر ہے یہ اندر سے کھوکھلی ہے اور اس کا منہ سیکم میں کھلتا ہے۔

اپنڈکس کی سوزش (یا التہاب) اپنڈی سائٹس ایک عام بیماری ہے اور دنیا کے ہر ملک کے رہنے والے عورتیں اور مرد اس میں مبتلا ہو سکتے ہیں بچے اور بوڑھے بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

اس بیماری میں جراثیم کے حملہ کی وجہ سے اپنڈکس میں ورم ہوجاتا ہے اور خون کی روانی بڑھنے سے یہ سرخ اور گرم ہوجاتی ہے۔ اگر مرض شدت پکڑتا ہے تو اس میں مواد پڑجاتا ہے۔ اگر اپنڈکس کا منہ کھلا ہوا ہو تو یہ مواد سیکم میں خارج ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ورم کی وجہ سے یا غذا

(باقی ص ۲۷ پر)

خطبۂ صدارت

نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں منیر نواز جنگ

اجلاس ہشتم آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

منعقدہ علی گڑھ ۱۸۹۳ء

بزرگانِ قوم و برادرانِ ملّت : جو عزت اس وقت آپ نے اس معزز اور قومی جلسے کے صدر انجمن ہونے کی مجھے بخشی ہے وہ ایک ایسی عزت ہے کہ ہر ایک نامور مسلمان اس پر فخر کر سکتا ہے۔ مجھ سا ناچیز آدمی جس قدر اس پر فخر کرے اور آپ کا شکر، وہ کم اور درحقیقت بہت کم ہے۔ مگر جب کہ میں ایک طرف اس معزز خدمت کے مشکل فرائض کو دیکھتا ہوں اور دوسری طرف اپنی ناقابلیت کو، تو چاہتا ہوں کہ اس بیچارے مومن کی طرح جسے نمازیوں نے زبردستی نماز پڑھانے کے لیے آگے کر دیا تھا اور وہ نمازیوں کو سجدہ میں چھوڑ کر سجدہ سے چل دیا۔ میں بھی موقع پاکر کھل جاؤں۔ لیکن چونکہ ایسے موقع کے ملنے کی مجھے امید نہیں ہے۔ اس لئے بڑا ہوں یا بھلا۔ آپ کے سامنے حاضر ہوا اور بہ تعمیل آپ کے حکم کے اس کرسی پر بیٹھتا ہوں۔ اگر میں اپنی اس معزز خدمت کے فرائض ادا کرنے میں قاصر رہوں تو مجھے امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے

صاحبو ! بحیثیت صدر انجمن ہونے کے اس وقت میرا پہلا فرض یہ ہے کہ آپ کا خیر مقدم کروں اور آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کروں۔ مگر میں متردد ہوں کہ آیا آپ مجھے اس کی اجازت دیں گے یا نہیں۔ اس لیے یہاں اس فرض کے ادا کرنے کے لیے آئے ہیں جو قوم کا آپ پر ہے پس ہر ایک متنفس جو یہاں ہے خود میزبان ہے اور خود مہمان، خود داعی ہے خود مدعو۔ خود شاکر ہے اور خود مشکور۔ کوئی ان میں سے اپنی قومی خدمت کا صلہ نہیں چاہتا۔ نہ کوئی اپنے اس فرض کے ادا کرنے پر کسی سے شکریہ یا اجر کا طالب ہے بلکہ ہر ایک مسلمان دل کی زبان سے کہہ رہا ہے کہ لا نرید منکم جزاءً ولا شکوراً مگر کیوں کہ اس شہر کے ہر ایک گوشہ سے آپ کے خیر مقدم کی صدا آرہی ہے اور اس قومی گھر کی ہر در و دیوار سے مبارکباد کی آواز بلند ہے۔ میرے اختیار میں نہیں ہے کہ میں ان کا ہم صفیر نہ بنوں اور آپ کو خیر مقدم نہ کہوں۔

صاحبو! جس وقت میں ان مجلسوں پر نظر کرتا ہوں جو آئے دن ہمارے یہاں ہوا کرتی ہیں تو مجھے اس مجلس کے دیکھنے سے جرأت آمیز خوشی ہوتی ہے۔ کل کی بات ہے کہ جب ہم مجلس کا نام سنتے تو بجز تہنیت یا تعزیت کی تقریب کے کسی اور طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔ نہ سوائے شخصی اغراض کے قومی مقاصد کے لئے لوگوں کے جمع ہونے کا خیال دل میں آتا۔ چند سال پہلے کسی نے سنا تھا کہ لوگ کہیں اس لئے جمع ہوئے ہوں کہ قوم کا کچھ کام کریں۔ اس کی تنزل یافتہ حالت پر متاسف ہوں اور اس کی ترقی کی تدبیر کریں۔ لیکن اب حالت دوسری ہے۔

بہت سے مسلمان ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو قوم کے لئے کام کرتے ہیں، اس کا خیال رکھتے ہیں اس کی دردناک حالت پر افسوس کرتے ہیں اس کی ترقی کے خواہش مند ہیں اور بعض ایسے بھی نظر آتے ہیں جو قوم کے اغراض کو اپنے ذاتی فوائد پر مقدم رکھتے ہیں اور بجائے نفسی نفسی کے قومی قومی پکارتے ہیں۔ جس طرح انیسویں صدی میں بہت سی چیزیں بدل گئی ہیں اس طرح ہمارے مانوس الفاظ فرض اور دعوت اور مجلس کے معنیٰ بھی بدل گئے ہیں اور بجائے ذاتیات کے ان کا طلاق قومی اغراض پر ہونے لگا۔ اب فرض سے راد ہے قوم کی بھلائی جو ہر ایک مسلمان پر بقدر اپنی طاقت کے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ دعوت کے معنیٰ ہیں کسی قومی کام کے لئے بلایا جانا اور مجلس کا مقصود ہے قوم کی بہبودی کے لئے لوگوں کا جمع ہونا۔

چنانچہ آج بہت سے نیک دل پاکیزہ خیال لوگ دور دراز مقامات سے سفر کی زحمت اٹھا کر اور اپنے کام کا ہرج کر کے یہاں آئے ہیں اس سے کوئی ذاتی فائدہ منظور نہیں۔ نہ کسی خاص شخص کی خوشی منظور ہے بلکہ صرف قومی خیال ان کو یہاں لایا ہے اور فقط اس غرض سے یہاں جمع ہوئے ہیں کہ قوم کی ترقی کی تدبیریں سوچیں، اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی تجویزیں کریں۔ اپنی متفرق اور منتشر قوم کو ایک جگہ جمع کر دیں۔ خیالات کے تبادلے سے غلطیوں کی اصلاح کریں اور باہمی صلاح و مشورہ سے قوم کی ترقی کا کوئی سیدھا راستہ نکالیں اس لئے اس مجلس کے دیکھنے سے اور شریک ہونے سے میرے دل کو ایک تعجب انگیز خوشی ہے اور یہ خوشی اس خیال سے اور بھی زیادہ ہو گئی ہے کہ آپ آج وہاں جمع ہیں جو قومی خیالات کا گھر ہے اور جہاں یہ پیارے اور ہونہار بچے ہمدردی محبت قومی تعلیم و تربیت کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں اور کانفرنس علی گڑھ کا پیارا بچہ ہے۔ اس شہر کو اس سے مادری محبت ہے۔ اس کی محبت سے امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔ آج وہ نہایت خوش ہے۔

کہ اس کا پیارا بیٹا ادھر اُدھر کی ہوا کھا تا تازہ توانا صحیح تندرست۔ اس وقت اس کی گود میں بیٹھا ہوا کھیل رہا ہے اس کی آٹھویں سالگرہ کے جشن میں اتنے دوست واحباب جمع ہیں۔

صاحبو! میری خوشی کچھ خیالی نہیں ہے بلکہ امر کا ایک خاص اور قومی سبب ہے۔ میرے نزدیک جس طرح کہ کانفرنس قومی ترقی کے لئے نہایت مفید ہے۔ ویسا ہی کانفرنس کا یہاں ہونا اس کے اغراض و مقاصد کے لئے فائدہ بخش ہے۔ اس لئے کہ اس کا اصلی مقصود ہے مسلمانوں کی ترقی اور وہ منحصر ہے اعلیٰ تعلیم پر اور یہ وہ مسئلہ ہے جس کو ہم مسلمان نہایت مشکل اور لاینحل سمجھتے ہیں اور جس کی عظمت اور وقعت ہماری ہمتوں کو توڑ دیتی ہے۔ اور جس کے اسباب جمع کرنے کا ہم ارادہ تک نہیں کرتے۔ اور اسی مسئلہ کا سمجھانا اور اسی مشکل کو آسان کرنا اور اسی کا شوق پیدا کرنا اور اسی کی ہمت دلانا ہمارا مقصود ہے اور یہ مقصود دوسری جگہ سیکڑوں رزولیشن کے پیش کرنے اور ہفتوں مباحثے کرنے اور مہینوں لکچر دینے سے بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ یہاں دو تین دن رہنے اور کالج کے ملاحظہ کرنے اور طالب علموں کی حالت دیکھنے سے حاصل ہوسکتا ہے قومی تعلیم کے مشکل مسئلہ کے معنیٰ نہایت آسانی سے یہاں سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس کی مشکلات جن کا رفع ہونا ناممکن سمجھا جاتا ہے یہاں حل شدہ دکھلائی دیتے ہیں اور قومی قوت اور قومی عزت کا نمونہ اور قومی ترقی کی تدبیر کی مجسم صورت یہاں نظر آرہی ہے۔

یعنی وہ کالج جس میں دنیوی تعلیم کے ساتھ مذہبی اور اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے۔ جہاں لڑکوں کی تربیت کا خیال اور ان کے اخلاق کی درستی کا لحاظ اور ان کے چال چلن کی نگرانی کی جاتی ہے۔ جہاں انگریزی پڑھنے والوں میں قومی ولولے اور اسلامی جذبات بھی پائے جاتے ہیں اور جہاں قومی قوت کے اجتماع اور سلف سیلپ کا عمدہ نتیجہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اس حیرت انگیز کارخانے کو دیکھ کر ممکن نہیں ہے کہ لوگوں کے دلوں میں جوش نہ آوے اور آیندہ کے لئے ہمت پیدا نہ ہو اور اپنی متفقہ کوششوں کو کام میں لانے کی رغبت۔ پس اے میرے دوستو۔ ان خیالات سے میں آپ کا یہاں جمع ہونا اور قومی ترقی کی تدبیریں یہاں بیٹھ کر کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اور یہاں آنے پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔

اے میرے دوستو! اگر صرف آپکا خیر مقدم کہہ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤں تو میں اس فرض کے ادا کرنے میں اپنے آپ کو قاصر سمجھوں، جو بحیثیت صدر انجمن ہونے کے مجھ پر ہے۔ مجھے ضرور ہے کہ میں اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی نسبت جو غلط فہمیاں اور اس کی کارروائیوں پر جو نکتہ چینیاں ہورہی ہیں ان کا کچھ تذکرہ کروں۔

صاحبو! آپ کو معلوم ہے کہ ہماری اس کانفرنس کے اغراض کی نسبت غلط فہمیاں بھی ہوئی ہیں اور اس کی کارروائی پر نکتہ چینیاں بھی کی جاتی ہیں۔ نکتہ چینی کی نسبت ہم کو تعجب نہ کرنا چاہیئے اس لئے کہ جو لوگ کوئی بڑا کام کرتے ہیں وہ معصوم نہیں ہوتے۔ نہ ان کی کارروائی کسی غلطی خطا اور نقص سے خالی ہو سکتی ہے۔ اور گو کیسی ہی لیاقت، محنت اور ایمانداری سے وہ اپنا کام کریں نکتہ چینی کا موقع ضرور باقی رہتا ہے۔ علاوہ بریں نکتہ چینی فی نفسہٖ نہایت مفید بلکہ ایک قسم کی مدد ہے۔ بشرطیکہ نیک نیتی سے کی جائے۔ ہمارا یہ مجمع خود نکتہ چینی کے لئے قائم ہے اور نکتہ چینی ہی اس کا اصل مقصود ہے تاکہ جو غلطی ایک کے خیال میں ہو وہ دوسرے کے خیال سے اصلاح پاوے۔ اے صاحبو! پھر ہماری کارروائیاں، ہماری باتیں اور ہماری تجویزیں بالکل عام ہیں اور ہر شخص کو ان پر بُری بھلی رائے ظاہر کرنے کا حق ہے۔ ہم ہر ایک بات دل سے سننے کو تیار ہیں اور ہم ہر ایک نکتہ چینی پر خیر مقدم کہنے کو تیار ہیں۔ مگر ہاں اس وقت ہم کو افسوس ہوتا ہے جب کہ ہماری کانفرنس کے اغراض و مقاصد دیدہ و دانستہ غلط بیان کئے جاتے ہیں اور بے دردی سے ان کی تضحیک کی جاتی ہے۔

صاحبو! بڑا اعتراض کانفرنس پر یہ ہے کہ کوئی عملی فائدہ اس سے قوم کو نہیں ہوا۔ میں خیال کرتا ہوں کہ کانفرنس پر یہ الزام عائد ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ تعمیل اس کی مقصود اور اس کی قدرت سے خارج ہے۔ جو لوگ کانفرنس پر یہ اعتراض کرتے ہیں۔ غالباً انھوں نے کانفرنس کے اشتہار اور پہلی سال کے رزولیشن کو بھی ملاحظہ نہیں فرمایا۔ پہلا رزولیشن جو ۱۸۸۶ء میں سید احمد خاں بہادر نے پیش کیا تھا وہ یہ تھا۔ "کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جاوے اور ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لئے مختلف اضلاع کے لوگوں کا ایک جلسہ ہوا کرے۔ اس رزولیشن کے پیش کرنے وقت سر سید احمد خاں نے فرمایا تھا کہ "گو ہم ایک قوم مسلمان کہلاتے ہیں مگر ایک جگہ کے رہنے والوں سے ایسے ہی ناواقف جیسے کہ کوئی اجنبی قوم ایک دوسرے کے حال سے ناواقف ہو۔ کوئی ذریعہ ہمارے پاس ایسا نہیں ہے کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں۔ ایک کے حال سے دوسرے کو آگہی ہو۔ ہم آپس میں مل کر اپنے خیالات جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں دوسروں پر ظاہر کر سکیں اور جو غلطی ہمارے خیال میں ہو وہ دوسروں کے خیال سے بخوبی اصلاح پاوے۔ اس مقصود کو جو کہ کانفرنس کے قائم کرنے وقت ظاہر کیا گیا تھا۔ پھر سید صاحب نے اپنے پچھلے سال کی رپورٹ میں ان لفظوں میں بیان فرمایا" کہ اس کانفرنس کا کام یہ ہے

کہ آپس میں صلاح و مشورہ سے بالاتفاق جو غیر مسلمانوں کے اس بات کو قرار دے کہ کیا امر مسلمانوں کی بھلائی اور ان کی قومی ترقی کے لئے مفید ہے اور سب پر ظاہر کرے اور ان کے فوائد کو قوم کے دل نشین کرے۔ ان کی تعمیل ہونی کانفرنس کی قدرت اور اختیار سے باہر ہے۔ یہ خود قوم کا کام ہے کہ جس تجویز کو خود انھوں نے قوم کے لئے مفید قرار دیا ہے اس کے عمل درآمد میں کوشش کریں۔ پس جس قدر افسوس ہو وہ قوم کی حالت پر ہونا لازم ہے کانفرنس تو مثل ایک دنیا دی واعظ کے قوم کی بھلائی کی باتوں کو بیان کرتی ہے۔ وہ قوم کو جتلاتی ہے۔ اس کی خراب حالت سے اس کو مطلع کرتی ہے ان پر عمل کرنا، اس کی تکمیل کے لئے کوشش کرنا، قوم یا بزرگانِ قوم پر منحصر ہے مگر کانفرنس جو کچھ کرتی ہے اس سے زیادہ کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتی" یہ بیان سید صاحب کا کانفرنس کے اغراض و مقاصد اختیار کرنے کی نسبت ایسا صاف ہے کہ اس سے ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ صرف تجویز کرنا اور تدبیر بتانا اس مجلس کا کام تھا نہ کسی تجویز کا تعمیل کرانا۔ اس پر اگر کوئی کہے کہ مجلس نے کوئی کام نہیں کیا وہ بعینہ ایسا ہے جیسا کوئی قانون بنانے والی کونسل کی نسبت کہے کہ اس نے کوئی مقدمہ فیصل نہیں کیا یا عمارت کے نقشہ بنانے والے پر یہ الزام لگاوے کہ اس نے مکان نہیں بنایا۔ یا ڈاکٹر پر یہ اعتراض کرے کہ اس نے نسخہ لکھا مگر بیمار اچھا نہ ہوا۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ مجلس کا قائم کرنا ہی بے سود اور لغو تھا تو یہ اور بات ہے۔ مگر میرے نزدیک ایسی مجلس کی نہایت ضرورت تھی۔ اس کے اغراض اور مقاصد بہت عمدہ ہیں۔ اس نے نہایت عمدگی سے اپنا کام کیا اور قوم کو بہت فائدہ پہونچایا۔ اس میں نہایت مفید رزولیوشن پیش کئے گئے۔ بہت خوبی سے اس پر بحثیں ہوئیں۔ نہایت آزادی سے رائے دی گئیں اور بے نظیر لیاقت سے تقریریں کی گئیں اور بہت سی تجویزیں قوم کو بتائی گئیں۔ اگر قوم کی حالت پیش نظر رکھ کر کانفرنس کی کارروائی پر غور کیا جاوے اور پچھلے سات برس کی روئدادیں انصاف سے دیکھی جاویں تو میرے نزدیک کانفرنس کی کارروائی نہایت اطمینان کے لائق اور اس کی کامیابی مبارکبادی کی مستحق ہے۔ ہمارے پاس کانفرنس کی بدولت اس وقت ایک اچھا رکارڈ ہے اور دفتر موجود ہے جس کا جمع ہونا بغیر کانفرنس کے ممکن نہ تھا۔ اس نے ہمارے لئے ایسا سامان اور مواد مہیا کر دیا ہے کہ اگر ہم اسے کام میں لاویں تو ہم بہت جلد ترقی کر سکتے ہیں۔ حقیقت میں کانفرنس نے قوم کے لئے راہیں تیار کر دی ہیں اور تمام مشکلات کو ان کے سامنے سے دور کر دیا ہے۔ اگر قوم اس پر چلنا شروع کر دے تو وہ آج منزل مقصود کو پہونچ سکتی ہے۔ [illegible]

قناعت کی بلکہ قوم کو چلنے کی بھی رغبت دلائی۔ غفلت
کے بُرے نتیجے اُسے بتائے۔ سست پڑے رہنے سے
جو مصیبتیں اس پر گزریں وہ ظاہر کیں۔ پیچھے رہ جانے
سے جن دردناک آفتوں میں مبتلا ہونے والی ہے اس
کا ڈر دلایا۔ بزرگوں کی کہانیاں سنا کر اس کے دل بڑھائے
گزشتہ زمانہ کی ثروت اور عزت کے قصے کہہ کر جوش
دلایا۔ تاریخی واقعات بیان کر کے قوموں کی ترقی و
تنزل کے اسباب بتائے۔ اوہام، تعصبات اور
خیالات جو سیدھی راہ پر چلنے سے مانع تھے دلوں سے
مٹائے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ کون سی تدبیر ایسی ہے جو قوم
کے جگانے اور اس کو ترقی کے راستے پر چلانے کے لیے
چاہیے تھی کہ اس نے نہیں کی۔ میرے نزدیک تو اس نے
اپنے فرائض کو بہت اچھی طرح انجام دیا اور نہ صرف وہی
کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا بلکہ اس سے بہت بڑھ کر
کیا۔ اگر ہم اور باتوں سے قطع نظر کریں اور صرف ان
نظموں اور لکچروں اور مضمونوں کو جو کانفرنس میں
پیش ہوئے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ کانفرنس کی کوششیں بے کار
نہیں گئیں اور لوگوں نے بے فائدہ محنت نہیں کی۔ میں
ان لوگوں کو نہایت بے درد اور نا منصف سمجھتا ہوں
جو ان چیزوں کو صرف شاعرانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور
اسے قوم کے حق میں مفید نہیں سمجھتے۔ میرے نزدیک وہ
لکچر جو مولانا مولوی نذیر احمد صاحب نے دیے ہیں آب زر
سے لکھنے کے لائق ہیں اور قوم کے دل کے پتھروں پر
نقش کرنے کے قابل۔ آپ یقین کیجیے گا کہ اگر یہ لکچر
یورپ اور امریکہ میں دیے جاتے اور فرض کرو کہ وہ
اس زبان کو سمجھ سکتے تو ہزاروں آدمی صرف اس کے
سننے کے لیے جمع ہوتے۔ لاکھوں روپیہ اس پر نثار
کرتے۔ اور اس سے اتنی آمدنی ہوتی کہ ہمارے محمڈن
کالج کا ایک بڑا حصہ تیار ہو جاتا۔

صاحبو! یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کانفرنس ایک مجمع
ہے صرف نو تعلیم یافتہ اور نئے خیالات رکھنے والوں کا۔
نہ اس میں علما و مشائخ شریک ہیں اور نہ امرا اور
بزرگانِ قوم اس میں شامل ہیں۔ اور اس کی تجویزیں
صرف ایک محدود اور مختصر فرقہ کی رائے ہیں نہ عام مسلمانوں
کی۔ میں اس کے جواب میں نہایت ادب سے کہتا ہوں کہ اگر
کل قوم تعلیم یافتہ ہوتی اور زمانہ کی ضرورتوں سے واقف
اور اپنی ترقی کے وسائل مہیا کرنے کے لائق تو ایسی کانفرنسوں
کی ضرورت ہی نہ ہوتی اور جب خدا کی مہربانی سے قوم کا
ایک بڑا حصہ تعلیم یافتہ ہو جائے گا تو وہ وقت ہوگا کام
کرنے کا نہ سوچنے کا۔ وہ زمانہ ہوگا ترقی کے نتیجوں کے
دیکھنے کا نہ اس کے اسباب جمع کرنے اور رغبت دلانے کا۔
وہ دن ہوں گے مبارکباد دینے کے نہ رونے اور
رلانے کے۔ وہ وقت ہوگا فصل کاٹنے اور پھل کھانے
کا نہ زمین جوتنے اور بیج بونے کا۔ ہم خود قبول کرتے
ہیں کہ یہ مجمع ہے ایسے لوگوں کا جن کے خیالات نئے ہیں
جو تعلیم اور تربیت کے اصول سمجھتے ہیں جو قومی ترقی

کی تدبیریں جانتے ہیں جن کو اپنی موجودہ حالت میں بہت کچھ اصلاح اور درستی کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ مگر کوئی مہربانی کرکے مجھے بتائے کہ دنیا کی تاریخ میں کسی قوم نے بغیر ایسے فرقہ کے ترقی کی ہے اور جب تک کوئی قوم ترقی نہ کرے ایسے خیال کے لوگ کہاں کثرت سے پائے گئے ہیں۔

صاحبو! قوم کی ترقی کا آغاز ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے کہ پہلے کوئی عالی دماغ، مستقل مزاج جس کا دل و دماغ ایسے کام کے لئے بنایا گیا ہو قوم کی اصلاح کے لئے آمادہ ہوتا ہے اور ایک ایک دو دو آدمی اس کی باتیں سمجھنے اور اس کے کہنے پر چلنے اور اس کی تائید کرنے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اس کا ایک مختصر گروہ بن جاتا ہے اور وہ لوگ اپنے خیالات پھیلانا اور اپنی جماعت کو بڑھانا شروع کرتے ہیں یہاں تک کہ ان کا اثر ساری قوم پر ہو جاتا ہے اور قوم ترقی کے درجہ پر پہونچ جاتی ہے۔ مگر صاحبو بغیر خیالات کے بدلنے اور بغیر کسی شخص پیشوا ہونے اور بغیر کسی ایک مضبوط اور متعدد لوگوں کی جماعت قائم ہونے کے۔ اگر کسی قوم کی کبھی اصلاح ہوئی ہو تو مجھے اس کی نظیر بتایئے۔ غرض کہ صاحبو جو چیز ازراہ ہماری نسبت کہی جاتی ہے ہم اس پر فخر کرتے ہیں اور کہنے والوں کا شکر۔

رہا یہ امر کہ بزرگان قوم اور علمار و مشائخ اس میں اسے میں تسلیم نہیں کرتا۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں ان کو چاہیئے کہ ذرا تکلیف گوارا کریں اور کانفرنس کی فہرست ملاحظہ فرمائیں اور ایک لحظہ کے لئے اس ہال میں تشریف لائیں اور مجھے بتائیں کہ اس سے بہتر مجمع مسلمانوں کا انھوں نے کہاں دیکھا ہے اور اس عزت اور درجہ کے مسلمان اور کسی قومی مجلس میں کہاں جمع ہوتے ہیں اور اگر فرض کیا جاوے کہ یہ مجلس بے سود اور صرف مجمع چند بگڑے خیالات کے لوگوں کا ہے تو میں نہایت ادب سے پوچھتا ہوں کہ براہ مہربانی وہ مجلس مجھے بتایئے جو مسلمانوں کے لئے مفید اور سود مند ہو اور جہاں علمار و فضلار و مشائخ اور اولیار امرار اور دولت مند مسلمانوں کی بھلائی کے لئے جمع ہوتے اور اپنے وقت عقل اور دولت کا کچھ حصہ اپنی قوم کے کام میں بھی لگاتے ہوں اور اس جگہ کا نام بتایئے جہاں ہم جاکر قوم کی ہمت اور اور اسلامی محبت اور قومی جوش کا ثبوت اور ان کی عمدہ تدبیروں اور مفید کاموں کا نمونہ دیکھیں اور قوم کی ترقی کی امید کریں۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ آپ ہماری قوم کی توجہ دنیاوی ترقی کے کاموں میں دکھایئے اس لئے کہ یہ نجس اور ناپاک چیز مسلمانوں کی توجہ کے قابل نہیں ہے الدُّنیَا جِیفَۃٌ وَطَالِبُھَا کِلَابٌ یہ کام دنیا کے کتوں کا ہے اور نیچری فرقہ کے دنیا طلب لوگوں کا۔ مسلمانوں کی شان اس سے ارفع و اعلیٰ ہے بلکہ وہ تدبیریں بتلایئے جو انھوں نے اپنے پاک اور

پیارے دین کے لئے کیں ہوں اور ان کی اس توجہ کا
ثبوت دیجئے جو انھوں نے دین کی حمایت، اور اس کی
حفاظت اور اس کی اشاعت میں کی ہو۔ مغربی علوم
پر خاک ڈالیئے، انگریزی کو کفر سمجھئے، یورپ کی طرز کے
کالج اور اسکولوں کو جانے دیجئے کہ یہ سب وہ چیزیں
ہیں جو صرف چند روزہ دنیا کے کام آنے والی ہیں اور مسلمانوں
کے اعتقادات اور خیالات کی بگاڑنے والی۔ مگر وہ
مقامات بتائیے جہاں دین اور اسلام کی حفاظت کا
انتظام کیا گیا ہو اور وہ مدرسے دکھلائیے جہاں دینی
علوم کی تعلیم دی جاتی ہو، اور ان دارالعلوم کا نشان
دیجئے جو بغداد اور قرطبہ کے نمونوں پر قائم کیے گئے
ہوں اور ان علماء کا نشان دیجئے جن کو صرف قوم کی
توجہ اور فیاضی نے بچایا اور علمی مشاغل میں مشغول رکھا
ہو۔ اور ان طالب علموں کو دکھایئے جو صرف قوم کی مدد سے
پرورش پاتے اور علم حاصل کرتے ہوں۔ مگر افسوس
صد افسوس کہ جہاں تک خیال کیا جاوے اور جس حصہ
کو ہندوستان کے دیکھا جاوے دین اور دنیا دونوں کا
یکساں حال ہے۔ اگر ہم دیکھیں کہ مسجدیں آباد ہیں،
خانقاہیں گرم ہیں، علماء و فضلاء کا گروہ بدستور
موجود ہے۔ پرانے مدارس طلباء سے بھرے ہوئے ہیں تو
ہم سمجھیں کہ صرف زہد اور تورع، دنیاوی علوم کی تحصیل
اور دنیاوی مدارس میں مدد دینے کی مانع ہے اور فقط
بندی شریعت کی، مغربی تعلیم کی مزاحم ہے اور دینی خیال

دنیاوی ترقی کا سد راہ ہے۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا
حال اس سے ہزار درجہ زیادہ برا ہے۔ دینی مدارس قوم کی بے
توجہی سے برباد ہیں۔ علماء فضلاء بھوکوں مر رہے ہیں، دینی
علوم کے تحصیل کرنے والوں کو کوئی بھیک کے ٹکڑے
نہیں دیتا اور اگر کہیں کچھ نیک دل بزرگوں نے کوئی مدرسہ
کھڑا کر دیا ہے اور چند غریب طالب علم کابل اور بخارا کے
جمع ہو گئے ہیں تو وہاں خاک اڑ رہی ہے اور قوم کی بے
خبری کا نوحہ ہو رہا ہے اور استاد و شاگرد دونوں
بھوکوں مرتے ہیں تو اسے ہم کیا سمجھیں۔ مانا کہ ہم نے مغربی
علوم کا شوق دلا کر مسلمانوں کو خراب کیا۔ مانا کہ ہم نے
انگریزی تعلیم و تربیت کے جاری کرنے سے الحاد پھیلایا،
مانا کہ ہم نے کانفرنس قائم کر کے مسلمانوں کو بہکایا۔ مگر ہم
طعنہ کرنے والے خدا کے لئے یہ بتا دیں کہ انھوں نے اپنی قوم
کے لئے کیا کیا اور اس ڈوبتی ہوئی کشتی کے بچانے میں
کون سی کوشش کی۔ اگر ہم نے مسلمانوں کے لئے دیر و کنشت
بنایا۔ مانا کہ گناہ کیا۔ مگر یہ فرمایئے کہ ان کا بنایا ہوا بیت المقدس
کہاں ہے جہاں جا کر ہم سجدہ کریں۔ اگر ہم نے اپنے بھائیوں
کے واسطے قومی کانفرنس قائم کی، ہم قبول کرتے ہیں کہ ایک
بے سود کام کیا مگر ہمارے دوست براہ مہربانی یہ فرما دیں
کہ انھوں نے قوم کے حال پر مرثیہ پڑھنے، قوم کی مصیبت
پر ماتم کرنے پر کونسی مجلس بنائی ہے کہ ہم وہیں جا کر نوحہ
کریں اور سر پیٹیں۔ اگر ہم مضر یا بے سود کام کرنے کے گنہگار
ہیں تو قوم کو مرتے دیکھنے اور کچھ نہ کرنے کا ذمہ دار کون

ہے۔

گردسرتو گشتن ومردن گناہ من
دیدن ہلاک ورحم نکردن گناہ کیست
گیرم کہ وقت ذبح طپیدن گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نکردن گناہ کیست

غرض کہ اے میرے بھائیو! یہ الزام جو ہم پر لگایا جاتا ہے اور وہ طعنہ جو ہم پر کئے جاتے ہیں نہ دینداری کے خیال سے ہیں نہ مذہب کے لحاظ سے بلکہ درحقیقت غفلت اور کاہلی کا نتیجہ ہے کہ نہ پرانے طریقوں پر قوم کے لئے کچھ کرتے ہیں نہ دینی کاموں میں اپنی مستعدی کی نشانیاں دکھاتے ہیں، نہ نئی راہ پر چلنے کے لئے ان کا قدم اٹھتا ہے نہ دوسروں کا چلنا پسند کرتے ہیں، غرض کہ نہ خود کریں اور نہ دوسروں کو کرنے دیں۔ ایسے لوگوں کی باتیں سن کر رنجیدہ ہونا اور طعن وطنز سن کر پریشان ہونا ہمت والوں کا کام نہیں ہے۔

اے میرے بھائیو! کیا آج تک کوئی بڑا کام بغیر طعنوں کی برداشت کرنے اور دل فگار باتوں کے سننے کے کہیں دنیا میں ہوا ہے۔

صاحبو! قومی ترقی اور قومی اصلاح کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ اس دنیا کے تمام کاموں میں اور سب سے زیادہ مشکل نازک اور تکلیف دہ ہے، حقیقی اصلاح اور سچی ترقی دینی اور دنیوی اصلاح اور معاش اور معاد کی فلاح یہ کام صرف پیغمبروں کا ہے مگر دنیوی اصلاح اور دنیوی ترقی بھی ایسی مشکل ہے کہ اس کے لئے بھی خدائے تعالیٰ خاص لوگوں کو پیدا کرتا ہے اور اس کے لائق ان کے دل و دماغ بناتا ہے مگر پیغمبروں یا مسلمان قوم خدا نے سب کے لئے یہ قاعدہ رکھا ہے کہ ان کی کوششوں کو منزل مقصود تک پہونچنے میں بہت سے درجے طے کرنے پڑتے ہیں۔ اوّل ان کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے اور ایک ناممکن خیال سے وہ دیوانے ٹھہرائے جاتے ہیں، پھر ان پر طعن وطنز ہوتے ہیں پھر ان پر تہمتیں کی جاتی ہیں، پھر کچھ کچھ باتیں ان کی سمجھ میں آنے لگتی ہیں اور ان کے کاموں کی عظمت اور وقعت کا خیال ہونے لگتا ہے اور آخر مفید سمجھ کر لوگ مدد دیتے ہیں اور اس کی کامیابی دیکھ کر تعجب کرتے اور خود ہی کہنے لگتے ہیں کہ پہلے ہم کیوں ایسا نہ سمجھے اور کیوں اول ہی اس کام میں شریک نہ ہوئے۔

اے میرے بھائیو! یہ وہ واقعات ہیں جو ہر ایک اصلاح کرنے والے کو پیش آتے ہیں۔ اگر آپ کی مجلس کا مقصود قومی اصلاح اور قومی ترقی ہے تو آپ کو بھی تمام درجات طے کرتے اور ان تمام دشوارگذار گھاٹیوں سے گزرنے کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔ مگر آپ بڑے خوش نصیب ہیں کہ آپ کو ایسے سکریٹری ملے جو آپ کی طرف سے سب مصیبتیں اٹھا چکے ہیں، ان کا مضحکہ اڑ چکا ان پر طعنے ہوئے وہ دیوانہ اور سودائی بن چکے، خود غرضی کا الزام ان پر لگ چکا، تہمتیں جتنی ہونی چاہئیں تھیں ان پر ہولیں۔ مسلمان ہو کر وہ کافر بھی ٹھیر چکے، ان کے

مقاصد میں غلط بیانیوں کی کوئی حد بھی نہیں رہی۔ اب
اس درجہ پر ہیں جہاں مصیبتوں کا خاتمہ ہوتا ہے اور ان کے
نتیجوں کے دیکھنے کا دور شروع ہوتا ہے اب لوگ
ان کے کاموں کی قدر کرتے ہیں۔ ان کی بات سنتے ہیں
ان کی وقعت اور عزت کرتے ہیں۔ ان کو اپنا رہنما جانتے
ہیں۔ بس اے میرے دوستو باوجود ان تمام مشکلات
کے طے ہو جانے اور آپ کو ایک ندیہ میں مل جانے کے
اگر آپ صرف چند طعن آمیز باتیں سننے سے رنجیدہ ہوں
گے اور اس مجلس کی کامیابی کی نسبت شک کرنے
لگیں گے تو مجھے تعجب ہوگا۔ آپ کو چاہیئے کہ آپ
استقلال سے کام کریں، اپنی محنتوں کی کامیابی پر
بھروسہ رکھیں کیونکہ جس قدر آپ اپنے فرائض سے
زیادہ واقف ہوں گے، جس قدر آپ میں ہمدردی کا جوش
زیادہ ہوگا، جس قدر آپ انسانیت کا زیادہ خیال
رکھیں گے، جس قدر آپ قوم کی زیادہ فکر کریں گے اور
جس قدر آپ کا زیادہ علم ہوتا جائے گا آپ اپنے آپ کو
زیادہ تکلیف میں پاویں گے اور آپ پر زیادہ مصیبتیں
نازل ہوں گی۔

بھائیو، عقل، علم اور انسانیت یہ خود مصیبت
کے اسباب ہیں اور ہر شخص کو اس دنیا سے اس قدر
تکلیف اٹھانی پڑتی ہے جس قدر اس میں عقل اور علم ہے
کاش ہم انسان نہ ہوتے تو ان مصیبتوں میں سے ایک
مصیبت بھی نہ اٹھانی پڑتی، یہ وہ امانت خدا کی ہے
جسے نہ آسمان اٹھا سکا، نہ زمین نہ پہاڑ، ہم نے نادانی
سے اٹھا لیا اور ظالم و جاہل ٹھہرے۔ إِنَّا عَرَضْنَا
الْأَمَانَةَ الخ

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

صاحبو! مجھے وہ دن یاد ہیں جب ہم غفلت کی
بہشت میں رہا کرتے تھے نہ اپنی خبر تھی نہ دوسروں کا خیال
نہ قوم سے مطلب تھا نہ مدرسے سے غرض، نہ مسلمانوں
کی دردناک صورت دکھا کر ہم کو کوئی ستاتا تھا، نہ ہائے
قوم نہ وائے قوم کی آواز ہمارے کان تک پہونچی تھی،
نہ کوئی چندہ مانگنے والا تھا نہ کانفرنس میں بلانے والا۔
بےخبری کے نشہ میں مست پڑے ہوئے کہا کرتے
تھے۔

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

اور اپنے پیشواؤں کے مشکور تھے جنہوں نے اوہام کا
سنگین پہرا علم کے درخت پر کھڑا کر دیا تھا اور ہم کو
وہاں تک جانے نہ دیتے تھے کہ اس میں ہمارے سر سید
سامنے آئے اور یہ آواز دی هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ شَجَرَةِ
الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ۔ انھوں نے ہم کو علم کا
درخت دکھلایا اور اس کے پھل کھانے کی رغبت دلائی
ان کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے بزرگ چلانے لگے کہ خبردار
ان کے پاس نہ جانا اور ان کی بات نہ سننا۔ إِنَّهُ لَكُمْ

عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔ اور چاروں طرف سے آواز آنے
لگی کہ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا
مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ مگر یہ بھی مزاج کے ایسے مستقل
اور اپنے ارادے کے ایسے مضبوط تھے کہ ترغیب
دیتے اور یہ کہتے رہے کہ تم حقارت کرو یا ملامت
زجر کرو یا توبیخ میں تو ضرور علم کا پھل اپنی قوم کو کھلاؤں
گا۔ اور بغیر اس کے کھلائے نہ مانوں گا۔ آخر انھوں
نے اپنا کہا پورا کیا اور ہم کا بہرہ علم کے درخت پر سے
اٹھا دیا اور لوگوں کو اس کا پھل کھلایا وَاَخْرَجَهُمَا
مِمَّا كَانَا فِیْهِ۔ جن لوگوں نے وہ پھل کھایا
نیکی و بدی کو پہچاننے لگے اور اس گناہ میں غفلت
اور بے خبری کی بہشت سے نکالے گئے، وہ اپنے آپ کو
دیکھ کر شرمندہ ہوتے اور اپنی عریانی چھپانے کی
فکر کرنے لگے۔ بھائیو یہ مصیبتیں کیوں ہوئیں، اگر ہم
نیکی و بدی کی تمیز کا درخت نہ دیکھتے اور اپنے بزرگ
سر سید کے کہنے سے اس کا پھل نہ کھاتے۔ ایک ان
کی بات سننے سے یہ ساری مصیبتیں گلے پڑیں۔ اب ہم ہیں
اور طرح طرح کی تکلیفیں۔ قومی ہمدردی، قومی محبت،
قومی ترقی، قومی تعلیم، قومی تربیت، قومی اصلاح اور
خدا جانے کتنے عذاب۔ گھر چھوڑنا، سفر کی مصیبتیں
اٹھانی، کانفرنس میں آنا، چندہ دینا اور پھر برا بھلا
سننا ہے

گریہ آتشیں می دانستم ؛ من آہ دل غریب می دانستم
نے نام بن گزاشتی و نہ نشاں دیگر اے عشق ترا چنیں می دانستم

مگر جب کہ ہم نے خود ان مصائب کو قبول کیا
تو اب اسے مردانہ وار برداشت کرنا چاہیئے تاکہ وہ
دوامی راحت اور لازوال خوشی ہم کو نصیب ہو جو نتیجہ
ان تکلیفوں کا اور ثمرہ ان مصیبتوں کا ہے۔ مگر صاحبو
اس کے لئے صبر اور وقت کا انتظار ضرور ہے۔ میں
ان لوگوں کو نتیجہ دیکھنے کی امید نہیں دلا سکتا جو صبر
نہیں کر سکتے اور نہ ان مایوس طبیعتوں کو پھل کھانے کی
توقع کر سکتا ہوں جو وقت کا انتظار نہیں کر سکتے
ایسے لوگ کامیابی کے مستحق نہیں ہوتے۔ زمانہ ان کی
خواہشوں سے اپنی رفتار بدل نہیں سکتا۔ قدرت کے
قانون میں ان کی بے صبری سے تبدیلی نہیں ہو سکتی۔
وقت سے پہلے کوئی بیج اپنا پھل نہیں لاتا، نہ کسی کی
بے صبری سے کھیتی قبل از وقت تیار ہو سکتی ہے۔ پس
اے بھائیو جو لوگ ہماری کانفرنس کے عملی نتائج کے
ظاہر نہ ہونے سے مایوس ہوتے اور اسے غیر مفید سمجھتے
ہیں ان کو کسی کاشتکار سے جا کر سبق لینا چاہیے تاکہ
معلوم ہو کہ صرف بیج ڈالنا پھل پانے کا مستحق نہیں کرتا۔
زمین میں بیج ڈالنے سے فصل کے تیار ہونے تک کئی درجے
طے کرنے پڑتے ہیں۔ پانی دینا، گھاس صاف کرنا (کسانوں
کی اصطلاح میں جسے نلائی کرنا کہتے ہیں) پرند اور
چرند بچانا ہوتا ہے اور ان سب باتوں کے پورا کرنے
کے لئے بہت بڑی محنت درکار ہے اور بہت کچھ صرف

کی ضرورت۔ اور سب سے بڑھ کر کھیتی کا آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہنا اور اس کے لئے خدائے ذوالجلال سے دعا کرتے رہنا۔ پھر یہ محنت اور صرف اور انتظار اتنا ہی زیادہ ہوگا جتنی کہ جنس لطیف اور عمدہ ہوگی۔ میں نے کسی کاشتکار کو نہیں دیکھا کہ وہ ان چیزوں کے تیار کرتے ہیں جو اس جسم خاکی کی غذا ہے صرف زمین میں دانے ڈالنے پر قناعت کرتا اور ان تمام ضروری باتوں سے جو کھیتی کے تیار ہونے تک مطلوب ہیں غافل ہوتا۔ اور پیش از وقت اپنی محنت کے نتیجہ پانے کی امید رکھتا ہو۔ پس اے میرے بھائیو جس شخص نے روح کی غذا تیار کرنے کا ارادہ کیا ہو اور جیسی جنس لطیف پاکیزہ اور نازک زراعت شروع کرنے کا ارادہ کیا ہو وہ بیج ڈالنے کے دوسرے دن اگر اس کے پھل کھانے کا متوقع ہو تو سوائے بوالہوسی اور دیوانگی کے اس کی امید کو آپ کیا کہیں گے۔ یہی حال ہماری اس کانفرنس کا ہے کہ چند آدمیوں نے مل کر علم کی زراعت کا ارادہ کیا انھوں نے ایک بڑے جنگل کو کاٹا، اُسے خاردار درختوں سے صاف کیا۔ اس کے ایک گوشہ کو کھیتی کے لائق بنایا اور اب اُس میں بیج ڈالا ہے۔ فصل تیار ہونے کا وقت ابھی دور ہے، تمام درجے محنت، صرف، نگرانی اور حفاظت کے ابھی باقی ہیں۔ اس پر بعض لوگ ایسے ہیں کہ زراعت کے تیار نہ ہونے کے سبب اور اپنی محنت کے پھل نہ ملنے پر مایوس ہیں۔ میرے نزدیک یہ وہ لوگ ہیں جن کو از روئے قانون قدرت کے ضرور مایوس ہونا چاہیئے اور جن کی کامیابی بموجب قواعد فطرت کے ناممکن ہے۔

عمرہا باید کہ تا یک پنبہ دانہ ز آب و گل
شاہدے را حُلّہ بخشد یا شہیدے را کفن
روزہا باید کہ تا یک مشت پشم از پشت میش
زاہدے را خرقہ گردد یا حمارے را رسن

اے میرے بھائیو! ابھی ہم لوگ نہایت نازک حالت میں ہیں اور ہمارا زمانہ نہایت خطرناک ہے ہم امید اور یاس کے بیچ میں جھول رہے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ قوم کے خیالات میں کچھ تغیر ہوگیا ہے وہ بھی اپنی حالت سے واقف اور اس پر متاسف ہے اور سب کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ موجودہ حالت دردناک ہے اور اس کا بدلنا قوم کی زندگی کے لئے ضرور ہے تو ہم کو بہت کچھ امید ہوتی ہے اور پھر جب ہم ایسے گروہ کو دیکھتے ہیں جو قوم کی ترقی میں سرگرم ہے اور اس کی اصلاح اور بہبودی کی فکریں کر رہا ہے اور ان میں ایک جوش قوم کی بھلائی کا پیدا ہوگیا ہے تو آیندہ کے لئے اور بھی دل خوش کن امیدیں نظر آتی ہیں مگر جب اس بات پر نظر جاتی ہے کہ بمقابلہ قوم کے یہ فرقہ بہت قلیل ہے اور ابھی اس میں بہت کچھ کرنا باقی ہے تو قوم کی ترقی سے ناامیدی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا

کہ ہماری قسمت میں اور کیا لکھا ہے، ہم اپنے مقصود پر کامیاب ہوں گے یا ہماری کوششیں ضائع اور رائیگاں جائیں گی۔ مگر جس راستہ پر ہم نے چلنا شروع کیا ہے وہ سیدھا راستہ ہے اور سیدھی راہ پر چلنے والا اگر برابر چلتا رہے بلاشبہ منزلِ مقصود پر پہنچتا ہے اس لئے ہم کو بھی امید ہے کہ ہم ضرور اپنے مقصد پر کامیاب ہوں گے۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْعَامِلِينَ۔

اے میرے دوستو! میں نے آپ کا بہت وقت صرف کیا اور میں نے اپنی پریشان تقریر سے آپ کو بہت پریشان کیا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھتا ہوں اور آٹھویں سال کے کانفرنس کے کھلنے کا اعلان کرتا ہوں۔

(اپنڈیسائٹس بقیہ ص ۱۴) کے کسی حصہ کے اٹک جانے سے اپنڈکس کا منہ بند ہو جائے تو مواد کے دباؤ سے اپنڈکس پھٹ سکتی ہے اور اس طرح جراثیم سارے پیٹ میں پھیل کر خطرناک صورت پیدا کر سکتے ہیں اس کو پیری ٹو نائٹس کہتے ہیں۔ اس بیماری میں پیٹ کے اندر کی جھلی پک جاتی ہے اور فاسد مادہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس سے ایک طرف تو آنتیں مفلوج ہوتی ہیں اور دوسری طرف جراثیم کا پیدا کیا ہوا زہر دورانِ خون سے سارے بدن میں پھیل سکتا ہے یہ صورت اتنی خطرناک ہے کہ اس سے موت بھی ہو سکتی ہے۔ کبھی کبھی اپنڈکس کے پھٹے بغیر بھی پیری ٹو نائٹس ہو سکتی ہے۔

بعض اوقات اپنڈکس پھٹتی نہیں ہے اس میں سوزش یا التہاب کی وجہ سے اس کے قریب کے اعضاء یعنی چھوٹی آنت اور پیٹ کی جھلی کا بنا ہوا وہ پردہ جسے انگریزی میں اومنٹم کہتے ہیں اپنڈکس سے چپک جاتا ہے اور پیٹ کے نچلے حصہ میں داہنی طرف ایک گٹھلی سی بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی اس گٹھلی میں مواد پڑ جاتا ہے اور اس طرح اپنڈکس کا پھوڑا بنتا ہے اس پھوڑے سے زہر پھیل کر جگر میں یا پیٹ کے دوسرے حصوں میں بھی مواد پیدا کر سکتا ہے علاوہ اس کے اگر اپنڈکس کا پھوڑا نہ بھی پھٹے تب بھی یہاں کے جراثیم جگر میں مواد پیدا کر کے مریض کے لئے خطرناک صورت پیدا کر سکتے ہیں۔

اپنڈیسائٹس کی علامات:۔

بیماری پیٹ کے درد سے شروع ہوتی ہے۔ یہ درد عموماً بیچ پیٹ میں شروع ہوتا ہے اور چند گھنٹوں کے بعد پیٹ کے نچلے حصے میں دائیں جانب سب سے زیادہ ہونے لگتا ہے۔

مرض کی دوسری علامات متلی ہے۔ ایک آدھ بار قے بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی قے بار بار ہوتی ہے۔ مریض کو بھوک نہیں لگتی اور عموماً اسے قبض ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی بجائے قبض کے دست آتے ہیں۔ غرض ہاضمہ کا فعل بگڑ جاتا ہے۔

حرارت بھی ہو جاتی ہے ۹۹ اور ۱۰۱ درجہ فارن ہائیٹ کے

(باقی ص ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیے)

جناب سہیل حامل

عمر کا جمال

قدرت کا قانون اٹل ہے۔ وہ اپنے تقاضے پورے کرتی ہے۔ یہ تقاضے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ جوانی کے جلو میں جمال چلتا ہے وہ ایک نئی آب وتاب، ایک دل آویز چمک دمک، ایک ہوشربا خوش قامتی اپنے ساتھ لاتی ہے، جسمانی ساخت کے جھول، زاویوں کی کمی، عدم تناسب کی باعرہ خراشی چشم زدن میں دور ہو جاتے ہیں۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

لیکن جوانی کا لایا ہوا جمال چار دن کی چاندنی کی طرح ہے جوانی کے ڈھلتے ہی چہرہ کی چمک، جسم کا گداز، اعضا کا تناسب، رگ وپے کا تناؤ، سبک موزونیت، سیمابی انداز، صباحت کی صیقل، ملاحت کی فتنہ سامانی سب اُترنے کملانے لگتی ہے۔ چالیس کی سرحد پار کی یا زیادہ سے زیادہ پچاس سے آگے بڑھے تو ساری قلعی کھل گئی۔ ایسا لگنے لگا کہ جسے ہم حسن سمجھ رہے تھے سب ملمع تھا عمر کی خراش لگی اور ملمع اتر گیا۔

لیکن ہر جگہ کچھ لوگ ایسے نظر آتے ہیں عمر جن سے خوبصورتی نہیں چھین پاتی۔ اب ان کا حسن نہ حشر سامان ہوتا ہے نہ حشر انگیز، ان کا جمال سکون وقار اور تمکین، وجاہت اور اطمینان کی تصویر ہوتا ہے اس طبقہ میں وہ لوگ بھی ہیں جن کے چہروں سے نیکی اور نور کی بارش ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ تجربہ کی بھٹی نے انھیں ہر آلائش، ہر کھوٹ سے پاک کر دیا ہے اور اب یہ خیر محض بن گئے ہیں۔ ان کے چہرے ان کے اطوار و گفتار سے ایقانِ خیر کی تائید اور ثباتِ خیر کی تجدید ہوتی ہے۔ انھیں دیکھ کر وہ بدگمانیاں جو انسانی فطرت کے متعلق تجربہ نے سمیٹی تھیں اس طرح چھٹنے لگتی ہیں جیسے سورج کی کرنوں سے اندھیرا۔ ان لوگوں کا حسن لازوال ہے سدا بہار ہے۔ عمر کا کاتب ان کے چہرے پر خستگی، فرسودگی تھکاوٹ، اضمحلال، مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے نقوش بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ہر بار مات کھاتا ہے۔ آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ کوئی پل، یا کوئی عمارت، یا کوئی سڑک، جس کے بنانے کی بار بار کوشش کی گئی لیکن ہر بار ناکام ہوئی۔ اس لئے نہ بن سکی کہ اس کے نیچے کوئی بزرگ دفن تھے۔ ہمیں اس وقت

ان روایات کی صحت یا عدم صحت سے سروکار نہیں ہے۔ اس وقت ان کا ذکر تمثیلاً کیا گیا ہے کہ بزرگی اور بھلائی شکستِ ناپذیر ہیں اور ان کے نقوش کچھ خواہ وہ ارض کے بطن میں ہوں خواہ انسان کے خدوخال پر کوئی مٹا نہیں سکتا۔

لیکن عمر کا حسن ان لوگوں کی وجاہت اور لمحات تک محدود نہیں جن کی زندگی خالق کی عبادت اور مخلوق کی خدمت، خیر کی تائید اور شر کی تردید میں گزری ہے۔

ہمیں ان لوگوں کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے — اور ان کی تعداد زیادہ ہے — جو شر سے نبرد آزما ہوئے بغیر اپنے جمال کو لیل و نہار کی دستبرد سے صاف بچا لے جاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے یا تو دنیا کو بازیچۂ اطفال سمجھا یا اپنی طمانیت پر کبھی زیادہ آنچ نہیں آنے دی اور زمانہ کے سرد گرم کو سکون اور اطمینان اور سلامت روی کے ساتھ برداشت کیا۔ انھوں نے تمازت اور حدت کو اپنے چہرے اور اپنے دل دونوں سے دور رکھا۔ ایسا کرنے میں انھیں اپنے مزاج سے مدد ملی لیکن اس میں ان کے ارادے کو برابر کا دخل رہا۔

ان ملکوں میں جہاں درجۂ حرارت افراط و تفریط کی مسافت طے کرتا رہتا ہے، آدمی گرمیوں میں تپتا ہے جھلستا ہے، جلتا ہے اور سردیوں میں ٹھٹھرتا ہے کانپتا ہے، سکڑتا ہے۔ جب لیل و نہار یہ ہوں تو پتھر کی عمارت کی طرح بدن کی عمارت بھی ٹوٹنے لگتی ہے۔ کل کی بات ہے گرمی شباب پر تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خوبصورت جامع مسجد کا فرش غروب کے بعد بھی تپ رہا تھا۔ راقم سے تپتے ہوئے فرش کی شکایت کی گئی اور مشورہ دیا گیا کہ ٹیوب ویل سے ایک نل براہِ راست مسجد میں لایا جائے تاکہ روز شام کو مسجد کے صحن کو پانی سے بھرا جا سکے۔ تجویز بظاہر معقول تھی۔ یونیورسٹی انجینئر سے رائے لی گئی تو انھوں نے بتایا کہ اس عمل سے فرش کے پتھر تڑخ جائیں گے اوپر کا حصہ سیراب ہو کر ٹھنڈا ہو جائے گا اور سکڑے گا اور نیچے کا دیر میں ٹھنڈا ہوگا۔ ایک حصہ سکڑے گا ایک گرمی کے اثر سے اسی طرح پھیلا رہے گا تو پتھر ٹوٹ جائے گا۔ یہی اثر گرمی اور سردی کے ردّ و بدل کا انسانوں کے جسم پر ہوتا ہے۔

بہرکیف ہمارے معاشرہ میں وہ لوگ بھی ہیں جن میں سرد و گرم کو جذب کرنے کی صلاحیت پتھروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے زندگی سے صلح کر رکھی ہے۔ آفاتِ ارضی و سماوی سے کسی کو مفر نہیں۔ یہ لوگ اپنی سلامت روی سے ان آفات کے فشار اور تباہی کو کم کر دیتے ہیں اور اپنی باقاعدگی اور زندگی کے انضباط اور طرزِ اعتدال

وہ ان تباہیوں اور گھبراہٹوں، حادثوں اور پریشانیوں سے بچے رہتے ہیں جن کو بیشتر انسان اپنی بے قاعدگی، لاپرواہی یا انتہا پسندی یا ہوس یا حسد کے ذریعہ دعوت دیتے ہیں۔ یہ ہوش مند لوگ جانتے ہیں کہ زندگی کے بہت سے مراحل آسانی سے سر ہو جاتے ہیں اگر انسان اچھی عادتیں اختیار کرلے۔ اس کے بعد سب کام وقت سے بغیر کسی کوشش کے خود بخود ہوتے چلے جاتے ہیں ایسی شخصیتوں کو منظم اور منضبط کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس داخلی توڑ پھوڑ سے محفوظ رہتے ہیں جس سے زیادہ تر انسانوں کو سابقہ رہتا ہے اور جو توڑ پھوڑ ان کے جسم اور خدوخال کو بھی اپنے شکنجہ میں کس لیتی ہے۔ بیماریوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انسان جب کمزور ہو جاتا ہے وہ اسے دبا لیتی ہیں یہی حال شکل کے بگڑنے کا ہے۔ بلکہ کھسکی اور جسم اور شکل [illegible] بگڑنے کے جو سامان تجربے اور صلاحیتیں ہیں یہ سب بروئے کار آجاتے ہیں۔ ہم اکثر کہتے ہیں کہ یہ شخص جوانی میں کس قدر خوبصورت تھا۔ اسے کیا ہو گیا کتنی جلدی۔ اکثر لوگ حُسن سے قبیح، خوش قامتی سے بدقوارگی کی منزلیں طے کر لیتے ہیں کتنا عبرتناک ہے یہ سفر جسے زیادہ تر انسان طے کرتے رہتے ہیں۔ نادانستہ، بلا ارادہ بغیر مقر کیے۔

وہ لوگ جو خود پرستی میں مبتلا ہو گئے یا جنھوں نے دل شکنی ہوس اور بے دردی کو اپنا شعار بنا لیا ان کی شکل کو مسخ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ شاہ تنبیہ کی تھی کہ نفس کی خباثت کا پتہ سالہا سال نہیں چلتا۔ لیکن وہ لوگ جو قیافہ شناس ہیں اس کا پتہ ایک پل میں لگا لیتے ہیں اور ذرا عمر بڑھ جائے تو انسان کی طبیعت کے شر کی دریافت ہر عام آدمی بھی آسانی سے کر سکتا ہے۔ رُخ کو مصحف کہا گیا ہے۔ یہ شاعروں اور عاشقوں کی عقیدتمندی ہے وہ مصحف جان کر خدوخال کو پڑھتے رہتے ہیں لیکن عام آدمی کے لیے رُخ نامۂ اعمال ہے۔ وہ ان کے اعمال اس کی شکل سے جھانکتے رہتے ہیں۔ چہروں پر عمر کے ساتھ جو سختی اور کرختگی آجاتی ہے وہ سب انسان کے اپنے اعمال کی دین ہے۔ عمر کے ساتھ شر آمادہ طبیعتیں بدی میں رواں ہو جاتی ہیں۔ بہرکیف حسن وہی ہے جو دیرپا ہو اور حسن کا رشتہ خدوخال کے بجائے افکار و اعمال اور نقطۂ نگاہ کے ساتھ جڑا ہو، بہت سے لوگ ساحل پر رہ کر اپنی بیٹھ ٹھونکتے ہیں کہ دامن کو تر نہیں ہونے دیا۔ لیکن داد ان کو ملنی چاہیے جو گرداب سے نبرد آزما ہو کر بھی شگفتگی، ہمدردی، خوش دلی کے دامن کو آلودہ یا شکن آلود نہیں ہونے دیتے یہ لوگ خواہ ہر لمحہ موج کے تھپیڑوں کی زد میں رہیں طمانیت سے ہاتھ دھوتے ہیں نہ سکون سے عمر کے ساتھ ان کے جمال اور وجاہت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

ہر طرف فریب

آج کی دنیا فریب کی دنیا ہے۔ آج کے انسان کو یسے نفسےرمل گئے ہیں جن سے وہ اپنی شخصی لوٹ کی سیاست کو قومی خدمت کی سیاست ظاہر کر سکے۔ ہر دمی ایسے الفاظ کا ماہر بنا ہوا ہے جو اس کے ظلم و فساد و عین حق و انصاف کا روپ دے سکیں۔ ہر آدمی کو ایسے ناونی نکتے ہاتھ آگئے ہیں جو اس کے جرم کو بے گناہی ا سرٹیفکٹ عطا کر دیں۔

یہ دنیا پرستوں کا حال ہے۔ مگر خدا پرستوں کا حالہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں یہاں بھی لوگوں نے ایسے تضائل و مسائل کا خزانہ جمع کر رکھا ہے جو ان کی بے دینی و دینی کمال کے خانہ میں ڈال دیں جو ان کی بے عملی کو عمل کا شاندار کریڈٹ دے دیں۔

لوگوں نے ایسا خدا دریافت کر رکھا ہے جس سے ڈرنے ی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کو ایسا رسول ہاتھ آگیا ہے جو صرف اس لئے آیا تھا کہ ان کی ساری بداعمالیوں کے باوجود خدا کے یہاں ان کا یقینی سفارشی بن جائے۔ لوگوں کو ایسی خستر مل گئی ہے جہاں جنت صرف اپنے لئے ہے اور جہنم صرف دوسروں کے لئے۔ لوگوں کو ایسی نمازیں حاصل ہو گئی یں جن کے ساتھ کبر اور حسد جمع ہو سکتا ہے۔ لوگوں کو ایسے روزے معلوم ہو گئے ہیں جو جھوٹ اور ظلم سے فاسد نہیں ہوتے۔

لوگوں کو ایسا دین ہاتھ آگیا ہے جو صرف بحث و مباحثہ کرنے کے لئے ہے نہ کہ عمل کرنے کے لئے۔ لوگوں کو اسلامی دعوت کے ایسے نسخے معلوم ہو گئے ہیں جو ان کی شخصی قیادت اور قومی سیاست کو اسلام کا لباس اوڑھا دیں۔

مگر جھوٹا سونا اسی وقت سونا ہے جب تک وہ کسوٹی پر نہ کسا گیا ہو۔ اسی طرح فریب کا یہ کاروبار بھی صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ خدا ظاہر ہو کر اپنے انصاف کی ترازو کھڑا نہ کر دے۔ آج امتحان کی آزادی ہے۔ آج آدمی کو موقع ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر جب امتحان کی مدت ختم ہو گی تو آدمی اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا وہ بولنا چاہے گا مگر اس کے پاس الفاظ نہ ہوں گے کہ وہ بولے۔ وہ چلنا چاہے گا مگر اس کے پاس پاؤں نہ ہوں گے کہ ان کے ذریعہ وہ بھاگ کر کہیں جا سکے۔

یہ سچائی کا دن ہوگا اس دن ہر آدمی کے اوپر سے فریب کا وہ لباس اتر چکا ہوگا جس کو آج وہ پہنے ہوئے ہے ہر آدمی اپنی اس اصل صورت میں نمایاں ہو جائے گا جو فی الواقع اس کی ہے مگر امتحان کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر آج وہ اس کو چھپائے ہوئے ہے۔ آدمی کی اصل صورت خدا کے سامنے آج بھی عریاں ہے مگر آخرت کی دنیا میں وہ تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔

(بہ شکریہ الرسالہ۔ دہلی)

اپنڈیسائٹس (باقی ص ۲۷) کے درمیان ٹمپریچر ہوتا
ہے۔ لیکن کبھی کبھی بخار تیز بھی ہوجاتا ہے۔ خصوصاً بچوں میں۔
مریض کا اگر معائنہ کیا جائے تو اور باتوں کے علاوہ
ٹ کے نچلے حصے میں داہنی طرف دکھن بھی ہوجاتی ہے
بھی کبھی تو ایسی جیسے کسی نے پھوڑے کو چھولیا ہو نبض
تیز ہوجاتی ہے۔

پیٹ میں درد اور دکھن، متلی، بھوک کا غائب ہوجانا
، اور حرارت علامتیں ہیں اپنڈی سائٹس کی۔ اگر یہ
یں ہوں تو فوراً سرجن سے رجوع کرنا چاہیئے۔ آج سے
ایک ہزار سال قبل حکیم بوعلی سینا نے کہا تھا کہ پیٹ میں
ربخار اگر ایک ساتھ ہوں تو انھیں خطرناک سمجھنا
اس بات میں بڑی سچائی ہے اور اپنڈی سائٹس پر
پورا اطلاق ہوتا ہے۔

علاج:۔

اس مرض کا علاج آپریشن ہے۔ آپریشن کے ذریعہ
کو کاٹ کر نکال دیا جاتا ہے اور اس کے بعد سیکم
راخ رہ جاتا ہے اس کو بند کر دیتے ہیں یہ آپریشن
ہے اور عموماً مریض کو بے ہوش کر کے کرتے ہیں۔
میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے مریض بغیر آپریشن
ہوسکتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کون سا
ؤں سے اچھا ہوجائے گا اور کون بغیر آپریشن کے
پیچیدگیوں میں مبتلا ہوجائے گا جن کا تذکرہ اوپر
لئے آپریشن ہی پر اصرار کرتے ہیں اور یہی طریقہ
لئے محفوظ ہے۔

البتہ اگر اپنڈیسائٹس کی وجہ سے پیٹ کے نچلے
والے حصہ میں داہنی طرف گلٹی پڑجائے (جس کا تذکرہ
اوپر کیا جاچکا ہے) تو عموماً فوراً آپریشن نہیں کرتے بلکہ
مریض کی غذا بالکل بند کر دی جاتی ہے اور اسے جراثیم کش
دوائیں دیتے ہیں۔ رگوں کے ذریعہ رقیق اشیاء دی
جاتی ہیں یہ سب اس امید پر کرتے ہیں کہ مرض قابو میں
آجائے گا لیکن یہ علاج سرجن کی نگرانی میں ہوتا ہے
اگر اس میں کامیابی ہوجاتی ہے اور مریض کی سب شکایتیں
دور ہوجاتی ہیں۔ اسے اچھا ہونے کے بعد گھر بھیج دیتے
ہیں اس ہدایت کے ساتھ کہ چھ سات ہفتوں کے بعد
دوبارہ اسپتال میں داخل ہوکر اپنڈکس کا آپریشن
کروالے یہ اس لئے کہ اپنڈکس پر اگر ایک دفعہ مرض
کا حملہ ہوجائے تو پھر یہ اپنی اصلی حالت پر کبھی نہیں آتی
اور اس کا برابر اندیشہ رہتا ہے کہ مرض کا حملہ دوبارہ
ہوجائے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنڈیسائٹس کی وجہ سے
پیٹ میں گلٹی پڑگئی ہے لیکن باوجود اس طریقہ علاج کے جس کا
بیان اوپر کیا گیا ہے مرض قابو میں نہیں آتا اور مریض کی تکلیفیں
بڑھتی جاتی ہیں ایسی صورت میں جان بچانے کی بس یہی صورت
ہے کہ فوراً آپریشن کردیا جائے یہ آپریشن نسبتاً مشکل ہوتا ہے
اور اسے کرنے کے لئے بڑی مہارت کی ضرورت ہے۔ اسی لئے یہ کہا
جاتا ہے کہ گلٹی پڑجانے کی صورت میں اگرچہ فوراً آپریشن نہیں
کرتے لیکن علاج ایک ماہر سرجن کی نگرانی میں ایسی جگہ ہونا
چاہیئے کہ ضرورت پڑنے پر وہاں آپریشن کیا جاسکے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نوٹس داخلہ نمبر ۳

سیشن ۸۳-۱۹۸۲ء

۸۳-۱۹۸۲ء کے سیشن کے لئے الیکٹریکل / میکینکل / سول انجینئرنگ میں B.E (سات سمسٹر پر مشتمل ایوننگ ڈگری کورس) میں داخلے کے لئے اہل امیدوار کی طرف سے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

داخلہ کے لئے کم از کم استعداد

ا) کسی تسلیم شدہ ادارہ سے مطلوبہ برانچ میں ڈپلوما

ب) انجینئرنگ میں ڈپلوما کرنے کے بعد انجینئرنگ کے پیشہ میں دو سالہ تجربہ۔

درخواست وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۱ / اگست ۱۹۸۲ء ہے۔

داخلہ فارم اور بلیٹن جس میں کورسیز، واجب الادا فیس اور درخواست کے روانہ کرنے سے متعلق ضابطے وغیرہ سے متعلق جملہ معلومات ہیں اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۱۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے -/3 روپیہ نقد ادا کر کے یا فائنس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا کراسڈ پوسٹل آرڈر بھیج کر حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ بذریعہ ڈاک داخلہ فارم حاصل کرنے کے خواہش مند امیدوار کو ۱۲ × ۱۱ سینٹی میٹر سائز کا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ایک روپیہ نوّے پیسے کے ٹکٹ چسپاں ہوں روانہ کرنا ہوگا۔ درخواست فارم کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک روانہ کئے جانے کی صورت میں امیدوار کو ایسا لفافہ روانہ کرنا ہوگا جس پر خود کے پتہ کے علاوہ ۶.۶۰/- روپیہ کے ٹکٹ چسپاں ہوں۔

ہر لحاظ سے مکمل فارم کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر (ناقابل واپسی) کے ہمراہ جو فائنس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۱۵۲، اے، ایم، یو علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کے دفتر میں ۲۱ / اگست ۱۹۸۲ء شام پانچ بجے تک پہونچ جانا چاہیئے۔

داخلہ فارم جس لفافہ میں ہوں اس کی پیشانی پر "داخلہ فارم برائے بی۔ای کورس" تحریر کر دینا چاہیئے۔ وہ امیدوار جو اس سے قبل بھی درخواست دے چکے ہیں اگر ۸۳-۱۹۸۲ء کے سیشن میں داخلے کے خواہش مند ہوں تو ان کو از سر نو درخواست دینی پڑے گی۔

نامکمل یا دیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی اور ایسی درخواستوں کے بارے میں مزید کوئی خط و کتابت نہیں ہوگی۔

کنٹرولر امتحانات و داخلہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار داخلہ نمبر ۲

سیشن ۱۹۸۳-۸۲ء

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جواہر لال میڈیکل کالج ہسپتال میں ستمبر ۱۹۸۲ء سے جنرل نرسنگ اور قابلہ (دایہ گیری) کے ۱/۲ ۳ سالہ (جنرل نرسنگ ۳ سال، قابلہ ۶ ماہ) کورس میں داخلہ کے لئے درخواستیں مطلوب ہیں۔

کم سے کم استعداد اتر پردیش بورڈ کے انٹرمیڈیٹ یا اس کے متبادل کسی امتحان میں مجموعی طور پر حاصل شدہ کم از کم ۴۵٪ فی صد نمبر۔ جو امیدوار سائنس کے مضامین اور انگریزی کے ہمراہ اعلیٰ تعلیمی استعداد کے حامل ہوں گے ان کو ترجیح دی جائے گی۔ امید وار غیر شادی شدہ طبی طور پر ہر طرح تندرست و توانا ہوں اور یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء کو ۱۷ سال کے ہو چکے ہیں یا اسی تاریخ کو ۳۵ سال سے زائد نہ ہوں۔

تحریری امتحانات اور انٹرویو کی بنیاد پر امیدواروں کا انتخاب عمل میں آئے گا۔ تحریری امتحان (۱) انگریزی (۲) ابتدائی ریاضی (۳) معلومات عامہ پر مشتمل ہوگا۔ اسٹیٹ نرسنگ کونسل کے قواعد کے تحت داخلہ کے لئے منتخب شدہ امیدواروں کو ۱۰۰ روپیہ ماہوار وظیفہ کے علاوہ مفت رہائشی / دوسری مراعات بھی حاصل ہوں گی۔

داخلہ فارم اور بروشر جس میں داخلہ اور کورسیز کے متعلق جملہ معلومات درج ہیں۔ اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تین روپیہ نقد ادائیگی یا اسی قیمت کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ بذریعہ ڈاک درخواست فارم حاصل کرنے کے خواہش مند امیدوار کو ۱۲ × ۲۰ سینٹی میٹر سائز کا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو اور ایک روپیہ نوے پیسے کے ٹکٹ چسپاں ہوں روانہ کرنا ہوگا۔ درخواست فارم کو بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک روانہ کئے جانے کی صورت میں امیدوار کو ایسا لفافہ بھیجنا ہوگا جس پر خود کے پتہ کے علاوہ ۵.۹۰ روپیہ کے ٹکٹ چسپاں ہوں۔

ہر لحاظ سے مکمل فارم پانچ روپیہ کے کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر (ناقابل واپسی) کے ہمراہ جو فائننس آفیسر

مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو اسسٹنٹ رجسٹرار (داخلہ) پوسٹ آفس بکس نمبر 52 کی معرفت مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 202001 کے دفتر میں 16 اگست کو شام پانچ بجے تک پہونچ جانا چاہیئے۔

نامکمل یا دیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی اور ایسی درخواستوں کے بارے میں مزید کوئی خط وکتابت نہیں کی جائے گی۔

کنٹرولر امتحانات وداخلہ

• پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد نے لیتھو کلر پرنٹرز میں چھپوا کر معفد منزل تار بنگلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع کیا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نوٹس داخلہ نمبر ۵

سیشن ۱۹۸۳-۸۲ء

قومی صوبائی یا یونیورسٹی سطح کے ان کھلاڑیوں کو جو ۱۹۸۳-۸۲ء کے سیشن میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ کے خواہش مند ہیں گیمس / اسپورٹس کے میدان میں حاصل کردہ ان کی کامیابیوں اور کامرانیوں کی بنیاد پر داخلہ میں ترجیح دی جائے گی۔ ایسے تمام امیدواروں کے لئے لازم ہوگا کہ وہ فارم داخلہ کے ہمراہ مکمل طور پر فارم (ضمیمہ) ضرور منسلک کریں۔ یونیورسٹی کی طرف سے مقرر کردہ کسی تاریخ کو ایسے تمام امیدواروں کو کھیل کے آزمائشی مقابلوں میں حصہ لینا ہوگا۔ کامیاب ہونے والے لائق اور ہونہار کھلاڑیوں کو پروفیشنل اور دوسرے کورسیز میں داخلہ دیا جائے گا اسپورٹس میں ان کی کامرانیوں کی بنیاد پر ان کو مزید کچھ دوسری مراعات بھی دی جائیں گی۔ درج ذیل گروپ کے تحت آنے والے کھلاڑیوں کو اسی ترتیب کے ساتھ ترجیح دی جائے گی۔

گروپ - I

کرکٹ۔ فٹ بال۔ ہاکی اور ٹینس

گروپ - II

بڈمنٹن اور ٹیبل ٹینس

گروپ - III

ایتھلٹس، تیراک، ویٹ لفٹر، کشتی، باسکٹ بال اور والی بال

نوٹ:۔ بالا کھیلوں کے صوبائی سطح کے اسکولی کھلاڑی بھی جو پری یونیورسٹی میں داخلہ کے خواہش مند ہیں درخواست دے سکتے ہیں۔

کنٹرولر امتحانات وداخلہ

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد چہارم] یکم صفر سنہ ۱۲۹۰ ھجری سنہ ۱۳۰۴ نبوی [نمبر ۲

جلد نمبر ۱ ۱۶ راگست ۱۹۸۲ شمارہ نمبر ۱۴

انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور مسلمان حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں ہے جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہو۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انہیں تاریخوں کو پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں جس سے بڑا نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ ازراہِ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس سبب ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے ...“

سید احمد

(انگلینڈ سے محسن الملک کے نام ایک خط میں)

سرسید اور سیکولرازم

اگرچہ بعض وجوہات سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے مذہب میں نہایت پختہ یا متعصب ہیں: مگر متعصب ہونے کا خیال میرے دل میں مطلق نہیں ہوا کیوں کہ میں اُن کو نہایت مہذب اور با اخلاق آدمی خیال کرتا ہوں اور ہر ایک کے اپنے مذہب میں پختہ ہونے کو نہایت عمدہ جانتا ہوں مگر تعصب کو نہایت بُرا اور ایک بڑا نقص اخلاق انسانی میں اور نیچر یعنی حکومت الٰہی کے برخلاف سمجھتا ہوں. تو ایسے اچھے آدمی میں جیسے کہ میجر ڈاڈ صاحب ہیں، ہیں ایسا نقص کیوں کر خیال کر سکتا تھا۔ مگر ایک دن اتفاقیہ یہ ذکر آیا کہ فلاں شخص باوصف بڑی لیاقت کے ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن اس لیے نہیں ہوا کہ وہ شاید لامذہب ہے۔ اور کسی مذہب کے سچے ہونے کا یقین نہیں رکھتا۔ میں نے کہا کہ "میری رائے میں ضرور ہے کہ ہندوستان میں ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن ایسے ہی ہوں جو لامذہب ہوں۔"

کہنے لگے "کیوں"؟

میں نے کہا۔ " جب ہندوستان میں مختلف قوم اور مختلف مذہب کے لوگ بستے ہوں تو مذہبی آدمی کا افسر تعلیم ہونا اکثر دفعہ بے تعصب عام تعلیم کا مانع ہو جاتا ہے"

یہ بات سن کر متعجب سے ہو کر خاموش ہو رہے۔ درحقیقت میری رائے یہ ہے کہ جیسا خدا بے تعصب ہے، مشرک، بت پرست، خدا پرست سب کو برابر پرورش کرتا ہے اسی طرح گورنمنٹ اور افسر تعلیم کو بے تعصب ہونا چاہیے۔ جب گورنمنٹ ظل اللہ اور افسر تعلیم معلم صفت من صفات اللہ ہو سکتا ہے۔

انتخاب از مسافران لندن

مرتبہ سر سید احمد خاں

تہذیب الاخلاق

پندرہ روزہ — علیگڑھ
جلد ۱ شمارہ ۱۴
۱۶ اگست ۱۹۸۲ء
مدیر - سید حامد
وائس چانسلر اے ایم یو
مدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

قیمت فی پرچہ — ایک روپیہ
ششماہی — گیارہ روپے
سالانہ — بیس روپے
بیرون ہند سے
ایک پرچہ — ایک ڈالر
سالانہ — بارہ ڈالر
پتہ :- مدیر مسئول رسالہ تہذیب الاخلاق
معتمد منزل تارا نگلہ اے ایم یو علی گڑھ

ہماری عید

عید ایک بار پھر آئی اور گزر گئی ہم جہاں تھے وہاں ہی رہے۔ سو سال کے دوران ہم نے اپنی ترقی کے لیے جتنے زینے تعمیر کیے تھے، اب وہ سب ڈگمگا رہے ہیں۔ نئے علوم سے استفادہ کرنے اور انگریزوں کی حکومت کے دور میں قدم جمانے کے لیے ہم نے جدید علوم کی ایک درسگاہ قائم کی، وہ آج حوادث کا شکار ہے اس کی جڑوں کو اس کے فرزند ہی کھوکھلا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ ہم نے مغربی تہذیب کے سیلاب سے دینی علوم، اپنی تہذیب اور معاشرہ کو بچانے کے لیے ایک درسگاہ قائم کی جن ہاتھوں نے وہ قائم کی تھی، انہی کے نام لیوا اسکی بیخ کنی میں معروف ہیں۔ ہم نے رفتارِ زمانہ کا ساتھ دینے کے لیے قدیم و جدید علوم کی آمیزش کرکے ایک اور درسگاہ قائم کی لیکن یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ اور اس کا نظامِ تعلیم زمانے کے تھپیڑوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔ ہم نے اپنے معاشرہ کے مختلف عناصر کو ایک سلسلہ میں منسلک کرنا چاہا لیکن یہ کوشش بھی کارگر نہ ہوئی۔ اور اختلافات بڑھتے ہی رہے۔ سو سال میں ہم نے اپنی ترقی کے لیے بہت سی تنظیمیں قائم کیں، زمانہ کے دست برد سے کوئی نہ بچا۔ جو بچ گئی وہ زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ ملک آزاد ہوا ہم بھی آزاد ہوئے لیکن پابہ گل ہی رہے۔ ہم اپنے وسیع وطن میں روز کہیں نہ کہیں زمانہ کی ستم ظریفی کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمارے گھر اجڑتے ہیں، کاروبار برباد ہوتے ہیں، عورتیں اور بچے بے سہارا ہو جاتے ہیں، عورتوں کی آبروریزی ہوتی ہے، ان کے خون سے ہاتھ رنگے جاتے ہیں۔ یہ وقت کا تازیانہ ہماری آنکھیں نہ کھول سکا۔ ہم آپس میں دست و گریباں ہیں۔ ہمارے تخریب کار جو ہم میں ہی بستے ہیں، کامیاب ہیں۔

ان حالات میں بھی امید کی ایک کرن نظر آتی ہے۔ ہمارے دستکار ہمارے معاشرہ کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ان کی صناعی نے ایک خاصا بڑا گروہ خوش حال لوگوں کا پیدا کر دیا ہے اور ماضی کے دور کی کمی پوری ہو رہی ہے۔ لیکن بدقسمتی ہے کہ ہم میں نہ ذوق و شوقِ علم ہے نہ ہمارے بچوں اور نوجوانوں کی تربیت کا کوئی

ہوتے تھے، اب ہماری بد اخلاقی کی دنیا شاکی ہے
ہم اسلام کے پرجوش علمبردار ہیں لیکن جذبات
کی حد تک ۔ مذہب توہمات کا گورکھ دھندا خیال
کیا جاتا ہے ۔ اسلام کو بھی ہمارے رویہ نے ایک
گورکھ دھندا ہی بنا دیا ہے ۔ اور غیر نہیں ہم خود
بھی مذہب کو یہی سمجھتے ہیں ۔

یہ ہیں وہ حالات اور تاثرات جن
کے اصلاح کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہی ہے ۔ دیکھیے
کون اصلاح کے لیے اُٹھتا ہے ۔

ضرورت ہے کہ بچوں اور نوجوانوں
کے لیے اردو اور ہندی میں رسالے شائع کیے
جائیں جو ان میں تعمیری فکر پیدا کریں وہ اپنے
ماضی اور حال سے آشنا ہوں، ان کی مایوسی دور
ہو اور اپنے کردار کی شمع سے اپنی ہی نہیں دوسروں
کی دنیا بھی روشن کریں ۔ ان کا اخلاق و کردار
بلند ہو ۔ مسلمان صنعت کار ہیں ۔ جو بے روزگار
ہیں ان کو دستکاری کی تربیت دینے کے لیے
ادارے قائم کیے جائیں ۔ ان کے اسکولوں اور
کالجوں اور ان کی یونیورسٹیوں کا معیار تعلیم
بلند کیا جائے اور یہ سب درسگاہیں ان کی تعلیم
و تربیت کا ذریعہ بنیں ۔ پھر عید کھاتے پیتے لوگوں
کی عید نہ ہوگی مسلم عوام کی عید ہوگی اور
خوشی کے شادیانے چند کے پاس نہیں سب کے پاس
بجیں گے ۔

[illegible] کی سخت بنیادی ضرورت

یہ بات کون نہیں جانتا کہ ترقی کے لیے خواہ
انفرادی ہو یا قومی، ضروری یہ ہے کہ محنت سے، توجہ
سے اور دیانت داری سے کام کیا جائے ۔ درسی کتب میں
ایسی کہانیاں ہوتی تھیں اور ممکن کہ اب بھی ہوتی
ہوں، جن سے بچوں کو محنت اور ذمہ داری سے کام کرنے
کی ترغیب دی جاتی ہو ۔ اس کا اثر بھی بچوں پر کسی نہ کسی قدر ہوتا
تھا ۔ کسی زمانے میں فارسی کی متعدد کتابیں نوجوانوں کے کردار
کی اصلاح کی غرض سے انکو پڑھائی جاتی تھیں لیکن اخلاقی تعلیم
کا اثر و اقدار کا احترام کب تک باقی رہ سکتا ہے جہاں اخلاقی
اقدار کو نظر انداز کرنا ہی سماج میں مقبولیت کا ذریعہ ہو اور
جب معاشرہ میں اخلاقی قیود کو اہمیت ہی نہ دی جاتی ہو
یہی وجہ ہے کہ ہمارے اجتماعی کام ادھورے یا ناقص ہوتے ہیں
مثال کے طور پر شہر کی سڑکیں اور عمارتیں جو سرکاری ادارے
تعمیر کراتے ہیں اگر دیانت داری سے تعمیر کرائی جائیں
تو کم رقم میں زیادہ اچھا کام ہو ۔ اور پائیدار ہو ۔ اسی
طرح ریلوے کے انتظامات کی طرف غور کیجیے اگر ملازمین
دیانت و احساس ذمہ داری سے کام کریں تو نہ ٹرین لیٹ
ہو نہ محکمہ کو خسارہ ۔ نہ عوام کو پریشانی ۔ ہمارے معاشرے
میں تہذیب و شائستگی کی کمی ہے ۔ سرسید ہی نہیں
گاندھی جی اور جواہر لال جیسے لوگ یورپ گئے تو انھوں
نے یہ محسوس کیا کہ مغربی یورپ کے باشندوں میں ایسی
انسانی خصوصیات ہیں جو ہم ہندوستانیوں میں نہیں ہیں
سید احمد خاں نے اسی تہذیب و شائستگی کو ملک میں عام
کرنے کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا ۔ اگر ہم آج انہی
مقاصد کے تحت اس رسالہ میں مضامین لکھیں تو ہمارے
دوستوں کو وہ ناپسند کیوں ہوں ؟

عبدالعزیز لوہی
شعبہ جغرافیہ
اے ایم یو علی گڑھ

شہروں کی آب و ہوا

عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شہروں کی آب و ہوا اور شہروں کے قرب و جوار کے جو گاؤں اور زرعی علاقے ہیں، ان کی آب و ہوا یکساں ہوتی ہے درحقیقت اِن دونوں کی آب و ہوا میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ خود جغرافیہ دانوں کو بھی اس فرق کا پوری طرح احساس پچھلی چند دہائیوں میں ہوا ہے اور اس احساس کے بعد سے ہی شہروں کی آب و ہوا کے بارے میں اعداد و شمار جمع کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس قلیل عرصے میں بڑے پیمانے پر اعداد و شمار نہیں جمع ہو سکے ہیں اور نہ ہی بہت زیادہ شہروں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ تاہم جو کچھ اعداد و شمار جمع ہو سکے ہیں ان سے بہت دلچسپ باتوں کا علم ہوا ہے اور شہروں و دیہی علاقوں کے فرق کا پتہ چلا ہے۔ خود اِس بات کا بھی اندازہ ہوا کہ پورے شہر کی آب و ہوا یکساں نہیں رہتی۔ اس کے وسطی علاقے، باہری علاقے اور ان دونوں کے درمیانی علاقے کی آب و ہوا میں فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق حرارت میں ہوتا ہے، رطوبت میں، بارش میں، کہرے میں ہوا کی رفتار اور اس کی کیمسٹری میں ہوتا ہے۔

حرارت

سب سے نمایاں فرق شہر اور قرب و جوار کے علاقوں میں حرارت کا ہے۔ شہر چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، اس کا درجۂ حرارت اطراف کے کھلے علاقے سے زیادہ ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر شہر اپنے پاس کے گاؤں سے زیادہ گرم ہوتے ہیں۔ شہروں کی اوسط سالانہ حرارت ایک ڈگری سے ڈیڑھ ڈگری فارن ہائٹ تک زیادہ پائی گئی ہے۔ دن اور رات کی حرارت میں بھی یہ فرق برقرار رہتا ہے۔ رات کی اوسط سالانہ حرارت بھی شہروں کی قریب چار ڈگری فارن ہائٹ اطراف کے علاقے سے زیادہ ہوتی ہے۔ بعض بعض شہروں میں اور بعض بعض موقعوں پر رات کی حرارت ۲۰ ڈگری تک زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح دن کی اوسط سالانہ حرارت بھی شہروں کی زیادہ ہوتی ہے۔

درجۂ حرارت کے سلسلہ میں ایک بات جو دلچسپ ہے، یہ معلوم ہوئی ہے کہ پورے شہر میں یہ یکساں نہیں ہوتا۔ یعنی شہر کے ایک حصہ میں کچھ ہوتا ہے تو دوسرے میں کچھ۔ شہر کا مرکزی علاقہ سب سے زیادہ گرم ہوتا ہے۔ اس سے کم درمیانی علاقہ اور اس سے کم سرحدی علاقہ۔ مثال کے طور پر ۱۴ مئی ۱۹۵۹ء میں لندن کے مرکزی حصہ کا درجۂ حرارت ۵۲ ڈگری فارن ہائٹ تھا اس کے بعد کے درمیانی علاقہ کا ۴۷ ڈگری اور اس کے بعد کے سرحدی کنارے کے علاقے کا صرف ۴۰ ڈگری تھا۔ شہر کے مرکزی اور کنارے کے علاقے میں ۱۲ ڈگری کا فرق پایا گیا۔ مرکزی علاقے کے زیادہ گرم ہونے کی وجہ سے اس علاقے کو جزیرہ حرارت (Heat Island) بھی کہتے ہیں۔ لندن کا

...س اوپر بیان کیا گیا ہے وہ بیں تمام شہروں پر صادق آتا ہے۔

جیسے جیسے شہر کا رقبہ اور اس کی حدود اور آبادی بڑھتی ہے، اس کی حرارت بھی بڑھتی جاتی ہے ایک تخمینے کے مطابق اس صدی کی شروع کی پانچ دہائیوں میں شہروں کا درجہ حرارت مجموعی طور پر قریب ایک ڈگری فارن ہائٹ بڑھا ہے۔ ٹوکیو جو جاپان کا دارالسلطنت ہے اور تیز رفتاری سے بڑھ اور پھیل رہا ہے، اس کا درجہ حرارت پچھلے سو سال میں تین ڈگری فارن ہائٹ بڑھ گیا ہے۔ اسی طرح اوساکا جو جاپان کا دوسرا بڑا شہر ہے اس کا درجہ حرارت پچھلے سو سال میں ۴.۵ ڈگری بڑھا ہے۔ گو کہ اس قسم کے اعداد و شمار بہت کم شہروں کے جمع کیے گئے ہیں اور قلیل اعداد و شمار کی بنیاد پر بڑی رائے عامہ بنانا غیر سائنٹفک بات ہوگی۔ تاہم یہ قلیل اعداد و شمار جس سمت کی طرف نشاندہی کرتے ہیں وہ اہم ہے اور نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

شہروں کے زیادہ گرم ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ ایک اہم سبب یہ ہے کہ شہروں میں بڑے پیمانے پر کوئلہ اور دوسرے ایندھن جلائے جاتے ہیں۔ یہ ایندھن باورچی خانوں میں، سرد ملکوں میں آتش دانوں میں، کارخانوں میں، ریلوے انجنوں، موٹروں اور مختلف قسم کے انجنوں میں جلائے جاتے ہیں۔ ان کے جلنے سے جو حرارت اور گرمی پیدا ہوتی ہے وہ شہر کے اندر کافی حد تک مقید رہتی ہے اور اس سے ان کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔

وی آنا (Vienna) میں کل تمازت ایک چوتھائی حصہ ایندھن جلنے اور تین چوتھائی سورج سے حاصل ہوتا ہے۔ برلن (BERLIN) میں ایک تہائی تمازت ایندھن جلنے اور دو تہائی سورج سے حاصل ہوتی ہے۔ مین ہٹن (Manhattan) میں جاڑوں میں سورج سے جتنی تمازت آتی ہے، اس سے ڈھائی گنا زیادہ ایندھن جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہروں کی حرارت دیہی قرب وجوار کے علاقوں سے زیادہ ہونے کی ایک وجہ شہروں میں کثیر مقدار میں ایندھن جلنا ہے۔

شہروں میں زیادہ حرارت کا دوسرا سبب یہ ہے کہ شہروں میں عمارتوں، سڑکوں، پٹریوں، کھمبوں اور تاروں وغیرہ میں جو سیمنٹ، اینٹیں اور لوہا وغیرہ استعمال ہوتا ہے وہ اپنے اندر حرارت جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چنانچہ سورج کی تمازت جو شہروں اور گاؤں میں یکساں آتی ہے اس کا بڑا حصہ شہروں میں تو جذب ہو جاتا ہے۔ مگر گاؤں وغیرہ میں عمارتیں سڑکیں وغیرہ کم ہونے سے اتنا زیادہ جذب نہیں ہوتا ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ شہر کی عمارتوں کی ساخت جس میں بند کمرے اور برآمدے بالکنی وغیرہ ہوتی ہیں اس حرارت کو جو ان کے اندر ایک دفعہ آجاتی ہے، کافی وقت تک مقید رکھتے ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس گاؤں کی کھلی فضا میں ایسا نہیں ہوتا۔

شہروں میں حرارت کی زیادتی کا تیسرا سبب یہ ہے کہ گاؤں میں سورج سے جو حرارت آتی ہے، اس حرارت کا خاصا حصہ درختوں، کھیتوں اور تالابوں وغیرہ میں جو نمی اور پانی ہوتا ہے، اس کا آبخرات اور بھاپ بنانے کے تصرف میں آجاتا ہے۔ جبکہ شہروں میں نباتات، تالاب وغیرہ کم ہونے کے

باعث وہ پانی اور نمی کم پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ حرارت جو پانی کو بھاپ بنانے میں خرچ ہوتی ہے وہ خرچ نہیں ہوتی۔ اور شہر کی حدود میں بدستور موجود رہتی ہے۔

چوتھا سبب شہروں کے زیادہ گرم ہونے کا یہ ہے کہ شہر کی فضا میں آلودگی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں ریت کے ذرّے، کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس، دھواں اور غبار وغیرہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ آلودہ ہوا ایک چادر کا سا کام کرتی ہے اور شہر کی گرمی جو رات کو سورج غروب ہونے کے بعد سے اوپر کی طرف جاتی ہے۔ اس چادر کی وجہ سے زیادہ اوپر نہیں جا پاتی اور زمین اور چادر کے درمیان مقیّد رہ جاتی ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایندھن کے جلنے، عمارتوں کی ساخت اور عمارتی اجزا، درختوں اور تالابوں کی کمی، فضا کی آلودگی ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے شہر نمایاں طور پر اطراف کے گاؤں وغیرہ سے زیادہ گرم ہوتے ہیں۔

رطوبت اور بارش

ہوا کی رطوبت کے معاملے میں بھی شہر اور قرب وجوار کے گاؤں میں نمایاں فرق ہوتا ہے شہروں میں رطوبت کم اور گاؤں میں زیادہ ہوتی ہے۔ اوسطاً جاڑوں میں شہر کی رطوبت گاؤں کے مقابلے میں ۲ فیصدی کم ہوتی ہے۔ اور گرمیوں میں یہ فرق اتنا بڑھ جاتا ہے کہ شہر کی رطوبت ۸ فیصدی کم ہوتی ہے۔ سالانہ اوسط لیا جائے تو شہر کی رطوبت مزید ۶ فیصدی کم ہو جاتی ہے۔

شہروں میں رطوبت کم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہاں آبخرات کم بنتے ہیں۔ آبخرات کے بننے کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ شہروں میں تالاب اور ایسی سطح جن پر پانی یا نمی ہو یا ایسی جگہیں جہاں پانی جذب ہوتا ہو، بہت کم ہوتی ہیں۔ چنانچہ آبخرات بھی کم بن پاتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ شہروں میں جو بارش برف باری اور اولہ باری وغیرہ ہوتی ہے، وہ جلد ہی نالوں اور نالیوں سے بہہ کر چلی جاتی ہے اور شہر کی زیادہ تر سطح پکّی ہوتی ہے، اس لیے زمین میں جذب بھی نہیں ہو پاتی۔ اور ابخرات بننے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ شہروں میں درخت اور پودے بہت کم ہوتے ہیں۔ درخت اور پودے اپنی پتیوں اور شاخوں، بارش، اوس اور زمین سے چوس کر پانی کا کافی ذخیرہ اپنے اندر رکھتے ہیں جس سے اطراف کی ہوا نرم اور مرطوب ہو جاتی ہے۔ شہروں میں نباتات کم ہوتی ہیں، اس لیے اس سے حاصل شدہ رطوبت بھی کم ہوتی ہے۔

جہاں تک بارش کا معاملہ ہے اس میں بھی یہ دیکھا گیا ہے کہ شہروں میں بہ مقابلہ گاؤں بارش کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق شہروں میں عام طور سے پانچ سے لے کر دس فیصدی تک زیادہ بارش ہوتی ہے اور نہ صرف بارش کی مقدار زیادہ ہوتی ہے بلکہ برسات کا موسم بھی طویل ہوتا ہے۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ شہروں میں اوسطاً دس فیصدی موسم

برسات کے دن زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک یہ دلچسپ بات بھی پتہ لگی کہ شہر سے جس سمت کی طرف ہوا چلتی ہے، ادھر نسبتاً زیادہ بارش ہوتی ہے ایک محقق نے تو یہ تک نوٹ کیا کہ ۱۹۵۳ سے ۱۹۶۷ء تک کے چودہ سالوں میں بہ مقابلہ چھٹی والے دن یعنی اتوار کے کافی دنوں یعنی پیر سے سنیچر میں ۳۱ فیصدی زیادہ بارش ہوئی۔

شہروں میں زیادہ بارش کے ہونے کے کئی اسباب ہیں۔ بارش ہونے کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ فضا میں ایسے ذرات موجود ہوں جن کے گرد پانی کے ابخرات جمع ہوکر بھاپ سے پانی یا برف کی شکل میں آسکیں اگر ایسے ذرات فضا میں زیادہ ہوں گے تو زیادہ بھاپ پانی یا برف کی شکل میں جمع ہو سکے گی اور آب ریزی زیادہ ہوگی۔ شہروں میں کارخانوں کی چمنیوں، مکانوں، موٹروں، بجلی گھروں وغیرہ سے اس قسم کے ذرات بہت کافی مقدار میں خارج ہوکر فضا میں کافی عرصے تک معلق رہتے ہیں اور یہ ذرے ابخرات جمع ہونے کا مرکز بن جاتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ برطانیہ کے شہروں میں قریب ڈیڑھ لاکھ ذرات فی مکعب سینٹی میٹر پائے جاتے ہیں۔ جب کہ برطانیہ کے دیہی علاقوں میں ان کی تعداد صرف دس ہزار فی مکعب سینٹی میٹر ہے۔ ان ذرات کی شہروں میں زیادتی شہروں میں زیادہ بارش کا سبب ہے۔

بارش زیادہ ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ شہر کے وسطی علاقے کافی گرم ہوتے ہیں۔ گرمی کی وجہ سے وسطی علاقے کی ہوا گرم ہوکر اوپر اٹھتی ہے اور اس بلندی تک اٹھتی چلی جاتی ہے جہاں حرارت اتنی کم ہوتی ہے کہ ابخرات پانی یا برف کی شکل میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور مناسب حالات ملنے اور مناسب مقدار میں جمع ہونے کے بعد برسنے اور گرنے لگتے ہیں

شہروں میں بارش زیادہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ شہروں کی سطح ناہموار ہوتی ہے۔ اونچی نیچی عمارتیں، پتلی اور چوڑی سیدھی اور ٹیڑھی سڑکیں۔ ان عمارتوں کی قطار اور سڑکوں کی سمتیں جن میں کوئی مشرق سے مغرب کو ہے تو کوئی شمال سے جنوب اور کوئی شمال مغرب سے جنوب مشرق کی طرف۔ جس کا مجموعی اثر یہ ہوتا ہے کہ ہوا میں اور حرارت کی تقسیم میں اتھل پتھل اور بے ترتیبی پیدا ہوجاتی ہے۔ سطح ناہموار ہونے اور بے ترتیب ہونے سے ہوا کی ایسی دھاریں (کرنٹس Currents) بن جاتی ہیں جن سے بارش کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف گاؤں کی مختصر آبادی اور تقریباً ہموار سطح کھلے کھیت ہوا میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتے۔ اور اس کا توازن برقرار رہتا ہے۔

کہرا۔

شہروں میں بہ مقابلہ گاؤں کہرا، زیادہ ہوتا ہے۔ کہرا زیادہ گھنا بھی ہوتا ہے اور ایسے دنوں کی تعداد بھی شہروں میں زیادہ ہوتی ہے جن میں کہرا پڑتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے شہروں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ گرمیوں میں شہروں میں گاؤں کے مقابلے میں ۳۰ فیصدی

زیادہ پڑتا ہے اور جاڑے میں سو فیصدی
زیادہ پڑتا ہے۔

کہرے کا تعلق براہ راست صنعتی
ترقی اور شہری آبادی بڑھنے سے ہے۔ چیکوسلواکیہ
کے دارالحکومت پراگ (Prague) کے
اعداد و شمار سے پتہ چلا ہے کہ اس شہر میں
۱۸۶۰ - ۱۸۸۰ء کے دوران سال میں قریب
۸۰ دن کہرا پڑا کرتا تھا۔ اس شہر کی ترقی اور
آبادی بڑھنے کے بعد ۱۹۰۰ - ۱۹۲۰ء کے
دوران سال میں ۲۱۷ دن کہرا پڑنے لگا۔ اسی
طرح جیسے جیسے شہری آبادیاں اور صنعتیں بڑھ
رہی ہیں کہرے میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

کہرا جب دھوئیں کے ساتھ ہوتا
ہے تو کئی طرح سے مضر اور خطرناک اثرات
رکھتا ہے۔ اس میں دھوئیں کے ساتھ ساتھ زہریلی
گیسیں بھی شامل ہوجاتی ہیں۔ یہ گیسیں کارخانوں
بجلی گھروں اور گھر کے آتش دانوں سے خارج
ہوتی ہیں اور کہرے میں شامل ہوجاتی ہیں۔
جن شہروں میں زیادہ کارخانے ہوتے ہیں، ان
میں زہریلی گیسیں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ لندن
میں دسمبر ۱۹۵۲ء میں پانچ روز تک کہرا بہت
گھنا ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے سینے کے اور
کچھ دوسرے امراض عود کر آئے تھے جس کے
نتیجے میں ۱۲۰۰۰ موتیں واقع ہوئیں۔ کہرا زیادہ
ہونے سے دو اور باتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ
کہ سورج کی گرمی اور روشنی جو زمین تک
پہنچتی ہے، وہ گھٹ جاتی ہے۔ دوسرے رویئت
کم ہوجاتی ہے۔ کبھی کبھی تو اتنی گھٹ جاتی
ہے کہ دس میٹر سے زیادہ فاصلے کی چیز
نہیں دکھائی دیتی۔ چنانچہ سڑک پر حادثوں
کی تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ گاؤں کی کھلی
فضا جس میں دھواں اور گیسیں کم ہوتی
ہیں اور جہاں ہوا کے چلنے میں رکاوٹ
نہیں ہوتی جیسے کہ شہروں کی عمارتوں وغیرہ
سے ہوتی ہے کہرا کم ہوتا ہے اور اگر
ہوتا ہے تو ہوا اس کو یکساں طور سے
وسیع رقبے میں پھیلا دیتی ہے اور اڑا
لے جاتی ہے۔

اس مطالعے سے یہ بات صاف
ہوگئی کہ شہروں اور دیہی علاقوں کی
آب و ہوا میں کافی فرق ہوتا ہے اور یہ
فرق ایسا ہوتا ہے جس میں شہر گھاٹے میں
رہتے ہیں۔ شہر کی زندگی میں اگر کچھ
سہولتیں، مراعات اور دلفریبی ہے تو
اس کے ساتھ ساتھ اس کی کچھ قیمت بھی
ہے جو ان میں رہنے والوں کو ادا کرنی
پڑتی ہے۔ اس میں نہیں یہ دیکھنا ہوگا
کہ یہ سودا زیادہ گراں تو نہیں ہے۔

مضامین صاف اور صفحے کے ایک
طرف ہی تحریر فرمائیں۔

ڈاکٹر رؤفہ اقبال
اے ایم یو ویمنز کالج
علی گڑھ

اسلام میں عورتوں کے حقوق

(مندرجہ ذیل مضمون ویمنز کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پلیٹنم جوبلی کے موقع پر Women and Social Change کے آل انڈیا سمینار منعقدہ ۵ر ۶ر مارچ ۱۹۸۲ء کو پڑھا گیا۔)

ہم جب نسائیت کی پوری تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ایک ایسی دردناک داستان ہے کہ واقعات پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔

مرد اور عورت کا تعلق ایسا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر، ہر نشیب و فراز میں ہر مرد کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت سے عورت سے وابستہ رہتا ہے اور ہر مقام پہ عورت کی خدمات، اس کی قربانیاں، اس کی جاں نثاری و محبت اس کو زندگی کی آسائشیں اور تمدنی ترقی کے مواقع فراہم کرتی نظر آتی ہے لیکن انسانیت کی پیشانی سے یہ بدنما داغ کبھی نہیں مٹ سکتا کہ مرد نے اسی آغوش کو زخمی کیا جس آغوش میں پرورش پائی، اسی سینہ کو مجروح کیا جس سے اس کا رشتۂ حیات وابستہ رہا۔ اسی اولین مکتب کو جہالت کی بھینٹ چڑھا دیا جس پر قوموں کی نشو ونما منحصر تھی۔ عہد وحشت وجہالت سے قطع نظر، عہد تہذیب وتمدن میں کوئی ایسا وحشیانہ سلوک نہ تھا جو عورت کے ساتھ روا نہ رکھا گیا ہو۔ دنیا کی کوئی ایسی ذلت نہ تھی جو اس مظلوم کو نہ سہنی پڑی ہو۔ روم، یونان، ایران وہندوستان جن کو اپنی تہذیب کی قدامت پر ناز ہے ان سے بھی اگر پوچھا جائے کہ تم نے تہذیبی ترقی کے دور میں عورت کے ساتھ کیا انصاف کیا تو شرمندگی سے سر جھکانے کے علاوہ ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا

اس احسانِ عظیم کا اندازہ کرنا مشکل ہے جو اسلام نے عورت پر کیا ہے۔ عورت کی حالت قریب قریب تمام ملکوں اور قوموں میں یکساں تھی۔ کوئی اس کو گناہ کا بانی و ذمہ دار قرار دیتا تھا تو کوئی اس پر علوم کے دروازے بند کرتا تھا اور مدنی اور انسانی حقوق سے محروم کرتا تھا روم، ایران، چین ومصر، تہذیب کے تمام گہواروں کا یہی عالم تھا۔ صدیوں کی محرومی ومحکومی اور عالمگیر حقارت نے عورت کے ذہن سے خود عزت نفس کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ خود بھول گئی تھی کہ وہ بھی کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے۔ مرد اس پر ظلم وستم کرنا اپنا فرض اور مردانگی سمجھتا تھا اور عورت اس کو برداشت کرنے میں اپنی نجات سمجھتی تھی۔ اسی غلامانہ ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو شوہر کی داسی اور شوہر کو دیوتا کہتی تھی۔ یعنی شوہر اس کا معبود اور وہ اس کی بندی تھی۔ اس ماحول میں نہ صرف قانونی اور علمی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے جس نظام نے انقلاب برپا کیا وہ اسلام ہے۔

آج حقوق نسواں، تعلیم نسواں اور معاشرتی

... زبان پر آتے ہیں وہ اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہے جو محمد صلعم کی زبانِ مبارک سے بلند ہوئی تھی، جس نے انسانی افکار کا رُخ بدل دیا تھا۔ کلام ربانی نے للکار کر کہہ دیا خلقکم من نفسٍ واحدۃٍ وخلق منھا زوجھا۔ اللہ تعالیٰ نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے اور اسی سے اس کے جوڑے پیدا کیے۔ للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساءِ نصیب مما اکتسبن مرد جیسا عمل کریں گے اس کا پھل پائیں گے اور عورتیں جیسا عمل کریں گی اس کا پھل پائیں گی۔"

ایمان و عمل صالح کے ساتھ جو روحانی درجات و مراتب مردوں کو مل سکتے ہیں وہ عورتوں کو بھی مل سکتے ہیں یہ اسلام ہی ہے جس نے بتایا کہ جس طرح مرد کے حقوق عورت پر ہیں، عورت کے حقوق بھی مرد پر ہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ذات اقدس ہے جس نے عورت کو ذلت کے غار سے نکال کر عزت کے مقام پہ پہونچا دیا۔ جنہوں نے باپ کو بتایا کہ بیٹی کا وجود ذہنیت کے لیے شرم و عار کی بات نہیں بلکہ اس کی پرورش اور حق شناسی تجھے جنت کا مستحق بناتی ہے۔ یہ آپؐ ہی ہیں جنہوں نے شوہر کو بتایا کہ نیک بیوی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس طرح سے ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی دنیا کے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عورت کے متعلق مردوں ہی کو نہیں خود عورت کی ذہنیت بدل دی۔ قانون کے ذریعہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی۔ مردوں کے ظلم کی روک تھام کی اور عورتوں میں یہ بیداری پیدا کی کہ وہ اپنے حقوق سمجھیں اور ان کو حاصل کریں

وہ عورت جو صدیوں سے تعلیم سے نا آشنا علم کی دولت سے بے بہرہ تھی۔ غارِ حرا سے آنے والے معلمِ انسانیت کی سب سے پہلی طالبہ بنی جس نے اِس پیغام پر لبیک کہا۔ آج اس کی صدیوں کی خوابیدہ تقدیر جاگ اٹھی۔ طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم ومسلمۃ۔ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض بتا کر یہ مژدہ جانفزا سنایا۔ نہ صرف یہ حکم دیا بلکہ ان کی تعلیم کا مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ انتظام کیا۔ آپؐ نے ان کے لیے اوقات مقرر فرمائے جن میں آکر وہ علم دین سیکھتی تھیں اور جس کے نتیجے میں ازواج مطہرات و صحابیات رضی اللہ عنہن نہ صرف عورتوں بلکہ مردوں کی بھی معلمہ بنیں اور بڑے بڑے صحابہؓ آکر حدیث، تفسیر اور فقہ کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ معاشی اور تمدنی حقوق دینے میں اسلام نے جس فیاضی کا ثبوت دیا ہے، اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔

معاشی حقوق

سب سے اہم چیز جس کی بدولت دنیا میں انسان کی قدر و منزلت قائم ہوتی ہے وہ اس کی معاشی حیثیت ہے۔ اسلام کے سوا تمام قوانین نے عورت کو معاشی حیثیت سے کمزور کر رکھا تھا۔ یہی معاشی کمزوری اس کی غلامی اور ذلت کا سبب بنی تھی۔ یورپ نے عورت کی حالت کو بدلنا چاہا تو اس کو نسوانی حقوق دلوا کر نہیں بلکہ کمانے کا بوجھ ڈال کر اس کے فرائض کو بڑھا دیا۔ اسلام اس معاملہ میں درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے۔ وہ عورت کو وراثت کے نہایت وسیع حقوق دلواتا ہے۔ باپ سے شوہر سے، اولاد سے۔ اس کے علاوہ اس کو مہر اور نفقہ کا حق ملتا ہے۔ عورت جو کچھ اپنی صلاحیت یا ترکہ سے حاصل کرے، اس پر اس کی بلاشرکت غیرے ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ وہ چاہے کتنی ہی دولت مند ہو، اس کا نفقہ اس کے شوہر پر ہے ... اس طرح بعض ...

عورتوں پر وہ ذمہ داریاں نہیں جو مردوں پر ہیں۔

معاشرتی حقوق

اسلامی سماج نے عورت کو جو حقوق دیے ہیں، ان سے زیادہ کسی جدید ترقی یافتہ معاشرے نے نہیں دیے۔ عورت کو شوہر کے انتخاب کا حق دیا ہے اس کی مرضی کے خلاف اس کو نکاح پر کوئی مجبور نہیں کر سکتا اگر شوہر سے تعلقات اچھے نہ ہوں تو عورت کو خلع اور تفریق کا حق دے دیا ہے۔ بیوہ یا طلاق شدہ عورت کو عقد ثانی کا غیر مشروط حق دیا ہے۔ شوہر کو بیوی پر جو اختیارات دیے ہیں، اُن میں جگہ جگہ قرآن نے حسن سلوک کی تاکید کر دی ہے۔ عاشروھن بالمعروف۔ عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو۔ لاتنسوا الفضل بینکم آپس کے تعلقات میں فیاضی کو نہ بھول جاؤ۔ ھن لباس لکم وانتم لباس لھن وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اسلام نے اس رشتہ کو ایک اعلیٰ مقصد کے لیے مقرر کیا ہے کہ یہ تعلق محبت اور انس کا تعلق ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے شریک رنج و راحت ہوں۔ ان میں ایسی دائمی وابستگی ہو، جیسی لباس کو جسم سے ہوتی ہے۔ دونوں صنفوں کا یہ تعلق انسانی معاشرت کا سنگِ بنیاد ہے۔ اس تعلق کو خالق کائنات رحمت و محبت ہی کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے قرآن پاک میں فرمایا ہے۔ خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ: یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے خود تم ہی میں سے جوڑے بنائے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی ہے۔

قرآن پاک کے نزدیک نکاح یا شادی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مرد و عورت ایک دوسرے کے لیے مصیبت بن جائیں بلکہ قرآنی تعلیم کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں کے ملاپ سے ایک خوشحال زندگی پیدا ہو جس میں نہ کدورت ہو نہ بغض و حسد ہو، نہ پریشانی اور انتشار ہو بلکہ معاشی، اقتصادی، اخلاقی، تمدنی اور تہذیبی، خانگی و بیرونی معاملات نقص سے پاک ہوں۔ یہ زندگی اور اس کا تصور اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کہ میاں بیوی اس ہدایت اور رہنمائی کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔ اس تعلیم میں کچھ حدود ہیں کچھ حقوق و فرائض ہیں جو دونوں کے لیے مساوی طور پر حکم رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان احکام کی خلاف ورزی کرے تو اس کے برے نتائج سے بچ نہیں سکتا۔ لہٰذا ہماری مسلم برادری بھی اس سلسلے میں اپنے مذہب کو چھوڑ کر جن راستوں کو اپنائے ہوئے ہے، اس کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ احکام شریعت جامد نہیں بلکہ حرکت و عمل چاہتے ہیں۔ اس کے قوانین میں لچک قرآن پاک کے الفاظ کی جامعیت اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری کتاب صحیح راستہ بتا کر صحیح سمت کی طرف رہنمائی کر دیتی ہے اور ایسی حدیں بھی بتا دیتی ہے جن کو عبور نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس راستے پر خس و خاشاک کنکر پتھر دیکھ کر چلنا ہے۔ آنکھ بند کر کے چلنا اسلام نہیں سکھاتا مسلمانوں کو ہر زمانے میں وقت کی ضرورت کے لحاظ سے بتلائے گئے راستے پر اپنی جزئیات خود طے کرنی پڑتی ہیں۔ اسلام تو انسانی ترقی کا مذہب ہے۔ اس کا مقصد جمود یا تنزل یا ذہنی و جسمانی غلامی نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کا مقصد ہمیشہ ترقی، ارتقاء اور آزادی رہا ہے۔

اسلام نے جن جاہلانہ رسموں کو ختم کیا تھا سماج کی جن

برائیوں کو مٹایا تھا، آج ہم پھر ان کو زندہ کیے ہوئے ہیں
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ اور مطلقہ عورتوں سے نکاح
کرکے یہ ثابت کر دیا تھا کہ یہ کوئی عیب یا حقارت کی بات
نہیں۔ مگر مسلمانوں نے پھر اس کی تحقیر شروع کر دی
شادی جو اسلام میں سب سے آسان کام تھا آج جہیز
اور غیر ضروری رسم و رواج میں جکڑ کر ایک مصیبت بن
گئی۔ تعدد ازدواج کوئی اسلامی چیز نہیں بلکہ یہ تو ایک
رعایت ہے جو خاص حالات میں چند سخت شرائط کے
ساتھ دی گئی ہے اور ان شرائط کے پورا نہ ہونے
پر اس کی ممانعت بھی ہے۔ طلاق کی اجازت اور حق جو مردوں
کو دیا گیا ہے وہ بھی درحقیقت ایک طرح کی آزادی ہے۔ اگر آج ہمارے
سماج میں بیوہ اور مطلقہ عورتوں کی تحقیر نہ ہو اور لوگ اسی طرح اُن
سے نکاح کرنا برا نہ سمجھیں جیسے اُس زمانے میں تھے تو یہ ایک آزادی
ہے سزا نہیں۔ اسلام درحقیقت ایک پورا نظامِ زندگی ہے اور تمام
فاسد نظاموں کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ وہ اس بزدلی اور مرعوبیت
کو گوارا نہیں کرتا کہ ہم اپنے اسلامی نظام کا جوڑ دوسروں کے
رسم و رواج کے ساتھ لگائیں۔ پھر اسلام کو الزام دیں۔

جن سماجی برائیوں کو اسلام نے ختم کیا تھا، ہم پھر ان ہی
میں گرفتار ہیں۔

"وہی فتنہ ہے لیکن ایک نئے سانچے میں ڈھلتا ہے"۔ وہ
جہالتِ اولیٰ کی عورت تھی جو حقوق سے محروم تھی۔ آج جہالتِ ثانیہ
کی تعلیم یافتہ عورت ہے جو حقوق پاکر کھو رہی ہے۔ یہ اس سے بھی
زیادہ افسوس کی بات ہے۔ اس لیے عورتوں کو ذاتی مفاد کو
پس پشت ڈال کر اجتماعی مفاد کے لیے جد و جہد کرنی چاہیے اور
سماج کی برائیوں کو مٹانا چاہیے۔

بے دینی کی زندگی گزارتے ہوئے ہم مذہبی حقوق کا
مطالبہ کرتے ہیں۔ ذرا غور کریں کہ جب تک ہم لوگوں میں دینی
روح بیدار نہ ہوگی اور ذمہ دارانہ طریقہ سے زندگی گزارنے
شعور پیدا نہ ہوگا۔ کون کس کو حق دے سکتا ہے اور کون لے سکتا
ایمان اور خوفِ خدا ہی وہ محرکات ہیں جو انسان کو فرائض کی ادائیگی
آمادہ کرتے ہیں جب تک ہم لوگ اپنی قوم میں اخلاقی حس کو بیدار نہ کر
گے سماج کے ان زخموں کا علاج ممکن نہیں۔ عدل و انصاف پر معاشرے
تعمیر ہو، ہر شخص اپنے فرائض کو سمجھے اور ادا کرے اور اس کے لیے ہمیں اُس
راستے کی طرف لوٹنا پڑے گا جس سے ہم بے خبر ہو چلے ہیں۔ یہ اور بھی حیر
کی بات ہے کہ بغیر سوچے سمجھے اجتہاد کا مطالبہ کیا جاتا ہے ایسے حضر
کو یہ جاننا ضروری ہے کہ اجتہاد کب اور کس وقت کیا جاتا ہے اور
کون اس کے اہل ہیں۔ اب نبی بھی آچکے اور آخری کتاب بھی آچکی
اب جو حلقہ بگوش اسلام ہیں انھیں اس کتاب کے قوانین کا پابند
ہوگا نہ کہ کتاب کے قوانین میں ترمیم کی فکر کریں۔ بقول علامہ اقبا
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں + ہوئے اس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق
ہم نے اسلام کو قبول کیا ہے، اسلام نے ہمیں قبول نہیں کیا
اس کے قوانین ہماری رائے کے ساتھ گردش کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا
مکمل ترین کلام ہے جو چودہ سو سال کا آزمودہ ہے اور باوجود کوش
کے اس میں کوئی ترمیم و اضافہ نہ کر سکا۔ ہماری فلاح اسی میں ہے ک
ہم اس دین کے لیے علمبردار بنیں کہ بہترین امت کے فرائض ادا کرنے
والے ہو جائیں۔ عورتوں نے جب بھی تعمیر معاشرت میں حصہ لیا تو
مردوں سے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ وقت کی پکار ہے کہ ہم خو
اور اپنے متعلقین کو علوم اسلامی سے روشناس کرائیں اس راست
پر چلیں اور اس کو پھیلائیں۔ قرآن پاک نے بھی یہ فرض ہم پر
عائد کیا ہے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس
تامرون بالمعروف وتنہون عن المنکر
(تم بہترین امت ہو جو کہ لوگوں کو بھلائی کا حکم
دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے
ہوں گے)۔

شعبہ اردو

اے ایم یو

آخری قسط

اردو اور سفارشات

۶۶۔ ریاستیں اور مرکزی علاقے مکمل اعداد و شمار بیچ وقت پر لسانی اقلیتوں کے کمشنر کو پیش کر دیں۔

۶۷ رسائل اور دیگر مطبوعات پر ڈاک کی شرح میں حکومت کافی رعایت دے۔

۶۸ مرکزی حکومت قومیائے بینکوں اور دوسرے مالی اداروں کو ہدایت کرے کہ وہ اردو پریس کی مالی ضرورتوں کو پورا کریں۔

۶۹ اردو اخبارات چلانے کے لیے کوآپریٹیو کی ہمت افزائی کی جائے۔

۷۰۔ اردو اخبارات کو طباعتی مشینیں درآمد کرنے کی اجازت دی جائے۔

۷۱ پریس انفارمیشن بیورو میں ایک مشورہ جاتی سیل قائم کیا جائے جو اردو پریس کو تکنیکی معاملات میں مشورہ دے۔

۷۲ چھوٹے اخبارات کو سہولت بہم پہنچانے کے لیے اخباری کاغذ کے بارے میں نئی پالیسی بنانے کے امکان پر غور کرے۔

۷۳ ریاستی حکومتیں کوآپریٹیو بینکوں یا فنانس کارپوریشن کے توسط سے چھوٹے اردو اخبارات کو عارضی قرضے دینے کا انتظام کریں کہ وہ منظور شدہ اخبار کا کاغذ حاصل کر سکیں۔

۷۴ ڈی۔ اے۔ وی۔ پی کی طرف سے رسائل کو اشتہارات دینے کے سلسلے میں اشاعتی تعداد کی جو شرط لگی ہوئی ہے اسے ان اخباروں اور رسائل کے بارے میں نرم کیا جائے۔ جو دانشوروں کے مطلب کے ہیں۔

۷۵ ڈی اے وی پی عوامی بیورو سے متعلق سائٹھ فیصدی وہ چھوٹے یا مجھولے اردو اخبارات کو دے۔

۷۶ ڈی۔ اے۔ وی۔ پی نمائشی اشتہارات کے سائز کو کم کر دے تاکہ چھوٹے اخبار و رسائل کے لیے گنجائش نکل سکے۔

۷۷ مرکز اور ریاستوں دونوں ہی میں تمام سرکاری اشتہارات۔ ڈی۔ اے وی۔ پی جیسی مرکزی ایجنسی کے ذریعہ دیے جائیں۔

۷۸ درجہ بند اشتہارات میں اردو اخبارات کو واجب حصہ ملنا چاہیے۔

۷۹۔ اشتہارات کے نرخ تجارتی خطوط پر متعین کیے جائیں۔ لیکن چھوٹے اور درمیانی اخبارات کے مفادات کا بھی خیال رکھا جائے۔

۸۰۔ حکومت یہ دیکھے کہ چھوٹے اردو اخبارات کے پیش کردہ بلوں کی ادائیگی فوری ہو جایا کرے۔

۸۱ اخباری صنعت سے متعلق لوگوں کے لیے انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونیکیشن مختصر تجدیدی کورس کا انتظام کرے۔ پنجاب یونیورسٹی اسد صحافتی

تعلیم کا انتظام کرے۔

۸۲۔ ریاستی حکومتیں اردو اخباراتی رابطہ دفتر قائم کریں جو سرکاری پالیسیوں اور ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں اردو اخبارات کو اطلاعات فراہم کریں۔ یہ دفاتر اردو اخبارات میں شائع ہونے والے مواد کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر سکتے ہیں۔

۸۳۔ ریاستی اور ممکن ہو تو ضلعی سطح پر مناسب پریس مشاورتی تنظیم قائم کی جائے۔ یہ تنظیم صحافتی اخلاقیات کا جائزہ لیتی رہے۔ اردو اخبارات کو اس میں مناسب نمائندگی ملے۔

۸۴۔ حکومت کچھ روپیہ مہیا کرے جس سے اردو کے شعری، افسانوی اور مزاحیہ ادب کو دیوناگری رسم خط میں شائع کیا جائے اور ایسے ہی ہندی تصانیف کو اردو۔ اشاعتی کام کی ذمہ داری کوئی نیم سرکاری تنظیم لے سکتی ہے۔

۸۵۔ بین لسانی لین دین کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔ ہندی ادب کی تاریخ کو اردو ادب میں اور اردو ادب کی تاریخ کو ہندی ادب میں شامل کیا جائے۔ یونیورسٹیوں میں علماء سے درخواست کی جائے کہ وہ ہندی کے طالب علموں کو خطاب کریں اور ایسے ہی اس کے برعکس۔

۸۶۔ مرکزی اور ریاستوں کی وزارتوں اور تعلیم و ثقافت کے شعبوں نیز ملک میں قائم شدہ مختلف اکادمیوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بجٹ کا معتد بہ حصہ سماجی اور طبیعاتی علوم وغیرہ کی کتابوں کی اشاعت کے فروغ کے لیے محفوظ کر دیں۔

۸۷۔ اردو کی تکنیکی ادب اور سائنسی اصطلاحات بین الاقوامی استعمال پر مبنی ہوں اور تمام ہندوستانی زبانوں میں یکساں ہوں۔ سماجی اور انسانی علوم کی مسلمہ اردو اصطلاحات کو قبول کرنے میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

۸۸۔ علیحدہ اردو اکاڈمیوں کے قائم ہونے تک اردو مصنفوں اور عالموں کو ریاستی ساہتیہ اکاڈمی میں واجب نمائندگی دی جائے۔

۸۹۔ ریاستی اکاڈمیاں اردو میں کتابیات انسائیکلوپیڈیا وغیرہ جیسی حوالہ جاتی کتابوں کو مرتب کرانے کا انتظام کریں۔ اس معاملہ میں اکاڈمی کے موجودہ رویہ کو تبدیل کرنا ہوگا۔

۹۰۔ وزارت تعلیم ریاستوں سے گفتگو کرے کہ مصنفوں کو امداد اور ترغیب دینے کے لیے مربوط پروگرام بنائیں۔

۹۱۔ مصنفین کی اپنی کتابوں کی اشاعت کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتیں امداد دیں اور اس مقصد کے لیے بنک قرضے بھی دیں۔

۹۲۔ سرکاری اکاڈمی کے انعامات کے لیے مصنفین کو منتخب کرنے والی کمیٹیوں میں عالموں اور مصنفوں کی نمائندگی بھی ہونی چاہیے۔ کمیٹی کی تشکیل علمیت اور فضیلت کی آئینہ دار ہو، نہ کہ محض بزرگی کی۔

۹۳۔ ساہتیہ اکاڈمی کی سرپرستی بشمول ترجموں کی تفویض کے بوجہ مساوی تقسیم ہو تاکہ کسی لسانی گروہ کو شکایت نہ پیدا ہو۔

۹۴۔ اگرچہ بالعموم ہی ہندوستانی زبانوں کی کتابوں کی فروخت کے لیے پورے ملک میں کتب فروشوں

. . . . . . ضرورت ہے۔ بین سرکاری
اکادمی کی مطبوعات کی فروخت کو منظم کرنا اشد
ضروری ہے۔ ریلوے کتب دکانوں پر اردو کی
کتابوں کی نمائش بھی ہونا چاہیے

۹۵ مرکزی اور ریاستی حکومتیں اردو
مصنفین کو ضعیف عمری کا جو وظیفہ دیتی ہیں، ان
میں اضافہ ہونا چاہیے۔

۹۶ ان سرکاری امداد یافتہ اداروں کے
درمیان جو اشاعتی کام انجام دے رہے ہیں، ربط اور
اتحاد ہونا ضروری ہے۔ تاکہ جو کتابیں اشاعت کے لیے
منتخب ہوں ان میں تکرار نہ ہو۔ زبانوں سے متعلق تحقیقاتی
معاملات میں بھی اسی انداز کے کام کی ضرورت ہے۔

۹۰ تحفظ کے حقوق کے قانون میں ضرورت
ہو تو ترمیم کی جائے تاکہ مصنفین اور ناشرین کے مابین
حفظ حقوق اور معاوضہ کے معاہدے پر باقاعدہ دستخط
ہوں اور متعلقہ حکام کے پاس ان کی رجسٹری ہوا کرے

۹ اردو تصنیفات کی جعلی اور غاصبانہ اشاعت
مسئلہ کو حل کرنے کے ناشرین کو مجبور کیا جائے کہ وہ
دکو رجسٹرڈ کرائیں۔ ضرورت ہو تو قانون کا بھی سہارا لیا
سکتا ہے۔

عوام میں مطالعہ کی عادت کو بڑھاوا دینے کے لیے
یت کتابوں کی اشاعت کی ہمت افزائی ہونی چاہیے۔
ت کاغذ کی پیداوار بڑھا کر اور خواہش مند ناشرین
ے پیمانے پر مہیا کر کے ایسا کیا جا سکتا ہے۔ اس
د کے لیے جتنی جلد ممکن ہو حکومت کو اندرون
آفسیٹ پریس بنانے کا پراجکٹ شروع
ہا ہیے۔

۱۰۰ اردو ناشرین کے لیے انڈین انسٹی ٹیوٹ
آف ماس کمیونکیشن یا اسکول آف پرنٹنگ الہ آباد میں
تجدیدی کورس شروع کرنے چاہییں۔

۱۰۱ اردو کتابوں کے تجارتی پیمانے پر
اشاعت اور فروخت کے لیے حکومت کی امداد سے اردو
مصنفین کی کوآپریٹیو سوسائٹی قائم ہونی چاہیے۔

۱۰۲ انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونکیشن مصنفین
کی ورکشاپ کا انتظام کرے جہاں اردو اور ہندی کے
کے مصنفین تجارتی تحریروں، اشتہار بازی اور روابط عامہ
نیز کتابیں لکھنے اور تیار کرنے کی تکنیک وغیرہ میں اپنی
مہارت کو بڑھا سکیں۔ اس طرح کی ورکشاپوں کے اخراجات
میں مرکزی اور ریاستی حکومتیں مدد دیں۔

۱۰۳ اردو کتابوں کے برآمدی بازار کا بھی جائزہ
لیا جائے اور برآمدات کو بڑھانے کے لیے اقدامات کریں۔

۱۰۴ نیشنل لائبریری کلکتہ کے اردو
اسٹاف میں فوراً اضافہ کیا جائے۔ ہر سال
کے آخر میں لائبریری اردو کی تمام کتابوں کی
فہرست شائع کرے۔

۱۰۵ پرائیوٹ اردو لائبریریوں کو بہتر
بنانے اور اوقاف کو ادبی کانفرنسیں منعقد کرنے
کے لیے مناسب امداد دی جانی چاہیے۔

۱۰۶ ایسی اسکیم ہونی چاہیے جس
کے تحت ممتاز علماء کی خدمت کا اعتراف کیا
جا سکے۔ انھیں وظائف دیے جا سکیں تاکہ
وہ اپنی تحقیقی اور تصنیفی سرگرمیوں کو جاری
رکھ سکیں۔

تلخ، ترش، شیریں

اشتیاق محمد خاں

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر — کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاق

ایک انٹرویو

میر ساجد علی قادری: پچھلے بیس سال سے آپ جعفر سلیمان مسلم اسٹوڈنٹس ہوسٹل (بمبئی) کی نگرانی بحیثیت اعزازی نگراں (وارڈن، سپرنٹنڈنٹ) کرتے چلے آئے ہیں۔ ہزاروں طلبہ سے آپ کا تعلق رہا ہوگا اس نئی نسل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے

اشتیاق صاحب: میری رائے اس نوجوان نسل کے متعلق بالخصوص مسلم طلبا کو پیش نظر رکھتے ہوئے زیادہ اچھی نہیں ہے۔ لیکن اس کے مستقبل سے بہت پُرامید ہوں۔

قادری: اگر آپ اپنے اس بیان کی وضاحت فرمادیں تو بہتر ہوگا۔

اشتیاق صاحب: ہماری موجودہ نسل جو ۱۹۴۷ء کے بعد وجود میں آئی، خودرو پودے کی مانند ہے جس کی صحیح نگہداشت اور تربیت گھر سے لے کر اسکول کالج تک نہیں ہوسکی۔ اس نئی نسل کے جوانوں کے پاس کوئی نصب العین نہیں ہے۔ یہ بہت سی کمیوں یا Complexes کا شکار ہیں جیسے خود اعتمادی، احساس ذمہ داری، روزمرہ کی زندگی میں برتے جانے والے آداب، وقت وعدہ کی پابندی، اخلاقی جرأت، سنجیدہ مطالعہ اور مہم جوئی کی اسپرٹ جیسی خصوصیات ان میں خال خال نظر آتی ہیں۔ آزاد ملک کے شہری ہونے کے ناطے آزادانہ اور بے باکانہ اظہارِ خیال سے جھجکتے ہیں۔

قادری: کیا ان خامیوں اور کمزوریوں کے ذمہ دار صرف یہ نوجوان ہی ہیں؟

اشتیاق صاحب: جی نہیں۔ اصل ذمہ داری ان سیاسی اور معاشی عوامل اور سماجی نظام کی ہے جس نے رشوت، بیکاری، فرقہ پرستی، کالا بازاری، دوغلے اور بے ایمان لیڈروں کو جنم دیا ہے، اسی نظام معیشت نے ان کو احساس کمتری اور بزدلی کا شکار بنا دیا ہے۔ ان کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ اس نسل کے لیے "کس طرح جئیں اور کیسے گزارا کریں" کا مسئلہ سب سے بڑا اور بھیانک مسئلہ ہے جو ہر وقت بھوت بن کر ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں یہ اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش سے زیادہ تعلیم کے بعد ملازمت حاصل

قادری۔ آپ نے اس نئی نسل میں کچھ خوبیاں یا اچھائیاں بھی پائیں؟

اشتیاق صاحب۔ جی ہاں، سو خوبیوں کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ حالات کی سنگینی نے اُن کو اب یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کوئی رشتہ دار، دوست اب کام نہیں آتا۔ جو کچھ حاصل کرنا ہے اپنے ہی بل بوتے پر کرنا ہے۔ گویا کہ زندگی کو بنانے میں "ذاتی" محنت و عمل' کا رجحان ان میں بڑا ہی خوش آئند ہے۔

قادری: طلباء کا کریکٹر بنانے یا سنوارنے میں ہوسٹل کیا رول ادا کرسکتے ہیں؟

اشتیاق صاحب: یہ میرا یقین ہے کہ نوجوانوں کی کردار سازی اور ان کی صحیح رہنمائی کا کام صرف ہوسٹل یا دار الاقامے ہی انجام دے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہوسٹل کے منتظمین بالخصوص نگراں (وارڈن) شعوری طور پر جذبۂ خلوص وایثار کے ساتھ اس کام کو اپنا مشن بنالیں۔ سر سید احمد خاں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو روزِ اوّل ہی سے اقامتی رکھا، جس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے۔ ایک عرصۂ دراز تک علی گڑھ کے طلباء اپنے رہن سہن، ڈسپلن بیباکانہ اور مہذبانہ طرزِ گفتگو اور بھائی چارگی میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے اور یہ سب کچھ اقامتی زندگی کی دین تھا۔

قادری: آج کل مسلم طلباء میں سیاسی شعور ختم ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے۔

اشتیاق صاحب: میں آپ کی اس بات سے متفق نہیں۔ سیاسی شعور تو ہے لیکن سیاست میں عملی طور سے حصہ نہیں لیتے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ فی الحال اس کی تفصیل میں بیان نہیں کروں گا۔

قادری: کیا آپ نے ہوسٹل کے طلباء میں سیاسی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی؟

اشتیاق صاحب: کبھی نہیں۔ بحیثیت نگراں یا وارڈن میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں سیاسی شعور اُجاگر کروں۔ میرا کام دراصل ہوسٹل میں رہنے والے طلباء کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے ساتھ ساتھ مل جل کر ایک منظم شکل میں زندگی گزارنے کے لیے رہنمائی کرنا ہے۔

قادری: کیا آپ کسی سیاسی جماعت کے ممبر ہیں؟ اگر نہیں تو آپ کا اپنا کوئی سیاسی نظریہ ہے؟

اشتیاق صاحب: میں کسی جماعت کا ممبر نہیں۔ ہاں اپنا ایک نظریہ ہے جو سیاسی کم معاشی زیادہ ہے جس کی وضاحت علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کی ہے۔

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

"تمہاری ضرورتوں سے زیادہ جو تمہارے پاس ہو اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو"

علامہ اقبال نے یہ شعر اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے کہا تھا، اگر اس وقت وہ زندہ ہوتے تو لفظ "شاید"، "یقیناً" میں ضرور بدل جاتا۔

قادری: آپ کا ہوسٹل ڈسپلن کے لحاظ سے بہت مشہور ہے۔ جب یہاں پچاس طلبا تھے تب آپ نگرانی کرتے تھے اور نئی بلڈنگ تعمیر ہو جانے کے بعد تعداد دو سو سے اوپر پہنچ گئی۔ تب بھی آپ تنہا ہیں اور ڈسپلن برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ جبکہ ہوسٹل کے کام کے علاوہ آپ ملازمت بھی کرتے ہیں۔ شہر کی مختلف سرگرمیوں اور کلچرل پروگراموں

میں بھی بھرپور طریقہ سے حصہ لیتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ آپ کس طرح کر لیتے ہیں۔

اشتیاق صاحب:- میاں قادری، یہ سوال اکثر لوگ مجھ سے کرتے ہیں کہ ملازمت کے باوجود آپ اتنے مختلف کام کیسے کر لیتے ہیں۔ میرا سب کو ایک ہی جواب ہے کہ ممبئی کی تیز رفتار اور کٹھور زندگی نے وقت کی پلاننگ کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا گر سکھا دیا ہے اور یہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کا اپنا کوئی نصب العین ہو یا جس نے اپنے لیے زندگی میں کوئی اعلیٰ مقصد کا تعین کیا ہو۔

رہے انتظامی معاملات تو اسکول و کالج سے لے کر ہوسٹل اور حکومت تک سب ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ ڈسپلن برقرار رکھنے کے لیے چند بنیادی باتوں اور اصولوں کا ہونا بہت ضروری ہے کسی بھی عہدیدار افسر یا حاکم کا مخلص ہونا ضروری ہے ساتھ ساتھ سخت گیر بھی۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر تنبیہ کر کے ان کو درگزر کر دینا چاہیے۔ ہر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے انسانی پہلو کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ تنبیہ اور وارننگ کے بعد بھی اگر کوئی غلطی یا جرم کا مرتکب ہو تو سزا دینا ضروری ہے۔ طلباء کے ساتھ بالخصوص ہمدردانہ رویہ اور دوستانہ رویہ رکھنا چاہیے۔ لیکن شرارتی عناصر کے ساتھ سختی سے پیش آنا ضروری ہے۔ کسی بھی معاملہ میں جانبدارانہ رویہ ڈسپلن کو ختم کر دیتا ہے۔ ان ہی چند اصولوں کو اپنا کر اور اُن پر عمل پیرا ہو کر اس ہوسٹل میں ڈسپلن پچھلے بیس سال سے برقرار ہے۔

قادری:- کہا جاتا ہے کہ موجودہ نسل مذہب بیزار ہے یعنی مذہب کی طرف رجحان ختم ہوتا جا رہا ہے ہوسٹل کے تجربے اور طلباء سے قریبی تعلق کی بنا پر آپ کی کیا رائے ہے؟

اشتیاق صاحب:- میری رائے میں نوجوان مذہب بیزار تو نہیں۔ البتہ مذہبی معلومات کی کمی ضرور ہے اور اس کی وجہ سیاسی ماحول اور معاشی بحران ہے۔ جس نے کٹر مذہبی لوگوں تک کو "مادہ پرست" بنا دیا ہے۔

مذہبی تعلیم جو دراصل گھر سے شروع ہونا چاہیے، آج نچلے اور متوسط طبقے کے گھرانوں میں ممکن نہیں ہے۔ آمدنی کم اخراجات زیادہ گذارہ ہو تو کیسے؟ یہی فکر والدین کو دامن گیر رہتی ہے۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں کہ بچے کی اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کی نگرانی یا انتظام کر سکیں۔

اس کے علاوہ ہمارے دینی رہنما اور مذہبی شخصیات نوجوان نسل کو متاثر کرنے سے قاصر ہیں۔ علماء میں گفتار کے غازی تو شہر در شہر مل جائیں گے، لیکن کردار کے غازی خال خال ہی کہیں ملیں گے۔

قادری:- آل انڈیا پیمانہ پر مسلم نوجوانوں کی تربیت و تنظیم کے بارے میں کبھی آپ نے کچھ سوچا ہے؟

اشتیاق صاحب:- میاں سوچا تو بہت کچھ ہے لیکن محض سوچنے سے گاڑی آگے نہیں بڑھتی

قادری:- پھر بھی بہتر ہوگا اگر آپ اس سلسلے میں

...کا اظہار کر رہیں۔

اشتیاق صاحب:- میری رائے میں اس وقت نام نہاد لیڈروں سے کہیں زیادہ مخلص نوجوان منتظمین (Organisers) کی ضرورت ہے جو ملک کے گوشہ گوشہ میں بہترین طلبا، سائنس داں، آرٹسٹ یا فن کار، بہترین کھلاڑیوں اور دستکاروں کو منظم کر سکیں یہی تنظیم بیروزگاروں کو روزگار مہیا کرنے کی کوشش کرے اور معلومات بہم پہونچائے۔ قومی بینکوں کی طرف سے بہت ساری اسکیمیں نکالی گئی ہیں، جن سے چھوٹے موٹے دھندے شروع کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان اسکیموں کا علم بہت سے نوجوانوں کو نہیں ہے۔

یہ تنظیم بلا امتیاز مذہب و فرقہ غریب ترین بچوں کی تعلیم کے اخراجات بھی برداشت کرے۔

قادری:- سر۔ ایک آخری سوال اور پوچھنا چاہوں گا۔

اشتیاق صاحب:- پوچھیے

قادری:- طلبا کے مثالی ڈسپلن کے سلسلہ میں دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلے میں آپ اکثر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کی مثال پیش کرتے تھے۔ لیکن پچھلے دو سالوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دو مرتبہ بند کی گئی۔ ایسا کیوں اور کیسے ہوا۔ کیا آپ اب بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا کو ڈسپلن کے لحاظ سے مثالی کہیں گے۔

اشتیاق صاحب:- میاں قادری! آپ نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا ہے گویا دکھتی ہوئی رگ پکڑ لی ہے۔

بہر حال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پچھلے سالوں میں جو کچھ بھی ہوا، واقعی افسوسناک ہے۔ یہ ایک الگ موضوع بحث ہے جو تفصیل اور وقت طلب ہے۔ پھر کبھی اس سلسلہ میں گفتگو ہوگی۔ لیکن ایک بات بہت یقین کے ساتھ کہوں گا اور وہ یہ کہ ہاتھی لٹے تب بھی سوا سو من کا رہتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا دوسری یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں بگڑے ہوئے حالات میں بھی بہت بہتر ہیں۔

قادری:- میں چاہوں گا، بلکہ درخواست کروں گا کہ مسلم نوجوانوں کو کوئی مفید پیغام دیں۔

اشتیاق صاحب:- بھئی قادری، آپ مجھ سے کیوں یہ بدعت کروانا چاہتے ہیں۔ میں وعظ و نصیحت کا شروع سے قائل ہی نہیں ہوں۔ انسانی دنیا عمل ہے۔ (؟) اس نسل پر بھی صرف عمل کا جادو چل سکتا ہے۔ وعظ و نصیحت کا نہیں۔

قادری:- لیکن یہ میری دلی خواہش ہے کہ نوجوانوں سے کچھ اچھی باتیں کہہ دیں۔

اشتیاق صاحب:- اچھا نہیں مانتے ہو تو سنو۔

"اچھی چیز جہاں ملے، اپنا کھویا ہوا سرمایہ سمجھ کر اپنا لو۔"

کمزور اور پسماندہ طبقوں کی حتی المقدور

محمد اقبال انصاری
صدر شعبۂ اسلامیات
اے ایم یو

شیخ عبدالحق محدث دہلوی

سولہویں صدی عیسوی مسلمانانِ ہند کے لیے سخت ابتلا و آزمائش کا دور تھا۔ اگرچہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی، مگر مذہب میں ریشہ دوانیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر کس و ناکس مذہب پر کھلا جا بیجا تنقید کرنے لگا تھا اور اس کا سلسلہ شاہی مجالس تک پہونچ گیا تھا، جس نے عہد اکبری میں 'دین الٰہی' کی شکل اختیار کی۔ اس پرفتن ماحول میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی جنوری ۱۵۵۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے شیخ اولیا سے ہجری سن ولادت نکلتا ہے۔

آپ کے مورثِ اعلیٰ آغا محمد ترک (م ۱۳۲۸ء) سلطان علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶ء) کے عہد میں بخارا سے ترکوں کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ ہندوستان

بقیہ مضمون "تلخ، ترش، شیریں"

اس طرح مدد کرو کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور تمہارے دوست بن جائیں۔ سیر و سیاحت ضرور کرو۔ تاریخی عمارتیں، قدرتی مناظر کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ مختلف ملکوں، شہروں اور گاؤں کے عوام کی اسٹڈی کرو

شکوہ شکایت کا دور ختم ہوا۔ احساس کمتری کے لباس کو اتار پھینکو
پریشانیوں اور تکلیفوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔

کسی کی سفارش اور سہارے کے بغیر اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنی شخصیت کی تعمیر کرو۔

ایک خوددار، غیور اور آزاد شہری کی حیثیت سے سمندروں، پہاڑوں اور میدانوں کی فضاؤں میں مانند شاہین مہم جوئی کا اس طرح آغاز کرو کہ "دوست کیا دشمن بھی جینے کی دعا دینے لگیں"
تمہارا یقین ہو تو ایسا ہو۔

وطن کی ریت مجھے ایڑیاں رگڑنے دے
مجھے یقین ہے پانی یہیں سے نکلے گا

تمہارا عزمِ بلند شاہیں صفت ہو

برہنہ سر ہے تو عزمِ بلند پیدا کر
یہاں فقط سرِ شاہیں کے واسطے ہے کلاہ

مراتب و عہدوں سے نوازا اور اپنے امرا کی جماعت کے ساتھ گجرات کی مہم پر روانہ کر دیا۔ جس کی فتح کے بعد انھوں نے وہیں کی سکونت اختیار کر لی۔ مگر ایک حادثہ میں ان کے سب سے بڑے لڑکے ملک معز الدین کے علاوہ بقیہ سو لڑکے ہلاک ہوگئے۔ اس سانحہ سے بددل ہو کر آغا محمد ترک ماتمی لباس پہن کر دہلی آئے اور شیخ صلاح الدین درویش سہروردی (م ۱۳۴۸ء) کی خانقاہ میں معتکف ہوگئے اور وہیں ۱۳۴۸ء میں وفات پائی۔

باپ کے انتقال کے بعد ملک معز الدین نے صبر و ضبط اور عزم و ہمت سے کام لے کر دہلی میں سکونت اختیار کی اور اس ماتمی ماحول کو رفتہ رفتہ ختم کیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے ملک موسیٰ نے بہت عزت و شہرت حاصل کی مگر فیروز شاہ تغلق کے ۱۳۸۸ء میں انتقال کے بعد ملکی حالات اس قدر بدتر و ناگفتہ بہ ہوگئے کہ دیگر علما و مشائخ کی طرح وہ بھی دہلی کو خیرباد کہہ کر ماوراء النہر چلے گئے۔ لیکن ۱۳۹۸ء میں جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کی فوجوں کے ہمراہ پھر یہاں واپس آگئے ان کے بیٹوں میں شیخ فیروز (م ۱۴۵۵ء) بہت لائق فائق تھے اور علوم دینیہ و دنیویہ میں یکتائے روزگار تھے ان عمر نے وفا نہ کی اور بہرائچ کے ایک معرکہ میں شہید ہوگئے۔

ان کے انتقال کے کچھ روز بعد ہی شیخ محدث کے دادا شیخ سعد اللہ (م ۱۵۲۱ء) پیدا ہوئے جن میں شہید باپ کی ساری خوبیاں موجود تھیں۔ تعلیم کے بعد انھوں نے عبادت و ریاضت کی طرف اور شیخ سعد ننگرہے کے ہاتھ پر بیعت کر کے جذب و سلوک کے مراحل طے کیے اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنے زمانے کے شیخ کامل بن گئے۔

ان کے دو بیٹے شیخ رزق اللہ مشتاقی (۱۴۹۱-۱۵۸۱) اور شیخ سیف الدین (۱۵۱۴-۱۵۸۲ء) بہت ہی مشہور ہوئے۔ وصال سے کچھ روز قبل اپنے موخر الذکر بیٹے کو مکان کے بالائی حصہ میں لے گئے۔ اور نماز تہجد کے بعد قبلہ رو کھڑا کر کے دعا مانگی " بار الہا۔ میں دوسرے لڑکوں کی تربیت کے فرض سے عہدہ برا ہو چکا ہوں لیکن صرف اس آٹھ سالہ بچے کو یتیم و بے سہارا تیرے سپرد کر رہا ہوں تو ہی اس کی دستگیری فرما"۔ یہ کہہ کر نیچے اتر آئے اور کچھ ہی دنوں بعد ۱۵۲۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا

اللہ پاک نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں اور کچھ ہی دنوں بعد آٹھ سالہ یتیم بچہ دہلی کی ایک نہایت باعزت و وقعت شخصیت بن گیا اور اسی کے گھر میں ۱۵۵۱ء کو علم و فضل اور زہد و تقویٰ کا وہ درخشندہ آفتاب طلوع ہوا جس نے ملک کی ساری فضا کو علم و فضل اور عبادت و ریاضت سے جگمگا دیا اور شیخ عبدالحق محدث کے نام سے مشہور ہوا۔ شیخ محدث کی والدہ مولانا زین العابدین المعروف بہ شیخ ادہن دہلوی کی صاحبزادی تھیں جو شیخ سماء الدین سہروردی کے مرید اور شیخ میاں عبداللہ تلنبی کے شاگرد خاص تھے اور اس طرح انھیں روحانی و علمی دنیا میں ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ اور اس طرح دادیہال اور نانیہال دونوں طرف سے شیخ محدث اعلیٰ علمی و روحانی ورثہ کے حامل تھے اور اسی نے انھیں بہت مختصر عرصہ میں یگانۂ روزگار بنا دیا۔

شیخ سیف الدین کو اپنے اس بیٹے سے بڑا گہرا قلبی لگاؤ تھا اور اسی سبب وہ شب و روز

ابھی آغوش ہی میں تھے اس کی تربیت میں مشغول رہے۔ چنانچہ ابتدائی تعلیم خود ہی دی اور وہ بھی اس نئے انداز سے کہ حروف تہجی سکھائے بغیر قرآن مجید کی کچھ سورتیں یاد کرا دیں اور اس طرح دو تین مہینہ میں پورا کلام پاک ختم ہو گیا۔ اس کے بعد لکھنے کی طرف توجہ کی اور ایک ماہ کی قلیل مدت میں وہ بھی سکھا دیا۔ جب کہ آپ کی عمر تین چار سال سے متجاوز ہوئی تھی۔ اس کے بعد آپ نے والد ہی کی سرپرستی میں عربی فارسی کی تعلیم شروع کی جنھوں نے اس زمانہ کے مروجہ نصاب یا طریقہ تعلیم کا لحاظ کیے بغیر جس کتاب کو مناسب خیال کیا پڑھایا اِس لیے کہ ان کی دلی تمنا تھی کہ وہ اپنے جگر گوشہ کے سینہ میں وہ تمام علوم منتقل کر دیں جو انھیں عمر بھر کے ریاض کے بعد حاصل ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۸ سال کی عمر میں آپ نے تمام علوم نقلیہ وعقلیہ پر دستگاہ حاصل کر لی اور ساتھ ہی باپ نے ابتدا ہی سے علوم ظاہری کے ساتھ علوم باطنی کی تربیت کا پورا پورا خیال رکھا اور اپنے بیٹے کے سینہ میں عشق حقیقی کے وہ جذبات پھونک دیے جو تا عمر ان کے قلب وجگر کو گرماتے رہے۔ چنانچہ ابتدائی زمانہ میں ہی وہ شب بیداری اور عبادت و ریاضت کے پابند ہو چکے تھے جس میں عمر کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ اور ساتھ ہی علماء ومشائخ کی صحبتوں سے بھی مستفید ہونے لگے۔ شیخ اسحاق ملتانی (م ۱۵۸۲ء) اس زمانہ میں سہروردیہ سلسلہ کے بڑے بزرگوں میں تھے جو ملتان سے دہلی آ گئے تھے۔ مگر بے حد کم گو تھے۔ البتہ جب شیخ محدثؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو خصوصی لطف وکرم والتفات فرماتے

علوم ظاہری و باطنی حاصل کرنے کے بعد شیخ کچھ دنوں درس و تدریس میں مشغول رہے۔ اور کچھ عرصہ فتح پور سیکری میں بھی رہے جہاں شہنشاہ اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۶) کے درباریوں نے ان کی بڑی عزت افزائی کی مگر وہاں جس طرح شرع کی بے حرمتی ہو رہی تھی۔ بدعات اور سیئات کا جو دور دورہ تھا اور ابوالفضل و فیضی نے جو دینی انتشار برپا کر رکھا تھا اس سے دل برداشتہ ہو شیخ محدثؒ نے ہندوستان چھوڑنے کا عزم کر لیا اور ۱۵۸۶ء میں جب کہ اُن کی عمر سینتیس[۳۷] سال کی تھی۔ مالوہ اور مانڈو ہوتے ہوئے احمد آباد پہونچے جہاں طبقاتِ اکبری کے مصنف مرزا نظام الدین احمد بخشی تھے انھوں نے بڑی قدر و منزلت سے انھیں ٹھہرایا اور چونکہ حجاز کا موسم گزر چکا تھا اس لیے مرزا کے بیحد اصرار پر شیخ محدثؒ نے آئندہ موسم تک وہاں قیام کیا اور اس عرصہ میں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی سے جو اپنے زمانہ کے جید عالم تھے اور علوم دینی کے علاوہ علوم باطنی میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ عالیہ قادریہ، چشتیہ، مغربیہ اور شطاریہ سلسلوں میں اکتسابِ فیض کیا اور ماہ رمضان سے کافی قبل مکہ مکرمہ پہونچ کر وہاں کے محدثین سے صحیحین کا درس لیا اور پھر شیخ عبد الوہاب متقیؒ سے اکتسابِ علم ظاہری و باطنی کیا جو ہندوستان کے ان متبحر علماء میں تھے جنھوں نے مکہ مکرمہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر ساری علمی دنیا پر اپنے علم وفضل کا سکہ جما دیا۔ شیخ محدثؒ نے سب سے پہلے اُن سے حدیث کی مشہور کتاب مشکوۃ المصابیح کا درس لینا شروع کیا اور اسی عرصہ میں شیخ کے ساتھ معتکف رہے اور فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ اور پھر اُن سے اجازت لے کر مدینہ منورہ

میام لیا اور زیارت و قربت نبوی سے سرفراز ہوئے۔ پھر واپس آکر مشکوٰۃ کے درس کی تکمیل کی اور پھر شیخ کی نگرانی میں عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ اور ساتھ ہی تصوف کی کچھ کتابیں بھی پڑھیں اور صحیح مسلم شریف کی اجازت بھی حاصل کر لی۔

علم ظاہری و باطنی کی تعلیم اور سلوک و معرفت کی تکمیل کے بعد شیخ عبدالوہاب متقیؒ نے ایک دن آپ کو وطن واپسی کی ہدایت کی۔ مگر وہ ہندوستان کے حالات سے کچھ اس قدر دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ طبیعت واپسی پر آمادہ ہی نہ ہوتی تھی۔

بالآخر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری دیتے ہوئے براہ بغداد واپسی کی اجازت چاہی۔ مگر شیخ نے اسے منظور نہیں لیا اور فرمایا کہ

"گھر جاؤ تمہاری والدہ اور بچے پریشان ہوں گے اور تمہارے منتظر ہوں گے۔۔۔۔۔۔ حق شرع سب پر مقدم ہے۔ غوث اعظم تمہارے ساتھ ہیں جس جگہ بھی رہو۔۔۔۔۔۔ ان کی پیروی کی کوشش کرو اور ان کے حکم پر چلو۔ وہ اس سے ہرگز خوش نہ ہوں گے کہ تم اپنی والدہ اور چھوٹے بچوں کو ایذا دو۔ تم خود کہتے تھے کہ میری والدہ نے مجھے حرمین شریفین جانے کی اجازت دی ہے۔ اور تاکید کر دی ہے کہ تیسری جگہ نہ جانا۔ اس حالت میں تم یہیں نہ رہ سکتے ہو"

الغرض شیخ کے حکم سے مجبور ہو کر شیخ محدث ۱۵۹۱ء میں وطن واپس ہوئے اور دہلی میں مسند درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور وعظ و ارشاد بچھا دی اور بقیہ عمر اسی میں گزار دی اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے لائق تلامذہ اور ان کی گرانقدر تصانیف سے علم دین کا چراغ روشن رہا اور ہنوز دلیل راہ بنا ہوا ہے۔

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

(باقی آئندہ)

۱۔ خلیق احمد نظامی: حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی (دہلی، ۱۹۵۳ء) ص ۱۱۹ و ۱۲۰ بحوالہ اخبار الاخیار

علی گڑھ کے شب و روز

انجینئرنگ کالج میں ورکشاپ

ڈائی کاسٹنگ سوسائٹی آف انڈیا اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف میٹلس (دہلی چیپٹر) کے اشتراک سے ذاکر حسین کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنولوجی میں ۲۸ جولائی کو ڈائی کاسٹنگ پر ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں دہلی اور علی گڑھ کے دیگر صنعتی اداروں نے بھی شرکت کی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد نے ورکشاپ کا افتتاح کیا۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے جناب سید حامد نے فرمایا کہ سائنس اور ٹیکنولوجی کے میدان میں جو تیز رفتار ترقی اور تبدیلی رونما ہوئی ہے اور جس کی بنا پر دیگر ممالک نے تکنیکی برتری حاصل کر لی ہے اس کے پیش نظر ہمارے صنعت کار بھی جدید ترین معلومات سے فائدہ اٹھا کر اپنی صنعت کو فروغ دیں۔

ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر کی آمد

ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر آقائے محمود صنعانی ۲۹ جولائی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے۔ ان کی آمد پر دینیات فیکلٹی میں ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں یونیورسٹی اور شہر کے معزز حضرات نے شرکت کی۔ جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ایرانی مہمان نے فرمایا کہ ایک مدت سے ان کی آرزو تھی کہ ہندوستان اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی دیکھیں جو آج پروفیسر کلب عابد کی دعوت پر یہاں آنے کے بعد پوری ہوئی۔

انھوں نے اپنی تقریر میں ایران کے موجودہ حالات اور مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی۔

یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس کے لیے نئی عمارت کی منظوری

ایک عرصہ سے مسلم یونیورسٹی میں مستقل گیسٹ ہاؤس کی کمی محسوس کی جا رہی ہے کیونکہ کثیر تعداد میں معزز مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور موجودہ گیسٹ ہاؤس جو ایک پرانی کوٹھی میں واقع ہے مہمان نوازی کے لیے قطعاً ناکافی ہے۔

چنانچہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مسلم یونیورسٹی کے لیے گیسٹ ہاؤس کی نئی عمارت تعمیر کرنے کی ضرورت کو اصولی طور پر مانتے ہوئے پہلے مرحلے میں تیس لاکھ روپیے کی منظوری دے دی ہے۔ یونیورسٹی کی جانب سے اس کام کے لیے پچاس ہزار روپیے کا تخمینہ یو جی سی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

داخلہ نوٹس نمبر ۶

سیشن ۸۳-۱۹۸۲ء

داخلہ نوٹس نمبر ۲ کی ضمن میں فیکلٹی آف میڈیسن کے جولائی ۱۹۸۲ء کے بیچ کے لیے ایم ڈی/ایم ایس اور ڈپلوما کورسیز میں داخلے کے واسطے درخواستیں طلب کرنے کے ساتھ ساتھ ایم ڈی (میڈیسن) کے کورس میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔

داخلے کے خواہش مند امیدواروں کو چاہیے کہ وہ ایڈمیشن نوٹس نمبر ۲ کے مجوزہ فارم کے مطابق سادہ کاغذ پر درخواست دیں۔ اس درخواست پر پاسپورٹ سائز کا فوٹو چسپاں کریں اور مبلغ پانچ روپیہ کا پوسٹل آرڈر بحق فائننس آفیسر اے ایم یو علی گڑھ منسلک کریں۔ یہ درخواست ہر حال میں اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱ کو مورخہ بیس؍ اگست ۱۹۸۲ء تک وصول ہو جانا چاہیے۔ نامکمل اور تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائینگی

داخلے سابقہ تعلیمی ریکارڈ اور ایک ٹیسٹ کی بنیاد پر ہوں گے۔ درخواست دینے والے امیدواروں کو چاہیے کہ وہ مورخہ ۲۵؍ اگست ۱۹۸۲ء دن کے دس بجے ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن جے این میڈیکل کالج میں ٹیسٹ میں شامل ہونے کے لیے حاضر ہوں۔

دستخط

این موئیدین

کنٹرولر آف اگزامینیشنز اینڈ ایڈمیشنز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۲/۷-۸۳-۱۹۸۳ء

درج ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

پروفیسرس

شرح تنخواہ 1500- 60- 1800- 100- 2000- 50/2- 2500 روپیہ

معہ دوسرے الاؤنس۔

۱۔ پروفیسر ان میڈیسن۔ گیسٹرو انٹرولوجی میں تخصص (پلان پوسٹ) ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن۔

آ استعداد

۱۔ لازمی۔ ایم ڈی (میڈیسن) ایم ڈی (جنرل میڈیسن) ایم آر سی پی (دولت مشترکہ سے ۱۱ نومبر ۸۰۱۹ء سے قبل حاصل شدہ)

تدریسی و تحقیقی تجربہ۔

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر میڈیسن کی تدریس کا چار سالہ تجربہ

۲۔ پسندیدہ۔ ڈی ایم (گیسٹرو انٹرولوجی)

ایم ڈی (میڈیسن) اور گیسٹرو انٹرولوجی میں خصوصی ۲ سالہ تربیت

۲۔ پروفیسر آف ریڈیالوجی۔ شعبہ ریڈیالوجی میں۔

استعداد: ایم ڈی/ایم ایس (ریڈیالوجی)

ایف ایف آر (یوکے) بذریعہ امتحان ۱۱ر نومبر ۱۹۷۸ء سے قبل حاصل شدہ

تدریسی/تحقیقی تجربہ:- کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر چار سالہ تجربہ

ریڈر:

شرح تنخواہ ۱- 1200 50 1300 - 60 - 1900روپیہ معہ دیگر الاؤنس

۴- ریڈیالوجی میں ریڈر، شعبہ ریڈیالوجی

استعداد

ایم ڈی/ایم ایس (ریڈیالوجی)

ایف ایف آر (یوکے) بذریعہ امتحان ۱۱ر نومبر ۱۹۷۸ سے قبل حاصل شدہ

تدریسی/تحقیقی تجربہ:- بحیثیت لکچرر کسی میڈیکل کالج میں پانچ سالہ تجربہ

لکچررس

شرح تنخواہ 700 - 40 - 1100 - 50 - 1600روپیہ معہ دیگر الاؤنس

لکچرر ان ریڈیالوجی (عارضی) شعبہ ریڈیالوجی۔

استعداد

ایم ڈی/ایم ایس (ریڈیالوجی)

ایف ایف آر- (یوکے،) بذریعہ امتحان ۱۱ر نومبر ۱۹۷۸ء سے قبل حاصل شدہ۔

تدریسی/تحقیقی تجربہ:- اس مضمون میں مطلوب تسلیم شدہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

۵- لکچرر ان پیڈیاٹرکس (پوسٹ پارٹم اسکیم) ڈپارٹمنٹ آف اوبسٹیٹرکس اینڈ گائناکالوجی

۶- لکچرر ان پیڈیاٹرکس (ڈپارٹمنٹ آف پیڈیاٹرکس)

استعداد

ایم ڈی (پیڈیاٹرکس)

ایم آر سی پی (یوکے) پیڈیاٹرکس بحیثیت خصوصی مضمون لے کر

بذریعہ امتحان ۱۱ نومبر ۱۹۷۸ء سے قبل حاصل شدہ
تدریسی / تحقیقی تجربہ:۔ اس مضمون کے لیے مطلوب تسلیم شدہ پوسٹ گریجویٹ
استعداد:۔

۷۔ لکچرر ان پلاسٹک سرجری (ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری)
استعداد

ایم سی ایچ (پلاسٹک سرجری)
یونائٹڈ اسٹیٹس آف امریکہ کے اسپیشلٹی بورڈ سے تسلیم شدہ استعداد اور
نیشنل بورڈ آف ایگزامینیشن نئی دہلی کی طرف سے یکم جون ۱۹۷۶ء کے بعد سے دی جانے
والی ایم اے این ایس / ایم این اے ایم ایس کا ایک امتحان اور ریسرچ کا ایک سالہ
تجربہ ایم ڈی / ایم ایس کے مساوی متصور ہوگا۔
تدریسی / تحقیقی تجربہ:۔ اس مضمون کے لیے مطلوب تسلیم شدہ پوسٹ گریجویٹ استعداد:۔

نوٹ:۔ متذکرہ بالا استعداد کے حامل ان امیدواروں کو جو اس سے قبل اشتہار نمبر ۳ / ۸۲-۱۹۸۳ء
کے تحت ان اسامیوں میں کسی کے لیے درخواست دے چکے ہیں از سر نو درخواست دینے کی ضرورت
نہیں۔ یونیورسٹی میں دی جانے والی ان کی سابقہ درخواستوں پر ہی غور کر لیا جائے گا۔
غیر معمولی استعداد اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو اعلیٰ تنخواہ سے ابتدا دی جا سکتی ہے۔
جن امیدواروں کو انٹرویو کے لیے طلب کیا جائے گا انہیں بطور T.A. سکنڈ کلاس کا یکطرفہ کرایہ
ادا کیا جائے گا۔

درخواست دینے کے لیے مطبوعہ فارم اور دیگر ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹی)
سے ذاتی طور پر یا ذاتی پتہ لکھ کر 23 x 10 cms کا لفافہ اور نقد دو روپیہ کی رسید جو مسلم یونیورسٹی
کے فائنانس آفس میں جمع شدہ ہو) یا انڈین پوسٹل آرڈر (جو فائنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام
واجب الادا ہو) کے ہمراہ حاصل کی جا سکتی ہیں۔
درخواستیں موصول ہونے کی آخری تاریخ ۳۱ اگست ۱۹۸۲ء ہے۔ تاخیر سے
وصول ہونے والی یا نامکمل درخواستیں مسترد کر دی جائیں گی

محمود علی
رجسٹرار

یاد رکھیے

"بنّی"

ہر طبقے اور ہر موقع کے لیے

"بنّی کا پولی اسٹر کپڑا

- ★ چالیس سے زیادہ خوبصورت رنگوں میں
- ★ نرم اور پائیدار، فیشن کے مطابق
- ★ مناسب دام

ایک بار ہمارے شوروم میں تشریف لاکر خدمت کا موقع دیجیے

مدراس کلاتھ ہاؤس

ریلوے روڈ۔ علی گڑھ

ٹیلیفون۔ (رہائش) 4023

دفتر PP. 3991

پرائمری اسکول کے لیے ہیڈ اُستانی کی ضرورت

لڑکیوں کے ایک پرائمری اسکول کے لیے جس کے آئندہ جونیر ہائی اسکول ہوجانے کی توقع ہے، معقول تنخواہ پر ایک ہیڈ استانی کی ضرورت ہے۔ جو کم از کم ہائی اسکول یا انٹر پاس ہو اور کسی اسکول کے چلانے کا اور ہندی و اردو میں درس و تدریس کا تجربہ بھی ہو۔ غریب اور بیوہ کو ترجیح دی جائے گی

اردو کی قابلیت اچھی ہونا چاہیے۔ امیدوار اپنی درخواست مندرجہ ذیل پتہ پر فوراً روانہ کریں

چودھری لیاقت حسین

منظور منزل۔ قصبہ سیانہ

ضلع بلند شہر۔ یو پی

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

1(15)

یوم آزادی

زمانہ گزرا ہم نے تقدیر سے عہد وپیمان کیا تھا اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنا عہد پورا کریں آدھی رات کا گجر بجنے پر جب ساری دنیا سوتی ہوگی ہندوستان بیدار ہو کر زندگی اور آزادی حاصل کرے گا۔ تاریخ میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب گردشِ گردوں ختم ہوتی ہے اور ایک قوم کی زمانہ سے کچلی ہوئی روح قوتِ گویائی پا لیتی ہے

جواہر لال

آزادی اپنے ہمراہ کچھ پابندیاں بھی لاتی ہے۔ غلامی میں یہ پابندیاں دوسروں کی طرف سے عائد ہوتی ہیں اور آزادی میں ترقی اور پیش رفت کے لیے یہ پابندیاں خود پہ عائد کرنا لازم ہوتا ہے۔ اگر خود عائد کردہ یہ پابندیاں نہ ہوں تو افراتفری اور انتشار کا دور شروع ہو جاتا ہے محنت اور نظم وضبط کی پابندی کے بغیر کوئی قوم ترقی کی شاہراہ پر آگے نہیں بڑھ سکتی۔

(یوم آزادی پر وائس چانسلر سید حامد صاحب کی تقریر سے اقتباس)

تہذیب الاخلاق کم وبیش چھ ماہ سے آپ کے زیر مطالعہ ہے۔ اس رسالہ کے مقاصد کی وضاحت کئی بار کی جا چکی ہے۔ یہ رسالہ نہ ادبی ہے، نہ فلمی۔ نہ مذہبی ہے نہ علمی۔ یہ ایک اصلاحی رسالہ ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ رسالہ کے پڑھنے والے زمانہ سے آشنا ہوں، ترقی کریں اور ملک کی فلاح وبہبود میں حصہ لیں۔ اس رسالہ میں ہم اب تک تین قسم کے مضامین شائع کرتے رہے ہیں۔ اول ایسے جن سے معلومات بڑھے دوسرے ایسے جن سے کردار کے اصلاح کی طرف توجہ ہو۔ تیسرے ایسے جو محنت کرنے اور ترقی کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔ مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں بھی مضامین شائع کیے گئے ہیں۔ یہ سلسلہ خصوصیت کے ساتھ جاری رہے گا۔ رسالہ میں سیّد احمد خاں مرحوم پر بھی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان کی اشاعت کا مقصد سیّد احمد خاں کی زندگی سے سبق لینا ہے۔

آپ سے درخواست ہے کہ رسالہ کے بارے میں اپنی رائے سے ہمیں مطلع فرمائیں اور آئندہ بھی مطلع فرماتے رہیں۔ ہم آپ کے تاثرات معلوم کرنے کے متمنی ہیں۔

اردو کے سنجیدہ رسالوں کے خریدار بہت کم ہوتے ہیں آپ سے درخواست ہے کہ آپ میں سے ہر فرد رسالہ کے دو خریدار بنا کر ہم کو شکریہ کا موقع دے۔ چندہ صرف بیس روپیہ سالانہ ہے،

اخلاص کیش

قاضی معز الدین احمد

جلد نمبر ۱ شمارہ ۱۵
یکم ستمبر ۱۹۸۲ء

تہذیب الاخلاق

مدیر: سید حامد
وائس چانسلر، اے ایم یو
مدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ
ششماہی ۱۱ روپے
سالانہ ۲۰ روپے
بیرونِ ہند سے
ایک پرچہ ایک ڈالر
سالانہ پندرہ ڈالر
پتہ۔ مدیر مسئول رسالہ تہذیب الاخلاق
صفدر منزل تار بنگلہ۔ اے ایم یو علی گڑھ

طلبا کی کثرت — اسکولوں کی قلت
ہماری غفلت

حصولِ آزادی کے بعد جدید تعلیم کی طرف مسلمانوں کی توجہ بڑھی۔ وہ لوگ جن کو لکھنے پڑھنے کا ذوق نہ تھا جو جسمانی محنت سے یا دکانداری سے روزی پیدا کرتے تھے ان کو بھی اپنے بچوں کو تعلیم دلانے کی خواہش ہوئی۔ عام طور پر مسلمان بچے مسلم اسکولوں میں یا ایسے اسکولوں میں جو مسلمانوں کے لیے قائم کیے گئے ہوں، داخل ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ آزادی کے ایک دو سال بعد ہی ان اسکولوں میں داخلہ کے طلب گار بچوں کا ہجوم ہو گیا۔ جن جماعتوں میں چالیس پچاس بچے پڑھتے تھے ان میں ساٹھ ستر داخل ہونے لگے۔ پھر نوبت یہاں تک پہنچی کہ پہلی جماعت میں بھی داخلے کے لیے بچوں کے انتخاب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

طالب علموں کی تعداد بڑھی تو مسلمانوں نے چند ابتدائی اسکول اور مکتب قائم کیے لیکن یہ بہت ناکافی رہے۔

جہاں مسلمانوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق بڑھ رہا ہے وہاں ان کی آبادی بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ بچوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان پڑھ بچوں کی اور دوسرے الفاظ میں ان پڑھ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جن مسلمان بچوں کو اسکولوں میں داخلہ نہیں ملتا، ان کے غول کے غول سڑکوں پر اور گلیوں میں کھیلتے ہر شہر میں ملتے ہیں۔ اور سنیما گھروں کے دروازوں پر ہجوم کرتے ہیں۔ اپنے ماں باپ کی گاڑھی کمائی سینما پر صرف کرتے ہیں اور وہاں سے وہ سب فنون سیکھ کر نکلتے ہیں جن کے سبب خود ان کی

... افسوس یہ ہے کہ رہنما جو اس
دور میں مسلمانوں کی رہنمائی کر رہے ہیں مسلمانوں کی پسماندگی کی طرف
متوجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی دوسرے مسلم لیڈر۔ اگر مسلمان
خود اسکول قائم نہ کر سکیں یا حکومت اور میونسپل کمیٹیوں سے
نہ قائم کرا سکیں تو کم از کم مساجد میں جن میں گنجائش
ہو، مکاتب قائم کریں۔ بچوں کو کلام مجید پڑھائیں۔ اردو
ہندی لکھنا پڑھنا سکھائیں اور کچھ حساب سکھا دیں تو
مسلمانوں میں ناخواندہ لوگوں کی کچھ تو تعداد کم ہو۔

جو بچے تعلیم سے محروم رہتے ہیں اور اسکولوں میں جن کو داخلہ نہیں ملتا، وہ سب غریبوں کے بچے نہیں ہوتے۔ اچھے کھاتے پیتے اور اکثر خوشحال گھرانے کے بچے ہوتے ہیں اور تعلیم کے اخراجات آسانی سے برداشت کر سکتے ہیں۔ ان بچوں کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا جا سکتا ہے بس مشکل یہ ہے کہ کرے کون؟ ایسے کاموں کے لیے خاموش کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف ندمت کے جذبے سے کام کریں خود نمائی کے لیے نہیں۔ مسلمانوں میں جہاں تعلیم کی کمی ہے، اخلاق اور شائستگی کی بھی کمی ہے ایک زمانہ میں وہ اخلاق و کردار اور شائستگی کا نمونہ تھے اب ان میں یہ اوصاف باقی نہیں رہے اس کی طرف ہمارے اکابر کی توجہ ہی نہیں ہوتی۔ افسوس یہ ہے کہ ان خصوصیات کی کمی مسلمانوں ہی میں نہیں ملک کی اکثریت میں بھی ہے۔ اسی بنا پر ہمارا ملک ہنگاموں کا گڑھ بن گیا ہے۔ ہر شخص کے سامنے اپنی ذات ہے اور اپنا مفاد ہے دوسرے شہری کے وجود کا کسی کو احساس نہیں۔ زرا زرا سی بات پر جھگڑنا۔ گالی گفتار عام ہے اور شرافت سے سڑکوں پر چلنا، ریل میں، بس میں سفر کرنا دشوار ہوتا جاتا ہے۔

ایک خط کے جواب میں
روزگار اور مسلم نوجوان

مسلم نوجوانوں کی بیروزگاری کا مسئلہ اہمیت رکھتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اس کو حل کرنے کی طرف کم اور اس کو اُلجھانے کی طرف زیادہ ہے۔ ہندوستان میں بے روزگاری کی شکایت عام ہے مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہندو نوجوان بے روزگار ہیں۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ مسلم نوجوان اپنے بیروزگاری کے مسئلہ حل کرنے کی طرف متوجہ نہیں، ہندو نوجوان متوجہ ہیں۔ اور محنت کر کے اس کو حل کرنا چاہتے ہیں۔

یہ تو حقیقت ہے کہ سرکاری دفاتر میں، پرائیویٹ کاروبار میں، بینکوں میں مسلمان بہت کم لیے جاتے ہیں۔ اور قابل مسلمان مل جائیں تو بھی ان کو نہیں لیا جاتا اور چونکہ وہ بہت کم لیے جاتے ہیں اس لیے وہ مایوس بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ ان حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ مسلمان محنت کریں اور حصول معاش کے لیے جدوجہد کریں۔ مایوس نہ ہوں اور شکایت کرنے کی عادت نہ ڈالیں اسی طرح ایک نوجوان نفسیاتی الجھنوں سے آزاد رہ سکتا ہے اور اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ حال ہی میں انگریزی کے اخبارات میں عرب ممالک میں ملازمتوں کا اشتہار نظر سے گزرا۔ اس میں ٹائپسٹ اور مختصر نویس کی ملازمت سے لگا کر معمولی مستری کی ملازمت تک متعدد جگہوں کے لیے درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ ان جگہوں کے لیے مسلمان درخواست کنندگان بہت کم تھے۔ بیشتر غیر مسلم ہی تھے۔ ٹائپسٹ اور مختصر نویس کی ہر دفتر میں ضرورت ہوتی ہے اور ہمیشہ یہاں ہندوستان میں اور عرب ممالک میں ان کی بہت

ضرورت رہے گی لیکن مسلمان نوجوان اس کام کو بہت کم سیکھتے ہیں۔ حالاں کہ تھوڑے عرصہ میں یہ کام سیکھا جا سکتا ہے اور معقول آمدنی کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بجلی کے مختلف قسم کے کاموں سے واقفیت رکھنے والوں کی ضرورت ہر جگہ ہے۔ مسلمانوں کی اس میدان میں بھی بہت کمی ہے۔ مسلمانوں کی مالی حالت اتنی خراب نہیں جتنی کہ خیال کی جاتی ہے۔ مسلمان دستکار ہیں۔ اور دسیوں قسم کے کام کرتے ہیں۔ اور بہت پیسے پیدا کر لیتے ہیں۔ دہلی میں مسلمان کاریگر ٹی وی سیٹ بناتے ہیں ٹرانسسٹر بناتے ہیں۔ بجلی کے پنکھے بناتے ہیں اور دسیوں چھوٹی موٹی چیزیں بنا کر پیسہ پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح علی گڑھ میں کاریگر مسلمان ہیں۔ اور کاروباری مالکانہ کارخانہ بڑے بڑے تاجر بھی بہت سے مسلمان ہیں۔ البتہ مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ایسا ہے جس کو بے روزگاری کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور وہ پریشان حال رہتا ہے۔ اس گروہ کے نوجوانوں کو ملازمت کی تلاش کی جگہ دستکاری کی طرف توجہ ہونا چاہیے

ایک دوست نے اپنا ایک قصہ سنایا وہ آپ کی دلچسپی کے لیے یہاں لکھتا ہوں۔ یہ صاحب مسلم یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اور معقول تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کا ایک قریبی عزیز دستکار ہے اور کاروبار کرتا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ایک بار اُن کے عزیز نے ان سے پوچھا کہ اُن کی ماہانہ کیا آمدنی ہے؟ انھوں نے اس کو اپنی تنخواہ بتائی تو وہ ہنسا اور بولا اتنی تو میں ایک دن میں پیدا کر لیتا ہوں۔

دراصل ہمارا نظامِ تعلیم اصلاح طلب ہے۔ ہر شخص کو اعلیٰ تعلیم کی طرف رخ نہ کرنا چاہیے بلکہ ثانوی تعلیم کے بعد روزگار کے لیے کوئی کام سیکھنا چاہیے۔ پھر اگر طالب علم اعلیٰ تعلیم ہی حاصل کرنی ہو تو پھر دستکاری اور کاروباری کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ ملازمت سے ایک نوجوان کو جو آمدنی ہوگی، اس سے کہیں زیادہ کاروبار سے ہو جائے گی۔

مسلمانوں کے پسماندہ طبقوں میں دستکاری عام ہے۔ پھر آزادیٔ ہند کے بعد ایسے گھرانوں کے نوجوانوں نے، تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم تک پہنچ گئے۔ بی۔ اے کیا ایم اے بھی کیا اور پھر گھر کے کاروبار میں لگ گئے اب ان میں بہت سے تاجر ہیں۔ اور ملازمت پیشہ "بابو" صاحبان کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دہلی میں ایک نہیں دسیوں لوگ ایسے ہیں جو یوپی یا بہار کے کسی مقام سے آئے پہلے کسی دکان دار کے ہاں ملازمت کر لی۔ پھر خود کاروبار کرنے لگے اور خوشحال ہو گئے اور دہلی نہیں ایسے نوجوان ہر جگہ ہیں۔

مسلم نوجوانوں کو مایوس نہ ہونا چاہیے، ملازمت کی طرف رُخ نہ کرنا چاہیے۔ ملازمت کرنا ہو تو پھر مقابلہ کے امتحان میں محنت کر کے شریک ہونا چاہیے بہتر یہ ہے کہ کاروبار اور دستکاری کی طرف رجوع کیا جائے

مسلمانوں میں اپنی کم مائیگی اور پسماندگی کا بڑا احساس ہے لیکن اس کے علاج کی طرف توجہ نہیں۔ لیڈر صاحبان جو ایم پی یا ایم ایل اے ہیں وہ بھی تعمیری کاموں میں اپنا وقت صرف نہیں کرتے چھوٹے موٹے کاموں میں الجھے رہتے ہیں۔

ضرورت ہے کہ ہر ریاست میں کم از کم ایک صنعتی انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جائے جن میں وسطی درجوں تک پڑھے لکھے نوجوانوں کو صنعتی تربیت دی جائے۔ اگر ایسے دو چار انسٹی ٹیوٹ بھی قائم ہو گئے تو بہت سے مسلمان نوجوانوں کے روزگار کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

روشنی کے برانگیختہ اخراج کی دھار — لیزر

پچھلے تیس چالیس برس میں سائنس دانوں نے جو بڑی ایجادیں کی ہیں، مربوط روشنی کی دھار جسے لیزر کہتے ہیں، ان میں سے ایک ہے۔ اس کے لازمی خواص ہیں (۱) سو فیصدی مکانی و زمانی ربط (۲) یک رنگی (۳) یکجہتی (۴) شدت (۵) توانائی کی بہتات (۶) مسلسل یا بہت چھوٹے وقفے کے ارتعاش۔ جس طریقِ عمل سے یہ دھار بنتی ہے اسے تابش کے برانگیختہ (اکسائے ہوئے) اخراج کے ذریعے بڑھاوا کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے فقرہ ہے: Amplification by Stimulated Emission of Radiation

کلیدی الفاظ کے پہلے لفظ لینے سے ASER بنتا ہے۔ اب روشنی Light کا L اس سے پہلے لگا دیں تو روشنی کے بڑھاوے کے لیے لیزر بن جاتا ہے اور ٹیلی وژن کی چھوٹی لہروں — Micro-waves کے لیے اسی طرح میزر وغیرہ۔

لیزر کے تصور کی بنیاد روشنی کے نظریاتی تصور پر ہے جس میں آئنسٹائن کی بصیرت نے آج سے ستر سال پہلے ہی برانگیختہ اخراج کا امکان دیکھ لیا تھا۔ اس کے چالیس سال بعد ممالک متحدہ امریکا میں ٹاؤنس اور روسی ساویٹ یونین میں باسوف اور پروخوروف نے اس امکان کو عملی جامہ پہنانے کی فکر کی، جس کے نتیجے میں پہلے میزر اور پھر چند ہی برس میں (۱۹۶۰ء) لیزر بننا شروع ہو گئے۔

اپنی ساخت، خواص اور جن چیزوں سے یہ بنیں ان کے لحاظ سے لیزروں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے بنانے میں جدید حرفتی ترقی کے علاوہ نظریاتی ارتقا کو بہت دخل ہے۔ ان دونوں کی تاریخ بڑی سبق آموز ہے اور دونوں میں متعدد اور مختلف قسم کے علوم و فنون کو دخل ہے۔

عملی دنیا میں لیزر سازی اور لیزری آزمائی (استعمال) دونوں کا فن تکمیل پسند ہے۔ یہاں کم درے پن یا چلتو کام کی گنجائش نہیں۔ ان اسباب سے لیزر بنانے اور انھیں ترقی دینے کا کام بہت خرچیلا ہے۔ یہاں تک کہ شروع شروع مذاق میں لیزر لفظ کی ایک دوسری تشریح کر کے کہا گیا تھا کہ اس کے معنی ہیں خرچیلی تحقیق کے لیے سرمایہ حاصل کرنے کا بہانہ۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، یہ بات صاف ہوتی گئی کہ لیزر پر جتنا سرمایہ لگایا جائے، وہ اس سے کہیں زیادہ بلکہ کئی کئی گنا واپس کر دیتا ہے۔

لیزروں کے استعمال بے شمار ہیں، اور انھوں نے بہت سی ایسی باتیں ممکن کر دکھائیں جو اس سے پہلے ناممکن یا کم از کم محال

ضرور تھیں۔ مثلاً ہولوگرافی، غیر مستقیم منظریات، خشک عملِ جراحی وغیرہ۔ ان کے علاوہ بہت سے دشوار کاموں کو لیزروں نے آسان اور بہت بہتر بنا دیا ہے مثلاً خلائی رسل و رسائل تحت ڈاپلر طیف شناسی آئسوٹوپ علاحدگی وغیرہ۔ لیزروں کی بدولت علوم و فنون کی سرحدوں پر کچھ تجربات کیے جا سکے، جیسے ایٹموں میں جفت و طاق حالت کا عدم استحکام، یا کیے جا رہے ہیں جیسے کہ مرکزوی اتصال کی کوششیں

عام روشنی اپنے مخرج سے نکل کر چاروں طرف پھیلتی ہے اور جوں جوں آگے بڑھتی ہے کمزور ہوتی جاتی ہے۔ ہم تک پہنچنے والی ہر رنگ کی روشنی بیک وقت ایٹموں یا سالموں کی ایک بڑی تعداد سے نکلتی ہے۔ (تقریباً 10^{15} فی مکعب ملی میٹر) ورنہ اتنی ہلکی ہو کہ ہم دیکھ بھی نہ سکیں۔ پھر جن سالموں وغیرہ سے یہ روشنی نکلتی ہے وہ بہت تھوڑی تھوڑی دیر (تقریباً 10^{-8} سکنڈ) کے لیے یکے بعد دیگرے اس عمل میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے عام روشنی غیر مربوط ہوتی ہے اور آلات کی مدد سے دوبارہ مرکوز کر کے اس کی شدت بڑھانے کی کوشش ایک حد سے زیادہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔

عام روشنی کو جالی یا منشور کی مدد سے پرکھا جائے تو اس میں متعدد رنگ (لہر لمبائیاں) ملتی ہیں اور اگر ایک طیفی لکیر الگ بھی کر لی جائے تو وہ خاصی چوڑی ہوتی ہے (۰٫۰۱ Å کے بقدر تک)۔

ان باتوں کے برعکس لیزر کی دھار اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ صرف ایک سمت میں آگے بڑھے۔ اس کی یک جہتی کی مثال یہ ہے کہ (تقریباً ایک ملی میٹر مربع کاٹ کی) لیزر دھار چاند پر پھینکی گئی تو تین لاکھ پچھتر ہزار کلو میٹر کے اوسطاً فاصلہ پر جا کے وہاں صرف چوتھائی مربع کلو میٹر کے بقدر پھیلی اس خاصہ کی بدولت لیزر کی شدت دور دور تک قائم رہتی ہے۔ ہیلیم کی مدد سے کام کرنے والا نیون لیزر خاصا کمزور ہوتا ہے۔ (چند ملی واٹ قوت کا)، لیکن اس کی نکلتی ہوئی دھار بھی فی اکائی رقبہ اس سے زیادہ تیز روشنی دیتی ہے۔ جتنی کہ ایک ہزار واٹ کے بلب سے ایک میٹر کے فاصلے پر مل سکتی ہے۔

عام روشنی جن سالموں وغیرہ سے یکے بعد دیگرے خارج ہوتی رہتی ہے، ان میں کوئی ربط نہیں ہوتا کہ کون کس لمحہ اخراج کا عمل شروع کرے گا اور کس مرحلہ میں۔ اس کے برخلاف اکسایا ہوا اخراج سو فیصدی مربوط ہوتا ہے کیونکہ روشنی کی لہر جس مرحلہ میں کسی ایٹم یا سالمہ وغیرہ کو متاثر کرتی ہے، اس سے اخراج اسی مرحلہ میں شروع ہوتا ہے۔ لیزر کی مربوطی کا راز یہی ہے۔

لیزر عمل میں خارج ہونے والی روشنی کی ممکن لہر لمبائیوں میں سخت مقابلہ ہوتا ہے اور جس لہر لمبائی کو ذرا سی بھی امکانی فوقیت حاصل ہو جاتی ہے وہ تمام دوسرے تواتروں پر غالب آ جاتی ہے۔ اس طرح لیزر کی یک رنگی مسلم ہو جاتی ہے، یعنی اس کی طیفی لکیر اتنی کم چوڑی کی جا سکتی ہے جتنی کہ ممکن ہے۔

موٹے طور پر لیزر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ مسلسل کام کرنے والے نسبتاً کم روشنی دیتے

یعنی ان کی یکی لکیر بہت چوڑی ہوتی ہے (۸/۸۵
کی مقدار ۱۵ ۱۰ تک حاصل کی جا سکی ہے) یا ان کے نہج
ارتعاش اور ان سے ملنے والی توانائی کو بہت بڑی حد تک
قائم رکھا جا سکتا ہے۔

دوسری قسم کے لمحاتی لیزر ایک بہت
چھوٹے لمحہ (ح ک جیسے ۱۰⁻¹² سکنڈ تک گھٹا لیا جا سکتا
ہے) کے دوران بہت بڑی مقدار میں (فی لمحہ ۱۰¹² واٹ تک) مرکوز توانائی اُنڈیل کے دوبارہ فعال ہونے
سے پہلے خاصی دیر تک معطل رہتے ہیں۔ ان لیزروں
کی طیفی لکیر خاصی چوڑی ہوتی ہے۔ مگر کام کی بات یہ
ہے کہ ان کے وقفۂ عمل کو چھوٹے سے چھوٹا بنایا جا سکتا
ہے جس سے کہ حیاتیاتی سالموں اور خلیوں وغیرہ کے
اعمال کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلا لمحاتی لیزر ۱۹۶۰ء
میں مائی مین نے یعقوت سے بنایا تھا۔ اس وقت
سے اعلیٰ درجہ کے مصنوعی یعقوت بنانے اور ان سے قوی
لیزر دھار نکالنے کا کام برابر بڑھتا رہا ہے۔ اس میں
تین مرتبہ برقائے ہوئے کرومیم ایٹم ۶۹۴۳ انگسٹروم
پر روشنی دیتے ہیں

چند ہی ماہ بعد علی جوان اور ان
کے رفیقوں نے سیلیم ملا کے نیون گیس سے ۱۱۵۲۸
انگسٹروم پر لیزر کی مسلسل دھار نکالی۔ ظاہر ہے کہ
یہ دونوں سرخ رنگ کی ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائڈ
گیس سے نظر نہ آنے والی گرمی کی لہروں (تحت سرخ
انفرارڈ) میں ۹.۶ اور ۱۰.۶ مائکرون پر
سی اِن کے پٹیل اور ان کے ساتھیوں نے ۱۹۶۳ء
میں بہت قوی دھاریں نکالیں۔ حالاں کہ گرمی کی

لہروں کے فوریے روشنی کے مقابلے میں بہت کم توانا ہوتے
ہیں۔ کاربن ڈائی آکسائڈ لیزر دنیا کے چار قوی ترین لیزروں
میں شمار ہوتا ہے۔ ایک اور قوی لمحاتی لیزر تین بار برقائے
ہوئے نیوڈیمیم ایٹموں کو المونیم گلاس جیسے کسی ٹھوس
سانچے میں رکھ کے بنایا گیا۔ یہ ۱.۰۶ مائکرون پر فی لمحہ
کئی جول توانائی مہیا کرتا ہے۔

روشنی کے منطقہ میں ایک بار برقائے ہوئے
گیسوں سے خوب کام نکلا۔ آرگن، کرپٹان، زینون
سبھی کام آتے ہیں۔ آرگن گیس لیزر کئی واٹ توانائی کی
مسلسل، یا حسب خواہش قوی تر لمحاتی، دھار ہری سے
نیلی روشنی تک کی کئی لہر لمبائیوں پر دیتا ہے۔ بالا
بنفشئی منطقہ میں، جہاں شعاعیں نظر نہیں آتیں لیکن
عکس گیر مادّہ کو زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ نائٹروجن گیس کا
سالماتی لیزر اپنی (نصف کلو واٹ) قوت کے لیے مشہور ہے
علاوہ ازیں یہ لمحاتی ہے اور خاص طور پر اس لیے استعمال ہوتا ہے
کہ نیلا رنگنے والے نامیاتی سالموں سے ہم ایسے لیزر بنائیں جن کی لہر
لمبائی ایک حد کے اندر باقاعدگی سے بدلی جا سکتی ہے
"یہ قابل ترمیم تواتر کے رنگ لیزر" سروکن نے ۱۹۶۶ء سے بنانے
شروع کیے۔ ان کا اصول یہ ہے کہ بعض سالمے یا بلّور خاصی وسیع
حدوں میں روشنی جذب کر لیتے ہیں اور پھر اسے نسبتاً لمبی لہروں پر
خارج کرتے ہیں اس عمل کو فلورسنس کہتے ہیں (جس کی اردو دمک ہو سکتی ہے)
اس سے فائدہ اٹھا کر لیزر سازی کے طریقوں کا استعمال کیا جاتا ہے،
جس سے روشنی اپنی ضرورت کی لہر لمبائی پر ہی دھار کی شکل میں
نکلتی ہے اور اس لہر لمبائی میں ردوبدل کی جا سکتی ہے —
مادہ میں توانائی کی تہوں کی ساخت کے مطالعہ کو ان
کی وجہ سے غیر سہولت بہم پہنچاتی ہے۔

ڈاکٹر حبیب الرحمٰن قدوائی

شمسی توانائی

ایک نہ ختم ہونے والا ذریعہ

آج توانائی کا بحران تمام دنیا میں محسوس کیا جا رہا ہے اور اسی لیے دنیا کے مختلف ممالک میں توانائی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ چونکہ اس بحران کا اثر ترقی پذیر ممالک پر زیادہ ہے، جو صنعتی اعتبار سے ابھی پیچھے ہیں۔ اس لیے ان ممالک کو شمسی توانائی اور توانائی کے دوسرے متبادل ذریعوں کے استعمال میں گہری دلچسپی ہے۔ ہندوستان کے بھی متعدد اداروں میں توانائی کے مختلف میدانوں میں تحقیقی کام ہو رہا ہے اور اب ہمارے سائنس دانوں کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہے کہ توانائی کے ذرائع تلاش کرنے میں شمسی توانائی ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس بات کا اندازہ ہمارے ملکی ماہرین کو بھی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ صرف ایک جگہ بیٹھ کر مشین کے ذریعہ بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں۔ مشین کو چلانے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے جو ہم کوئلہ، تیل، ہائیڈرو الیکٹرک (بھاپ سے بجلی پیدا کرنا) یا یورینیم تھوریم وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔ اب سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے تک عام لوگوں کو اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تیل، کوئلہ، یورینیم وغیرہ کے ذرائع ختم بھی ہو سکتے ہیں۔

گزشتہ چند برسوں میں یہ خیال عام ہونے لگا کہ تیل، کوئلہ یورینیم، تھوریم، پلوٹونیم کے ذخیرے ایک نہ ایک دن ختم ہو جائیں گے اور جس رفتار سے ان کا استعمال ہو رہا ہے وہ دن اب بہت دور نہیں ہے۔ مثلاً کوئلہ تو ابھی کچھ صدیوں تک چل سکتا ہے لیکن ایک اندازے کے مطابق شاید تیل اگلی صدی کے شروع میں ہی ختم ہو سکتا ہے۔ دوسری جانب بھاپ سے بجلی پیدا کرنے یا سمندری لہروں سے بجلی پیدا کرنے کے ذرائع ہیں۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ذرائع کی بھی ایک حد ہے اور یہ حد ہماری ضروریات کو دیکھتے ہوئے ناکافی ہے۔

اس بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے توانائی کے ایسے متبادل ذرائع کو دریافت کرنے کی ضرورت ہے جو نہ ختم ہونے والے ہوں اور اس کا اثر بھی ماحول پر خراب نہ پڑے تاکہ ترقی پذیر ممالک بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ شمسی توانائی ہی

...ذریعہ ہے جس میں یہ خوبیاں کافی حد تک موجود ہیں۔ اور بعض میں مزید تحقیق کے ذریعہ اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سورج کی توانائی بھی ایک دن ختم ہو جائے گی لیکن ایک اندازے کے مطابق یہ بات سامنے آتی ہے کہ سورج کی توانائی تقریباً بیس چالیس ارب سال تک قائم رہ سکتی ہے

شمسی توانائی کا استعمال تو عام طور پر ہم اپنی زندگی میں روزانہ ہی کرتے ہیں۔ مثلاً گھروں میں کپڑے سکھانا، گاؤں میں اناج اور فصلوں کا سکھانا اور سمندر کے پانی سے نمک حاصل کرنا بھی سورج کی روشنی میں ممکن ہے لیکن شہر اور دیہی علاقوں میں زیادہ تر کام ایسے ہوتے ہیں جن میں شمسی توانائی کو پہلے میکانیکی یا برقی توانائی میں تبدیل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً کپڑوں پر استری کرنا، گھر کو ٹھنڈا یا گرم کرنا، کھیت کی آبپاشی کے لیے کوئیں سے پانی نکالنا اور کارخانوں میں مشین کا چلانا۔ لیکن ان سب کاموں کے لیے شمسی توانائی کو براہ راست استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ شمسی توانائی منتشر ہے یعنی فضا میں بہت بکھری ہوئی ہے اسے ایک جگہ اکٹھا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ دوسری وجہ جس کا تعلق پہلی سے ہے وہ یہ ہے کہ ابھی ہم زیادہ بہتر طور پر شمسی توانائی کو بجلی میں تبدیل نہیں کر سکے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کو زیادہ مقدار میں جمع نہیں کر سکتے تاکہ رات کے وقت یا ایسے وقت استعمال کر سکیں جب سورج کی روشنی کم ہوتی ہے

مندرجہ بالا حالات کے مد نظر بنیادی طور پر تین طریقے ہیں جن کے ذریعہ شمسی توانائی کو کارآمد شکل میں تبدیل کرنے کے سلسلے میں سائنسی تحقیق و ترقی کا کام ملک کی مختلف لیبارٹریز میں ہو رہا ہے۔

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ شمسی توانائی کو حرارت میں تبدیل کر دیا جائے اور پھر اس حرارت کو توانائی کی شکل میں ضرورت کے مطابق استعمال میں لایا جائے

دوسرا طریقہ شمسی توانائی کو شمسی سیل کی مدد سے بجلی میں تبدیل کرنے کا ہے۔

اسی طرح تیسرا طریقہ اس پر منحصر کرتا ہے کہ پودے شمسی توانائی کی مدد سے شعاعی ترکیب عمل (فوٹو سنتھیسس) کے ذریعہ کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی سے اسی طرح کے کیمیائی مرکب تیار کرتے ہیں جن میں توانائی کی کافی مقدار ہوتی ہے۔

(بہ شکریہ سائنس کی دنیا)

بقیہ مضمون ابوالحسن صدیقی۔

رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ محمد ابوالحسن نے حافظ کا انتخاب عطر دیوانِ حافظ کے نام سے شائع کیا۔ حالاں کہ دیوان حافظ خود انتخاب ہے۔ انھوں نے اشعار حافظ پر ایک کتاب بھی لکھی۔

سر سید کی مجالس کا قدیم رکن قرآن اور دین کی وادی میں کیوں داخل نہ ہوتا۔ محمد ابوالحسن صدیقی کے مضامین کا ایک مجموعہ "اعجاز القرآن" کے نام سے مطبع نفیسی آگرہ سے ۱۹۰۷ء میں چھپا محمد ابوالحسن نے اس کو انگریزی میں شائع کیا

ابوالحسن صدیقی کے شوق تعلیم کی وجہ سے ان کے خاندان کے بیشتر افراد نے اعلیٰ مغربی تعلیم حاصل کی۔ ان کے بھتیجے ریاض الدین سر سید کے عہد کے ممتاز طالب علم تھے۔ ان کے حقیقی بھتیجے محمد قمر الدین ابن ضیاء الدین مرحوم اکبر کے ممتاز بھتیجے

عتیق احمد صدیقی
شعبہ اردو
اے ایم یو۔ علی گڑھ

ابوبکر محمد بن زکریا رازی

اسلام کے مہرِ عالم تاب نے نہ صرف دنیا کے گوشہ گوشہ کو منور کر دیا بلکہ علم و عمل کی ایسی فضا پیدا کی جس کی بدولت ایسے افراد وجود میں آئے جن کے انوارِ علم کی کرنیں تاریخ کے اوراق کو آج بھی جگمگائے ہوئے ہیں۔ زمانہ گذر گیا، علوم کی دنیا میں بے پناہ وسعت پیدا ہو گئی، تصورات میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو گئیں، بہت سے نظریات غلط ثابت ہو گئے، لیکن جن افراد نے ابتدائی کوششیں کیں اور آج کی فلک بوس عمارت کے لیے بنیادیں فراہم کیں، ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایران کی سرزمین سے ابھرنے والی ہستیوں میں رازی ایسی شخصیت ہے کہ جس کے شجرِ علم سے مشرق و مغرب میں صدیوں خوشہ چینی ہوتی رہی۔

محمد بن زکریا رازی ایران کے شہر رے میں ۸۶۴ء میں پیدا ہوا۔ رے کی نسبت سے ہی اس کے نام کے ساتھ رازی لگا ہوا ہے۔ رے کا عظیم الشان شہر، ایران کی دلکش آب و ہوا، اسلامی عظمت و شان کی بڑھتی ہوئی شوکت، فارغ البالی کا ہر طرف دور دورہ اور پھر رازی کی نوجوانی کی ترنگ۔ ان سب عناصر نے رازی کو فکرِ جہاں سے آزاد کر دیا اور نوجوانی کا ابال بن کے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ نغمہ و سرود دل بہلانے کا سہارا بنا اور نوجوان اس میں ایسا گم ہوا کہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر رہ گیا۔ عود نوازی میں بے مثال مہارت پیدا کی۔ لیکن اس سے پیٹ تو نہیں بھر سکتا تھا۔ ذمہ داریوں کا بوجھ پڑنا شروع ہوا تو حصولِ زر کی فکر ہوئی۔ کسی پیشے کی تربیت حاصل کی نہیں تھی۔ پھر مسئلہ کیسے حل ہو۔ مشرق میں ایک تصور عام تھا کہ بعض جڑی بوٹیوں کے ذریعہ لوہے تانبے کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ اس علم کو کیمیا کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ تصور کیجیے تو حصولِ زر کا اس سے آسان کیا طریقہ ہو سکتا تھا۔ نوجوان زکریا بھی اسی دھن میں لگ گیا۔ سونے کا بننا تو فریب ثابت ہوا، لیکن اس کاوش میں اسے جڑی بوٹیوں اور ان کی خاصیتوں سے خاصی واقفیت حاصل ہو گئی۔ طب سے اس کی دلچسپی کی یہ خشتِ اول تھی۔

قوم زندہ اور توانا ہو اور قوتِ نمو باقی ہو تو افراد بالخصوص نوجوانوں کی بے راہ روی عارضی ثابت ہوتی ہے۔ وہ بھلے ہی بے فکری کے کچھ دن لہو و لعب میں گزار دیں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار آنے کا موقع نہ دیں، لیکن معاشرے کے اجتماعی دباؤ کی قوت ان کو جلد ہی شاہراہِ قومی پر ڈال دیتی ہے اور ان کا اصل سفرِ ارتقاء شروع ہو جاتا ہے۔

میں سونا بنا کر یکایک مالدار ہو جانے کی دھن میں معدنی اشیاء اور جڑی بوٹیوں کا جو علم حاصل کیا تھا وہ اس کی طبی صلاحیتوں سے ہم آہنگ ہو گیا۔ ایک معمولی سا واقعہ اس کی زندگی کو تبدیل کرنے کا سبب بن گیا۔ کیمیاگری کے شوق میں بھٹی دھونکتے دھونکتے اس کی آنکھوں میں تکلیف ہو گئی۔ علاج کے لیے اس کے پاس پیسہ بھی نہیں تھا اور علاج تھا بھی بہت مہنگا۔ معالج نے اس سے زبردست معاوضہ طلب کیا تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ خود علم طب حاصل کرے گا۔ چنگاری بڑھ کر شعلہ بننے لگی اور رازی نے خود کو ہمہ تن حصول علم میں منہمک کر دیا۔

رے کے مقامی اساتذہ سے اس نے طب اور فلسفہ دونوں کی تعلیم حاصل کی۔ جلد ہی یہاں مدارج کی تکمیل ہو گئی تو اس نے بغداد کا رُخ کیا جو دارالخلافہ ہونے کے ساتھ ساتھ علم اور اہل علم کا خاص مرکز بن چکا تھا۔ طبری اس دور کے مشہور عالم طبیب وہاں موجود تھے۔ رازی نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ استاد نے بھی شاگرد کے جوہر کو پہچان لیا اور اس کو چمکانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ جلد ہی رازی کو ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے شہرت حاصل ہو گئی۔ طبری کا انتقال ہو گیا۔ اس نے اپنا مطالعہ جاری رکھا۔ کچھ سال بعد اسے رے کے سرکاری شفاخانے میں طبیب مقرر کیا گیا۔ ایک اچھے طالب علم کا سرمایۂ افتخار صرف روایتی علم پر عبور ہی نہیں ہوتا۔ اس کی جدتِ ذہنی نئے آفاق پیدا کرتی ہے۔ رازی کا بھی تخلیقی دور یہاں سے شروع ہوا۔ اس نے اپنے تصورات کی یہاں آزمائش کی۔ اس نے ایک عام معالج کی حیثیت

[illegible] ایک طرف نسخوں [illegible] غیر معمولی غور و فکر سے کام لیا اور دوسری طرف دواؤں کے تجویز کرنے میں اپنی ذہنی اپچ کا استعمال کیا اور تجویز کردہ دواؤں کے اثرات کا مطالعہ کیا۔ اور یوں روایتی دواؤں اور طریق علاج میں اختراعات کیں وہ ان تمام تجربوں کو بھی قلم بند کرتا گیا اور علمی تحقیق کا ایک بڑا ذخیرہ اس نے جمع کر لیا۔

۹۰۲ء میں اس کا تبادلہ بغداد کے شفاخانہ میں کر دیا گیا۔ اس نے اپنا معمول وہاں بھی جاری رکھا۔ بغداد بڑی جگہ تھی، اس لیے اسے وسیع تر تجربات کا موقع ملا۔ ۹۰۴ء میں پھر اس کا تبادلہ رے کے شفاخانہ میں کر دیا گیا کہ حکومت اس کو وسعت دینا چاہتی تھی اور رازی سے زیادہ اور کوئی شخص اس کام کے لیے موزوں نہیں تھا۔ یہیں رہ کر اس نے طبی تجربات پر مبنی اپنی پہلی کتاب "منصوری" مرتب کی۔ اس سے اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور علمی دنیا نے اسے سب سے بڑا عالم اور طبیب تسلیم کر لیا۔ یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کا لاطینی ترجمہ یورپ میں صدیوں تک شائع ہوتا رہا۔

اس دور میں فلسفہ اور طب علیحدہ علم نہیں تھے بلکہ طب فلسفہ کی ہی ایک شاخ متصور ہوتی تھی۔ ایک طرف اس کی طبی اختراعات و مہارت کی دھوم ہوئی تو دوسری طرف اس غیر تقلیدی فلسفیانہ افکار نے لوگوں کو چونکا دیا۔ گویا اب رازی اپنے دور کا سب سے بڑا فلسفی بھی تھا اور طبیب بھی۔ اس نے علم العلاج اور اصول علاج وغیرہ کی طرف خاص توجہ کی۔ امراض کا تعلق صرف ہمارے ماحول

جسم ہی سے نہیں ہوتا، بلکہ واردات قلبی اور روحانی کے اثرات جسم پر مترتب ہوتے رہتے ہیں۔ اصولِ علاج میں اس نے اس کا بھی خیال رکھا۔ یہیں اس کی اجتہادی شان نظر آتی ہے۔ اس نے اصول علاج اور علاج دونوں میں نئی راہیں پیدا کیں۔ "کتاب الطب الروحانی" اس کی اہم تصانیف میں شمار ہوتی ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

بغداد کا سرکاری شفاخانہ عالم اسلام کا سب سے بڑا شفاخانہ تھا۔ رازی شہرت کے جس مقام پر پہنچ چکا تھا، اس شفاخانہ کے شایانِ شان اسی کی ذات تھی۔ ۹۰۸ء میں اسے بغداد بلاکر افسر الاطبا مقرر کیا گیا۔ وہ چودہ سال اس عہدہ پر فائز رہا۔ یہیں اس نے اپنی زندگی بھر کی طبی تحقیقات کو مجتمع کیا اور تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھا۔ اس کی شہرۂ آفاق تصنیف "حاوی" کا مواد اسی زمانے میں جمع ہوا۔ جسے بعد میں اس کے شاگردوں نے مرتب کر کے پیش کیا۔ یہ کتاب علاج اور اصولِ علاج کی قاموس ہے۔ اس میں رازی نے اپنے عہد تک کی تمام علمی معلومات اور اپنی تحقیقات کو جمع کر دیا یہ کتاب پچیس جلدوں پر محیط ہے۔ اسے مشرق کی محرومی کہیے کہ اصل کتاب جو عربی میں ہے آج تک زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر عام نہ ہو سکی، صرف لائبریریوں کی اور وہ بھی اکثر مغربی لائبریریوں کی زینت ہے۔ لیکن اس کے بیشتر حصوں کے لاطینی ترجمے ایک سے زیادہ بار شائع ہو چکے ہیں اور مغرب نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

اہم کتاب "طب الملوکی"، [illegible]

میں اس نے علاج بالغذا سے بحث کی ہے۔ وہ اس نظریہ کا بہت بڑا حامی تھا اور اس کتاب میں اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ غذا سے امراض کا علاج کیا جائے اور جب تک یہ ممکن ہو دوا کا استعمال نہیں ہونا چاہیے۔

'طب الفقرا' میں ایسی اشیا کا بیان کیا گیا ہے جو بہت معمولی ہیں لیکن طبی حیثیت سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی مدد سے طبیب کے بغیر بھی امراض کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ اس نے گردے اور مثانے کی پتھری، وجع مفاصل، قولنج، فصد وغیرہ پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے اس میں سب سے زیادہ اہمیت اور مقبولیت اس رسالے کو حاصل ہوئی جو اس نے چیچک اور خسرہ پر لکھا۔ یہ بیماری اس زمانے میں بہت عام تھی۔ رازی نے پہلی بار اس مرض کو مبسوط مطالعہ اور تحقیق کا موضوع بنایا۔ قبل مرض احتیاطی تدابیر، مرض کی نوعیت اور علاج وغیرہ سب ہی اس میں شامل ہیں۔ اس کتاب کے تراجم یورپ کی مختلف زبانوں میں انیسویں صدی تک شائع ہوتے رہے قوت باصرہ اور اس سے متعلق روشنی کے عمل اور اس کی کیفیت کے بارے میں اس نے جو تصورات پیش کیے اُن میں سے بعض آج بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

کیمیا گری کا شوق اس کو ساری عمر رہا۔ سونا بنانے میں تو وہ عمر بھر کامیاب نہ ہو سکا، لیکن اس بہانے اگر ابتدا میں اسے جڑی بوٹیوں کے خواص سے آشنا ہونے کا موقع ملا تو بعد میں بہت سے کیمیائی عملوں کی دریافت کا سہرا اس کے سر بندھا۔ اس نے اپنے پیشرو [illegible]

اہم ... وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا۔ اس کے انکشافات دوررس نتائج کے حامل ثابت ہوئے۔ (۱۳) نے مادوں کو حیوانات، نباتات اور جمادات میں تقسیم کر کے جو بحثیں کیں، ان میں نامیاتی اور غیر نامیاتی کیمیا کی راہیں کھل گئیں۔

طب اور کیمیا کے علاوہ اس کے غور و فکر کا بڑا میدان فلسفہ تھا۔ اس میں مذہبیات خاص طور پر الٰہیات بھی شامل تھیں۔ ارسطو کو اسلامی دنیا میں بڑی مقبولیت حاصل تھی کہ اس کے تصورات اسلامی عقائد سے متصادم نہیں تھے۔ رازی نے ارسطو کے تصورات کو مسترد کر دیا۔ اور افلاطون کو اپنا مرجع قرار دیا۔ وہ تقلید پسندی کا قائل نہیں تھا اس کے خیال کے مطابق ہمیں متقدمین پر یہ تفوق حاصل ہے کہ ہم ان کے علم سے تو واقف ہیں ہی، اس پر اضافہ کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ اس نے روایت سے زیادہ درایت کو اہمیت دی۔ اس کا کہنا تھا کہ انسانی عقل نہ صرف عملی معاملات کو سلجھا سکتی ہے بلکہ اپنی رسائی سے صحیح نظریات و تصورات بھی قائم کر سکتی ہے۔ اس لیے وہ خارجی رہبری و ہدایت کی محتاج نہیں ہے۔ یہیں سے انبیاء، معجزات اور مذہبی معتقدات کے بارے میں اس کے بعض وہ تصورات ابھرے جو تشکیک کی حد سے مل جاتے ہیں۔ اس کے بعض دیگر تصورات حسب ذیل ہیں۔

خلائے بسیط (space) محدود ہے۔ زماں (وقت) ایک دھارے کے مانند ہے جو خود لامحدود ہے۔ یہ اس دنیا کی تخلیق ... ہے ... مادہ جوہر (ا... پر مبنی ہے جو خلا (Vacuum) کے ساتھ مل کر عناصر اربعہ خاک، آب، باد، آتش اور اجسام فلکی بناتے ہیں۔ کثیف مادے خاک اور آب زمین کے مرکز کی طرف اور لطیف مادے باد و آتش اوپر کی طرف راجع رہتے ہیں۔ فلکی اجسام کی حرکت مدوّر ہے۔

ازل سے بھی پہلے پانچ ارکان موجود تھے: خالق، روح، مادہ، زمان اور خلائے بسیط۔ روح کو مادّے میں مقید کر دیا گیا۔ روح انسانی جسم سے آزادی کی خواہاں رہتی ہے۔ اس میں بالقوۃ یہ استعداد ہوتی ہے لیکن اس استعداد کو بروئے کار لانے کے لیے روح کو بعض مراحل سے گزرنا پڑتا ہے گویا روح کا ارتقا جاری رہتا ہے۔ جب جملہ ارواحِ انسانی اجسام سے آزاد ہو جائیں گی تو دنیا ختم ہو جائے گی جانوروں کی روح میں یہ استعداد نہیں ہوتی۔ اسی لیے جانوروں کا مار ڈالنا جائز ہے کہ اگر ان کی روح جسم انسانی میں داخل ہو جائے تو اس میں حصول آزادی کی استعداد پیدا ہو سکتی ہے اور بالآخر وہ بھی آزادی حاصل کر سکتی ہے۔

غرض کہ اس نے اپنی طبی اور کیمیائی تحقیقات کے علاوہ انسان اور کائنات کے مختلف پہلوؤں کو بھی اپنے غور و فکر کا موضوع بنایا۔ ان پر اس نے غیر روایتی انداز میں آزادانہ طور پر سوچ بچار کیا۔ یہاں گویا اس کی فکر کاوش حقیقت میں غلطاں و پیچاں رہی۔ اس نے پہلے

بہت سے نظریات کی تردید کی، نئے نظریات قائم کیے اور اپنے تمام تصورات کا بیباکی کے ساتھ اظہار بھی کیا۔ اس کی تجدد پسندی کے باعث شدید مخالفتیں بھی ہوئیں۔ بہت سے علماء سے ان کے مناظرے ہوئے لیکن اس نے مخالفین کو دنداں شکن جواب دیا۔

بالآخر اس کو ضعیفی نے آگھیرا، جو ہر انسان کا مقدر ہے۔ اس کی عمر ۸۰ سے بھی تجاوز کر چکی تھی، جب وہ بغداد کی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن رے میں مقیم ہوا۔ عمر کے ساتھ ساتھ ضعفِ بصارت بھی بڑھتا گیا اور وہ بینائی سے محروم ہو گیا۔ ۹۲۵ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اور یوں وہ آزاد منش لاابالی نوجوان جو اپنی ابتدائی زندگی میں رے کی گلیوں میں عود بجاتا پھرتا تھا، اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنے پیچھے ایک بڑا علمی ذخیرہ اور ایک توانا علمی روایت چھوڑ گیا۔ اس کی تصانیف کی تعداد سو سے زیادہ شمار کی جاتی ہے۔ تصانیف کی تعداد سے زیادہ اہم وہ علمی ہلچل تھی جو اس کے تصورات نے پیدا کر دی تھی اور جس نے علما کو منقولات کے ساتھ معقولات کی طرف توجہ دینے پر مجبور کر دیا۔ خالقِ کائنات نے کائنات کے بارے میں انسان کو جو تفقہ، تفکر اور تعقل کی دعوت دی تھی، رازی جیسے افراد ہی اس پر لبیک کہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے خود بھی کائنات و مسائلِ کائنات پر غور کیا اور اپنے نتائجِ فکر سے دوسرے ذہنوں کو بھی سوچنے پر مائل کر دیا۔ اور یہی افراد انسانیت کا زیور ہیں۔

بقیہ "صہیونی، فلسطین اور عرب"

یہود دشمنی Anti Semitism کی چنگاریوں کو کرید کر دینا ہے۔ واضح کر دیں گے کہ ابھی وہ عہدِ وسطیٰ میں رہتے ہیں جبکہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں سے اس بات کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا کہ خدا نے یہودیوں سے دوبارہ اسرائیل کے قیام کا وعدہ کیا ہے۔ اشاروں کنایوں سے یورپ کے عیسائیوں کی صلیبی دور کی دشمنی کو ہوا دی اور اس سے فائدہ اٹھایا اور اسی قسم کے کئی حربے حالات اور مواقع کے لحاظ سے بڑی چابکدستی سے استعمال کیے۔ اس سارے پروپیگنڈے اور ریشہ دوانیوں میں متاثر گروہوں کے ذہن میں یہ بات شاید کبھی نہیں آئی کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ فلسطین کس کا ملک ہے اور صہیونیوں کو کیسے حق ملتا ہے کہ اس پر قبضہ کریں۔ جب ہٹلر نے جرمنی میں یہودیوں پر ظلم و ستم شروع کیا اور ان کا قتلِ عام (Holocaust) ہوا تو بچے ہوئے یہودیوں کو زبردستی فلسطین لایا گیا اور اسرائیل کے قیام کے دعوے کو اور مضبوط کیا گیا اور یہ سوال اٹھائے بغیر کہ ہٹلر کے ظلم و ستم کا بدلہ آخر بے چارے فلسطینیوں سے کیوں لیا جا رہا ہے۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

ڈاکٹر یوسف قرضاوی
مترجم مولانا نصیر احمد

اسلامی ذرائع

(ڈاکٹر یوسف القرضاوی دوحہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں۔ آپ عرب دنیا میں ایک مقتدر عالم کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اسلامیات و دیگر موضوعات پر موصوف کی کئی کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ان کے ایک مضمون کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے)

اس میں شک نہیں کہ اسلام غریبی کی مذمت اور ہر محاذ پر اس کے خلاف جنگ اس لیے کرتا ہے تاکہ عقائد اور رہن سہن کے طریقوں میں بگاڑ نہ آئے۔ خاندان اور سماج کی حفاظت ہو اور خاص طور پر ایسے سماج کی تعمیر ہو سکے جس میں ہر فرد اخوت اور مساوات کے مخلصانہ جذبات سے سرشار ہو اور یہ ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ تب ہوگا جب کہ لوگوں کے پاس کھانے پینے اور رہنے سہنے کے لیے اسی طرح دیگر ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے اس قدر اسباب فراہم ہوں جو ان کے اور ان کے بال بچوں کے لیے بڑی حد تک کافی ہوں اور ان کی انفرادی، اجتماعی یا ازدواجی زندگی کسی کدورت اور میل کے بغیر اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے اور اس سے تعلق استوار کرنے میں بسر ہو اور اگر خیر سے کسی مسلم معاشرے یا اسلامی ملک میں کوئی غیر مسلم امان لے کر سکونت پذیر ہو تو رہائش اور ہر قسم کی آسائش کے اسباب اس کے لئے فراہم ہوں اور اپنے بال بچوں کے ساتھ اس کی گذر بھی راحت و آرام سے ہو سکے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اسلام کے وہ ذرائع کیا ہیں اور اسلامی معاشرے میں رہنے والے افراد کو یہ چیزیں کیوں کر میسر آ سکتی ہیں۔

پہلا ذریعہ۔ **حرکت و عمل** بطور جواب آئندہ سطروں میں انھیں ذرائع اور وسائل کو سلسلہ وار پیش کیا جاتا ہے۔ اسلام معاشرے کے ہر شخص سے مطالبہ کرتا ہے کہ جب قدرت کا اتنا بڑا کارخانہ صرف اس لیے حرکت و عمل میں ہے تو اس کا بھی یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اپنے ہاتھ پیر کو حرکت دے۔ محنت سے گریز نہ کرے اور قرب و جوار میں چل پھر کر اپنی روزی خود تلاش کرے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے

ھو الذی جعل لکم الارض الخ (ملک)

وہ ایسا منعم ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو مسخر کیا سو تم اس کے راستوں پر چلو اور خدا کی روزی میں،

سے (جو زمین میں پیدا کی ہے) کھاؤ پیو۔

عمل سے مراد مناسب روزگار ہے جس سے اپنے اور اپنے خاندان کے لیے خاطر خواہ روزی کا سامان ہو سکے۔

اس میں شک نہیں کہ زندگی کے جہاد میں محنت و مشقت اور حرکت و عمل وہ حربہ ہے جس کے ذریعہ انسان دولت پیدا کر سکتا ہے، زمین کے اس ویرانے کو آباد کر سکتا ہے اور غریبی اور ناداری کے خلاف فیصلہ کن جنگ کر سکتا ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی زبان سے قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

یٰقوم اعبدوا اللّٰہ الخ (ھود ۶۱)

اے میری قوم، تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اس نے تم کو اس میں آباد کیا۔

۔ علاوہ ازیں اسلامی سوسائٹی کی ایک امتیازی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اس بات کی پوری آزادی دیتی ہے کہ پیدائش دولت کے لیے جس پیشے کو چاہے اختیار کرے خواہ ادنیٰ ہی پیشہ کیوں نہ ہو لیکن کسی کو ایسے کام کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا جو اس کی فطرت کے خلاف یا اس کے معاشرے کے لیے ضرر رساں ہو۔

اسلام میں حرام ٹھہرائے گئے کاموں کی علت عموماً یہی ہوتی ہے۔

لیکن معاذاللہ اسلام اس کی بھی تائید کرتا ہے کہ حرکت و عمل سے روزگار سے روزی کی فراہمی ایک امر بدیہی ہے، لیکن یہ خواب اسی وقت

شرمندۂ تعبیر ہوگا جب سماج ملک اور ملکی سیاست پر اسلام اور اسلامی تہذیب و ہدایت کی چھاپ نمایاں ہوگی۔

چنانچہ کارکردگی اور محنت کے معیار کو بلند کرنے اور مالک و مزدور کے درمیان رونما ہونے والے مسائل کے تصفیے کے لیے اسلام نے جو اخلاقی ضابطے مقرر کیے ہیں، ان کے پیش نظر یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ایک محنت کش مزدور بھی ہر قسم کے جھگڑوں اور پریشانیوں سے یکسو ہو کر محض اپنی مزدوری کے سہارے اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکتا ہے اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق بھی ادا کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام سکھاتا ہے کہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدور کی محنت کا ثمرہ بلا کم و کاست اس کے ہاتھوں میں پہنچا دیا جائے۔

اسلام کی نظر میں ایسے لوگ بدترین ظالم ہوتے ہیں جو طے شدہ اجرت میں کمی کرتے ہیں۔ یا سرے سے اس کی ادائیگی کی کوئی فکر نہیں کرتے اور یہ طے ہے کہ اسلام مظالم کو سخت ترین حرام سمجھتا ہے۔

اسلام سکھاتا ہے کہ مال و دولت اللہ کا فضل ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ہر جائز کوشش درست ہے اور ہر مسلمان کو اس سلسلہ میں مکمل مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اسلام اس کی کھلی اجازت دیتا ہے کہ آدمی اپنی پس انداز کردہ دولت سے کسی بھی قسم کی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد کی خرید و فروخت کرے۔

محنت سے گریز:

اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ آدمی کیڑے مکوڑے کی طرح زندگی گزارتے ہوئے ایسے وسائل اختیار کرے جس سے اس کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ اس کی بیماری اور کبرسنی کے دن سکھ چین سے بسر ہوں اور اس کے بعد اس کے بچے دربدر کی ٹھوکریں نہ کھاتے پھریں۔

اس لیے اسلام نے بہت پہلے ان فاسد اوہام اور باطل خیالات کی جڑیں کاٹ دیں جن کے ہوتے ہوئے آدمی محنتی اور جفاکش بننے کے بجائے کاہل اور سست بن جاتا ہے۔

(الف) چنانچہ کچھ لوگوں کو یہ خیال ہوجاتا ہے کہ انھیں خدا پر بھروسہ ہے۔ اس نے پیدا کیا ہے تو روزی بھی وہی دے گا خواہ اس کے لیے محنت مشقت کی جائے یا نہ کی جائے

اسلام اس قماش کے لوگوں کو ناسمجھ تصور کرتا ہے اس لیے توکل اور خدا پر بھروسہ کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی محنت کرنے اور اسباب کو استعمال کرنے سے گریز کرے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہے۔ بلکہ مسلمانوں کا شیوہ ہے کہ وہ اسباب کو کام میں لائیں گے۔ چنانچہ کھیتی کرنی ہو تو پہلے زمین درست کریں گے، پھر بیج ڈالیں گے۔ البتہ نتیجہ خدا پر چھوڑ دیں گے۔

زمانۂ نبوی کا واقعہ ہے کہ جب ایک بدو نے اپنی اونٹنی مسجد نبویؐ کے دروازے پر کھلی چھوڑی اور اپنی دانست کے مطابق خدا پر توکل کرنا چاہا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نصائح کی اور فرمایا کہ

"(دیکھو!) اسے باندھو پھر خدا پر بھروسہ کرو"

(ترمذی، ابن ماجہ)

توکل کا غلط مفہوم:

(ب) کچھ لوگ محنت مشقت اور کام کاج سے بچنے کے لیے اس حدیث کا سہارا جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، لیتے ہیں۔

"اگر تم خدا پر بھروسہ کرو تو پرندوں کی
طرح وہ تمہیں روزی عطا کرے گا،
تم پرندوں کو دیکھتے ہو کہ صبح خالی
پیٹ گھونسلوں سے نکلتے ہیں لیکن
شام کو آسودہ ہو کر واپس آتے ہیں"

ان لوگوں کی دانست میں حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خدا پر توکل کیا جائے تو روزی خود بخود مل جاتی ہے۔ حالاں کہ یہ واقعہ ہے کہ یہی حدیث خود ان کے مفروضے کو غلط ثابت کرتی ہے اور حصولِ رزق کے لیے جدوجہد کرنے کی صاف طور پر دعوت دیتی ہے اس لیے کہ یہ حدیث بتاتی ہے کہ پرندوں کا شکم سیر واپس آنا اسی وقت ممکن ہوتا ہے کہ جب رزق کی تلاش میں وہ نکل کھڑے ہوتے ہیں اور دن بھر اسی فکر میں سرگرداں رہتے ہیں گویا پرندوں کی دوادوش ان کے لیے حصولِ رزق کا سبب ہے۔ اسی تمثیل کی رو سے صحابہ کرامؓ خشکی اور تری کا تجارتی سفر فرماتے تھے۔ یا پھر کھجوروں کے باغات اور نخلستانوں میں مصروفِ عمل رہا کرتے تھے۔ ان صحابہؓ کی پیروی ہمارے لیے کافی ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ سے کسی نے پوچھا،
ایک شخص اس خیال سے گھر یا [illegible]

جانتے ہے کہ مجھے کچھ کرنے کی چنداں حاجت نہیں
میرا رزق مجھے مل کر رہے گا۔ اس شخص کے بارے
میں آپ کی کیا رائے ہے؟
آپؐ نے فرمایا:
"یہ شخص پرلے درجہ کا جاہل ہے اسے
نہیں معلوم کہ رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا:
"خدا نے میرے رزق کو میرے تیرے کے
نیچے چھپا رکھا ہے" (احمد)
درحقیقت باری تعالیٰ نے زمین کو
بنایا تو اس میں خیر و برکتیں ودیعت فرمائیں اور
انسانوں اور تمام جانداروں کے لیے روزی اور
زندگی کی تمام ضروریات مہیا فرمائیں۔ چنانچہ
ارشادِ باری ہے۔

اور بے شک ہم نے تم کو زمین پر
رہنے کے لیے جگہ دی اور ہم نے
تمہارے لیے اس میں سامانِ زندگی پیدا
کیا۔ تم لوگ بہت ہی کم شکر
کرتے ہو"۔

(اعراف ۱۰)

بنی آدم پر اپنے احسانات کا اظہار
فرماتے ہوئے دوسری جگہ ارشاد ہے۔
"اور ہم نے آدمؑ کی اولاد کو عزت
دی، اور ہم نے ان کو خشکی اور دریا
میں سوار کیا اور نفیس نفیس چیزیں ان
کو عطا کیں۔

(اسراء ۷۰)

نیز فرمایا
اللہ ہی ہے جس نے زمین کو (مخلوق
کو) قرار گاہ بنایا۔ سو عمدہ نقشہ
بنایا اور تم کو عمدہ عمدہ چیزیں
کھانے کو دیں۔ پس اللہ ہے تمہارا
رب، سو بڑا عالی شان ہے۔ اللہ
جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔
(غافر ۶۴)

یہی نہیں باری تعالیٰ نے زمین پر بسنے
اور تا قیامت اس کی پشت پر چلنے والے جملہ
جانداروں کی روزی رسانی کی ذمہ داری اپنے
اوپر لے رکھی ہے۔ چناں چہ باری تعالیٰ کا
ارشاد ہے۔

اور رکوئی رزق کھانے والا
جانور روئے زمین پر چلنے والا
ایسا نہیں ہے کہ اس کی روزی
اللہ کے ذمے نہ ہو"
(وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ
إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا)

(ھود ۔ ۶)

اللہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے
والا نہایت قوت والا ہے۔
(ذاریات ۵۸)

(احتساب علی گڑھ کے شکریہ کے ساتھ)

پروفیسر ایم اے سلیم خاں
ڈائرکٹر سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز

قسط اوّل

صہیونیت، فلسطین اور عرب

ایک تاریخی اور سماجی جائزہ

اس سال کے لبنان پر اسرائیلی حملے، مغربی بیروت کے محاصرے، فلسطینی تنظیم آزادی کے سپاہیوں کا اخراج، عرب ممالک کی بے چارگی، اقوام متحدہ کی ناکامی اور امریکہ کی ہر قدم پر اسرائیل کی تائید، ان سب نے وہ مناظر دہرائے ہیں جو صہیونیوں نے اس صدی کے نصف اول میں فلسطین میں اسرائیل کی بنیاد ڈالنے کے لیے اسٹیج کیے تھے۔ اس سال کے واقعے سے ایک طرف تو اسرائیل کی طاقت، ظلم و تشدد کی صلاحیت اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اخلاق و اقدار کو پامال کرنے پر اصرار، دوسری طرف مغرب، خاص طور سے امریکہ کے اسرائیل سے مغلوب ہو جانے اور اس کے توسیع پسندانہ عزائم (expansionist ambitions)

---

1 Zionism (صہیونیت) لفظ Zion سے نکلا ہے جو یروشلم کا ایک پہاڑ ہے جس کو یہودی مقدس مانتے ہیں۔ مذہبی صہیونیت (Religious Zionism) جس کا مقصد Zion کی طرف واپسی ہے پرانی تحریک ہے اس کے تحت بہت سے یہودی خاص طور پر بوڑھے یروشلم جاتے، وہاں عبادت کرتے اور اکثر بس جاتے، اور وہیں انتقال کر جاتے۔ لیکن سیاسی صہیونیت کی ابتدا انیسویں صدی کے آخری زمانے سے ہوئی جس کا مقصد فلسطین میں یہودیوں کی ریاست کا قیام تھا۔ اور اس بات کا خیال کیے بغیر کہ وہاں ہزاروں سال سے فلسطینی آباد ہیں اور ان کو وہاں سے نکالے بغیر یہودی ریاست قائم نہیں کی جا سکتی۔ بہت سے یہودی اس سیاسی صہیونیت (Political Zionism) کے مخالف تھے اور اب بھی ہیں گو ان کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ ان یہودی مخالف صہیونیوں میں دو گروہ اہم ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو مذہبی عقیدے کی بنا پر اس کے مخالف ہیں اور سیاسی صہیونیت کو ناجائز اور خدا کی مرضی کے خلاف سمجھتے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو مغربی ممالک میں آباد ہیں اور وہاں کی قوموں میں اپنی یہودی انفرادیت کو باقی رکھ کر ضم ہو گئے ہیں۔ یہ انضمام پسند (Integrationist Jews) یہودی بھی اسرائیل کے قیام کے مخالف تھے۔ جس طرح یہودیت اور صہیونیت دو مختلف چیزیں ہیں اسی طرح یہودیت کی مخالفت (جس کو مخالف سامیت Anti-Semitism [illegible] کا نام

(بقیہ آئندہ صفحہ پر دیکھیے)

کی تائید اور تیسری طرف عربوں کی کمزوریوں کو پھر سے بہیانک صورت حال میں واضح کرتا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ اس صدی کے نصف اوّل میں اسرائیل کی بجائے صیہونی تھے اور اکیلے امریکہ کی بجائے ساری مغربی دنیا اور روس تھے جن میں آگے آگے برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ تھے اور اس وقت اقوام متحدہ میں سوائے ریاست ہائے متحدہ کے اور کوئی اسرائیل کی تائید کرنے والا نہیں ہے۔ لیکن اُس وقت انجمن اقوام (League of Nations) میں ساری استعماری طاقتیں صیہونیوں کی تائید کر رہی تھیں اور ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے اقوام متحدہ میں امریکہ اور ساری یورپ کی ریاستیں بشمول روس ان کی تائید کر رہی تھیں۔ اس فرق کے باوجود تین باتیں اب بھی قائم ہیں، جارحیت کی کامیابی، کمزور اقوام کی شکست اور مغربی جمہوریت (جس کا بڑا نمائندہ امریکہ ہے) کی جارحیت کی تائید اور یہ اس دور میں قائم ہیں جس کو روشن ترین صدی یا سب سے متقدم ([illegible]) عہد کہا جاتا ہے۔ چوں کہ ان حالیہ واقعات کی بنیاد اس صدی کے نصف اول کے واقعات پر قائم ہے۔ اس لیے موخر الذکر واقعات اور ان کا تاریخی اور سماجی پس منظر اس مضمون کا موضوع ہے

فلسطین میں اسرائیل کا قیام بیسویں صدی کا ایسا عجیب و غریب واقعہ اور ایسا تاریخی المیہ ہے جس کو نہ انسانی ذہن سمجھ سکتا ہے اور نہ انسانی ضمیر قبول کر سکتا ہے۔ صہیونیوں نے فلسطین کی سرزمین پر اسرائیل کے قیام کے لیے ایک طرف تو یہ دعویٰ کیا کہ قبل مسیح کی بعض صدیوں میں یہودیوں نے فلسطین میں اپنی ریاست قائم کی تھی اور دوسرے یہ کہ خدا نے یہودیوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ فلسطین میں دوبارہ ان کی حکومت قائم کرے گا۔ یہ بات صحیح ہے کہ یہودیوں نے جو فلسطین کے باشندے نہیں تھے باہر سے آکر پہلے فلسطین میں بس گئے۔ پھر وہاں کے اصلی باشندوں کو رفتہ رفتہ مغلوب کر کے اپنی ایک ریاست قائم کر ڈالی جو چند صدیوں میں ختم ہو گئی ہے۔ باہر کے حملہ آوروں نے (جن میں عرب نہیں تھے) ان کو شکست دے کر فلسطین سے نکال دیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سارے کے سارے یہودی نکال دیے گئے۔ اگر ایسا ہوا تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہت کم تعداد میں تھے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کے پہلے باشندوں کے ساتھ بہت سے یہودی بھی وہاں رہ گئے جو یا تو یہودیت پر قائم رہے یا بعد میں انھوں نے عیسائیت اور دوسرے مذاہب کو قبول کر لیا۔ رفتہ رفتہ فلسطین میں دوسرے لوگ بھی آکر آباد ہو گئے ان میں عرب بھی شامل ہیں۔ ان سب لوگوں کی اولاد فلسطین میں ہی بستی رہی اور رفتہ رفتہ اس نے عربی زبان اختیار کر لی اور یہی فلسطینی عرب (مسلمان یہودی اور عیسائی) ہیں۔ اس لیے کہ عرب وہ ہیں جو عربی اپنی مادری زبان کے طور پر بولتے ہیں اور رنگ و نسل اور مذہب و ملت پر عربیت کا انحصار نہیں ہے

دیا جاتا ہے) صہیونیت کی مخالفت سے مختلف ہے۔ مخالف سامیت کے کلنک کو یہودیوں نے صرف یہود دشمنی کے لیے مختص کر دیا ہے حالانکہ عرب بھی سامی (Semites) ہیں اور عربوں سے دشمنی جو صہیونیوں نے دنیا بھر میں پھیلا رکھی ہے اور یہ بھی anti Semitism ہے اور اتنی ہی قابل مذمت ہے جتنی کہ مخالفت یہودیت۔

انھیں فلسطینی عربوں میں سے مسلمانوں اور عیسائیوں کو صہیونیوں نے فلسطین سے نکالنا شروع کیا۔ اور آخر کار ۱۹۴۸ء کی جنگ میں تقریباً سب کو نکال دیا اور یہی فلسطینی عرب ہیں جنھوں نے بعد میں فلسطین کی تنظیم آزادی (P.L.O) قائم کی اور اپنے وطن کو لوٹنے کی تحریک شروع کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فلسطین کے باہر سے آئے ہوئے یہودیوں کی چند صدیوں کی حکومت دو ہزار سال کے بعد ان یہودیوں کی مزعومہ اولاد اور دوسرے یہودیوں کو یہ اختیار دے سکتی ہے کہ ان فلسطینیوں کو جو اپنے ملک میں ہزاروں سال سے آباد ہیں نکال کر ایک یہودی سلطنت قائم کریں۔ اگر اس مضحکہ خیز اور خلافِ عقل نظریہ مان لیا جائے تو دنیا میں ایسی بہت سی قومیں اور گروہ پیدا ہو جائیں گے جو اپنے کسی پرانے دور کی ریاستوں کو یاد دلا کر کسی نہ کسی دوسرے ملک میں دوبارہ اپنی ریاست قائم کرنے کے حق کا دعوے کر سکتے ہیں۔ اس طرح عربوں کو اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ اسپین میں اپنی ریاست دوبارہ قائم کریں۔ اس قسم کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں ترکوں کو حق ہوگا کہ ایران اور مشرق وسطیٰ کے بعض اور حصّوں میں اپنی ریاستیں بنائیں اور اطالویوں کو یہ اختیار ہوگا کہ سلطنتِ روما کا واسطہ دے کر خود اسرائیل میں دوبارہ اپنی ریاست قائم کریں۔ لہٰذا اس سے نہ صرف ساری دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا بلکہ ان ملکوں کے باشندوں پر ویسا ہی ظلم ہوگا جو صہیونیوں نے فلسطینیوں پر برپا کر رکھا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود یہودیوں میں ایک بڑا طبقہ ایسا تھا جو سیاسی صہیونیت اور اسرائیل میں دوبارہ یہودیوں

کی ریاست قائم کرنے کے خیال کا مخالف تھا اور یہودیوں کے ایسے کئی مخالف صہیونی (anti-Zionist) گروہ تھے لیکن صہیونیوں کے تشدد اور دہشت انگیزی نے ان کی تعداد کم کر دی اور ان کو کمزور کر دیا۔ دوسرا دعویٰ صہیونیوں کا یہ تھا کہ خدا نے یہودیوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ دوبارہ اسرائیل میں ان کی ریاست قائم کر دے گا۔ اس دعوے کے صحیح ہونے یا نہ ہونے سے ہمیں زیادہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس بات کو بنیاد بنا کر دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے اور وہاں کے باشندوں کے قتل اور اخراج کا اختیار انسانیت بین الاقوامی قانون اور اخلاقی اقدار کسی بھی قوم یا گروہ کو دے سکتے ہیں۔ اس قسم کا دعویٰ کوئی بھی مذہبی گروہ کر سکتا ہے اور اپنی مذہبی کتابوں کے ایسے جملے نکال سکتا ہے کہ اس کو دنیا پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے کہ اس کو دوسرے لوگ مان لیں گے۔ یہ نظریہ بھی اتنا ہی غیر انسانی، غیر اخلاقی اور غیر منطقی ہے جتنا کہ پہلا نظریہ۔ سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ صہیونیوں کی ہٹ دھرمی، ظلم پسندی اور انسانیت سوزی ہے کہ انھوں نے ایسا کیا اور دنیا کی بعض اندھی سامراجی اور خود غرض طاقتوں نے ان کا ساتھ دیا اور عربوں کی کمزوری اور بیسویں صدی کے نصف اوّل کے بین الاقوامی، سیاسی، جنگی اور پروپگنڈے کے ماحول نے ایسا کرنے کا موقع دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی یورپ کی طاقتیں دنیا کے بڑے حصے بشمول مشرق وسطیٰ پر چھائی ہوئی تھیں۔ انجمن اقوام (League of Nations) پر انھیں سامراجی طاقتوں کا قبضہ تھا۔ اور ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کی بہت

سی قومیں یا تو غلام تھیں یا ابھی ابھی ابھر رہی تھیں۔ اسی طرح ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام سے پہلے اقوام متحدہ بھی انہیں سامراجی طاقتوں کا گڑھ تھا جب کہ فلسطین کی تقسیم کی قرارداد جنرل اسمبلی General Assembly میں پاس ہوئی۔ دنیا جانتی ہے کہ کس طرح امریکہ نے اس وقت کے بعض کمزور ممبر ملکوں پر دباؤ ڈال کر ووٹ حاصل کیے اور کس طرح اسٹالن نے یہ سمجھ کر کہ اسرائیل کے قیام سے مشرق وسطیٰ میں کمیونزم کے پھیلنے میں مدد ملے گی، دوسرے کمیونسٹ ملکوں کے ووٹ اس قرارداد کی تائید میں حاصل کیے۔ عرب ملکوں نے جنہوں نے اس قرارداد کو رد کر دیا تھا فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کے بعد جب حملہ کیا تو انھیں نام نہاد جمہوری اور کمیونسٹ ملکوں نے اسرائیل کی جنگی، مالی اور ڈپلومیٹک مدد کی اور عربوں کو ناکام کر دیا۔ اسرائیل کے قیام کی بنیاد نہ کسی تاریخی، مذہبی اور قانونی حق کی بنیاد پر ہے اور نہ اخلاقی اور انسانی اقدار پر بلکہ اس کی بنیاد صرف طاقت پر ہے جس کو ظلم، ہٹ دھرمی اور انسانیت سوزی کی تائید میں استعمال کیا گیا۔

صہیونیوں نے جو پروپیگنڈے کا جال بنا اور نئے نئے طریقے دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے استعمال کیے اور سامراجی طاقتوں نے جس طرح ان کا ساتھ دیا ابھی ان کی پوری تاریخ مرتب نہیں ہوئی۔ لیکن بہت کچھ لکھا جا چکا ہے[۱]۔ انیسویں صدی کے وسط سے ہی برطانوی وزیر خارجہ اور وزیراعظم پامرسٹن نے استعماری اغراض کے لیے یہودیوں کو استعمال کرنے کا ارادہ کر لیا تھا مصر میں محمد علی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنے، اس کے فرزند ابراہیم کی فلسطین اور شام کی فتوحات کو ناکام بنانے اور شام اور مصر کے بیچ میں متوقع اتحاد کو روکنے کے لیے جہاں اس نے دوسرے طریقے استعمال کیے وہاں یہ بھی اسکیم بنائی تھی کہ فلسطین میں یہودی آبادی بڑھائی جائے تاکہ بعد میں ایک یہودی ریاست کا قیام عمل آئے ۔ تھیوڈر ہرزل (Theodor Herzle) کی کتاب "یہودی ریاست" (The Jewish State) کے ۱۸۹۶ء میں شائع ہونے کے بعد سیاسی صہیونیت نے زور پکڑا چونکہ فلسطین سلطنت عثمانیہ (The Othoman Empire) کا حصہ تھا۔ اس لیے ترکی اور اس کے حلیف جرمنی میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کی اجازت حاصل کر لی جائے لیکن اس میں صہیونیوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن جوں ہی جنگ عظیم اول شروع ہوئی ان کو امید پیدا ہو گئی۔ یورپ کی مغربی طاقتیں اور خاص طور پر برطانیہ گزشتہ دوسو سال سے بیمار اور کمزور سلطنت عثمانیہ کو اس کی توسیع پسندی کو روکنے، ہندوستان اور مغربی یورپ کے درمیانی راستے کو دشمنوں سے صاف رکھنے اور یورپ میں توازن طاقت (Balance of Power) کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن اب ۱۹۱۴ء میں

---

[۱] مثلاً ملاحظہ ہو صہیونی پروپیگنڈے اور قلابازیوں کی مختصر تاریخ کے لیے ایک برطانوی مصنف کی کتاب Michael Ionides - Divide and Lose: The Arab Revolt of 1955-1958 (London 1960) pp 19-85

اسی طرح ایک اور برطانوی مصنف کی کتاب صہیونیوں، برطانیہ اور عرب فلسطینیوں کے تعلقات کے لیے خاص طور پر فلسطین میں

انھوں نے اپنی اس پرانی پالیسی کو جو مشرقی سوال "ma" (Eastern Question) کے نام سے یاد کی جاتی تھی یکلخت بدل دیا اور اس کو تباہ و برباد کرنے پر تل گئے۔ صیہونیوں کے لیے سنہرا موقع ہاتھ آگیا۔ انھوں نے اپنی تنظیمیں امریکہ، جرمنی اور فرانس وغیرہ میں برقرار رکھیں، لیکن اپنی طاقت کو برطانیہ میں مرکوز کر دیا اور اس بات کی پوری کوشش کی کہ برطانیہ جنگ جیت جائے۔ جنگ کے آخری دور یعنی ۱۹۱۷ء میں انھوں نے برطانوی حکومت سے اعلان بالفور (Balfour Declaration) حاصل کر لیا جس میں ان سے وعدہ کیا گیا کہ فلسطین میں ایک یہودی وطن قائم کرنے میں برطانوی حکومت مدد کرے گی۔ پھر ۱۹۲۰ء میں استعماری طاقتوں پر مشتمل انجمن اقوام (League of Nations) نے ایک سامراجی نظریہ پر مبنی ابتدائی نظام (Mandatory System) کے تحت فلسطین برطانیہ کے حوالے کر دیا اور اعلان بالفور کو ابتدائی نظام کا ایک جزو قرار دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کی آمد میں سہولتیں پیدا کرنی شروع کیں۔ چرچل جیسے طاقتور سیاست داں ہمیشہ صیہونیوں کی تائید کرتے رہے۔ اعلان بالفور کو صیہونیوں نے ہمیشہ حالات کے لحاظ سے معنی پہنائے۔ صیہونی پروپگنڈے کے ماہر پہلے ہی یہ کہتے آرہے تھے کہ فلسطین میں کوئی آبادی نہیں ہے۔ چند بدو رہتے ہیں اور وہ بھی ایک طرف سے آتے ہیں اور دوسری طرف سے نکل جاتے ہیں۔ اس لیے یہودیوں کو وہاں بسایا جائے تاکہ وہ اپنی محنت اور علم و فن کے صحرا کو گلزار بنا دیں۔ چنانچہ یہ دلفریب نعرہ لگایا گیا "A people without a land, for a land without a people."

یعنی یہودی جن کا کوئی وطن نہیں ہے انہیں ایسا ملک دیدیا جائے جہاں کوئی آبادی نہیں ہے۔

اس نعرے کو مغرب کی تاریخ و جغرافیہ دانی کے باوجود وہاں کے بہت سے عالموں اور عقل مندوں نے صحیح سمجھ لیا۔ اعلان بالفور نے صیہونیت کو بین الاقوامی سیاست میں نہ صرف محترم مقام عطا کیا بلکہ ان کے دعوے کو بین الاقوامی قانون (جو اپنے دور استعمار کا پرتو تھا) کا لبادہ پہنا دیا۔ ادھر امریکہ میں ایک لبرل صدر ولسن کا انتخاب ہوا تھا اور ان انتخابات میں ایک صیہونی با اثر وکیل برانڈیس Brandeis نے اہم رول ادا کیا تھا اور موخر الذکر کے زیر اثر ولسن پر صیہونیت کی گہری چھاپ تھی۔ صیہونیوں نے استعمار پسندوں سے کہا کہ اسرائیل کا قیام ان کے مقاصد میں مدد و معاون ہوگا۔ لبرل گروہوں سے کہا کہ وہ تو فلسطین کے عربوں کو وہاں کے شیوخ اور جاگیرداروں سے نجات دلا رہے ہیں۔ سوشلسٹوں سے کہا کہ وہ وہاں کے غریب کسانوں اور مزدوروں کی مدد کر رہے ہیں۔ کیتھولک عیسائیوں کو دھمکایا کہ اگر انھوں نے مخالفت کی تو ان کے ذہنوں میں بھی ہوگی

باقی صفحہ نمبر ۱۳ پر دیکھے۔

G. B. Kirk, a Short history of Middle East (Northampton 1964) pp 146-59-179 89-202-6-209-27.

فرخ جلالی
شعبۂ تاریخ
اے ایم یو۔

محمد ابوالحسن صدیقی

کالج کے پہلے مسلمان استاد

اعلیٰ مغربی تعلیم کی ضرورت ۱۸۵۷ء کے بعد نہایت شدت سے محسوس کی گئی۔ مگر اس کی طرف توجہ دیر سے ہوئی۔ سرسید نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج شروع کیا۔ اس وقت فارسی اور عربی کے اساتذہ تو آسانی سے مل گئے۔ مگر مغربی تعلیم کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی سخت کمی تھی۔ سرسید نے سفرِ انگلستان کے زمانہ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا منصوبہ ۱۸۷۰ء میں مرتب کیا تھا۔ اور پانچ برس کے بعد ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو سرسید کے اس تعلیمی ادارہ کا افتتاح ہوا۔ سڈنس پہلے پرنسپل مقرر ہوئے جو ۱۸۸۳ء تک رہے۔ انگلش کے پہلے مسلم استاد محمد ابوالحسن صدیقی تھے۔ دوسرے مسلمان اساتذہ عربی، فارسی اور ریاضی کے تھے۔ عربی کے اساتذہ میں مولانا محمد اکبر کاندھلوی کا نام کافی مشہور رہے۔

محمد ابوالحسن صدیقی ۱۲ فروری ۱۸۵۲ء مطابق ۱۲ ربیع الثانی ۱۲۶۸ھ کو بدایوں میں پیدا ہوئے ان کے والد کا نام محمد عزیز الدین تھا جو دہلی میں وکیل تھے اور دہلی میں کافی جایداد تھی۔ غالب کا ایک خط عودِ ہندی میں ان کے نام موجود ہے۔ محمد عزیز الدین غالب کے شاگرد تھے۔

محمد ابوالحسن صدیقی نے ابتدائی تعلیم بدایوں میں حاصل کی اور ۱۸۷۰ء میں بدایوں گورنمنٹ اسکول سے ہائی اسکول پاس کیا۔ بریلی کالج سے انھوں نے ایف اے پاس کیا بس بی اے میور سنٹرل کالج الہ آباد سے کر رہے تھے کہ ۱۸۷۵ء میں سرسید نے قدیم مراسم خاندانی کی وجہ سے ان کو علی گڑھ بلا لیا۔ وہ پہلے مسلم استاد تھے جنھوں نے کالج کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

محمد ابوالحسن کا خاندان بدایوں کا تھا مگر ان کے مورث سو برس سے دہلی میں بسلسلۂ جایداد مقیم تھے ان کے والد عزیز الدین کے سرسید سے گہرے تعلقات تھے۔

عزیز الدین بعد کو منصف ہوگئے تھے۔

ایک مرتبہ سرسید نے عزیز الدین کو کالج کے معاینہ کے لیے بلایا۔ مولوی عزیز الدین نے خاص طور پر معاینہ کے بعد لکھا کہ سرسید کی کتب مذہبی تک طلبا کی رسائی نہیں ہے۔ سرسید کا یہ خاص ایثار تھا۔

۱۸۷۵ء اور کسی مسلمان کا استاد کی
حیثیت سے کالج سے متعلق ہونا بہت بڑی بات تھی۔
بقول سرسید کے کہ مقامی حکام ہندوستانیوں اور
خصوصاً مسلمانوں کے درمیان اعلیٰ مغربی تعلیم نہیں دیکھنا
چاہتے تھے۔ سرسید نے اپنے مخالفین مذہبی میں کالج
کے سلسلہ میں صرف مولانا علی بخش کو اہمیت دی یہاں
تک کہ مذہبی تعلیم کی نگرانی بھی ان کو پیش کی۔ مگر سرسید
سے ان کی ضد کے باعث نباہ نہیں ہوا۔ وہ آخر وقت
تک مخالف رہے۔ سرسید کے خلاف کتابیں لکھیں، فتوے
حاصل کیے۔ علی بخش بھی بدایوں کے رہنے والے تھے
حافظ احمد حسن (ٹونک والا) نے تہذیب الاخلاق کے
اجراء میں سرسید کی مالی مدد کی تھی اور شیخ شرف
الدین۔ سی آئی۔ ای۔ سائنٹیفک سوسائٹی کے ممبر
رہے۔ یہ دونوں حضرات بدایوں کے بڑے رئیسوں
میں سے تھے۔

مخالفت اور موافقت کی اس کشمکش
میں محمد ابوالحسن صدیقی کا سرسید کے ساتھ تعاون کرنا
ایک اہم واقعہ سمجھا گیا تھا

۱۸۷۹ء میں سرسید وائسرائے
لارڈ لٹن کی کونسل کے ممبر مقرر کیے گئے۔ یہ کسی بھی ہندوستانی
کے لیے بہت بڑا اعزاز اور منصب تھا۔ سرسید نے اس
موقع پر محمد ابوالحسن کی قابلیت اور ایمانداری کا لحاظ
کرکے اپنا پرائیوٹ سکریٹری مقرر کر لیا۔ یہاں کونسل
میں سرسید نے بعض بڑے معرکے کے قانون پاس
کرائے جن میں ٹیکے کا قانون اور قاضیوں سے متعلق
ایک ایکٹ پاس کرایا۔ اِس کام اور تقریروں کی تیاری
میں محمد ابوالحسن نے ان کی بڑی مدد کی۔ سرسید بہت
کم تصدیقی اور تعریفی تحریریں لکھتے تھے۔ مگر ابوالحسن
مرحوم کے بارے میں انھوں نے ایک مختصر تصدیق نامہ
لکھا جو خطوط سرسید میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۸۸۰ء تک سرسید وائسرے کی کونسل
کے ممبر رہے۔ اس دوران میں کالج کا چارج خواجہ
محمد یوسف کے پاس رہا۔ سالار جنگ وزیر اعظم
حیدرآباد سرسید کو بلاتے رہتے تھے اور سرسید
یہاں سے نہایت اہل اور قابل لوگوں کو بھیجتے رہتے تھے
سید مہدی علی محسن الملک، مشتاق حسین وقار الملک
ڈاکٹر نذیر احمد اور چراغ علی کو سرسید نے حیدرآباد
بھیجا۔

۱۸۸۲ء میں سرسید کی ایما سے
محمد ابوالحسن صدیقی حیدرآباد پہنچے۔ پہلے وزیر اعظم
کے عملے میں شریک کیے گئے اور اس کے بعد ناظم اول
یعنی چیف جج ہو گئے۔ اپنی خدمات سے سبکدوشی کے
بعد بدایوں آ گئے۔ تعلیمی تحریک سے وہ ابتدا سے
متعلق تھے۔ یہاں انھوں نے اسلامیہ ہائی اسکول
کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا اور اس کے پہلے سکریٹری
مقرر ہوئے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سرسید
حافظ کے شیدا تھے۔ ان کے ملنے والوں کو
بھی حافظ سے خاص شغف پیدا ہو گیا تھا۔ شبلی
نے اپنی طبیعت داری اور ذوق سخن کے باعث
شعر العجم میں حافظ کے بارے میں جس شیفتگی سے
لکھا ہے اس میں سرسید کی مجلسوں کا اثر اور

باقی صفحہ نمبر ۸ پر دیکھیے

مصطفیٰ شروانی
حیدرآباد۔

الحاقِ افغانستان

تہذیب الاخلاق کے یکم اگست ۸۲ء کے اداریہ میں افغانستان پر اغیار کا قبضہ کا تذکرہ مصر کے شاہ فاروق مرحوم کے اس تاریخی قول کی یاد دلاتا ہے کہ بالآخر دنیا میں صرف ۵ بادشاہ رہ جائیں گے۔ چار تاش کے پتوں میں اور شاہ (یا ملکہ) انگلستان۔ افغانستان کی موجودہ سیاسی پیچیدگیوں کی ابتدا در اصل ظاہر شاہ کو ان کے برادر نسبتی داؤد خاں کے ملک بدر کر کے افغانستان میں جمہوری حکومت قائم کرنے سے شروع ہوتی ہے۔ خود ظاہر شاہ وسیع النظر اور دور اندیش حکمران تھے اور جانتے تھے کہ افغانستان کی ہمہ جہتی ترقی کے لیے سوویت یونین کا اشتراک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ دسمبر ۱۹۵۵ء میں مارشل بلگانین صدر مجلسِ وزرا سوویت یونین اور مسٹر خروشچوف نے ہندوستان کے بعد افغانستان کا دورہ کیا اور کابل میں شاہی مہمان رہے۔ محمد داؤد خاں اس وقت افغانستان کے وزیر اعظم تھے۔ مسٹر بلگانین نے ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو ماسکو میں سوویت یونین کی اعلیٰ سوویت کے اجلاس میں اپنی رپورٹ میں اپنے اور مسٹر خروشچوف کے دورۂ افغانستان کے بارے میں کہا تھا

افغانستان کی سوویت حکومت نے ہمیشہ مدد کی ۱۹۱۹ء میں ہمارے ملک (سوویت یونین) نے سب سے پہلے افغانستان کو بطور ایک خود مختار سلطنت کے تسلیم کیا۔ اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ بادشاہ افغانستان اور وزیر اعظم محمد داؤد خاں اور دیگر افغانی مدبرین سے ہماری ملاقاتوں نے واضح کر دیا کہ وہ دونوں ممالک کے مابین خوشگوار ہمسائگی کے تعلقات قائم رکھنا اور بڑھانا چاہتے ہیں۔ (رپورٹ مارشل بلگانین روبرو اعلیٰ سوویت ماسکو ۲۹ر دسمبر ۱۹۵۵ء)

جب محمد داؤد خاں نے ظاہر شاہ کو ہٹا کر خود صدر جمہوریہ افغانستان بن کر تاریخ کے بہاؤ کو بدل دیا تو ملک ایک انتشار کے دور کی طرف مائل ہو گیا۔ راقم الحروف ۱۹۶۱ء میں کابل گیا۔ اور کابل ایرپورٹ پر سب سے پہلے روسی تیل ہوائی جہاز میں بھرنے کے ٹینک کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ بین الاقوامی ہوائی جہاز Caltex یا Esso کے ٹینک سے تیل لیا کرتے تھے پھر اتفاق سے افغانستان کے قومی دن کی پریڈ دیکھنے کا موقع ملا جس کی سلامی خود ظاہر شاہ نے لی تھی پریڈ میں اکثر فوجی بکتر بند گاڑیاں روسی ساخت کی تھیں۔ یہ سب امریکہ کے علی الرغم ہوتا رہا۔

محمد غزالی خاں عبد نظر ثانی شہناز ہاشمی
شعبۂ صحافت اے ایم یو

یونیورسٹی کے شب و روز

جشن آزادی

یونیورسٹی میں جشن آزادی حسب معمول جوش و خروش سے منایا گیا۔ اسٹوڈنٹس یونین کی جانب سے ۱۴ر اگست ۸۲ء کو کینڈی ہال میں تقریری مقابلہ اور ۱۵ر اگست کو کلچرل پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔

بقیہ مضمون "الحاق افغانستان"

تھا۔ عام خوشحالی کا یہ حال تھا کہ اچھی جرمن دستی گھڑی ایک سو افغانی (یعنی ہندوستانی دس روپیہ میں) ملتی تھی ہندوستان کا ایک روپیہ ۱۱ افغانی کے مساوی تھا۔ ہوٹل میں انگریزی طرز سے پکی ہوئی مرغی ڈیڑھ روپیہ (۱۲ افغانی) میں ملتی تھی۔ لیکن شاہی جانے کے بعد یہ مرفع الحالی باقی نہیں رہی اور اب ہندوستانی روپیہ ایک افغانی کے مساوی ہو گیا ہے۔

پھر بھی تاریخ کا ایک دور رہا کہ محمد داؤد خاں کی نام نہاد جمہوریت سے افغانی عوام بیزار ہو گئے اور داؤدی حکومت کا تختہ الٹ دینے کے بعد باسرک کارمل نے زمام حکومت سنبھالی اور ساست روسی پشت پناہی افغانستان کو حاصل ہو گئی۔

تاریخ میں ایسی ہی لیکن اس سے زیادہ درخشاں اور کامیاب مثال اتاترک مصطفیٰ کمال کے ترکی سے خلیفہ سلطان عبدالمجید کے ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کو ترکی سے اخراج اور قیام جمہوریہ ترکی سے ملتی ہے لیکن اس دور میں غازی پاشا نے یورپ کے 'مرد بیمار' ترکی کو دنیا کی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ رکھنے کا عزم کیا تھا اور ایک مستحکم خود مختار جمہوریہ ترکی کا قیام عمل میں آیا تھا جو آج بھی قبرص اور یونان کی حکومتوں سے اپنا لوہا منوا رہا ہے۔

چرچل نے اپنی بے نظیر تصنیف Great Contemporaries - (۱۹۳۷ء) میں لیون ٹراٹسکی کے بیان میں کمیونزم کی اصلیت یوں بتائی ہے کہ کسی ملک میں ایسے انتشار کے حالات پیدا کئے جائیں۔ پہلے لبرل یا سوشلسٹ قسم کی حکومت قائم کی جائے اور جلد اسی حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے۔ اور مکمل انتشار کے بعد عوام کی مدد کے بہانے بیرونی دخل اندازی کر دی جائے۔ افغانستان میں یہی ہوا ہے پہلے ہنگری میں ایسا ہی نقشہ بنایا گیا اور اب پولینڈ کی باری ہے لیکن افغانستان میں انتشار "میں خود تا یا نہیں لایا گیا ہوں" کے مصداق ہوا جو شاہ کے شعلہ کے مٹا دے جانے کا لازمی نتیجہ ہے

وکٹوریہ گیٹ پر وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب نے پرچم کشائی کی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے آپ نے نظم وضبط پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ اس کے بغیر کوئی قوم آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یونیورسٹی کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے ملک وملت کو کوئی نقصان پہنچے۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہیے کہ آنے والی نسلوں کے لیے ہمارا ورثہ قابلِ فخر ہو۔

نیا ہوسٹل

یو جی سی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک ہوسٹل کی تعمیر کے لیے ایک کروڑ اڑتالیس لاکھ تیس ہزار روپیہ کی منظوری دی ہے۔ اس ہوسٹل میں پانچ سو طلبا کی رہائش کا معقول انتظام ہوگا۔ یہ منظوری چھٹے پنج سالہ منصوبہ میں ترقیاتی اسکیم کے تحت دی گئی ہے۔

یونین اسکول

مسلم یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے سابق سکریٹری جناب معراج الدین احمد نے سعودی عرب کے ممتاز صنعت کار حسن کمال صاحب کے یونین کے تحت چلنے والے عبدالبصیر خاں اسکول کی تعمیر نو کے لیے ایک لاکھ ڈالر کے عطیہ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ حسن کمال صاحب نے یہ چیک وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب کے نام بھیجا ہے اس عطیہ کا اعلان حسن کمال صاحب نے علی گڑھ میں قیام کے دوران کیا تھا جب وہ اسکول کا معائنہ کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ (دیکھیے تہذیب الاخلاق ۱۶ ار جون ۱۹۸۲ء)

یونیورسٹی کورٹ اور ایگزیکیٹو کاونسل

یونیورسٹی کورٹ کے لیے وزیٹر کی جانب سے پانچ ممبران پارلیمنٹ نامزد کیے گئے ہیں۔ جناب سید احمد ہاشمی، مولانا اسعد مدنی، جناب سید شہاب الدین، جناب جی ایم بنات والا اور ڈاکٹر اے یو اعظمی۔ ایگزیکیٹو کاؤنسل میں وزیٹر نے تین ممبران جناب اے جے قدوائی، پروفیسر بی ڈی شرما اور جناب ماسٹر صاحب کو نامزد کیا ہے۔ گورنر کی جانب سے ایگزیکیٹو کاؤنسل میں سید سبط حسن صاحب نامزد کیے گئے ہیں۔

یونیورسٹی پر فلم علی گڑھ کے ممتاز اولڈ بوائے اور سابق استاد جو بمبئی میں آج کل کئی فلموں سے وابستہ ہیں، فلم ڈویژن کی طرف سے یونیورسٹی پر ایک ڈوکیومنٹری فلم بنا رہے ہیں جس کی شوٹنگ ۱۲ اگست سے شروع ہوئی۔ یونیورسٹی کے مختلف شعبے، تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیاں اس فلم میں شامل ہوں گی۔

> شعبۂ سیاسیات کے ممتاز اور مقبول استاد پروفیسر ناصر علی کا دماغ کی رگ پھٹ جانے سے ۱۰ اگست ۸۲ کو انتقال ہوگیا۔ بعد عصر ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ سوگواران میں یونیورسٹی کے بہت سے اساتذہ اور طلبا موجود تھے۔ ادارہ پس ماندگان سے اظہار ہمدردی اور مرحوم کیلیے دعائے خیر کرتا ہے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نوٹس داخلہ نمبر ۷

سیشن ۸۳-۱۹۸۲ء

۸۴-۱۹۸۲ء کے سیشن کے لیے مندرجہ ذیل کورسیز میں اہل اور مستحق امیدواروں سے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ یہ داخلے مقابلے کے امتحان/ امتحان و انٹرویو کی بنیاد پر ہوں گے۔ ذیل میں ہر کورس کے مقابل میں کم از کم تعلیمی استعداد مدت درخواست فارم موصول ہونے کی آخری تاریخ۔ امتحان کی تاریخ اور داخلہ کی متوقع تاریخیں درج ہیں۔

نمبر شمار	کورس اور اس کی میعاد	کم از کم استعداد	درخواست موصول ہونے کی آخری تاریخ	ٹیسٹ کیلئے تاریخ	داخلہ مکمل کرانے کی متوقع تاریخ
۱	بی ایس سی (انجینئرنگ، الیکٹریکل، مکینیکل، سول کیمیکل) (پانچ سال)	مسلم یونیورسٹی سے سیکنڈ ڈویژن سے پری یونیورسٹی سائنس فزکس کیمسٹری اور میتھمیٹکس کے مضامین کے ساتھ یا اس یونیورسٹی سے اسکے مساوی کوئی اور امتحان جس میں انگریزی ایک مضمون کی حیثیت سے شامل ہو	۱۳ر ستمبر ۸۲ء	۴ر تا ۸ر اکتوبر ۱۹۸۲	۶ر نومبر ۱۹۸۲ء
۲	ایم بی بی ایس ۴½ سال	سائنس کے مضامین میں	۱۰ ستمبر ۱۹۸۲ء	۹ر تا ۱۳ر اکتوبر ۸۲ء	۱۱ر نومبر ۱۹۸۲ء

		۵۰ فیصد نمبروں کے ساتھ پری میڈیکل امتحان یا انگریزی کے ساتھ کوئی ایسا امتحان جسے مسلم یونیورسٹی پری میڈیکل کے مساوی تسلیم کرتی ہو۔			
۳	کامل طب وجراحت کی پری طب کلاس ۱/۲ برس کا نصاب	اس یونیورسٹی کا پری یونیورسٹی امتحان یا انگریزی کے مضمون کے ہمراہ کوئی امتحان جسے یونیورسٹی پری یونیورسٹی امتحان کے مساوی تسلیم کرتی ہو یا (ا) عالم (عربی)، کامل (فارسی) ادیب کامل (جامعہ اردو) یا کسی بورڈ/ یونیورسٹی یا ادارہ یا ریاستی محکمہ تعلیم کا کوئی امتحان جسے یہ یونیورسٹی اسکے مساوی تسلیم کرتی ہو (ب) پری یونیورسٹی کے معیار کی اردو قابلیت۔	۱۵؍ستمبر ۸۲ء	یکم تا ۲؍اکتوبر ۱۹۸۲	۳۰؍اکتوبر ۱۹۸۲
۴	بی. لائبریری سائنس ایک سال	بی اے/بی ایس سی/بی کام یا اس کے مساوی کوئی اور امتحان	۲۰ ستمبر ۸۲ء	۱۵؍اکتوبر ۸۲ء	۳۰؍اکتوبر ۱۹۸۲ء
۵	ماسٹر آف بزنس ایڈمنسٹریشن۔ (ایم بی اے) ۲ سال	بی اے/بی ایس سی/بی کام بی ایس سی (انجینئرنگ)/ بی ایس سی (ایگریکلچر) یا اس کے مساوی کوئی امتحان	۱۵؍ستمبر ۱۹۸۲ء	۲۳ تا ۲۵ ستمبر ۱۹۸۲ء	۸؍نومبر ۱۹۸۲ء
۶	ڈپلوما ان انجینئرنگ سول/الیکٹریکل/ میکینکل۔ ۳ سالہ کورس	انگریزی، ہائر میتھیمٹکس اور ہائر سائنس کے مضامین کے ساتھ ہائی اسکول یا اس کے مساوی کوئی امتحان جس میں انگریزی حساب اور سائنس میں مجموعی طور پر ۴۵ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں	۱۰؍ستمبر ۱۹۸۲	۳۰؍ستمبر ۸۲ء	۲؍نومبر ۱۹۸۲ء

۷ کمپیوٹر سائنس میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ	ایم ایس سی میں فرسٹ ڈویژن اس کے علاوہ بی ایس سی فزکس اور میتھمیٹکس کے مضامین لے کر پاس کی ہو یا بی ایس سی انجینئرنگ یا اس کے مساوی کوئی امتحان فرسٹ ڈویژن میں	۱۵ ستمبر ۸۲ء	۲۲ ستمبر ۸۲ء	۱۴ اکتوبر ۱۹۸۲ء
۸ کمپیوٹر پروگرامنگ میں ڈپلومہ ایک سالہ کورس	۵۰ فیصد نمبروں کے ساتھ بیچلر ڈگری۔ یا اس کے مساوی کوئی امتحان	۱۰ ستمبر ۸۲ء	۲۳ ستمبر ۸۲ء	۱۵ اکتوبر ۸۲ء
۹ ہائیڈرو جیالوجی میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلوما ایک سالہ کورس	ایم ایس سی / ایم ٹیک جیالوجی / اپلائڈ جیالوجی / جیو فزکس کے مضامین جس میں سکنڈ ڈویژن اور مجموعی طور پر ۵۰ فی صد نمبر حاصل کیے ہوں۔ میتھمیٹکس کا پس منظر رکھنے والے امیدواروں کو ترجیح دی جائے گی۔ یا فرسٹ ڈویژن میں بی ایس سی انجینئرنگ۔	۱۵ ستمبر ۱۹۸۲	۲۱ ستمبر ۱۹۸۲ء	۴ اکتوبر ۱۹۸۲ء
۱۰ بی ایڈ ایک سال	بی اے / بی ایس سی / بی کام یا اس کے مساوی پاس شدہ کوئی امتحان ۵۰ فی صد نمبروں کے ساتھ	۲۰ ستمبر ۱۹۸۲ء	۱۵ اکتوبر ۱۹۸۲ء	۱۵ نومبر ۱۹۸۲
۱۱ ایم ایڈ ایک سالہ کورس	بی ایڈ یا اس کے مساوی کوئی امتحان جس میں تھیوری کے	۲۰ ستمبر ۱۹۸۲ء	۲۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء	۲۵ نومبر ۱۹۸۲ء

		پرچوں میں مجموعی طور پر ۵۰ فیصد نمبر حاصل کیے ہوں			
۱۲۔	ایم لب سائنس	بی لب سائنس یا اس کے متبادل کوئی امتحان سیکنڈ ڈویژن اور ۵۰ فیصد مجموعی نمبروں کے ساتھ	۲۰ ستمبر ۸۲ء	۱۵ اکتوبر ۸۲ء	۱۴ نومبر ۱۹۸۲ء
۱۳	ایم ایس سی انجینئرنگ سول/الیکٹریکل/مکینیکل ۲ سالہ کورس	متعلقہ مضمون میں ۶۰ فیصد نمبروں کے ساتھ فرسٹ ڈویژن یا اس کے متبادل اسی گریڈ میں کوئی اور امتحان۔	یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء	۱۴ اکتوبر ۸۲ء	یکم نومبر ۱۹۸۲ء
۱۴۔	ایم ڈی (یونانی) تین سالہ کورس	(ا) اس یونیورسٹی سے پاس شدہ بی یو ایم ایس/بی یو ایم ایم ایس/بی یو ڈی ایس یا یونیورسٹی سے اس کے متبادل کوئی امتحان فرسٹ کلاس مارکس کے ساتھ (ب) ہاؤس جاب/انٹرن شپ کی حیثیت سے کام کرنے کا کم از کم چھ ماہ کا تجربہ	یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء	۲۰ اکتوبر ۱۹۸۲	۱۱ نومبر ۱۹۸۲

یا

بی یو ایم ایس/بی یو ایم ایم ایس/بی یو ڈی ایس یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء
۲۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء ۱۱ نومبر ۱۹۸۲ء کے فائنل امتحان پاس کرنے
کے بعد کم از کم دو سال۔

نمبر شمار ۱۔۲۔۳۔۴ کے تحت آنے والے کورسیز میں داخلہ تحریری امتحان کی بنیاد پر ہوگا۔ جبکہ ۵۔۶۔۷۔۸۔۹۔۱۰
۱۱۔۱۲۔۱۳ اور ۱۴ نمبر کے کورسیز میں داخلہ تحریری امتحان اور انٹرویو کی بنیاد پر ہوگا۔

کورسیز، قابل ادا فیس، درخواست بھیجنے کے قواعد اور طریقہ کار وغیرہ کے متعلق جملہ معلومات "گائڈ ٹو ایڈمیشن ٹیسٹ" میں دی گئی ہیں۔ درخواست فارم اور گائڈ ٹو ایڈمیشن ٹیسٹ کی کاپیاں اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۲۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تین روپیہ کی نقد ادائیگی یا فائنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا تین روپیہ کے کراسڈ پوسٹل آرڈر بھیجے جانے پر طلب کیے جا سکتے ہیں۔ فارموں کے لیے جو درخواستیں بھیجی جائیں ان میں واضح طور پر بیان کیا جائے کہ کس کورس میں داخلے کے لیے درخواست فارم مطلوب ہیں۔

یونیورسٹی سے متعلق داخلی طلبا، اپنے متعلقہ پروسٹ سے فارم حاصل کر سکتے ہیں۔ جو امیدوار بذریعہ ڈاک درخواست فارم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں ان کے لیے ضروری ہے کہ ۱۳×۲۸ سینٹی میٹر کے لفافہ پر ۱.۴۰ روپیہ کے ٹکٹ چسپاں اور اس پر اپنا پتہ لکھ کر روانہ کریں اور اگر درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک مطلوب ہوں تو خود کا پتہ تحریر کیے ہوئے لفافہ کے ہمراہ 4.45 روپیہ کے ٹکٹ چسپاں کیے جائیں۔ باہری امیدواروں کو چاہیے کہ ہر لحاظ سے مکمل درخواست فارم ۲۵ روپیہ کے کراسڈ پوسٹل آرڈر کے ہمراہ جو فائنانس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو رجسٹریشن اور ایڈمیشن فیس (ناقابل واپسی) کے بطور اس طرح ارسال کریں کہ وہ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۲۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دفتر میں ۵ بجے شام تک اس تاریخ تک پہنچ جائیں جو اس کورس کے مقابل درج ہے۔ جس کورس میں داخلہ مطلوب ہو اس کا نام لفافہ کی پیشانی پر تحریر فرمائیں۔

یونیورسٹی کے داخلی طلبا، ہر لحاظ سے مکمل اپنی درخواستیں مقررہ فیس اور دستاویزات کے ساتھ اپنے متعلقہ پروسٹ آفس میں اس تاریخ سے دو روز قبل جمع کر دیں جو ایڈمیشن آفس میں جمع ہونے کی آخری تاریخ ہے۔

نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں کو قبول نہیں کیا جائے گا اور اس طرح کی درخواستوں کے سلسلہ میں مزید کوئی مراسلت نہیں کی جائے گی۔

این محی الدین
کنٹرولر آف ایگزامینیشن اینڈ ایڈمیشنز

مرتبہ انور حبیب علوی۔ لکھنو

۱۔ آپ روزنامہ قومی آواز لکھنو مورخہ ۲۱ اگست صبح ایڈیشن صفحہ ۴ کو ضرور ملاحظہ کیجیے۔ اس میں پبلک سروس کمیشن اتر پردیش کا متعدد جگہوں کے لیے ایک اشتہار ہے جس میں ۴۸ اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولس کی جگہیں بھی ہیں۔ امیدوار کو ۲۱ سے ۳۵ سال کے درمیان ہونا چاہیے اور گرس گریجویٹ ہونے کے ساتھ ساتھ ایجوکیشن میں کوئی ڈگری یا ڈپلومہ ہونا بھی ضروری ہے۔ متعلقہ دفتر میں پوری طرح مکمل درخواست پہنچنے کی آخری تاریخ ۲۰ ستمبر ۸۲ ہے

۲۔ پبلک سروس کمیشن اتر پردیش، فارسٹ رینجرز کورس ۸۳-۸۴/۸۳-۸۵ کے ۱۹۸۲ کے مقابلہ کا امتحان ماہ نومبر میں مختلف مراکز پر منعقد کر رہا ہے۔ امیدوار کو انٹرمیڈیٹ یا بی ایس سی پاس ہونا چاہیے اور مضامین میں باٹنی، زولوجی، کیمسٹری فزکس یا میتھمٹکس میں سے ۲ یا اس سے زیادہ مضامین ہونا چاہیے جسمانی بناوٹ میں امیدوار کو کم سے کم ۱۶۵ سینٹی میٹر لمبا ہونا چاہیے اور سینہ ۷۹ سینٹی میٹر بغیر پھیلائے ۸۴ سینٹی میٹر پھیلانے پر ہونا چاہیے۔ درخواست کے چربے اور تفصیلات کے لیے روزنامہ قومی آواز لکھنو مورخہ ۱۴ اگست ۸۲ء صفحہ ۴ ضرور ملاحظہ کریں اور درخواست ۸ ستمبر ۸۲ء تک دفتر میں ضرور پہنچ جانا چاہیے۔

۳۔ ٹائمز آف انڈیا، دہلی مورخہ ۲۳ اگست بروز دوشنبہ دیکھیے۔ اس میں انڈین آئل کارپوریشن لمیٹڈ کو درخواستیں مطلوب ہیں۔ آفیسرز ٹرینیز کی جس کے لیے امیدوار کو میکینکل، سول، الیکٹریکل، کیمیکل انجینیرنگ یا پٹرولیم ٹکنالوجی میں فرسٹ کلاس ڈگری ہونا چاہیے یا پھر فرسٹ کلاس ایم بی اے ہونا چاہیے۔ عمر میں امیدوار کو ۲۵ سال سے زائد ہونا چاہیے۔ اخبار میں دیے درخواست کے چربے کے مطابق مکمل درخواستیں ۷ ستمبر ۸۲ تک ضرور ضرور متعلقہ دفتر میں پہنچ جانا چاہیے۔

۴۔ ریزرو بنک آف انڈیا نئی دہلی اور کانپور ڈویژن میں کلرک اور کوائن اگزامنر کی تقریباً ۲۰۰ جگہیں اور ۸۰ ٹائپسٹ کی جگہیں خالی ہیں۔ دفتروں میں درخواست دیے ہوئے چربے کے مطابق ۴ ستمبر تک ضرور پہنچ جانا چاہیے۔ کانپور ڈویژن میں مطلوب درخواستوں کے لیے نادرن انڈیا پتریکا لکھنو مورخہ ۱۹ اگست صفحہ ۴ ضرور ملاحظہ فرمایئے۔ اور نئی دہلی میں مطلوب درخواستوں کے لیے ٹائمز آف انڈیا نئی دہلی مورخہ ۱۶ اگست ۸۲ ضرور ملاحظہ کیجیے۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد نمبر ۱ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۲ء شمارہ نمبر ۱۶

غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنا گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا..... جو حال اُس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا تھا چند روز میں اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے .... یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کے ساتھ مصیبت میں رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑی ہے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا..... میرے غم خوار مجھ کو اس کے مانع آئے تھے اور میرا دل ان سے کہتا تھا ؎

حریفِ کاوشِ مژگانِ خوں ریزم نہ ناصح بدست آور رگِ جانی و نشتر را تماشا کن

سید احمد

(ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریر)

اللہ کے بندوں کے ساتھ رحم کرو اللہ تم پر رحم کرے گا۔ سچ بولو کہ سچ حقیقت ہے اور جھوٹ باطل۔ سیدھے راستے پر چلو۔ ظلم، جہالت، حسد، جھوٹ اور فریب سے گریز کرو۔ غریبوں، یتیموں، مسافروں اور حاجتمندوں کی مدد کرو۔ صرف خدا سے ڈرو۔ جو مانگنا ہے اسی سے مانگو۔ محنت کی کمائی کھاؤ۔ دل غنی رکھو عمل کا ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہوگا۔ جیسا کروگے ویسا بھروگے دنیا اور آخرت دونوں میں۔ بڑوں کا ادب کرو اور چھوٹوں پر شفقت۔ اللہ کے رسول اور آخرت پر ایمان لاؤ، بھلائی کے کام کرو اور لوگوں کو سچائی کی طرف بلاؤ۔ اس زندگی میں جہاں قدم قدم پہ مصیبتیں ہیں، خوف اور لالچ اور ترغیب اور آزمائش ہے، ثابت قدم رہو۔ کوئی خوف تمھیں حق کے راستے سے ہٹا نہ سکے۔ کوئی لالچ تمھیں ورغلا نہ سکے۔ خدا کے سوائے کسی کے سامنے نہ جھکو، دل کو حرص اور حسد سے پاک رکھو۔ علم حاصل کرو عقل سے کام لو، غور و فکر کی عادت ڈالو۔ دنیا نہ خواب ہے نہ خیال، ایک زندہ حقیقت ہے۔ طویل سفر کی ایک منزل ہے، ایک امتحان گاہ ہے۔ انسانیت انسانوں کے ساتھ بھلائی کرنے میں ہے جو لوگ دوسرے مذاہب کے ماننے والے ہیں ان سے بدگمان نہ ہو۔ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۱۶

۱۶ ستمبر ۱۹۸۲ء

مدیر: سید حامد
وائس چانسلر۔ اے ایم یو
مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

قیمت فی پرچہ	ایک روپیہ
ششماہی	۱۱۔ روپے
سالانہ	۲۰۔ روپے

بیرون ہندسے

ایک پرچہ	ایک ڈالر
سالانہ	۱۵۔ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا
مدیر مسئول "تہذیب الاخلاق"
صفدر منزل، تار بنگلہ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

شیخ صاحب کی یاد میں

شیخ محمد عبد اللہ نے ۸ ستمبر کو داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ شیخ صاحب کے انتقال سے ملک میں ایک خلا پیدا ہو گیا جس کو مستقبل میں بہت محسوس کیا جائے گا اور ہر مشکل کے موقع پر وہ یاد آئیں گے۔ اب کوئی باوقار اور جرأت مند رہنما ایسا نہ رہا جو ان کے معاملات پر بے خوف اظہار خیال کرے اور جس کی آواز میں طاقت ہو اور جس کو دنیا سننے کے لیے تیار بھی ہو اور مجبور بھی۔

ہمارے دل میں ترکمان دروازہ دہلی کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ اس علاقہ کے مظلوموں کی آہیں اب بھی فضا میں گونج رہی ہیں۔ یہ شیخ عبد اللہ ہی تھے جن کی للکار نے بلڈوزر کا رُخ پھیر دیا تھا اور دہلی والوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ شیخ صاحب مرحوم کی تمام زندگی ملک، مسلمان اور جموں و کشمیر کے عوام کی خدمت کرنے میں گزری۔ وہ اپنے ملک کے عوام کے حقوق کے تحفظ کے لیے انگریزوں کی حکومت کے دور میں ریاست کے مہاراج کی سرکار سے لڑتے رہے اور آزاد ہندوستان میں جموں و کشمیر کے عوام کی ترقی اور ریاست کے تحفظ میں معروف رہے۔ ما در ہزار مخالفتیں برداشت کیں اور ایک غلط فہمی کی بنا پر جیل

کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔

گو شیخ عبداللہ کی زندگی جموں وکشمیر کے لوگوں کی خدمت کے لیے وقف رہی لیکن مسلمانوں کا جب بھی کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تھا، اس کو حل کرنے میں شیخ صاحب مدد کرتے تھے۔ شیخ صاحب ایک خوش عقیدہ دین دار آدمی تھے لیکن سیاسی مسائل پر سکولر نقطۂ نظر ہی رکھتے تھے۔

شیخ عبداللہ کے رگ وریشہ میں کشمیری خون دوڑتا تھا وہ یہ نہ بھولے تھے کہ ماضی میں جموں وکشمیری عوام کے ساتھ کتنا ظالمانہ سلوک روا رکھا گیا تھا اور ان غریبوں نے برسہا برس کس غربت وافلاس میں زندگی گزاری تھی اور اب بھی گزار رہے ہیں اور ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی ہے۔ وہ یہ محسوس کرتے تھے کہ کشمیر کا مستقبل اسی وقت روشن رہے گا جب وہ ہندوستان جیسے وسیع اور طاقتور ملک کا جزو رہے گا۔

آزاد ہندوستان میں اس کے امکانات بہت تھے کہ ملک کے تاجر اور سرمایہ دار ریاست جموں وکشمیر کی طرف متوجہ ہوں، وہاں کارخانے قائم کریں اور تجارت کریں۔ ایسا ہوتا تو ملک کے سرمایہ دار نو اور دولت مند ہو جاتے، غریب اور پسماندہ جموں اور کشمیر سے غربت وافلاس کا دور ختم نہ ہوتا۔ اسی بنا پر شیخ صاحب نے وہ تمام اقدامات کیے جو ریاست کی ترقی میں معاون ہوں اور ان تجاویز کی مخالفت کی جو جموں وکشمیر کے لوگوں کی فلاح وبہبود کی رفتار میں رکاوٹ پیدا کریں۔ جموں وکشمیر کی ہندوستان میں ایک مخصوص حیثیت، ریاست کی سیاسی تنظیم نیشنل کانفرنس کو باقی رکھنے پر اصرار اور بہت سی پابندیاں جو جموں اور کشمیر کی حکومت نے لگائیں، اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ جموں و کشمیر کے لوگ خود اس قابل ہو جائیں کہ اپنے کارخانے کھولیں، خود تجارت کریں اور ریاست کی قدرتی ومعدنی دولت سے خود استفادہ کرنے کے قابل ہو جائیں اور ملک میں فرقہ وارانہ فضا نہ رہے۔ تب کہیں وقت آئے گا کہ ہندوستان میں وہ اپنی مخصوص حیثیت ترک کریں، اس سے پہلے نہیں۔

شیخ صاحب رہائی پاکر دہلی میں ایوانِ غالب کے قریب مقیم رہے۔ اس دور میں انھوں نے مسلم رہنماؤں سے گفتگو کی اور مسلمانانِ ہند کی فلاح وبہبود کے مسئلہ پر ان سے تبادلۂ خیال کیا۔ یوسف صدیقی صاحب مرحوم جو انگریزی کے ریڈینس ہفت روزہ کے ڈائرکٹر، ایڈیٹر اور بڑے سرگرم ملی کارکن تھے۔ انھوں نے مسلم مجلس مشاورت کا جلسہ بلانے کے لیے دہلی کے کارکنوں کو شیخ صاحب کی کوٹھی پر مدعو کیا۔ شیخ صاحب نے حاضرین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بڑے افسوس اور شرم کی بات ہے کہ ملک میں مسلمان خاصی بڑی تعداد میں ہیں ان کا ایک شاندار ماضی رہا ہے، ان کی عظیم تہذیب رہی ہے ان کی کافی بڑی تعداد

اِس ملک میں آباد ہے ہر اعتبار سے وہ ملک میں ایک حیثیت رکھتے ہیں لیکن اُن کا کوئی ایسا مرکز نہیں جہاں سے ان کے مسائل کے بارے میں، ان کی تاریخ کے بارے میں اور تہذیب و تمدن کے کے بارے میں اگر کوئی معلومات حاصل کرنا چاہے تو حاصل کرسکے۔ اس مرکز کی ایک وسیع عمارت ہو، وہاں ایک لائبریری ہو۔ مہمانوں کے لیے ایک مہمان خانہ ہو۔ طلباء کے لیے ایک ہوسٹل ہو، وسیع ہال جلسوں کے لیے ہو۔ اور ایک دفتر ہو جہاں سے مسلمانوں کے بارے میں ہر قسم کی معلومات حاصل ہوسکے۔ شیخ صاحب مرحوم نے مختصر تقریر میں اُس اِسلامی مرکز کی تفصیلات پر روشنی ڈالی۔ شیخ صاحب کی تقریر نے سب کو متاثر کیا۔ شیخ صاحب نے حاضرین کو اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ شیخ صاحب! یہ اسکیم تو بہت اچھی ہے لیکن اس کو عملی جامہ کون پہنائے گا؟ آپ خود اِس کام کو ہاتھ میں لیجیے، دہلی میں قیام کیجیے اور مسلمانانِ ہند کی رہنمائی کیجیے۔"

شیخ صاحب نے فرمایا کہ "جو کام میرے ذمہ ڈالا جائے گا وہ ضرور کروں گا لیکن اِس کام کو عملی شکل آپ لوگ دیجیے۔" شیخ صاحب نے مسلمانوں کی تعلیم اور مالی پسماندگی پر بھی اظہارِ خیال کیا اور چند نام اس سلسلہ میں بھی لیے گئے۔ چند روز بعد مسلم مجلس مشاورت کا اجتماع شیخ صاحب مرحوم کی صدارت میں بچوں کے گھر میں ہوا۔ تقاریر ہوئیں، تجاویز پاس ہوئیں، کمیٹیاں بنیں اور وہی ہوا جو مسلمانوں کی دوسری تحریکات کے سلسلہ میں ہوتا رہا ہے۔ شیخ صاحب مرحوم کشمیر چلے گئے اور وہاں کشمیر کے مسائل میں منہمک ہوگئے۔ انھوں نے چند بار کوشش ضرور کی کہ یہ کمیٹیاں اپنا کام شروع کریں اور اسلامی مرکز کے قیام کے لیے فضا پیدا کی جائے لیکن وہاں کون سرگرم تھا کہ جو اسلامی مرکز کے قیام کے خواب کو عملی جامہ پہناتا؟"

خادم معزالدین احمد

رسالہ تہذیب الاخلاق ایک اصلاحی پرچہ ہے۔ اس میں افسانے، نظم، غزل، تنقید اور تحقیقی مضامین ہم شائع نہیں کرتے۔ صرف ایسے مضامین شائع کرتے ہیں جو سبق آموز ہوں جو مضامین افسانے معلوم ہوتے ہیں وہ ایسی آپ بیتی یا جگ بیتی ہوتے ہیں جن کے مطالعہ سے سبق حاصل ہو۔

صنعت کی اہمیت

اب تک کسی نے بھی سنجیدگی سے توجہ نہیں دی ہے کہ امتحانات پاس کرنے کے بعد کالج ایک اوسط ہندوستانی کو دنیا کے حالات کے مطابق ڈھالنے میں کس حد تک مدد کر سکتے ہیں۔ آزادی کے ۲۵ سال بعد بھی ملازمت کا شوق برابر جاری ہے اور حکّام اور ماہرین تعلیم کے لیے یہ مسئلہ انتہائی پیچیدہ ہو گیا ہے کہ وہ موجودہ نظام میں ایک نئی جان ڈالیں۔

ہمارے ملک میں والدین اور اُن کے بچے یہ سمجھتے ہیں کہ کالج کی تعلیم باحیثیت ہونے کی ایک علامت بن گئی ہے جن طلباء کو داخلہ نہیں مل پاتا سماجی اور تعلیمی حلقوں میں وہ خود کو الگ تھلگ سا محسوس کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹری، انجینیرنگ اور قانون وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم پر کافی خرچ آتا ہے اور زندگی میں کافی عرصہ بعد اس کے نتائج سامنے آتے ہیں ہائر سکنڈری پاس کرنے کے بعد جب ایک طالب علم کو کالج میں داخلہ نہیں ملتا ہے تو وہ پریشانی کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ ڈگری کے بغیر اپنی زندگی کیسے گزارے اور مستقبل کا کیسے سامنا کرے۔

گزشتہ ۳۰ برسوں میں کثیر تعداد میں سائنسی اور تکنیکی ادارے اور تربیتی مرکز قائم کیے گئے ہیں لیکن پیشہ وارانہ مطالعات کے لیے مواقع کی فراہمی کے سلسلے میں کافی تبدیلیاں آگئی ہیں اس وقت ایسے بہت سے ادارے ہیں جنھیں حکومت اور نجی تنظیمیں چلاتی ہیں جن میں مختلف پیشوں کی تربیت دی جاتی ہے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد کورس کا انتخاب کرنے میں کافی تبدیلی آگئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی تکنیکی مہارت رکھنے والا ہنرمند شخص ملازمت پیشہ افراد سے کہیں زیادہ کماتا ہے والدین اور ان کے بچے رفتہ رفتہ یہ بات سمجھتے جا رہے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جب یہ بہتر معیارِ زندگی بھی فراہم کرے۔

- بجلی کی پیداوار میں اضافہ کا ۱۵ سالہ جامع پروگرام شروع کیا گیا ہے جس پر ۱۹۹۵ء تک عمل درآمد ہوگا۔ جس کے نتیجے میں ملک بھر میں صنعتی ادارے اور استطاعیہ سے متعلق عمارتیں تعمیر کی جائیں گی ان سب کے لیے ایرکنڈیشننگ کی بھی ضرورت ہوگی اور یہ ایسا پیشہ ہے جسے طالب علم جھجکے بغیر منتخب کر سکتے ہیں
- ریفریجیشن بھی اس سے ملتی جلتی لائن ہے جس کا مستقبل روشن ہے موجودہ حکومت اندرون ملک کی ضروریات پوری کرنے اور برآمدی منڈیوں کے لیے بھی گوشت، سمندری مصنوعات سبزیوں اور پھلوں کو محفوظ رکھنے کو بے حد اہمیت دے رہی ہے اس کے علاوہ ملک بھر میں کولڈ اسٹورج بھی تعمیر کیے جا رہے ہیں جہاں اشیاء محفوظ رکھی جا سکتی ہیں اس لیے ریفریجیشن کے تربیت یافتہ ماہرین کی کافی مانگ ہے۔ تنخواہ بھی ہزاروں میں ملتی ہے اس طرح کے تربیت یافتہ افراد کی مانگ مسلسل بڑھ رہی ہے مستقبلِ قریب میں یہ مانگ اور بڑھے گی۔ روزگار کے مواقع میں بھی لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ کیوں کہ تمام عمارتیں فیکٹریاں دفاتر اور گھروں کو مکمل طور پر ایرکنڈیشنڈ بنایا جا رہا ہے

گوداموں میں کولڈ اسٹوریج ہوتے ہیں تاکہ جلد خراب ہونے والی اشیا کو محفوظ کیا جاسکے۔

• ملک میں بہت جلد رنگین ٹی وی شروع ہونے والا ہے اور حکومت اس سلسلہ میں متعدد کارخانہ داروں کو مکمل سیٹ تیار کرنے، کل پرزے درآمد کرنے اور ان پرزوں کو جوڑ کر رنگین ٹی وی سیٹ بنانے کے لیے لائسنس جاری کرچکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس شعبہ میں روزگار کے مواقع حاصل کرنے کی کافی گنجائش ہے۔ خصوصاً ان سیٹوں کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہوگی۔

• ویڈیو بھی سندھ میں بے حد مقبول ہو رہے ہیں، سرِدست ملک میں ایک لاکھ ویڈیو ٹیپ ریکارڈر ہیں اور آبکاری محصول میں کمی اور فراخدلانہ درآمدی پالیسی کی وجہ سے ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ویڈیو کھیل بھی ملک میں تیزی سے مقبول ہو رہے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب یہ ملک کے گوشے گوشے میں پھیل چکے ہوں گے۔

جدید اسپتالوں کی سہولتوں میں اضافے سے ان لوگوں کے لیے بھی کافی مواقع پیدا ہوگئے ہیں جو طبی پیشے میں تربیت حاصل کر رہے ہیں، یعنی لیبارٹری اسسٹنٹ، لیبارٹری ٹیکنیشین اور کیمسٹوں وغیرہ کی بڑے پیمانے پر مانگ ہے۔ سند یافتہ افراد کو سماج میں اچھا مقام حاصل ہوتا ہے اور انھیں اچھی تنخواہیں بھی ملتی ہیں۔ تربیت یافتہ پیشے میں تربیت یافتہ افراد کو خود اپنا پیشہ اور روزگار چلانے کے لیے مالی ادارے آسان شرائط پر قرضے بھی دیتے ہیں۔

• کاروباری لین دین میں کمپیوٹروں کا استعمال بھی عام ہوتا جا رہا ہے۔ شہری علاقوں میں ایسے متعدد ادارے ہیں جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کو کمپیوٹر ٹکنالوجی کی تربیت دی جاتی ہے۔ اس شعبہ میں تربیت یافتہ افراد کی کافی کمی ہے اور جو لوگ تربیت حاصل کرچکے ہیں ان کے لیے مستقبل میں خا(طر خواہ) امکانات ہیں۔

• جدید ٹیلی فون مواصلات جن میں الیکٹرانک ٹیکنک کا استعمال ہوتا ہے اور الیکٹرانک آلات کے شعبے میں بھی روزگار کے بہت مواقع ہیں۔ ٹیلی پرنٹر، ٹیلکس اور فوٹو ٹرانسمیشن وغیرہ کے لیے تربیت یافتہ افراد کی ضرورت ہے اور تربیت بھی بہ آسانی حاصل کی جاسکتی ہے۔ فوٹو کاپی کا کام بھی بہت مقبول ہے جس کے لیے آسانی سے تربیت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں خود اپنا روزگار شروع کرنے والوں کو مالی امداد دی جا رہی ہے

• میڈیم بینڈ تک ریڈیو سیٹ لائسنس فیس سے مستثنیٰ ہیں۔ معمولی تربیت سے کوئی شخص بھی پرزے جوڑ کر ریڈیو سیٹ بنانا سیکھ سکتا ہے اور ایک یا دو بینڈ والے ریڈیو سیٹ بنا کر فروخت کرسکتا ہے۔ ان سیٹوں کی تیاری کے لیے تمام حصے اور پرزے آسانی سے مل جاتے ہیں اور یہ کم قیمت بھی ہیں۔ اس کاروبار میں منافع کی بھی زیادہ گنجائش ہے۔ معمولی رقم سے یہ کاروبار شروع کیا جاسکتا ہے اور بینک سے امداد لے کر اسے بڑھایا جاسکتا ہے۔ بینک بے روزگار اور سماج کے کمزور طبقوں کو آسان شرطوں پر قرضے دے رہے ہیں۔

ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے مذکورہ بالا کام مشکل ہوں وہ لوگ ویلڈنگ، کارپینٹری، چمڑے کی مصنوعات، کتابوں کی جلد سازی، درزی کا کام اور اس طرح دوسرے کاموں کی تربیت حاصل کرسکتے ہیں جس سے آرام دہ زندگی کے لیے کافی آمدنی ہوسکتی ہے۔ مناسب روزگار مل سکتا ہے۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو ہم بڑے پیمانے پر بے روزگاری کی شکایت کرتے ہیں اور دوسری طرف ہمیں تربیت یافتہ افراد کی قلت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس لیے مستقبل کے لیے منصوبہ سازی کرتے وقت

باقی صفحہ نمبر ۷ پر

پروفیسر محمد انس
شعبہ جغرافیہ
اے ایم یو

رودادِ چمن

ہندوستان و پاکستان کے تمام شعبہ جات جغرافیہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ جغرافیہ سب سے قدیم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برّاعظم صغیر کی جغرافیہ دانوں کی پہلی نسل کے بیشتر افراد اسی شعبہ کی پیداوار ہیں۔ اپنے ابتدائی دور میں یہ شعبہ اور اس کا معیارِ درس و تدریس ہندو پاکستان کی دوسری یونیورسٹیوں کے لیے مشعلِ ہدایت رہا ہے اور اِس حد تک کہ ۱۹۳۵ء میں پروفیسر ایل، ڈی اسٹیمپ جب یہاں تشریف لائے تو انھوں نے اپنے خطبے میں اِس شعبے کو "ہندوستان کے جغرافیہ دانوں کا مکہ" کہا تھا۔ اسے یہ فضیلت بڑی حد تک، اب بھی حاصل ہے

اس شعبہ نے جغرافیہ کی بہت سی شاخوں کو گل افشاں کیا ہے۔ گزشتہ پچیس تیس برسوں میں زرعی جغرافیہ یہاں کا خاص میدان رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ، بلدی جغرافیہ، آبادیاتی جغرافیہ، سیاسی جغرافیہ اور انسانیاتی جغرافیہ میں بھی بہت کچھ کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔

اس شعبہ کی اہمیت اور اس کی کارگزاری کے پیشِ نظر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اسے "مرکزِ اعانتِ خصوصی" کا درجہ دیا ہے اور اس کی استواری اور توسیع کے لیے تقریباً بیس لاکھ روپیوں کی خصوصی رقم فراہم کی ہے۔ علاوہ ازیں چند سال پہلے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ا[س] شعبہ کو ایک ایسا پروجیکٹ کے لیے دو لاکھ روپیوں ک[ی] گرانٹ دی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اتر پردیش میں زر[عی] بارآوری کی پیمائش کا کوئی موزوں طریقہ طے کر کے بہت زیا[دہ،] زیادہ، درمیانی اور کم بارآور علاقوں کی شناخت کی جا[ئے] اور ان کی تقسیم کی جائے۔ اِس سلسلہ میں پیمائش کے مختل[ف] طریقوں کی افادیت کا جائزہ لینے کے بعد ایک خاص طریقہ متع[ین] کیا گیا اور چند اہم تغیر پذیر عناصر اور ان کی باہمی فعال[یت] کی بنا پر مجموعی لحاظ سے اتر پردیش کی اور پھر اس کے مختلف ضلعوں کی زرعی بارآوری کی تحقیق کی گئی۔ اِس سے جو نتائج برآمد ہوئے ہیں، ان کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ زرعی بارآوری میں اضافہ لانے کے لیے مختلف عوامل کو کتنا گھٹایا یا بڑھایا جا سکتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ پتہ چلا کہ اگر دوسرے عوامل کو برقرار رکھا جائے تو نہروں سے آبپاشی میں ایک فی صد اضافہ کرنے سے ایس، این، یو (اسٹنڈرڈ نٹریشنل یونٹ) یعنی تغذیہ کی معیاری اکائی جو ہندوستان کے لیے فی کس آٹھ لاکھ کیلوری سالانہ کے برابر مانی جاتی ہے ۱۶ء۰ بڑھ سکتا ہے۔ اسی طور پر یہ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اگر کم بارآو[ر]

علاقوں میں آبپاشی بذریعہ نہر، آبپاشی بذریعہ وسائل دیگر
اور کھاد کے استعمال میں ایک ایک فی صد اضافہ کیا جائے۔
اور زرعی مزدوروں کی تعداد ایک فیصد گھٹا دی جائے تو
ایس' این' یو ۳۱۵ء ۷۹ کا اضافہ ہوسکتا ہے یعنی دوسرے
الفاظ میں اسی ہزار مزید آبادی کی کفالت ہوسکتی ہے۔ اسی
طرح کے تخمینے دوسرے علاقوں کے بارے میں بھی لگائے گئے
ہیں۔ یہ رپورٹ جلد ہی شعبۂ جغرافیہ سے شائع کی جائے گی۔

ان دنوں شعبہ نے ایک بین الاقوامی
سیمینار کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ یہ سیمینار مارچ/اپریل
۱۹۸۳ء میں منعقد ہوگا۔ اور اس کا عنوان ہوگا "ترقی پذیر
ممالک خصوصاً ہندوستان میں غذائی نظام"۔ پروفیسر
محمد شفیع جو "بین الاقوامی کمیشن برعالمی غذائی نظام" کے
چیرمین ہیں اس سلسلہ میں ہندوستانی اور بیرونی جغرافیہ
دانوں کی شمولیت کے لیے خط وکتابت کر رہے ہیں۔ اس
سیمینار کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ نیشنل اکیڈمی
آف سائنسز اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے
مالی امداد منظور ہوچکی ہے۔ یقین ہے کہ یہ سیمینار بہت
کامیاب اور بہت مفید ثابت ہوگا۔

شعبۂ جغرافیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،
نے ماضی میں بہت سے نامور جغرافیہ داں اور محقق پیدا
کیے ہیں اور مستقبل کے بارے بھی یقین ہے کہ ؎
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

بقیہ مضمون "صہیونی، فلسطین اور عرب"

ارتقاء نوری السعید سے شروع ہوکر عبدالکریم قاسم اور
عبدالسلام عارف سے ہوتا ہوا حسن البکر اور صدام حسین
تک پہنچا۔ مصری حکمرانوں کا زوال ناصر سے سادات کی طرف
ہوا اور حسنی مبارک نے ابھی میدان میں قدم رکھا ہے۔ د
وہ کیا کرتے ہیں۔ ملک حسین اپنی جگہ پر قائم ہیں لیکن ب
پیچھے ہیں۔ شام کی فرقہ وارانہ بعث پارٹی کے پردے کے
پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ لبنان کو اب اسرائیل نے زنجیر
پہنا دی ہیں۔ شمالی اور جنوبی یمن کے انقلابات مزید انقلا
کے ڈر سے لرزاں ہیں۔ تیل والے ملکوں کی رفتار ترقی
بہت سست ہے اور اپنے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔
ایسا لگتا ہے کہ یہ ممالک خانہ بدوشی اور چراگاہی کے پیشے
سے سیدھے تجارت کی طرف لپک کر آگئے ہیں۔ کویت، ابو
ذبی، مسقط، دوحہ اور جدہ صرف بازار ہیں جہاں باہ
سامان بکتا ہے اور باقی سب ضمنی ہیں۔ زراعت، صنعت
اور خاص طور پر علوم وفنون اور سائنس اور ٹکنالوجی کے
لیے لوگوں کو فرصت نہیں ہے۔ آسانی اور تیزی سے
حاصل ہونے والی دولت ہی ان کے لیے سب کچھ ہے
عرب ملکوں کے وسائل محدود ہیں
دشمنوں کی تعداد، طاقت اور عزائم بڑھ رہے ہیں او
عرب ملکوں کے دانشوروں میں اور حکمرانوں میں
ان خطرات، اپنی پسماندگی اور وقت کی تنگی کے تناسب
سے احساس کی کمی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ لبنان پر اسرائیل
کے حالیہ حملے اور اس کے دوررس نتائج سے ان
کے اندر احساس اور عمل کی تیزی پیدا ہوجائے۔

بقیہ مضمون "صنعت کی اہمیت" صفحہ ۵

ہمیں اس طرف خاص طور پر توجہ دینا چاہیے تاکہ ہم
آئندہ پیش آنے والی ضروریات کے مطابق خود کو اس
قابل بنا سکیں کہ کسی قلت کا سامنا نہ کرنا پڑے

بشکریہ "قومی آواز" لکھنؤ"

محمد یونس قاضی
دہلی۔

لیڈی کریم حیدر

۱۹۳۶-۳۷ء کا تعلیمی سال تھا۔ خبر آئی کہ ڈاکٹر ایل کے حیدر ممبر فیڈرل پبلک سروس کمیشن اپنا ٹرم پورا کرکے واپس آرہے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ وہ "بہت بددماغ" ہیں اور کالے آدمی کو کم ہی لفٹ دیتے ہیں۔ شعبۂ معاشیات کے طلباء کو پریشانی ہوئی اس لیے اور بھی کہ علی گڑھ کی روایات شفیق استاد کی تھیں۔

مگر جب ڈاکٹر حیدر کو ہم طلباء نے برتا تو حقیقت بالکل برعکس نکلی۔ اپنے چھوٹوں سے بالخصوص وہ بہت اخلاق سے پیش آتے۔ ایم۔ اے کے طلباء کو سال میں دو بار کھانے پر بلاتے اور کسی کی پلیٹ خالی نہ رہنے دیتے۔ کھانے کے بعد پھلوں کا دور رہتا۔ کھانے کے بعد گپ شپ کے دوران جی کڑا کرکے میں نے ایک مرتبہ پوچھ ہی ڈالا: "آپ کے آنے سے پہلے طرح طرح کی افواہیں آپ کے متعلق سنی تھیں جو غلط ثابت ہوئیں۔ لوگ آپ سے کیوں ناراض ہیں؟"

ڈاکٹر حیدر پہلے تو خوب ہنسے اور پوچھنے لگے کہ لوگوں نے ان کے متعلق کیا افواہیں مشہور کیں۔ مگر پھر ایک دم سنجیدہ ہوگئے "مجھ سے تو لوگ اس لیے خفا ہیں کہ میں نے کسی کی سفارش نہیں مانی۔ انھیں غلط فہمی ہوئی کہ میں مغرور ہوگیا۔ انھیں کیا معلوم کہ میں نے صرف انھیں کی نہیں بڑے بڑے لوگوں کی بھی سفارش نہیں مانی

تم لوگ بھی جب کرسی پر بیٹھو، اپنے پرائے کی تفریق بھول جانا اور انصاف کرنا!"

ایک بار ڈاکٹر حیدر کے کمیشن کے ساتھی (مسٹر بارڈی) ان سے ملنے علی گڑھ آئے۔ وہ ریٹائر ہوکر اپنے وطن (انگلستان) واپس جارہے تھے۔ ان کے اعزاز میں ڈاکٹر حیدر نے عصرانہ دیا۔ یکایک اور بالکل خلاف توقع مسٹر بارڈی نے کھڑے ہوکر با آواز بلند کہا "مجھے اپنے کچھ گناہوں کا اعتراف کرنا ہے۔ آپ کے ڈاکٹر حیدر نے غیر جانب داری اور دیانت کی وہ اعلیٰ روایات چھوڑیں کہ مجھے انکا برقرار رکھنا مشکل ہوگیا"

کریدنے پر ایک نہایت دلچسپ واقعہ کا انکشاف ہوا۔ ڈاکٹر حیدر کے لارڈ لنلتھگو Lord Linlithgow سے دوستانہ مراسم تھے۔ دونوں نے کئی سال زراعتی کمیشن میں کام کیا تھا۔ جب لنلتھگو وائسرائے ہوکر ہندوستان آئے تو وائسرائیگل لاج میں ڈاکٹر حیدر کا اکثر جانا ہوتا۔ ایک مرتبہ لیڈی لنلتھگو نے کسی امیدوار کی درخواست ڈاکٹر حیدر کو اپنے نجی خط کے ساتھ بھجوائی سفارش تو نہیں کی مگر مطلب صاف ظاہر تھا۔ ڈاکٹر حیدر نے اس امیدوار کو امتحان میں شریک نہیں ہونے دیا۔

۳۹ء میں میرا تقرر بحیثیت لیکچرر شعبہ معاشیات ہوا۔ جب میں چارج لینے شعبہ پہونچا تو ڈاکٹر

حیدر مجھے اپنے کمرہ میں لے گئے اور بولے: تمہارے متعلق بڑی شکایات آرہی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ تم مسلمان نہیں ہو، کوئی کہتا ہے کہ تم خفیہ سیاسی پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہو۔ جوابات میں نے تمہارے شاکیوں سے کہی، وہی تم سے کہتا ہوں۔ مجھے تمہارے کام سے سروکار ہے، تمہارے ذاتی عقائد اور سیاسیات سے نہیں۔ اگر تمہارا کام ٹھیک ہوگا تو میں راضی، میرا اللہ راضی۔ ہم تم میں آج یہ معاہدہ ہوگیا۔ آؤ ہاتھ ملاؤ۔" یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر حیدر اپنی بات پر قائم رہے۔

یہ بات انگریزی دور کی ہے

اس زمانہ میں بنیادی انسانی حقوق" اور "علمی آزادی" کا کوئی چرچہ نہ تھا۔ نہ ڈاکٹر حیدر کسی سیاسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ البتہ ان میں شہری شعور تھا۔ اِس لیے وہ دوسروں کے لیے بھی وہی روا رکھتے تھے جو اپنے لیے ان کی آزادیِ رائے" آج کل کے نام نہاد دانشوروں کی "علمی آزادی" سے بالکل مختلف تھی۔ ان کی "آزادی رائے" دیانت، دوسروں کا پاس اور درس گاہ کی خیر خواہی پر مبنی تھی۔

ڈاکٹر حیدر کے ساتھ میں نے

تقریباً چھ سال کام کیا۔ تعلقات نہایت خوش گوار اور قریبی رہے مگر جو فصل کہ ایک بزرگ اور اس کے چھوٹوں میں رہنا چاہیے وہ ہمیشہ قائم رہا۔ میں بن بلائے ان کے یہاں کبھی نہیں گیا۔ نہ ہی وہ مجھ سے اس کی توقع کرتے تھے۔ وہ اِس بات پر فخر کیا کرتے تھے کہ ڈپارٹمنٹ کے لوگوں سے ان کے تعلقات "نہایت دوستانہ مگر نہایت صحیح" ہیں۔ حقیقی قربت برسوں بعد مجھے لندن میں حاصل ہوئی جہاں ان کی زندگی کے آخری سال گزرے

اپنی بیماری فالج کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے کے لائق نہیں رہے تھے اور انھیں اس کا بڑا غم تھا کہ وہ علی گڑھ نہ جا پائیں گے۔ علی گڑھ کی یاد انھیں بہت ستاتی تھی ایک بار جب ڈاکٹر ذاکر حسین اُن سے ملنے گئے تو وہ بار بار علی گڑھ کا نام لیتے اور بے اختیار روتے۔ ذاکر صاحب سے اُن کی کوئی گفتگو ہی نہ ہوسکی۔

ڈاکٹر حیدر کو ایک نہایت ہی نیک، باوفا اور سمجھ دار رفیقۂ حیات ملی تھیں۔ وہ کس قدر اپنے شوہر کا خیال رکھتی تھیں اس کا اندازہ اِس واقعہ سے لگائیے۔

جب لندن میں پہلی بار ڈاکٹر حیدر سے ملنے گیا تو دروازہ کھولتے ہی مسز حیدر کے منہ سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے:

"کئی برسوں سے انھوں نے اپنی زبان نہیں سنی ہے تم اُن سے اردو ہی میں بات کرنا!" اندر پہونچا تو ڈاکٹر حیدر کی سراپا حالت کو دیکھ کر بالکل بھول گیا کہ وہ بیمار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی تقریب میں جانے والے ہیں۔ میں تقریباً ہر ہفتہ ہی اُن کے یہاں جاتا اور ہفتہ کی رات اور اتوار کا پورا دن ان کے یہاں گزارتا۔ صبح جب چہل قدمی کرکے واپس آتا تو ڈاکٹر حیدر کو نہائے دھوئے اور ایک نئے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس ناشتہ کی میز پر ہوتے تھے۔

پروفیسر محمد اقبال انصاری
صدر شعبۂ اسلامیات
اے ایم یو۔

شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ

(۲)

دہلی واپس آکر شیخ محدّثؒ نے اپنے آبائی مکان میں سکونت اختیار کی جو دہلی دروازے سے آگے، باغ مہدیاں کے قریب چھ بیگہ سے زائد رقبہ پر واقع تھا۔ مکان سے متصل ایک خانقاہ اور مسجد بھی تھی۔ شیخ محدث زیادہ وقت اسی خانقاہ میں عبادت و ریاضت میں گزارتے۔ خود ہی اس کی جاروب کشی کرتے، وہاں چراغ جلاتے اور طالبانِ رشد و ہدایت کی رہنمائی و دستگیری فرماتے۔ شیخ محدث کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا جو اس وقت کی اہم و نایاب ترین کتابوں پر مشتمل تھا جس کی وسعت کا اندازہ شیخ محدث کی ان گراں قدر تصانیف سے ہوتا ہے جو انھوں نے وہاں بیٹھ کر تصنیف و تالیف فرمائیں اور جو آج بھی بطور کتب حوالہ استعمال ہوتی ہیں۔ ریاضت و عبادت کے علاوہ شیخ کا دوسرا اہم مشغلہ مطالعہ، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف تھا جس میں بقیہ ساری عمر گزار دی اور بالآخر ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ (۱۹ جون ۱۶۴۲ء) میں وفات پائی۔ وصیت کے مطابق آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ نور الحق نے نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کے جسد خاکی کو حوض شمسی کے کنارہ سپردِ خاک کر دیا گیا۔ جہاں وہ اب بھی مرجع خلائق بنا ہوا ہے اور ورثا سالانہ عرس کا اہتمام کرتے ہیں۔

شیخ محدثؒ کے تین فرزند تھے جن میں سب سے بڑے شیخ نور الحق تھے جو ۹۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ شیخ ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور اسی لیے اپنے ہی آغوش میں ان کی تعلیم و تربیت کی اور بہت جلد علوم عقلیہ و نقلیہ میں فارغ التحصیل کر دیا۔ ان کی غیر معمولی قابلیت و استعداد کی بنا پر شاہجہاں نے تخت نشین ہونے کے بعد اکبرآباد کی قضا کا عہدہ باصرار ان کے سپرد کیا جسے انھوں نے بحسن و خوبی انجام دیا مگر شیخ محدث کی وفات کے بعد وہ منصب شاہی سے وابستہ نہ رہ سکے اور باپ کی مسند وعظ و ارشاد کو سنبھال لیا۔

اگرچہ شیخ نور الحق بھی ایک کامیاب مصنف تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر اپنی تصانیف چھوڑی ہیں جن کی تعداد بارہ تک پہنچتی ہے اور جو تفسیر، فقہ، منطق، علم کلام اور تاریخ وغیرہ پر ہیں مگر جس کتاب نے آپ کو شہرتِ دوام بخشی وہ حدیث کی مشہور کتاب بخاری شریف کی فارسی شرح "تیسیر القاری" ہے جو چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور سب سے پہلے ۱۲۹۸ھ میں مطبع علوی لکھنؤ میں چھپی تھی۔

آپ کا انتقال ۹ شوال ۱۰۷۳ھ کو دہلی ہی میں ہوا اور والد کے احاطہ مزار میں سپرد خاک ہوئے

دوسرے لڑکے شیخ علی محمد بھی بڑے عالم اور بزرگ تھے مگر آپ کی صرف تین تصانیف کا ذکر ملتا ہے جو کہ نایاب ہیں۔ تیسرے صاحبزادے محمد ہاشم تھے جن کی حدیث سے خصوصی دلچسپی کا ذکر تو کتابوں میں ملتا ہے مگر خود ان کی کسی تصنیف کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ البتہ شیخ نورالحق کی اولاد نے کافی عرصہ تک سلسلۂ تصنیف و تالیف جاری رکھا اور مختلف موضوعات پر گراں قدر اضافہ کیا۔

شیخ محدث نے جس وقت ہوش سنبھالا اس وقت علماء ہند کی توجہ زیادہ تر منطق، فلسفہ اور علم کلام پر مرکوز تھی۔ اس لیے آپؒ نے قرآن و حدیث کی طرف خصوصی توجہ فرمائی اور علوم دینی کے احیاء کی امکانی جدوجہد کی۔ چنانچہ آپ نے اور آپ کے خاندان والوں نے نہ صرف صحیحین کی شروح لکھیں بلکہ حدیث کی دیگر کتب کی بھی عربی و فارسی میں شروح لکھیں اور اصولِ حدیث میں بھی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ اور اس طرح علم حدیث میں وہ روایات قائم کیں جن پر شاہ ولی اللہؒ اور دیگر محدثین نے پوری طرح عمل کر کے ان علوم کو فروغ دیا اور ان ہی کی بدولت یہ سلسلہ آج بھی قائم ہے۔

شیخ محدثؒ کی تصانیف کی تعداد

بیشتر مصنفین نے سَو سے متجاوز بتلائی ہے لیکن یہ زیادہ درست معلوم نہیں ہوتی اور غالباً ان میں متعدد رسائل کو بھی شمار کر لیا گیا ہے جو درحقیقت ایک ہی کتاب شمار ہونا چاہیے تھی۔ مثلاً ایک کتاب "المکاتیب والرسائل" جو ۶۸ رسائل پر مشتمل ہے۔ چنانچہ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تحقیق و جستجو کے بعد شیخ محدثؒ کی تصانیف کی تعداد ۶۰ بتلائی ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے ان میں تین[۳] فارسی، انیس[۱۹] عربی اور گیارہ عربی و فارسی دونوں میں ہیں جن میں سولہ مطبوعہ ہیں۔ بیالیس[۴۲] غیر مطبوعہ اور دو نایاب ہیں۔ سات کتابوں کے اردو اور ایک کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور "اخبار الاخیار" کے تو اردو ہی میں کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔

میں اس وقت آپ کی چند اہم کتابوں کے مختصر تعارف پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ اشعۃ اللمعات: احادیث کے مجموعوں میں مشکوٰۃ المصابیح کو جو خاص اہمیت حاصل ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اس میں نہ صرف صحاح کی احادیث کو یکجا کر دیا گیا ہے بلکہ سلسلۂ اسناد حذف کر کے اور صرف اصل راوی کے نام پر اکتفا کر کے عبارت کو بھی مختصر کر دیا گیا ہے اس لیے ابتدا ہی سے یہ مدارسِ عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیش نظر شیخ محدث نے مکہ مکرمہ جا کر شیخ عبدالوہاب متقیؒ سے اسے درساً پڑھا اور اجازت حاصل کی جیسا کہ اوپر تذکرہ آچکا ہے۔ شیخ نے چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد ۱۶۱۶ء میں اس کی فارسی شرح مکمل کی جو چار جلدوں پر مشتمل ہے اور پہلی جلد کے شروع میں ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے یہ متعدد بار چھپ کر قبول عام حاصل کر چکی ہے۔

۲۔ لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح: یہ د[۲۱]
جلدوں میں مشکوٰۃ شریف کی عربی شرح ہے۔ اس میں احادیث کی نحوی و لغوی مشکلات کو حل کیا گیا ہے اور فقہ حنفی سے احادیث کی تطبیق کی گئی ہے۔ یہ کتاب تو غالباً ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ البتہ اس کا مقدمہ مشکوٰۃ المصابیح کے ساتھ اس کی افادیت کے پیش نظر شائع ہوتا رہا ہے۔

۳۔ ان دو کتابوں کے علاوہ بھی شیخ محدثؒ کی فنِ حدیث پر گیارہ دیگر کتب موجود ہیں جن میں ایک عربی کتاب ما ثبت بالسنۃ فی ایام السنۃ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں حدیث کی رو سے سال بھر کے مذہبی مراسم و مناسک کا ذکر ہے۔ یہ کتاب شائع ہو چکی ہے اور دیگر [illegible] ترجمہ [illegible] ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں۔

۴۔ "تکمیل الایمان و تقویۃ الایقان": شیخ محدث کا فارسی میں یہ مختصر رسالہ اپنی جامعیت اور صاف و سلیس زبان کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور اسی وجہ سے اسے بہت جلد قبولیتِ عامہ حاصل ہو گئی۔ اصل رسالہ اور اس کا اردو ترجمہ دونوں ہی شائع ہو چکے ہیں۔

۵۔ ۶ اسلامی آداب و اخلاق پر شیخ محدث کے دو فارسی رسالے "آداب الصالحین" اور "آداب اللباس" اگرچہ مختصر ہیں مگر بڑی حد تک جامع ہیں۔ اسی لیے صرف یہ دونوں رسالے بلکہ ان کے اردو ترجمے بھی شائع ہو کر قبولِ عام حاصل کر چکے ہیں۔

۷۔ "جذب القلوب الیٰ دیار المحبوب": فارسی میں مدینہ منورہ کی تاریخ ہے اور شیخ کو وہاں سے جو والہانہ عقیدت تھی، اس کا کتاب کے حرف حرف سے اظہار ہوتا ہے۔ کتاب اپنی مقبولیت کی وجہ سے کئی بار چھپ چکی ہے اور تاریخ مدینہ کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۸ شرح سفر السعادت: مولانا مجد الدین فیروزآبادی کی سفر السعادت، جس میں وہ احادیث جمع کی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادات و آداب معاشرت کا ذکر ہے مگر بعض موقعوں پر ان کا قلم حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے۔ شیخ محدثؒ نے اس کی شرح لکھ کر مصنف کی لغزشوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اصل کتاب اور اس کا اردو ترجمہ کئی بار چھپ چکا ہے۔

۹ شرح فتوح الغیب: حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے اٹھتر وعظوں کا مجموعہ ہے جس میں مذہبی مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں تصوف کا رنگ دے کر پیش کیا گیا ہے۔ شیخ محدث نے اس کی شرح لکھی جو بیحد مقبول ہوئی۔ یہ شرح متن کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ نیز اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۰۔ مرج البحرین: تصوف پر مختصر مگر بہت جامع کتاب ہے جس میں شیخ محدثؒ نے شریعت و طریقت کے پیچیدہ مسائل پر نہایت دلنشیں انداز میں بحث کی ہے اور قرآن و حدیث کے جابجا حوالے بھی دیے ہیں۔ یہ کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ نیز وصال السعدین کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے جو مولوی غوث محمد فرخ آبادی کا کیا ہوا ہے۔

۱۱۔ مدارج النبوۃ: اگرچہ سیرت نبوی پر ہندوستان میں بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر اب بھی ان میں مدارج النبوۃ کو ایک خاص و اہم مقام حاصل ہے اور یہ شیخ محدث کا بہت ہی اہم اور علمی کارنامہ ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے اور مدارج النبوۃ کے نام سے اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

۱۲۔ اخبار الاخیار فی احوال الابرار: یہ ہندوستان کے علماء و مشائخ کا بہت ہی مستند و جامع تذکرہ ہے جس میں شیخ محدثؒ نے اختصار کے ساتھ حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ سے لے کر اپنے وقت تک کے مشہور علماء کے حالات قلم بند کر دیے ہیں۔ آخر میں شیخ نے خود اپنا

پروفیسر ایم اے سلیم خاں
ڈائرکٹر سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز
اے ایم یو

صہیونی، فلسطین اور عرب

ایک تاریخی اور سماجی جائزہ

حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک طرف تو عیسائی پادریوں کا ایک حصہ، دوسری طرف بہت سے بڑے بڑے دانشور، تیسری طرف امریکی صدر جیسے ولسن، روزویلٹ، ہیری من وغیرہ، چوتھی طرف برطانوی وزیر اعظم جیسے چرچل اور اٹلی وغیرہ اور پانچویں طرف روس کے کرتا دھرتا اسٹالن (حالانکہ لینن کے زمانے سے روس کی کمیونسٹ پارٹی صہیونیوں کی تحریک کو ایک بورژوا انحراف کا نام دے رہی تھی) صہیونیت کی تائید کرتے رہے۔ کیا اس کو مغربی تہذیب کی ناکامی کا نام دیا جائے یا مغربی ضمیر کے مردہ ہونے کا ثبوت سمجھا جائے یا مغربی ثقافت کی منافقت کی دلیل سمجھا جائے۔ یورپ کی اٹھارھویں صدی کی روشن خیالی کی تحریک (Enlightenment)، انیسویں صدی کی حریت پسندی، جمہوریت اور سوشلزم اور بیسویں صدی کے حقوق انسانی، حق خود اختیاری اور ریاستوں کی آزادی کے نظریات سب ایک حیوانی طاقت یعنی صہیونیت کے سامنے جھک گئے اور مغربی تہذیب کی انسانیت نوازی (Humanism) اور علم و دانش سامراجی مقاصد اور صہیونی پروپیگنڈے کے سامنے نہ صرف بے دست و پا ہو گئے بلکہ ان کی مدد کی۔ یہ ایسا عالم تھا جس کو "دوپہر کی تاریکی" سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ آرتھر کوسلر Arthur Koestler کے (Darkness at Noon) سے مختلف ہے۔ یہ دوپہر کی تاریکی، اس گہن کا نتیجہ تھی جو صہیونیوں نے انسانی ضمیر پر لگا دیا تھا۔ یہ بیسویں صدی کا المیہ ہے کہ تقریباً ساری "مہذب" دنیا صہیونیوں کے فریب میں آ گئی۔ گو اب اس سے آہستہ آہستہ نکل رہی ہے۔ اس اندھیرے میں البتہ چند ایسی ہستیاں ملتی ہیں جنھوں نے صہیونیوں کے تار و پود کو بکھیر دیا ان میں ایک طرف گاندھی جی اور نہرو جی ہیں تو دوسری طرف مشہور مورخ

بقیہ مضمون "شیخ عبدالحق محدث" اور اپنے آباء و اجداد کا حال لکھا ہے۔ علماء و صوفیاء کے اس تذکرے نے مصنف کی حیات ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی تھی جس میں امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا اسی لیے یہ کتاب مصنف کی کتابوں میں سب سے زیادہ بار شائع ہوئی نیز اس کے متعدد اردو ترجمے بھی ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

آرنلڈ ٹائن بی (Arnold Toynbee) اور عہد حاضر کے عظیم فلسفی برٹرنڈ رسل (Bertrand Russel) ہیں لیکن مغربی دنیا کا غالب طبقہ یا تو گونگا رہا یا مختلف اغراض و مقاصد کے تحت یا صہیونیوں کی پیدا کردہ ذہنی دہشت انگیزی (Intellectual Terrorism) سے گھبرا کر یا اپنے پیشوں (Carems) میں کامیابی کا ان کی تائید پر انحصار سمجھ کر صہیونیوں کی تائید کی اور اب بھی کر رہا ہے

صہیونیوں کے لیے صہائی دنیا میں سب سے بڑا حربہ یہود دشمنی (anti semitism) کا ہے جو یقینی بڑی چیز ہے۔ شروع سے عیسائیوں نے یہودیوں پر یہ الزام لگا رکھا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھانے کے ذمہ دار ہیں۔ اس لیے عیسائیوں میں صدیوں سے یہودیوں کے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ ہے اور اس جذبہ میں اس بات سے اور اضافہ ہو گیا تھا کہ صدیوں سے اور خاص طور پر عہد وسطیٰ میں یہودی تاجروں نے سود خواری اور دیگر ذرائع سے سیدھے سادے اور مجبور عیسائیوں کا کافی استحصال کیا ہے۔ شیکسپیر کے ڈرامے "وینس کا تاجر" (Merchant of Venice) میں یہودی تاجر اور سود خوار شائلاک (Shylock) کا کردار اس استحصال کا ایک رمز (Symbol) بن چکا ہے۔ عیسائیوں کے ایک بڑے طبقے میں اب بھی یہودیوں سے نفرت کا ایک جزو ملتا ہے۔ صہیونیوں نے جب اسرائیل قائم کرنے کی تحریک شروع کی تو ان کو عیسائیوں کے اس جذبے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن انھوں نے اسی کو ایک ہتھیار بنا لیا اور عیسائیوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا۔ جہاں کہیں عیسائیوں نے صہیونیت کے عزائم کی، جو بہرحال غیر معقول، غیر منطقی اور غیر اخلاقی تھے مخالفت کی تو ان پر فوراً یہود دشمنی کا الزام لگا دیا جاتا اور اس کو اتنا اچھالا جاتا کہ بیچارے عیسائی سرا سیمہ ہو جاتے۔ عہد وسطیٰ میں یہودی تاجروں نے سیدھے سادے عیسائیوں کا کافی استحصال کیا تھا اور بیسویں صدی میں صہیونیوں نے روشن خیال اور لبرل لیکن بزدل اور غیر منظم عیسائیوں کا نفسیاتی استحصال کیا اور اب بھی کر رہے ہیں یہود دشمنی کے نام پر یورپ اور امریکہ کو صہیونیوں نے ہمیشہ بلیک میل کیا۔ حالانکہ بہت سے یہودی خود مخالف صہیونی رہے۔ صہیونیت کی مخالفت (anti Zionism) کبھی بھی یہود دشمنی (anti semitism) نہیں ہے۔ لیکن صہیونیوں نے عمداً ان دونوں کو گڈمڈ کر دیا۔ آخر الذکر کو بہت بڑے اور موثر حربے کے طور پر استعمال کیا اور اب بھی کر رہے ہیں۔ اس نام نہاد (so-called) یہود دشمنی کے ہتھیار کو صہیونیوں نے اتنا تیز اور ہمہ مقصدی (Multi Purpose) بنا دیا ہے کہ مغربی یورپ روس اور امریکہ جو اسرائیل کے قیام میں آگے آگے رہے اور اب اسرائیل کی سلامتی (Security) ان کی اہم پالیسی ہے۔ جب کبھی اسرائیل کی جارحیت، ہٹ دھرمی اور توسیع پسندی کی دبی زبان سے بھی مخالفت کرتے ہیں تو ان پر یہود دشمنی کا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ اس طرح اب اسرائیل اپنے توسیعی عزائم کے لیے اس ہتھیار کو استعمال کر کے ان کو بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور یہی امریکہ کی غلامی کی اہم وجہ ہے۔

صہیونیوں نے قومی اور بین الاقوامی تنظیمیں، ان کی علمی ادبی اور فنی صلاحیتیں، ان کی محنت، جفاکشی، عزم و استقلال، لگن اور مستقل مزاجی، ان کی دولت کی فراوانی اور فیاضی، معیشت کے بڑھتے پر

قبضہ، ان کا اثر و رسوخ۔ ان کا عوامی مواصلات (mass media) پر اثر، اُن کے اثر انگیز اور دلکش ناول اور افسانے اور ان کے ادیبوں اور فن کاروں کا ثقافت پر اثر، ان کے پروفیسروں، دانشوروں اور ریسرچ کے اداروں کا علمی دنیا میں بھاری ہونا، ان کی متعدد الطبقات (multi-layered)، متعدد الابعاد (multi-dimensional) اور متعدد الادوار (multi-faceted) اسکیمیں اور پروپیگنڈے، ان سب نے مل کر ایک طرف تو یورپ اور امریکہ کے عوام، دانشوروں اور پڑھے لکھے طبقوں (intellectual intelligentsia) کو متاثر کیا اور دوسری طرف ان کی حکومتوں، پالیسی بنانے والوں اور پالیسی پر اثر انداز ہونے والوں کی آزادی کے ساتھ اور سارے پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیتوں کو مفلوج کر دیا۔ اسی طرح اب مختلف اسرائیلی لابیاں (lobbies) مختلف ملکوں اور خاص طور پر ریاست ہائے متحدہ میں ان کی حکومتوں اور عوام اور سیاسی پارٹیوں اور ان کی مختلف علمی، فنی، ثقافتی اور نسلی (ethnic) گروہوں پر ایک اخطبوط (octopus) کی طرح چھائی ہوئی ہیں اور ان کا اخلاقی اور ذہنی خون چوس رہی ہیں اور انھیں مفلوج کر کے اپنی مرضی کے مطابق کام لے رہی ہیں۔

اس پوری تنظیم امور (scheme of things) میں جو خلا تھا وہ عرب آواز کا تھا اور اب بھی کافی حد تک ہے اور خاص طور پر امریکہ (جو اس وقت واحد ملک ہے جو اسرائیل پر اثر انداز ہو سکتا ہے) میں تو اب بھی بہت زیادہ ہے۔

ایسے ادوار، مراکز اور ممالک میں جہاں ان کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا، عربوں کا منظر سے غائب رہنا، ان کا حقیر اور ناقابلِ توجہ سمجھا جانا اور ان کے حقوق کا تذلیل اور بغیر کسی بدلے کے خوف کے ٹھکرا دیا جانا ایک طرف تو اس تاریخی شکنجے کی نشاندہی کرتا ہے جس میں ان کی گردن پھنس گئی، دوسری طرف ان کی پسماندگی کی گہرائی اور ان کی ہر میدان و فن میں کمزوری کا پتہ دیتا ہے تو تیسری طرف ان کے دشمنوں یعنی صہیونیوں کی ہمہ گیر نفاذ (penetration) اثر و رسوخ اور کامیاب ریشہ دوانیوں کی صلاحیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس تضاد کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم عربوں اور صہیونیوں کے تاریخی حالات، اور ان کی صلاحیتوں کا تقابلی مطالعہ کریں۔

اس صدی کی ابتدا میں جب صہیونیوں کی مشرق وسطیٰ پر نظر جم گئی اور فلسطین میں وہ اسرائیل کے قیام کی جد و جہد میں مصروف ہو گئے تو اس وقت وہ مغربی یورپ اور امریکہ پر چھا جانے کے موقف میں تھے اگرچہ کہ ان کی تعداد وہاں کی آبادیوں میں بہت کم تھی اور اندرونی یہود دشمنی (anti-semitism) ابھی باقی تھی لیکن بڑھتی ہوئی صہیونی تنظیمات کے پاس دولت، غور و فکر کی صلاحیت، تکنیک (techniques) اور اسٹراٹیجی (strategy) کو حالات کے لحاظ سے مرتب کرنے اور ان کو روبہ عمل لانے کے مواقع، کام کرنے کا جذبہ اور عزم و استقلال کا سرمایہ، یہ سب موجود تھے۔ ان کی بین الاقوامی تنظیمیں جو یورپ اور امریکہ میں قائم ہو رہی تھیں ہمیشہ ایک دوسرے سے تعاون کرتیں، متعلقہ حکومتوں کی

پاسیبیوں کے بنانے میں اثر انداز ہوتیں اور جنگوں میں ان کی مدد کرتیں۔ مثال کے طور پر پہلی جنگ عظیم میں مشہور صہیونی لیڈر وائزمین (Weizmann) نے اپنی سائنس کی دریافتوں کے ذریعہ برطانیہ کو جنگ جیتنے میں مدد دی اور دوسری جنگ عظیم میں صہیونیوں نے اپنی فوج مرتب کی جس نے اتحادیوں کی مشرق وسطیٰ میں مدد کی۔ انھوں نے عام طور پر اتحادیوں (Allies) کا ساتھ دیا اس لیے کہ انہیں سے آئندہ مدد کی توقع تھی۔ پہلی جنگ عظیم میں جب سلطنت عثمانیہ تباہ ہوگئی اور فلسطین انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تو ۱۹۱۷ء میں صہیونیوں نے ان سے اعلان بالفور (Balfour Declaration) حاصل کرلیا جو اسرائیل کے قیام کا سنگ بنیاد تھا۔ ان ہی انگریزوں کو سامراجی طاقتوں پر مشتمل انجمن اقوام (League of Nations) نے فلسطین پر حکومت کرنے کا انتداب (Mandate) عطا کیا جو کسی صورت میں جائز نہیں قرار دیا جا سکتا اور اتنا ہی قابل مذمت ہے جتنا کہ اعلان بالفور، لیکن عربوں کی کہیں آواز نہیں تھی۔ صہیونیوں نے انتداب کے وثیقے میں اعلان بالفور کو شامل کرالیا تاکہ اس کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوجائے اب یہودیوں کو عرب فلسطین میں فوج در فوج در آنے وہاں کے باشندوں کی زمینوں پر مال و دولت، حکومت کی سرپرستی، عرب زمینداروں کی خود غرضی اور عرب کسانوں کی بیچارگی اور غربت کے نتیجے میں قبضہ کرنے اپنی آبادی کو تیزی سے بڑھانے اور اپنی منظم فوجی تنظیمیں قائم کرکے فلسطینیوں کی مقاومت (Resistance) کے مواقع مل گئے۔ ۱۹۱۷ء سے پہلے ہی صہیونیوں کے بھیجے ہوئے یہودی فلسطین میں آرہے تھے لیکن اس کے بعد اور خاص طور پر ۱۹۲۰ء کے انتداب کے قیام کے بعد ان کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا۔ فلسطینیوں اور دوسرے عربوں کو اعلان بالفور کا بہت بعد میں پتہ چلا اور فلسطین پر برطانوی انتداب کے قیام کے مضمرات کو سمجھنے میں دیر لگی اور جب بات سمجھ میں بھی آگئی تو اس کے اثرات کو روکنے کی یا اس کو اپنے مقاصد کے لیے تبدیل کروانے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی اس لیے کہ نہ برطانیہ میں اور نہ لیگ میں ان کی آواز موثر تھی۔ فلسطین میں عربوں نے مقابلہ کیا۔ مظاہرے، ہڑتالیں، بغاوتیں اور دہشت انگیزی کے واقعات ہوئے لیکن عام طور پر انگریز اور صہیونی متحد تھے اور صہیونیوں کی بین الاقوامی تنظیمیں لندن میں حکومت برطانیہ کا گلا دبوچے ہوئی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم سے چند روز پہلے جب برطانیہ نے یہودیوں کی آمد پر پابندی لگانی شروع کی تو امریکہ کے صدر روزویلٹ نے برطانیہ کو مجبور کیا کہ وہ پابندی ہٹالے۔ جب دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ کی طاقت کمزور ہو رہی تھی اور اس کو امریکہ کی مدد کی سخت ضرورت تھی صہیونیوں نے اپنے عمل کے مراکز زیادہ تر امریکہ منتقل کر دیے۔ جنگ کے ختم ہونے پر برطانیہ اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں کی بنا پر فلسطین چھوڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا اس وقت امریکہ ایک غیر معمولی عظیم طاقت (Super-power) کی حیثیت سے نمودار ہوا۔ اس وقت صہیونی امریکہ میں پہلے ہی سے طاقت ور تھے اور عربوں کی کوئی آواز نہیں تھی اس وسیع ملک میں عربوں کو جاننے والے برطانیہ سے بھی کم تھے ۱۹۴۷ء اور

۱۹۴۷ء میں جب اقوامِ متحدہ میں فلسطین کا معاملہ پیش ہوا تو امریکہ نے اپنے اثر و رسوخ کا استعمال کر کے صہیونیوں کی تائید میں بہت سے ممالک کے ووٹ حاصل کیے۔ مغربی یورپ کی استعماری طاقتیں تو پہلے ہی سے ان کی تائید کر رہی تھیں اور روس نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اب عرب کہیں کے نہیں رہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب صہیونیوں نے زبردستی اسرائیل قائم کر لیا تو گیارہ منٹ کے اندر امریکہ کے صدر ٹرومن نے اس غاصبانہ ریاست کو تسلیم کر لیا۔ اس لیے کہ صدارتی انتخاب میں صہیونیوں نے ان کی مدد کی تھی۔ پھر جب کچھ عرب ریاستوں نے اسرائیل سے لڑنے کے لیے اپنی مختصر سی فوجیں فلسطین بھیجیں تو انھیں مغربی طاقتوں اور روس نے اسرائیل کی فوجی اور ڈپلومیٹک مدد کی اور اقوام متحدہ سے جنگ کو روکنے کی قراردادیں اس طرح منظور کروائیں اور ان کا نفاذ اس طرح عمل میں آیا کہ عربوں کی شکست یقینی ہو گئی۔ گویا ساری طاقت ور دنیا عربوں کی مخالف تھی اور خود عرب کمزور تھے۔

عربوں کی کمزوریوں کو ان کے دشمن بہت حقارت سے اور ان کے دوست بہت تلخ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی کمزوریاں بہت واضح ہیں۔ اگرچہ کہ وہ عرب نسلیں (Generations) جو جنگ عظیم اول سے اب تک صہیونیوں اور اسرائیل کا مقابلہ کرتی رہی ہیں اپنی ناکامیوں کی ذمہ دار ہیں، لیکن ساری ذمہ داری ان کے سر نہیں تھوپی جا سکتی یہاں ذمہ داریوں کا ایک مثلث بنتا ہے جس کے اضلاع میں ایک تو یہ خود عرب نسلیں ہیں جن کو ان آفاتِ انسانی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرا ضلع صہیونیوں عظیم طاقتوں سے عبارت ہے جنہوں نے ان پر ظلم کیا اور تیسرا ضلع عربوں کی وہ نسلیں ہیں جو گزشتہ ایک ہزار سال میں زندہ رہیں اور انھوں نے اپنے اندر فساد اور کمزوری کو گھسنے دیا، زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی پرورش کی اور اس کا وبال آنے والی نسلوں پر ڈالا یہاں تک کہ بیسویں صدی میں عرب مٹی کا ڈھیر ہو گئے

عربوں میں اضمحلال گزشتہ ایک ہزار سال پہلے شروع ہو چکا تھا۔ یہ دنیا کی ان چند قوموں میں سے ہیں جو جس تیزی سے اٹھیں، اسی تیزی سے زوال کی طرف گرتی چلی گئیں۔ عہد نبوی، عہد خلافتِ راشدہ اور عہد اموی خالص عربوں کے دور کہے جا سکتے ہیں۔ عہد عباسی کا ابتدائی دور اگرچہ کہ عرب علوم و فنون کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے لیکن عرب زوال پذیر ہو گئے تھے۔ حکومت میں ان کی طاقت اور سوسائٹی میں ان کا اثر دونوں کم ہو چکے تھے۔ اگرچہ کہ عباسی خلفاء عرب تھے اور خلافت کی زبان عربی تھی لیکن غیر عرب غالب آ رہے تھے۔ پھر عباسی خلافت طویل عرصہ زوال پذیر رہنے کے بعد تیرھویں صدی میں ہلاکو کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔ عباسی دور ہی میں سلجوقی ترکوں نے خلافت کو سنبھالا دیا تھا ورنہ بہت پہلے گر جاتی۔ مصر کے غیر عرب مملوکوں نے بغداد کی تباہی کے بعد منگولوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا تھا۔ غیر عرب صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو لوٹا دیا تھا اور عثمانی ترکوں نے اسلامی سلطنت کو آگے بڑھایا تھا ان ادوار میں عرب کسی نمایاں مقام پر نہیں تھے۔ حرم خانہ کعبہ کے پاسباں فراہم کر رہے تھے اور عرب ان کے وظیفہ خوار تھے۔ پھر عرب سولھویں صدی

سے سلطنتِ عثمانیہ کے زیرنگوں ہوگئے۔ اٹھارویں صدی کے آتے آتے یہ سلطنت اپنی آن بان کھو چکی تھی۔ تیرھویں چودھویں صدی کی نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں یکے بعد دیگرے ترقی کی تحریکیں اور ادوار آتے رہے جب یورپ ابھر رہا تھا، سلطنتِ عثمانیہ اور اس کی رعایا گر رہی تھی۔ یہاں تک کہ ترکی (سلطنتِ عثمانیہ) کو یورپ کا مردِ بیمار- Sickman of Europe) - قرار دیا گیا جس کے مرنے کا انتظار تھا تاکہ اس کی جائداد کے حصے بخرے کر لیے جائیں۔ وہ بہت پہلے ہی مرجاتا لیکن برطانیہ نے اپنے مقاصد کے لیے اس کو مصنوعی تنفس کے ذریعہ زندہ رکھا اور جب برطانیہ اور فرانس نے جنگِ عظیم سے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ اب اس مردِ بیمار کو مار ڈالا جائے تو ۱۹۱۴ء کو مار کر اس کے حصے بخرے کر لیے۔ صدیوں کی غلامی اور بے چارگی نے اب عربوں کو نابالغ یتیموں کی حالت میں لاکر چھوڑ دیا۔ عربوں میں آزادی اور قومیت کی تحریک اس صدی کی ابتدا میں شروع ہوئی تھی۔ اگرچہ کہ ان کا ادبی نشاۃ ثانیہ نپولین کے مصر پر حملے (۱۷۹۸ء) سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن بہت سست رفتار تھا۔ ان کی ادبی اور سیاسی تحریکیں دونوں کی دونوں نابختہ تھیں۔ جنگِ عظیم اول میں سلطنتِ عثمانیہ ٹوٹ پھوٹ گئی اور صیہونی برطانیہ کی گردن پر سوار ہوکر فلسطین میں آ اتر پڑے۔ ہلالِ زرخیز - Fertile Crescent) - کی دوسری ریاستیں یعنی عراق شام، لبنان اور اردن انگریزوں یا فرانسیسیوں کے قبضے میں انتداب کے نام سے آگئیں۔ مصر تو ۱۸۸۲ء ہی سے برطانیہ کے قبضہ میں تھا۔ یہی ریاستیں تھیں جو کسی قدر آگے تھیں لیکن وہ غلام ہوگئی تھیں۔ جزیرہ نمائے عرب میں اگرچہ ابن سعود (عبدالعزیز) کی طاقت ابھر رہی تھی لیکن وہ

بہت ہی پسماندہ علاقہ تھا۔ سائنس اور ٹکنالوجی، علوم اجتماعی (Social Science) اور خاص طور پر بین الاقوامی سیاست اور ڈپلومیسی کی گویا عربوں کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ وہ دنیا کو پہلے تو ٹھیک طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے تھے اگر ان کے کچھ عقلمند اس کو سمجھنے کا دعویٰ کرتے تو وہ دنیا پر اثر انداز نہیں ہوسکتے تھے اس لیے کہ ان کے پاس اس کے کوئی ذرائع نہیں تھے۔ ان میں نہ صرف غربت، بے احساسی اور ناخواندگی عام تھی، بلکہ ان کے پڑھے لکھے لوگ بھی عام طور پر نیم جاہل تھے۔ ان میں نئے اعلیٰ فنون کا فقدان تھا۔ ان کی بربادیوں کے جو شورے آسمانوں میں ہو رہے تھے ان سے اگر دیر سویر واقف بھی ہوجاتے تو ان کے پورے مضرات کو سمجھنے سے قاصر تھے اور ان کی تباہی کے طریقوں کو کاٹنے اور اپنی ترقی اور مفاد کو آگے بڑھانے اور طاقتور اقوام سے ان کو منوانے کی ان کے پاس صلاحیت تھی نہ ذرائع۔ اسٹراٹیجک غور و فکر اور تدابیر کا ان کو خیال بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس لیے کہ ان کے پاس اس کی تنظیم اساس (Infrastructure) موجود نہیں تھی۔ یہ گویا دنیا سے غائب تھے اور دنیا ان کو نظرانداز کرسکتی تھی۔ ان کے حاکم، ان کے لیڈر اور ان کے عالم عام طور پر یا تو غیر دوراندیش یا خریدے ہوئے یا کم مایہ تھے۔ ان کے اندر شاید ہی کوئی مثبت صلاحیت تھی جو نئی دنیا میں کام آسکتی اور پھر ان کے اندر کمزوریوں کے ڈھیر تھے مختصر یہ کہ عرب کئی صدیوں کے زوال اور انحطاط کے نتیجے میں مضمحل، بے صلاحیت اور منقسم ہوگئے تھے۔ عہدِ حاضر کے ایک عربی شاعر نے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی گھناؤنی شکست سے متاثر ہوکر ان کے بارے میں ایک تلخ اور طویل نظم لکھی ہے جو اگرچہ ۱۹۶۷ء کے

حالات کے مطابق نہیں تو کم از کم اس صدی کے ابتدائی نصف کے بارے میں ضرور صحیح ہے۔ اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں[1]

ما دخل الیهود من حدودنا وإنما	یہودی ہمارے حدود میں داخل نہیں ہوئے بلکہ وہ تو
تسربوا کالنمل من عیوبنا	چیونٹیوں کی طرح ہمارے عیوب میں سے گھس آئے ہیں
خمسة آلاف سنة	پانچ ہزار سال ہوئے
ونحن في السرداب	ہم سرنگ میں گھسے ہوئے ہیں
فالناس یجهلونکم في خارج السرداب	اس سرنگ کے باہر لوگ تمہیں نہیں جانتے
الناس یحسبونکم نوعاً من الذئاب	لوگ تم کو تو بھیڑوں کی ایک قسم سمجھتے ہیں۔
......	......
جلودنا میتة الإحساس	ہمارے جلدیں احساس سے عاری ہیں۔
أرواحنا تشکو من الإفلاس	ہماری روحیں دیوالیہ پن کی شکایت کرتی ہیں
أیامنا تدور بین الزار والشطرنج والنعاس	ہمارے دن چیخ و پکار، شطرنج اور اونگھ میں گزرتے ہیں۔
هل (نحن خیر أمة أخرجت للناس)	کیا ہم وہ بہترین امت ہیں جو انسانوں کی رہنمائی کے لیے نکالی گئی ہے۔

بہر حال اس دور میں تاریخ اور جغرافیہ دونوں عربوں کے دشمن ہو گئے تھے۔ وہ تاریخ کے ایسے دور میں پکڑے گئے جبکہ وہ بہت کمزور، منقسم اور علم و فن میں پیچھے تھے اور نہ عصر حاضر کی دنیا کو سمجھنے اور اس کو اپنے مقاصد کے استعمال کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے۔ بلکہ اپنے حقوق کی حفاظت سے بھی قاصر تھے اور ان کو اس گروہ نے پکڑ لیا جو ایک طرف اپنی محنت، جفاکشی، تحمل، ذہانت، علم و فن، تنظیم، پروپیگنڈے اور دنیا کو متاثر کرنے کی دوسری صلاحیتوں میں یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ قوموں سے بھی آگے تھا تو دوسری طرف اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی بد دیانتی، دغا، فریب، دروغ گوئی، ظلم و تشدد، دہشت انگیزی اور بربریت کو استعمال کرنے کو اپنا ایمان سمجھتا تھا۔ اسی طرح عربوں کی ساتویں اور بعد کی صدیوں کی فتوحات، اسلام کی اشاعت، یہودیوں اور عیسائیوں کی دشمنی، صلیبی جنگیں اور اسی قسم کے دوسرے واقعات اور عوامل یورپ کی استعمار پسندی، امریکہ کی صیہون غلامی اور صہیونیوں کی جارحیت کے ساتھ نیا مسالہ تیار کر رہی تھیں جو ان کے خلاف بارود کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ جغرافیہ بھی عربوں کا دشمن تھا اگر عرب طاقتور ہوتے تو اسی جغرافیہ کو ایک اثاثے (...) کے طور پر استعمال کرتے۔ لیکن ان کی کمزوریوں کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کا اسٹریٹیجک جائے وقوع ان کے گلے کی زنجیر بن گیا۔ اگر عرب دنیا

---

[1] نزار قبانی "هوامش علی دفتر النکسة" الأعمال السیاسیة (بیروت)
آخری سطر بین القوسین قرآن کی آیت ہے۔ پانچ ہزار سال تو ایک شاعرانہ مبالغہ ہے لیکن عرب تقریباً ایک ہزار سال سے ادبار اور انحطاط میں مبتلا ہیں۔

کے کسی دور افتادہ علاقے میں رہتے، جیسے آسٹریلیا نیوزی لینڈ وغیرہ اور ان کا خطہ تیل سے مالا مال نہ ہوتا، دنیا کے راستے اس میں سے نہیں گزرتے اور صہیونیوں کی نظر فلسطین پر نہ پڑتی تو شاید دو اور صدیاں سو کر گزار سکتے تھے. لیکن وہ نافِ زمین پر بسے ہوئے تھے اور دنیا کے چوراہے پر اصحابِ کہف کی طرح سو رہے تھے .

عربوں کی ناکامیوں سے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شاید وہ دنیا کی کمزور ترین قوم تھے. نظرِ انصاف سے دیکھا جائے تو دنیا میں ان سے بھی کمزور قومیں ہیں. لیکن اپنی کمزوریوں کی ان کو اتنی بڑی سزا نہیں بھگتنی پڑی. عربوں کو جس قسم کے دشمنوں سے سابقہ پڑا اور اس کے پیچھے دنیا کی جو طاقتیں کام کر رہی تھیں وہی دشمن مع ان طاقتوں کے کسی اور پسماندہ قوم سے جو عربوں سے بھی زیادہ طاقتور ہوتی لڑتا اور اس پر قبضہ کرنا چاہتا تو یقینی کامیاب ہو جاتا۔ یہ عربوں کی بدقسمتی ہے کہ ڈھائی ہزار سال پہلے خانہ بدوش یہودیوں نے فلسطین میں داخل ہو کر کچھ صدیوں کے لیے اپنی ایک ریاست قائم کر لی تھی اور بیسویں صدی میں ان میں ایک گروہ نے طاقت حاصل کر کے وہاں ریاست قائم کرنے کی ٹھان لی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عربوں کو ان کی کمزوری اور غفلت کی سزا ملی۔ لیکن کمزوری کوئی جرم نہیں ہے سوائے حیوانات کی دنیا کے۔ یہ خیال کہ "جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات" ہے، ایک فاشسٹ نظریہ ہے اور دنیا ہٹلر کی اسی لیے مذمت کرتی ہے کہ وہ فاشسٹ تھا. لیکن ہٹلر کی فاشسیت نے صہیونیوں کو فاشسٹ بنا دیا اور اس وقت اسرائیل اندرونی طور پر کتنا ہی جمہوری ہونے کا دعویٰ اور اس کے ہوا خواہ اس کے علم و فن کی ترقی کی تعریف کریں اس کی ذہنیت فاشسٹ ہے جس طرح برطانیہ کسی زمانے میں اندرونی طور پر جمہوری تھا لیکن باہر کے ملکوں کے لیے سامراجی تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ امریکہ ایک طرف جمہوری ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسری طرف ایک فاشسٹ طاقت کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ اس نے فاؤسٹ کی طرح اپنی روح اسرائیلی لابی کے ہاتھوں بیچ دی ہے لیکن پتہ نہیں کس مقصد کے لیے ایسا کیا ہے

یہ بات بھی نہیں کہ عربوں کو اپنی ۱۹۴۸ء کی شکست کا احساس نہیں اور اُن کے اندر کوئی تبدیلیاں نہیں آئیں۔ ۱۹۴۹ء کے شام کے تین انقلابات، مصر کا ۱۹۵۲ء کا انقلاب، اردن کے بادشاہ عبداللہ کا قتل اور ملک حسین پر بار بار حملے اور ملک میں بار بار بغاوت اور انقلاب کی کوششیں، عراق کا ۱۹۵۸ء کا انقلاب، یمن کا ۱۹۶۳ء کا انقلاب، عراق اور شام کے سلسلہ وار انقلابات، بے شمار تلخ کتابوں کا لکھا جانا، مختلف قومی، سوشلسٹ اور مذہبی پارٹیوں کا قیام، انقلابی مجموعہ ہائے نظریات (Ideologies) کا وجود میں آنا اور عرب سوسائٹی کے ایک بڑے حصہ کا حرکت میں آنا ان سب میں سب سے بڑا عامل عربوں کی صہیونیوں کے ہاتھوں اور بعد میں اسرائیل کے مقابلے میں شکست ہے. شاید عربوں کا ردِ عمل کچھ اور تیز، مربوط اور متحد ہونا چاہیے تھا لیکن ان انقلابات نے کیا کیا. سوائے مصر کے انقلاب کے جس کو ایک بڑا لیڈر میسر آ گیا تھا اور یہ کہ مصر آبادی کے لحاظ سے ایک متجانس (Homogeneous) ملک ہے. دوسرے انقلابات نے یا تو مزید انقلابات کے راستے کھول دیے

یا خانہ جنگی پیدا کردی یا ترقی کا راستہ روک دیا۔ شام سارے انقلابوں اور انقلابی آئیڈیالوجی کے باوجود اس وقت ایک اندرونی ہیجان میں مبتلا ہے جس کے منہ پر فوجی استبداد کا ڈھکن کسا ہوا ہے اور روس سے اتحاد کے باوجود حالیہ اسرائیلی حملے میں بُری طرح شکست کھا کر خاموش ہو چکا ہے۔ یمن کے انقلابات کے بعد دس سال تک خانہ جنگی ہوتی رہی اور ایک فوجی حکومت قبائلی نظام کے ساتھ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہے۔ جنوبی یمن مسلسل انقلابات کے چکر میں پھنس کر کمیونسٹ ہو چکا ہے اور روس کے زیر اثر ہے۔ عراق کئی انقلابوں کے بعد ۱۹۶۸ء کے انقلاب کو ساتھ لے کر آگے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن اندرونی نسلی (Ethnic) اور طائفی (Sectarian) قوتوں نے اس کے قدموں کو زنجیریں پہنانے کی کوشش کی اور ایران کے عہد وسطیٰ (Medieval) کے انقلاب نے اس کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ناصر کو ۱۹۶۷ء کی شکست نے مارا اور سادات نے پیچھے کی طرف قدم ہٹانے شروع کر دیے۔ پھر مذہبی مجنونوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ کسی ملک میں نہ لبرل جمہوریت (Liberal Democracy) قائم ہوئی اور نہ جمہوری سوشلزم (Democratic Socialism) آسکا۔ یہ دونوں متقدم (Advance) نظام ہائے حکومت ان ملکوں میں نہیں آسکتے جب تک ان کے قیام کے لیے پہلے ہی سے ضروری شرائط (Pre-requisites) موجود نہ ہوں۔ لبنان کی طائفی جمہوریت (Confessional Democracy) کا جو حشر ہوا وہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس وقت یا تو فوجی حکومتیں ہیں جن کے پیچھے کسی طبقے یا فرقے یا کسی آئیڈیالوجی کی طاقت ہے یا نیم مطلق العنانی بادشاہتیں ہیں۔ اجتماعی علوم کا یہ ایک معرکتہ الآرا اور لاینحل مسئلہ ہے کہ کیا ایسے ملکوں میں کسی بھی طرز کی جمہوری حکومت قائم ہو سکتی ہے اور باقی رہ سکتی ہے جب تک کہ ایک زمانے تک نیک نیت (Benevolent) ڈکٹیٹر یا فوجی گروہ یا بادشاہت اس کے فروغ دینے کے لیے حکومت کرے۔ کیا ایسا ممکن بھی ہے؟ دوسرے بہت سے پسماندہ ملکوں کی طرح عرب ملکوں میں ایسے سماجی تضادات (Contradictions) ہیں جنہوں نے مسائل کو پیچیدہ کر دیا ہے۔

عربوں کے پاس گزشتہ کئی دہوں (Decades) سے تیل کی دولت ہے اور خاص طور پر ۱۹۵۰ء کے انتظامات اور ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۸ء کی تیل کی قیمتوں کے ارتفاع نے یکے بعد دیگرے بہتر سے بہتر موقع فراہم کیے ہیں۔ بعض ممالک میں اس تیل کی دولت کی وجہ سے ان کی صدیوں کی فاقہ کشی ختم ہو گئی اور دولت اول کی دولت اسی روز سے کے انطار میں خرچ ہو گئی اور کچھ حکمرانوں کی فضول خرچیوں کی نذر ہو گئی۔ ایک عجیب بات یہ کہ جو ملک علم و فن میں آگے تھے وہاں تیل نہیں نکلا سوائے عراق کے اور جہاں تیل نکلا وہ دنیا سے صدیوں پیچھے تھے۔ پرانی صدیوں کو طے کرکے ان کی آبادی کے بعض حصے جب نئی صدی میں داخل ہوئے تو دنیا بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ ان پسماندہ تیل والے ملکوں میں آبادی کی بھی بہت کمی ہے اور پسماندگی کی گہرائی ہی بہت زیادہ ہے اور زیادہ تر حکمرانوں میں عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کی عقلیں تھیں۔ گو اب ایسے حکمراں نہیں رہے۔ تیل کے سیلاب نے اُن کو بہا دیا۔ شیخ شخبوط (ابوظبی)، سلطان (عمان) اور ملک سعود (سعودی عربیہ) ہٹا دیے گئے اور ان کی جگہ شیخ زاید، سلطان قابوس، اور ملک فیصل جیسے حکمرانوں نے لے لی۔ عراقی حکمرانوں کا

باقی صفحہ نمبر ۷ پر ملاحظہ فرمایئے

ڈاکٹر وارث کرمانی
شعبۂ فارسی
اے ایم یو۔

جرسِ فریاد می دارد.....

تقسیم ملک سے پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں کی بڑی تعداد مسلمان امراء ورؤساء کے گھرانوں سے تعلق رکھتی تھی اور ان کی تعلیم کا مقصد مہذب و شائستہ بننے کے علاوہ اعلیٰ سرکاری ملازمت حاصل کرکے خاندانی اعزاز میں اضافہ کرنا ہوتا تھا۔ اب نہ وہ رئیس و تعلقہ دار باقی رہ گئے ہیں نہ آئی سی ایس کا وہ جادو باقی ہے۔ موجودہ علی گڑھ کے طالب علم زیادہ تر یو۔پی کے ایسے مسلمان گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں جو ابھی تک سابق زمینداریوں کی بچی کھچی املاک سے اپنے آبائی قصبات میں گزر بسر کر رہے ہیں یا پھر شہروں میں نکل کر آباد ہو گئے ہیں اور وہاں کسی نہ کسی ملازمت یا تجارت سے بسر اوقات کر رہے ہیں۔ قصبوں میں رہنے والوں کی جائداد زیادہ تر کاشتکاری کے فارموں، مختلف کھیتوں اور ریلوں کے باغات کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ بعض جگہوں پر کاشتکاری کے علاوہ یا اس کے ساتھ دوسرے ذرائع آمدنی بھی ہوتے ہیں جیسے ٹیوب ویل، بجلی یا انجن سے چلنے والی چکیاں، آرہ مشین، ٹرانسپورٹ کا دھندا یا کولڈ اسٹوریج کا کاروبار وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کاروبار ان طالب علموں کے گارجین چلاتے ہیں یا پھر گھر کے ایسے افراد جو اعلیٰ تعلیم نہ پانے کی وجہ سے دیہاتی زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے۔ لیکن گھر کے وہ افراد جو یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے ہیں، ان کا نصب العین وہی سرکاری ملازمت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ نصب العین آج بوسیدہ و از کار رفتہ ہو گیا ہے۔ سول تو سرکاری ملازمت اب اس پائے کی نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ آج کا ڈپٹی کلکٹر سائیکل دبائے ہوئے گاؤں گاؤں مارا مارا پھرتا ہے اور اس سے نیچے درجے کے ملازموں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ ان ملازموں کی تنخواہیں اتنی کم ہوتی ہیں کہ صاف اور صحت مند زندگی کی کفالت نہیں کر سکتیں۔ مجبوراً ملازمت کرنے والا دوسرے ناجائز ذرائع آمدنی سے پیسہ کمانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے باوجود اسے شہر کے تنگ مکانوں میں ملاوٹ کی ہوئی غذا اور صنعتی ماحول کی زہریلی ہوا پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ اس رجحان کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ ہمارے گاؤں اور قصبے جو ابھی تھوڑی مدت پہلے ہماری تہذیب کا مرکز تھے اور جنھیں شاہجہاں اپنی سلطنت کا خزانہ کہا کرتا تھا، اب آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ لکھوری اینٹ کی بنی ہوئی بلند حویلیاں جہاں کبھی تہذیب کی بہار نظر آتی تھی آج ویران ہو کر کھنڈر بننے لگی ہیں اور ان کے شکستہ کنگورے آزاد بلگرامی، ریاض خیرآبادی، محسن کاکوروی، جوش ملیح آبادی اور مجاز ردولوی کا نوحہ پڑھ رہے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ ختم ہو چکے ہیں

بلکہ اس لیے کہ آج ان کی جائے پیدائش پر ان کے پڑھنے اور سمجھنے والے باقی نہیں رہے ہیں اور اُن کے نونہال ترکِ وطن کرکے کسی گنجان شہر کی مشین کا پرزہ بن چکے ہیں۔

اس مضمون کے ذریعہ ہم اپنے طالب علموں کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرنا چاہتے ہیں کہ وہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر شہری مشین کا پرزہ بننے سے پہلے ایک بار اپنے آبائی وطن اور اپنے گھروں کی جانب بھی دیکھ لیا کریں اور وہاں کی آزاد زندگی اور آزادانہ ذریعہ معاش کو بھی پیشِ نظر رکھ کر اپنے مستقبل کے پروگرام کا فیصلہ کریں۔ آج کل زیادہ تر نوجوان دیہات کی آرام دہ زندگی پر شہر کی محبوس اور تکلیف دہ زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس رویہ کے پیچھے کئی غلط مفروضات کارفرما ہیں جو ماضی میں کسی وقت شاید صحیح رہے ہوں لیکن آج قطعی بے بنیاد ہوگئے ہیں۔ عام طور سے قصبوں کی زندگی کو شہر کی زندگی کے مقابلہ پر غیر محفوظ سمجھا جاتا ہے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ صورتِ حال اب اس کے برعکس ہے۔ شہروں میں کہیں زیادہ ڈکیتیاں اور فسادات ہوتے رہتے ہیں اور نہ پولیس موقع پر پہنچتی ہے نہ پڑوسی گھر سے نکلتا ہے جب کہ دیہات میں اگر اتفاق سے ایسا حادثہ ہو بھی جاتا ہے تو پولیس سے پہلے سارے گاؤں والے جمع ہو کر مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔ ایک دوسرا اعتراض جو دیہاتی زندگی پر کیا جاتا ہے وہ تعلیمی اور طبی سہولتوں کا نہ ہونا ہے۔ یہ بات بھی اب زیادہ صحیح نہیں رہی ہے۔ تعلیمی اور طبی سہولتیں اب اطراف میں پھیل چکی ہیں اور سند یافتہ ڈاکٹر چھوٹے چھوٹے قصبوں میں موجود ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے اسکول ہر جگہ کھل چکے ہیں۔ بجلی تقریباً ہر جگہ پہنچ چکی ہے۔ اور ٹرانسپورٹ کی سہولتوں نے قصبوں کو شہر سے شہر والوں سے قریب تر کر دیا ہے۔ کھانے پینے اور ضروریاتِ زندگی کی بیشتر چیزیں وہاں دوکانوں پر موجود رہتی ہیں۔ یہ ہے موجودہ دیہات اور قصبات کا نقشہ جس سے گریز کرکے نوجوان شہروں کی گنجان، غیر صحت مند اور فتنہ پرور زندگی کی طرف بھاگتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں اگر ہمارے طالب علم تعلیم یافتہ ہونے کے بعد شہروں میں معمولی نوکری کرنے کے بجائے اپنے گھروں میں رہ کر پیسہ کمانے کی کوشش کریں تو وہ زیادہ خوش حال اور مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ جن کے گھروں میں کاشت کاری یا آم کے باغات ہیں وہ زراعت کے جدید طریقوں سے انھیں ترقی دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے حکومت کی طرف سے ہر ممکن سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ مثلاً اچھے بیج کی فراہمی، کیڑے مار دواؤں کا انتظام اور صنعتی کھاد وغیرہ۔ اس کے علاوہ کھیتوں اور باغوں کی آمدنی پر حکومت کوئی انکم ٹیکس بھی نہیں لیتی جو مزید ہمت افزائی کا سبب ہے۔ اگر یہ طالب علم انجینیر یا ڈاکٹر بن کر نکلے ہیں تو بھی اپنے وطن میں ذاتی کاروبار کر سکتے ہیں جسے انگریزی میں Self-employment کہا گیا ہے ڈاکٹر اپنا دواخانہ کھول کر اور انجینیر اپنی دوکان قائم کرکے ملازمت سے کہیں زیادہ مالی منفعت حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ وہ آزادانہ زندگی بسر کریں گے جس کی بنا پر وہ اپنے علاقے کے دیہاتوں سے خوشگوار تعلقات قائم کر سکتے ہیں اور سیاسی و سماجی مسائل میں دلچسپی لے کر اپنے ہم وطنوں کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اس سے ان کی ہر دل عزیزی میں اضافہ ہوگا اور انھیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ صرف مسلمان فرقے کے ایک فرد نہیں ہیں بلکہ ہندوستان میں کثیر التعداد میں

ہندوروں کے لیے بھی جزوِ زندگی ہیں اور ان کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ ہمارے مشرقی یو۔پی میں بسنے والے غیر تعلیم یافتہ معصوم ہندوؤں کی اکثریت نہایت ایماندار اور محنتی اور وفاشعار ہے۔ ان سے ربط ضبط پیدا کرنے سے اپنے دائرہ عمل میں ایک عجیب بالیدگی اور وسعت کا احساس ہوتا ہے جو تجربہ ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ یہ تمام پروگرام اپنے آبائی مستقر یا خاندانی وطن ہی میں رہ کر پورا کیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ جاگیردارانہ دور کا کھویا ہوا وقار دوبارہ ہمارے قصبات میں واپس آجائے گا

علی گڑھ میں ہمارے طالب علم ایک عرصہ سے اس طرح زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے ہیں جیسے کسی جزیرے پر سکونت اختیار کیے ہوں۔ اطراف وجوانب سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں جس کی بنا پر ایک قسم کی کشیدگی اور مخاصمت کا احساس دلوں پر طاری رہتا ہے جو اکثر فرقہ وارانہ رنگ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ اس مقامی فضا کو غلطی سے ملک کی عام فضا سمجھ کر زیادہ تر طالب علم یونیورسٹی کے اندر ہی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا پھر بڑے شہروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ رویہ گمراہ کن اور حقیقت کے خلاف ہے اور ہمارے طالب علموں کو ملک کے مرکزی دھارے Main Stream سے دور رکھتا ہے۔ اگر ہمارے نوجوان اپنے آبائی ٹھکانوں پر جو تمام یو پی کے دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں، واپس جا کر اپنا کیریر بنانا شروع کریں تو انھیں علی گڑھ کی محدود زندگی سے نکل کر پورے ملک کے سماجی ارتعاش میں شامل ہونے کا موقع ملے گا۔ اور وہ تسخیر و تعمیر کے بے شمار موقعوں پر اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکیں گے۔ اس کا ایک بالواسطہ فائدہ یہ ہوگا کہ وہ قصبات و دیہات جو صدہا سال سے ان کا وطن تھے اور ان کے آبا و اجداد کے تصرف میں تھے غیر آباد و ویران ہونے سے بچ جائیں گے اور وہاں نئے سرے سے ان کا اثر و رسوخ قائم ہو جائے گا اور وہ بالادستی جو جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے انھیں حاصل تھی اب علم و ہنر کے ذریعہ عوامی ہر دلعزیزی کی شکل میں پیدا ہو جائے گی۔ مرزا غالب نے اپنی ایک مسلسل غزل میں اس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ آپ اگر ان شعروں پر غور کریں تو اُن میں آپ کے مستقبل کی زندہ و تابندہ بشارتیں نظر آئیں گی۔ غالب کہتے ہیں:

مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند

ترجمہ: ان اندھیری راتوں میں مجھے صبح کی خوشخبری دی ہے
شمع کو بجھا دیا اور سورج کا پتا دیا ہے۔

گہر از رایت شاہان عجم برچیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

(عجم کے بادشاہوں کے پرچم سے موتی توڑ لیے لیکن اُس کے
معاوضہ میں مجھے خزانہ برسانے والا قلم عنایت کیا)

افسر از تارک ترکان پشنگی بردند
بسخن ناصیۂ فرِ کیانم دادند

(پشنگ کی نسل کے ترکوں کے سر سے تاج لے لیا (اور اس کی
جگہ) میری شاعری کی پیشانی کو کیانی شان عطا کی)

گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند

(تاج سے موتی توڑ کر علم سے باندھ دیا۔ گویا ظاہر میں جو
چیز چھین لی پوشیدہ طور سے مجھے دے دی۔)

غالب اپنا سلسلۂ نسب تورانی بادشاہ پشنگ

اور افراسیاب سے جوڑا کرتے تھے۔ اپنے بزرگوں کی حکومت اور ان کا جاہ و جلال یاد کرکے خود کو تسلی دے رہے ہیں کہ غزانے ہم سے تخت و تاج لے کر علم و ہنر کی دولت عطا کی جو شاہی میراث سے کہیں بہتر ہے وہ اگر شمع کی مانند تھی تو علم و ہنر سورج کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ ظاہر میں جو چیز لے لی وہ پوشیدہ طور سے ہمیں دوسرے انداز میں عطا کر دی

غالب کی طرح ہمارے طالب علموں کو بھی اپنے ماضی کی شان و شوکت کا بدل اپنی محنت اور اپنے علم و ہنر کو سمجھنا چاہیے۔ ہمارے نوجوان، خاص طور سے اس عظیم الشان یونیورسٹی کے طالب علم، پوری قوم کی امیدوں کا مرکز اور اس کے مستقبل کی ضمانت ہیں ان کی یہ محدود زندگی جو یونیورسٹی سے نکل کر شہر کی ملازمت میں کھو جاتی ہے کسی طرح ان کے شایانِ شان نہیں انھیں پورے ملک کو اپنی جولانگاہ سمجھنا چاہیے اور اس کے سماج کے ہر گوشہ و قریہ کو اپنی تسخیر و تعمیر کا نشانہ بنانا چاہیے۔ نہ یہ کہ خود اپنے ہی آبائی مکانوں کو ویران کرکے دور افتادہ شہروں میں گوشۂ عافیت تلاش کریں۔ ان کی ترقی اپنے آبائی مرکز ہی میں قدم جمانے کے بعد ممکن ہو سکے گی اور اسے مضبوطی سے پکڑنے کے بعد ہی دور تر اور بلند تر مقاصد پر کمند ڈال سکتے ہیں۔ اس کا ذریعہ اور آلۂ کار علم کی روشنی، محنت کی عرق ریزی، وطن کی خدمت، اہلِ وطن سے محبت اور تعاون ہی ہو سکتا ہے۔ میرے کہنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ ہمارے طالب علم اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کو نہ حاصل کریں یا شہروں میں بود و باش نہ اختیار کریں۔ میرا کہنا صرف اس قدر ہے کہ اسے اپنا مستقل گھر نہ بنائیں۔

بقولِ فراق ؎

وہ کوچہ رو کشِ جنت ہو گھر ہے گھر پھر بھی

ہمارے طالب علموں کو اعلیٰ ملازمت سے جو فیض اور منفعت حاصل ہو اُسے اپنے آبائی گھر کے سجانے اور بڑھانے میں استعمال کریں اور زندگی کی شام اور کبر سنی کا خاتمہ ہونے پر وہیں مراجعت کریں۔ اس طرح اپنے ماضی اور اپنی روایات سے جڑے رہیں گے، اپنے کنبے اپنے معاشرے اور اپنے خاندان کو اکیسویں صدی کی آنے والی اندھادھند زندگی میں منتشر نہ ہونے دیں گے۔ ان کے گھر اور ان کے وطن میں نئی رونق اور چہکاہٹ پیدا ہو جائے گی اور وہ معاشرہ اور محفلیں پھر سے ظہور میں آئیں گی جو اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہمارے بزرگوں کا طرۂ امتیاز تھیں۔ اور وہ علم و ادب کے مرکز پھر جاگ اٹھیں گے جن پر شاہانِ تیموریہ فخر کرتے تھے۔

تمام خط و کتابت و ترسیل زر کے لیے

مدیر مسئول پندرہ روزہ تہذیب الاخلاق

صفدر منزل۔ تار منگلہ۔ اے ایم یو

علی گڑھ 202001 یاد رکھیں۔

مضامین صاف اور کاغذ کے صرف

ایک جانب تحریر کریں۔ تاکہ اغلاط

سے بچا جا سکے

ڈاکٹر ایس ایم وسیم
شعبۂ کامرس
اے ایم یو۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

قومی یک جہتی میں اس کا کردار

قومی یک جہتی (National Integration)

ایک ترقی پذیر جذبۂ اتحاد کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔ یہی جذبۂ باہمیت کی طرف لے جاتی ہے۔ میل جول کی زندگی پر مبنی مربوط رشتے قائم کرتی ہے اور اگر یہ جذبہ صادق ہو تو ایک فلاحی حکومت (WELFARE STATE) کے نشانوں کی تکمیل کا باعث بنتا ہے، جن کے اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی پہلو ہوتے ہیں۔ عقیدے اور اعمال کی منزل میں افراد میں پائے جانے والے خلوص کے اعتبار سے نتیجہ بھی برآمد ہوگا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہر طرح کی نابرابری کو دور کرنے کے لیے کوشش جاری رہنا چاہیے۔

ایک مختلف النوع سماجی، ثقافتی سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے کو جس میں مختلف زبانیں بھی رائج ہوں، اس بات کی اور بھی ضرورت ہے کہ وہاں قومی یک جہتی کا جذبہ بتدریج جڑ پکڑتا جائے۔ ایسے سماج میں تعلیمی ادارے ایک مربوط معاشرے کی تشکیل میں ایک بڑی حد تک معاون و مؤثر ہو سکتے ہیں۔ اس بات کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ مختلف طبقوں اور علاقوں سے آنے والے طلباء کی تعلیمی ضروریات کو پورا کر رہے ہوں۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھی ایک اہم کردار ادا کرتی آئی ہے، جہاں مختلف پس منظر اور طبقوں سے آنے والے طلبا آزادانہ تجسس، وسیع النظری اور پاک کرداری کا سبق سیکھتے آئے ہیں۔ سر سید احمد خاں اور اسی جذبے کے حامل دوسرے افراد کے الفاظ ہمارے کانوں میں گونجتے رہنا چاہئیں — ہمیں عزم مستقل اور جذبۂ پیہم سے کام لیتے رہنا چاہیے اگر کبھی کوئی کمی نظر آئے تو وجوہات کا پتہ لگانے کے لیے داخلی اور بیرونی وجوہات کا تجزیہ کرنا چاہیے اور پھر منزل کی طرف قدم بڑھا دینا چاہیے۔

علی گڑھ تحریک دراصل ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی بیداری کے لیے شروع کی گئی تھی۔ مولانا آزاد نے کہا تھا کہ :

" انیسویں صدی ہندوستان کے لیے اسی طرح تغیر کا دور تھا، جس طرح یہ مشرق کے دوسرے علاقوں کے لیے تھا...... ہندوستان کی پرانی مٹی کو نئے پیکر میں ڈھالا جا رہا تھا۔ جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق

ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ علی گڑھ تھا جہاں اصلاحی تحریک کی تشکیل ہوئی۔ یہ ان علامتوں میں سے تھا، جنھوں نے نئے ہندوستان کی تشکیل کی قیادت سنبھالی تھی۔"

اور اِس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مولانا نے بجا فرمایا تھا۔ کیوں کہ علی گڑھ میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو مرکز قائم کیا گیا تھا، وہ آج یونیورسٹی کی شکل میں طلبا اور اساتذہ کو بغیر کسی رنگ و نسل، مذہب اور علاقائی تعصب کے، خوش آمدید کہتا ہے۔

سرسیّد نے فرمایا تھا

"کالج میں ملنے والے وہ حقوق ان کے لیے ہیں جو اپنے کو مسلمان کہتے ہیں وہی [حقوق] بغیر کسی شرط کے مساوی طور سے ہندوؤں کے لیے بھی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی طرح کا فرق نہیں ہے۔ یہاں اِس کالج میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو وظائف پانے کا حق ہے اور دونوں ہی کے ساتھ اقامتی طلبا [Residential] ہونے کے لحاظ سے ایک طرح کا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنی دونوں آنکھوں کی طرح سمجھتا ہوں۔"

سرسیّد نے جو کہا تھا وہی کیا بھی۔ بیج ناتھ پرشاد جو ہندو تھے اسکول کے ماسٹر، مسٹر سڈونس (Mr Siddons) کی ماتحتی میں ماسٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اساتذہ فہرست میں سات میں سے دو ہندو تھے۔ بابو جیندرا چکرورتی اور پنڈت شیو شنکر شرما جو ریاضی اور سنسکرت پڑھاتے تھے۔ کالج کی

انتظامیہ میں ۲۲ میں سے ۶ غیر مسلم تھے۔ اسی طرح ۱۸۸۴ء میں ۲۶۷ طلبا، میں سے ۸۰ ہندو تھے۔ ۱۸۹۵ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۱۰۹ ہوگئی جب کہ کل طلبا، کی تعداد ۵۶۵ تھی۔ اس ادارے کے پہلے گریجویٹ تھے شری ایشوری پرشاد اور پہلے پوسٹ گریجویٹ تھے شری امبا پرشاد اس زمانہ میں بھی یہاں سنسکرت پڑھائی جاتی تھی۔ اس طرح یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے شروع کیے جانے والے اِس ادارے نے اپنے دروازے غیر مسلموں کے لیے ہمیشہ کھلے رکھے۔ آج بھی اعداد و شمار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ملک کے ایک اہم ادارے کی طرح پیش کرتے ہیں۔ آنجہانی جواہر لال نہرو نے سرسیّد کے اقدام کو سراہتے ہوئے کہا تھا

"سرسید کے اقدامات ....چھوٹے پیمانے پر ہونے کے باوجود دراصل صحیح اور انقلابی سمت میں تھے۔"

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طلبا کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے، جنھوں نے ہندوستان کی تعمیرِ نو میں نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے ۱۹۴۸ء میں وائس چانسلر کی حیثیت سے عہدہ سنبھالتے وقت کہا تھا

مجھے احساس ہے کہ یہ ادارہ ہندوستان کی قومی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرے گا۔ اگر مجھے اِس امر کا یقین نہ ہوتا تو میں جامعہ کے کام کو چھوڑ کر، جس سے میں ذہنی اور جذباتی طور سے وابستہ ہوں، یوں علی گڑھ نہ چلا آتا۔ اِس اقدام کے لیے میں نے اپنے کو اِس لیے

تیار کرلیا کہ مجھ پر یہ روشن ہے کہ یہاں
عظیم قومی اہمیت کے حامل کام انجام دیے
جانے کے مواقع ہیں — وہ کام جن کا
تعلق ہندوستانی نظریات اور ہندوستانی
تعلیم کے بنیادی اصولوں کی اساس سے
ہے [اور جن کا تعلق] جمہوری اور
غیر جانبدارانہ حکومت میں پلنے والی
ایک مظلوم قوم کی تعمیر سے ہے اور
وجن کا تعلق [۴ کروڑ مسلمان شہریوں
کے کردار اور حیثیت سے ہے. مختلف
النوع تہذیبوں کو یک جہتی عطا کرنے سے
ہے تاکہ ان کی نشو ونما کو اس طرح بڑھاوا
دیا جاسکے کہ ان میں سے ہر ایک تہذیب
علیحدہ علیحدہ چمکتی بھی رہے اور مل جل
کر کُل کو طاقت وحسن بھی عطا کرتی رہے
ایک صحت مند قومی زندگی کی تشکیل یقیناً
ایک اہم کام ہے۔ [بس] یہ ضروری ہے
کہ ہماری ساری طاقت اسی طرف صرف
کی جائے۔ علی گڑھ جس طرح قومی زندگی
کے پہلوؤں میں حصّہ لے گا، اس اعتبار
سے ہندوستان کی قومی زندگی میں مسلمانوں
کو جگہ ملے گی [اور] جس طرح علی گڑھ کو
ہندوستان برتے گا، اسی طرح سے،
ہاں اسی طرح سے ہماری قومی زندگی
کی مستقبل میں تشکیل ہوگی"۔
[انگریزی سے ترجمہ]
اس طرح یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے

کہ ہمیں ہر سطح پر مل جل کر قومی اہمیت کے کاموں میں
ہاتھ بٹاتے رہنا چاہیے۔ سر سید نے جنوری ۱۸۹۴ء
میں کیا خوب کہا تھا۔
"ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ ہم ایک قالب
وصحح بن کر یکسانیت سے کام کریں
اگر ہم متحد ہوں گے تو ہم ایک دوسرے
کی مدد کر سکیں گے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا
تو اس کا اثر ایک دوسرے کے خلاف،
دونوں کو تنزلی کی طرف لے
جائے گا"۔
بیشک قومی یک جہتی ہمیں ترقی کی
شاہراہ پر لے جاتی ہے۔
ہندوستان کی تہذیب ضم کرنے والی
رہی ہے جو کوئی بھی آیا، ہندوستانی معاشرے کا
حصّہ بن کر اسے ترقی کی طرف لے گیا۔
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طلبا، ملک
کے دور دراز علاقوں ہی سے نہیں آتے ہیں بلکہ
یہاں طلبا دوسرے ایشیائی اور افریقائی ممالک
سے بھی آتے ہیں۔ ایک ساتھ رہنے اور برتنے
سے انھیں بہت کچھ سیکھنا چاہیے۔
روشنی بڑھتی رہے، بڑھتی چلی جائے کہ
یہاں تک
چھا جائے یہ ساری زمین پر
اس کے میدانوں پر اس کے پہاڑوں پر

حکیم محمد حسین خاں شفا
جیل روڈ۔ رامپور۔

سرسیّد کی ایک غیر معروف کتاب

غالب، مولانا حالی، شبلی اور سرسیّد
وغیرہ کی خدمات علم و ادب کا بہت کچھ حصہ اور کارنامے ابھی
تشنۂ تحقیق ہیں۔ خاص طور سے اِن حضرات کے رامپور سے
تعلق پر ابھی خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔
نواب رامپور کے مشورے سے انگریزوں
نے سرسید احمد خاں کو اپریل ۱۸۵۸ء میں بجنور کی صدر امینی
سے ترقی دیکر مراد آباد میں صدر الصدور کا عہدہ دے دیا۔
مراد آباد میں سرسید کا قیام اپریل ۱۸۵۸ء سے ۱۲ مئی ۱۸۶۲ء
تک رہا۔ مگر اِس پانچ سالہ دور میں سرسیّد کی زندگی میں
انقلاب برپا ہوگیا تھا۔ انھوں نے روسائے رامپور کا ہم خیال
بنالیا جنہوں نے سرسیّد کی ہمیشہ تن من دھن سے مدد کی۔
سرسیّد نے مراد آباد میں تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ
عملی طور پر ایک مدرسہ کی بنیاد بھی رکھی جس کے بارے میں
مولانا حالی لکھتے ہیں۔

"۱۸۵۹ء میں سرسید نے ایک مدرسہ مراد آباد
میں قائم کیا جب اسٹریچی صاحب وہاں کلکٹر ہوکر آئے،
تو انھوں نے ایک تحصیلی مدرسہ قائم کیا۔ اِس تحصیلی
مدرسہ میں اِس فارسی مدرسہ کے طلبا بھی داخل ہوگئے تھے
اِن مدرسہ کے بچوں کے واسطے سرسید نے خود ایک یا پانچ
ورقی رسالہ کتاب فقرات کے نام سے لکھا۔ دراصل یہ
پند ہیں یعنی ایک "نمونا صحانہ فقرے۔ اِس موضوع پر

صد پند لقمان بہت مشہور رہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کا بھی ایک
رسالہ ہے۔ چونکہ نہ تو صد پند سرسیّد کی تصنیف ہے
نہ تالیف۔ بلکہ یہ ایک انتخاب ہے جو چھوٹے بچوں کے واسطے
مرتب کیا گیا ہے۔ غالبًا اِس وجہ سے حالی نے اسے قابلِ
ذکر نہیں سمجھا۔ اہل علم اور خاص طور پر کتب خانوں سے
تعلق رکھنے والے اِس کتاب سے واقف ہیں۔ میں نے
متعدد اہل علم سے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ اس کتاب پر
سنہ طباعت تو ہے نہیں لیکن ٹائیٹل سے عہد کا خود بخود
اندازہ ہوجاتا ہے۔ سرسید کی اس کتاب کے بارے میں
جناب ضیاء الدین لاہوری کا ایک مضمون ہماری زبان
نئی دہلی ۲۲ مئی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ فاضل مضمون
نگار لکھتے ہیں

" انڈیا آفس لائبریری لندن میں سرسیدکی
ایک فارسی درسی کتاب دستیاب ہوئی ہے۔ صرف آٹھ
صفحات کی اِس تصنیف کا نام " الفقرات " ہے سرورق
پر سرسیّد کے نام کے ساتھ سی ایس آئی کے الفاظ ہیں
کتاب پر سنہ طباعت موجود نہیں۔ البتہ لائبریری کے
کیٹلاگ میں اسے مطبوعہ میرٹھ بتایا گیا ہے۔ ضیاء صاحب
کے بیان سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جس نسخہ لندن کا
تعارف کرایا ہے وہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ ہمارے پیش
نظر اس وقت جو نسخہ رامپور میں ہے وہ پہلا ایڈیشن

ہے۔ اس لیے ان دونوں میں یہ فرق موجود ہے۔

نسخۂ لندن تعداد صفحات ۸

ٹائٹل ہو المستعان

برائے مبتدیان فارسی زبان عبارت سلیس

ومضامین نفیس۔ کتاب الفقرات

مولفہ مولوی احمد خاں صاحب بہادر سی ایس آئی

درمطبع ضیائی طبع شد۔

نسخۂ رامپور تعداد صفحات ۹

کتاب الفقرات برائے تعلیم طالبعلمان پنچایتی

مدرسہ مرادآباد۔

مولفہ سید احمد خاں صدر الصدور ضلع مرادآباد

طبع شد۔

دونوں ایڈیشنوں کے متنوں میں بھی جزوی فرق ہے ابتدا کا جو حصہ ضیاء صاحب نے نقل کیا ہے' نسخۂ رامپور میں بھی وہی ہے۔ البتہ ضیاء صاحب کے بیان سے بعض اختلافات بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں " سرورق کے آخری صفحہ پر موٹے حروف اور نفیس کتابت میں یہ دو اشعار درج ہیں۔ درنظم سرتن ہیمبراند۔ قول است کہ جملگی انند

فردوسی و انوری و سعدی۔ ہرچند کہ لانبی بعدی

نسخۂ رامپور میں یہ عبارت نہیں ہے۔ مارچ ۱۹۸۱ء کو راقم الحروف کو ایک سیمینار میں شرکت کا موقع ملا تھا۔ موضوع تھا۔ تاریخ سند کے فارسی ماخذ۔ دوران گفتگو جناب پروفیسر اقبال انصاری سے سرسید کے اس رسالہ اور ریاست رامپور اور سرسید سے متعلق کچھ کاغذات کا تذکرہ آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تمام مواد کو جمع کر کے شائع کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

بہ ظاہر یہ کتاب سو ناصحانہ فقروں پر مشتمل ہے، جس کو صدپند سرسید کہا جا سکتا ہے۔ لیکن سرسید کی تصانیف میں اس کو کئی اعتبار سے بہت اہمیت حاصل ہے۔

قیام مرادآباد کے دوران سرسید نے ایک جامع بنیادی تعلیم کا نقشہ بنایا تھا جو مدرسۃ العلوم کے لیے اچھے طالب علم فراہم کرنے کے لیے ضروری تھا۔ اس سلسلہ میں نواب رامپور کی حمایت سے سرسید نے اصلاحی مکاتیب کی ایک مہم چلائی اور اچھے طالب علموں کے لیے وظائف کا اعلان کیا گیا۔ پہلا مدرسہ سرسید نے مرادآباد میں قائم کیا اور پہلی درسی کتاب خود مرتب کی جو تمام تر تعمیر سیرت و اخلاق سے متعلق اقوال پر مشتمل ہے۔ اس سے یہ بھی انداز ہوتا ہے کہ سرسید کس قسم کے طالب علم بنانا چاہتے تھے

اس اہم کتاب کے سرسید کی زندگی میں دو ایڈیشن شائع ہوئے جس کا پہلا ایڈیشن رامپور میں ہے جس کا متن راقم نے شائع کر دیا ہے۔ دوسرا ایڈیشن لندن میں ہے۔ اگر قارئین تہذیب الاخلاق نے پسند کیا تو آئندہ کسی شمارہ میں اس پوری کتاب کا اردو ترجمہ نظر قارئین کر دیا جائے گا۔ جس سے سرسید کے مطلوبہ طالب علم اور پسندیدہ نوجوان کا اندازہ ہو جائے گا۔

دراصل سرسید بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھے اور تہذیب الاخلاق کو اولیت دیتے تھے۔ ان کا مقصد باحمیت با اخلاق' اسلامی اور مشرقی تہذیب اور جدید عصری تعلیم سے آراستہ نوجوان نسل کی تخلیق کرنا تھی۔ سرسید کا یہ خواب کس حد تک شرمندۂ تعبیر ہو یہ ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔ بہرحال یہ کتاب اعلیٰ اخلاقی تعلیم پر مشتمل ہے۔ عموماً کتب خانوں میں اس قسم کی کتابیں آب زر سے لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نوٹس داخلہ نمبر ۷

سیشن ـــــ ۱۹۸۲-۸۳ء

۸۳-۱۹۸۲ء کے سیشن کے لیے مندرجہ ذیل کورسیز میں اہل اور مستحق امیدواروں سے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں۔ ہر طور سے مکمل فارموں کی ایڈمیشن آفس میں وصولیابی کی آخری تاریخ ۲۳ر اکتوبر سنہ۱۹۸۲ء ہے۔

۱۔ ایم۔اے، ایم ایس سی، ایم کام۔
۲۔ ایل۔ایل بی، ایل ایل ایم۔
۳۔ بیچلر آف تھیالوجی۔ (بی ٹی ایچ)، ماسٹر آف تھیالوجی (ایم ٹی ایچ)
۴۔ ڈپلوما ان اسٹینو ٹائپنگ۔
۵۔ ڈپلوما ان سیکریٹریل ورکس۔
۶۔ ڈپلوما ان ڈرافٹنگ اینڈ ڈزائننگ

مندرجہ ذیل پروفیشنل کورسیز میں ڈپلوما

ا۔ الیکٹرونک ڈیٹا پروسیسنگ مشین آپریشن۔
ب۔ میوزیولوجی
ج۔ پیسٹ منیجمنٹ
د۔ کمپنی لا اینڈ لیبر ریشن
س۔ لیباریٹری ٹیکنالوجی (فزیکل اینڈ کیمیکل)

—۱۹۸۱ء

(س) جیم میٹنگ اینڈ آرٹ آف لیپڈری

(ص) میڈیکل لیبوریٹری ٹکنالوجی (ریڈیالوجی)

(ط) جرنلزم

(ع) اپلائڈ آرٹ

ف انسٹرومنٹ ٹکنالوجی

ق کارٹوگرافی

ک میڈیکل لیب ٹکنالوجی

(ل) آرتھوپٹکس۔

م پیسی کلچر۔

کورسیز، قابل ادا فیس، درخواست بھیجنے کے قواعد اور طریقۂ کار وغیرہ کے متعلق جملہ معلومات "گائڈ ٹو ایڈمیشن" میں دی گئی ہیں۔ درخواست فارم اور گائڈ ٹو ایڈمیشن کی کاپیاں اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۲۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تین روپیہ کی نقد ادائیگی یا فائنس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا تین روپیہ کے کراسڈ پوسٹل آرڈر بھیجے جانے پر طلب کیے جاسکتے ہیں۔ فارموں کے لیے جو درخواستیں بھیجی جائیں ان میں واضح طور پر بیان کیا جائے کہ کس کورس میں داخلے کے لیے درخواست فارم مطلوب ہیں۔

یونیورسٹی سے متعلق داخلی طلبا۔ اپنے متعلقہ پرووسٹ سے فارم حاصل کرسکتے ہیں۔ جو امیدوار بذریعہ ڈاک درخواست فارم حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں ان کے لیے ضروری ہے کہ ۱۲ × ۲۰ سینٹی میٹر کے لفافہ پر ۹۰-۱ روپیہ کے ٹکٹ چسپاں کرکے اور اس پر اپنا پتہ لکھ کر روانہ کردیں اور اگر درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک مطلوب ہوں تو خود کا پتہ تحریر کیے ہوئے لفافہ کے ہمراہ 45-4 روپیہ کے ٹکٹ چسپاں کیے جائیں۔ باہری امیدواروں کو چاہیے کہ ہر لحاظ سے مکمل درخواست فارم پانچ روپیہ فی کورس کے حساب سے بحیثیت رجسٹریشن فیس جو فائنس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو اس طرح ارسال کریں کہ وہ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس ۵۲ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ کے دفتر میں ۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۱ء کو شام پانچ بجے تک پہنچ جائے۔ جس کورس میں داخلہ مطلوب ہو اس کا نام لفافہ کی پیشانی پر تحریر فرمائیں۔ یونیورسٹی کے داخلی طلبا، کی ہر لحاظ سے مکمل درخواستیں مقررہ فیس اور دستاویزات کے ساتھ متعلقہ پرووسٹ آفس میں اس تاریخ سے دو روز قبل جمع کردیں جو ایڈمیشن آفس میں وصول ہونے کی آخری تاریخ ہے نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں کو قبول نہیں کیا جائے گا اور اس طرح کی درخواستوں کے سلسلہ میں مزید کوئی مراسلت نہیں کی جائے گی

امین محی الدین

کنٹرولر آف اکیزامینشن اینڈ ایڈمیشنز

کرو۔ انسانیت کے ٹکڑے جغرافیہ یا رنگ و نسل کی بنا پر نہ ہونے دو۔ اسے افضل و اعلیٰ، ارذل و اسفل کے خانوں میں نہ بانٹو۔ تمہارا لطف، تمہاری ہمدردی اسی طرح عام ہونی چاہیے جیسے ہوا اور پانی حرارت اور روشنی۔ محنت کرو اور پھل کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو۔ قناعت کا مطلب ہے ضرورتوں کو نہ بڑھاؤ۔ توکل کا مطلب ہے خدا کے مسبب الاسباب اور کارساز ہونے پر یقین رکھو۔ اپنے قویٰ اور اپنی صلاحیتوں کو کماحقہٗ استعمال نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے توکل نہیں۔ توکل اور قناعت دونوں کا مفہوم ہے اکلِ حلال کے لیے محنت اور کوشش۔ ان تھک محنت اور لگاتار کوشش۔ اور نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دینا۔ اگر کوشش کامیاب نہیں ہوئی تو کبیدہ خاطر اور شکوہ سنج نہ ہو۔ مایوسی سے دامن بچانا کہ مایوسی کفر ہے۔ اس کا مطلب ہے خدا کی رحمت سے انکار۔ ہر فرد اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ اس کے اعمال کا جواب کوئی دوسرا نہیں دے گا خود اسے دینا پڑے گا۔ انتہاپسندی، شدت اور سختی سے بچو۔ اعتدال اور سلامت روی اختیار کرو۔ یاوہ گوئی اور الزام تراشی اور تضیع وقت سے احتراز لازم ہے۔ پیٹھ پیچھے کسی کو برا نہ کہو۔ ظلم اور بے دردی سے بچو۔ رحم اور نرمی اختیار کرو لیکن حق گوئی اور باطل کی مدافعت کے سلسلہ میں کسی خوف یا تامل کو راہ نہ دو۔ ....

سید حامد وائس چانسلر اے ایم یو

(خطبۂ افتتاحیہ دینی تعلیمی کانفرنس منعقدہ بہرائچ سے ایک اقتباس)

۱۔ گجرات پبلک سروس کمیشن کے ذریعے ۱۱۰۰ (گیارہ سو) اسسٹنٹ انجینیر (سول) کا تقرر ہونا ہے۔ جس کے لیے امیدوار کو کسی بھی ایسے ادارے سے جو حکومت ہند سے تسلیم شدہ ہو بی۔ای کا امتحان پاس ہونا ضروری ہے۔ یا اس کے مساوی کوئی امتحان جو کہ صوبائی حکومت گجرات سے تسلیم شدہ ہو۔ امیدوار کی عمر ۲۸ سال سے زائد نہیں ہونا چاہیے۔ مکمل درخواستیں دفتر میں پہنچنے کی آخری تاریخ ۴؍اکتوبر ۸۲ ہے۔ تفصیلات کے لیے امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۴؍ستمبر ۸۲ء ضرور ملاحظہ کیجیے۔

۲۔ اسٹی[redacted]آف انڈیا کو ۵۰۰ (پانچ سو) جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔ عہدے کا نام پروبیشنری افسر ہے ۲۱ سے ۲۸ سال کے درمیان جو امیدوار گریجویٹ ہیں وہ اس میں درخواست دے سکتے ہیں۔ دیے ہوئے پتہ پر مکمل درخواست پہنچنے کی آخری تاریخ ۱۱؍اکتوبر ۸۲ء ہے۔ درخواست کے فارم اور تفصیلات کے لیے ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۸؍ستمبر ۸۲ء ضرور دیکھیے

۳۔ پبلک سروس کمیشن اترپردیش کے تحت یو۔پی سکریٹریٹ کے پرسنل اسسٹنٹ اور یو۔پی ودھان سبھا سکریٹریٹ کے لیے اسٹینوگرافر/پرسنل اسسٹنٹ گریڈ سکنڈ کی ۵۵ جگہوں کے لیے مقابلہ کا امتحان ماہ دسمبر ۸۲ء میں الٰہ آباد میں ہوگا۔ امیدوار کی عمر ۳۰ سال سے زائد نہیں ہونا چاہیے اور یو۔پی بورڈ کا انٹرمیڈیٹ پاس ہونا چاہیے، ساتھ ہی ساتھ ہندی پڑھنے اور لکھنے کی وہندی، انگریزی کی اسٹینوگرافی میں ۸۰ سے ۱۰۰ الفاظ فی منٹ کی رفتار ہونا چاہیے۔ کمیشن میں درخواست پہنچنے کی آخری تاریخ ۱۸؍اکتوبر ۸۲ء ہے۔ تفصیل کے لیے قومی آواز لکھنؤ مورخہ ۴؍ستمبر ۸۲ء ملاحظہ کریں اور ٹائمز آف انڈیا دہلی مورخہ ۱۱؍ستمبر ۸۲ء میں بھی یہ اشتہار شائع ہوا ہے۔

۴۔ کمبائنڈ میڈیکل سروسز امتحان برائے ۱۹۸۳ء کا امتحان یو۔پی، ایس، سی کے تحت ہوگا۔ امیدوار کو کم سے کم حکومت ہند کے کسی ادارے سے ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری حاصل ہونی چاہیے اور ۳۰ سال سے کم عمر ہونا چاہیے۔ مکمل درخواستیں دفتر میں پہنچنے کی آخری تاریخ ۸؍نومبر ۸۲ء ہے۔ تفصیل کے لیے امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۲۵؍ستمبر ۸۲ء ملاحظہ کریں۔

ایجوکیشنل بک ہاؤس
[illegible]

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد نمبر ۱ — یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء — شمارہ نمبر ۱

"میں ایک جاہل آدمی ہوں نہ مولوی ہوں، نہ مفتی، نہ قاضی اور نہ واعظ۔ نہ میری یہ خواہش ہے کہ کوئی شخص گو وہ میرا کیسا ہی دوست ہو، میرے خیالات کی پیروی کرے۔ میں رسولوں کے سوا کسی شخص کا ایسا منصب نہیں سمجھتا کہ ان باتوں میں جو خدا اور بندوں کے درمیان دلی اور روحانی اس سے متعلق ہیں اور جن کو مذہب کہتے ہیں۔ وہ یہ خواہش کرے کہ لوگ اُس کی پیروی کریں۔ یہ منصب رسولوں کا تھا اور آخر کو جناب رسولِ خدا احمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر، جن کا ازلی مذہب خدا ابدالآباد تک قائم رکھے اور ضرور قائم رکھے گا۔ کیونکہ جیسا وہ ازلی ہے ابدی ہے، ختم ہوگیا ...."

سید احمد

(اسلام پر ایک تقریر)

اندلس اور صلیبی محاربات کے متعلق دو تاریخیں انگریزی میں لکھوانے کا خیال

دو بہت بڑے واقعے دنیا میں ہوئے ہیں۔ جن سے مسلمانوں کو نہایت بڑا تعلق ہے۔

ایک واقعہ فتح اندلس کا ہے جس میں سات سو برس تک مسلمانوں کی انگریزوں پر یعنی عیسائیوں پر حکومت رہی۔ اور جو انصاف اور تعلیم و تربیت مسلمانوں نے اس قوم کی کی عجیب اور قابلِ فخر ہے۔

دوسرا واقعہ کروسیڈ کا ہے یعنی آٹھ لڑائیاں جو مسلمانوں اور تمام عیسائی قوموں سے بیت المقدس پر ہوئیں۔ میں نے اس عالم صاحب سے کہا ہے کہ ان دونوں واقعوں کی دو دو مختصر تاریخیں وہ لکھ دیں اور ان کی رائے میں جو سچ اور انصاف ہو اور جس کا قصور اس میں ان کی منصفانہ رائے میں ہو سب لکھیں اور چونکہ وہ عالم صاحب نہایت منصف اور بہت بڑا عالم ہے اور جرمن، فرنچ، لیٹن، گریک زبان جانتا ہے اور سب مصنفوں کی کتابیں پڑھ کر رائے قائم کرتا ہے، صرف انگریزی کتابوں پر اس کو بھروسہ نہیں ہے اس لیے امید ہے کہ جیسی بلا تعصب اس نے یہ کتاب لکھی ہے ویسی ہی وہ بھی لکھے گا....."

اقتباس از

مسافرانِ لندن

مرتبہ : سر سیّد احمد خاں

شائع کردہ : مجلس ترقی ادب لاہور

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

جلد نمبر ا شمارہ نمبر ۱
یکم اکتوبر ۱۹۸۲ء

مدیر: سید حامد
وائس چانسلر۔ اے ایم یو۔

مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد

قیمت فی پرچہ — ایک روپیہ
ششماہی — ۱۱ روپے
سالانہ — ۲۰ روپے

غیر ممالک سے
فی پرچہ — ایک ڈالر
سالانہ — ۱۵ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتا
مدیر مسئول تہذیب الاخلاق
صفدر منزل، تار بنگلہ
اے ایم یو علی گڑھ ۲۰۰۲۰۲

جوئے خون

تہذیب الاخلاق کے صفحات میں یہودیوں کی حکومت کے بارے میں ایک مضمون شائع ہو چکا ہے۔ قارئین کی نظروں سے ضرور گزرا ہوگا۔ اس مضمون میں صہیونیت کی پوری تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

فلسطین میں یہودیوں کو آباد کرنے کا جواز یہ بیان کر کے حاصل کیا گیا تھا کہ وہ علاقہ غیر آباد ہے۔ عرب جو وہاں نظر آتے ہیں وہ اس علاقے کے باشندے نہیں ہیں۔ بس عارضی طور پر وہاں آتے جاتے ہیں۔ یہودی اگر وہاں بسا دیے جائیں تو نہ صرف وہ غیر آباد علاقہ آباد ہو جائے گا، یہودی اپنے علم و دولت سے اس علاقہ کو سرسبز و شاداب بنا دیں گے۔

جب یہودیوں کو وہاں آباد کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو عربوں نے احتجاج کیا۔ اور عربوں ہی نے نہیں پوری دنیائے اسلام نے اس اقدام کے خلاف آواز بلند کی اور پھر عربوں اور اسرائیلوں میں جھڑپیں ہونا شروع ہو گئیں۔ یورپ کی حکومتوں نے جن کے مفادات یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنے سے وابستہ تھے اسرائیل کی مدد کی۔ اس روز سے آج تک یہ ممالک اسرائیل کی مدد کر رہے ہیں اور اب امریکہ اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔

اس نصف صدی میں اسرائیل نے ترقی کی ہے اور فوجی اعتبار سے اسرائیلی حکومت بہت طاقتور ہو چکی ہے۔ اب کوشش یہ ہے کہ پہلے وہ اس گروہ کو ختم کر دے جو فلسطین کا باشندہ ہونے کا دعویدار ہے اور اسرائیل کا مقابلہ کرتا ہے اور پھر مغربی ایشیا کا رخ کرے۔ شام و اردن کو ختم کرے اور پھر دولت مند عرب ممالک سے اپنے اقتدار کا لوہا منوائے

عربوں کی کثیر دولت امریکہ اور انگلستان کے بنکوں میں جمع ہے اور کارخانوں میں لگی ہوئی ہے۔ انگلستان اور امریکہ گو عربوں کی دولت سے خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن ان کو یہ ڈر بھی ہے کہ کہیں عرب انگلستان اور امریکہ کی اقتصادی حیثیت پر اثر انداز ہونا شروع نہ کریں اس لیے قبل اس کے کہ وہ وقت آئے اسرائیل عربوں کی سرکوبی کر چکا ہو۔

اسرائیل کی افواج آج بیروت میں ہیں۔ مغربی بیروت ان کے قبضہ میں ہے۔ دائیں بازو کی عیسائی افواج کو اسرائیل کی حمایت حاصل ہے۔ وہ اب آزادی کے ساتھ مسلمانوں پر خنجر چلا رہی ہے۔ بیروت کے مسلمان اور فلسطین کے مہاجرین اس کا شکار ہیں اور قاتل کا خنجر بچے، بوڑھے، جوان، عورت اور مرد میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ اور پوری آزادی سے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ اسرائیل کے سامنے عہد وسطیٰ کی مسلمانوں کی فتوحات ہیں۔ آج اس کو موقع ملا ہے کہ وہ مسلمانوں سے بدلہ لے اور عرب ممالک کو سبق سکھائے۔

مسلمان آج سے نہیں دو سو سال سے یورپ کی صنعتی سرمایہ داری تہذیب سے دوچار ہیں۔ یورپ کی علمی ترقیات کا وہ مشاہدہ کر رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ دو سو سال کے اس طویل دور میں انھوں نے یورپ سے سیکھا کیا ہے۔ کونسا مسلم ملک ہے جس نے جدید علوم و افکار سے استفادہ کیا ہو۔ جہاں ہر فرد و بشر نہیں ملک کی آدھی آبادی ہی پڑھی لکھی ہو۔

مسلمان یورپ کی معاشرت سے متاثر ہوئے اور یورپ کی عریانی نے ان کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ اور اسی کو وہ ترقی کا منتہا سمجھے۔ انھوں نے وہ سب اختیار کیا جس سے ان کو ان کے دین نے روکا تھا۔ اور اس کی طرف سے منہ پھیر لیا جس کے حصول کو ان پر فرض قرار دیا تھا

اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے اور وقت کا فرمان صادر ہونے والا ہے۔ اب بھی اگر وہ بیدار ہو جائیں تو عجب نہیں کہ قدرت ان کو بچا لے۔ دیکھیے مستقبل کے دھندلکے سے کیا صورت ابھرتی ہے۔

(ق۔ م۔ ا)

بقیہ مضمون "رشید احمد صدیقی کے عہد کا علی گڑھ" متعلقہ صفحہ

...ن ہیرا پھیری اور ہڑ گڑ میں کچھ گم بھی ہو جاتا کچھ بٹے کھاتے میں آ جاتا۔ جمعہ کو کالج جاتا۔ ہر لڑکا بجائے اس کے کہ کپڑوں پر ٹوٹتا دور ہی سے پکارتا۔ اکیلے اکیلے لڑکی کی شادی کر لی اور ...م کو نہیں بلایا۔ سب کو سلام کرتا کہتا۔ میاں آپ کہاں جاتے۔ آپ کے پڑھنے لکھنے میں ہرج ہوتا۔ آپ کے اقبال سے سب کام بن گیا۔ سب کے سب اشراف تھے۔ کہتے انکو ہم ...دوست نہیں میلے کپڑے چارپائی کے نیچے سے تکیے کا غلاف اور چادر بستر سے اتار لینا دھلے کپڑے بکس میں رکھ دینا۔ چابی تکیے کے نیچے ہوگی۔ بکس بند کر کے کنجی دے جاتا ...کو کیا خبر کون سے اور کتنے کپڑے لے گیا اور کیا واپس آیا۔ کبھی یاد آ گیا تو پوچھ لیتے انکو فلاں فلاں کپڑے نہیں ملتے۔ میں کہہ دیتا۔ حضور وہ لڑکی کی شادی نہ تھی شاید کچھ ...ادھر ادھر ہو گیا۔ کہتے ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ یاد نہیں رہا۔ اور ہاں تم نے ہم کو نہیں بلایا۔ میرا یہ بہانا اور اُن کا یہ جواب کچھ دن رہتا پھر ختم ہو جاتا۔

کالج میں کرکٹ کی دھوم تھی۔ ایک دفعہ کپتان صاحب نے گھاٹ پر سے بلوا بھیجا۔ کہنے لگے "انکو دہلی سے بے کچھ کھیلنے والے آ گئے ہیں ہم لوگوں کو وقت نہیں ہے ...ن ان کو میچ کھلائے بغیر واپس نہیں کیا جا سکتا۔ یہ میچ کالج کے بیرے کھیلیں گے۔ کوٹ پتلون قمیص وغیرہ کی ضرورت ہوگی۔ بیروں کی ٹیم کو یونیفارم مہیا کرو کل ایسے ...کو میں سب ٹھیک دیکھوں۔ کپتان صاحب کا یہ جنرلی حکم پورا کیا گیا۔ ٹیم کھیلی اور جیت ہو گئی۔ کپتان صاحب نے سب کو دعوت دی اور آخر میں بھرے مجمع میں کہا "انکو شکریہ"

غرض اس عہد کی کتنی باتیں ہیں۔ زمانہ گزر گیا علی گڑھ کے در و دیوار آشنا ہیں اب بھی بُرے بھلے ہم سب ٹریڈیشنوں کو یاد کر لیتے ہیں اور کبھی کبھار اُن کی ...ک بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ رشید صاحب کی تحریروں میں ایسی کتنی یادیں بکھری ہوئی ہیں۔ آج بھی لڑکے ہوسٹلوں میں ان کی تلاوت کرتے اور سر دھنتے ہیں ...نتی ہوسٹلوں میں جلسے بھی ہوتے ہیں ان روایات کی بازخوانی ہوتی ہے اور حسرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ ہم اپنے بزرگوں کی روایات کو پھر تازہ کریں گے کہ علی گڑھ سچ پوچھیے تو ان ہی روایات کا دوسرا نام ہے۔

سید حامد صاحب
وائس چانسلر

اُٹھائے کچھ ورق لالہ نے.....

حضرت امیر خسروؒ کے عرس کے موقع پر خواجہ حسن ثانی نظامی دوسری تقریبات کے علاوہ، ایک ادبی محفل بھی برپا کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ اس بار صدارت میں کروں چنانچہ بیک وقت بغلیں اور کتابیں جھانکنا شروع کردیں۔ مولانا آزاد لائبریری سے امیر خسروؒ کی مثنویاں نکلوائیں۔ خیال آیا کہ انگریزی ادب کی چند طویل نظمیں بھی پڑھی جائیں جو اس دور کے قریب لکھی گئی ہوں۔ جیوفرے چاسر کی حیثیت انگریزی نظم کے باوا آدم کی ہے۔ خسرو اور چاسر کے درمیان تقریباً ایک صدی کا فاصلہ ہے۔ "کینٹربری کی کہانیاں" (CANTER-BURY TALES) چاسر کی سب سے مشہور اور مقبول طویل نظم ہے۔ نظم کی ساخت سادہ سی ہے۔ کینٹربری کی زیارت کے لیے قافلہ روانہ ہو رہا ہے۔ مسافر سفر کو بہلانے کے لیے طے کرتے ہیں کہ اُن میں سے ہر ایک راہ میں دو کہانیاں سنائے گا۔ زائرین عمر، عادات، کردار، اطوار، افتادِ طبع، پیشہ، مشاغل، حیثیت اور تجربات کے لحاظ سے رنگا رنگ ہیں۔ شاعر نے ان کے کردار کی عکاسی میں کردار نگاری اور داستان گوئی کی آمیزش اور آویزش سے ایک جیتا جاگتا نگارخانہ، ایک چلتی پھرتی ہنستی بولتی دنیا پیدا کردی ہے۔ انگریزی ادب میں اس پایہ کی خلاقی صرف ایک اور فنکار کے حصہ میں آئی اُس کا نام شیکسپیئر تھا۔

"کینٹربری کی کہانیاں" کی ورق گردانی کے بعد خیال آیا کہ خسرو کی عشقیہ مثنویوں کی ردیف میں چاسر کی طویل عشقیہ نظم Troilus & Criseyde کا مطالعہ زیادہ برمحل ہوگا۔ اس کتاب کو دیکھنا شروع کیا بلکہ چاسر پر ایک کتاب میں اِس طویل نظم سے متعلق تبصرہ کو۔ اِس نظم میں کرداروں کی جو دلنواز اور معنیٰ خیز تصویر کشی چاسر نے کی ہے اور جس طرح کرداروں کا باہم ردّعمل اور ارتقاء دکھایا ہے اور کردار اور داستان میں جو ربط باہم پیدا کیا ہے اس کی مثال فارسی اور اُردو مثنویوں میں نہیں ملتی۔

قارئین حیران ہوں گے کہ ان سطور کا عنوان سے کیا تعلق۔ واقعی تمہید اتنی ہی طویل ہوگئی جتنی ہم میں سے اکثر ہندوستانی عموماً گفتگو کے دوران روا رکھتے ہیں۔ نفسِ مضمون کی دُور دُور تک آہٹ نہیں ملتی۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو صاحب آپ سے ملنے کسی غرض سے آئے ہیں وہ دنیا اور ملک و ملّت کے بہت سے مسائل پر تبصرہ کرنے اور آپ کے کام کے متعلق ناخواستہ مشورہ کا آپ پر احسان رکھنے کے بعد برسرِ مطلب آتے ہیں اور جو مقصد دراصل ان کی نشانِ منزل تھا اس کا ذکر اٹھتے اٹھتے اور چلتے ہوئے اِس انداز سے کرتے ہیں جیسے وہ فروعی اور ضمنی بات انھیں اتفاقاً یاد آگئی ہو۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اس فریب سے کیا حاصل۔ وہ دھوکا کسے دے رہے ہیں؟ اس شخص کو جس کا قیمتی وقت انھوں نے طوالت تمہید کی آڑ میں برباد کیا یا اپنی ذات کو جو دوسروں کو ناحق بے وقوف سمجھنے پر تُلی ہوتی ہے۔ اِن تمہید سازوں

کو یہ نہیں معلوم کہ ان کے جانے کے بعد ان کے مخاطب کے
دل سے دھواں اُٹھتا ہے اور اس کی زبان کے سرے پر وہ
الفاظ تلملاتے ہیں جو اگر ادا ہو جائیں تو بلوے کو جنم دے دیں،
اور شائستگی کو پیغام مرگ۔

الغرض تمہید سے حذر اُولیٰ۔ اُن دونوں کتابوں کو
کھولنے کے بعد زیادہ دور نہ جا سکا تھا کہ راستہ کو کٹا ہوا
پایا۔ ایک بہت چوڑی کھائی نظر آئی جسے پار کرنا ممکن نہ تھا۔ یعنی
پڑھنے والوں نے دونوں کتابوں میں سے بہت سے ورق
پھاڑ لیے تھے۔ اب کیجیے آپ جو کر سکتے ہوں۔ پھاڑنے
والے نے یہ نہیں سوچا کہ ان اوراق کا لبِ لباب قلم بند کیا
جا سکتا تھا۔ اور اگر دماغ کو محنت کے لیے آمادہ کرنا ممکن
نہ تھا تو ان اوراق کو نقل کرنے میں کیا دشواری تھی لیکن اس
عہد کے طالب علم نے وہ راہ اختیار کی جو بظاہر آسائش کی راہ
تھی لیکن دراصل یہ راستہ بے حسی، خود غرضی، چوری، کج خلقی،
اور بربادی کا راستہ ہے۔

علم کی خدمت اور اشاعت کا کام کلاس
روم سے زیادہ لائبریری انجام دیتی ہے۔ انسانی آگاہی اور
بصیرت کے دریا کو کوزہ میں بند کرنا لائبریری کے سوا کسی
دوسرے کے بس کی بات نہیں۔ ترقی کے سارے اشاریوں
کو تھوڑی دیر کے لیے بھلا دیجیے، صرف یہ دیکھنے کی کوشش
کیجیے کہ آبادی اور کتب خانوں اور ان کے استعمال
کا تناسب کیا ہے۔ پتہ چل جائے گا کہ وہ شہر یا ملک کس
حد تک ترقی یافتہ ہے اور مزید ترقی کے کیا امکانات رکھتا ہے۔

کتاب سے ورق پھاڑنے والے
ظالم اور جاہل ہیں۔ اُن پر علم کے قتل کرنے کا الزام عاید
ہوتا ہے۔ وہ روشنی کے دشمن اور اندھیرے کے دوست
ہیں، وہ بصارت اور بصیرت کا خون کرتے ہیں، گوشت
سے ناخن کو جدا کرنا ان کا محبوب شغل ہے۔ کتاب کی وحدت
کو پارہ پارہ کر کے وہ لذت اندوز ہوتے ہیں۔ کتاب کی سالمیت
کو ٹکڑے ٹکڑے وہ مزے لے لے کر کرتے ہیں۔ وہ
محسن کش اور علم دشمن ہیں۔ ان کی نگاہ میں علم کی چنداں
وقعت نہیں۔ کتابوں پر مجرمانہ حملہ کرنے والے طہارت اور
پاکیزگی سے روگرداں ہیں۔ یہ احسان فراموش اس سیڑھی
کو لات مارتے ہیں جس نے انھیں بام پر پہونچایا تھا، یا پہونچانے
کا وسیلہ فراہم کیا تھا۔ کتاب علم و دانش کا ظرف ہے، روشنی
اور ہدایت کی حامل ہے، تہذیب و تمدن کا ذخیرہ ہے۔ کتاب
کے ساتھ ظلم کرنے والے زندگی کی اعلیٰ اقدار کے منکر ہیں۔
قلب و نظر کی پاکیزگی سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ وہ وفا
ناآشنا ہیں۔ کتاب کے ساتھ جس نے بے دردی روا رکھی
وہ مادرِ درس گاہ کا حق کب ادا کر سکے گا۔ اس کے کلیجہ
میں خنجر گھونپنے میں اسے کیوں تامل ہونے لگا۔ ایسا کندۂ
ناتراش بھلا استادوں کی عزت کیوں کرنے لگا، بزرگوں
کو خاطر میں کیوں لانے لگا۔

ہمارے بچپن کی بات ہے، اگر کبھی
کتاب ہاتھ سے گر گئی تو اسے اُٹھا کر آنکھوں سے لگاتے تھے
ہونٹوں سے چومتے تھے۔ احترام اور محبت اور پشیمانی کے
[illegible] اور اب یہ عالم ہے کہ ہمارے بعض نونہالوں کو
[illegible] چاک کرنے میں تامل نہیں۔ اسے گیند کی طرح پھینکنے
[illegible] باک نہیں۔ کتاب کی قیمت اب صرف اتنی رہ گئی ہے
جتنی اس پر لکھی ہو، اس میں جو کچھ لکھا ہے کتاب کی قدر
و قیمت کو اب اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ کتاب کے ساتھ
اس نوع کا تعلق بازاری تعلق ہے۔ یہ دھندے اور
کاروبار، بالاخانہ اور بہیمیت کی باتیں ہیں۔ علم روشنی اور
تہذیب کی نہیں۔ تہذیب کا لُبِّ لباب کیا ہے؟ حزنیں

پاکیزگیاں، لطافتیں۔ یہ نہ ملیں تو کچھ نہ رہا۔

ہوائی اڈے پر یہ منظر اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ کاونٹر کے سامنے مسافروں کی طویل قطار صورتِ سوال کھڑی ہے۔ ہاتھ میں بریف کیس ہے۔ بریف کیس میں کیا ہوتا ہے؟ بالعموم کاغذات اور کتابیں۔ مسافر اسے اپنے یمین میں زمین پر رکھ دیتے ہیں کہ جب لکیر یا قطار کو دوبارہ جنبش ہوگی تو اسے اٹھا کر چند قدم آگے بڑھیں گے اور پھر زمین پر رکھ دیں گے۔ لیکن ان میں ایسے مسافر بھی نظر آتے ہیں جو بریف کیس کو اٹھانے کے بجائے اسے پیروں سے سرکاتے ہیں۔ یہاں جان پر بن جاتی ہے انھیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کتنے بڑے ظلم، کیسی شرمناک جسارت کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اور یہ لوگ نوخواندہ ناتراشیدہ طالب علم نہیں بلکہ معاشرہ کے ترقی یافتہ، تربیت یافتہ، صحبت یافتہ افراد۔ آپ اعتراض کیجے تو برہم ہو جائیں گے۔ "آخر ہاتھ اور پاؤں میں فرق ہی کیا ہے۔ دونوں ایک ہی جسم کے حصے ہیں۔ ہاتھ سے نہ اٹھایا پاؤں سے سرکا دیا تو کون سی آفت آگئی"۔ اس دلیل کا آپ کیا جواب دیں گے بغلیں جھانک کر رہ جائیں گے۔ منطق کے بغیر مفر بھی نہیں لیکن زندگی میں ایسے مقامات بھی ہیں جہاں منطق کا گزر بھی نہیں۔ بہت سی لطافتیں ہیں، بہت سی خوبصورتیاں، بہت سی نفاستیں جنھیں منطق کے شکنجے میں کسا نہیں جا سکتا جو لوگ ذہنی غذا کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں، انھیں جسمانی غذا کو بھی پاؤں سے دھکیلنے میں کوئی سنکوچ نہ ہوگا، اگر یہ خوف نہ ہو کہ اس طرح گرد اور جراثیم ان کی غذا میں شامل ہو جائیں گے۔ رزق اور علم دونوں کا احترام واجب ہے۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمتیں ہیں۔ اس احترام میں ان کے پیدا کرنے والے، ان سے ہمیں سرفراز کرنے والے کا احترام اور سپاس بھی شامل ہوتا ہے۔ احترام اور حرمت کے مفہوم میں اثبات کے ساتھ نفی بھی ہے۔ اس نفی سے ہم گریز کریں گے تو اثبات تک کیونکر پہونچیں گے۔ اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ نفی سے اثبات کی طرف، رد سے قبول کی جانب لے جاتا ہے تاکہ اشتباہ، احتمال اور خلطِ مبحث کی گنجائش نہ رہے۔ خدائے واحد کی خدائی کا اعلان بھی دوسرے خداؤں کے امکان کی نفی کے بعد کیا گیا ہے اوامر اور نواہی ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔

بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔ جاسم سے متعلق وہ دونوں کتابیں جراحت خوردہ تھیں اور وہ شخص بھی جو انھیں پڑھ رہا تھا اور ٹوٹے ہوئے سلسلہ کو جوڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ غزل ہوتی تو کام چل جاتا کہ اس میں تسلسل چنداں اہم نہیں لیکن یہاں تو سابقہ مثنویوں سے تھا کہانیوں سے بیچ کی کڑیاں غائب کر دی جائیں تو کیا رہ گیا وہ شخص اکثر سوچا کرتا ہے کہ اردو ادب نے غزل کے بجائے مثنوی کو منظورِ نظر بنایا ہوتا تو اردو والوں کے مزاج کی افتاد بدلی ہوئی ہوتی۔ ان کی باتیں زیادہ مربوط ہوتیں، ان کی کاوشیں زیادہ طویل، ان کے عزائم زیادہ بلند، ان میں سوگز دوڑنے کے بجائے میراتھان [illegible] دوڑنے والے کا دم ہوتا۔ زندگی کے مراحل اپنے بہانے سے وہ گریز نہ کیا کرتے۔ خاکہ اور منصوبہ بنا کر آگے بڑھنے سے انھیں وحشت نہ ہوتی۔ لیکن اس شخص کا جھگڑا غزل سے اس بے حسی اور بے اتفاقی سے ہے جو کتابوں کے ساتھ روا رکھی جاتی اور جس کی سب سے مکروہ اور شرمناک شکل وہ ہے جو اس وقت نظر کی محرک ہوئی۔ ہمارے کتبخانوں کی [illegible] سی کتابیں زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں ؎

اٹھائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری [illegible] ہوئی ہے داستاں میری

شاداں پرویز
بی ایس سی - سال دوم
ڈیفنس کالج اے ایم یو

شمسی توانائی

توانائی ۔ یہ آج کی دنیا کا ایک اہم مسئلہ ہے اور یہ مسئلہ ان ملکوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے جو نہ تو صنعتی طور پر ترقی یافتہ اور دولت مند ہیں اور نہ ان کے پاس تیل کے چشمے ہیں۔ ہمارا ملک بھی ایسے ہی ملکوں میں سے ہے۔ اسی لیے ہم توانائی حاصل کرنے کے لیے نئے نئے ذریعے تلاش کر رہے ہیں۔ آج کل کوئلہ، تیل، پٹرول وغیرہ سے توانائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ پٹرول ہم زمین سے حاصل کرتے ہیں۔ لیکن زمین کا یہ خزانہ بڑھتا نہیں ہے۔ بلکہ جتنا زیادہ زمین سے نکالا جاتا ہے اتنا ہی کم ہوتا جاتا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں کہ ایک روز معلوم ہوگا کہ اب زمین کا پیٹ خالی ہو گیا (اس کا ذخیرہ ختم ہو گیا)۔ پھر تیل سے کیے جانے والے تمام کام رک جائیں گے اور اس وقت ساری دنیا کے سامنے ایک بہت بڑا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ اسی لیے اب ہمیں توانائی کے ذریعے تلاش کرنے ہوں گے۔ جہاں تک پانی کا معاملہ ہے جب بارش نہیں ہوتی تو پھر پانی سے بجلی بنانے کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اب سائنسدانوں نے سورج کی طرف توجہ دی ہے۔

سورج توانائی کا سرچشمہ ہے

دراصل ہماری دنیا کا سارا کاروبار سورج ہی کی بدولت چلتا ہے۔ سورج کے اندر توانائی کا زبردست خزانہ ہے۔ اس توانائی کو ہم پہلے دن سے استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔ انسان بہت سی چیزیں دھوپ میں سکھاتا ہے۔ یہ شمسی توانائی کا براہ راست استعمال ہے۔ اب سے بائیس سو سال پہلے شمسی توانائی کا استعمال بطور اسلحہ کے بھی ہو چکا ہے۔ ایک مشہور سائنس داں آرک میڈیز تھا اس نے چھوٹے چھوٹے شیشوں کو جوڑ کر بہت بڑی بڑی طشتریاں بنائیں اور ان طشتریوں سے وہ سورج کی کرنوں کا عکس حملہ آور جہازوں پر اس طرح ڈالتا تھا کہ حملہ کرنے والے جہاز دور سے برباد کیے جاسکتے تھے

روزمرہ کی زندگی میں شمسی توانائی ہمارے لیے بڑی کارآمد ہے۔ اس سے بہت سے کام لیے جاتے ہیں۔

- شمسی توانائی کی مدد سے کھاد بنائی جاتی ہے
- شمسی توانائی کا استعمال مرغی خانوں کو گرم کرنے میں بھی ہوتا ہے
- شمسی توانائی کے ذریعہ پانی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچایا جا سکتا ہے۔
- شمسی توانائی کی مدد سے ایسی مشینیں بنتی ہیں جن سے بڑے پیمانے پر ناشپاتی اور مرچیں وغیرہ سکھائی جاسکتی ہیں۔

- شمسی توانائی کی مدد سے ریفریجریٹر بھی بنائے گئے ہیں۔
- شمسی توانائی کی مدد سے چولہے بھی جلائے جاتے ہیں
- شمسی توانائی کی مدد سے پانی کو صاف کرنے میں بھی مدد لی جا رہی ہے۔
- شمسی توانائی کی مدد سے عمارتوں کو ٹھنڈا اور گرم کیا جا سکتا ہے۔
- شمسی توانائی کی مدد سے بڑی ریل گاڑیاں بھی چل سکتی ہیں۔
- شمسی توانائی کی مدد سے ٹیلی فون کے درمیان سلسلہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔
- شمسی توانائی سے کاریں بھی چلائی جا سکتی ہیں۔
- شمسی توانائی کی مدد سے پانی کا پمپ بھی چلایا جا سکتا ہے
- شمسی توانائی کی مدد سے ایک ایسی مشین بنائی گئی ہے جس سے بدن کے جوڑوں اور ہڈیوں کا علاج بھی کیا جا رہا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شمسی توانائی کو کس طرح استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اب سائنس والوں نے اس قسم کی المونیم کی پلیٹیں بنائی ہیں جن کی سطح سورج کی شعاعوں کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ اور اس سے گرمی پیدا ہوتی ہے۔ ان کے اوپر کی سطح بہت چمکیلی بنائی جاتی ہے۔ جس سے وہ زیادہ سے زیادہ شعاعوں کو منعکس کر سکیں۔ یعنی شمسی توانائی کو گرمی کی توانائی میں تبدیل کرنے کے لیے سورج کی شعاعوں کو ایک جگہ جمع کر کے ایک نکتہ پر اس کا عکس ڈالا جاتا ہے۔ اس نکتہ پر درجہ حرارت بہت بڑھ جاتا ہے۔ جس چیز کی مدد سے ان شعاعوں کو ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے اسے شمسی کلکٹر کہتے ہیں۔ یہ کلکٹر کئی قسم کے ہوتے ہیں۔

۱۔ ایک چوکور ڈبے کی شکل کا ہوتا ہے۔ اس کی اوپری سطح موٹے کانچ سے ڈھکی ہوتی ہے۔ یہ چپٹی پلیٹ کے کلکٹر کہلاتے ہیں۔ یہ کلکٹر سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ یہ چوکور اور چپٹا ہوتا ہے۔ اس کی شکل ڈبے کی سی ہوتی ہے اس کے اندر نلکیاں لگی ہوتی ہیں اور اوپر ایک موٹا سا کانچ لگا ہوتا ہے۔ اس میں تانبے کی پلیٹ ہوتی ہے اس پلیٹ کا وہ رُخ جو سورج کی طرف ہوتا ہے اس کو کالا رنگ دیا جاتا ہے اور اس کے کناروں میں لکڑی لگی ہوتی ہے اور پیچھے کا حصہ اون (Glass wood) سے ڈھکا ہوتا ہے۔ یہ حرارت کو ضائع ہونے سے روکتا ہے۔ اس کے اندر ایک پلیٹ ہوتی ہے جو اپنے اندر شمسی توانائی کو جذب کرتی ہے اس سے ایک انچ یا تھوڑی اوپر دوسری پر گلاس یا پلاسٹک کی سطح بنا دی جاتی ہے۔ تاکہ اس کے اندر حاصل کی ہوئی حرارت ضائع نہ ہونے پائے۔ یہاں شمسی توانائی گرمی کی توانائی میں تبدیل کر کے پانی یا کسی دوسرے رقیق کی مدد سے اس جگہ پہنچا دی جاتی ہے جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ پانی یا رقیق نلکیوں میں بہتا ہے اور یہ نلکیاں جذب کرنے والی پلیٹ میں لگی ہوتی ہیں۔

۲۔ دوسرا کلکٹر گول توے کی شکل کا ہوتا ہے اس کی اوپری سطح چمکدار ہوتی ہے۔ اس میں بعض پیالے کی شکل کے بھی بنائے جاتے ہیں جو بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ جتنے بڑے ہوتے ہیں اتنی ہی زیادہ حرارت بڑھتی ہے۔ ان کی اوپری سطح بہت چمکدار المونیم کی بنی ہوتی ہے یہ شمسی شعاعوں کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ پھر ایک خاص نقطہ پر عکس ڈالتی ہے۔ اس نقطے پر درجہ حرارت بہت

زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں پر اس رقیق کو گرم کر لیا جاتا ہے۔ پھر اس کو نلکیوں کے ذریعہ دوسری جگہ بھیجا جاتا ہے۔

ہندوستان میں نیشنل فزیکل

لیبارٹری نے سورج کی توانائی سے چلنے والا چولھا ایجاد کیا ہے۔ یہ چولھا اسی طرح بنا ہے کہ اس میں آئینہ کے ذریعہ سورج کی کرنوں کو اس طرح ڈالا جاتا ہے کہ ان سے برتن میں گرمی پیدا ہو جائے۔ اب کچھ شمسی چولھے اس طرح کے بھی بنائے گئے ہیں جن میں کھانا باورچی خانوں میں رکھ کر پکایا جاسکتا ہے۔ ان میں باہر لگے کلکٹروں کی مدد سے گرمی حاصل کرکے پانی یا رقیق کے ذریعہ چولھوں تک پہنچا دی جاتی ہے۔

شمسی توانائی سے چلنے والے

تنور (ovens) بھی بنائے گئے ہیں۔ ان تنوروں میں کیک بھی بنایا جاسکتا ہے اور ان میں دوسرے کھانے بھی پکائے جاسکتے ہیں۔ ان کی ایک خاصیت یہ ہے کہ سورج ڈوبنے کے بعد بھی یہ کچھ گھنٹے کام کرتا ہے اور اس کانچ میں ایک چپٹا آئینہ ہوتا ہے۔ یہ اس آئینہ کی مدد سے زیادہ شعاعوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ تنور کے بن طرف المونیم کی شیٹ لگائی جاتی ہے۔ تنور کے ندر جو کھانا پکانے کا برتن رکھا جاتا ہے اس کا رنگ کالا رو دیا جاتا ہے۔ المونیم کی سطح زیادہ سے زیادہ شعاعوں اپنے اندر جذب کرکے اس کالے رنگ کے برتن پر اپنا س ڈالتی ہے۔ اسی طرح پکانے کے لیے زیادہ سے زیادہ رت حاصل ہو سکتی ہے۔

شمسی توانائی کے ذریعہ سمندر کے

ا کو پینے کے قابل بنایا جاسکتا ہے۔ اس کو صاف کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ سمندر کے پاس بڑی بڑی ٹنکیاں بنائی جاتی اور سمندر کے پانی کو ان ٹینکوں میں منتقل کیا جاتا ہے

پھر ٹینکوں کے اوپر شیشے لگا دیئے جاتے ہیں اور سورج کی شعاعوں کو پانی پر اس طرح ڈالا جاتا ہے کہ پانی بھاپ میں تبدیل ہو کر شیشوں کی نچلی سطح پر اکٹھا ہونے لگتا ہے اور یہ بھاپ ایک نلکی کے ذریعہ نیچے اتاری جاتی ہے اور پھر ٹھنڈی ہو کر دوبارہ پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور یہ پانی خالص ہو جاتا ہے۔ سمندر کا پانی جن برتنوں میں بھرا جاتا ہے وہ برتن کالے رنگ کے ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے اندر زیادہ سے زیادہ گرمی جذب کر لیں۔ جب بھاپ دوبارہ پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے تو پھر اس کو نلکیوں کے ذریعہ نکال کر دوسری ٹنکی میں بھر دیا جاتا ہے۔ نمک اور دوسری ملاوٹیں اس ترکیب سے نیچے تہ میں رہ جاتی ہیں۔ اس طرح ایک دن میں چھ ہزار گیلن پانی صاف کیا جاسکتا ہے۔ مگر اس میں جو کانچ کا فریم لگایا جاتا ہے یہ بہت مہنگا پڑتا ہے۔ اگر اس میں پلاسٹک کا استعمال کیا جائے تو اس پر خرچ کم آئے گا۔

شمسی توانائی کی مدد سے جاڑوں

میں عمارتوں کو گرم اور گرمی میں ٹھنڈا کرنے کا تجربہ بھی کیا جاچکا ہے۔ مگر اس کے لیے خاص قسم کے مکان بنائے جانے چاہییں۔ اس کام کے لیے ہوا کو شمسی توانائی کی مدد سے ٹھنڈا یا گرم کرنا پڑتا ہے۔ اس میں چھت کے اوپر کلکٹر لگا ہوتا ہے جو کہ پانی کو گرم کرنے کا کام کرتا ہے۔ یہ گھر دو منزلہ ہوتے ہیں۔ وہ چھت جس میں کلکٹر لگا ہوتا ہے کچھ ترچھی بنی ہوتی ہے تاکہ سورج کا اچھی طرح سامنا کر سکے۔ شمسی شعاعوں کو جذب کرنے کے لیے اس چھت کی اوپری سطح المونیم کی کالی چادر سے ڈھک دی جاتی ہے اور اس میں پانچ پانچ انچ کی دوری پر تانبے کی نلکیاں لگی ہوتی ہیں۔ یہ نلکیاں ایک شیشے ٹینک میں

نکلتی ہیں۔ یہاں سے پانی ایسی جگہ بھیجا جاتا ہے جہاں پر وہ
ہوا کو گرم کرتا ہے اور پھر وہ ہوا پنکھے کی مدد سے پورے
کمرے میں پھیلا دی جاتی ہے۔

اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گرم پانی
یا ہوا، نلکیوں میں چکر لگاتی ہے اور جب کمرے کی ٹھنڈی
ہوا اس سے آکر ملتی ہے تو وہ بھی گرم ہو جاتی ہے اور
اس پورے کمرے کی ٹھنڈی ہوا گرم ہو جاتی ہے۔ اس
طرح کمرہ گرم ہو جاتا ہے۔

آپ نے دیکھا سورج کی توانائی
سے کتنے کام لیے جا سکتے ہیں۔ ہم جب سوچتے ہیں کہ
سورج سے کتنی توانائی ہر وقت نکلتی رہتی ہے اور پھر
اسے استعمال میں نہیں لاتے وہ ضائع ہو جاتی ہے۔ تو
ہمیں بڑا دکھ ہوتا ہے مگر اس کے استعمال کو عام
بنانا اتنا آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس پر بہت
خرچ آتا ہے۔ دیکھنے میں تو ہمیں لگتا ہے کہ دھوپ مفت
کی ملتی ہے۔ مگر اس طرح سے زمین کے اندر کوئلہ،
لکڑی، تیل سب ہی مفت ہے خرچ تو اس کے نکالنے
میں آتا ہے اور اپنے لیے کارآمد بنانے میں ہوتا ہے۔
اب سائنس داں اس پر کام کر رہے ہیں کہ شمسی توانائی
ہم کو دوسرے ایندھنوں کے مقابلے میں سستی پڑے
جو آج کل روزمرہ استعمال میں آرہے ہیں۔ اس سلسلہ
میں دنیا کے اٹھارہ بڑے شہروں کا جائزہ لیا گیا ہے اور
یہاں پر ہمیں کچھ چیزوں کا استعمال سستا پڑا ہے
اب ہم کو اندازہ ہو رہا ہے کہ
شمسی توانائی کا زمانہ بہت جلد آنے والا ہے ہم روز
بروز اس کے قریب آتے جا رہے ہیں اس پر نئے
نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ جلد
ہی شمسی توانائی عام ہو جائے گی اور دنیا کے بہت سے
ملک اس کا استعمال کرنے لگیں گے۔ ہم ہندوستانی
دوسرے ملکوں میں جو سامان بیچتے ہیں ان سے جو روپیہ
ملتا ہے اس میں زیادہ تر روپیہ پٹرول خریدنے میں
خرچ ہو جاتا ہے۔

جب ہم سورج سے توانائی حاصل
کریں گے تو ہمیں اتنا زیادہ پٹرول پر خرچ کرنا پڑے گا
اور پھر ہمارا روپیہ باہر جانے کے بجائے ہمارے ملک میں
رہے گا اور ہمارے ملک کی غریبی دور ہوگی اور شمسی
توانائی سے عام لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔ سورج کی توانائی
سے ہمیں بہت سی آسانیاں ہوں گی۔ تو آیئے ہم سب
مل کر اس نئے دور کے آغاز کا استقبال کریں۔

مضامین ارسال کرتے وقت درج ذیل
باتوں کو مدنظر رکھیں

- مضامین صاف ہوں۔
- صفحے کے صرف ایک جانب تحریر ہوں
- رسالے کے معیار کے مطابق ہوں

اخلاق، تہذیب، تعلیم اور سائنس
پر مضامین تحریر فرمائیں۔

پتہ
رسالہ تہذیب الاخلاق
صفدر منزل، تار بنگلہ، اے ایم یو، علی گڑھ 202001

مجی ں حا ی
دھلی

روزگار کا مسئلہ

خدا کا شکر ہے کہ علی گڑھ میں اب تعمیری کام کے لیے فضا پیدا ہو چلی ہے۔ سب سے اہم اور پریشان کن سوال روزگار کا ہے۔ اب تک ہماری توجہ سرکاری سرکاری ملازمت اور مقابلے کے امتحانات پر رہی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دیگر مواقع کی بھی سوچیں۔ مقابلہ کے امتحانات میں چند ہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں اور ملازمتوں میں بھی ہر نوجوان کی کھپت نہیں ہو سکتی۔

اس وقت ہندوستان صنعتی دور سے گزر رہا ہے وہ چاہتا ہے کہ قدرت نے جو عظیم معدنی اور زرعی وسائل اسے عطا کیے ہیں انھیں کام میں لائے اور جلد از جلد خود کفیل ہو جائے۔ گزشتہ تیس برس میں نت نئی صنعتیں قائم ہوئی ہیں اور بازار میں شاید ہی کوئی ایسی چیز ملے جو باہر کی بنی ہوئی ہو۔ صنعت سازی کے لیے حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ کم سرمایہ کے لوگوں کو بھی موقعہ دیا جائے اور ایسی شعبوں کا خاص خیال رکھا جائے جن میں ا۔ انی محنت کی نسبتاً زیادہ کھپت ہو۔ انھیں ا(۲) اصولوں کے مدّنظر کچھ شعبوں میں بڑے کارخانے بنانے کی اجازت نہیں ہے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ صنعت سازی وبا کی طرح پھیلتی ہے۔ جب بھی کہیں کوئی کارخانہ قائم ہوتا ہے تھوڑے ہی دن بعد اس کے معاون کارخانے اور کاروبار وجود میں آجاتے ہیں۔ اگر شکر کی فیکٹری ہے تو اس کے شیرہ کو کام میں لانے کے لیے کئی اور کارخانے کھل جائیں گے کوئی اس سے الکوہل (ALCOHAL) بنائے گا، کوئی موٹا کاغذ، کوئی کچھ اور۔ ہر نئے کارخانے کے لیے تربیت یافتہ انسانوں کی ضرورت ہے۔ علاوہ کارخانے کے اندر کام کرنے والوں کے ایسے لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے جو مرمت اور ملحقہ کاموں سے واقف ہوں

صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ زراعت کو بھی بہت فروغ ہوا ہے۔ زراعت میں مشین کا استعمال روز افزوں ہے۔ ساتھ کے ساتھ قصبات اور دیہات میں بھی بجلی آجانے کی وجہ سے بہت سی گھریلو صنعتیں قائم ہو گئی ہیں اور ہوتی جا رہی ہیں۔ اب دیہات میں انجینیروں، مستریوں وغیرہ کی خاصی مانگ ہو گئی ہے۔ خوشحالی کی وجہ سے دیہات میں ایک ایسا متمول طبقہ وجود میں آگیا ہے۔ جن کا معیارِ زندگی شہری معیارِ زندگی کے برابر ہے۔ اسے ڈاکٹر کی ضرورت ہے اور اچھے گھر، اچھے برتنوں، فرنیچر، ریڈیو وغیرہ کی بھی۔ بدیگر الفاظ جہاں تک اشیاء کی مانگ کا سوال ہے، دیہات اب اچھا خاصا مارکٹ ہے۔

جب ہم روزگار کے مسئلہ کو اپنی معاشی ترقی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں تو ہمیں ان مواقع کا کچھ اندازہ ہوتا ہے جو اس وقت موجود ہیں۔ ان مواقع سے

فائدہ اٹھانے کی دل تو ہنر اور دوسرے جرأتِ رندانہ کی
ضرورت ہے۔ الغرض اگر ملازمت کے لیے نکلے گا تو دروازے
بڑھنے گا۔ ہاں اگر وہ مخلوق کی خدمت کی خواہش رکھتا ہے
تو شہروں کے بجائے قصبات اور دیہات کا رُخ کرے پیسہ
اس پر برسے گا اور ساتھ کے ساتھ عوام کی محبت اور ان
کا احترام بھی اسے حاصل ہوگا۔ کم و بیش یہی بات انجینیر پر
بھی صادق آتی ہے۔

اس وقت ملک میں نوجوانوں کو
خود کار بنانے کی سیکڑوں اسکیمیں ہیں جن پر ہر سال کروڑ ہا
روپیہ صرف ہوتا ہے۔ مرکزی حکومت کا بجٹ علیحدہ ہے
صوبائی حکومتوں کا علیحدہ۔ مجھے نہیں معلوم کہ علی گڑھ کے
طلبا نے ان سے کہاں تک فائدہ اٹھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ
رہبری کی ضرورت ہے۔ علاوہ معلومات فراہم کرنے کے
کچھ اور بھی چاہیے وہ کیا ہو اس کا جواب سنجیدہ مطالعہ اور
اور غور و غوض کے بعد دیا جا سکتا ہے۔ سردست یہ کہا
جا سکتا ہے کہ ہمیں نصاب میں ان مضامین/شعوق کو جگہ
دینی ہوگی جن سے نوجوانوں کو خودکار بننے کی ترغیب
ہو اور اس کے لیے شعور پیدا ہو۔ انجینیرنگ، سائنس،
معاشیات، کامرس، بزنس ایڈمنسٹریشن کے مضامین
کے طلبا کے علاوہ ہر طالب علم کے لیے Business Intr
prise - کا پرچہ لازمی ہونا چاہیے اور اس کی
اہمیت وہی ہونا چاہیے جو مثلاً انگریزی زبان کی ہے
انجینیرنگ اور سائنس کے طلبا کے
لیے اپنے اپنے میدان میں ایک ہنر سیکھنا لازم ہونا چاہیے
اس کے لیے ضروری ہوگا کہ ہمارے انجینیرنگ کالج اور
پولیٹکنک کی توسیع کر کے انھیں Industrial Estate
کی شکل دی جائے۔ جہاں طلبا مختلف چیزیں بنائیں/مرمت

کریں۔ کوئی وجہ نہیں کہ یونیورسٹی کے چلائے ہوئے چھوٹے
چھوٹے کارخانے یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر کے لیے عام
ضروریات کی چیزیں نہ بنا سکیں۔ اسی طرح یونیورسٹی کا مشین
کی مرمت کے لیے گریجویٹ اور غیر گریجویٹ طلبا کی ٹیمیں
تیار کر سکتی ہے۔ اگر ان کا کام عام مستریوں سے بہتر
اور سستا ہوگا تو بازار میں ان کی مانگ یقینی ہے
طلبا کو چھوٹے چھوٹے بزنس چلانے کی
ترغیب نہایت موثر اور عملی طریقہ پر دی جا سکتی ہے
کیوں نہ کچھ جاندار اور معتبر طلبا کو رستوران، بساتی، پرچونیے
وغیرہ کی دکانیں کھولنے کی دعوت دی جائے؟ ترغیب کے
لیے کچھ سالوں کے لیے زمین/دکان کا کرایہ معاف یونیورسٹی
میں جو رسد آئے ان کے ذریعہ آئے وغیرہ وغیرہ۔ ہر
ہوسٹل میں چائے خانہ سابق گریجویٹ طلبا کو کھولنے
کی اجازت دے دی جائے۔ شروع میں ان شعوق کو لیا
جائے جن میں کم سرمایہ لگے اور مانگ کافی اور دائمی ہو۔
جن حضرات کو ایک ہی طریق پر سوچنے
اور چلنے کی عادت ہے تو وہ مندرجہ بالا تجاویز کی مخالفت
نہیں تو مذاق مزید اڑائیں گے۔ ایسے لوگوں سے بحث
مباحثہ بیکار ہے۔ ان کو دعوت دی جائے کہ وہ کوئی
بہتر اور زیادہ موثر کام شروع کر دیں۔ مگر جو حضرات
مخالفت یا تضحیک محض اپنے نکمے پن کی وجہ سے کریں
انھیں پنشن دے کر با عزت طور پر رخصت کر دیا
جائے!

ڈاکٹر انجمن آرا انجم
علی گڑھ

"جاسوسی اور غیر صحتمند ادب، فلم اور نوجوان"

نوجوانوں کو متاثر کرنے، ان میں
اخلاقی انحطاط پیدا کرنے اور ان کی شخصیتوں اور ذہنوں
کو بگاڑنے میں جہاں بہت سے اسباب کارفرما ہیں ان
میں فلم، جاسوسی اور غیر صحت مند ادب خصوصی طور پر
قابلِ ذکر ہیں۔

آج کل جاسوسی ادب اور فلم بینی
کا شوق عموماً ہر عمر کے لوگوں اور خصوصاً نوجوانوں کو
دیوانگی کی حد تک ہے۔ شاید ہی جاسوسی ناول اور کہانیوں
کا کوئی تازہ ترین شمارہ ایسا ہو جو نوجوانوں کی نظر سے
نہ گزرتا ہو۔ اسی طرح یہ طبقہ فلم بینی کے مرض کا شکار ہے
ہر فلم کے ڈائرکٹر، ہیرو، ہیروئن، گلوکار اور گیت کار
کے متعلق پوری معلومات فراہم کر لیجیے۔ فلموں کی کہانیاں
اور گانے از بر ہیں۔ غرض کہ فلمی دنیا کا کوئی پہلو ایسا
نہیں جس پر نوجوان بھرپور طریقے سے اظہارِ خیال نہ کر سکتے
ہوں۔ اپنے اس شوق کی سیرابی نوجوان اپنے والدین کی
کمائی یا پھر دوسرے طریقوں سے کرتے ہیں۔ اگر برسرِ
روزگار ہیں تو پھر اپنی کمائی کا بیشتر حصہ فلم بینی کی نذر
کر دیتے ہیں۔

آج کل نوجوانوں میں جو رجحان
رہزنی اور جرائم کی طرف جو میلان پایا جاتا ہے اس کا بڑا
سبب جاسوسی اور جنسیاتی ادب کا مطالعہ اور فلم بینی
ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی نے اس جنون پر مہمیز کا کام کیا ہے
گھر بیٹھے انھیں ایسے ذرائع اور مواقع مہیا ہیں جو ان
کی جنون خیزی میں اضافے کا سبب بنتے ہیں۔ تعلیم یافتہ
اور غیر تعلیم یافتہ نوجوان شعوری اور غیر شعوری طور پر
ایسے غیر صحت مند ادب اور فلموں کا اثر قبول کرتے ہیں
جو ان کی زندگیوں میں کہیں نہ کہیں جھلک جاتا ہے۔ کتنے
افسوس کی بات ہے کہ جو وقت نوجوانوں کے ذہنوں،
شخصیتوں کو بنانے اور سنوارنے اور ان میں اخلاقی
صفات اور بلند پاکیزہ جذبات ابھارنے کا ہوتا ہے، وہ
زندگی کے اس نازک موڑ پر فلم بینی، جاسوسی اور جنسی ادب کے
مطالعے اور شوق میں گرفتار ہو کر غلط راہ اختیار کر لیتے ہیں
پردۂ فلم پر دکھائے جانے والے اخلاق سوز، عریاں،
فحش اور بدنمائی مناظر اور گانے نوجوانوں کے کورے اور
معصوم ذہنوں پر ایسے انمٹ نقوش چھوڑتے ہیں جو انھیں
جذبات کے طوفان میں بہالے جاتے ہیں جہاں خیر و شر کا
امتیاز کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ فلموں کے
زہر آلود ماحول اور اس کی فضا جب انھیں اپنی گرفت
میں لے لیتی ہے تو طرح طرح کے مغویات، جرائم کے ارتکاب
اور تخریبی کارروائیوں میں زندگی کا قیمتی اور بہترین وقت
ضائع کرتے ہیں۔ جب ایک دفعہ کسی غلط کام کا چسکا لگ
جاتا ہے تو اس سے پیچھا چھڑانا ایک ناقابلِ حل مسئلہ بن

بن جاتا ہے۔

مغربی ممالک میں نوجوانوں کا جائزہ لینے کے بعد معلوم ہوا کہ ان کو مجرم بنانے میں فلم، جاسوسی اور فحش ادب کا زبردست ہاتھ ہے اور ان کی زندگیاں تباہ کرنے میں دونوں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ قدم قدم پر ان کو ایسے مواقع کثرت سے ملتے ہیں جو ان کو ذہنی اور جسمانی عیاشی اور غلط روی کے سامان فراہم کرتے رہتے ہیں۔ مغربی تہذیب کے یہ اثرات ہندوستان میں بھی تیزی کے ساتھ آ رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی ایسے رسائل کی کمی نہیں ہے جو نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی اور جرائم کی ترغیب دیتے ہوں۔ اگر یہی حال رہا اور اس طرف توجہ نہ دی گئی تو چند سال بعد ان امراض کا ازالہ ممکن نہ ہوگا

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ بچوں اور نوجوانوں کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم دینے پر خاصا زور دیا جاتا تھا۔ ان کو ایسی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں جو پند و نصائح سے بھرپور ہوتی تھیں اور جو ان میں پاکیزہ خیالات اور لطیف جذبات کو ابھارنے میں ایک موثر ذریعہ ثابت ہوتی تھیں انھیں کتابوں کے مطابق ان کے رجحانات و نظریات بنتے تھے۔ مگر آج کے حالات اور ماحول میں بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ اب درسگاہوں اور گھروں کی فضا کچھ ایسی بن گئی ہے جہاں نوجوانوں کو ایسی کتابیں پڑھنے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں یا بالکل ملتے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جس ماحول میں پروان چڑھتے ہیں، جو تعلیم وہ حاصل کرتے ہیں اور گرد و پیش کے جو حالات کو وہ دیکھتے ہیں ان کے ذہنوں پر ویسے ہی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ان کے کرداروں میں انہی کی رنگ آمیزی ہوتی ہے۔

نوجوان، سماج اور قوم کا بیش قیمت سرمایہ ہوتے ہیں۔ وہ اسی وقت ملک کے ذمہ دار شہری اور سماج کے کارآمد افراد بن سکتے ہیں جب ان کی تربیت صحیح طریقے سے ہو اور انھیں مخرب اخلاق باتوں سے روکا جائے۔ جہاں تک ممکن ہوسکے ان کو غیر صحت مند اور جاسوسی ادب کے مطالعے اور فلم بینی کے مرض سے محفوظ رکھا جائے۔ ان کے مطالعہ میں ایسی کتابیں لائی جائیں جو ان کے دل و دماغ کو روشنی بخشیں اور ان کی شخصیتوں میں وقار اور پختگی پیدا کریں اور ساتھ ہی انھیں اعلیٰ کردار کا مالک بنائیں تاکہ ان کی زندگیاں تباہی کی نذر نہ ہوں اور ان کی بڑھتی ہوئی صلاحیتیں تعمیری کاموں میں صرف ہوسکیں۔ انھیں دنیا کے عظیم انسانوں کی سوانح اور خصوصاً مذہبی و اخلاقی کتابوں کے مطالعہ کا شوق دلانا چاہیے۔ اس طرح کی کتابیں کردار سازی میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں جاسوسی، سستے اور غیر صحت مند ادب کے پڑھنے سے پاکیزہ ادب کا ذوق مردہ ہو جاتا ہے۔ اس سے نہ زبان و بیان کا لطف ہی حاصل ہوتا ہے اور نہ ذہن بیدار ہوتا ہے بلکہ رکیک جذبات اپنی جگہ بناتے ہیں۔ ذہن تخریب کاری کی طرف مائل ہوتا ہے اور اخلاق بگڑتے ہیں اور پھر پورے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگتی ہیں۔ اسی طرح ۹۹ فی صد فلمیں ایسی ہوتی ہیں جن کا نہ دیکھنا ہی نوجوانوں کے لیے بہتر ہے۔ معلوماتی (ڈاکومنٹری) فلمیں تو نوجوانوں کے لیے مفید ہوسکتی ہیں مگر ایسی فلمیں تو شاذ و نادر ہی بنتی ہیں۔ ٹی، وی، اور ریڈیو پر بھی ادبی پروگراموں کو اتنی اہمیت اور مقبولیت حاصل نہیں ہے جتنی فلمی پروگرام کو۔ قاعدے کے جو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں ان کو دیکھنے اور سننے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہوتی ہے۔

ہم اپنے نوجوانوں کو ان امراض سے اسی وقت محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ جب خود ان سے پرہیز کریں۔ ہم خود سستے، جاسوسی اور جنسی ادب اور فلم کے دیوانے ہیں اور انھیں کے ذریعہ اپنے ذوق کی تسکین کرتے ہیں۔ ظاہر ہے جب ایسے احول اور فضا میں نوجوان نسل پروان چڑھے گی تو اس کے نتائج بھی ویسے ہی ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ ہم نوجوانوں کی اصلاح کریں ہمیں خود اپنی اصلاح کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں مردوں اور خواتین کو ایسی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے جو ان کے اخلاق کردار، خیالات اور سیرت میں پاکیزگی پیدا کریں اور اعلیٰ انسانی اقدار کو اپنانے میں معاون ثابت ہوں۔ اسی وقت یہ ممکن ہو سکے گا کہ والدین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے دوران انھیں ستھرے، صحت مند اور عمدہ ادب کے مطالعے کی ترغیب دیں اور فلم بینی کے مضر اثرات سے ان کے ذہنوں کو صاف و پاک رکھیں۔

موجودہ سماج میں بے راہ روی کے جو رجحانات تیزی سے بڑھ رہے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی صالح اور معیاری معاشرے کے بنانے اور سنوارنے میں اخلاقی اور مذہبی تعلیم کس قدر لازمی اور ضروری ہے۔ اس کے بغیر خیر و شر اور نیکی اور بدی میں امتیاز کرنا ممکن نہیں۔ نوجوانوں کو ایک اچھا انسان ایک فرض شناس شہری اور ملک و ملت کا بہی خواہ بنانے کے لیے اسکول اور کالجوں میں اخلاقی تعلیم کو جگہ دینے پر زور دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ جب تک گھروں میں مذہبی اور اخلاقی تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہوگا تو آنے والی نسلوں سے یہ امید عبث ہوگی کہ وہ بہتر انسان بن سکیں گی اور جذبۂ خدمت سے سرشار ہو کر ملک و قوم کی ترقی و بہبود کے لیے کوئی اہم اور قابلِ قدر کارنامہ انجام دے سکیں گی۔

بقیہ "یونیورسٹی کے شب و روز"

پروفیسر بہاء الدین مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف فرما تھے۔

"مٹی سے جیون" میں آج کل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں اور کم تنخواہ والے ملازمین کی مشکلات کی بڑی خوبی سے عکاسی کی گئی جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔

پروگرام کے شروع ہونے سے قبل ڈرامہ کلب کی جانب سے ایک قرارداد کے ذریعہ فلسطینیوں پر اسرائیلی حملہ کی سخت مذمت کی گئی۔

جواہر لال نہرو میڈیکل کالج اسپتال کیلیے مزید ۱۵۰ بستر

ایک عرصہ سے جواہر لال نہرو میڈیکل کالج کے اسپتال میں بستروں کی کمی کے سبب سے برابر اس امر کی کوشش کی جا رہی تھی کہ مزید بستروں کا انتظام جلد سے جلد کیا جائے۔ چنانچہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ایک سو پچاس بستروں کے لیے عمارت تعمیر کرنے کے واسطے چورانوے لاکھ چونتیس ہزار تین سو روپیہ کی منظوری دے دی ہے۔ اسی دوران سی۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی سے بھی اس پروجیکٹ کی منظوری حاصل ہو گئی ہے۔

امید ہے کہ جلد از جلد عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہو جائے گا اور اسپتال میں کل بستروں کی تعداد پانچ سو ہو جائے گی۔

قسط نمبر ۱

عشرت علی قریشی
ڈپٹی لائبریرین۔
مولانا آزاد لائبریری

"مولانا آزاد لائبریری"

مولانا آزاد لائبریری برصغیر کی چند قدیم یونیورسٹی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ آج اس کا شمار دنیا کے اہم کتب خانوں میں ہوتا ہے۔ ایم اے او کالج جنوری ۱۸۷۷ء میں قائم ہوا۔ لیکن لائبریری کی ابتدا بانیٔ درس گاہ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کار کے ذاتی کتب خانوں کے عطیات سے ۱۸۷۵ء میں ہوئی جب سرسید نے علی گڑھ میں ایک اسکول قائم کیا جس نے تقریباً تین سال بعد کالج کی شکل اختیار کی۔ ۱۸۷۷ء میں لائبریری کا نام ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ لٹن کے نام پر جنھوں نے کالج کا سنگِ بنیاد رکھا تھا، لٹن لائبریری رکھا گیا۔ سرسید خود افقِ علم کے درخشندہ ستارہ تھے۔ وہ مسلمانوں کی علمی خدمات اور روایات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ بغداد اور قرطبہ کے کتب خانوں کی تاریخ ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کی لائبریریوں کو دیکھا تھا۔ اور برٹش میوزیم میں بیٹھ کر سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کا جواب خطباتِ احمدیہ لکھا تھا۔ چنانچہ وہ شروع ہی سے کالج کے لیے ایک معیاری لائبریری بنانے کے کوشاں تھے۔ سرسید کی کوششوں سے لائبریری کا علمی و تحقیقی ذخیرہ بتدریج بڑھتا رہا۔ انھیں عربی و فارسی کی قدیم مؤلفات سے بڑا شغف تھا۔ یورپ میں جوں ہی کوئی نئی کتاب ان کی دلچسپی کی چھپتی وہ فوراً منگا لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے مطبوعاتِ عربی و فارسی جتنی زیادہ تعداد میں اس لائبریری میں ہیں ہندوستان میں کسی دوسری جگہ کم ہوں گے۔ یہاں بہت سی ایسی کتابیں ہیں جن پر سرسید اور شبلی وغیرہ کی تحریریں اور یادداشتیں ہیں۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد کالج کے پرنسپل سر تھیوڈر ماریسن نے لائبریری کی ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ ٹرسٹیان کالج کی ایک میٹنگ کو جو سرسید کے لیے بہترین دوامی یادگار کے طریقہ پر غور و خوض کے لیے بلائی گئی تھی۔ پرنسپل ماریسن نے خطاب کرتے ہوئے کہا

"دوسرا نیک مقصد جس میں روپیہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے ایک دائمی عظیم اور معیاری لائبریری کا بنانا ہے۔ لائبریری خصوصیت کے ساتھ اپنے ذخیرہ میں نہ صرف جامع ہو بلکہ غیر معمولی بھی اور یہ ذخیرہ صرف عربی اور فارسی کی کتابوں پر مشتمل نہ ہو بلکہ اس میں ایک معتد بہ تعداد انگریزی زبان کی کتابوں کی بھی ہو۔"

پرنسپل ماریسن کی اس تجویز پر کالج کے سکریٹری نے اپنی

رپورٹ میں ٹرسٹیان سے کہا

"مسٹر مارلیسن نے بجا طور پر کالج لائبریری کو بہتر بنانے پر زور دیا ہے۔ انھوں نے صحیح کہا ہے کہ ایسی لائبریری جس میں کتابیں تمہوں دنیا کا عجوبہ ہی ہو سکتی ہے۔ تاہم ہمارا کالج ابھی اپنے دورِ طفولیت میں ہے اور انگریزی کی کتابیں جو پرنسپل کے دفتر میں رکھی ہیں کالج کے لیے مفید اور شایانِ شان ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ٹرسٹیاں پرنسپل کی اس خواہش کو کہ کالج کی لائبریری میں بڑی تعداد میں کتابیں ہوں پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔"

آئندہ سالوں میں لائبریری نے تیزی سے ترقی کی اور جب کالج کے انگریز اسٹاف نے تقریباً بیس سال بعد کالج کو یونیورسٹی کے قیام سے کچھ قبل چھوڑا تو لائبریری کے پاس فلسفہ، انگریزی ادب، معاشیات، عربی و فارسی ادب اور اسلامیات پر اٹھارہ ہزار نادر و نایاب کتابوں کا قیمتی ذخیرہ تھا۔ یہ انگریز اسٹاف ممبران انگلستان کی قدیم یونیورسٹیوں آکسفورڈ، کیمبرج، لندن اور ایڈنبرگ سے فارغ التحصیل تھے اور انھیں کالج کے نظامِ تعلیم میں لائبریری کے رول کا پورا احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ایم اے او کالج کی لائبریری کو اُسی نہج پر استوار کیا اور پروان چڑھایا جس طرز کی لائبریریاں انھوں نے اپنے ملک میں دیکھی اور برتی تھیں۔ اس ضمن میں جی۔ گارڈنر براؤن، آرنلڈ، رالے، ہورووٹز، آکرٹلونی اور اسٹوری (G.Gardner Brown, Arnold, Raleigh, Horovitz, Archterlonie, and Storey) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ان حضرات نے نہ صرف درس و تدریس کے فرائض کالج میں انجام دیے بلکہ بحیثیت آنریری لائبریرین بھی کام کیا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، یکم دسمبر ۱۹۲۰ء کو وجود میں آئی۔ کالج کے برٹش اسٹاف نے اپریل ۱۹۱۹ء میں کالج کی علمی زندگی کو کلیتاً ہندوستانی اسٹاف کے سپرد کیا۔ اس وقفہ میں لائبریری کی انتظامیہ میں جلد جلد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر اسٹوری نے ایف۔ ڈی مراد صاحب کو جو اس وقت فزکس میں لکچرار تھے لائبریری کا چارج دیا۔ اسی سال ماہ ستمبر میں ڈاکٹر ولی محمد نے مراد صاحب سے چارج لیا۔ اور آئندہ ماہ ڈاکٹر ایل۔ کے حیدر نے لائبریری کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں۔ جولائی ۱۹۱۹ء سے دسمبر ۱۹۲۱ء تک خان بہادر محمد اسد اللہ صاحب نے لائبریری کی جدید طرز پر تنظیم کی۔ بعد میں وہ مستعفی ہو گئے۔ اسی زمانہ میں دسمبر ۱۹۲۰ء میں بشیر الدین صاحب کا تقرر تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ہوا۔ لیکن انھوں نے اپریل ۱۹۲۱ء میں اپنا عہدہ سنبھالا۔ اسد اللہ صاحب کے مستعفی ہونے پر ایگزیکٹیو کونسل نے بشیر الدین صاحب کو لائبریری ٹریننگ کے لیے لاہور بھیجا۔ جہاں سے انھوں نے ڈپلومہ حاصل کیا اور مارچ ۱۹۲۲ء میں اسد اللہ صاحب کی جگہ بحیثیت اسسٹنٹ لائبریرین لائبریری کی ذمہ داری سنبھالی۔

حالانکہ اسد اللہ صاحب نے بہت کم مدت لائبریری کی ذمہ داریاں سنبھالیں، تاہم اس تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے لائبریری کی آئندہ نشوونما کے لیے خطوط مرتب کیے۔ ان کے زمانے میں سائنٹفک طریقہ پر لائبریری کی تنظیم ہوئی۔ لائبریری اسٹاف کے تقرر کے لیے خاکہ مرتب ہوا۔ لائبریری کا پہلا سالانہ بجٹ تیار ہوا۔ اور انھوں ہی نے لائبریری کے پہلے قواعد تیار کیے اور پہلی لائبریری کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔

یہ دور یونیورسٹی کا عہدِ طفولیت تھا اور یونیورسٹی تنظیم اور استحکام کے منازل طے کر رہی تھی۔ تاہم اربابِ حل و عقد کی خاطر خواہ توجہ لائبریری کی طرف رہی جیسا کہ وائس چانسلر کی ۱۹۲۴ء کی رپورٹ کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

"میں ممبرانِ کورٹ کی خصوصی توجہ یونیورسٹی لائبریری کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو میرے خیال میں ایک تعلیمی مرکز کے معیار پر پوری نہیں اُترتی۔ انگریزی اور مشرقی زبانوں میں کتابوں کی کل تعداد اکیس ہزار ہے۔ انگلستان میں اسکولوں کی لائبریریاں بھی اس سے بہتر اور بڑی ہوتی ہیں۔ ہمیں مختلف مضامین پر کم از کم ایک لاکھ کتابیں مہیا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کتابوں کی قلت کے علاوہ لائبریری کی موجودہ عمارت اس قلیل تعداد کے لیے بھی ناکافی ہے لائبریرین کی رپورٹ قابل ملاحظہ اور غور طلب ہے۔ اِس وقت کتابوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ایک بہتر اور کشادہ عمارت کی فوری ضرورت ہے"

یونیورسٹی کی ترقی اور وسعت کے ساتھ ساتھ لائبریری بھی ارتقاء کے منازل طے کرتی رہی۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۶۰ء تک پروفیسر بشیر الدین اس کی نشو و نما میں لگے رہے۔ لائبریری کو بنانے اور سنوارنے میں ان کا زبردست حصّہ ہے۔ انھوں نے ہر موضوع پر اعلیٰ معیاری کتابیں حاصل کر کے اس کے ذخائر کو وسیع بنایا یہ اُن ہی کی لگن اور محنت کا نتیجہ تھا کہ جب تقریبًا چالیس سال خدمت کرنے کے بعد وہ لائبریرین کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تو لائبریری میں کتابوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب تھی۔

پروفیسر بشیر الدین کے ریٹائر ہونے پر پروفیسر طاہر رضوی (صدر شعبۂ جغرافیہ) نے لائبریری کی ذمہ داری بحیثیت چیرمین لائبریری کمیٹی سنبھالی۔ اس وقت مرحوم مظفر علی صاحب اسسٹنٹ لائبریرین تھے۔ ۱۹۶۲ء میں اُن کا تقرر ڈپٹی لائبریرین کے عہدہ پر ہوا۔ پروفیسر طاہر رضوی کے بعد پروفیسر نور الحسن (صدر شعبۂ تاریخ) لائبریری کمیٹی کے چیرمین ہوئے اور کچھ عرصہ بعد پرو وائس چانسلر ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم نے لائبریری کا انتظام و انصرام بحیثیت لائبریرین سنبھالا۔ ۱۹۶۷ء میں پروفیسر بشیر الدین کا تقرر دوبارہ لائبریرین اور صدر شعبۂ لائبریری سائنس کی حیثیت سے ہوا۔ اپریل ۱۹۷۰ء میں ان کی مدّتِ معاہدہ ختم ہونے پر لائبریری کا چارج موجودہ لائبریرین اور چیرمین شعبۂ لائبریری سائنس محمد حسین رضوی نے لیا۔ گزشتہ بارہ سال میں لائبریری نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ کتابوں کی تعداد میں اِس سرعت سے اضافہ ہوا ہے کہ لائبریری کا ذخیرہ اس مدّت میں تقریبًا دوگنا ہوگیا ہے۔ طلبہ، اساتذہ اور تحقیقی کاموں میں منہمک حضرات کی تعداد میں بھی حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ لائبریری نے اپنے محدود وسائل اور گوناگوں دقتوں کے باوجود اپنی خدمات کو نئے علمی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے ہر طرح کے [illegible] خدمات شروع کی گئی ہیں۔ لائبریری کے اوقات کو بڑھایا گیا ہے اور مطالعہ کرنے والوں کے آرام و آسائش کے لیے سہولتیں فراہم کی گئی ہیں

لائبریری کی عمارت: ابتدا میں لائبریری کا

سمر وہ ہال تھا جس کی تعمیر ۱۹۰۶ء میں ہوئی اور جو لٹن لائبریری کہلاتا تھا۔ یہی ہال دارالمطالعہ تھا، کتابوں کا اسٹیک روم بھی اور دفتر بھی۔ جب کالج بڑھ کر یونیورسٹی بن گیا تو یہ ہال قطعی ناکافی ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۶۰ء تک لائبریری کی روزافزوں وسعت اور ترقی کی ضروریات کو ہال کے دونوں جانب کمرون کو لائبریری میں شامل کرکے کسی حد تک پورا کیا جاتا رہا۔ لائبریری کی عمارت کی ضرورت پر وائس چانسلر کی سالانہ رپورٹ کو ہمیشہ موضوع بنی رہی۔ تاآنکہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند کے دور وائس چانسلری میں لائبریری کی نئی عمارت کا پلان نیرہ لاکھ روپے کی لاگت پر تیار ہوا جسے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے منظور کر لیا۔ عمارت کا نقشہ فن تعمیر کے مشہور ماہر فیاض الدین صاحب نے بنایا تھا عمارت کا سنگ بنیاد ۱۰ نومبر ۱۹۵۵ء کو آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو، وزیراعظم ہند نے رکھا۔ تعمیر کے کام کا افتتاح بزرگ ترین اولڈ بوائے جناب حبیب اللہ خاں صاحب کے دست مبارک سے ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد نئی لائبریری کو جو ابھی زیر تعمیر تھی مولانا مرحوم کے نام نامی سے موسوم کر دیا گیا۔ عمارت پانچ سال میں پایہ تکمیل کو پہنچی اور اس کا افتتاح پھر آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں ۶ دسمبر ۱۹۶۰ء کو ہوا۔ اصل عمارت دو منزلہ ہے لیکن کتابیں رکھنے کا حصہ سات منزلہ ہے۔ حالانکہ لائبریری کی عمارت آئندہ بیس سال کی توسیع کو پیش نظر رکھ کر کی گئی تھی لیکن طلبہ، اساتذہ اور ریسرچ کرنے والوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد اور کتابوں کے ذخیرہ میں بے پناہ اضافہ نے جلد ہی عمارت کو تنگ کر دیا اور دس سال بعد ہی لائبریری پھر جگہ کی قلت کے مسئلہ سے دوچار ہو گئی۔ گزشتہ دس سال میں مسلسل کوششوں کے باوجود عمارت میں کوئی اضافہ نہ ہو سکا اور اب ۱۹۸۲ء میں صورت حال اتنی سنگین ہو گئی ہے کہ نہ مزید کتابیں رکھنے کی جگہ ہے اور نہ ہی طلبہ اور تحقیقی کاموں میں منہمک افراد کی موجودہ تعداد کے لیے گنجائش۔ لائبریری کو کم از کم دو نئے دارالمطالعہ اور کتابیں رکھنے کے لیے مزید جگہ کی ضرورت ہے۔

لائبریری کے ذخائر: ۱۹۲۰ء میں جب یونیورسٹی قائم ہوئی تو کتابوں کی مجموعی تعداد اکیس ہزار تھی اور اب یہ تعداد چھ لاکھ ۱۱ ہزار ۶ سو بہتر ہے۔ برصغیر کی بہت کم یونیورسٹی لائبریریوں کے پاس اتنا عظیم ذخیرہ ہے۔ یہ ذخیرہ کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ مضامین کی وسعت کے اعتبار سے، نادر و نایاب کتب اور مخطوطات کے اعتبار سے، کلاسیکی لٹریچر کے اعتبار سے، علوم مشرقیہ کے لٹریچر کے اعتبار سے اور مشرقی زبانوں بالخصوص اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں کتابوں کی ایک معتد بہ تعداد کے اعتبار سے۔ اب سے پورے سو سال پہلے ۱۸۸۲ء میں لائبریری کو سینٹیفک سوسائٹی کی کتابوں کا ذخیرہ ملا۔ اور اس کے ساتھ ہی لائبریری کے ریسرچ کلکشن کی ابتدا ہوئی وقت کے ساتھ ساتھ یہ علمی و تحقیقی ذخیرہ برابر بڑھتا رہا ہے۔ اس ذخیرے کے دو بڑے حصے ہیں۔

مخطوطات اور مطبوعات۔

مخطوطات:

لائبریری کی متاع بیش بہا اور اس کا اصل سرمایۂ افتخار نادر و نایاب مخطوطات اور نوادر علمیہ کا ذخیرہ ہے۔ سرسید ہی کے ذاتی کتب خانے سے اس ذخیرہ کا آغاز ہوا۔ انھیں قلمی کتابیں جمع کرنے کا بھی بڑا ذوق تھا۔ " تاریخ گزیدہ" کا وہ نسخہ جس پر ضیغمی کی تحریریں

ہیں، سرسید ہی کے ذاتی کتب خانہ کا نسخہ ہے۔ مخطوطات کی بڑی تعداد عربی اور فارسی میں ہے لیکن اردو میں بھی ایک معتدبہ تعداد موجود ہے۔ کچھ قلمی کتابیں ہندی اور سنسکرت میں بھی ہیں۔ یہ ذخیرہ اسلام اور اسلامی علوم تصوف، مابعدالطبیعات، اسلامی اخلاقیات، علم الکلام، فلکیات (ہیئت ونجوم)، ریاضی، سائنسی علوم، طب یونانی، عہد وسطیٰ کی تاریخ بالخصوص تاریخ ہند، عربی فارسی واردو ادب، سیرت وتذکرہ اور موسیقی پر ارباب علم وذوق اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بنیادی مواد فراہم کرتا ہے۔ پرو وائس چانسلر کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۲۴ء میں مخطوطات کی مجموعی تعداد ۶۲۸ تھی۔ لیکن لائبریری کے موجودہ ریکارڈ کے مطابق (جو صحت طلب ہے) یہ تعداد اب ۱۴۴۶۲ ہے۔ زبان کے اعتبار سے تعداد حسب ذیل ہے

عربی	۸۱۸۱
فارسی	۵۰۹۶
اردو	۱۰۶۹
ہندی	۱۱۴
سنسکرت	۱۲

یہ عظیم الشان ذخیرہ جو برصغیر میں غالباً مخطوطات کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے اپنی نشوونما میں زیادہ تر عطیات کا مرہون منت ہے۔ خریدکردہ مخطوطات کی تعداد نسبتاً کم ہے اہم عطیات میں خصوصیت سے قابل ذکر مولوی سبحان اللہ خاں، نواب صدر یار جنگ، نواب عبدالسلام خاں، مولانا عبدالحی فرنگی محلی، سرشاہ سلیمان، قطب الدین، منیر عالم، ایجوکیشنل کانفرنس (آفتاب کلکشن)، احسن مارہروی، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اور جواہر میوزیم کے ذخیروں کے عطیات ہیں۔ ان کے علاوہ یونیورسٹی کا اپنا کلکشن ہے جو زیادہ تر خرید کردہ مخطوطات پر مشتمل ہے۔

ان عطیات میں سبحان اللہ کلکشن نہ صرف تعداد میں سب سے زیادہ ہے، بلکہ موضوعات کی وسعت کے اعتبار سے کافی وقیع ہے۔ قلمی کتابوں کی بہترین خطاطی اور تزئین کاری بھی اس کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ حبیب گنج کلکشن اسلامی علوم، تصوف، فارسی واردو ادب بالخصوص فارسی شاعری، عہد مغلیہ کی مصوری اور منقش ومرصع نسخ قلمی کے اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اس ذخیرہ کے فارسی شاعری کے مخطوطات کا کیٹلاگ شائع ہوچکا ہے۔ اس میں مثنوی معنوی، بوستان سعدی، دیوان ابن یمین، مجمع البحرین دیوان امیر شاہی، دیوان آصفی، مظہر الاسرار، دیوان روزبہان صبری، کلیات عرفی، دیوان حافظ، قصائد فیضی، دیوان صائب دیوان بے دل، دیوان آرزو، کلیات حزین، دیوان کمال خجندی اور صورت فتانیہ کئی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ بعض نادر ونایاب ہیں اور ان کے نسخے کسی دوسری جگہ نہیں ملتے۔ بعض شاہی کتب خانوں میں رہ چکے ہیں اور ان پر بادشاہوں اور امراء کی تحریریں، دستخط اور مہریں ہیں۔ بعض مشہور خطاطوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ بعض شعراء کی زندگی میں ہی مکتوب ہوئے۔ اور بعض کی کوئی اور اہم خصوصیت ہے۔

تاریخی اہمیت کے اعتبار سے یونیورسٹی کلکشن اور عبدالسلام کلکشن کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ذخیروں کی خصوصیت ہندوستان پر افغان حکومت سے متعلق بنیادی تحقیقی مآخذ اور ہندوستان کے مسلم عہد کی تاریخ پر بیش بہا کتب ہیں۔ حبیب گنج، سبحان اللہ، شیفتہ، سلیمان اور منیر عالم کے مجموعات میں بھی تاریخ پر کافی

تعداد میں کتابیں ہیں۔ تاریخ عالم اور تاریخ اسلام کے علاوہ سلجوقیوں، منگولوں، تیموریوں، صفویوں اور دورِ نادر شاہ کی تاریخ پر نیز افغانستان اور ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ پر یہ کتابیں بے انتہا تحقیقی اہمیت کی حامل ہیں۔ بعض اعتبار سے اہم اور نادر و کمیاب کتابوں میں خصوصیت سے قابلِ ذکر "صبحِ صادق" مصنف مرزا محمد صادق بن محمد صالح اصفہانی (م ۱۰۶۱ھ)، "مراۃ آفتاب نما" مصنف عبدالرحمٰن تصنیف ۱۲۱۷ھ، "حقیقتہائے ہندوستان" مصنف لچھمی نرائن شفیق (تصنیف ۱۲۰۴ھ) "ذکر الملوک" از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مکتوبہ ۱۰۳۰ھ) "ترجمۂ تاریخ طبری" مترجمہ ابو محمد (مکتوبہ ۱۰۳۰-۱۰۲۹ھ) حبیب السیر فی اخبارِ افراد البشر" مصنف غیاث الدین (مکتوبہ مولانا شاہ محمد ۱۰۱۰ھ) "تذکرۃ السلاطین چغتا" مصنف محمد ہادی ۱۱۴۲ھ خان ۱۱۳۴ھ) اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کی "تواریخ عزیزی" مکتوبہ ۱۲۷۷ھ ہیں۔

نادر قلمی کتابوں میں "حال نامۂ بایزید انصاری" مرتبہ ملا محمد بن ابوبکر قندھاری (عہدِ اکبری کے مشہور بزرگ بایزید انصاری کا ذکر) اور "نفائس المآثر" مصنف مرزا علاء الدولہ نامی قزوینی۔ سال تالیف ۹۷۳ھ۔ ۱۵۶۵ء (دسویں صدی ہجری کے شعراء کا تذکرہ اور بابر سے اکبر تک تیموریوں کی تاریخ) کا ذکر ضروری ہے۔ ان دونوں تذکروں کے نسخے کسی اور جگہ نہیں ملتے۔ برٹش میوزیم میں نفائس المآثر کے صرف کچھ اقتباسات ملتے ہیں۔

مصنفوں کے خود نوشت نسخوں میں دیوانِ صائب بخطِ صائب "فتح المتعال فی مدح النعال" مصنفہ احمد بن محمد المغربی بخطِ مصنف مکتوبہ ۱۰۳۳ھ "چار چمن" مصنف غلام محی الدین مبتلا مکتوبہ ۱۸۰۷ء "شرح خطبۃ القواعد" مصنف فخر الدین بن محمد الحسن بن یوسف علی بن المطہر مکتوبہ ۹۰۰ھ "عیون الاجوبہ فی فنون الاسولہ" مصنف ابو القاسم عبدالکریم ہوازنی القشیری (متوفی ۴۶۵ھ) قابلِ ذکر ہیں۔ دیوان صائب کا ایک اور نسخہ ہے جس کی کتابت ۱۰۸۵ھ میں صائب کے شاگرد عارف تبریزی نے کی ہے۔ یہ نسخہ صائب کی نظر سے گزر چکا ہے اور مختلف صفحوں کے حواشی پر اُس نے اپنی غزلیں اپنے قلم سے بڑھائی ہیں۔

ایسے بھی نسخے ہیں جن پر مشاہیر کی تحریریں یا دستخط یا مہریں ہیں۔ "اشعار دیوان ترکی" کے صفحہ اوّل پر جہانگیر کی تحریر اور مختلف امراء کی تحریریں اور مہریں ثبت ہیں۔ "ترجیعات عراقی" مکتوبہ ۹۰۰ھ کے پہلے صفحہ پر بھی جہانگیر کی تحریر اور دستخط ہیں۔ "بہارستان جامی اور نفحات الانس" مکتوبہ ۸۸۳ھ پر جامی کی تحریریں ہیں "تاریخ گزیدہ" مصنف خواجہ حمداللہ مستوفی کے پہلے صفحہ پر عہدِ اکبری کے مشہور شاعر اور ادیب ابوالفیض فیضی کی تحریر دستخط اور مہریں ہیں۔ "صحاح جوہری" ابو نصر اسماعیل بن حماد الجوہری کی مشہور لغت کا قدیم نسخہ ہے جس کی کتابت ۶۲۸ھ میں ہوئی۔ اس پر سب سے اہم تحریر مسعود بن ... مسعود القونوی متوفی ۷۷۱ھ کی ہے۔ غزالی کی "القسطاس المستقیم" معرفت باری کے سلسلہ میں مختلف بیانوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ایک مقام پر سر سید نے حاشیہ پر ایک نوٹ لکھا ہے اور غزالی کے استدلال کا بڑے پُر زور انداز میں رد کیا ہے۔

معتبر نسخوں میں "خمسۂ نظامی" نظامی گنجوی کی مشہور کتاب (مکتوبہ حسین عبداللہ ۸۷۳ھ "مثنوی حسینی" سال تالیف ۱۱۶۳ھ) "دیوان حافظ"

مکتوبہ عبدالرحمٰن ۱۰۷۱ھ، مثنوی مولوی معنویؒ (مکتوبہ عبداللہ بن قنبر سمرقندی ۱۰۱۹ھ اور "حملۂ حیدری" از محمد رفیع خان باذل مشہدی قابلِ ذکر ہیں۔

مرصع و منقش نسخوں میں "کریما" مکتوبہ بدر علی تلمیذ آغا مرزا (۱۲۷۷ھ) "ملفوظات صاحب قرآن" از افضل بخاری مکتوبہ ہدایت اللہ ۱۲۲۰ھ، "ہفت بند کاشی" مکتوبہ عطار در قم ۱۲۸۰ھ اور قصیدہ حافظ شیرازی در منقبت امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ قابلِ دید ہیں۔

قرآن حکیم کے متعدد نادر و نایاب نسخے بھی اس ذخیرہ کا اہم جزو ہیں۔ ان میں سے بعض نسخے شاہان مغلیہ کے ذاتی کتب خانوں میں تھے۔ ایک نسخے کی کتابت شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر سے منسوب کی جاتی ہے۔ ایک اور نسخہ دور شاہجہانی کے مشہور خطاط عبد الباقی حدّاد کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ چرم آہو پر سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کا کچھ حصہ اس ذخیرہ کا قدیم ترین نسخہ ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منسوب ہے۔ ان کے علاوہ قرآن شریف مترجم فارسی بخط کشمیری تقطیع کلاں، برحاشیہ تفسیر حسینی مکتوبہ ۱۲۸۲ھ، قرآن مجید (سی د... قی) قرآن پاک تقطیع کلاں مکتوبہ ۱۲۰۱ھ، بین السطور فارسی ترجمہ اور حواشی پر تفسیر فارسی، قرآن شریف بخط ثلث، حمائل شریف اور دیگر نسخ قرآنی فن خطاطی اور تزئین کاری کے بہترین نمونے ہیں۔ قرآن پاک کے کچھ اور نوادر بھی ہیں۔ ایک صدری پر پورا قرآن خفی قلم میں مکتوب ہے۔ چند گز لمبے اور آدھ فٹ چوڑے کاغذ پر مکمل قرآن مجید بخط غبار تحریر ہے۔ اس کو کاغذ کے نیچے کپڑا لگا کر محفوظ کیا ہے۔ علاوہ ازیں قرآن شریف کے صرف تیس پارے خط نسخ خفی میں پارچہ مومی پر تحریر ہیں۔

نادر کتب عربی میں "نہج البلاغۃ" مکتوبہ علی بن ابی قاسم ابن علی (سال کتابت ۳۸۵ھ) شاید دنیا کا قدیم ترین نسخہ ہے۔ بعض نامور علماء اور مشاہیر کے قبضہ میں یہ نسخہ رہ چکا ہے اور ان کی تحریریں اور مہریں موجود ہیں۔ "جمہرۃ اشعار العرب" مرتبہ ابو الخطاب القرشی عربی شاعری کا مجموعہ ہے۔ جس کی کتابت ۹۹۰ھ میں ہوئی۔ اس سے زیادہ قدیم نسخے کے وجود کا پتہ نہیں چلتا۔ "تاویل المتشابہات فی اخبار والآیات" مصنفہ عبد القاہر البغدادی متوفی ۴۲۹ھ بھی نادر مخطوطہ ہے۔ دنیا میں اس کتاب کے سوا کسی دوسرے نسخہ کا علم نہیں۔ اسی طرح "سہو المصلین" مکتوبہ ۸۳۱ھ فقہ کی ایک نایاب کتاب ہے۔

تراجم میں مہابھارت کا فارسی ترجمہ از نقیب خان بحکم شہنشاہ اکبر مکتوبہ ۴۸-۱ء، راجہ بیربل کا بھگوت گیتا کا ہندی ترجمہ اور ابو الفیض فیضی کا بھگوت گیتا کا فارسی ترجمہ تاریخی و علمی اعتبار سے اہم ہیں۔

خوشخط نسخے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ "دیوان لسانی" مکتوبہ حسن قلمی ۹۸۳ھ، "خمسۂ نظامی" مکتوبہ میر محمد بن سلیمان بخط نستعلیق، مثنوی مولانا روم ۱۰۸۹ھ، "زاد المعاد" مکتوبہ طاہر شیرازی ۱۲۳۵ھ اور "طبقاتِ اکبری" از خواجہ نظام الدین بخشی مکتوبہ عبد الحی قریشی ۱۰۰۳ھ کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس ذخیرہ میں کچھ شاہی فرامین بھی ہیں۔ شاہان مغلیہ کے فرامین میں بابر، اکبر، شاہجہاں شاہ عالم، اور شاہ عالم گیر ثانی کے فرامین قابل ذکر ہیں

ان میں بابر کا فرمان سب سے بڑا ہے اور اس پر بابر کی اپنی مہر ثبت ہے۔ ایک فرمان محمد شاہ بادشاہ کا بھی ہے۔ فرامین کے علاوہ ۹۵۰ قدیم سکے بھی اس ذخیرہ میں ہیں۔ تقریباً سارے مسلمان بادشاہوں کے سکے موجود ہیں۔

عربی اور فارسی خطاطی کے نمونوں کی بھی خاصی تعداد یہاں موجود ہے۔ ان میں خط نسخ، خط نستعلیق، خط غبار، خط شکستہ، خط رعشہ، خط ناخن اور خط معکوس کے نادر نمونے ہیں۔ تقریباً تمام مشہور خطاطوں کی وصلیاں موجود ہیں۔ ان میں میر عماد الحسینی محمود بن اسحٰق شہابی، آقا عبدالرشید دیلمی شاگرد میر عماد، عبدالرحیم عنبرین قلم، ہدایت اللہ، حافظ نور اللہ (عبدالرشید دیلمی کے متبع) اور شیخ طاہر وحید کے نام سر فہرست ہیں۔ ان کے علاوہ مغل بادشاہ بہادر شاہ، دار بخت ولی عہد بہادر شاہ اور شہزادہ علی بخش کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وصلیاں بھی موجود ہیں۔

دیگر اہم نوادرات میں سنسکرت میں سنہاسنا کا ڈرامہ ملایالم رسم الخط میں اور آیور وید تیلگو زبان میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں درخت کی چھال پر لکھے ہوئے ہیں۔

علاوہ ازیں ایک چاول پر ڈاکٹر ضیاء الدین، سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی نہایت عمدہ تصویر بنی ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ان کا نام مع ڈگریوں کی تفصیل (سی آئی ای، ایم اے (کینٹب) پی ایچ ڈی، ڈی ایس سی) تحریر ہے۔ ایک دوسرے چاول پر پوری سورہ اخلاص مع بسم اللہ تحریر ہے۔ علاوہ ازیں یہ عبارت "سید سبحان اللہ رئیس اعظم گورکھپور" بھی مکتوب ہے۔

لائبریری نے نادر و نایاب قلمی کتابوں کے فوٹوگراف اور مائیکرو فلم بھی بڑی تعداد میں حاصل کیے ہیں۔

برٹش میوزیم سے جن مخطوطات کے روٹوگراف حاصل کیے گئے ہیں اُن میں "نسخ جہاں آرا" مصنفہ احمد بن محمد معروف بہ قاضی غفاری، دیوان عمادی غزنوی، "دیوان غزالی مشہدی"، "تاریخ احمد شاہی" از محمود المنشی ابن ابراہیم الحسینی اور "لطائف السعادت" از انشاء اللہ خاں انشا اہم ہیں۔ برلین کے کتب خانہ سے "محاسن المساعی فی مناقب الامام الاوزاعی" (امام اوزاعی کے حالات پر بڑی کارآمد کتاب۔ سالِ تالیف ۸۵۰ھ) "نزہتہ الارواح" مصنفہ شہرزوری اور استنبول سے "کتاب التفہیم" از البیرونی کے روٹوگراف منگائے گئے ہیں۔ "المقفیٰ" ابن مقفع کا روٹوگراف مشتمل بر سہ جلد ہالینڈ سے منگایا گیا ہے۔

مشاہیر کے خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ بھی شعبۂ مخطوطات کی اہم خصوصیت ہے۔ ان میں سر سید اور ان کے قریبی رفقاء مثلاً ان کے صاحبزادے سید محمود، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حالی، مولانا شبلی، مولوی ذکاء اللہ وغیرہ کے خطوط کے علاوہ علماء، سیاسی رہنما، مشاہیر ہند، شعراء اور ادیبوں کے مکاتیب بھی شامل ہیں۔ اس طویل فہرست کی اہم شخصیات مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا لطف اللہ علی گڑھی، مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، علامہ اقبالؒ، آنریبل سر امیر علی، سید علی بلگرامی، سر کشن پرشاد، سر رضا علی، شمس العلماء محمد حسین آزاد، عبدالحلیم شرر، اکبر الہ آبادی، مرزا غلام احمد قادیانی، سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر ذاکر حسین، تھیوڈر ماریسن، تھیوڈر بیک اور جیمس لٹوش ہیں۔

باقی صفحہ نمبر ۲۹ پر ملاحظہ فرمایئے

ڈاکٹر اطہر پرویز
شعبۂ اردو
اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے عہد کا علی گڑھ

رشید احمد صدیقی ۱۹۱۵ء میں طالب علم کی حیثیت سے علی گڑھ آئے۔ یہ زمانہ تھا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا۔ وہی ایم اے او کالج جس سے یونیورسٹی برآمد ہوئی۔ اس زمانے میں کالج کی شہرت و شوکت اپنے عروج پر تھی کھیل کود میں، پڑھنے لکھنے میں، یونین کی سرگرمیوں میں، رئیسانہ اور شریفانہ رکھ رکھاؤ میں، چھوٹے بڑوں کے آپس کے سلوک میں، غرض کہ اس وقت کے معیار سے زندگی کا ہر پہلو بابرکت اور بارونق نظر آتا تھا اور ایک طرح کی آسودگی اور آرزومندی کی فضا چپے چپے پر چھائی ہوئی تھی۔ رشید صاحب سنہ ۲۴ء میں استاد کے منصب پر فائز ہوئے ۳۰ سال خدمت کرنے کے بعد سنہ ۵۸ء میں اس عہدے سے سبکدوش ہوئے اور ۱۹ سال بعد یعنی ۷۷ء میں اسی سرزمین میں دفن ہوئے۔ رشید صاحب نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ انھیں نیا نہیں بلکہ دھلا ہوا کفن دیا جائے۔ کیونکہ یہ حضرت عمرؓ کا ارشاد تھا۔ انھیں ۱۵ جنوری ۷۷ء کو ان کی وصیت کے مطابق یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

مئی سنہ ۷۶ء میں مجھے حکومت ہند نے ماریشس بھیجا۔ جانے سے پہلے میں اپنے استاد محترم سے ملنے گیا۔ بڑی محبت سے ملے۔ میں نے شکایت کی کہ آپ نے گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے۔ طالب علم آپ کو دیکھنے کو ترستے ہیں۔ درسی کتابوں میں آپ کے مضامین پڑھتے ہیں کینیڈی ہاؤس میں جب پھولوں کی نمائش ہوتی ہے تو بہت سے لڑکے لڑکیاں آپ کو دیکھنے کی آرزو لے کر جاتے ہیں لیکن وہاں آپ کے لگائے ہوئے پھول ہوتے ہیں آپ نہیں ہوتے۔" رشید صاحب مسکرائے اور کہنے لگے "میاں! میں اسی طرح لوگوں کے کہنے پر بلکہ بہکانے میں آکر اپنی یونیورسٹی کو دیکھنے نکلا۔ ابھی ذاکر باغ سے باہر بھی نہیں آیا تھا کہ چند لڑکیاں رنگ برنگے کپڑے پہنے بال کھولے نظر آئیں۔ یہ لڑکیاں برقع نہیں پہنے تھیں میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ کیا یہاں پردہ بالکل اٹھ گیا ہے۔" انھوں نے کہا "رشید صاحب مگر یہ تو لڑکے ہیں۔ آج کل کا فیشن کچھ ایسا ہی ہے کہ لڑکے بڑے بڑے بال رکھتے اور رنگین کپڑے پہنتے ہیں"۔ میں بھونچکا سا رہ گیا مجھے آنکھوں پر یقین نہیں آیا اور میں الٹے پاؤں واپس آگیا۔ اچھا ہے وہ تصویر جو میں نے اپنی یونیورسٹی کی اپنی آنکھوں میں سجائی ہے مرتے دم تک قائم رہے۔ بس وہ دن ہے اور آج کا دن — میں گھر سے باہر نہیں نکلا۔"

میرا علی گڑھ کا تعلق چالیس سال کا ہے۔ اس سے پہلے کا علی گڑھ میں نے رشید صاحب کی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس کے بعد کا خود برتا ہے — "گویا کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے"۔

رشید صاحب کے عہد کا علی گڑھ میں الف لیلہ کی داستان معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ اس عہد کے علی گڑھ سے واقف نہیں ہیں وہ اندازہ نہیں کرسکتے کہ ادب، آرٹ، زندگی اور تنقید کے کیسے کیسے فرعون اور دوستی اس وقت یہاں موجود تھے — علی گڑھ کبھی بھی ایک خالص مدرسہ نہیں رہا۔ یہ ایک تہذیب ایک روایت اور ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے تھے کہ جب کوئی معقول آدمی نظر آتا ہے تو میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ ضرور علی گڑھ سے فیضیاب ہوا ہوگا اور جب مجھے معلوم ہوتا کہ اس نے کہیں اور تعلیم پائی ہے تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ اگر اس نے علی گڑھ میں پڑھا ہوتا، تو اس کی شخصیت اور نکھر گئی ہوتی — علی گڑھ کی اس محبت میں عقیدت کو نو حصہ دخل ہے گا'

لیکن یہاں حقیقت بھی اپنا کام کرتی ہے۔ استاد تو ہر درس گاہ میں تعلیم و تربیت کا خیال رکھتے ہیں یہاں اس ذمہ داری کو بانٹنے والوں میں سینیر طلبا بھی شریک ہوتے ہیں۔ رشید صاحب لکھتے ہیں:

"ایک سینیر طالب علم میرے وطن سے آئے جہاں انکے والد گورنمنٹ کے ایک ذمہ دار عہدے پر مامور تھے۔ گھر والوں نے میرے لیے یونیفارم کا کپڑا بھیجا بورڈنگ ہاؤس پہنچ کر انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ میرے کمرے پر تشریف لائے، گھر والوں کی خیریت تفصیل سے سنائی اور بتایا کہ یونیفارم کا کپڑا لائے تھے۔ میں نے بے اختیار پوچھا کہاں ہے۔ مسکرائے اور بڑے اطمینان اور شفقت سے فرمایا "کمرے پر ہے" معاً مجھے احساس ہوا کہ میری یہ حرکت "فریشر" یا "نو وارد" کی تھی۔ بولے "چار بجے میرے کمرے پر آجاؤ، میرے ساتھ چلنا، سو کپڑا مل جائے گا"۔ یہ توقف مجھے بڑا شاق ہوا۔ بارے وقت آیا اور میں ان کے کمرے پر پہنچا۔ دروازے پر آکر پذیرائی کی، دوسروں سے تعارف کرایا۔ کھیلنے اور پڑھنے کے بارے میں پوچھتے رہے۔ بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا "کپڑا مرحمت ہو میں جانا چاہتا ہوں"۔ بولے "ضرور۔ ضرور" نوکر کو آواز دی۔ وہ آیا۔ بکس کی کنجی اس کے حوالے کی، کپڑا نکلوایا میں نے چاہا کہ کمرے سے بھاگ کھڑا ہوں۔ بولے "ذرا ٹھہرو، نوکر چائے کے برتن ہٹا دے۔ وہ کپڑا لے کر تمھارے ساتھ جائے گا۔" میں چاروں خانے چت تھا لیکن شاید چت ہونے میں ایک دو خانہ باقی تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک اور سینیر رونق افروز تھے۔ میں نے نوکر سے جھپٹ کر کپڑا لیا اور بکس کھول کر رکھنے لگا۔ نوکر جانے لگا تو سینیر صاحب نے آواز بلند مجھے مخاطب کر کے فرمایا۔ "دو آنے نوکر کو دیے دیتا ہوں روپے میں بیس "آنے" رہیں گے"۔ اب میں چاروں خانے چت تھا۔"

یہ تو تھی سینیر کی بات۔ استادوں کا اپنا انداز تھا۔ پروفیسر رینل انگریز پروفیسر تھے۔ قاعدے قانون کے نہ صرف خود پابند تھے اپنے شاگردوں سے بھی پابندی کراتے تھے۔ اتفاق سے ایک دن کلاس دیر سے پہنچے لڑکے جا چکے تھے دوسرے دن آئے تو کہا جب تک تم کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں رخصت پر ہوں یا مر گیا، اس وقت تک میری کلاس نہ چھوڑا کرو۔ یورپین اسٹاف نے استعفیٰ دیدیا۔ رینل صاحب شام کی گاڑی سے علی گڑھ چھوڑنے والے تھے۔ اس دن انھوں نے حسب معمول کلاس لی اور پوری توجہ سے آخر وقت تک پڑھاتے رہے۔ گھنٹہ بجا اور کلاس اٹھنے لگی تو کتاب بند کی اور بولے۔ "حضرات! خدا حافظ!"۔ رینل صاحب کی آواز کسی قدر گلوگیر ہو گئی تھی

میں نے اپنے زمانے میں سابق وائس چانسلر کرنل سید بشیر حسین زیدی کو چارج دینے سے پہلے اسی طرح کام کرتے دیکھا تھا۔ میڈیکل کالج کے پلان کے بارے میں اسی انداز سے بات کر رہے تھے جیسے وہ یہاں رہنے والے ہوں اور آدھ گھنٹے کے بعد انھوں نے نئے وائس چانسلر کو چارج دے دیا۔

ام اے او کالج کھیل کود کا بھی بہترین زمانہ تھا۔ کرکٹ میں تو اس کا مقابلہ کوئی یونیورسٹی نہ کر سکتی تھی اس کی فتوحات نے روایات کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ ڈسپلن کی پابندی سختی سے کی جاتی تھی لیکن بعض اوقات ناخوشگوار باتیں بھی ہوتی تھیں، ایک بار کرکٹ کی ٹیم ٹور پر جانے والی تھی، ایک کھلاڑی اور کپتان میں کسی بات پر اختلاف ہو گیا کھلاڑی نے ٹور پر جانے سے انکار کر دیا جس سے ٹیم میں کمزوری کے آثار نظر آنے لگے، معاملہ رفع دفع نہ ہوا تو پرنسپل کو رپورٹ دی گئی انھوں نے حکم دیا کہ اس کھلاڑی کو ٹیم کے ساتھ لے جاؤ، کسی میچ میں کھیلنے نہ پائے اور ہر میچ کے دوران "اسکورر" کے پاس بیٹھ کر کھیل دیکھنے سے "لطف اندوز" ہو۔ اس کی حرف بحرف تعمیل ہوئی۔

علی گڑھ میں یونیفارم کو قانون ہی نہیں تہذیب اور شائستگی کی علامت سمجھا گیا ہے۔ دیکھنے والے اپنی یونیفارم میں اور کھلاڑی اپنی یونیفارم میں۔ اس منظر کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ رشید صاحب نے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "علی گڑھ کی ٹیم میچ کھیلنے باہر گئی۔ میچ ایک مشہور کالج کی ٹیم سے تھا۔ اتفاق یہ کہ جن کے ساتھ میچ ہونے والا تھا وہ ٹینس کی یونیفارم میں نہ تھے۔ اس زمانے میں ٹینس کا یونیفارم سپید فلالین یا زین کا پتلون یا سپید ہی فلالین یا لونگ کی قمیص پر مشتمل تھا۔ علی گڑھ کی ٹیم نے اس بنا پر کھیلنے سے انکار کر دیا کہ مقابل ٹیم کے کھلاڑی مناسب یونیفارم میں نہ تھے ان کا کہنا تھا کہ وہ اس کو گوارہ نہیں کر سکتے کہ علی گڑھ کسی میچ میں اور ایسی ٹیم کے ساتھ کھیلے جہاں ٹینس کا احترام ملحوظ نہ رکھا جاتا۔

یونیفارم علی گڑھ کی زندگی کا لازمی حصہ تھا صبح سے شام تک ہر لڑکا یونیفارم میں نظر آتا تھا۔ اگر کسی موقع پر کسی ساتھی کو دوسرے لباس میں دیکھ

بتے تو جھجک جاتے تھے کہ وہی ہے یا کوئی اور۔ عیدین کے موقع پر جب یونیفارم کی قید اٹھا دی جاتی تو ہندوستان کے مختلف حصوں کے طلبا اپنے اپنے علاقوں کے لباس میں دکھائی دیتے۔ یہ خوبصورت نظارہ کہاں دیکھنے کو ملتا

یہ تو تھی یونیفارم کی بات — ہوسٹل میں — ڈائننگ ہال طلبا کی شکتی اور تہذیبی زندگی کا خاص مرکز تھا۔ اس نے طالب علموں کو خوش طبعی کے مواقع فراہم کیے۔ کھانا تو زندگی بھر کھایا ہے لیکن علی گڑھ کا ڈائننگ ہال پھر کہاں۔ جب سے ڈائننگ ہال شروع ہوا ہے علی گڑھ کے طالب علموں نے اس کے کھانے پر بڑی بڑی طبع آزمائیاں کی ہیں۔ اس پر نظمیں لکھی ہیں، ڈرامے کیے گئے ہیں، سیمنار ہوتے ہیں۔ رشید صاحب نے ایک سیمنار کی چند باتیں جو لکھی جا سکتی تھیں، لکھ دی ہیں۔

ایک صاحب نے ڈائننگ ہال کے کھانے پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ تحقیقات کی رو سے کالج کا کوئی طالب علم نہ تو شرعی گواہ ہو سکتا ہے اور نہ الیکشن میں ووٹر۔ اس لیے کہ ان کا ہاضمہ اتنا قوی اور ڈائننگ ہال کا کھانا اتنا ضعیف ہوتا ہے کہ کھانے کا فضلہ بھی ان کا جزو بدن ہو جاتا ہے۔

ام اے او کالج کا زمانہ علی گڑھ کا سنہرا دور کہا جاتا ہے جس نے مولوی عبدالحق، سجاد حیدر یلدرم، عبدالرحمٰن سنجری، عبدالرحمٰن بجنوری، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی وغیرہ کی تعلیم و تربیت کی۔ انھوں نے انھیں ہوسٹلوں میں اپنی طالب علمی کے ادوار بسر کیے، انھیں ڈائننگ ہالوں میں کھانا کھایا۔

کالج کی زندگی میں صرف استادوں اور بزرگوں سے سابقہ نہیں پڑتا، بیرے، ڈاکیے، چپراسی اور دھوبی کا بھی اپنا مقام ہے۔ سرسید نے ایسے معاشرے کی بنیاد ڈالی تھی جہاں ان کی عزت کی جاتی تھی۔ اس کے بانی یہ وہ ان کا خیال کرتے تھے کہ ان نوجوانوں کو گھر سے دوری کا احساس بھی نہ ہونے پائے۔

اس زمانے میں نئے طالب علموں کو بیرے اکثر جھڑک بھی دیتے کبھی کبھی مربیانہ انداز بھی اختیار کرتے۔ بعض نوجوان تنک مزاج ہوتے تھے۔ غصے میں بیروں کو سخت سست کہہ دیتے تھے۔ شاید ہاتھ بھی اٹھا دیتے لیکن

اس زمانے میں بیروں کو مارنا سنگین جرم سمجھا جاتا تھا۔ جو شخص بھی ایسی غلطی کرتا اسے وارڈن سخت سزا دیتے۔ وہ ساتھیوں کی نظر میں گر جاتا اور ہوسٹل میں بدنامی الگ ہوتی۔ اگر طالب علم ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ لیں تو یہ اتنا بڑا جرم نہیں مانا جاتا تھا کیونکہ وہ ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھا سکتے تھے لیکن نوکر دوں کی تحت طالب علم پر ہاتھ اٹھانے کی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ان کو مارنے کی سخت سزا دی جاتی۔ علی گڑھ میں نوکر کو شاید اسی لیے آقائے نامدار کہتے ہیں"۔

دھوبی کی وقعت کچھ زیادہ ہی تھی۔ اپنی سپید پوشی کے ساتھ دوسروں کو بھی سپید پوش رکھتا تھا۔ رشید صاحب کے زمانے میں ایک دھوبی تھا۔ انگنو دھوبی۔ آپ نے اس دھوبی کی زبان سے اس زمانے کی کچھ باتیں سنیں۔ انگنو بڑھاپے میں اس عہد کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "میاں! وہ دن بھی کیا تھے اور کیسے کیسے اشراف کالج میں پڑھنے آیا کرتے۔ قیمتی خوبصورت نرم و نازک سلیقے کے کپڑے پہنتے جلد اتار دیتے تھے اور جلد دھلنے کا تقاضا بھی نہ کرتے۔ ہر مہینے دو چار کپڑے ادھر ادھر کر دیتا اور نہال ہو گئے۔ ان کی اترن میں ہم ہمارے بچے اور رشتہ دار ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے علی گڑھ کی نمائش! میاں ان کے کپڑوں کو دھونے میں مزا آتا جیسے دودھ ملائی کا کاروبار ہاتھ لگانے میں مزا، دھونے میں مزا، استری کرنے میں مزا، دیکھنے دکھانے میں مزا۔ کوئی ایسا پاس کپڑے نہیں دھوتے تھے، کوتاہی کرتے تھے۔ آنے جانے والے تماشا دیکھیں، رشتہ ناتا، دنیا گا۔ اگر سید صاحب کے کالج کا دھوبی ہے پہچان [illegible] دو [illegible] بلا دا آتا۔ ایسے ایسے بڑے ہیں کر جاتا کہ گاؤں کا مکھیا اور پٹواری ملنے آتا۔ [illegible] سب ہاتھ جوڑ کر ملتے۔ شہر میں ہی شادی بیاہ ہوتا تو سب سے پہلے بلایا جاتا۔ تنخواہ والے کو لڑکا کر کہتے "بھیا انگنو لڑکی کا بیاہ ہے [illegible] کا معاملہ ہے۔ برادری کا معاملہ ہے [illegible] وقت میں کہا انشیحت رہو۔ [illegible] نہیں [illegible] لڑکی ہے۔ کالج جب ہوا نے فکر مت کرو میاں یقین ہا لو کالج کے لڑکوں سے کہا حضور لڑکی کی شادی ہے اپنے کپڑے نہیں آئیں گے۔ وہ کہتے۔ انگنو کچھ پرواہ نہیں جو چاہے لے جاؤ، دیکھو کام نہ کرنا ہم لوگ بھی انگنو میاں پھر کیا تھا۔ گز بھر کی چھاتی ہو جاتی۔ ایک بار ہی کے کپڑے دری، فرش، تولیے چاندنی، دسترخوان سب دھو کر لڑکی والے کے گھر پہنچا دیا۔ محفل جگمگ ہو جاتی ایسا معلوم ہوتا جیسے کالج کا کوئی جلسہ ہے۔ براتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے۔

باقی صفحہ ۴۴ پر

سید محی الدین اظہر
لیکچرر شعبہ فارسی
اے ایم یو علی گڑھ

سرسید اور علی گڑھ تحریک

ایک اجمالی تعارف

جن لوگوں کی نظر "علی گڑھ تحریک" کی تاریخ پر ہے ان پر یہ بات روشن ہے کہ جب ۱۸۵۷ء کا انقلاب ناکام ہو گیا تو انگریزی حکومت کا ردِ عمل تشدد کی صورت میں ظاہر ہوا۔ یوں تو اس انقلاب میں ہر مذہب و ملت کے افراد نے بھرپور حصہ لیا تھا کیوں کہ اس وقت دہلی کے بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھے اور ابھی لال قلعہ پر اسلام کا پھریرا لہرا رہا تھا۔ اس لیے انگریزوں کو یہ گمان ہوا کہ انقلاب کے ذمہ دار صرف مسلمان تھے۔ اور یہی وجہ تھی جس کے نتیجے میں مسلمان انگریزی حکام کے مظالم کا نشانہ بنے۔ صدیوں تک مسلمان اس جاہ و جلال سے ہندوستان پر حکومت کرتے رہے تھے کہ کبھی اپنی محکومی کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اب جو اچانک ان پر یہ آفتیں پڑیں تو وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ چوں کہ اس تصور نا کردہ حالات کے لیے ان کا ذہن پہلے سے تیار نہ تھا، اس لیے قدرتی طور پہ مایوسی اور کمتری جیسے مہلک احساسات میں مبتلا ہو گئے ان کے سوچنے، سمجھنے اور حالات سے مردانہ وار مقابلے کی قوت [illegible] ہوں کہ انگریزوں [illegible] کے بجائے وہ ماضی کے رومان انگیز کھنڈرات میں پناہ ڈھونڈنے لگے۔ ماضی میں مسلمانوں نے بے شمار مردہ دل انسانوں کے اندر زندگی کی تڑپ پیدا کی تھی اور حوصلہ ہارے ہوئے لوگوں کی ڈھارس بندھائی تھی۔ لیکن اب وہ خود مایوسیوں کے شکنجے میں اسی طرح جکڑے ہوئے تھے کہ ان میں زندگی کی کوئی علامت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اگر مسلمانوں نے صرف اقتدار ہی کھویا ہوتا تو کوئی بڑا نقصان نہ تھا کیوں کہ اقتدار آتا ہے اور چلا جاتا ہے مگر قوم کا وجود باقی رہتا ہے۔ بشرطیکہ اقتدار کے ساتھ حوصلہ نہ کھویا جائے۔ خود اعتمادی ایک ایسی دولت ہے جسے کھو کر انسان بالکل خالی ہو جاتا ہے اور کسی کام کا نہیں رہ جاتا۔ مسلمان بھی کسی کام کے نہ رہے۔ ہاں اگر انھیں کوئی کام رہ گیا تھا تو وہ عظمت رفتہ کا ماتم تھا، حال سے بیزاری تھی اور مستقبل سے مایوسی!

یہ وہ بحرانی دور تھا جب مسلمانوں کے سامنے حدِ نظر تک تاریکی ہی تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ انھیں مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی ضرورت تھی۔ مگر روشنی کی ہلکی سی کرن بھی دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ کسی رہنما کی جستجو میں تھے

مایوسی، ناکامی اضطراب اور کشمکش کے اسی لمحہ فکریہ میں سرسید احمد خاں نمودار ہوئے ــــــ وہ جو تھے آسمان سے نہیں اُترے تھے مگر ہندی مسلمانوں کے حق میں مسیحا صفت ضرور ثابت ہوئے۔ ان کے وجود سے عزم و ارادہ کی وہ کرنیں پھوٹیں جو خاورِ مشرق سے پھوٹتی ہیں خوابِ غفلت کے مزے لیتے ہوئے مسلمانوں نے انھیں دیکھ کر منہ بسورنا شروع کر دیا۔ مگر چونکہ وہ آفتابِ حیات تھے، اس لیے لوگ چادر تلے ہوئے دیر تک خراٹے نہ لے سکے۔ ان کی ذات نے جب فضا میں توانا روشنی کی کرنیں بکھیریں تو مسلمان ان کو زندگی تقسیم کرنے والی روشنیوں کا مخزن سمجھنے پر مجبور ہوئے۔ ان کے دلِ درد مند سے نکلی ہوئی صدائیں ایسی تھیں کہ سننے والے بے اختیار پکار اُٹھے

اجالا چھن رہا ہے روشنی تقسیم ہوتی ہے
تری آواز ہے یا زندگی تقسیم ہوتی ہے

مسلمانوں کی مشکوک سیاسی پوزیشن صاف کرنے کے لیے سرسید نے "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر بے باکی کے ساتھ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کر دیا۔ اس کتاب میں انھوں نے اس الزام کی تردید کی کہ انقلاب کے ذمہ دار صرف مسلمان تھے اور پوری پوری اخلاقی جرأت سے انگریزی سرکار کے ظلم و استبداد کی نشاندہی بھی کی۔ سرسید نے خوف و ہراس کے اس عالم میں ایسا جرأت مندانہ عمل پیش کیا، جب انگریز کے خلاف زبان پر ایک لفظ لانا بھی جرمِ عظیم سمجھا جاتا تھا اور بڑے بڑے لوگ بھی کمال منافقت سے ملکہ وکٹوریہ کی قصیدہ خوانی کرنے لگے تھے۔

سرسید کو مسلمانوں کی تباہی کا بے حد غم تھا۔ لیکن یہ غم کسی مرثیہ خواں کا غم نہ تھا۔ بلکہ یہ غم، وہ غم تھا جو قوم و ملت کے بے غرض اور سچے رہنما کے دل میں ہوا کرتا ہے۔ اُن کے سینے میں ایسا دل تھا، جس میں سارے مسلمانوں کی دھڑکنیں سمٹ آئی تھیں۔ راتوں کی خاموشی اور تنہائی میں ان کی آنکھیں بارہا موتی اور ان کے دل میں کرب ہوتی۔ مگر ان کی راتیں میر کی راتیں نہ تھیں۔ ان کی گریہ وزاری کسی مجازی محبوب کے فراق میں کسی رومان پرست کی گریہ وزاری نہ تھی۔ بلکہ ان کا محبوب ان کی قوم تھی۔ رہنمایانِ قوم تو بہت سے پیدا ہوئے لیکن سرسید جیسا عاشقِ قوم اب تک پیدا نہ ہو سکا ان کے ہاتھ دعا کو اُٹھتے مگر یہ دعا، زاہدِ خود غرض اور عالمِ بے عمل کی نہ تھی بلکہ قوم کی فلاح و بہبود کے لیے دن بھر کی جد و جہد کے بعد اپنی نتائجِ عمل کی قبولیت کی دعا تھی۔

سرسید محکمہ عدالت میں منصفی کے عہدے پر تھے۔ لیکن مسلمانوں کی اصلاح کا جذبہ ان کے دل میں اس قدر موجزن تھا کہ کبھی ایک لمحہ کو بھی ان کو چین سے نہیں لینے دیتا۔ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں وہ جہاں بھی گئے تو وہاں کچھ نہ کچھ کرتے رہے۔ سالہا سال کی فکر اور غور و خوض کے بعد مسلمانوں کی ترقی کا راز انھیں ان کی "تعلیمی ترقی" میں ملا۔ لیکن ان کے نظریہ کے مطابق جو نظامِ تعلیم مسلمانوں کی ترقی کا ضامن ہو سکتا تھا وہ صرف اور صرف مغرب کا جدید نظامِ تعلیم تھا۔ مسلمانوں کو اس نظامِ تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے انھوں نے انگریزی زبان کے علوم و فنون کے خزانوں کو اردو میں منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ جب ۱۸۶۲ء میں ان کا تبادلہ غازی پور میں ہوا تو اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہاں انھوں نے "سائنٹفک سوسائٹی" قائم کی۔ لیکن بعد کو اس سوسائٹی کا دفتر

پے عدے ساتھ ہی علی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ علی گڑھ میں اس دفتر کے لیے سرسید نے نئی عمارت بنوائی جس کا افتتاح ۱۴؍ فروری ۱۸۶۶ء کو میرٹھ کے کمشنر مسٹر ولیمز نے کیا۔ سوسائٹی نے ۳۰؍ مارچ ۱۸۶۶ء سے اخبار "سائنٹفک سوسائٹی" کے نام سے اپنا پہلا ترجمان جاری کیا۔ یہی اخبار آگے چل کر ۲۵؍ مئی ۱۸۷۷ء کے بعد "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے نکلنے لگا۔ گزٹ کا پہلا شمارہ ۲؍ جون ۱۸۷۷ء کو شائع ہوا اور اسی وقت سے کنور جگجیت سنگھ کا اخبار "پروگریس" بھی اس میں ضم کر دیا گیا۔

سرسید نے مسلمانوں کی اصلاح کے کام کی ابتدا ان کی تعلیمی اصلاح سے کرنا چاہی تھی۔ چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی کا دفتر جب علی گڑھ منتقل ہو گیا تو اس کے بعد تعلیمی منصوبے پر انھوں نے خاص طور سے توجہ دی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کیمپس میں آج جس جگہ آج "سرسید ہال" کی پرشکوہ عمارتیں ہیں وہاں کبھی فوجیں پڑاؤ کیا کرتی تھیں۔ فوجی چھاؤنی کا یہ علاقہ جو تہتر ۷۴ ایکڑ زمین پر مشتمل تھا۔ سرسید نے سر جان اسٹریچی سے جو اتر پردیش کے لفٹننٹ گورنر تھے، درخواست کی یہ زمین انھیں اسکول کے قیام کے لیے دے دی جائے۔ گورنر موصوف کی کوششوں سے حکومت نے یہ زمین "مجلس خزینۃ البضاعۃ" کو دے دی اور ۱۶؍ اپریل ۱۸۷۵ء کو اس بے آب و گیاہ میدان پر مولوی سمیع اللہ خاں کو قبضہ مل گیا۔ علی گڑھ فوجی چھاؤنی کے میس ہاؤس میں ۲۴؍ مئی ۱۸۷۵ء کو "مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ (محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول) کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے بعد سرسید نے ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے سبکدوشی حاصل کر لی اور مدرسۃ العلوم اور سائنٹفک سوسائٹی کی نگرانی کے لیے مستقل۔ گورنمنٹ کے ارادے سے علی گڑھ آ رہے۔

سرسید جب مستقلاً علی گڑھ آئے تو ان کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ مسلمانوں کی تشکیل جدید تھی۔ ان کے سامنے صرف ایک ہی منزل تھی جہاں تک پہنچنے کے لیے انھوں نے مختلف وقتوں میں مختلف راستے اختیار کیے۔ ان کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں تھیں۔ وہ عمر کی اس منزل پر تھے جہاں سے موت بہت قریب نظر آتی ہے ان کے پاس وقت کم تھا اور کام زیادہ۔ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کر کے بہت جلد اپنی منزل مقصود تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اس لیے بیک وقت متعدد کام کرتے تھے۔ وہ دن بھر مئی اور جون کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں اسٹریچی ہال کی تعمیر کے لیے مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرتے اور رات کے وقت گزٹ تیار کرنے کے واسطے مضامین لکھتے۔ گزٹ کے سرورق پر اگرچہ ایڈیٹر کی حیثیت سے کسی کا نام نہیں چھپتا تھا لیکن اس کے ایڈیٹر دراصل خود سرسید تھے۔ کیوں کہ ۲۱؍ فروری ۱۸۸۰ء کے گزٹ میں سرسید کی جانب سے ایک نوٹ شائع ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادارت کے فرائض خود وہی انجام دیتے تھے۔ مذکورہ بالا نوٹ کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔

" علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جس کا ایڈیٹر بالفعل راقم ہے ......"

جس زمانے میں گزٹ شائع ہوتا تھا وہ اردو زبان کے نقطۂ عروج کا زمانہ تھا۔ شمالی ہند کے تمام باشندوں نے مذہبی و ملی اور صوبائی تعصب سے بالاتر ہو کر اردو کو اپنی علمی و تہذیبی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا۔ حتیٰ کے جنوبی ہند کے کچھ علاقوں کی عوامی زبان بھی اردو ہی تھی شمالی ہند میں بول چال، تحریر و تقریر، عدالتی معاملات،

سرکاری دفاتر اور کاروباری امور کے لیے اردو زبان استعمال کی جاتی۔ اس زمانے میں شمالی ہند اور ملک کے دوسرے گوشوں سے بڑی کثیر تعداد میں اردو اخبارات شائع ہوتے تھے۔ لیکن ان سب میں گزٹ کی اپنی ایک امتیازی حیثیت تھی۔ اس میں ہند اور بیرون ہند کی خاص خاص خبریں شائع ہوتیں اور عام قاری کی دلچسپی کے لیے بھی مضامین ہوتے۔ اس میں ملک اور قوم کے رہنماؤں کی تقریریں چھپتیں اور عالمی حالات و واقعات پر تبصرے بھی ہوتے تھے۔ انگریزی اور عربی سے خاص خاص کتابوں کے تراجم اردو میں کیے جاتے اور نئی کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوتے۔ مجموعی حیثیت سے "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" سرسید کی اصلاحی تحریک کا سچا ترجمان، محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے طلبا کی علمی و تہذیبی زندگی کا حقیقی مرقع اور مسلمانان ہند کی قومی زندگی کا آئینہ دار تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں اس اخبار نے صحافت کے میدان میں جو لافانی نقوش چھوڑے ہیں ان کے ذکر کے بغیر اردو صحافت کی تاریخ نامکمل رہے گی۔

گویا علی گڑھ سے سائنٹفک سوسائٹی مدرسۃ العلوم اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ذریعہ سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا اسی کو ہندوستان کی تاریخ میں "علی گڑھ تحریک" یا "سرسید تحریک" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

بقیہ مضمون "مولانا آزاد لائبریری"

تصاویر کا بھی عمدہ ذخیرہ ہے۔ تاریخی اہمیت کی تصاویر میں شاہ طہماسپ صفوی، نور جہاں، شاہ جہاں (عالم شباب) اورنگ زیب (عالم شباب) اورنگ زیب (عالم ضعیفی)، نادر شاہ، سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر، مرزا دارا بخت ولی عہد بہادر شاہ، شہزادہ اکبر، شاہجہاں مع اسداللہ خاں وزیر اعظم، اکبر شاہ ثانی مع شرکائے دربار، بہادر شاہ، ٹوڈرمل، توتی بیگم، محمد شاہ رنگیلے، تاناشاہ اور مولانا فخرالدین دہلوی کی تصویریں قابلِ ذکر ہیں۔

لائبریری اپنے اس گنج گراں مایہ کے تحفظ اور تشنگان علم کی سیرابی کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف ذخیروں کی فہرستیں شائع کرتی رہی ہے۔ تاریخ پر فارسی مخطوطات کا ایک کیٹلاگ ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا جسے پروفیسر اطہر عباس رضوی نے مرتب کیا تھا اور بعد میں پروفیسر مختارالدین احمد نے نظر ثانی کرکے ایڈٹ کیا۔ ۱۹۸۱ء میں ذخیرہ حبیب گنج کی فارسی منظومات کے مخطوطات کا کیٹلاگ شائع ہوا۔ اسے موجودہ لائبریرین محمد حسین رضوی صاحب اور محمود حسن قیصر سابق اسسٹنٹ لائبریرین شعبۂ مخطوطات (جن کا تقرر ریٹائر ہونے کے بعد بحیثیت اسپیشل آفیسر ہو گیا ہے) نے مرتب کیا ہے لائبریری کمیٹی نے حال ہی میں تمام ذخیروں کی دستی فہرستیں تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنادی ہے جس کے کنوینر پروفیسر خلیق احمد نظامی (چیرمین شعبۂ تاریخ) ہیں۔ ذخیرۂ شیفتہ کی فہرست تقریباً چھپ چکی ہے۔ ذخیرہ احسن کی فہرست زیر طبع ہے۔ ان دونوں فہرستوں کے انگریزی میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں اور پریس میں جانے والے ہیں۔ دوسرے ذخیروں کی فہرستیں بھی تیار ہو رہی ہیں۔

(باقی آئندہ شمارہ میں)

یونیورسٹی کے شب و روز

ماہرینِ امراضِ چشم کی آمد

پاکستان کے چند مشہور ماہرین امراضِ چشم ایک روز کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تشریف لائے انھوں نے یونیورسٹی کی انسٹی ٹیوٹ آف آفتھلمولاجی دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر پروفیسر کیدار ناتھ اور ڈاکٹر بی۔ ایس۔ گوئل تمام وقت ان کے ساتھ رہے۔

وائس چانسلر کی جانب سے ان کے اعزاز میں عشائیہ کا اہتمام کیا گیا۔

ماہرین کے اس وفد میں پروفیسر راجہ ممتاز، پروفیسر محمد منیر الحق، پروفیسر خواجہ شریف الحسن اور پروفیسر محمد داؤد خاں شامل تھے۔ یہ وفد حکومتِ ہند کی دعوت پر دہلی میں منعقدہ امراضِ چشم سے متعلق ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے آیا ہوا تھا۔

نیو ہال میں ادبی و ثقافتی انجمن کی افتتاحی تقریب

۱۶ ستمبر کی شام ۷½ بجے نیو ہال کی ادبی و ثقافتی انجمن کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقع پر مہمانِ خصوصی جناب نسیم قریشی صاحب نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں فرمایا کہ علی گڑھ تحریک صرف تعلیمی تحریک ہی نہیں تھی بلکہ وہ ادبی اور تہذیبی تحریک بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے قیام سے پہلے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا جس کا نصب العین مسلمانانِ ہند کی ادبی، دینی اور تہذیبی اصلاح و ترقی تھا۔ ضرورت ہے کہ علی گڑھ اپنی اس روایت کو پیشِ نظر رکھے اور اس کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے فروغ دینے کی کوشش کرے۔

اس موقع پر ہال کی ادبی و ثقافتی انجمن نے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں علی گڑھ شہر اور یونیورسٹی کے کئی ممتاز شعرا نے شرکت کی اور سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

نیا سیشن شروع

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ۸۳-۱۹۸۲ء کا سیشن ۱۶ ستمبر سے شروع ہو گیا ہے۔

ڈرامہ کلب کی تازہ ترین پیش کش

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ڈرامہ کلب کی جانب سے ۲۲ ستمبر ۱۹۸۲ء کو کینیڈی ہال میں دو ڈرامے "مٹھی بھر جیون" اور "راجہ کا باجا" پیش کیے گئے۔

اس موقع پر پرو وائس چانسلر صاحب

باقی صفحہ نمبر ۱۴ پر

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اطلاع داخلہ نمبر ۹

سیشن ۸۳-۱۹۸۲ء

مقررہ فارموں پر اہل امیدواروں کی جانب سے حسب ذیل کورسوں میں ۸۳-۸۲ سیشن میں داخلے کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔ تکمیل شدہ داخلہ فارموں کی یونیورسٹی کے داخلہ دفتر میں پہونچنے کی آخری تاریخ ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۲ء ہے۔

۱۔ ایم اے، ایم ایس سی، ایم کام۔

۲۔ ایل ایل بی، ایل ایل ایم۔

۳۔ بیچلر آف تھیالوجی۔

۴۔ ڈپلوما ان اسٹینو ٹائپنگ۔

۵۔ ڈپلوما ان بینک ایڈمنسٹریشن

۶ ڈپلوما ان سکریٹریل ورکس۔

۷ ڈپلوما ان ڈرافٹنگ اور ڈیزائننگ۔

۸۔ حسب ذیل پروفیشنل کورسوں میں ڈپلوما

(الف) الیکٹرانک ڈیٹا پروسسنگ مشین آپریشن

(ب) موسیقی

(ج) کیڑے مکوڑوں پر قابو۔

(د) کمپنی لا، بینکنگ اینڈ انشورنس

(ہ) لیبر لا اینڈ لیبر ریلیشنز

(و) لیبوریٹری ٹیکنالوجی (فزیکل اور کیمیکل)

(ز) جواہرات کی جانچ اور جواہرات پر کندہ کرنا۔

(ح) میڈیکل لیبوریٹری (ٹیکنالوجی)

(ط) جرنلزم

(ی) اپلائڈ آرٹ

(ک) کارٹوگرافی۔

(ل) میڈیکل لیب ٹیکنالوجی (کلینکل پیتھالوجی)

(م) انسٹرومنٹ ٹیکنالوجی

(ن) اورتھوپٹکس

(س) سیسی کلچر۔

جملہ تفصیلات بابت کورسنز، فیس درخواستیں بھیجنے کے ضوابط وغیرہ داخلے سے متعلق گائڈ میں درج کر دیے گئے ہیں۔ فارم درخواست داخلہ اور داخلوں سے متعلق گائڈ طلب کرنے پر اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر 52 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے تین روپیہ نقد یا بذریعہ کراسڈ انڈین پوسٹل آرڈر بنام فائنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ درخواست داخلہ کے لیے واضح طور پر تحریر کیا جائے کہ کس کورس کے لیے داخلہ مطلوب ہے۔ انٹرنل امیدوار متعلقہ ہال کے پرووسٹ سے فارم داخلہ طلب کرسکتے ہیں۔ ڈاک سے طلب کرنے والے امیدواروں کو اپنا پتہ تحریر کیا ہوا ایک لفافہ 12×28 سینٹی میٹر سائز داخلہ کی درخواست کے ساتھ بھیجنا چاہیے۔ جس پر ایک روپیہ ۹۰ پیسے کے ٹکٹ چسپاں ہونے چاہیں۔ فارم رجسٹرڈ ڈاک سے طلب کرنے کی صورت میں 4/65 روپے کا ٹکٹ اپنے پتہ کے لفافہ پر چسپاں کرنا ہوگا۔

بیرونی امیدواروں کے مکمل داخلہ فارم ہر کورس کے لیے پانچ روپیہ فی کورس کے حساب سے انڈین پوسٹل آرڈر (کراسڈ) برائے رجسٹریشن فیس بنام فائنانس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشنز) پوسٹ بکس نمبر 52 علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 202001 کے نام ۲۳ اکتوبر ۸۲ء کو پانچ بجے شام سے قبل پہونچ جانے ضروری ہیں۔ کورس کا نام جس میں داخلہ درکار ہے لفافہ پر لکھا ہوا ہونا چاہیے

انٹرنل طلباء کے لیے داخلے کے تکمیل شدہ فارم مع مقررہ فیس، اور ضروری کاغذات متعلقہ پرووسٹ کو ایڈمیشن آفس میں وصولی کی آخری تاریخ سے کم از کم دو دن قبل پیش کر دینے ضروری ہیں۔

نامکمل درخواستیں یا مقررہ تاریخ کے بعد وصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی اور اس قسم کی درخواستوں کے سلسلہ میں کوئی بھی خط وکتابت نہیں کی جائے گی۔

این موئیدین

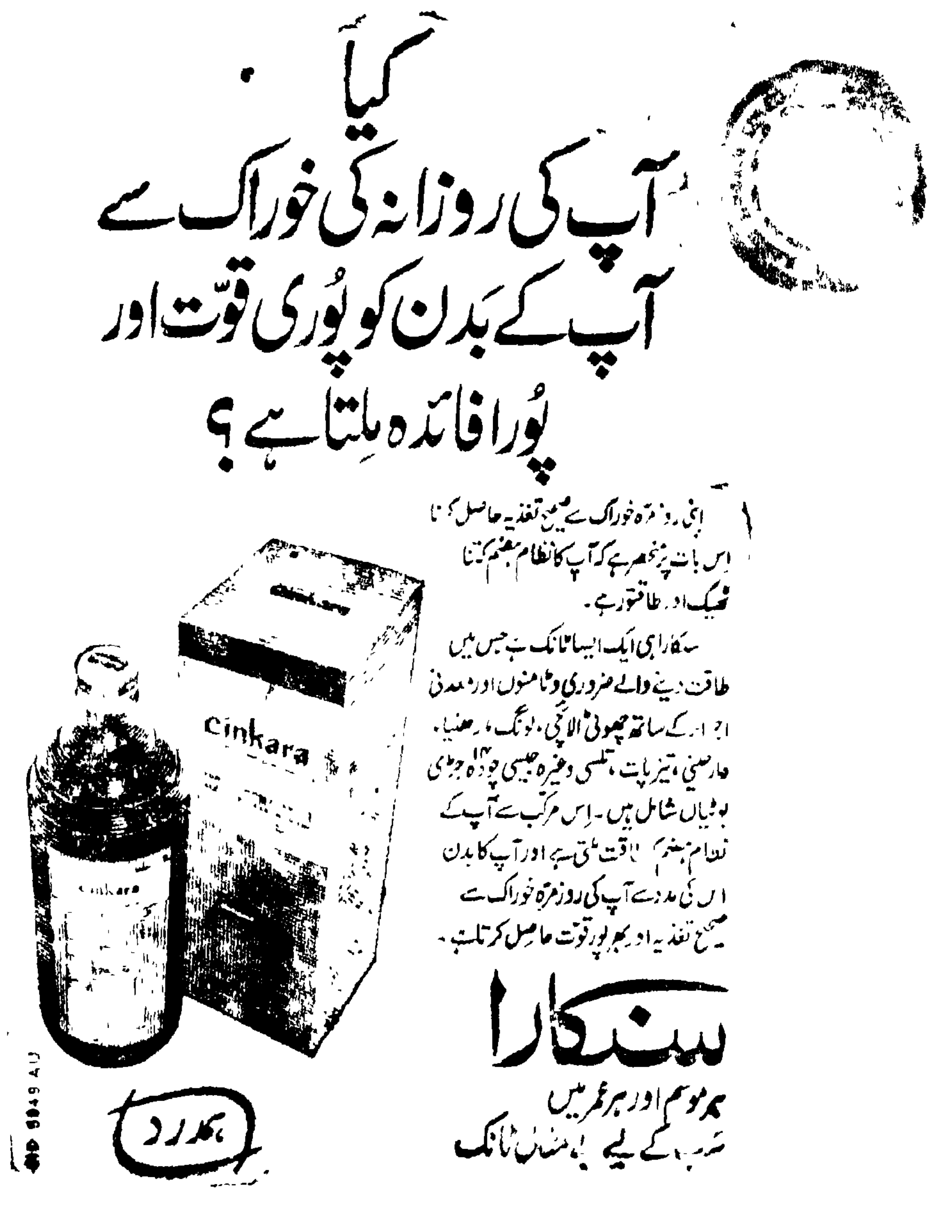
کنٹرولر آف اگزامنیشنز اینڈ ایڈمیشنز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

پرنٹر، پبلشر: قاضی معزالدین احمد نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوا کر صفدر منزل تار بنگلہ۔ اے ایم یو علی گڑھ سے شائع کیا۔

اطلاع کے لیے شائع کیا جا رہا ہے کہ پبلک سروس کمیشن اترپردیش کے مختلف امتحانات سال ۸۲ ۱۹ء کی بقیہ مدت اور ۱۹۸۳ء کے پورے سال کے لیے درج ذیل پروگرام کے مطابق منعقد ہوں گے۔

نمبر شمار	امتحان کا نام	سال/ماہ
	۱۹۸۲ء	
۱	کمبائنڈ اسٹیٹ سروسز امتحان ۱۹۸۲ء	ستمبر/اکتوبر ۱۹۸۲ء
۲	اسٹیٹ پروسیکیوشن آفیسر امتحان ۱۹۸۲ء	اکتوبر ۱۹۸۲ء
۳	فارسٹ رینجرس کورس امتحان ۱۹۸۲ء	نومبر ۱۹۸۲ء
۴	ٹرانسلیٹر امتحان برائے یوپی سکریٹریٹ	" "
۵	پرائیویٹ سکریٹری کا امتحان برائے یوپی	" "
۶	سپروائزر (قانون گو) امتحان	دسمبر ۱۹۸۲ء
۷	پرسنل اسسٹنٹ امتحان برائے یوپی	" "
۸	سپیریر فارسٹ سروسز ڈبلیو ماکورس امتحان	" "
	۱۹۸۳ء	
۱	اکاؤنٹس امتحان برائے بورڈ آف ریونیو یوپی	فروری ۱۹۸۳ء
۲	آڈیٹرس امتحان برائے کوآپریٹیو سوسائٹیز	مئی ۱۹۸۳ء
۳	اپر/لوور ڈویژن اسسٹنٹس امتحان برائے یوپی سکریٹریٹ	مئی ۱۹۸۳ء
۴	یوپی سول (جیوڈیشیل) سروسز (منصف) امتحان ۱۹۸۳ء	جون ۱۹۸۳ء
۵	اپر سب آرڈینیٹ سروسز امتحان ۱۹۸۳ء	جون ۱۹۸۳ء
۶	سپیریر فارسٹ سروسز (ڈبلیو ماکورس)	" "
۷	اپر/لوور ڈویژن اسسٹنٹس امتحان برائے یوپی پبلک سروس کمیشن	اگست ۱۹۸۳ء
۸	کمبائنڈ اسٹیٹ سروسز امتحان ۱۹۸۳ء	ستمبر/اکتوبر ۱۹۸۳ء
۹	فارسٹ رینجرس کورس امتحان	نومبر ۱۹۸۳ء
۱۰	لوور سب آرڈینیٹ سروسز امتحان ۱۹۸۳ء	دسمبر ۱۹۸۳ء

[redacted]


کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟
اپنی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا
اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظام ہضم کتنا
ٹھیک اور طاقتور ہے۔
سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں
طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی
اجزا کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا،
دارصینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی ۱۴ چودہ جڑی
بوٹیاں شامل ہیں۔ اس مرکب سے آپ کے
نظام ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن
اس کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک سے
صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔
cinkara
سنکارا
ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے مناسب ٹانک
ہمدرد
HD 5849 AU

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد نمبر ۱ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۸۲ء شمارہ نمبر ۱۸

"....اِس پرچے کے اجرا سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجے کی سویلیزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے۔"

"....دوسری قوم کی رسومات کا اختیار کرنا اگرچہ بے تعصبی اور دانائی کی دلیل ہے مگر جب وہ رسمیں اندھے پن سے صرف تقلیداً بغیر سمجھے بوجھے اختیار کی جاتی ہیں تو بلاشبہ نادانی اور حماقت کا ہوتی ہیں۔"

سید احمد

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ بیس روپے

بیرونِ ہند سے فی پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

خط و کتابت و ترسیلِ زر کا پتا۔

تہذیب الاخلاق۔ صفدر منزل، ستار بنگلہ۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ یوپی۔ ۲۰۲۰۰۱

سرِ خاکِ شہیدِ برگ ہائے لالہ می پاشم

کہ خونش با نہالِ ملّتِ ما سازگار آمد

علامہ اقبال

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے

عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

نہ ستارے میں ہے نے گردشِ افلاک میں ہے

تیری تقدیر مرے نالۂ بیباک میں ہے

یا مری آہ میں کوئی شررِ زندہ نہیں

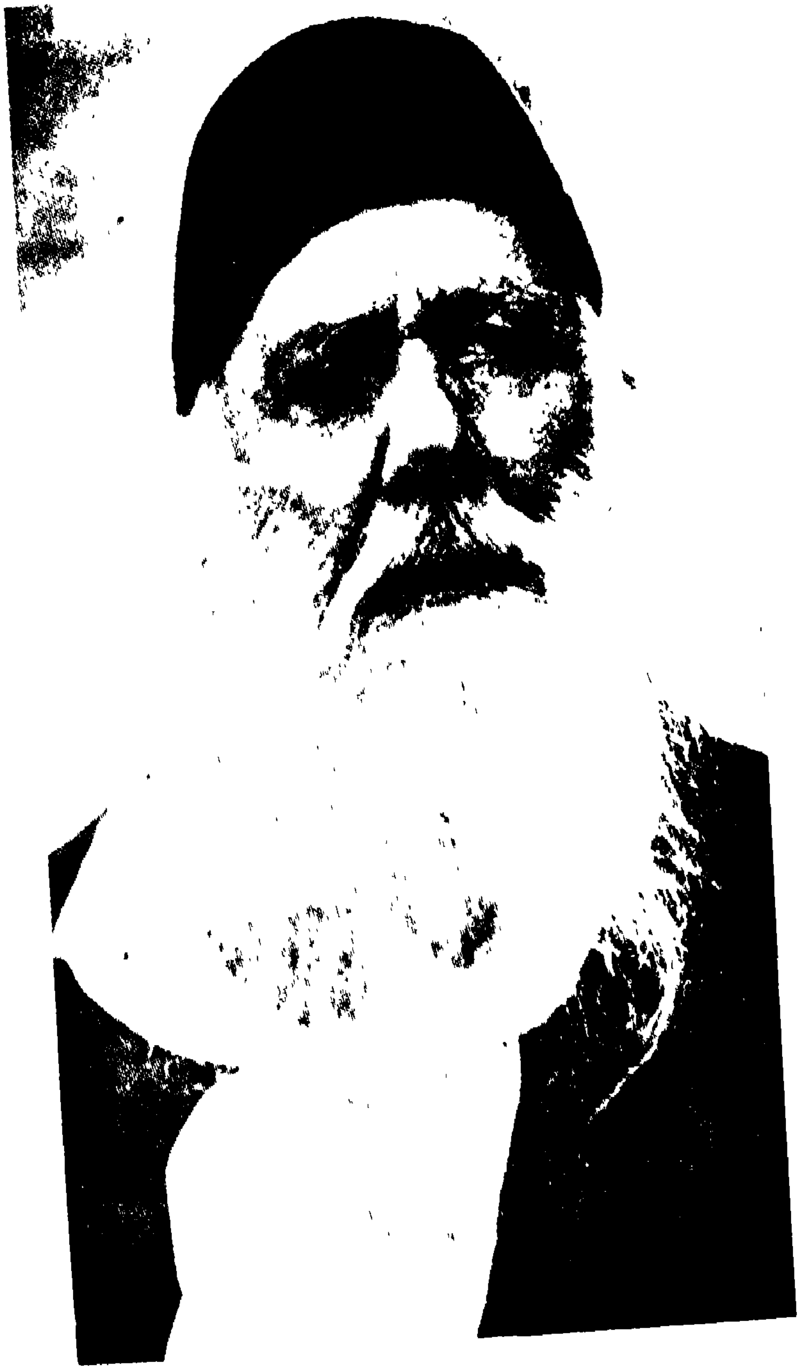
یا ذرا نم ابھی تیرے خس و خاشاک میں ہے

کیا عجب! میری نوا ہائے سحر گاہی سے

زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے

توڑ ڈالے گی یہی خاک طلسمِ شب و روز

گرچہ الجھی ہوئی تقدیر کے پیچاک میں ہے



جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

پندرہ روزہ
تہذیب الاخلاق
علی گڑھ

مدیر: سید حامد وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔
مدیر مسئول: قاضی معز الدین احمد
جلد ۱ - شمارہ ۱۸ ۱۶ اکتوبر ۱۹۸۲ء

بیاد سید

مسلمان اٹھارویں۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے ان بیاسی سال کے طویل دور میں شدید بحرانی ادوار سے گزرے ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس صدی کے آخری ایام تک کس قسم کے حالات سے وہ دوچار رہیں۔ اس گردش زمانہ میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے سخت ترین بدحالی کے وقت سید احمد خاں خضر راہ کی صورت میں نمودار ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دی اور وہ ملک میں قدم جمانے کے قابل ہوئے۔ ——— انیسویں صدی میں زمانہ کا عجب رنگ تھا۔ مسلمان طاقت اور اقتدار کھو کر بے سہارا اور بے یار و مددگار زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دوچار تھے۔ ایک طرف ملک کی وہ اکثریت تھی جو فاتح قوم کے تاجروں اور دانشوروں سے دوستانہ تعلقات رکھتی تھی۔ ان کے آدابِ معیشت سے آشنا اور ان کے علوم و افکار سے آگاہ تھی اور کمپنی کی حکومت میں حصہ دار ہونے کی خواہش مند تھی، دوسری طرف وہ تھے جو تھکے ہارے، شب و روز کی آسائش سے محروم تھے۔ سید احمد خاں نے ان کی رہنمائی کی ان کو بیدار کیا، حالات سے آگاہ کیا۔ سید احمد خاں ان کی مدد نہ کرتے تو کون کرتا؟ ملک میں اور بھی پسماندہ گروہ تھے وہ آج تک پسماندہ ہی ہیں۔ کون ان کی مدد کو اٹھا۔ بیسویں صدی میں ملک کے ہی نہیں دنیا کے حالات بدلے تو سر سید احمد خاں پر یہ تہمت [illegible] نے قلم اٹھایا وہ فرقہ پرست قرار دیے گئے اس لیے کہ انھوں نے [illegible] کو بیدار کیا اور جب تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ کیا انیسویں صدی کے قومی لیڈروں سے یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ اگر وہ نیشنل لیڈر تھے تو انھوں نے بچھڑے [illegible] گروہوں کو بسانے میں کیا مدد کی اور مسلمانوں کو سید احمد خاں پر ہی کیوں چھوڑ دیا۔

ہندوستان ایک عجیب ملک ہے جہاں جغرافیائی، اقتصادی، تہذیبی حالات ہر علاقہ کے مختلف ہیں۔ [illegible] رہا ہے اور یہ خیال بھی بیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ ہر فرقہ، ہر گروہ اپنے مسائل خود ہی حل کرتا آیا ہے اور آج بھی بیشتر خود ہی حل کرتا ہے۔ دوسروں کی مدد واجبی اور ہمدردی زبانی ہوتی ہے۔ اس وقت ملک میں جو فرقہ وارانہ فضا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ضرورت ہے کہ گزشتہ دو سو سال کی تاریخ پر خود مسلمان قلم اٹھائیں۔ تحریک آزادی اور علی گڑھ تحریک پر لکھنے کی خصوصاً ضرورت ہے۔ بنگال کی کمپنی بہادر کے دور کی تاریخ پر تو لکھا گیا ہے لیکن مسلمانوں کے بنگال میں استحصال کی تاریخ پر شاید ہی کسی نے ہمدردانہ قلم اٹھایا ہو۔ یہ خواہش نہیں کہ سیاہ کو سفید، کھوٹے کو کھرا کر دکھایا جائے۔ واقعات سے غلط نتائج مرتب کر کے مسلمانوں [illegible] کی تاریخ کو مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ [illegible] نے کام کیا جائے اور گزشتہ دو سو سال کی تاریخ مرتب کرنے میں ذمہ داری سے کام لے کر فرقہ پرستوں کی مذموم [illegible]

۱۸ اکتوبر سید احمد خاں [illegible] پیدائش [illegible] خواہش تو یہی تھی کہ [illegible] تہذیب الاخلاق [illegible] کام

دشوار تھا۔ رسمی مضامین کا مجموعہ شائع کرنا کچھ مفید نہ معلوم ہوا۔ ایسے مضامین کی اشاعت تو ہوتی رہتی ہے بس اس موقع پر اسی پر اکتفا کیا گیا کہ چند مضامین سید احمد خاں پر شائع کر دیے جائیں اور مرحوم کی یاد تازہ کر لی جائے۔ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

فرخ جلالی صاحب کی کوشش سے ہمیں سید ملت کی کمیاب تصویر حاصل ہوئی ہے اس کا بلاک بنوا کر اس شمارہ میں سید احمد خاں کی تصویر شائع کر رہے ہیں۔ فرخ جلالی صاحب تہذیب الاخلاق کی برابر مدد کرتے رہتے ہیں۔ ہم ان کی تکلیف کے ممنون ہیں۔

ق۔م۔ا

بقیہ مضمون: سر سید اور تربیت نسواں''

تحریک کے دور رس اثرات کے تحت تعلیم نسواں کی تحریک میں سرگرمی پیدا ہونی یقینی تھی۔ گویا سر سید کی پیشین گوئی صحیح نکلی کہ جو خدمت وہ اس وقت قوم کے لڑکوں کے لیے کر رہے ہیں، آگے چل کر اس سے دونوں فائدہ اٹھائیں گے۔ سر سید کی اس بات میں بڑا وزن تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں رسالہ خاتون کے ذریعہ تحریک تعلیم نسواں کے لیے پر جوش آوازیں بلند ہوئیں جس سے معاشرہ کا ایک مخصوص طبقہ ہموار ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۶ء میں ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ اور وحید جہاں بیگم نیز دوسرے بے لوث ساتھیوں کی مدد سے مسلمان لڑکیوں کے لیے جدید مدرسہ کا قیام عمل میں آیا۔ و سر سید کے پسندیدہ گھریلو تربیتی مکتب کی ایک فطری ارتقائی شکل تھا۔

✲ ✲

بقیہ مضمون ''چھوٹی صنعتیں اور مسلمان''

کھولے جا سکتے ہیں۔ مسلمانوں کے فلاحی ادارے اور تعلیمی وتہذیبی مراکز مثلاً مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ وغیرہ اس سلسلہ میں رہنمائی اور ابتدائی امداد کے فرائض آسانی سے انجام دے سکتے ہیں۔ صنعتوں کو فروغ دینے اور پھیلانے کی اصل ضرورت تعلیم یافتہ نوجوانوں، کاریگروں، دستکاروں اور تجارت پیشہ لوگوں میں ہے۔ اس سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی اہم کردار حسب ذیل طریقوں سے ادا کر سکتی ہے

(۱) یونیورسٹی کے زیر اہتمام ایک صنعتی معلوماتی مرکز قائم کیا جائے جو چھوٹی صنعتوں کے بارے میں ضروری لٹریچر اور معلومات فراہم کرے۔ جس سے نئے صنعت کار اور پہلے سے صنعتیں لگائے ہوئے افراد مستفید ہو سکیں۔ یہ مرکز چھوٹے چھوٹے کتابچے اور رسالے شائع کر کے بڑی اچھی خدمت انجام دے سکتا ہے

۲۔ یونیورسٹی M.B.A کورس میں ایک پرچہ چھوٹی صنعتوں کو فروغ دینے اور صنعت کاری کی فضا قائم کرنے کے متعلق رکھا جائے۔ تاکہ طلباء کو اس ضمن میں عملی معلومات ہو سکیں اور کورس پورا کرنے کے بعد وہ صنعت کے میدان میں داخل ہو سکیں۔

(۳) مرکزی و نیز صوبائی حکومت کے اشتراک سے یونیورسٹی ایک انڈسٹریل اسٹیٹ یونیورسٹی کیمپس میں قائم کرے جہاں خواہش مند طلبا تعلیم ختم کرنے کے بعد اپنی صنعتیں لگا سکیں۔ یونیورسٹی انجینئرنگ کالج کی ورکشاپ اس سلسلہ میں بڑی کارآمد ہو سکتی ہے

سیّد حامد

"کنگ لیَر"

شیکسپیئر کے چار بڑے المیے "ہیملٹ"، "میکبتھ" "اوتھیلو" اور "کنگ لیر" ہیں۔ آج کی صحبت آخرالذکر کے لیے وقف ہے۔

شاہ لیر کی تین بیٹیاں تھیں۔ گونیرل، ریگن، کارڈیلیا۔ اولادِ نرینہ نہ ہونے کا اسے غم بھی نہیں۔ اُس کی بیٹیاں اُسے چاہتی ہیں اور وہ بھی اُن سے محبت کرتا ہے، اور کارڈیلیا سے سب سے زیادہ۔ گونیرل اور ریگن کی شادی ہو چکی ہے، کارڈیلیا کی ہونا باقی ہے۔ دو شاہی پیام زیرِ غور ہیں۔ خواستگار خود حاضر ہیں۔

لیر زندگی کی اس منزل میں پہنچ گیا تھا جب انسان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے چنانچہ اس نے یہ ٹھان لی کہ راج کاج اولاد کے حوالے کر دے ایک روز اس نے تینوں بیٹیوں کو بلایا اور دل کی بات اُن کے سامنے رکھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں چاہے جانے کی آرزو ہوتی ہے۔ لیر جو ایک زبردست اور اولوالعزم اور مضبوط اور عالی حوصلہ اور روشن تن بادشاہ تھا وہ بھی اِس اِنسانی کمزوری سے نہ بچ سکا۔ ملک تقسیم کرنے سے پہلے اس نے کہا آؤ دیکھیں ہماری بیٹیاں ہمیں کتنا چاہتی ہیں اور کون سب سے زیادہ چاہتی ہے۔ اسی حساب سے وہ ملک کے حصّے بخرے کرے گا۔

وہ اسے کتنا چاہتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں گونیرل نے کہا کہ "وہ اسے ہر شئے سے زیادہ چاہتی ہے بینائی اور آزادی سے بھی زیادہ۔ دنیا میں کوئی اس کو اس قدر عزیز نہیں جتنا اس کا چہیتا باپ۔ ریگن نے مہلے پر دہلا لگایا گویا باپ کے بغیر زندگی بیکار ہے۔ باری اب چہیتی چھوٹی بیٹی کارڈیلیا کی تھی۔

اس نے کہا۔ "میں آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی ایک بیٹی کو باپ سے کرنی چاہیے۔ نہ کم نہ زیادہ۔" یہ سُننا تھا کہ تندخو بادشاہ کے آگ ہی تو لگ گئی۔ "دور ہو جا میری نظروں سے۔ اب مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھانا۔" غیض میں آکر بیچاری کو ورثہ سے بھی محروم کر دیا۔ ملک بڑی اور منجھلی بیٹی کو بانٹ دیا گیا۔ لیر نے طے کیا کہ باری باری ان کے ساتھ رہے گا۔

حکومت کا ہاتھ میں آنا تھا کہ گونیرل اور ریگن کی نگاہیں بدل گئیں۔ بے التفاتی سے شروعات ہوئی اور اہانت، عداوت اور ظلم و ستم پر خاتمہ۔ لیر کو

اتنے آدمی اپنے ساتھ رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ان لوگوں نے گھر کے نظام اور سکون کو برہم کر دیا ہے۔" گونیرل نے جس کو باپ کی میزبانی کا شرف حاصل تھا، اعتراضات کر کر کے لیئر پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ اس بیہودہ نے باپ کو اس قدر ذلیل کیا کہ وہ اس کا گھر چھوڑ کر چلا گیا، انتہائی بے آبروئی کے ساتھ۔ منجھلی لڑکی کے یہاں پہنچا تو اس سے پہلے بڑی بیٹی کا پیغام پہنچ چکا تھا۔ وہاں بھی ٹھکانا نہ ملا اور ملا کیا تحقیر اور بے رخی۔ کل تک جو جلیل القدر بادشاہ تھا، آج در در کی خاک چھان رہا تھا۔ خود اس کی بیٹیوں نے اسے راندۂ درگاہ بنا دیا۔

فراخ دل، عالی ظرف، قدآور، گرمجوش لیئر اپنی بڑی بیٹیوں کی تغیر رنگ، محسن کشی، دنیا دشمنی اور کمینہ پن کی تاب نہ لا سکا۔ ان کے ہاتھوں اہانت اور تذلیل اس سے برداشت نہ ہو سکی۔ دنیا اس کی نظروں میں تاریک ہو گئی۔ اسے باور نہ آتا کہ خود اس کی بیٹیاں جو اسی کی آنکھوں کا نور، اس کے جگر کا ٹکڑا تھیں، جو کل تک اس کی محبت کا دم بھرتی تھیں اسے اس طرح دغا دے دیں گی۔ محبت کا اعلان کیا سب فریب تھا۔ اس کا مقصد کیا صرف دولت اور حکومت حاصل کرنا تھا۔ لیئر کا اعتبار زندگی اور اس کی قدروں، انسان اور اس کی زبان، رشتوں اور ان کی پاکیزگی، فطرت اور اس کی استواری سے بالکل اٹھ گیا۔ کوئی پُرپیچ یا فریب آشنا یا دنیا دار انسان ہوتا تو اسے اولاد کی بے مہری اور محسن کشی سے اتنا دھکا نہ پہونچتا۔ لیئر سادہ دل، دیو قامت، پاک نہاد، یک رُخ انسان تھا۔ فریب کھانا اس کے لیے آسان تھا لیکن فریب اور تنگ ظرفی اور انسان ناشناسی کے طشت از بام ہو جانے کے بعد اسے برداشت کر لینا لیئر کے بس کی بات نہ تھی۔ ابتدا اس کو لگا کہ دنیا تہ و بالا ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دریا طغیانی پر ہے، سمندر میں جوار بھاٹے کا سا سماں تھا۔ ایک جوالا مکھی تھا جو آگ اور لاوا اُگل رہا ہو۔

لیئر کے اندر جو طوفان بپا تھا، ایسا لگتا تھا کہ اس پُرفریب دنیا کو تہس نہس کر دے گا۔ اس ظالم طوفان نے دنیا کو تو تہس نہس نہیں کیا۔ لیئر کی شخصیت اس کوہ پیکر انسان کی سالمیت کو پارہ پارہ کر دیا۔ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا اور دیوانوں کی طرح فلک شگاف چیخیں بلند کرنے لگا۔ دھکہ ایسا لگا کہ وہ چیخ اُٹھا۔

"اے آبشارو، اے طوفانو! پانی کے دھارے اُگل ڈالو۔ ڈوب جانے دو ان میں اس قصر کے کنگروں کو گندھک کے ابخرات کو بکھیرنے والی آگ اور فلک آشنام شعلو اور تناور اوک کو آرے کی طرح دونیم کرنے والی بجلیو! جھلس ڈالو میرے سفید سر کو۔

جھنجھوڑ ڈالنے والی گرج، ہلا دینے والی رعد گرد اور اس فربہ زمین کی گولائی کو پچکا کر چورس کر دو"

اپنی غدار اور شقی بیٹیوں کو اس نے کوسنا اور بد دعائیں دینا شروع کر دیا

"اے احسان فراموش چڑیل! تیرے پاس
دل نہیں پتھر ہے۔"
خدایا اس عورت کے رحم میں بانجھ پن کو
اُتار دے۔ اور اس میں جنم دینے والے
سوتوں کو خشک کر دے۔
الٰہی اس کے ذلیل بدن سے کبھی کوئی بچہ
پیدا نہ ہو۔ جو اسے ماں کے پاکیزہ نام سے
پکارے
خدا کرے کہ تیرے باپ کی بد دعاؤں کے

نیزے تیرے حواس کو چھید چھید کر چھلنی کردیں"
"ریگن تونے تیز دانتوں والی بے مہری کو گدھ
کی طرح اِس جگہ (اپنے دل کی طرف اشارہ
کرتا ہے) باندھ رکھا ہے"

دنیا میں اب رہ کیا گیا تھا اور دنیا خود رہنے کے قابل کب رہی تھی۔ گھاؤ ایسا کاری لگا تھا کہ لیر سنبھل نہ سکا۔ اس کو سنبھالنے کے لیے تھا بھی کیا؟ کوئی کام ایسا نہ تھا جسے اس نے زندگی کا مقصد بنا لیا ہو۔ اور جو ذاتی حوادث کے لیے سپر کا کام دے سکے۔ جس کے آگے ذات اور سانحات اور واردات کی حیثیت جزئی، فروعی، ثانوی رہ جائے۔

کنگ لیر کو اس احساس نے بھی جھنجھوڑا ہوگا، کچوکے پر کچوکے لگائے ہوں گے کہ اس کے ساتھ بے لوث، بے ریا محبت اس کی چھوٹی بیٹی کارڈیلیا کرتی تھی۔ وہی کارڈیلیا جس کو اس نے حق گوئی کی اتنی بڑی سزا دی تھی، جس کو اُس نے ذلیل کرکے گھر سے نکال دیا تھا جس کو وراثت سے محروم کر دیا تھا، وہی کارڈیلیا جس نے سزا کا بدلہ اس طرح دیا کہ باپ کی مصیبت کے ایام میں اپنے آپ کو اسے سنبھالنے میں مٹا دیا۔ باپ کی تالیفِ قلب، اس کے زخموں کا اندمال، اس کی افتادِ طبع اور دماغی توازن کی بازیابی، اس کو دلاسا دینا، اُس کے ہیجان کو دور کرنا، اسے سکون پہونچانا۔ کارڈیلیا کی زندگی اسی کوشش پر مشتمل رہ گئی تھی۔

کسی کے ساتھ احسان پر احسان کیے جائیں اور وہ جواب میں خنجر بھونک دے، اس کو برداشت کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ لیکن بہت بار ایسا ہوا ہے کہ احسان کا بدلہ اسی طرح چکایا گیا ہے۔ جب ہی تو اللہ تعالیٰ دریافت کرتا ہے

هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ

احسان کا بدلہ احسان کے سوا کیا ہے

یعنی لوگ احسان کا بدلہ احسان کے سوا بھی چکاتے آئے ہیں اور یہ لوگ گمراہ ہیں۔ دراصل کسی انسان کو پرکھنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی احسان کر دیجیے اور پھر کچھ عرصے اس کے تیور، اس کا ردِ عمل دیکھتے رہیے۔ پتہ چل جائے گا کہ وہ زرِ ناب ہے یا جنس کاسد، نیک طینت ہے یا کج نہاد۔ اگر ہماری زندگی میں احسان شناسی اور محسن کشی چند مثالوں تک محدود رہتی تو شکسپیر جیسا عالی مرتبت ڈرامہ نگار جس نے فطرت کو آئینہ دکھایا ہے اسے اپنی ایک عظیم تمثیل کا موضوع نہ بناتا۔

ایک بادشاہ کی داستان آپ سن چکے جو تخت و تاج کا وارث تھا اور جس نے پہلے تخت و تاج پر لات ماری اور اس کے بعد دنیا اور انسان اور عقل و ہوش پر۔ اب ایک ایسے بادشاہ کی کہانی سُنیے جس کو تخت و تاج سے کوئی سروکار نہ تھا لیکن جو شخصیت اور طبیعت، حوصلے اور عزائم، توانائی اور صلاحیتوں میں بادشاہوں کا بادشاہ تھا۔ وہ پیدا اس وقت ہوا جب کہ ہندوستان میں مغل بادشاہت کا چل چلاؤ تھا اور ابھی اس نے اپنی نصف عمر طے کی تھی کہ ہندوستان میں انگریزی بادشاہت کا آغاز ہوا۔ لیکن نہ وہ مغل بادشاہ جس کے دربار سے وہ وابستہ تھا نہ وہ انگریز ملکہ جس کی حکومت سے اسے منسلک ہونا پڑا، شاہانہ قد و قامت میں اس کی حریف تھی۔

یہ شاہِ قامتِ انسان ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء میں دلی میں میر متقی کے گھر میں پیدا ہوا اور وہیں پروان

چڑھتا۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں رہ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ مغل شہنشاہت کا یہ دمِ واپسیں ہے اور مستقبل اب ان طاقتوں کے ساتھ ہے جنھوں نے مشاہدہ، تجربہ اور غور و فکر کو شعار بنایا ہے جنھوں نے بھاپ اور بجلی کے بازوؤں پر پرواز کی ہے۔ جنھوں نے صنعتی انقلاب برپا کیا ہے اور جنھوں نے تجارت سے تسخیر کا کام لیا ہے۔ وہ غدر کے پرآشوب اور حوصلہ فرسا دور سے گزرا۔ مسلمانوں کے ہاتھوں سے بادشاہت بھی گئی، اقتدار اور اعتماد بھی گیا، حوصلہ اور ولولہ بھی جاتا رہا۔ اس بیدار مغز اور دور بین اور پُربصیرت اور دردمند انسان نے یہ ٹھان لی کہ انھیں یاس اور علیحدگی، غم اور غصہ سے نکال کر نئی صنعتی دنیا کے تقاضوں سے روشناس اور عصری ترقیوں سے ہمکنار کرے گا۔ اُس فرزانہ نے، جس کی عملی بصیرت اور دوراندیش حکمت کی ہندوستانی مسلمانوں نے کوئی دوسری مثال پیدا نہیں کی، اپنی زندگی کو دیوانہ وار اُن مقاصد کے حصول کی خاطر وقف کر دیا۔ وہ اپنے وطن عزیز کو دنیا کی محفل میں عزت کا مقام دلانا چاہتا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کو جہالت، مایوسی، تنگ نظری اور قدامت پرستی سے نکال کر علم، روشنی، خوداعتمادی اور ہم جوئی سے لیس کر دے۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اس کو یہی فکر دامن گیر تھی۔

اس نے قوم کی فکر میں خود کو فنا کر دیا۔

زندگی کا کون سا شعبہ تھا جسے اس نے مسلمانوں کی اصلاح اور بہبود کے لیے نہ کھنگالا ہو، کون سی صعوبت تھی جسے اس نے قوم کی خاطر گوارا نہ کیا ہو۔ مدرسے قائم کیے، کالج بنایا، رسالہ نکالا، اخبار شروع کیا، سائنٹفک سوسائٹی قائم کی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ دلی کی اسلامی تعمیرات پر ایسی کتاب لکھ ڈالی جو آج تک مستند ہے۔ یہ سب کچھ اس قوم کے لیے کیا جو اس کی منظورِ نظر تھی۔ اس نے اسلام پر ایک مغربی مصنف کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے گھر کا سامان بیچ کر ولایت کا سفر کیا۔ اور لائبریریوں میں مطالعہ اور تحقیق کرنے کے بعد مدلل اور مسکت جواب لکھا۔

• اس احسان (اور یہاں احسان کے ساتھ ایثار بھی شامل تھا) کا جواب خدا کے اس بندے کو ایسا دیا گیا جو اس جواب سے کہیں زیادہ تلخ اور جارحانہ تھا جس پر تلملا کر لیبر بادشاہ نے اپنا دماغی توازن کھو دیا۔ قدم قدم پر اس کا مذاق اڑایا گیا۔ اسے نیچری، دہریہ، کافر، قوم فروش اور انگریز پرست بتایا گیا۔ ہمارے سب سے بڑے مزاح نگار شاعر نے اپنے ترکش کے بہت سے تیروں کا ہدف سید احمد کو بنایا۔ مصلح کو مجرم، خیرخواہ کو بدخواہ، قوم پرست کو خودغرض قرار دیا گیا۔ اس کی حکمت پر نکتہ چینی کی۔ اس کی نیت پر حملہ کیا۔ اس مبلِ جلیل نے علی گڑھ کالج کو قائم کرنے کے لیے در بدر بھیک مانگی۔ چندہ کرنے کے لیے وہ اسٹیج پر گھنگھرو باندھ کر آگیا۔ اس نے گالیاں کھائیں، پھبتیاں سنیں، تہمتیں اٹھائیں لیکن اف نہیں کی۔ توازن کھونا درکنار اس کے پائے ثبات کو جنبش نہیں ہوئی۔ اس کی استقامت پر آنچ نہیں آئی۔ اس شخص پر جس نے اپنا سارا اثاثہ قوم کے لیے برباد کر دیا تھا، خیانت کا الزام لگایا گیا اُسے کافر قرار دیا گیا۔ کفر کے فتوی، پھبتی اور عداوت کی صبر شکن اور اعصاب دوز آوازیں ہر طرف سے کانوں میں آئیں۔ فضا ان آوازوں سے بھر گئی۔ کوئی اور ہوتا تو دیوار سے سر ٹکا کر مر جاتا کہ ناسپاسوں کی تہمت اور استہزا کے ان تیروں سے نجات پانے کا، جو کلیجہ کو چھید رہے تھے، صرف ایک ہی راستہ نظر آتا تھا لیکن اُس کے ماتھے پر شکن کبھی نہیں آئی۔ وہ اپنے دریدہ دہن اور بے شعور اور تنگ بین نکتہ چینوں کے سامنے ہاتھ جوڑتا

اور ہاتھ پھیلاتا رہا، گڑگڑا تا رہا کہ مجھے جتنا برا سمجھنا چاہو، تمھیں اختیار ہے سمجھو اور کہو لیکن خدارا اس کام میں میری یاوری کرو۔ اس نے ایم اے او کالج کے لیے ایسی عمارتیں بنوائیں جو آج بھی یونیورسٹی کے سر کا تاج ہیں۔ اپنی دور اندیش بصیرت سے کام لے کر اس نے مستقبل کا احاطہ کیا مستقبل اس کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح تھا۔ آگے چل کر بیسویں صدی میں اقبال نے کہا۔

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر دیکھ

اقبال نے آنے والے دور کی دھندلی سی تصویر دیکھی یا الفاظ کے آب و رنگ سے تیار کی تھی۔ سیّد احمد کی تیز اور دور رس نگاہ نے مستقبل کی تصویر کے خدوخال کو روشن کر دیا تھا۔ اس نے آج سے ۱۰۵ سال پہلے ایم اے او کالج کے لیے زمین اور تعمیر کا اہتمام اس انداز سے کیا کہ وہ سو سال کام آئیں۔ اس کے بعد جو لوگ آئے وہ چند سال آگے کی سوچتے رہے اور اب تو ایک عرصہ سے لمحہ بہ لمحہ جی رہے ہیں۔ روایت ہے کہ سیّد احمد نے یہ عمارتیں باوجود اپنی کثیر اور گرانقدر مصروفیات کے خود کھڑے ہو کر بنوائیں اور یہاں تک التزام کیا کہ راج ردّے میں کوئی اینٹ بھگوئے بغیر نہ لگانے پائے۔ روزانہ صرفہ کا تفصیل کے ساتھ بہ نفس نفیس حساب لکھا۔ ان حسابات کے رجسٹر یونیورسٹی میں آج تک محفوظ ہیں۔ لیکن اس عدیم المثال ریاضت، ایثار اور اخلاص اور انضباط کا جواب کیا ملا۔ کسی بے درد اور تیرہ باطن معترض نے کہا کہ عمارتیں اس لیے بنائی جا رہی ہیں کہ اپنے لیے کچھ پس انداز کر لیں۔ ظالمو اس نے جو کچھ پس انداز کیا آخرت کے لیے کیا۔ حالاں کہ توشۂ آخرت بھی اس کا منظور و مقصود نہ تھا۔ اس کا مقصود صرف ایک تھا ہندوستانی مسلمانوں میں قومی حمیت بیدار کرنا، انھیں جدید تعلیم سے سنوارنا، انھیں ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا کر دینا ان میں بھلے اور برے کا شعور پیدا کرنا۔

اور جب وہ مرنے کے قریب ہوا تو خود اس کے گھر میں اس کے لیے جگہ نہ تھی۔ دلیروں کا دلیر دل شکستہ مرا

اب قارئین ہی بتائیں کہ کنگ لیئر پر جو بیت گیا وہ اس کے برابر تھی جو سیّد احمد پر گزر رہی۔ اس قوم نے جس کے لیے اس نے عمر بھر پاپڑ بیلے، ہزارہا مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھائیں اس قوم نے اپنے محسن کے ساتھ کون سا ظلم تھا جو نہ کیا۔ لیکن ان محسن کشوں کی یلغار میں بھی سیّد احمد نے وہ دماغی توازن نہ کھویا جس سے کنگ لیئر نے اپنی بڑی بیٹیوں کی بے مہری اور احسان فراموشی کے کارن ہاتھ دھو لیا تھا۔ وجہ ظاہر ہے۔ لیئر نے انسانی محبت کی رسی کو اس مضبوطی کے ساتھ نہیں پکڑا تھا، جیسے سیّد احمد نے؛ یہی محبت آفات و احساسات کے مقابلے میں آخر الذکر کی ڈھال بن گئی۔ لیئر شاید شاہی آن بان کے احساس کو یک قلم مٹا نہ سکا۔ سیّد احمد نے اپنی انا کو اس طرح توڑ ڈالا، اپنی ذات کو اس طرح مٹا ڈالا، خود کو مقصد میں اس طرح ضم کر دیا کہ اس کی ذات اور نام نہاد عزت اس کے لیے غیر مربوط بے معنیٰ اور فروعی سے بھی کمتر ہو گئی۔ اس نے لیئر کی طرح دھوکا بھی نہیں کھایا، نہ اُس نے کسی کو جراحت پہونچائی تھی۔ لیکن تھے دونوں احسان فراموشی کے زخم خوردہ۔

مسلمانوں کی پسماندگی کا بڑا سبب یہی ہے ہے کہ ہر اس شخص کو جو ان کی بھلائی کے لیے کوشاں، ان کی اصلاح اور پیش رفت کے لیے سرگرم ہو، بدگمانی، الزام، اتہام اور استہزا کی صلیب تھما دیتے ہیں کہ جب تک زندہ ہو اسے شانوں پر لے کر چلو، اور مرنے کے بعد بھی بشرطیکہ اگلی پیڑھیوں کو بھی ہماری طرح صلیب سازی اور صلیب برداری کی توفیق ہو گی۔ ایسی قوم اچھی قیادت سے خود کو ہمیشہ کے لیے محروم

کر لیتی ہے۔ فراست، عظمت اور بصیرت سے قطع نظر کوئی دوسرا سید احمد کا سا کلیجہ کہاں سے لائے کہ گالیاں سُنے اور مُسکرا دے

اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آئے۔

کوئی قوم ترقی جبھی کرتی ہے جب اس کا ماحول اچھے رہناؤں کو قبول کر سکتا ہے، اور جب اس میں اداروں کو بنانے اور ڈھنگ اور اتحاد سے چلانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ہمارے یہاں نہ رہنما سرخرو ہوتے ہیں، نہ ادارے کامیاب۔ اور اب ہمیں ایسے ہی رہبر ملنے لگے ہیں جن کے ہم مستحق ہیں۔ غیرت ناشناس، تنک حوصلہ، خوشہ چیں، کوتاہ اندیش، تنگ نظر، خود غرض، خود نگر، خود پرست۔ یہ سید احمد کا ایثار تھا اور اس کا حسنِ نیت کہ اس کا ادارہ بے شمار حوادث اور خطروں کے باوجود آج تک قائم ہے اور ایک عنوان پھل پھول رہا ہے۔ مذکورہ خطروں میں سب سے بڑا خطرہ اس ادارہ سے وابستہ افراد میں سے کچھ کی خود غرضی اور بے حسی سے ہے۔ ان پر سامری کا سحر پوری طرح چل گیا ہے۔ ان کے دل کی آنکھوں کو زر کی چمک نے خیرہ کر دیا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد اور تناسب کا [illegible] ناظرین کے ظن و تخمین پر چھوڑتا ہوں۔

حالی نے حیاتِ جاوید لکھی اور خوب لکھی لیکن ان کے پاس شیکسپیئر جیسے ڈرامہ نگار کا قلم نہ تھا کہ ان زلزلوں طوفانوں اور آتش فشاں قیامتوں کی تشبیہ اتار سکتا جو ایک بے حس اور بے شعور قوم کی محسن کشی نے سید احمد کے دل میں برپا کر رکھی تھیں لیکن طوفان اور یہ قیامتیں دل کی دل میں رہ گئیں، دماغ تک نہیں پہونچیں، زبان تک نہیں آئیں۔ سید والا گہر کی مقصدیت اور لگن، بے نفسی اور عملی بصیرت نے انھیں آگے بڑھنے نہ دیا۔ قوم کی محبت نے طوفانوں کو جذب کر لیا۔ [illegible] وغضب کو پی لیا۔ اس نے ساری محبت اپنی قوم کو دی، خود قوم سے محبت کا مطالبہ نہیں کیا۔ لہذا وہ اس مایوسی اور صدمے سے محفوظ رہا، جس نے کنگ لیئر کو مار ڈالا جس نے توقع ہی نہیں کی، طلب ہی نہیں مانگا اسے شکایت کیوں ہو۔ اس نے اس ظالم ناشکری قوم کو جس نے اس کو قدم قدم پر ایذا پہونچائی نہ برا بھلا کہا، نہ گالی دی، نہ بددعا دی، نہ کوسا۔ جو سراپا دعا بن کر آیا تھا وہ بددعا کیسے دیتا، جو سدھارنے اور سنوارنے آیا تھا وہ بگاڑنے اور برباد کرنے کی بات زبان پر کیوں لاتا۔ جس کا ہر لمحہ، جس کا ہر فعل ایک مقصد کے تابع تھا۔ اس کے ذہن میں اور زبان پر کوئی دوسری بات کیسے آسکتی تھی۔ کیا یونیورسٹی کی جامع مسجد کے پہلو میں آسودہ اس بطلِ جلیل کی روح آج بے حد مضطرب نہ ہوگی۔ اتنی مضطرب وہ عارضی زندگی میں کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ اس کی زندگی میں اس کی محبت، اس کے ادارہ کی خدمت کا دعویٰ کرنے والا کون تھا، خدمت کرنے والے محبت کرنے والے خاموشی سے اپنا کام کر رہے تھے۔ آج اس کے دعویدار ہر گوشہ میں نظر آتے ہیں لیکن کیا یہ دعوے گونیرل اور ریگن کے دعووں کی طرح پُر فریب اور کھوکھلے نہیں ہیں۔ اس ادارہ میں جس کی بنیاد وفا اور ایثار پر تھی کیا اس نام کی کوئی چیز باقی ہے؟ کیا کوئی بے صدا کارڈیلیا کسی گوشے سے نکل کر بوڑھے باپ کو دلاسا دے سکتی؟

———

محمد مجتبیٰ صدیقی
علی گڑھ

ماں کی تعلیم بیٹے کو

جناب مدیر مسئول کا حکم ہے کہ سر سید احمد خاں پر ایک مختصر مضمون اشاعت کے لیے حاضر کیا جائے سر سید کی حیات کے ہر گوشہ پر اس قدر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ اب اس میں کسی نئی بات کا اضافہ مشکل ہے اور کہی ہوئی باتوں کا اعادہ کچھ سود مند نہیں ہوگا۔ مگر حکم کی تعمیل ضروری ہے اس لیے یہ چند سطریں پیش کر رہا ہوں۔

جیساکہ عنوان سے ظاہر ہوگا، میں یہاں سر سید ہی کی زبان میں صرف اس تعلیم کا ذکر کروں گا جو سر سید کو اپنی والدہ محترمہ عزیز النسا بیگم سے حاصل ہوئی، اور جس کا اثر ان کی زندگی پر پڑا۔ تعلیم صرف کتاب ہی سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کا سرچشمہ وہ ذاتی کردار بھی ہوتا ہے جو خدا کے برگزیدہ بندے مثال کے طور پر اپنے بعد کے آنے والوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں۔ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ماں کی گود میں بچہ اس وقت تک تعلیم پاتا ہے، جب تک وہ سنِ شعور کو نہیں پہونچتا۔ مگر حقیقت میں ماں کی گود اتنی تنگ دامن نہیں ہوتی ہے۔ بچہ بڑا ہو کر بھی اس کی نظروں میں بچہ ہی رہتا ہے اور بچہ بھی سنِ طفولیت کی حدیں پار کر لینے کے باوجود ان سے ایسی ہی عقیدت رکھتا ہے جیسی اس کو بچپن میں تھی اور اس کی نصیحت کو مانتا ہے۔ بڑے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن پر ایک سمجھ دار ماں کا سایہ سنِ شعور کو پہنچ جانے کے بعد بھی قائم رہے۔ سر سید ایسے ہی خوش قسمت بیٹے تھے اور عزیز النسا بیگم ایسی ہی سمجھ دار ماں تھیں۔

عزیز النسا بیگم ایک بڑے عالی خاندان کی ایک فرد تھیں۔ ان کی والدہ خواجہ محمد مراد اعتمادی کی بیٹی تھیں، جو نقیب الاولیا کے عہدے پر مامور تھے۔ والد خواجہ فرید الدین احمد دہلی دربار کے ایک اعلیٰ رکن تھے۔ مغل تاجدار اکبر شاہ نے ۱۸۱۵ء میں ان کو وزیر مقرر کیا اور دبیر الدولہ امین الملک مصلح جنگ کا خطاب عطا کیا۔ شوہر یعنی سر سید کے والد سید متقی خاں تھے۔ جن کو زمانہ شہزادگی میں اکبر شاہ متقی بھائی کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ زندگی کا زیادہ حصہ اس امیرانہ ماحول میں بسر کرنے کے باوجود ان کی طبیعت کی سادگی ہمیشہ قائم رہی۔ وہ ایک خدمت گزار بیٹی، ایک غم گسار بیوی اور ایک شفیق ماں تھیں۔

وہ بے حد لائق اور ذہین تھیں۔ گو تعلیم انھوں نے کچھ زیادہ نہیں پائی تھی۔ وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور کسی زمانے میں فارسی کی چند ابتدائی کتابیں

بھی پڑھی تھیں۔ سرسید نے گلستاں کے چند سبق ان سے پڑھے تھے۔ پڑھاتے وقت سرسید کی تنبیہ کے لیے وہ ایک لکڑی میں سوت کی گندھی ہوئی تین لڑیں اپنے پاس رکھ لیتی تھیں مگر ان کے استعمال کی کبھی نوبت نہیں آئی۔

جس زمانہ میں سرسید گیارہ برس کے تھے انھوں نے ایک پرانے ملازم کو کسی بات پر تھپڑ مار دیا۔ اس پر عزیز النسا بیگم اس قدر ناراض ہوئیں کہ ان کو گھر سے نکلوا دیا۔ اتفاق سے اسی وقت ان کی خالہ کی ماما ادھر سے گزر رہی اور ان کو خالہ کے گھر لے گئی۔ تین دن تک وہ وہاں چھپے رہے اور ان کو اس شرط پر معافی ملی کہ پہلے ملازم سے اپنا قصور معاف کرالیں۔ سرسید نے ملازم کے سامنے ہاتھ جوڑے تب ان کا قصور معاف ہوا۔

عزیز النسا بیگم لاوارث عمر رسیدہ عورتوں کی ہمیشہ خبرگیری کرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک عورت زیبا نامی اُن کے ساتھ رہتی تھی۔ اتفاقاً عزیز النسا بیگم بیمار ہوئیں اور زیبا کو بھی وہی مرض لاحق ہوا۔ طبیب نے جو دوا ان کے لیے تیار کرائی اسی میں وہ زیبا کو بھی شریک کرتی تھیں۔ جب دونوں کو صحت ہوگئی تو معالج نے ایک قیمتی معجون تجویز کیا۔ اس میں سے برابر زیبا کو بھی حصہ ملتا رہا۔ ان کا دستور تھا کہ ان کے پاس جو کچھ نقد یا جنس کی شکل میں آتا تھا اس میں سے ۵ فیصدی خدا کے نام پر علیحدہ کرلیتی تھیں اور جب ایک معتد بہ رقم جمع ہوجاتی تھی تو اس سے غریب پردہ نشیں عورتوں کی جو معاش سے تنگ تھیں امداد کرتی تھیں۔

سرسید کی ننھیال کو شاہ عبدالعزیزؒ اور ان کے خاندان سے عقیدت تھی۔ وہاں بیماروں کو صحت یابی کے لیے گنڈے اور تعویذ دیے جاتے تھے۔ عزیز النسا بیگم نے اس مسئلہ میں اپنے ننھیال کا اثر قبول نہیں کیا۔ ان کو شاہ غلام علی سے بیعت و عقیدت تھی جہاں گنڈے اور تعویذ کا ذکر بھی نہیں تھا۔ یہ مسلک خود انھوں نے اپنے اجتہاد سے اختیار کیا تھا۔

سرسید خورد سال ہی تھے کہ ان کی ماں بی بی (اُن کی انّا) کا انتقال ہوگیا۔ مرتے وقت انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کا تمام زیور سرسید کو دیا جائے۔ مگر عزیز النسا بیگم اس کو مرحومہ کی طرف سے خیرات میں دینا چاہتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے سرسید سے پوچھا کہ تم کہو تو یہ زیور ماں بی بی کو بھیج دیا جائے۔ سرسید نے ہاں کہا، تو وہ سب زیور انھوں نے مختلف طرح سے خیرات کردیا۔ زیور تو بیشک ان کو نہیں پہونچا مگر اس کی خیرات کا ثواب ضرور اُن کو مل گیا۔

وہ سرسید کو نصیحت کرتی تھیں کہ اگر کسی نے ایک دفعہ تمہارے ساتھ نیکی کی ہو اور پھر بُرائی کرے تو تم کو آزردہ نہ ہونا چاہیے۔ کیوں کہ نیکی کرنے والا کیسی ہی بُرائی کرے اس کے احسان کو نہیں بھلایا جاسکتا۔

اپنے نوجوان فرزند سید محمد خاں جو سرسید سے بڑے تھے کے انتقال پر انھوں نے جس صبر و استقلال کا اظہار کیا وہ انھیں کا حصہ تھا۔ ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے مگر انھوں نے صرف اتنا کہا کہ " خدا کی مرضی " اور وضو کرکے صبح کی نماز کے لیے کھڑی ہوگئیں اور اشراق تک مصلّے سے نہیں اٹھیں۔ اتفاق سے چار دن بعد ہی ان کی رشتہ داری میں ایک شخص کی بیٹی کی شادی درپیش تھی۔ اس نے شادی کو ملتوی کرنا چاہا۔ مگر انتقال سے تین دن بعد ہی عزیز النسا بیگم اس کے گھر گئیں اور کہا کہ میں تمہاری بیٹی کی شادی میں آئی ہوں تین دن سے

زیادہ سوگ منانے کا حکم نہیں ہے۔ شادی ملتوی کرنے سے تمہارا بہت نقصان ہوگا۔ میں شادی کی اجازت دیتی ہوں۔

سید محمد خاں کے انتقال کے بعد

سرسید نے اپنا تبادلہ فتح پور سے جہاں وہ منصف تھے دہلی کرا لیا۔ حکیم غلام نجف سے سرسید کے مرحوم بھائی کی بہت دوستی تھی۔ سرسید بھی ان کو اپنے بڑے بھائی کے برابر سمجھتے تھے۔ اتفاقاً حکیم صاحب کسی بات پر ناراض ہوگئے۔ مگر سرسید برابر ان سے ملتے رہے۔ جب انھوں نے سرسید کے پاس آنا چھوڑ دیا تو سرسید نے بھی ان کے ہاں جانا کم کر دیا۔ عزیز النسا بیگم نے سرسید سے اس کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے جو بات تھی بتا دی۔ عزیز النسا بیگم نے ان کو نصیحت کی کہ افسوس ہے کہ جس بات کو تم اچھا نہیں سمجھتے اس کو خود کرتے ہو۔ تم کو حکیم صاحب سے بدستور ملنا اور اپنا فرض ادا کرتے رہنا چاہیے۔ اِس سے تم کو کیا غرض کہ دوسرے اپنا فرض ادا کرتے ہیں یا نہیں۔

ایک شخص نے جس کے ساتھ سرسید نے نیکی کی تھی ان کے ساتھ نہایت بدی کی۔ سرسید کے پاس اس کو سزا دلانے کے لیے پورا ثبوت موجود تھا اور انھوں نے اس سے انتقام لینا بھی چاہا۔ مگر عزیز النسا بیگم نے اُن سے کہا کہ ایسا کرنا بڑی نادانی ہوگی۔ بہتر ہے کہ اس کو معاف کر دو۔ لیکن اگر انتقام لینا ہی ہے تو اس کو خدا پر چھوڑ دو جو ہر بُرے عمل کی سزا دینے والا ہے۔ سرسید نے ان کی نصیحت پر عمل کیا اور اس کو معاف کر دیا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزی سپاہ نے

جب دہلی میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا تو فوجی عزیز النسا بیگم کے گھر میں بھی گھس آئے اور ان کا تمام مال و اسباب لوٹ لے گئے۔ انھوں نے حویلی چھوڑ کر زیبا (جس کا ذکر اوپر آچکا ہے) کی کوٹھری میں اپنی نابینا بہن کے ساتھ پناہ لی۔ آٹھ دس دن انھوں نے بڑی تکلیف میں بسر کیے اس وقت سرسید بجنور میں تھے۔ جب وہ دہلی پہنچے تو اس وقت عزیز النسا بیگم کے پاس ۳ دن سے کچھ کھانے کو نہ تھا۔ کہیں سے گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا، اسی پر بسر تھی۔ ۲ دن سے پانی بھی میسر نہیں ہوا تھا۔ سرسید ان کو اور اپنی خالہ کو میرٹھ لے گئے۔ عزیز النسا بیگم نے جو تکلیفیں اُٹھائی تھیں ان کو وہ برداشت نہ کر سکیں اور چند ہی دنوں بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ مرتے وقت انھوں نے سرسید سے کہا کہ ان کے ذمہ نہ تو کسی روزے کی قضا باقی ہے اور نہ کسی نماز کی۔ سوائے ان چند دنوں کے جو انھوں نے زیبا کی کوٹھری میں بسر کیے تھے۔ ان کی قضا اگر وہ زندہ رہتیں تو خود کر دیتیں لیکن چونکہ اب ایسا ممکن نہیں ہے اس لیے سرسید کو انھوں نے وصیت کی کہ ان کی قضا نمازوں کا حساب کر کے کفارہ کے گیہوں غریبوں کو تقسیم کر دیے جائیں۔ یہ وصیت کر کے انھوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

عزیز النسا بیگم کا یہی مثالی کردار تعلیم و ہدایت کا وہ سرچشمہ تھا جس سے ایک شفیق ماں اپنے سعادت مند بیٹے کو اپنی آخری سانس تک فیض یاب کرتی رہی۔ جس طرح وہ سرسید کے لیے باعثِ رحمت تھیں دعا ہے کہ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان پر بھی اپنی رحمت نازل کرے اور ہم سب کو ماں اور بیٹے دونوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔

اقبال حسین
شعبہ تاریخ اے ایم یو

سرسیّد اور مدرسۃ العلوم

سرسیّد ایک ایسے دور کی پیداوار تھے، جب مسلمان سیاسی اقتدار سے محروم ہو چکے تھے اور وہ من حیث القوم، ایک ایسی کشمکش میں مبتلا تھے جس سے باہر نکلنا اُن کے لیے دشوار تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی اقتدار سے برطرفی ایک تاریخی حادثہ نہیں بلکہ بڑا المیہ تھا۔ کیوں کہ مسلمانوں کی اقتصادی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی پوری طرح سے سیاسی اقتدار سے منسلک تھی کہ اس کے چھن جانے سے ان کی اجتماعی زندگی کے تار و پود بکھر کر رہ گئے۔ مسلمان ایک شکستہ کشتی میں سوار تھے جس کے بادبان پھٹ چکے تھے، پتوار ٹوٹ چکے تھے اور کشتی بغیر کسی ناخدا کے شدید طوفان میں گھری ہوئی تھی۔

۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعات نے مسلمانوں کی بچی کھچی ہمت بھی پست کر دی۔ انگریزوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بھی زیادہ تر وہی بنے اور انھیں اپنی جان و مال، عزت و آبرو اور زمین و جائداد سب ہی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ انگریز، مسلمانوں کو سیاسی رقیب سمجھتے ہوئے پہلے ہی شک و شبہات کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ غدر میں مسلمانوں کی سرگرمیوں نے انھیں اور برہم کر دیا۔ مسلمان ہر جگہ معتوب تھا، مقہور تھا۔ ایسی صورت حال میں احساسِ کمتری اور خوشامد کے جذبات کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر، فراریت اور قنوطیت کا شکار ہونے لگا حسب سابق انگریز مسلمانوں کو شک و شبہات کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت میں نئے حکمرانوں کے تہذیب و تمدن، حکومت اور جدید تعلیم سے نفرت اور بیزاری کے جذبات بڑھتے جا رہے تھے۔ اس طرزِ عمل کی وجہ سے دونوں میں آہستہ آہستہ شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔ فراریت اور احساسِ کمتری کا شکار مسلمان اپنا رشتہ ماضی کی شاندار یادوں اور روایتوں سے جوڑ کر اپنی مجروح انا کی تسکین کی خود فریبی میں مبتلا ہو گیا۔ جھوٹی شان و شوکت اور بے ہودہ غیر ضروری رسم و رواج کو برقرار رکھنا ہی اُس کی ذہنی آسودگی کا سبب بننے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء کے سیلِ گراں سے بچنے والی جاگیریں اور زمینداریاں اس خود فریبی کی قربان گاہ پر چڑھ کر سود خواروں اور ساہوکاروں کی نظر ہونے لگیں۔ ان کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ حکومت وقت کی مصلحتوں نے ہندوستانیوں کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے پہلے ہی بند کر رکھے تھے۔ مسلمانوں کی انگریز نفرت، جدید تعلیمات سے بیزاری نے ان کے لیے معمولی ملازمتیں بھی مشکل بنا دیں۔ صدیوں کی حکمرانی نے مسلمانوں کو تجارت سے دور کر دیا تھا، اب کوئی ایسا میدان نہ تھا جس کے سہارے مسلمان اپنی بقا کا سامان ڈھونڈتا۔ غرض کہ ہر طرف سے مسلمان کچھ اغیار کے سلوک اور کچھ اپنی فطرت کی وجہ سے تنہا اور عزلت کی راہ پر گامزن تھا۔ سرسیّد ایسے ہی

عالم میں مسلمانوں کے لیے ہادی بن کر نمودار ہوئے۔

سرسید اور ان کے کارناموں پر نظر ڈالیے تو ایک عجیب پہلو دار شخصیت سامنے آتی ہے جس کو اللہ نے عزم محکم، سعیٔ پیہم، راست گفتاری، جرأت و بے باکی، جذبۂ قومی، رواداری، انکساری، تحمل و بردباری، استغنا اور انسانیت سب ہی سے بھرپور نوازا تھا۔ سرسید کے سامنے ایک ایسی قوم کی اصلاح کا مسئلہ تھا جو ہر طرح بکھر چکی تھی ایک طرف لٹا پٹا طبقہ امرا تھا جن کے پاس بچا کھچا اثاثہ موجود تھا۔ لیکن جدید تعلیم سے بیزار اور بے نیاز تھا۔ دوسری طرف ان گنت پرانے تباہ حال خاندان تھے جن کو عزت و آبرو برقرار رکھنی دشوار ہو رہی تھی۔ دونوں ہی آئین نو سے خائف اور طرز کہن پر اڑے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کی اکثریت دل و دماغ، ناک کان، آنکھیں سب بند کیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی تھی۔ سرسید کے سامنے بڑا مشکل کام تھا۔ ان کو راجہ رام موہن رائے کے مقابلے میں کہیں زیادہ دشواریوں کا سامنا تھا۔ کم از کم رائے کی یہی کم خوش قسمتی تھی کہ ان کو قوم اور حکومت وقت دونوں سے تعاون ملا۔ یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔

سرسید کو یقین تھا کہ جب تک مسلمان جدید تعلیم سے بے نیاز رہیں گے، ان کی ترقی ناممکن ہے۔ مسلمانوں میں جدید تعلیم کو رائج کرنے کے لیے انھوں نے مدرسۃ العلوم کے قیام کا تصور پیش کیا۔ سرسید کا مدرسۃ العلوم گو کہ مسلمانوں کے لیے قائم ہوا تھا لیکن اس کے دروازے تمام ہندوستانیوں کے لیے بلا امتیاز مذہب وملت کھلے تھے تاکہ جدید تعلیم سے فائدہ اٹھا کر، ملک وقوم کو ذلت وخواری سے نجات دلا سکیں۔ سرسید کو ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کے اہانت آمیز سلوک کا بھرپور احساس تھا۔ اپنے ایک لکچر میں مدرسۃ العلوم کے قیام کے مقصد کو بیان کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا:۔

> ہم لوگ آپس میں کسی کو ہندو، کسی کو مسلمان کہیں، مگر غیر ملک میں ہم سب نیٹو یعنی ہندوستانی کہلائے جاتے ہیں۔ غیر ملک والے خدا بخش اور گنگا رام دونوں کو ہندوستانی کہتے ہیں ..... نیک دل سے نیٹو یعنی ہندوستانی کا اور تنگ دل لوگوں سے نیگر یعنی کالے منھ یا وحشی کا لقب برابر ملتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ہندوؤں کی ذلت سے مسلمانوں کی اور مسلمانوں کی ذلت سے ہندوؤں کی ذلت ہے۔ پھر ایسی حالت میں جب تک یہ دونوں بھائی ایک ساتھ پرورش نہ پاویں، ساتھ ساتھ دودھ نہ پئیں، ایک ہی ساتھ تعلیم نہ پاویں، ایک ہی طرح کے وسائل ترقی دونوں کے لیے موجود نہ کیے جاویں، ہماری عزت نہیں ہوسکتی۔ مدرسۃ العلوم قائم کرنے میں یہ مطلب ہی ہے۔
>
> (مجموعہ لکچرہائے سرسید ص ۲۴۶)

قدرت نے سرسید کو بے پناہ قائدانہ صلاحیتیں ودیعت کی تھیں وہ اپنا اصلاحی مشن صرف مسلمانوں تک محدود نہ رکھ کر عام ہندوستانیوں تک وسیع کرسکتے تھے، لیکن اس میں کئی قباحتیں تھیں۔ سرسید کو غالباً یہ احساس تھا کہ اگر وہ تمام ہندوستانیوں کے مسائل لے کر آگے بڑھ

تو اس کے اثرات بہتر نہ ہوں گے اور مسلمانوں کی اصلاح ممکن نہ ہو سکے گی۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ انگریز اور مسلمان ایک دوسرے سے بیزار تھے، سرسید نے اسی لیے تحریک کو مسلمانوں تک محدود رکھا اور مسلمانوں اور انگریزوں کے درمیان خلیج کم کرنے کے لیے افہام و تفہیم کی راہیں پیدا کیں اس رویہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ سرسید کی تحریک مذہبی عصبیت اور فرقہ وارانہ تھی، سخت غلطی ہوگی۔ سرسید کا ذاتی تجربہ تھا کہ مسلمان کیا سے کیا ہوتے جارہے تھے۔ بنگال کی مثال ان کے سامنے تھی۔ باوجود بڑی تعداد کے وہ اقتصادی بدحالی کا بڑی طرح شکار تھے اور سرکاری نوکریوں میں ان کی تعداد گنی چنی تھی۔ ان کو یہ احساس تھا کہ ہندو اور مسلمان، گاڑی کے دو پہیوں کی طرح ہیں۔ اگر ایک کمزور یا سست رفتار رہا تو گاڑی چلنی دشوار ہوگی۔ ہندوؤں میں جدید تعلیم کا پچاس سال پہلے ہی آغاز ہوچکا تھا۔ وہ ہر طرح ترقی پذیر تھے۔ وہ تاجر تھے، وکیل تھے، ڈاکٹر تھے اور سرکاری ملازمتوں میں دخیل تھے۔ لیکن مسلمان کچھ بھی نہ تھا۔ کوئی ملک کیسے ترقی کرسکتا تھا جس کی اتنی بڑی آبادی جہل اور اقتصادی پس ماندگی کا شکار ہو۔ سرسید جب بھی مسلمانوں کی پس ماندگی کے متعلق کوئی خبر سنتے بے قرار ہوجاتے۔ اپنے ایک خط میں محسن الملک کو تحریر فرماتے ہیں،

"بھائی مہدی، تم پائنیر اخبار الہ آباد میں سے ایک آرٹیکل کا ترجمہ سنو۔ وہ لکھتا ہے کہ آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں۔ وہ بھی ضعیف ہیں، جلد پنشن لیں گے اور ان کی جگہ بھی کوئی مسلمان نہیں ہوگا۔ دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا، اب سب یہی کہتے ہیں۔"

(مکتوباتِ سرسید، ص۔ ۶۳)

سرسید کا ذہن زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح پر سوچنے لگا۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان، قائم کی، لیکن قوم کی بے رخی سے وہ سخت مضطرب تھے۔ جس روز کمیٹی کا اجلاس ہونے والا تھا، اس سے ایک رات پہلے سرسید کے اضطراب کا یہ عالم تھا کہ بقول محسن الملک۔ "دو بجے رات کے قریب جو آنکھ کھلی تو میں نے سرسید کو پلنگ پر نہ پایا میں ان کو دیکھنے کمرہ سے باہر نکلا، دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدہ میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوس ناک خبر آئی ہے۔ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ اس سے زیادہ اور کیا مصیبت ہوسکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے، بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔"

سرسید کو مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف مائل کرنے اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ قائم کرنے میں جن دشواریوں، مخالفتوں، تنقیدوں اور یاوہ گوئیوں کا سامنا کرنا پڑا، اس کا اندازہ آج کی نسل نہیں کرسکتی۔ یہ یہ مخالفتیں اغیار نہیں خود مسلمان کر رہے تھے۔ بدقسمتی سے اس کا سلسلہ زبان و قلم تک محدود نہ رہ کر اہانتوں اور دھمکیوں تک پہنچ گیا تھا اور اس میں علماء کا بڑا طبقہ پیش پیش تھا۔ سرسید کو طرح طرح کے استہزائیہ خطابات سے نوازا گیا۔ ان کی تعلیم کی مہم کے خلاف علماء

نے صف آرا ہو کر اپنے خطبات اور تقریروں میں فتوی صادر کرنے شروع کر دیے۔ جدید تعلیم کے حصول کو اسلام مخالف اور اسلام دشمن قرار دے دیا گیا۔ کوئی اور ہوتا تو اپنوں کی اس بے رخی اور دشمنی سے ہراساں ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن سرسیّد جناب رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلم کی سنت پر عمل کرتے ہوئے مردِ آہن کی طرح تنقید و تنقیص سے بے پروا، عاجزی لیکن پائیداری اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنے منصوبہ کی تکمیل میں سرگرم رہے۔ وہ مدرستہ العلوم کے قیام کے لیے دربدر بھٹکتے رہے۔ اور چندہ وصول کرنے کے لیے کبھی یہ نہ سوچا کہ وہ خود کیا ہیں بقولِ حالی:

"..... نمائش گاہ، علی گڑھ میں انھوں نے کتابوں
کی نمائش لگائی اور خود کتابیں بیچنے کے لیے
دوکان پر بیٹھے۔ نیشنل والینٹر بن کر گلے
میں جھولی ڈال کر اور اسٹیج پر کھڑے ہو کر
غزلیں گائیں۔"

(حیاتِ جاوید ص ۲۵۰)

سرسیّد نے اپنے مخالفوں سے معاندانہ رویہ نہیں اختیار کیا۔ وہ عظیم انسان تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی قوم کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ جو بھی کام کر رہے تھے فرض سمجھ کر نہایت خلوصِ دل اور نیک نیتی سے کر رہے تھے۔ اسی لیے انھوں نے مدرستہ العلوم کے مخالفوں کے جواب میں افہام و تفہیم، دلیل و برہان اور عاجزی کی راہ اپنائی۔ ۱۸۷۴ء میں مذہبی مخالفتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لاہور کے مواعظ سے فرمایا تھا۔

"..... فرض کرو میں ایک بدعقیدہ ہوں مگر
اے بزرگانِ پنجاب! میں آپ سے
پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی
قوم کی بھلائی کے لیے کوشش کرے تو
کیا آپ اس کو اپنا خادم اور خیرخواہ نہ
تصور کریں گے۔ آپ کے لیے دولت سرا
بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں
اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں یا آپ
کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے
ذوالجلال کا نام لیتے ہیں۔ چوڑھے، چمار،
قلی، کافر، بت پرست بدعقیدہ سب
مزدوری کرتے ہیں مگر آپ نہ کبھی اس
دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ
کبھی مسجد منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں
آپ مجھ کو بھی اس مدرسہ کے قائم کرنے میں
ایک چمار قلی تصور کیجیے اور میری محنت و مشقت
سے اپنے لیے گھر بننے دیجیے۔"

(حیاتِ جاوید، ص ۲۸۲)

بالآخر سرسید اپنے مقصد میں، اپنے مساعی جمیلہ سے مدرستہ العلوم قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مدرستہ العلوم کے قائم کرنے میں بہر طور سرسیّد کا یہ خیال کبھی نہیں تھا کہ اس کے فارغ شدہ طالب علم سرکاری ملازمتیں آسانی سے حاصل کریں گے۔ اگر صرف حصول نوکری ہی سرسیّد کا مقصد ہوتا تو وہ مدرستہ العلوم کے قائم کرنے کی تحریک کے بجائے، مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ سرکاری مدارس انگریزی میں داخلہ دلانے اور تعلیم حاصل کرنے کی تحریک چلاتے۔ مدرستہ العلوم کے قیام کے مقاصد میں ایک جانب مسلمانوں کے مذہبی، ثقافتی اور علمی روایات کا تحفظ پیش نظر تھا تو دوسری جانب ان کی تربیت و اصلاح منظور تھا

تکہ وہ خود اعتمادی کے ساتھ زندگی میں پیش آنے والے مصائب اور مشکلات کو ایک ترقی یافتہ اور مہذب قوم کی طرح جھیل سکیں۔ سرسید نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا بھی ہے۔

"...... اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان علوم
وفنون میں ایسی تعلیم پا جائیں کہ بلا ذریعہ نوکری
خود اپنے قوت بازو سے اپنی معاش پیدا
کریں اور جو مدارس سرکاری میں بجز نوکری
پیشہ بننے کے یہ بات نہیں پیش آئی۔"
(مکتوبات سرسید، ص ۲۲۶)

مدرستہ العلوم کے قیام کے بعد سرسید نے اس کے نظم و نسق کے لیے انگریزوں کا انتخاب کیا چونکہ سرسید انگریزوں کے عادات و اطوار کا مشاہدہ انگلینڈ میں خود کر آئے تھے۔ وہ مسلمانوں کے اندر جدید علم کے ساتھ ساتھ وہ ایسی ہی باقاعدگی اور نظم پیدا کر دینا چاہتے تھے جو انگریزوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس انتخاب میں کسی طرح کی مرعوبیت یا خوشامد پسندی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ صدق دل سے اس عمل کو قوم کے لیے مفید جانتے تھے۔ گو کہ سرسید نے مدرستہ العلوم کی اعلیٰ جگہوں پر انگریز اساتذہ کا تقرر کیا تھا لیکن مدرستہ العلوم کی پالیسی اور نظم و نسق پر ان کی بھرپور نظر تھی۔ اس امر کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مدرستہ العلوم کے معاملات میں سرکاری دخل در معقولات کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسی مسئلہ پر ان کی مسٹر کیلسن، ڈائرکٹر پبلک انسٹرکسنز سے ناچاقی بھی ہو گئی چونکہ سرسید مدرستہ العلوم کے طلبا کو مہذب، آزاد مزاج، بے باک اور نڈر بنانا چاہتے تھے اس لیے مدرستہ العلوم کے لیے بھی ضروری تھا کہ سرکاری قید و بند سے آزاد رہے۔ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اس بات کی وصیت کر دی تھی کہ مدرستہ العلوم کو قوم ہی کے ہاتھ میں رہنا چاہیے اور "بری طرح یا بھلی طرح ہماری قوم ہی اس کی چلانے والی ہو۔ لوگ عام فائدہ کے کاموں میں حکام کے سامنے اپنا رسوخ چاہتے ہیں، مگر حقیقت میں اپنی عزت کو بیچتے ہیں۔" (مکتوبات سرسید، ۲۷۲،۲۷۳)

سرسید اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہے، فی الوقت اس پر گفتگو ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ ہم کس حد تک سرسید کے بتلائے ہوئے راستہ پر گامزن ہیں اور مدرستہ العلوم کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ آج ہم مدرستہ العلوم کے چند دوست نما دشمنوں کے غلط پروپیگنڈوں کا شکار ہو کر ایسے کام کرتے جا رہے ہوں جس سے ادارہ کی شہرت اور ترقی مجروح ہو رہی ہو۔

ترسیلِ زر
اور
جملہ خط و کتابت
مندرجہ ذیل پتہ پر کیجیے
قاضی معزالدین احمد
مدیر مسئول تہذیب الاخلاق
صفدر منزل۔ تار بنگلہ اے ایم یو
علی گڑھ۔ یوپی (۲۰۲۰۰۱)

فرخ جلالی
شعبۂ تاریخ
اے ایم یو

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا مشرقی شعبہ

باشعور افراد کو تنزل کے زمانہ میں تعلیم کی یاد بہت آتی ہے۔ سیاسی غلامی اپنے ساتھ تعلیمی ابتری بھی لاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں تیزی کے ساتھ تبدیلیاں آئیں۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۳ء تک سرسید غور وفکر کے ساتھ ان تبدیلیوں کا مطالعہ کرتے رہے وہ اس سلسلہ میں متفکر اور کچھ مبہوت سے تھے۔

۱۸۶۳ء میں سرسید کلکتہ گئے وہاں انھوں نے انگریزی حکومت کے استحکام کے آثار دیکھے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی دیکھی۔ اس سوسائٹی سے پہلے سے ان کا ربط تھا۔ یہاں جدید انداز سے مشرق کے بارے میں معلومات اکٹھی اور شائع کی جارہی تھیں۔ کلکتہ سے واپس آکر سرسید نے سائنٹیفک سوسائٹی کے کام کو فروغ دیا۔ سرسید قدیم نظام تعلیم کو عام کرنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے اگلے بارہ برس (۱۸۶۳ء - ۱۸۷۵ء) ایک نئے نظام تعلیم کی تشکیل اور ترویج میں صرف کر دیے۔ اس کام میں ان کے چھوٹے بیٹے سید محمود (۱۸۵۰ء - ۱۹۰۳ء) کو بڑا دخل تھا۔ سرسید نے قدیم اور جدید کی آویزش ایک نئی آمیزش میں تبدیل کر دیا۔ حالاں کہ یہاں بھی وہ ایک حد تک ناکامیاب رہے۔ اس طرح انھوں نے اپنے بہترین علمی ورثہ کی حفاظت اور تبلیغ کا کام انجام دیا۔ اور جدید نظریات اور نئی زبان کا خوش دلی سے خیرمقدم کیا۔ یہاں ان کی دیوپیکر شخصیت اور باشعور صلاحیت کا قائل ہونا پڑتا ہے یہ ہر فرد کے بس کی بات نہیں۔

محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا اردو نام "مدرسۃ العلوم مسلمانان" تھا مگر یہ نام مشہور نہیں ہوا۔ اس "مدرسۃ العلوم میں تعلیم کے دو صیغے" تھے

۱ اول۔ انگلش ڈپارٹمنٹ جس میں علوم انگریزی زبان میں اور عربی یا فارسی یا سنسکرت بطور سیکنڈ لینگویج کے پڑھائی جاتی تھی

۲ دوم اورینٹل ڈپارٹمنٹ جس میں علم ادب عربی یا فارسی زبان میں تاریخ وجغرافیہ وحساب وریاضی وغیرہ علوم وفنون اردو زبان میں پڑھائے جاتے تھے۔ "اور انگریزی بطور سیکنڈ لینگویج کے تعلیم ہوتی ہے"

اس کے علاوہ سنی اور شیعہ طلباء کی تعلیم اور امتحان کا انتظام الگ تھا۔ جس میں بعض اونچے درجے کی کتابیں شامل نصاب تھیں۔

ہندوستان میں مشرقی نظام تعلیم میں اصلاح اور تبدیلی کی آوازیں قریب سو برس سے اٹھ رہی ہیں۔ سو سال ہوئے سرسید نے قدیم وجدید کے بہترین امتزاج کے ساتھ ایک نصاب تیار کیا اور دس برس

تدریس کی تجربہ گاہ میں جاری رکھ کر ملک کے سامنے پیش بھی کر دیا۔

یہ صرف مشرقی مدارس کے نصاب کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یونیورسٹیوں میں اسلامک اسٹڈیز کے نام سے جو غیر واضح نصاب شامل ہے ان کے لیے بھی غور و فکر کی دعوت ہے۔ اسلامک اسٹڈیز میں یورپ کے زیر اثر مسلمانوں کی تاریخ کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ایسی کتابیں شامل نصاب ہیں جن میں مسلم تاریخ میں تحریف کا کام بھی کیا گیا ہے اور بعض نئے گوشوں کو اجاگر کیا گیا ہے اور وہ علوم جن کو مدارس اسلامی میں خصوصی حیثیت حاصل ہے وہ اسلامک اسٹڈیز میں ثانوی حیثیت سے پڑھائے جاتے ہیں۔ ادھر مدارس میں بعض تحقیقی اور عصری مشکلات کے باعث مسلم تاریخ کا نصاب بہت کم ہے۔ تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا پتہ بھی نہیں ہے۔

سر سید نے محمدن اینگلو اورینٹل کالج میں ایک متوازن مشرقی نظام کا تجربہ کیا جس میں جدید علوم کے اکتسابات اور علوم قدیمہ کے بہترین انتخابات شامل تھے۔

سر سید کے عہد میں "اورینٹل صیغہ عربی" میں پانچ جماعتیں تھیں۔ ایک کالج کلاس میں اور چار اسکول کلاس میں۔"

مختلف درجوں میں جو قدیم اور جدید کتابیں پڑھائی جاتی تھیں یا ان کے انتخاب پڑھائے جاتے تھے' ان کے نام لکھتا ہوں تاکہ اس نصاب تعلیم کی وسعت کا اندازہ ہو سکے۔

مختصر معانی	سبعہ معلقہ	شرح لمعہ	قوانین الاصول
مقامات حریری	شرح ملا	اصول کافی	معالم الاصول
حماسہ	حاشیہ قطبی	نہج البلاغہ	شرائع الاسلام

نفحۃ الیمن	مقامات بدیعی
عجب العجائب	شافیہ
کافیہ	شرح تہذیب
ہدایت النحو	میزان
منشعب	صرف میر
نحو میر	شرح ماۃ عامل
مسلم الثبوت	شرح عقاید جلالی
تفسیر بیضاوی	مشکوٰۃ شریف
صحیح ترمذی	صحیح نسائی
صحیح ابن ماجہ	صحیح ابوداؤد
الصحیح البخاری	

فلسفہ منطق۔

شرح سلم قاضی مبارک (بحث تصورات تمام)

شرح سلم مولوی حمداللہ

صدرا	مرقات
میرزاہد	

کتب مذہب اہل سنت جماعت

ہدایہ	نور الانوار
توضیح	قدوری
شرح وقایہ	مالابدمنہ
شرح عقاید نسفی	سراجی

کتب مذہب شیعہ اثنا عشریہ

تبصرہ علامہ حلی — جامع عباسی۔

تاریخ

واقعات ہند — تاریخ انگلستان

تاریخ ہندوستان

جغرافیہ

مفتاح الارض — جغرافیۂ ہند

جغرافیہ طبیعی۔ ذکاء اللہ

ریاضی

جبر و مقابلہ — از ٹاڈ ہنٹر۔ مترجمہ ذکا اللہ

حساب — برناڈ اسمتھ مترجمہ ذکا اللہ

اقلیدس — ٹاڈ ہنٹر مترجمہ ذکا اللہ

امتحان کا طریقہ خاصا سخت تھا۔ اعلیٰ درجہ کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جن میں چند کے نام یہ ہیں

مولانا محمد اکبر ابن مولانا نور الحسن کاندھلوی عربی کے پروفیسر تھے۔

مولوی سید عباس حسین ابن مولانا جعفر علی شیعہ دینیات اور عربی کے پروفیسر تھے۔

یکم فروری ۱۸۸۳ء سے مولانا شبلی بھی اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے تھے۔

مولوی نجف علی خاں ریاضی کے استاد تھے۔ ۱۸۷۵ء میں ان کا تقرر ہوگیا تھا۔

مولانا خلیل احمد اسرائیلی اور مولانا محمد اسحٰق کا تعلق علی گڑھ سے تھا۔

حافظ محمد فایق اور مولوی عبدالرزاق فارسی کے استاد تھے۔

۱۸۸۵ء میں صیغہ مشرقی عارضی طور سے بند ہوگیا۔ شاید ۱۹۸۵ء تک اس کی تجدید ہوجائے۔

بقیہ یونیورسٹی کے شب و روز

(صفحہ نمبر کا بقیہ۔)

دماغ کی رگ پھٹ جانے کے سبب سے ۴ اکتوبر ۱۹۸۲ء بروز پیر اچانک انتقال ہوگیا۔

یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کا ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں مرحوم کے اوصاف حسنہ پر روشنی ڈالی گئی اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

شعبۂ انگریزی میں بھی ایک جلسہ ہوا جس میں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور دعائے مغفرت کے ساتھ ایک تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔

ادارہ تہذیب الاخلاق بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے اور مرحوم کے پسماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

[redacted]

حامدہ مسعود
ویمنس کالج
اے ایم یو۔

سرسید اور تربیتِ نسواں

....

ڈپٹی نذیر احمد کا قصہ مراۃ العروس جب پہلی بار شائع ہوا تو اس میں اکبری کے بدڈھنگے پن اور بدسلیقگی کی روداد پڑھ کر سرسید بہت بدمزہ ہوئے اور اسے مسلم معاشرے کی خواتین پر اتہام قرار دیا۔ دراصل ان کے ذہن میں مسلم گھرانے کی مستورات کی وہ تصاویر محفوظ تھیں جو انھوں نے اپنے نانا خواجہ فریدالدین کے گھرانے میں دیکھی تھیں۔ ان میں سب سے دل پذیر تصویر خود ان کی والدہ عزیزالنسا بیگم کی تھی جن کی آغوشِ تربیت کا لطف انھیں عمر بھر یاد رہا۔ سرسید کے بیان کے مطابق عزیزالنسا بیگم کی فہم و فراست کے واقعات کی جو کڑیاں ہمارے سامنے آئی ہیں ان کی مدد سے ہم انھیں انیسویں صدی کے مسلمان شرفا کے گھرانے کی ایک مثالی خاتون قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔ وہ خواجہ فریدالدین کی تین بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ خواجہ موصوف شمالی ہند میں اپنی انتظامی صلاحیت کی بنا پر خاص شہرت رکھتے تھے۔ جب مہاراجہ رنجیت سنگھ نے انھیں ملازمت کی دعوت دی تو عزیزالنسا بیگم نے انھیں مشورہ دیا کہ آپ کا مہاراجہ رنجیت سنگھ کی عملداری میں جانا اور اس کی سلطنت کے اختیار لینے اور ہم سب کا انگریزی عملداری میں رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ خواجہ فریدالدین نے بیٹی کی رائے کو صحیح جانا اور لاہور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

سرسید نے اپنی والدہ میں انسانی ہمدردی، فیاضی اور اولوالعزمی کے ساتھ مذہبی عقائد کے معاملہ میں ان کی روشن خیالی دیکھی تھی۔ وہ روایتی رسم و رواج سے متنفر تھیں اور نذر و نیاز اور تعویذ گنڈوں پر یقین نہیں رکھتی تھیں۔ جوان بیواؤں کو وہ نکاحِ ثانی کی ترغیب دیتی تھیں۔ جبکہ اس وقت معاشرے کے دباؤ کے تحت شاہ عبدالعزیزؒ جیسی بلند مرتبت شخصیت کا یہ عالم تھا کہ خود ان کے بیان کے مطابق وہ جب اپنی جوان بیوہ بہن کو قرآن کی تفسیر پڑھاتے تو نکاحِ ثانی کے احکام حذف کر جاتے تھے۔ سرسید نے اپنے گھر میں ماں، خالہ اور بہن کو دیکھا تھا جو سلیقہ کے ساتھ خانہ داری کی جملہ ذمہ داریوں کو سنبھالتی تھیں۔ عزیزالنسا بیگم قرآن شریف کے علاوہ فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھے ہوئی تھیں۔ بہن صفیۃ النسا بیگم علاوہ اور مذہبی کتابوں کے حدیث کی عربی کتابوں کا مطالعہ مع ترجمہ کے کرتی تھیں اور محلہ اور کنبہ کی لڑکیاں ان سے پڑھتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے ایجوکیشن کمیشن کے سامنے نیز متعدد اسپیچوں میں اپنے خاندان کی عورتوں کے لکھے پڑھے ہونے کا ذکر کر کے اس کی تردید کی تھی کہ مسلمان عورتیں جاہل ہوتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ سرسید کا تعلق معاشرے کے جس طبقہ سے تھا اس طبقہ کے فرد کی حیثیت

سے خواتین کے بارے میں ان کا رویہ جذبۂ تحسین سے مملو نظر آتا ہے۔ تاہم وہ عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مسائل کو یکسر فراموش نہیں کرتے بلکہ جو لوگ انھیں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں مستعد نظر آتے تھے وہ ان کی کوششوں کو فراخدلی سے سراہنے سے گریز نہیں کرتے۔ انگلستان کے سفر کے دوران جہاز پر ان کی ملاقات مس کارپنٹر سے ہوئی۔ یہ خاتون برسٹل کی رہنے والی تھیں جنھیں تعلیم نسواں سے گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنے دوست راجہ رام موہن رائے سے ہندوستانی عورت کی جہالت اور زبوں حالی کا ذکر سنا تھا چنانچہ عورتوں کی اصلاح اور تربیت کا جذبہ انھیں ہندوستان کھینچ لایا۔ مس کارپنٹر نے سرسید سے فرمائش کی کہ وہ ان کی نوٹ بک میں ہندوستانی عورت کی تعلیم و تربیت کے مسئلہ پر اظہار خیال کریں چنانچہ سرسید نے اس میں مندرجہ ذیل عبارت لکھی۔

"اس گروہ کی تعلیم جس کو خداوند تعالیٰ نے
مرد کے لیے بطور دوسرے ہاتھ کے بنایا ہے اور
جس کو نیک کاموں کے بخوبی انجام ہونے کے لیے
مرد کا مددگار کیا ہے۔ تعلیم و تربیت میں کوشش
کرنا، درحقیقت یہ مضمون اور اس پر کوشش
نہایت قدر کے لائق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ
نیک کام پر کوشش ہونی چاہیے گو وہ کسی طرح
ہو، نہایت اچھی ہے۔ کیوں کہ وہ کوشش اگر
درست بنیاد پر قائم ہوگی تو وہ خود کامیاب
ہوگی اور اگر اس میں کچھ غلطی ہے تو اس سے امید
ہے کہ اوروں کو اس نیک کام پر کوشش کرنے
کی تحریک ہوگی۔"

اس رائے سے واضح ہوتا ہے کہ سرسید مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا معین کار سمجھتے ہیں اور عورت

کی تعلیم و تربیت کی کوشش کو مستحسن قرار دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اُس مہم میں پیش آنے والی مشکلات کا بھی اندازہ لگاتے ہیں جن کو کامیابی سے سر کرنے کے لیے گو ابھی وقت درکار ہے تاہم جد و جہد جاری رکھنا انسانی فہم و فراست کا تقاضہ ہے کہ اس طرح نیکی اور ترقی کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔

انگلستان کے دوران قیام سرسید چند انگریز خواتین کے حسن و اخلاق اور کارکردگی سے بہت متاثر ہوئے۔ یہ خواتین اس لاجنگ کی لینڈ لیڈی، اس کی بہن اور دو خادمائیں تھیں جہاں سرسید بحیثیت پینگ گیسٹ مقیم تھے اور انھیں ان عورتوں کے طور طریق کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ تہذیب و شائستگی کے ان نمونوں کو وہ بڑی حیرت سے دیکھتے ہیں۔ لینڈ لیڈی مسز لڈسم اور بہن مس الن وسٹ انھیں عجیب و غریب صفات کی حامل نظر آتی ہیں۔ صاحب خانہ مسٹر لڈسم علمی کاموں میں مصروف رہتے ہیں انھیں آفس جانے اور علمی جلسوں میں شرکت کے علاوہ کسی چیز سے سروکار نہیں ہے۔ مسز لڈسم نے اپنے شوہر کو تمام گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد کر رکھا ہے۔ وہ ایسی تعلیم یافتہ، شائستہ اور نیک بی بی ہیں کہ زبان اس کی خوبیاں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ مسز لڈسم کی بہن الن وسٹ مطالعہ کی بلا کی شوقین ہے۔ حتیٰ کہ ایک بار بیماری کے عالم میں وہ سرسید سے کتاب پڑھنے کے لیے منگا بھیجی ہے۔ سرسید کے لیے یہ تجربہ ناقابل فراموش ہے کہ ایک عورت عالم بیماری میں کتب بینی سے دل بہلائے اور پھر مذہبی موضوع سے متعلق اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی اہلیت بھی رکھتی ہے۔ اس گھر میں دو خادمائیں بھی موجود ہیں جن کے نام این اسمتھ اور ایلزبتھ ماتھیوز ہیں۔ انگلستان کی یہ معمولی خادمائیں بھی وقت کی پابند اور فرض شناس ہیں۔ ان کے اندر خدمت کا جذبہ ہے۔ وہ وقت ضائع نہیں کرتیں اور ہر

[redacted]

خدمت خندہ پیشانی سے بجا لاتی ہیں۔ الیزبیتھ ما تھیوز قلیل تنخواہ کے باوجود اخبار "ایکو" خرید کر پڑھتی ہے اور کبھی "پنچ" میں عورتوں کے میسنر اور کسٹمز کی تعاد پر ایڈیٹر کے دلچسپ اشارے اور کنائے پڑھ کر لطف اندوز ہوتی ہے۔ انگلستان کی یہ چاروں خواتین اپنی لیاقت اور تہذیب و شائستگی سے سرسید کو متاثر کرتی ہیں جن کا حال وہ بڑی تفصیل اور ذوق و شوق سے اپنے دوست راجہ کشن داس کو خط میں تحریر کرتے ہیں اور بے ساختہ یہ کہنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں لکھنا پڑھنا نہیں جانتیں اور حلیہ تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو ایسا ہی تعجب ہوتا ہے جیسے ہمارے ملک میں اگر کوئی عورت برہنہ بازار میں گھومنے لگے تو سب حیرت زدہ ہو جائیں۔

انگلستان سے واپسی پر سرسید نے جوش و خروش اور آہنی اعتماد کے ساتھ قوم کے نوجوانوں کی زندگی کو باوقار بنانے کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز کیا انھیں جدید مغربی طرز کی تعلیم کی ضرورت کا احساس دلایا تاکہ وہ زندہ اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہو سکیں لیکن جہاں تک مسلمان عورت کی تعلیم کا سوال تھا تو انھوں مسز لڈسم اور ایلن وسٹ کے جاندار کرداروں کا مزید تذکرہ نہیں کیا۔ کیونکہ ان کے نزدیک ہندوستانی مسلمان عورت مذہب اور رسم و رواج کی عاید کردہ حدود میں رہ کر اپنی صلاحیتوں کو جلا دے سکتی ہے۔ مذہب اسلام نے اسے خاص حقوق عطا کیے ہیں اور جہاں اسے یہ سہولتیں میسر نہیں ہیں تو اس حق تلفی کو وہ مردوں کی جہالت سے تعبیر کرتے ہیں۔ رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں انھوں نے عورتوں کے حقوق کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرائی۔ ایک شمارے میں تہذیب کا جامع تصور پیش کرنے کے بعد اس کی جو تفصیل بیان کی ہے، اس میں آزادیٔ رائے، درستیٔ عقاید، مذہبی تعلیم اطفال وغیرہ کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کی اہمیت ان الفاظ میں باور کرائی ہے

"کچھ شبہ نہیں کہ قومی تہذیب و شائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے اور ان کو دست کاری سکھانے کے لیے کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔"

ایسے معاشرے میں جہاں قوم کے مردوں کو جدید تعلیم کے حصول پر ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے لیے ہزار جتن کرنے پڑ رہے تھے مسلمان عورتوں کے لیے پردے کی پابندی کے ساتھ دست کاری کا ہنر سیکھنے کا اقدام ایک موہوم لیکن مثبت اندازِ فکر کی نشان دہی کرتا ہے۔ مردوں کے لیے انگریزی تعلیم کا مقصد اعلیٰ ملازمتوں کے حصول سے وابستہ تھا لیکن عورت کے لیے ملازمت کا تصور تو خود ابھی یورپ میں بھی پیدا نہیں ہوا تھا ایسی صورت میں مسلمان عورتوں کے لیے جدید تعلیم حاصل کرنے کا سوال اٹھانا صدائے صحرا تھا۔ البتہ اس وقت تک سرسید کے ذہن میں یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ عام مسلمان عورتوں کی حالت وہ نہیں ہے جو ان کے اپنے گھرانے میں نظر آتی ہے۔ عورت کی مظلومیت، بیچارگی اور مصائب و آلام کی اصلی داستان وہ ہے جو بیشتر ہندوستانی گھرانوں میں دہرائی جاتی ہے۔ سرسید کمال خلوص و محبت سے عورتوں کے حقوق کی حمایت میں آواز بلند کرتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو فراخدلی سے جو حقوق عطا کیے ہیں وہ مردوں کو کسی صورت میں غصب نہیں کرنے چاہییں۔ تاہم طبقۂ نسواں کی عزت و احترام کے باوجود وہ مذہب اور معاشرے کی عائد کردہ پابندیوں کی پاسداری سرسید کو عزیز ہے۔ خواتین پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں وہ اپنا موقف واضح کرتے ہیں کہ وہ خواتین کی تعلیم سے بے پرواہ نہیں ہیں اور دل سے ان کی ترقی کے خواہاں ہیں۔ البتہ نئے طریقہ تعلیم کے بجائے وہ مسلمان خواتین کے لیے پرانے طریقہ تعلیم کی سفارش کرتے ہیں جن میں

محلہ کی باوقار خواتین اپنے محلہ اور کنبہ کی لڑکیوں کو سکھانے پڑھانے کے علاوہ اخلاق و عادات سنوارنے کی سعی کرتیں لیکن مردوں کی ناسمجھی سے یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں پھر سے شروع کیا جائے۔ گھریلو امور کی انجام دہی میں مہارت اور پرورش اولاد کا بہترین ڈھنگ سیکھنا عورت کی زندگی کا مقصد ہے۔ سرسید خواتین پنجاب سے کہتے ہیں۔

"تمہاری دادی نانیوں نے یہی طریقہ کتابوں کے ذریعہ حاصل کیا تھا۔ وہی کتابیں آج بھی مفید ہیں پس اس زمانے کی نامفید نامبارک کتابوں کی کیا ضرورت ہے"۔

مسلمان مردوں اور عورتوں کی تعلیمی منصوبہ بندی کے سلسلہ میں سرسید جدت اور روایت کے دو علیحدہ پلوں کو پاٹنے پر ذہنی طور پر تیار نہیں ہو سکے۔ وہ لڑکیوں کے لیے انگریزی زبان، سائنسی علوم اور جدید طرز فکر (جسے وہ خواتین پنجاب کے سامنے نیا علم، نئی زبان اور نئی چال سیکھنے سے تعبیر کرتے ہیں) کو اپنانا غیر ضروری خیال کرتے ہیں۔ سرسید کا یہ رویہ آج بھی غیر متوقع محسوس نہیں ہوتا۔ وہ حقیقت میں تھے جس معاشرے میں مردوں کے لیے جدید مغربی علوم کی تعلیم گناہ کبیرہ سے کم نہیں تھی، وہاں عورتوں کے لیے اس قسم کی کوشش کا سوال کہاں پیدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سرسید جب خواتین پنجاب سے مخاطب ہو کر مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان میں خلوص اور صداقت کی بو آتی ہے۔

جب وہ (قوم کے مرد) تعلیم یافتہ ہو جائیں گے تو تمہارے غصب شدہ حقوق تم کو مل جائیں گے۔ میں تم یقین دلاتا ہوں کہ اس وقت جو خدمت تمہاری کر رہا ہوں نہ صرف تمہارے لڑکوں کی ہے بلکہ لڑکیوں کی بھی ہے۔ اگر خدا نے چاہا تو اس سے دونوں فائدہ اٹھائیں گے اور لڑکے اور لڑکیاں دونوں علم کی روشنی سے روشن ضمیر ہوں گے"

تاریخی تناظر میں دیکھتے چلیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۷۵ء میں مسلم اینگلو اورنٹیل کالج کے قیام کے بعد رفتہ رفتہ مسلمان لڑکوں کے لیے جدید تعلیم جائز قرار پائی اور نئی زندگی کے ولولے نے افراد کو نئے زمانے اور ماحول سے ہم آہنگ ہونے پر آمادہ کیا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے حلقے نے تعلیم نسواں سے متعلق اپنی ذمہ داری... کی ۱۸۹۶ء میں خواجہ غلام الثقلین نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس... ایک رزولیوشن پیش کیا کہ اب ہمیں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف... چاہیے جس کی حمایت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں اور مولوی ممتاز علی نے کی۔ ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ بھی اس کوشش میں بڑی گرم جوشی کا ثبوت دے رہے تھے۔ انھوں نے جب کبھی سرسید سے اس مسئلہ میں بات کی تو انھوں نے جواب دیا کہ موجودہ طرز کے مدارس میں پڑھ کر لڑکیاں بداخلاق ہو جائیں گی اور ان کے رفیق ڈپٹی نذیر احمد نے بھی اپنے مخصوص انداز میں سرزنش کی کہ میاں! کیا تم لڑکیوں کے لیے مدرسہ قائم کرنا چاہتے ہو۔ انگریزی مدارس میں پڑھ کر ہرزگیاں ہو جائیں گی۔ سرسید اور ان کے دوست کے ان ہلکے پھلکے بے ضرر ریمارکس کو آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی و ویمنز کالج کے یوم بانیان کے موقع پر ہماری پرجوش مقررین اکثر دہرایا کرتی ہیں حالاں کہ غور سے دیکھیے تو ان جملوں میں عام اظہار خیال کے علاوہ کسی قسم کی شدید مخالفت اور معاندانہ ردعمل کا رنگ نہیں جھلکتا اور یہ بھی گویا اس دور کے نوجوانوں کے جوش عمل کو مہمیز دینی مقصود تھی۔ خود یہ بزرگ جس کام کو چند در چند وجوہ کی بنا پر پورا نہ کر سکے نئی نسل اگر چاہے تو اسے اپنی ذمہ داری پر پورا کر سکتی ہے۔

وقت کے ساتھ روایات کی قطع برید کر کے اسے جدت میں تبدیل کرتے ہیں۔ ۱۸۹۶ء میں سرسید کی حیات ہی میں محسن الملک کی تحریک سے کانفرنس کے ساتھ ایک شعبہ تعلیم نسواں قائم ہوا جس کے ذمہ داروں نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ تاہم سرسید

باقی صفحہ نمبر ۲ پر

سرور رئیس
شعبہ جیالوجی

جوہری پتھر

GEMSTONES

GEMSTONES (جوہری پتھر) انسان کی زندگی میں عظمت، عزت اور دولت کے اعتبار سے ہر دور میں اہم رہے ہیں۔ پرانے زمانے کے لوگ خوبصورت پتھروں کو جمع کرکے ان کو زیور کی طرح استعمال کرتے تھے، بعض پتھروں کو مذہبی نقطہ نگاہ سے اہمیت حاصل تھی اور بعض پتھر پراسرار طاقتوں کے مالک جانے جاتے تھے۔ آج بھی جوہری پتھروں کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

کسی بھی معدنی پتھر (Mineral) کو جوہری پتھر عام طور پر اس وقت کہتے ہیں جب وہ خوبصورت ہو، پائے دار ہو اور کم یاب ہو۔ بہت سے ایسے پتھر ہیں جن میں یہ تینوں خصوصیات ایک ساتھ نہیں ہوتیں مگر دوسری اور خصوصیات کی بنا پر ان کو جوہری پتھر کہا جاتا ہے۔ جیسے اوپل (OPAL) ہے۔ کسی بھی ایسے پتھر کو جس میں اوپر دی گئی تین خصوصیات موجود ہیں، اس کو جوہری پتھر (GEM STONE) کہتے ہیں اور جب ان ہی پتھر کو تراش کر اس پر پالش کر دی جاتی ہے تو اس کو جواہر (GEMS) کہتے ہیں۔

یوں تو دنیا میں MINERALS کی ۳ ہزار سے بھی زیادہ قسمیں ہیں۔ مگر ان میں صرف لگ بھگ ۲۰۰ طرح کے MINERALS کو جوہری پتھر (GEMSTONE) کا درجہ دیا گیا ہے۔ ان میں کچھ اہم جوہری پتھر مندرجہ ذیل ہیں۔

ہیرا (DIAMOND)، زمرد (EMERALD and BERYL)، لعل (RUBY)، یاقوت ازرق (SAPPHIRE)، اوپل (OPAL)، نیلم (AMETHYST)، یاقوت (GARNET)، جیڈ (JADE)، یشب سبز (PERIDOT)، سنگ مرمر (QUARTZ)، لاجورد (LAPIS LAZULI & LAZU-RITE)، پکھراج (TOPAZ)، سنگ زرگون (ZIRCON)، ترملین (TOURMALINE)، فیروزہ (TURQUOISE)، موتی (PEARL)، سنگ موسیٰ (JET)، عنبر (AMBER) وغیرہ وغیرہ۔

جب کوئی جوہری پتھر قدرتی حالت میں ملتا ہے تو عام آدمی کو اس میں کوئی خوبصورتی نظر نہیں آتی۔ مگر جب یہی پتھر تراش دیا جاتا ہے اور اس پر پالش کر دی جاتی ہے، تو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وہی پتھر

جس کو اس کی اصلی حالت میں دیکھا تھا۔

جوہری پتھر تراشنے والے کو GEMOLOGIST اور اس علم کو GEMOLOGY کہتے ہیں۔ ایک عام آدمی کے لیے کسی جوہری پتھر کو پہچاننا ممکن نہیں۔ اس کو پہچاننے کے لیے کافی تجربہ اور آلات کی مثلاً خاص طرح کی دوربین (MICROSCOPE)، ریفریکٹرومیٹر (REFRACTROMETER) وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ موجودہ دور میں کسی جوہری پتھر کو پہچاننے کا سب سے آسان اور قابلِ یقین طریقہ ایکسرے (X-RAY) کا طریقہ ہے۔

آج کل ہر چیز کی نقل بہ آسانی بنا لی جاتی ہے۔ اس لیے بازار میں کافی نقلی جوہری پتھروں کی بھرمار رہتی ہے۔ ان نقلی پتھروں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو ان کو پہچاننا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ اصلی اور نقلی جوہری پتھروں کی تفریق کرتے وقت اگر اس کی مندرجہ ذیل خصوصیات پر نگاہ رکھی جائے تو اصلی اور نقلی جوہری پتھروں میں تفریق کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔

(۱) بناوٹ کی لائنیں۔ (STRUCTURAL-LINES) : نقلی جوہری پتھروں میں عام طور سے خم دار (CURVED) بناوٹی لائنیں ہوتی ہیں۔ جبکہ قدرتی جوہری پتھروں میں اگر لائنیں یا دھاریاں موجود ہوں تو وہ ہمیشہ سیدھی یا پھر آڑی ترچھی ہوں گی خم دار کبھی نہیں ہوں گی۔

(۲) جوہری پتھروں میں گیس کے بلبلے ہوتے ہیں۔ یہ بلبلے نقلی جوہری پتھروں میں خم دار بناوٹی لائنوں کے متوازی ہوتے ہیں جب کہ قدرتی جوہری پتھروں میں یہ بغیر کسی خاص ترتیب کے اِدھر اُدھر بکھرے ہوتے ہیں

(۳) رنگ :- نقلی جوہری پتھر کا رنگ پورے پتھر میں بالکل یکساں ہوتا ہے جب کہ قدرتی جوہری پتھر کا رنگ پورے پتھر میں ایک طرح کا نہیں ہوتا۔ بلکہ پتھر کی ہر سمت اور ہر پہلو میں تھوڑی بہت تبدیلی رنگ میں ہمیشہ ہوتی ہے۔

(۴) اندرونی دراریں (INTERNAL CRACKS) نقلی جوہری پتھر کی بناوٹ کے دوران صحیح طور سے تمام عناصر کے نہ ملنے کی وجہ سے کبھی کبھی اس کے اندر کچھ دراریں پڑ جاتی ہیں جبکہ قدرتی جوہری پتھروں میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔

(۵) دھندلا پن (CLOUDINESS) نقلی جوہری پتھروں میں کبھی کبھی دھندلا پن سارہ جاتا ہے کیوں کہ اس کی بناوٹ کے دوران تمام عناصر پورے طور پر گھل مل نہیں پاتے جب کہ قدرتی جوہری پتھر بالکل صاف اور شفاف ہوتے ہیں۔

(۶) ایکسرے میں جانچ (X-RAY TEST) قدرتی جوہری پتھر میں ایکسرے بالکل آر پار ہو جاتی ہیں جبکہ نقلی پتھروں میں ایسا نہیں ہوتا

(۷) روشنی کی سمت کا تعین (ORIENTATION OF CUT STONES) قدرتی طور سے بنے ہوئے ہر جوہری پتھر میں روشنی کی سمت کی ایک خاص مناسبت اور تعین ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے تراشے جانے کے بعد پتھر میں بہت خوبصورت چمک ہوتی ہے۔ مگر نقلی پتھروں میں اتنی اچھی چمک اور رنگ نہیں ہوتے۔

یونانی، رومن اور سنسکرت ادب سے

یہ پتا لگتا ہے کہ پرانے زمانے سے ہی ہندوستان میں ہیرے سب سے زیادہ پائے جاتے تھے۔ مگر آج کل برازیل اور جنوبی افریقہ میں سب سے زیادہ ہیرے پائے جاتے ہیں سنسکرت کے مشہور عالم کوٹلیہ نے اپنی مشہور کتاب "ارتھ شاستر" (321-300 BC) میں اور وراہ مہر نے "برہت سمہیتا" میں کافی تفصیل سے ہندوستان میں ہیروں کی کان کنی کے بارے میں تذکرہ کیا ہے۔

بیرونی سیاحوں مثلاً مارکو پولو (۱۳ویں صدی) اور ٹاورنیر (۱۷ویں صدی) نے بھی اپنے سفر ناموں میں ہیروں کی کان کنی اور اس کی تجارت کا تذکرہ کیا ہے۔

"ارتھ شاستر" اور "برہت سمہیتا" میں ہیروں کی جن کانوں کے بارے میں لکھا ہے اس کے محل وقوع کے بارے میں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج بھی ان [illegible] علاقے ایسے ہیں جن سے ہیرے نکالے جا رہے ہیں۔

پرانے زمانے میں ہیروں کی کان کنی کی صنعت [illegible] شباب پر تھی اور صرف 'پنا' کی ہیرے کی کانوں [illegible] کو ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ کی رائلٹی ملتی تھی۔

ہیرا بہت کم ملتا ہے اور پھر یہ سب سے زیادہ پائیدار اور خوبصورت جواہر ہوتا ہے اس لیے جوہری پتھروں میں سب سے زیادہ اہمیت اسی کی ہے۔ ہندوستان میں پائے گئے چند مشہور ہیرے ہیں۔ جن میں سے کوہ نور وزن ۱۸۲ کیرٹ (ایک کیرٹ ۲۰۰ ملی گرام کے برابر ہے) "گریٹ مغل" ۲۸۰ کیرٹ۔ "نظام" ۲۷۷ کیرٹ" اور لوف" ۱۹۴ کیرٹ اور "پٹ" ۱۴۰ کیرٹ وغیرہ کے ہیں۔

ہندوستان میں "ہیرے" پنا اور ریوا (مدھیہ پردیش) کرنول، کوڈپا، بیلاری، گولکنڈہ (آندھرا پردیش) مرزا پور (اتر پردیش) وغیرہ میں بہت ملتے ہیں۔ لعل (RUBY) اور یاقوت ازرق (SAPPHIRE) - سب سے زیادہ سری لنکا اور برما میں اور ہندوستان میں یاقوت ازرق کے لیے پڈار (ضلع کشتوار جموں وکشمیر) سب سے زیادہ مشہور ہے۔

زمرد (EMERALD & BERYL) کے لیے کھاسی اور جینتیا پہاڑ (آسام) ہزاری باغ اور سنگھبم (بہار) ریوا (مدھیہ پردیش) اجمیر، میواڑ کشن گڑھ اور جودھ پور (راجستھان) وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ یاقوت (GARNET) کوڈرما (بہار) کشن گڑھ، جے پور، میواڑ (راجستھان) نیلور (آندھرا پردیش) وغیرہ میں ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ لگ بھگ تمام ہی جوہری پتھر ہندوستان میں تھوڑی بہت مقدار میں ہوتے ہیں۔

عشرت علی قریشی
ڈپٹی لائبریرین
مولانا آزاد لائبریری اے ایم یو

دوسری قسط

مولانا آزاد لائبریری

انگریزی: انگریزی مطبوعات کا ذخیرہ انیسویں اور بیسویں صدی کے سائنسی لٹریچر کے اعتبار سے کافی وقیع ہے۔ اس سائنسی ذخیرہ میں اعلیٰ معیار کی علمی سوسائیٹوں کی سائنسی مطبوعات اور سائنسی رسائل کے پورے شمارے شامل ہیں۔ تقریباً پورے کلکشن کا نصف حصہ سائنسی موضوعات بالخصوص کیمسٹری، طبعیات، جغرافیہ، ریاضی، علم الحیوانات علم النباتات وغیرہ کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ انگریزی زبان کا باقی ذخیرہ بھی غالب تحقیقی مواد پر مبنی ہے۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ پر کتابیں ریسرچ کے لیے بنیادی مآخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مسلمانانِ ہند کی سیاسی معاشی، اور ثقافتی زندگی پر تحقیق کے اعتبار سے بھی یہ ذخیرہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اسلام اور اسلامی علوم پر کتابیں اس لائبریری کا اہم ترین موضوع رہی ہیں۔ اور یہ ذخیرہ لائبریری کے ذخائر میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مرکز دراسات ایشائے غربی کے قیام کے بعد سے مغربی ایشیا پر کتابوں کا ایک بڑا کلکشن بن گیا ہے۔ اس ذخیرہ کی ایک اور خصوصیت سترھویں اور اٹھارویں صدی کے ادبی اور تحقیقی کارنامے، سفرنامے، سوانح، طب اور مشرقی علوم پر کتابیں ہیں۔ انگریزی ادب میں شیکسپیر پر کتابوں کا ذخیرہ کافی اہم ہے۔ ہندوستانی ادب پر کتابوں کا کلکشن بھی عمدہ ہے۔ مصوری پر ہر ملک اور ہر زمانے بالخصوص عہدِ وسطیٰ کی ایرانی اور مغل مصوری پر بڑی تعداد میں کتابیں ہیں۔ فن تعمیر پر بھی کتابوں کی کافی تعداد ہے جو ہر طرز کے فن تعمیر (قدیم ہندوستانی، ایرانی، مغل، اسلامی، برطانوی، ہسپانوی وغیرہ) سے قارئین کو روشناس کراتی ہیں۔ اسی طرح مختلف ممالک اور مختلف زمانوں کی سنگ تراشی اور نقاشی پر بھی کتابوں کا خاصا ذخیرہ ہے۔ فنون لطیفہ بالخصوص مصوری اور ہندوستانی آرٹ پر بڑا جامع ذخیرہ ہے۔

حوالہ جاتی کتب میں، قاموس، لغات، سالنامے، کتابیات اور دیگر حوالہ جاتی اہمیت کی کتابیں بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

اس ذخیرہ میں کچھ عطیات بھی شامل ہیں۔ ان میں ڈاکٹر ولی محمد، حامد علی، خواجہ عبدالمجید، ایجوکیشنل کانفرنس (آفتاب)، عثمانیہ، صابرہ زیدی تہذیب النساء اور ایٹہ کلکٹری کے ذخیروں کے عطیات قابلِ ذکر ہیں۔

سرکاری مطبوعات بھی جن میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں دونوں (بالخصوص حکومت یوپی) کی مطبوعات شامل ہیں، بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ان میں خصوصیت سے قابلِ ذکر فورٹ ولیم، انڈیا ہاؤس خط و کتابت

ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے مباحث کی روداد یں
پرانے گزیٹیر، مردم شماری کی رپورٹ، مرکزی حکومت اور
یوپی حکومت کے سالانہ بجٹ، مختلف سرکاری کمیشنوں اور
کمیٹیوں کی رپورٹ، حکومت ہند اور حکومت یوپی کے گزٹ،
آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا (۱۹۰۹-۱۰ء سے) پنج سالہ
منصوبے وغیرہ ہیں۔ امپیریل گزیٹیر (جو پہلی بار ۱۸۸۱ء میں
شائع ہوا تھا) کے تمام ایڈیشن موجود ہیں۔ آزاد ہندوستان
میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے جو نئے گزیٹیر چھاپے
ہیں، وہ سب اہتمام سے حاصل کئے گئے ہیں۔ سب سے پرانا
گزیٹیر ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقبوضات سے متعلق ہے جو لندن
سے ۱۸۵۴ء میں چھپا تھا۔ مردم شماری کی تمام رپورٹ
۱۸۷۲ء سے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ نیم سرکاری وغیر
سرکاری اداروں اور مطابع کی تمام اہم مطبوعات موجود
ہیں۔ مثلاً کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ
کی "ویلتھ آف انڈیا" اور جی اے گریرسن G. A.
Grierson کی لنگوسٹک سروے آف انڈیا۔

اقوام متحدہ اور دیگر اہم بین الاقوامی
اور علاقائی اداروں کی مطبوعات کی بھی ایک معتد بہ تعداد
موجود ہے۔ یہ تمام ذخیرہ تحقیق کے نقطۂ نظر سے بڑا
اہم ہے۔

انگریزی زبان کے علاوہ جرمن
فرانسیسی، روسی، ترکی، ہسپانوی، اطالوی اور عبرانی
زبانوں میں بھی کتابیں موجود ہیں۔ فرانسیسی میں شاہنامہ
فردوسی کا وہ نسخہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ جو ۱۸۳۸ء
میں پیرس سے چھپا تھا۔ علاوہ ازیں آثار الصنادید کا فارسی
ترجمہ از گارساں دتاسی (Garcin de Tassy)
مطبوعہ پیرس ۱۸۶۱ء بھی فرانسیسی ذخیرہ کی ایک نایاب
کتاب پر ہے۔

اس لائبریری میں شعبۂ اردو کو خصوصی
اہمیت حاصل ہے۔ اس کی حیثیت ایک مستقل اور جداگانہ
ریسرچ لائبریری کی ہو گئی ہے۔ یہاں طلبہ اپنی نصابی کتب
کے علاوہ دیگر معیاری کتب سے بھی استفادہ کرتے ہیں اور
تحقیقی کاموں میں اس چشمۂ علم سے سیراب ہوتے ہیں۔

اردو زبان میں کتابوں کا یہ ذخیرہ برصغیر
میں سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ اور اس لائبریری کا وہ قیمتی سرمایہ
ہے جو اسے دوسرے کتب خانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس
ذخیرہ کی مجموعی تعداد اس وقت تقریباً ایک لاکھ ہے۔ اردو
ادب اور تنقید، لسانیات، ہندوستانی تہذیب و ثقافت
تاریخ ہند، سیاست اور مذہب بالخصوص مذہب اسلام
اور اسلامی علوم پر یہ نادر و نایاب کتب کا ذخیرہ بے انتہا
تحقیقی افادیت کا حامل ہے۔

اس سیکشن کی سب سے نمایاں خصوصیت اس
کے اردو رسائل کا ذخیرہ ہے۔ جو ہندوستان کے کسی دوسرے
کتب خانے میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس میں بیسویں صدی
کے علاوہ انیسویں صدی کے بھی نادر و نایاب رسائل شامل
ہیں۔ ان میں سرسید احمد خاں کا اخبار سائنٹیفک سوسائٹی
(علی گڑھ، ۱۸۶۶ء)، تہذیب الاخلاق (علی گڑھ: ۱۸۷۰ء)
پنجاب ریویو (امرتسر ۱۸۷۹ء)، البنچ (بانکی پور ۱۸۸۵ء)
حسن (حیدرآباد: ۱۸۸۸ء)، گلدستۂ سخن (آگرہ:
۱۸۸۳ء)، گل رعنا (بھوپال: ۱۸۹۵ء)، اصلاح
(پٹنہ، ۱۸۹۷ء)، اور معارف (علی گڑھ: ۱۸۹۸ء)
خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ بیسویں صدی کے اہم
رسالوں میں مخزن (لاہور: ۱۹۰۱ء)، زمانہ (کانپور

۱۹۰۲ء)، اردوئے معلیٰ (علی گڑھ: ۱۹۰۳ء)، عصر جدید
لکھنؤ: ۱۹۰۳ء)، خاتون (علی گڑھ: ۱۹۰۴ء)، علی گڑھ
منتھلی (۱۹۰۳ء)، عصمت (دہلی: ۱۹۰۸ء)، الناظر۔
لکھنؤ: ۱۹۰۹ء)، معارف (اعظم گڑھ: ۱۹۱۶ء)، اردو
(اورنگ آباد: ۱۹۲۱ء)، ھمایوں (لاہور: ۱۹۲۲ء)،
عالمگیر (لاہور: ۱۹۲۱ء)، نگار (لکھنؤ: ۱۹۲۲ء)،
جامعہ (دہلی: ۱۹۲۳ء)، اورینٹل کالج میگزین (لاہور:
۱۹۲۵ء) کے مجلدات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سیکشن میں قدیم اردو مطبوعات کا ذخیرہ بھی کافی وسیع ہے۔ ان میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ، دہلی کالج اور سرسید احمد خاں کی سائنٹیفک سوسائٹی کی مطبوعات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ دارالترجمہ حیدر آباد کی مطبوعات کا بھی مکمل سیٹ موجود ہے۔ دہلی و اودھ کے شاہی مطابع کے شائع کردہ انیسویں صدی کی نادر مطبوعات کی خاصی تعداد بھی اس کلکشن کی اہم خصوصیت ہے۔ نول کشور پریس کی تقریباً تمام مطبوعات موجود ہیں۔ کمیاب اور نادر مطبوعات میں خصوصیت سے قابلِ ذکر "اخلاق ہندی" ترجمہ مفرح القلوب مصنفہ مفتی تاج الدین مترجمہ سید بہادر علی حسینی (مطبوعہ کلکتہ: ۱۸۰۰ء)، "آرائش محفل" مصنفہ شیر علی افسوس (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۸ء)، "بارہ ماسہ" مصنفہ کاظم علی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۱۲ء)، "خرد افروز" ترجمہ عیار دانش مصنفہ ابوالفضل مترجمہ حفیظ الدین (کلکتہ: ہندوستانی چھاپہ خانہ ۱۸۱۵ء)، "منتخبات ہندی" از جان شیکسپیر (لندن: ۱۸۲۵ء)، "انتخاب اخوان الصفا" مطبوعہ لندن ۱۸۲۹ء)، "جام جم" مصنفہ سرسید احمد خاں (آگرہ: ۱۸۴۰ء)، "دیوان ریختہ" مطبوعہ ۱۸۱۰ء)

"آثار الصنادید" مصنفہ سرسید احمد خاں (طبع اول مطبوعہ سید الاخبار دہلی ۱۸۴۷ء)، "آئین اکبری" مصححہ سرسید احمد خاں (مطبوعہ دہلی ۱۲۷۲ھ۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۵۲ء سرسید کا ذاتی نسخہ، اضافہ اور ترمیمیں خود ان کے قلم کی موجود ہیں)، "رسالہ در باب آلات پیمائش" از کنھیا لال (مطبوعہ ۱۸۵۷ء)، "گنج خوبی" مترجمہ میر امن دہلوی (کلکتہ ۱۸۴۲ء)، "یونان کے قدیم زمانہ کی تاریخ" مصنفہ رولن (اردو ترجمہ علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی۔ ۱۸۶۵ء)، "رسالہ علم انتظام مدن" مصنفہ ناسا ولیم سینیر (اردو ترجمہ علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی ۱۸۶۵ء)، "تاریخ ہندوستان" مصنفہ الفنسٹن (ترجمہ سائنٹیفک سوسائٹی۔ ۱۸۶۸ء)، "تاریخ ایران" مصنفہ میلکم (ترجمہ سائنٹیفک سوسائٹی۔ ۱۸۷۳ء)، "اصول علم حساب جزئیات وکلیات" مصنفہ آئی۔ ایل۔ بوشارلٹ (اردو ترجمہ۔ دہلی کالج ۱۸۴۵ء)، "اصول علم مثلث" مصنفہ صنو و بوشارلٹ ترجمہ ماسٹر رام چندر (دہلی کالج ۱۸۴۸ء)، "طوطا کہانی" ترجمہ طوطی نامہ از ضیاء الدین نخشبی مترجمہ حیدر بخش حیدری لندن، ۱۸۵۲ء)، "جامع الاخلاق" ترجمہ اخلاق جلالی، مترجمہ امانت اللہ (کلکتہ، احمدی پریس ۱۸۴۸ء)۔

اس کلکشن کی ایک اور اہم خصوصیت انیسویں اور بیسویں صدی کے شعراء کا کلام ہے۔ غالب پر تنقیدی کا ذخیرہ خاصا ضخیم ہے۔ علاوہ ازیں دیگر شعراء مثلاً میر، سودا، ذوق، حالی، مومن، انیس، آتش، ناسخ، میر حسن، دیا شنکر نسیم، داغ، امیر مینائی، فانی، حسرت، جگر وغیرہ پر بھی مستند لٹریچر موجود ہے۔

لائبریری کی اپنی خرید کردہ کتابوں کے علاوہ مشاہیر کے ذاتی کتب خانوں نے بھی اس سرمایہ

علمی میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اس وقت تک مجموعی طور پر ۴۴ مشاہیر کے ذخیرے ہم تک پہنچے ہیں ان میں مولانا احسن مارہروی (۲۴۴۰ کتب)، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ۲۰۴۴ کتب و رسائل)، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۹۴ کتب)، سر شاہ محمد سلیمان (۴۹۴ کتب)، راجہ محمد حسن حسینی آف اصغر آباد (۱۰۰ کتب و رسایل)، ضیاء الحسن جو پال ۹۰۰ کتب) خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے علاوہ اردو کے مشہور ادیب اور نقاد مولانا عبدالماجد دریا بادی کی اردو کتابوں کا مکمل ذخیرہ بھی حاصل کر لیا گیا ہے جس میں تقریباً ۳۰۰۰ کتابیں اور رسائل کے مجلدات شامل ہیں اس طرح اردو کتب و رسایل کے ذخیرہ کو ہر طرح سے ہمہ گیر اور ہمہ جہت بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

عربی :- عربی زبان میں کتابوں کی مجموعی تعداد اس وقت ۲۲،۲۲۵ ہے۔ یہ ذخیرہ اسلامی فلسفہ تصوف، قرآن و حدیث اور دیگر اسلامی علوم، سائنس، طب، ریاضی، عربی شاعری وغیرہ پر نادر و نایاب کتب اور تحقیقی مواد کا حامل ہے۔

انتہائی نایاب اور قدیم ترین مطبوعات میں خصوصیت سے قابلِ ذکر شیخ بوعلی سینا کی شہرۂ آفاق تصنیف "القانون فی الطب" (مطبوعہ روم ۱۵۹۳ء) ابن بطریق کی "نظم الجوہر" (مطبوعہ ۱۶۵۴ء)، عربی و لاطینی زبان میں "بائبل" (مطبوعہ روم ۱۶۷۱ء)، ابن طغری بردی کی "مورد اللطافۃ" (مطبوعہ کیمبرج ۱۷۹۲ء)، المسعودی کی "مروج الذہب"، ابن مسکویہ کی "تجارب الامم"، حاجی خلیفہ کی کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون" المقریزی کی نبذۃ العقود فی امور النقود" مطبوعہ جرمنی ۱۷۹۰ء Historia ORIENTALIS مع عربی ترجمہ

مطبوعہ ۱۲۶۰ء ہیں۔

فارسی : اِس کلکشن کی کل تعداد اِس وقت ۱۴،۴۴۲ ہے۔ یہ ذخیرہ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ بالخصوص عہدِ مغلیہ اور مختلف صوبوں یا علاقوں کی تاریخ پر بنیادی تحقیقی مواد کے اعتبار سے بڑا اہم ہے. فارسی ادب بالخصوص شاعری (ایرانی، ہندوستانی) تاریخِ اسلام اور اِسلامی علوم، ہندوستانی سائنس، ریاضی وغیرہ مضامین پر بھی یہ کلکشن کافی اہمیت کا حامل ہے۔ قدیم و نادر کتب میں "ہدایہ" مترجمہ غلام یحییٰ خاں (مطبوعہ ۱۸۰۷ء) "عروضِ سیفی" (مطبوعہ ۱۸۷۲ء) "دیوان صائب" (مطبوعہ ۱۸۵۳ء)، "انوارِ سہیلی" مصنفہ ملا حسین کاشفی (مطبوعہ ۱۸۱۶ء)، "مراۃ دولتِ عباسیہ" مصنفہ دولت رائے (مطبوعہ ۱۸۵۰ء) "ظفر نامہ" مصنفہ ہاتفی عبداللہ (مطبوعہ ۱۸۶۹ء) "ریاض الفردوس" مطبوعہ ۱۸۶۵ء)، "تحفۃ العراقین" مصنفہ خاقانی (مطبوعہ ۱۸۵۵ء)، "رقعاتِ بیدل" (مطبوعہ ۱۸۷۵ء) "ہفت ضابطہ" مصنفہ علی نقی خاں (مطبوعہ ۱۸۶۵ء)، اور "جلاء الاذہان فی علوم القرآن" مترجمہ معین الدین (مطبوعہ ۱۸۷۵ء) قابلِ ذکر ہیں۔ اِن کے علاوہ شاہنامۂ فردوسی کا وہ نسخہ بھی اہم ہے. جو مرحوم شاہ ایران کی ذاتی دلچسپی سے شائع ہوا تھا۔ یہ نسخہ لائبریری کو حکومتِ ایران نے چند سال قبل پیش کیا۔

سنسکرت :- عربی اور فارسی کے ساتھ سنسکرت کی تعلیم بھی اِس ادارہ میں سر سید کے زمانہ ہی سے رائج ہے۔ چنانچہ سنسکرت کی کتابوں کا ایک معتدبہ ذخیرہ بھی اس لائبریری کی ایک اہم خصوصیت ہے سنسکرت

ادب پر تقریباً تمام اہم کتابیں اس ذخیرہ میں شامل ہیں۔ نادر و نایاب کتب میں ''لیلاوتی'' مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۶ء (جو ریاضی اور پیمائش پر ایک رسالہ ہے)، سشنکر اچاریہ کی شرح کے ساتھ ''اپنیشد'' مطبوعہ کلکتہ ۱۸۷۳ء اور پن دو تم مطبوعہ ۱۹۲۶ء ہیں۔

ھندی : اِس کلکشن کی ابتدا دوسری زبانوں کے ذخیروں کے مقابلہ میں نسبتاً بعد میں ہوئی۔ تاہم یہ کلکشن بھی رفتہ رفتہ خاصا ضخیم ہوگیا ہے۔ ۵۵-۱۹۵۴ء میں اس کی ازسرِنو تنظیم ہوئی۔ تقریباً تمام اہم جدید مطبوعات موجود ہیں۔ علاوہ ازیں جتنی حوالہ جاتی کتب اب تک شائع ہوئی ہیں وہ سب بھی موجود ہیں۔ اردو کی کلاسیکی کتابیں اور شعراء کا کلام جو ہندی میں شائع ہوا ہے اُس کو بھی اہتمام سے حاصل کیا گیا ہے۔ ان میں دیوانِ غالب اور دیوانِ میر خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے آخذ کے ہندی تراجم بھی خصوصی توجہ سے حاصل کیے گئے ہیں۔ نادر و نایاب کتب اور انیسویں صدی کی مطبوعات بھی اس ذخیرہ میں شامل ہیں مثلاً ''سبھا شاچیندرودایہ'' مطبوعہ ۱۸۵۵ء، ''وشنو مہیا'' مطبوعہ ۱۸۷۵ء، ''سنہاسن بتیسی'' مطبوعہ ۱۸۷۶ء، ''شری رام گیتا'' مطبوعہ ۱۸۸۱ء اور رسانند وہی کی ''ہت کا پارم'' مطبوعہ ۱۸۸۳ء۔ ہر سال تقریباً ۲۰ ریسرچ اسکالر اس کلکشن سے استفادہ کرتے ہیں۔

دیگر ھندوستانی زبانیں : ہندی کے علاوہ تامل، تیلگو، ملایالم، بنگالی اور دوسری ہندوستانی زبانوں میں کتابیں موجود ہیں۔

ذخیرۂ سرسید : بانیِ درسگاہ کی جملہ تصانیف، انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور سرسیّد اور اُن کی تحریک پر جو کچھ دوسروں نے لکھا ہے، وہ سب ایک علیحدہ کمرہ میں ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ ذخیرہ علی گڑھ تحریک پر ریسرچ کے لیے ناگزیر ہے یہی وجہ ہے کہ سرسید پر تحقیق کرنے والے حضرات، جن میں مقامی اور بیرونی، دونوں شامل ہیں۔ اِس ذخیرہ سے استفادہ کرتے رہتے ہیں۔ علاوہ ازیں انیسویں صدی کے نصفِ آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، اقتصادی، مذہبی اور تعلیمی حالت پر تحقیق کے لیے بھی یہ ذخیرہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مسلمانانِ ہند کی اس دور کی تاریخ بڑی حد تک علی گڑھ تحریک کی تاریخ ہے۔ یہ دور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسیّد اور ان کی تحریک موضوعِ تحقیق بنے ہوئے ہیں اور اِس موضوع پر لٹریچر برابر بڑھ رہا ہے۔

سائنسی و علمی رسائل : لائبریری دو ہزار[2] اعلیٰ معیار کے علمی و سائنسی رسائل قیمتاً حاصل کرتی ہے اور تقریباً پانچ سو رسائل بطور عطیہ وصول ہوتے ہیں۔ رسائل کی خریداری پر اب قریب قریب ۱۰ لاکھ روپے سالانہ صرف ہوتے ہیں۔ علمی و سائنسی رسائل کے علاوہ لائبریری عام معلومات اور دلچسپی کے رسائل مثلاً نیو اسٹیٹسمین، آبزرور، سنڈے ریویو، ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ، ٹائم، نیوز ویک وغیرہ بھی خریدتی ہے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کے اہم اخبارات کی پوری فائلیں بھی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ جیسے اسٹیٹسمین، ہندوستان ٹائمز، الجمیعۃ وغیرہ۔ بلاشبہ رسائل کا یہ ذخیرہ تحقیق کے لیے بنیادی مواد فراہم کرتا ہے۔

تحقیقی مقالات : یونیورسٹی کی پی ایچ ڈی

ڈی ایس۔سی، ایم۔اے۔ اور ایم۔ایس سی کی ڈگریوں کے مقالات کا بھی ایک بڑا ذخیرہ اس لائبریری میں موجود ہے۔ یہ ذخیرہ یونیورسٹی میں نہ صرف تحقیق کی وسعت اور رجحانات کو ظاہر کرتا ہے۔ بلکہ مستقبل میں مزید تحقیق کے لیے بنیادیں بھی فراہم کرتا ہے۔ یونیورسٹی کو پیش کیے گئے سارے مقالات کو حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ ذخیرہ بڑی حد تک مکمل ہے۔ یونیورسٹی میں تحقیق کی ابتدا یونیورسٹی کے قیام کے بعد ہی سے ہوگئی تھی۔ لیکن اس ذخیرہ میں سب سے پرانا تحقیقی مقالہ ۱۹۲۹ء کا کیمسٹری پر ملتا ہے۔ سائنسی موضوعات پر مقالات دوسرے موضوعات کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں۔ تحقیق کی ابتدا بھی سائنس ہی کے شعبہ جات سے ہوئی۔ مقالات کی سب سے زیادہ تعداد علم الکیمیا پر ہے۔ اور اس کے بعد بالترتیب طبیعیات وعلم الحیوانات پر۔ سائنس کی فیکلٹی میں شعبہ جات جغرافیہ، ریاضی، علم النباتات اور علم الطبقات الارض بھی تحقیق کے میدان میں پیش پیش ہیں۔ ۱۹۶۰ء سے تحقیق کی سرعت رفتاری بڑی نمایاں ہے۔ سائنسی موضوعات پر بڑھتی ہوئی تحقیق کے ساتھ ساتھ اب انجینیرنگ، سوشل سائنس، آرٹس، کامرس، قانون، دینیات اور اسلامیات کے شعبہ جات میں بھی تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ آرٹس کی فیکلٹی میں ہندی، اردو اور فارسی ادب پر تحقیقی مقالات کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ سوشل سائنس میں تاریخ معاشیات، سیاسیات اور نفسیات کے شعبہ جات اس میدان میں تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ کامرس میں بھی تحقیق کی رفتار بڑی تیز ہوگئی ہے۔

ذخیرۂ علی گڑھ :- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق سرکاری وغیر سرکاری مطبوعات کو علیحدہ ترتیب دیا گیا ہے یہ ذخیرہ علی گڑھ کلکشن کہلاتا ہے۔ اس ذخیرہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ (۱۹۲۰ء) اور بعد کے جملہ ترمیمی اور ذیلی قوانین ([illegible])، پرانے یونیورسٹی کلینڈر، یونیورسٹی کورٹ، ایکزیکیٹو کونسل، اکیڈمک کونسل کی رودادیں، اکیڈمک اور ایکزیکیٹو آرڈیننس، سالانہ بجٹ، آڈٹ رپورٹ، مشاہیر کے خطبات، جلسۂ تقسیم اسناد، وائس چانسلر کی سالانہ رپورٹ، مختلف فیکلٹیوں، کالجوں اور شعبہ جات کے پراسپیکٹس اور سلیبس، یونیورسٹی سے متعلق تحقیقاتی کمیشنوں کی رپورٹ، حکومت اور والیانِ ریاست کو پیش کیے گئے میمورنڈم، سیمیناروں، کانفرنسوں اور دیگر علمی مجالس کے خطبات افتتاحیہ اور مذاکرات، مختلف شعبہ جات اور سوسائٹیوں کی علمی سرگرمیوں کے تذکرے، رہائشی ہالوں کے میگزین اور اسی طرح کی دوسری مطبوعات شامل ہیں۔

اس ذخیرہ کا استعمال بالعموم سرکاری وغیر سرکاری ضرورتوں کے لیے بطور حوالہ جاتی مواد ہوا ہے۔ لیکن یہ ذخیرہ یونیورسٹی کی تاریخ لکھنے کے لیے بھی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

(باقی آئندہ شمارے میں
ملاحظہ فرمائیے)

عبدالعلیم قدوائی (ایم اے)

چھوٹی صنعتیں اور مسلمان

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی واقتصادی پس ماندگی اور بدحالی پوری ملت کے لیے ایک سنگین اور اہم معاملہ ہے جس کے دور کرنے کی تدابیر پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیوں کہ جب تک ہماری معاشی حالت مضبوط اور مستحکم نہیں ہو جاتی ہمارے معاشرہ کی حالت سدھر نہیں سکتی اور نہ ہم اطمینان سے آزادانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ دورِ انگریزی میں ملازمتوں اور زمینداری کے سہارے ہمارا بھرم ایک حد تک بنا رہا۔ مگر آزادی کے بعد زمین داری کا خاتمہ ہوا اور ہوشربا اضافۂ آبادی نے ملازمتوں کا دائرہ محدود سے محدود تر کر دیا۔ تجارت کے لیے اچھے خاصے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس مسئلہ کو سلجھانے کی ایک موثر ترکیب یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ چھوٹی اور گھریلو صنعتیں قائم کریں اور اپنی کارکردگی سے قومی زندگی میں ایک اہم جگہ بنالیں۔ اس سلسلہ میں بڑی ہمت افزا بات یہ ہے کہ ملک کے مختلف حصوں میں مسلمان کاریگروں کی اکثریت ہے جو اپنے اپنے فن میں خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی ان صلاحیتوں سے پورا فائدہ ہی نہیں اٹھا سکتے اور اب بھی ان کی حیثیت معمولی کاریگر اور مزدور کی ہے۔ جب کہ انھیں یہ پورا موقع حاصل ہے کہ وہ اپنی صنعتیں خود قائم کرکے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرسکتے ہیں۔ اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار فراہم کرسکتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ چھوٹی اور گھریلو صنعتیں ہندوستان جیسے عظیم ملک کے لیے جہاں آبادی بہت بڑی ہے اور زیادہ تر دیہی علاقوں میں رہتی ہے، نہایت موزوں ہیں ان صنعتوں کو ترقی دینے اور پھیلانے کا کام سرکاری سطح پر ۱۹۵۶ء میں شروع کیا گیا اور گزشتہ ۲۵-۲۶ برسوں کے تجربہ نے ظاہر کیا کہ اس پروگرام سے ملک کو بے انتہا فائدہ پہنچا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج ہمارے ملک کی کل صنعتی پیداوار کا ۴۹٪ حصہ ان ہی صنعتوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور یہ صنعتیں ملک بھر کے صنعتی مزدوروں کے ۵۰ فیصد یعنی نصف حصہ کو کام فراہم کر رہی ہیں۔ ہندوستان جو پہلے پسماندہ ملک کہا جاتا تھا، آج ترقی پذیر ملکوں کے سربراہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں کی چھوٹی صنعتیں دنیا میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں اور ہندوستانی مصنوعات ایشیا، افریقہ اور یورپ کی منڈیوں میں خاصی مقبول ہو چکی ہیں۔ تکنیکی اعتبار سے بھی یہ صنعتیں اب بہت ترقی کرچکی ہیں۔

ہمارے ملک کی صنعتوں کو تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ بڑے پیمانہ کی اور بھاری صنعتیں جو سرکاری اور نجی دونوں دائروں میں چل رہی ہیں [illegible] [illegible]

وافر سرمایہ، بڑی بڑی مشینیں، اعلیٰ تکنیکی صلاحیت، بجلی اور مزدوروں کی بڑی تعداد وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کارخانے نہ ہر جگہ کھولے جا سکتے ہیں اور نہ ہر ایک ان کو قائم کر سکتا ہے۔ پبلک دائرہ میں وہ صنعتیں رکھی گئی ہیں جو اپنی افادیت اور ملک کے دفاع و استحکام کے لیے نہایت ضروری ہوں مثلاً فوجی ساز و سامان بنانے کے کارخانے، ٹیلی فون، فولاد ریلوے انجن اور ڈبے، جان بچانے والی دوائیں، کھاد، معیاری مشینیں اور کل پرزے، ڈبل روٹی، سمندری اور ہوائی جہاز بنانے کے کارخانے وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ شکر، کپڑا، انجینئرنگ، کیمیکل، بجلی کا سامان، چمڑا اور دیگر صنعتوں کے بڑے کارخانے ملک کے مختلف حصّوں میں نجی سرمایہ داروں کے زیرِ انتظام چل رہے ہیں۔ اس طرح کی صنعتیں اور کارخانے چلانے کے لیے حکومت ہند کی وزارتِ صنعت سے لائسنس لینا ہوتا ہے اور مختلف قسم کے سرکاری ضوابط اور قواعد کی پابندی کرنا ہوتی ہے۔

۲ چھوٹے پیمانہ کی اور گھریلو صنعتیں

اس شعبہ میں ایسے تمام کارخانے آجاتے ہیں جن میں مشینوں پر سرمایہ ۲۰ لاکھ روپے سے زیادہ نہ لگا ہو اور بعض مخصوص حالتوں میں یہ حد ۲۵ لاکھ روپیہ تک بھی ہو سکتی ہے۔ اب یہ شعبہ بہت وسیع ہو گیا ہے۔ اس میں مختلف قسم کی چھوٹی صنعتیں مثلاً انجینئرنگ کیمیکل، چمڑا، شیشہ، مٹی، لکڑی، بجلی اور گاؤں کی ضرورتوں کو پورا کرنے والی چیزیں مثلاً آٹا چکّی، دھان صاف کرنے کی چکّی، تیل گھانی، بڑھئی گیری، لوہار گیری، کمہاری وغیرہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس شعبہ میں کسی بھی کام شروع کرنے کے لیے نہ تو کسی لائسنس کی ضرورت ہے اور نہ لمبے چوڑے ضابطوں کی خانہ پُری کرنا پڑتی ہے۔

۳۔ ہتھ کرگھے، بجلی سے چلنے والے کرگھے، دستکاریاں وغیرہ، اس شعبہ میں زیادہ تر پشتینی کاریگر ہیں جو ملک کے مختلف حصّوں میں آباد ہیں اور عرصۂ دراز سے اپنے پیشوں میں لگے ہوئے ہیں۔

زیرِ نظر مضمون میں (۲) اور (۳) کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی جا رہی ہے۔ کیوں کہ ان ہی کے ذریعہ زیادہ لوگوں کو روزگار مل سکتا ہے اور ملّت کو اجتماعی اور انفرادی دونوں طریقوں سے نفع پہنچ سکتا ہے۔

جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے ان صنعتوں کو شروع کرنے کے لیے کسی قسم کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے البتہ کوئی کام شروع کرنے سے پہلے حسبِ ذیل باتوں پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیے۔

(۱) آپ کونسی صنعت شروع کرنا چاہتے ہیں؟ اس کام کے شروع کرنے میں آپ کو کون کون سی سہولتیں حاصل ہیں اور کس قسم کی دشواریاں۔ یہ صنعت کاری کا سب سے پہلا مرحلہ ہے اور بڑی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ اسی پر آپ کی کامیابی منحصر ہے

بنیادی چیز یہ دیکھنا چاہیے کہ کس چیز میں آپ کو دلچسپی یا تجربہ ہے۔ اس کو بنانے کے لیے کن چیزوں کی ضرورت ہے اور آپ اپنے ذرائع سے کہاں تک مہیا کر سکتے ہیں۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ آپ یہ کام کہاں شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اصل چیز آپ کی سہولت ہے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی سوچنا ضروری ہے کہ بجلی، خام مال، سرکاری مدد، مصنوعات کے بیچنے میں کہاں زیادہ سہولت مل سکتی ہے۔ صنعت کا انتخاب واقعی دشوار کام ہے لیکن اس کے لیے اب آپ کو خاصی سہولتیں بھی دستیاب ہیں۔ کچھ سرکاری اور نیم سرکاری ادارے اس کام میں آپ کو مدد دے سکتے ہیں۔ مگر بہتر یہی

ہوگا کہ آپ کسی سرکاری ادارے سے مدد لیں۔

(۱) ہر ضلع میں ایک ضلع صنعتی مرکز قائم ہے (District Industries Centre) یہ صوبہ کی حکومت کا دفتر ہے اور ہر قسم کی صنعتوں کے قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آپ وہاں جاکر یا خط کے ذریعہ جنرل منیجر سے بات چیت کرکے اپنی صنعت کا انتخاب کرسکتے ہیں اور ضروری لٹریچر سے بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔

(۲) اگر آپ کسی صوبہ کے صدر مقام یا دہلی میں رہتے ہیں تو آپ اسمال انڈسٹریز سروسز انسٹی ٹیوٹ حکومت ہند کی وزارتِ صنعت کے دفتر سے رجوع کرسکتے ہیں۔ دہلی میں یہ انسٹی ٹیوٹ اوکھلا انڈسٹریل [illegible] میں واقع ہے۔ ان دفتروں کو آپ بھی خط لکھ سکتے ہیں اور ان سے ان صنعتوں کی فہرست حاصل کرسکتے ہیں جن کی ہمت افزائی آج کل حکومت اور مالی اداروں کی طرف سے کی جارہی ہے۔ دہلی میں نرمان بھون میں وزارت صنعت کا بڑا دفتر ڈیولپمنٹ کمشنر اسمال انڈسٹریز کا ہے۔ وہاں سے بھی آپ کو ہر قسم کی ضروری معلومات اور اطلاعات مل سکتی ہیں۔ خواہ آپ خود تشریف لے جائیں یا ان کو خط لکھ کر دریافت کریں۔

(۳) حکومت ہند نے اپنی نئی صنعتی پالیسی کے بموجب ۸۰۷ چیزوں کی فہرست مرتب کی ہے۔ جن کو چھوٹے پیمانہ ہی پر شروع کیا جاسکتا ہے۔ یعنی ان چیزوں کو بنانے کے لیے حکومت کسی بڑے کارخانے یا صنعت کو لائسنس نہیں دے گی۔ اس طرح اگر آپ ان چیزوں میں سے کسی چیز کے تیار کرنے کا کارخانہ لگائیں گے تو آپ کو بڑے کارخانوں سے مقابلہ نہ کرنا پڑے گا۔

اس طرح کی ایک اور فہرست ۴۴۱ اشیاء کی مرتب کی گئی ہے جن کو حکومت ہند اور اس کے متعلقہ دفتر چھوٹے صنعت کاروں ہی سے خریدیں گے۔ بشرطیکہ مصنوعات معیاری ہوں۔

یہ دونوں فہرستیں آپ کو صنعت کے انتخاب میں بہت مدد دیں گی۔ اس کے علاوہ ہر ضلع میں صنعتی مرکزوں نے صنعتی جائزہ لے کر ایک فہرست مرتب کی ہے جو اس ضلع کے وسائل، مانگ اور صلاحیتوں پر مبنی ہیں۔ یہ فہرست آپ کو متعلقہ ضلع مرکز سے مل سکتی ہے اور آپ کو صنعت کے انتخاب میں خاص مدد دے سکتی ہے۔ کیوں کہ آپ کو اس سے پتہ چل جائے گا کہ کسی خاص ضلع یا مقام پر کس قسم کا خام مال اور کاریگر دستیاب ہیں اور وہاں کن چیزوں کی مانگ ہے۔

صنعت کے انتخاب کے ساتھ ہی ساتھ یہ طے کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کو کس جگہ قائم کیا جائے۔ ظاہر ہے اپنی سہولت سب سے مقدم ہوتی ہے۔ مگر ساتھ میں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس خاص جگہ بجلی، ذرائع آمد و رفت کی سہولتیں کس حد تک دستیاب ہیں۔ پھر آج کل حکومت ہند نے پسماندہ علاقوں کی صنعتی ترقی کے لیے خاص مراعات اور سہولتیں دینے کا اعلان کیا ہے۔ یعنی ان جگہوں پر اگر آپ صنعت قائم کریں گے تو کل سرمایہ کا [illegible] حکومت بطور مدد آپ کو دے گی۔ اس طرح انکم ٹیکس، سیلس ٹیکس میں چھوٹ آسان قسطوں پر مشینیں اور کم شرح سود پر قرض مہیا کیا جاتا ہے۔ ملک میں ۲۴۷ پسماندہ اضلاع منتخب کیے گئے ہیں۔ کچھ اضلاع کے متعین علاقے پسماندہ قرار دیے گئے ہیں شمالی مشرقی منطقہ اور پہاڑی علاقوں میں اور زیادہ سہولتیں دی گئی ہیں۔

اپنے فیصلہ سے قبل ان مراعات اور سہولتوں پر بھی نظر ڈال لینا چاہیے۔ یہ چھوٹے کارخانے افراد، ساجھے داری کی فرمیں کو آپریٹیو سوسائٹی، پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنیوں کے زیر اہتمام

باقی صفحہ نمبر پر۔

فرخ جلالی
شعبہ تاریخ

سرسید ۔ تاریخ کی ڈائری میں

۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء پیدائش [سر] سیّد احمد خاں ۔ مقام دہلی ۔

۱۸۳۴ء نانا فریدالدین کا انتقال

۱۸۳۸ء والد سید متقی کا انتقال

۱۸۳۹ء نائب منشی آگرہ

۱۸۴۰ء پہلی فارسی کتاب جام جم

۱۸۴۲ء دربار دہلی سے جواد الدولہ سیّد احمد خاں عارف جنگ کا خطاب

۱۸۴۷ء آثار الصنادید شایع

۱۸۵۵ء صدر امین بجنور

۱۸۵۸ء والدہ کا میرٹھ میں انتقال

۱۸۵۹ء مراد آباد میں ایک مدرسہ کا قیام

۱۸۶۳ء اشاعت التماس بخدمت ساکنان ہندوستان درباب ترقی تعلیم ہند ۔

۱۸۶۴ء غازی پور میں مدرسہ کا قیام

۱۸۶۴ء ساینٹیفک سوسائٹی کا آغاز

۱۸۶۶ء اخبار ساینٹیفک سوسایٹی کا اجرا

۱۸۶۹ء انگلستان کا سفر ۔ سرسید نے ورناکیولر یونیورسٹی کی تجویز پارلیمنٹ کو بھیجی ۔

۱۸۷۰ء	اینتھم کلب لندن کی ممبر شپ
۱۸۷۰ء	میں خطبات احمدیہ کی اشاعت
,, ,,	انگریزی میں ہندوستان کی تعلیم پر ایک مختصر کتاب
,, ,,	تہذیب الاخلاق کا اجرا
۱۸۷۲ء	محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے اجرا کے لیے بنارس میں اجلاس
۱۸۷۵ء	۲۴ مئی کو محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا افتتاح
۱۸۷۶ء	پر پنشن بنارس سے۔
۸ اور ۹ جنوری ۱۸۷۷ء	کو لارڈ لٹن کی آمد کالج اور لائبریری کا آغاز
۱۸۷۸ء	وائسرائے کی کونسل کی ممبر شپ
۱۸۸۱ء	B.A. بی اے کی تعلیم
۱۸۸۴ء	پنجاب کا سفر
۱۸۸۶ء	محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس
۱۸۸۸ء	انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کا آغاز
۱۸۸۹ء	بورڈ آف ٹرسٹیز کا قیام
۱۸۹۴ء	ایم اے او کالج میگزین کا الگ اجرا
۱۸۹۵ء	کالج میں غبن
۱۸۹۸	۲۷ مارچ کو علی گڑھ میں انتقال

یونیورسٹی کے شب و روز

گاندھی جینتی

سالہائے گزشتہ کی مانند امسال بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۲/ اکتوبر کو مہاتما گاندھی کا یوم پیدائش بڑے جوش و خروش سے منایا گیا۔

صبح طلبہ اور اساتذہ کا ایک جلسہ ہوا جس کی صدارت وائس چانسلر جناب سید حامد نے کی۔ جلسے میں مقررین نے مہاتما گاندھی کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور ان کی عظیم شخصیت کے اہم پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالی۔

جناب سید حامد نے اپنے صدارتی خطبہ میں مہاتما گاندھی کے خصوصی اوصاف بیان فرماتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی سے ایک بہت بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ ہمیں ہر حال میں صبر و تحمل اور ہوش سے کام لے کر اپنے جذبات پر قابو رکھنا لازم ہے۔

انھوں نے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ جذبات سے مغلوب ہو جانا خودکشی کے مترادف ہے۔

قومی ترانے پر جلسے کا بحسن و خوبی اختتام ہوا

مولانا آزاد لائبریری میں نمائش

گاندھی جینتی کے موقع پر مولانا آزاد لائبریری میں امسال کتابوں، تصویروں اور اہم دستاویزات کی نمائش کا اہتمام کیا گیا جو چھ روز تک کھلی رہی۔ اس دوران یونیورسٹی کے طلبا اور اساتذہ کے علاوہ شہر کے لوگوں نے کثیر تعداد میں لائبریری آکر یہ نمائش دیکھی۔

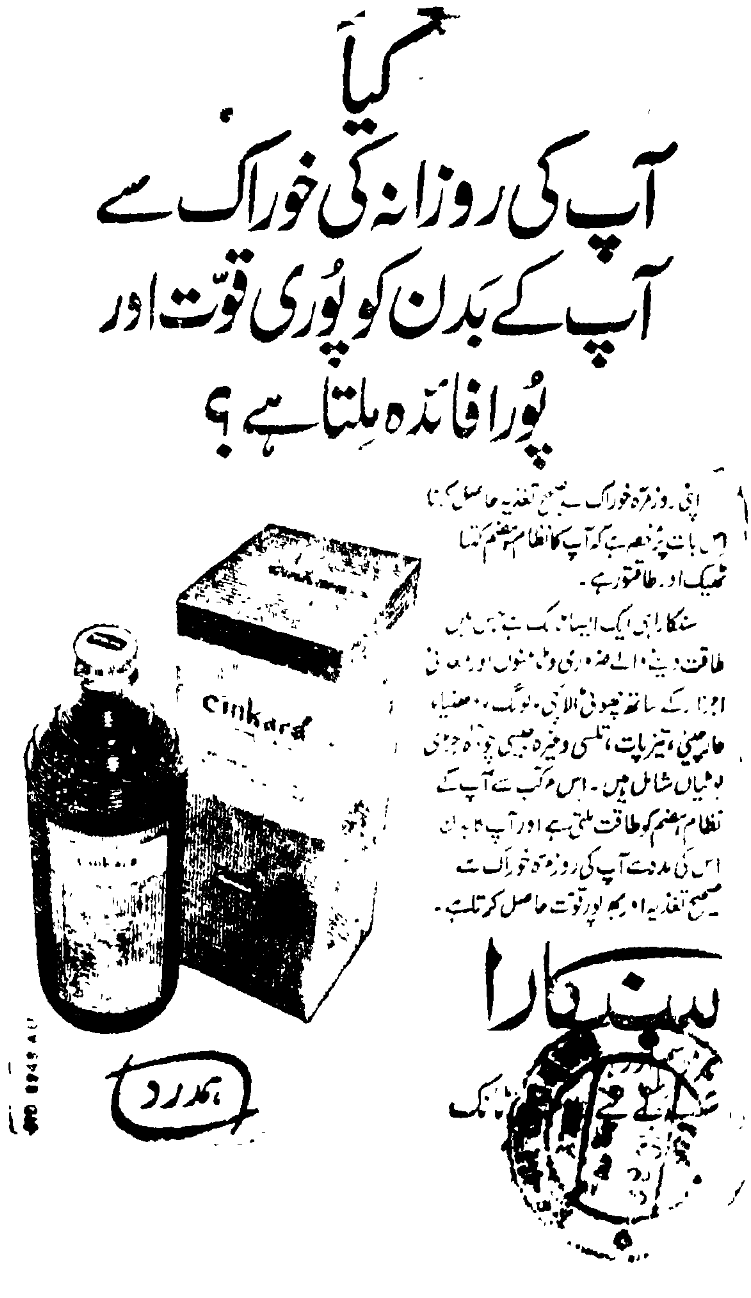
مہاتما گاندھی کے چند خطوط جو انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائز اور اسٹوڈنٹس یونین کے سکریٹری کے نام لکھے تھے، سبھی حضرات نے بڑی دلچسپی سے دیکھے۔

مہاتما گاندھی کے ہاتھ کا لکھا ہوا اردو میں ایک خط سب ہی کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔

ڈاکٹر سلامت اللہ خاں صاحب کا انتقال پُر ملال

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی شعبہ انگریزی کے ریڈر ڈاکٹر سلامت اللہ خاں صاحب کے

باقی صفحہ نمبر ۲۱ پر


کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوّت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟
اپنی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظام ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔
سنکارا ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزا کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اس مرکب سے آپ کے نظام ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور قوت حاصل کرتا ہے۔
cinkara
سنکارا
ہمدرد

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱ — یکم نومبر ۱۹۸۲ء — شمارہ ۱۹

جو تائید اسلام کی میں نے اپنی دانست میں اختیار کی ہے وہ اس وجہ سے نہیں کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور خواہ نخواہ مجھ کو اسلام کی تائید کرنی چاہیے۔ میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا جو شخص جس مذہب میں پیدا ہوا ہے خاموشی سے اس میں چلے جانا دوسری بات ہے اور اس کی تائید پر مستعد رہنا دوسری بات ہے پچھلی بات اس شخص کو زیبا نہیں ہے جس نے پورا یقین اس امر پر خود نہ کر لیا ہو۔ میں نے خالی الذہن ہو کر اسلام پر بہت کچھ غور کیا ہے اور نہایت غور و فکر کے بعد میرے دل میں اس بات کا یقین ہوا ہے کہ دنیا میں کوئی مذہب سچا ہے تو وہ اسلام ہی ہے اور میں اس دلی یقین پر اس کی تائید کرتا ہوں نہ اس وجہ سے کہ میں مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان ہوں۔

سید احمد

ہری پتلیوں والا عفریت	سید حامد
ڈینگو	امین الدین بلگرامی
اصول صحت اور حضور اکرمؐ کی تعلیمات	سید کمال الدین حسینی
ہماری موجودہ تعلیم! ایک لمحۂ فکر	ہادی نقشبندی
مولانا آزاد لائبریری	عشرت علی قریشی
ملا بحرالعلوم فرنگی محلی	اقبال انصاری
مسلم یونیورسٹی کے شب و روز	

فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ ۲۰ روپے

بیرون ہند سے

ایک پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیل زر و خط وکتابت کا پتہ

تہذیب الاخلاق۔ صفدر منزل۔ تار بنگلہ

اے ایم یو علی گڑھ یوپی۔ 202001

تہذیب الاخلاق

جلد نمبر ۱   یکم نومبر ۱۹۸۲ء   شمارہ نمبر ۱۹

مدیر :- سید حامد
وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

مدیر مسئول :- قاضی معز الدین احمد

سید حامد

ہری پُتلیوں والا عفریت

تہذیب الاخلاق کے پہلے شمارہ میں "ہمارے مسائل" کے عنوان سے وہ معایب گنائے گئے تھے جو ہندوستانی مسلمانوں کے گلے کا ہار اور ان کی راہ کا روڑا بن گئے ہیں۔ ان میں سرِفہرست حسد ہے۔ انگریزی میں نہ جانے کیوں اسے Green Eyed Monster کہتے ہیں۔ میں نے اس کا ترجمہ "ہری پتلیوں والا عفریت" کیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ Monster اور عفریت میں باہم کوئی تعلق نہیں مجھے یقین ہے قارئین اس سے بہتر ترجمہ کریں گے اور ترجمہ کے علاوہ اصل کی وجہ تسمیہ پر بھی غور فرمائیں گے۔

حسد کی حیثیت ساری برائیوں میں منفرد ہے۔ دوسری کسی اخلاقی برائی کو لے لیجیے اس میں بظاہر آپ کی منفعت کا کوئی پہلو، خواہ کتنا دور از کار اور پُرفریب کیوں نہ ہو، ضرور نکل آئے گا جو اس کو اپنی طرف کھینچے گا۔ اس طرح اسے یک گونہ جواز مل جائے گا۔

حرص یا طمع یا (Greed) یا ہوس یا لالچ کو لے لیجیے جس شخص کو یہ جذبہ لاحق ہوتا ہے وہ کسی چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے، خواہ وہ دولت ہو، خواہ اقتدار، خواہ جاہ و ثروت خواہ خدم و حشم خواہ زمین و مکان۔ زن، زر، زمین کی طمع سے کم لوگ اپنا دامن بچا سکے ہیں اور یہ طمع اکثر فتنہ و فساد اختلاف و نفاق کا باعث بنی ہے۔ وہ چیز اسے ملے یا نہ ملے لیکن جذبہ کا جواز یہ ہے کہ انسان کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی خواہش اور کوشش اعتدال سے تجاوز کر جائے اور اس کی شدت اسے سلامت روی اور سکون سے محروم کر دے یا وہ کوئی چیز اس مقدار میں چاہے جس کو وہ استعمال نہ کر سکے اور اس کی طمع دوسروں کی محرومی کا سبب بن جائے یا وہ کوئی ایسی چیز چاہے جس پر اس کو کوئی حق نہیں پہنچتا ہو یا وہ کسی ایسی چیز پر للچائے جو اس کے لیے مضر اور تباہ کن ہو۔ طمع بہرحال سکون اور بسا اوقات راست روی سے محروم کر دیتی ہے۔

اخلاقی معایب میں غصہ اکثر پشیمانی کی طرف لے جاتا ہے۔ غصہ کی بارش اتر جاتی ہے تو غصہ کرنے والے کو اپنے دونوں طرف افسردگی اور اضمحلال کی ریت بچھی ہوئی نظر آتی ہے۔ "آخر مجھے کیا ہو گیا تھا کہ اپنے آپے میں نہ رہا۔ جو کچھ منہ میں آیا بک دیا۔ نہ جانے کتنوں کا دل دکھا ہو گا۔" غصہ انسان کو بے قابو کر دیتا ہے۔ اسے خود پر اختیار نہیں رہتا۔ غصہ میں دوسروں کو جراحت پہونچانے کی نیت بالکل نہیں ہوتی، لیکن پہنچ جاتی ہے۔ اس اخلاقی عیب میں خود غرضی شامل نہیں۔ بھیانک نتائج سے قطع نظر غصہ اخلاقی معایب میں نسبتاً کم سنگین ہے۔ یہ جس طرح خود غرضی سے محفوظ ہے اور اس میں ایذا رسانی کی نیت بھی نہیں ہوتی جیسا کہ [illegible]

کا ضامن ہے اس کے تقاضوں کو رد کرنا سیلاب پر بند باندھنا ہے لیکن اس کو بے مہار چھوڑنے کے معنی ہیں انسانیت اور تہذیب دونوں کو موت کے گھاٹ اُتار دینا۔ زر، زن، زمین کی آشوب پرور تثلیث میں اس جذبہ کا روئے سخن زن کی طرف ہے۔ لیکن جب فریق مرد اور زن ہوں تو زن کو ہی موجبِ الزام کیوں قرار دیجیے۔ قلم یا مو قلم ابھی تک مردوں کے ہاتھ میں تھا، شبیہ جس طرح چاہا کھینچ دی۔ ظاہر ہے کہ عورت ٹوٹے میں رہی اور فساد اسی سے منسوب کیا گیا، حالانکہ قصور زیادہ مرد کا ہے۔ اب عورت کے ہاتھ میں بھی برش آگیا ہے اور خامہ بھی۔ اب جو تصویر بنے گی وہ حقیقت سے قریب تر ہو گی۔ بہر کیف جنسی خواہش جسے اہل نظر نے ہوس کا نام دیا ہے دراصل بُری شے نہیں، حدود سے تجاوز کرنے کے بعد بُری ہو جاتی ہے اور اس کی بدولت انسان اسفل سافلین کی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔

بغض اور کینہ سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور فتنہ و فساد کی نئی نئی راہیں نکلتی ہیں اس کی شروعات غبار اور کدورت سے ہوتی ہے۔ شاعر نے کہا تھا:

کر دیجیے معاف، یہ پاکیزہ صاف دل
ہے کس لیے غبار کو مہماں کیے ہوئے

غبار کی تہ پر تہ جمتی چلی جائے تو وہ کدورت کی راہ سے کینہ، بغض اور عداوت تک پہنچ جاتی ہے۔ کینہ انسان کو بلندی سے پستی کی طرف لے جاتا ہے، نگاہ کا انداز بگڑ جاتا ہے، کینہ جس کے خلاف ہے اس میں کینہ پرور کو کوئی بات اچھی نظر نہیں آتی۔ اس کی خوبیاں برائیوں میں بدل جاتی ہیں۔ طرزِ فکر مسخ ہو جاتا ہے۔ لیکن کینہ خواہ کتنا ہی غارتگر کیوں نہ ہو بے سبب نہیں ہوتا کوئی سبب واقعی یا خیالی ضرور ہوتا ہے جو غبار بن کر دل کے آئینہ کو مکدر کر دیتا ہے اور کدورت کو عداوت بننے دیر نہیں لگتی۔

بخل کے شکنجہ سے خدا بچائے۔ اس کی بہن حرص برابر اس کا ساتھ دیتی ہے اس کا دستور ہے کہ جو کچھ نظر آئے، جہاں تک ہاتھ پہنچے سب کچھ سمیٹ لو اور کسی دوسرے کو اس کی ہوا بھی نہ لگنے دو۔ کنجوس جو کچھ کماتا ہے یا بٹورتا ہے اس کا فائدہ خدا کی مخلوق تک پہنچنا تو درکنار خود اس تک کبھی نہیں پہنچتا۔ وہ خزانہ پہ سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ بخل اور تنگ نظری میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بخیل آدمی کسی کی تعریف بھی نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ممتحن ہے تو اچھے نمبر دیتے ہوئے اس کی جان پر بن جاتی ہے۔ اس کے سامنے کسی کی تعریف کی جائے تو اس کی جبیں پر شکن آ جاتی ہے اور شگفتن نہ بھی آئے تو تیور صاف بتا دیتے ہیں کہ تعریف اسے ذرا بھی نہیں بھائی۔ بخل سے شخصیت ممی کی طرح سکڑ جاتی ہے، بے جان ہو جاتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ولولہ، ذوق، حوصلہ، امنگ، آرزو سب کمھلا جاتے ہیں۔

گھمنڈ کا شمار کلیدی عیوب میں ہے۔ انسان کی، اس ذرۂ ذلیل کی، بساط ہی کیا ہے جس پر اتراتا پھرے وسیع کائنات میں زمین خود ایک ذرہ سے زیادہ نہیں پھر اس میں انسان جیسے ایک [illegible] نہیں اینٹھتا اور اکڑتا ہوا دکھائی دے۔ یہ [illegible] مضحکہ خیز ہی نہیں عبرتناک بھی۔ پھر گھمنڈ ایک [illegible] ہے جو کسی کو [illegible] انسان بھلے بُرے، دوست، دشمن میں فرق نہیں کر سکتا اور [illegible] دشمن دونوں کو اہانت آمیز برتاؤ [illegible] گھمنڈی انسان اس مرغ کی طرح ہے جو [illegible] سینہ تان کر، گردن اُٹھا کر ساری دنیا کو [illegible] چیلنج [illegible]

بانگ دیتا ہے۔ اس سے غافل کرتی اس کی گھات میں ہے اور اس کی اکڑی ہوئی گردن کے لیے دانت تیز کر رہی ہے۔ گھمنڈ سے کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے عداوتوں اور خود فریبیوں کے۔

ایک اور عیب ہے بے حسی، بے تعلقی، بے پروائی۔ یہاں ایک شعر یاد آگیا جو بیت بازی کے ایام میں اکثر کام آتا تھا۔

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

ہمدردی اور دردمندی کے لیے تو انسان پیدا کیا گیا اور وہ اسی سے کنارہ کش ہو جائے۔

گر از نیستی دیگری شد ہلاک
مرا ہست بط را ز طوفاں چہ باک

اگر کوئی دوسرا اس لیے مر گیا کہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا تو کیا ہوا، میرے پاس تو ہے، بطخ کو کیا ڈر، بے حسی کو جذبہ کیوں کہیے۔ یہ تو ایک منفی کیفیت ہے جسے "جلد باقی افلاس" کہنا اولیٰ۔ بے حس آدمی میں کوئی جان نہیں ہوتی کوئی دم خم نہیں ہوتا۔ وہ گوبر گنیش یا مٹی کے مادھو کی طرح زمین پر بوجھ بنا بیٹھا رہتا ہے۔ سوئیاں چبھو دیجیے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں۔ لیکن گنیش کو اس ہاتھی سے کوئی نسبت نہیں جسے نومبر میں ہونے والے ایشیائی کھیلوں کا نشان بنایا گیا ہے اور جسے اپّو کا سامعہ نواز نام اور باصرہ فواز شکل دی گئی ہے۔ اپّو کی چشم تنگ میں آسمان کی تجلیاں اور زمین کی ساری شرارتیں بھری ہوئی ہیں ایسا جان پڑتا ہے کہ اس نے ابھی ابھی کوئی شرارت کر کے دم لیا ہے یا کوئی نئی شرارت سوجھی ہے۔

بہرحال بے حسی، بے تعلقی، بے پروائی، عیب ضرور ہے لیکن بے ضرر۔ یہی عیب جب خود غرضی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے تو طرح طرح سے غضب ڈھاتا ہے دوسروں کو روندتا ہوا چلا جاتا ہے اور مڑ کر بھی نہیں دیکھتا لیکن خود غرضی بھی کسی مقصد کے تحت ہوتی ہے خواہ وہ کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو۔

ریاکاری کا مرض بہت عام ہے۔ اس کا روگی گیہوں دکھاتا ہے اور جو بیچتا ہے۔ اس کے دل میں زہر اور زبان پر امرت ہوتا ہے۔ جو کچھ اس میں ہے اسے چھپاتا ہے اور جو کچھ نہیں ہے اس کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے افکار و اقوال میں تضاد کا رشتہ ہوتا ہے۔ ریاکار کے کردار کا گھناؤنا پن جلد یا بدیر ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ ریاکاری ایک مقصد کے تحت ہوتی ہے۔ اپنی شبیہ کو سجا کر پیش کرنا اور اپنی پاکبازی اور راست روی اور خدا ترسی اور انسان دوستی کے ڈنکے بجانا اور ممکن ہو تو اس طرح شہرت، عزت اور اقتدار حاصل کرنا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دور نے ریاکاری کو قبولِ عام کی خلعت دے دی ہے اور ہمارے زمانے کا یہ سب سے خطرناک وصف ہے جسے اہلِ سیاست بالخصوص فن کارانہ انداز سے برتتے ہیں۔ ہمارے عہد کے نوجوانوں میں بغاوت، سرکشی اور اقدار فراموشی اور تشکیک اور استہزا اور نظم شکنی کا رشتہ سب بزرگوں کی کھوکھلی ریاکاری کے ساتھ جوڑتے ہیں۔ ریاکار سمجھتا ہے کہ وہ دنیا کو دھوکا دے رہا ہے، دیتا خود کو ہے۔ ریاکاری فریب کی ہی ایک شکل ہے۔ فریب کا بھانڈا چوراہے پر پھوٹتا ہے یا زنداں میں۔ ریاکاری، مکر و فریب، سب دروغ کے گھرانے کے افراد ہیں جھوٹ کی سرزمین میں یہ پیدا ہوتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ سچ کی "سموم" کے ایک جھونکے سے مرجھا جاتے ہیں۔

اخلاقی برائیوں میں پہلے اور خود

کو بڑھاوا دینے کی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ دو اخلاقی برائیاں کسی میں جمع ہوجائیں تو یہ جوڑ کا نہیں ضرب کا عمل ہوتا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اس قدر شہ ملتی ہے کہ ان کا اجتماعی اثر ان کے مجموعہ سے کہیں آگے نکل جاتا ہے

مذکورہ عیوب میں سے سوائے غصہ اور گھمنڈ کے، کوئی بے مقصد نہیں۔ ان میں کوئی نہ کوئی پہلو، خیالی، عارضی یا ذاتی منفعت کا نکل آتا ہے۔ غصہ اور گھمنڈ کے پیچھے ایذارسانی کی نیت نہیں ہوتی۔ غصہ اچانک آتا ہے سیلاب کی طرح اور ہوش و حواس کو بہالے جاتا ہے۔ گھمنڈ میں انسان اپنی خوبیوں سے متاثر ہوکر غبارے کی طرح پھولنے لگتا ہے۔ اس سے دوسروں کو تکلیف پہونچ جاتی ہے۔ لیکن گھمنڈ اپنے حامل سے ایذارسانی کا مطالبہ کبھی نہیں کرتا۔ تنہا حسد ایک ایسا عیب ہے جس کی سرے سے کوئی وجہ جواز نہیں جس سے حسد کرنے والے کو کسی فائدہ کے پہونچنے کا احتمال تک نہیں۔ اور جو خود کو ہمہ وقت جلاتا ہے اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتا ہے۔ یہ عجیب حالت ہے یہ ایک انوکھی بیماری ہے کہ انسان کو اچھائیاں بری لگنے لگیں دوسروں کی خوشیاں اس کے لیے غم بن کر آئیں، ہمسایہ کی کامیابی اور خوش حالی اسے جلاکر خاک کر دے۔ یہ کیسا اوندھا آئینہ ہے جس میں ہر تصویر الٹی نظر آتی ہے — دوسروں کی مصیبت اور تکلیف سے حاسد خوش ہوتا ہے۔ ان کی شکست اور رسوائی پر بغلیں بجاتا ہے بات یہیں تک رہتی تو بھی ہم صبر کر لیتے لیکن حسد کرنے والا دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھتا ہے تو نچلا نہیں بیٹھتا۔ انھیں ٹانگ پکڑ کر کھینچتا ہے، گرا دیتا ہے۔ خود جل بھن کر کباب ہوجاتا تو اچھا تھا، اس کے خبث نفس سے ہم نفسوں کو نجات ملتی لیکن جو آگ اس کے دل میں سلگتی ہے، بھڑکتی ہے، اس کی منزل مقصود دوسروں کے گھر ہوتے ہیں جب تک وہ نہ جل جائیں اس کے کلیجہ میں ٹھنڈک نہیں پڑتی۔ آپ ہر شخص کو رام کر سکتے ہیں سوائے حاسد کے۔

توانم آنکہ نیازارم اندرون کسی
حسود را چہ کنم کو زخود برنج دراست

[میں یہ تو کر سکتا ہوں کہ کسی کا دل نہ دکھاؤں
لیکن حاسد کو کیا کروں کہ وہ خواہ مخواہ خود بخود
رنجیدہ ہے]

حاسد سدا خود سوزی میں مبتلا رہتا ہے اور جہاں سوزی کے لیے مستعد۔ اسے پھول کانٹا نظر آتا ہے اور اگر در اصل کانٹے سامنے آئیں تو اس کے دل کا چمن لہلہا اٹھتا ہے

بنالیا ہے نگاہ حسود کو معیار
وہ پھول پھول نہیں ہے جو خار ہو نہ سکا

اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہوگی کہ انسان بلا وجہ بنی نوع انسان کا دشمن بن جائے اور انکی خوشی اسے ایک آنکھ نہ بھائے اور ان کی تکلیفوں پر وہ مسکرائے۔ اب اس قوم کی بدنصیبی پر قیاس کیجیے جس کے بیشتر افراد اس روگ میں مبتلا ہوں ہندوستانی مسلمان (میں ملک کی حدود کو چھوڑنا نہیں چاہتا) من حیث القوم حسد کی زلف گرہ گیر کے اسیر رہے ہیں۔ ان کے زوال اور ادبار کا ناٹک اگر کبھی منچ پر کھیلا گیا تو اس میں حسد کا کردار سب سے اہم ہوگا۔ بات لمبی ہوگئی ورنہ بتایا جاتا کہ حسد نے کس کس عنوان اور کس کس بھیس میں ہماری جڑوں کو کھودا ہے۔ حسد نفاق اور انتشار اور پراگندگی کو جنم دیتا ہے۔ حسد کو اغیار کا پھلنا پھولنا گوارا ہوتا ہے لیکن اپنوں میں سے اگر کوئی ترقی کر گیا یا خوشحال ہوگیا تو حاسد کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ اپنوں میں سب سے پہلے قریبی اعزہ اور ہمسائے آتے ہیں۔ قرب

کے دائرے وسیع ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی مسلمان ترقی کرتا، یا امتیاز، یا خوشحالی یا شہرت حاصل کرتا ہوا نظر آئے تو مسلمان اس میں کیڑے ڈالنے، اور عیب ڈھونڈنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کوئی تنظیم زیادہ عرصے تک ڈھنگ سے کام نہیں کر پاتی۔ کوئی ادارہ ٹھیک سے نہیں چل پاتا۔ جہاں کسی ادارے یا انجمن نے کامیابی حاصل کی اس کے سربراہوں پر حسد کے زہریلے دہانے کھول دیے جاتے ہیں اور ان غریبوں کو عافیت صرف کنارہ کشی اور روپوشی میں نظر آتی ہے ہمارے ایک بڑے محترم بزرگ نے اس دور میں مسلمانوں کی پسماندگی اور زبوں حالی کی ایک وجہ یہ بتائی کہ "ان میں اچھے اداروں کو بنانے اور چلانے کی صلاحیت کا فقدان ہے۔ اس کی بڑی وجہ حسد ہے جو ہمارا قومی وصف بن گیا ہے۔ ہمارا شعار ہے خود سلگنا اور دوسروں کو جلانا۔ حسد کی اس جہاں سوزی کے آگے نہ قاید ٹھہر پاتے ہیں نہ ادارہ، نہ انجمن

اگر طبیعت میں حسد ہو تو اسے یکلخت خارج تو نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے کم اور اس کی آنچ کو دھیما ضرور کر سکتے ہیں۔ جہاں تک خود سلگنے اور جلنے بھننے کا تعلق ہے عقل کو بروئے کار لایا جائے اور سوچا جائے کہ خود کو سلگانے اور تباہ کرنے سے ہمیں کیا مل جائے گا۔ عقل سمجھائے گی کہ اگر ہمسایہ کے چمن میں پھول کھل رہے ہیں تو ہمارے دل میں کانٹا کیوں چبھ رہا ہے۔ اگر پھولوں کو دیکھ کر ہم حظ اندوز نہیں ہو سکتے تو ان کی طرف سے نظر کیوں نہیں ہٹا لیتے۔ اس طرح طبیعت مکدر ہونے سے بچ جائے گی۔ جہاں تک خود سلگنے کے بعد دوسروں کو جلانے کا سوال ہے وہاں ضمیر کو بروئے کار لانا پڑے گا۔ اپنوں کو تباہ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے وہ زندگی میں کامیاب ہوں گے انسانی پیشرفت میں معاونت کا شرف حاصل کریں گے تو ساری قوم کی عزت بڑھے گی۔ ہمیں تو اس پر فخر کرنا چاہیے خوش ہونا چاہیے اور کسی ایسے شخص کو نقصان پہنچانا جس نے ہمیں کوئی تکلیف نہ دی ہو ہمارا حق نہ چھینا ہو، صریحاً ناانصافی نہیں تو کیا ہے۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ ہم اپنے سفلی جذبات کو جڑ سے اکھاڑ نہیں سکتے لیکن ان کو سفلی سے علوی میں بدل سکتے ہیں۔ ادنیٰ کو اعلیٰ بنا سکتے ہیں۔ حسد کے جذبہ کو ہم ارتفاع کے ذریعہ رشک کے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں۔ تاکہ جب ہم دوسروں کو ترقی کے زینہ پر چڑھتا دیکھیں تو انھیں ٹانگ پکڑ کر کھینچنے کے بجائے ہمارے دل میں یہ صحت مند جذبہ پیدا ہو کہ ہم بھی اس زینہ پر چڑھیں اور کچھ اور تیزی کے ساتھ۔ مثال کی ضرورت ہو تو وہ بھی دور نہیں۔ کچھ عرصہ ہوا میں جنوبی ہند کے دورے پر گیا تھا۔ یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ جنوبی ہند کے مسلمانوں میں اس وقت سب سے زیادہ جوش و خروش تعمیری اور تعلیمی کاموں کے لیے حیدرآباد میں پایا جاتا ہے۔ نئی نئی انجمنیں وجود میں آ رہی ہیں۔ کوئی انجینئرنگ کالج قائم کر رہی ہے کوئی بیت المال کوئی پولی ٹکنیک اور کوئی میڈیکل کالج قائم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ میں وہاں ایک محفل میں اپنے ان تاثرات کا پرستائش اظہار کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے میرے کان میں کہا کہ "یہ کارگزاری حسد اور رقابت کی دین ہے" جس نے رشک اور مسابقت کا روپ دھارا ہے۔ "تخریب کو تعمیر بنتے دیر نہیں لگتی۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ مسائل پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے اور گرم جذبات کو تباہی کے بجائے آبادکاری پر لگایا جائے۔ سہری پتلیوں والے عفریت کو شیشہ میں اتارا جا سکتا ہے۔ اسے قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ اس سے جہاں سوزی کے بجائے چمن بندی کا کام لے سکتے ہیں یہ موکل کیا نہیں کر سکتا۔ شرط ہے اس کو قابو میں رکھنا اور سیدھی راہ پر ڈالنا۔

تہذیب الاخلاق
ڈاکٹر امین الدین بلگرامی
ہیلتھ آفیسر
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈینگو - DENGUE

ڈینگو بخار یا ہڈی توڑ بخار — (Break bone fever) آج کل ہندوستان خاص طور پر دہلی میں وبائی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہ ہڈی توڑ بخار اس وجہ سے کہلاتا ہے کہ اس میں پیٹھ اور جوڑوں میں بہت سخت درد ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اس سے پہلے بھی یہ وبائی شکل اختیار کر چکا ہے۔ گوالیار، لکھنؤ دہلی، کانپور ستمبر اور اکتوبر ۱۹۷۰ء میں اس کی زد میں آچکے ہیں۔ یہ بخار ایک خاص مچھر نام Aedes Aegypti کے ذریعہ پھیلتا ہے۔ یہ مچھر صاف پانی میں رہتا ہے اور دن کے وقت کاٹتا ہے۔ مچھر جب بیمار آدمی کو کاٹتا ہے تو تین دن کے اندر مچھر کے جسم میں بیماری کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں پھر گیارہ دن کے بعد مچھر اس قابل ہوتا ہے کہ وہ بیماری دوسرے آدمی تک پہنچائے۔

یہ بیماری زیادہ تر برزیل، فیجی، سیریا اور افریقہ کے ملکوں کی ہے۔ اس کے لیے گرم اور مرطوب آب و ہوا کی ضرورت ہے

اس کا Incubation period (یعنی وہ وقفہ جس میں بیماری کے جراثیم بدن کے اندر پہنچنے تک اور بیماری کی علامت ظاہر ہونے تک) پانچ سے دس دن تک ہوتا ہے۔

علامات: یہ بخار ایک دم سے سردی لگ کر شروع ہوتا ہے۔ سر اور آنکھوں میں ہلکا درد ہوتا ہے مگر پیٹھ اور جوڑوں میں شدید درد ہوتا ہے جو مریض کو توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ بخار تیزی سے بڑھتا ہے۔ کبھی بدن پہ دانے (Rash) ابھر آتے ہیں جو کہ عام طور سے ہتھیلی اور ہاتھ کی پشت پر سے شروع ہو کر بازو پیٹھ اور پیر تک پہنچ جاتے ہیں۔ یہ بیماری زیادہ لمبی نہیں چلتی ہے اور ایک ہفتہ یا دس دن میں آدمی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ مہلک (Fatal) نہیں ہوتی ہے۔

احتیاط۔

۱- گھروں میں عام طور سے نلوں کی ٹونٹیوں سے پانی ٹپکتا رہتا ہے۔ ان کو فوراً ٹھیک کروانا چاہیے

۲- اکثر گھروں- لان- باغ اور نیچی جگہوں پر پانی بھرا رہتا ہے جس میں کہ مچھر پرورش پاتا ہے اسی وجہ سے ان جگہوں پر پانی نہ جمع ہونے دیا جائے

۳- گھروں اور آس پاس ایسی چیزیں جن میں پانی بھر سکتا ہے مثلاً ڈالڈا کے ٹن، بوتلیں، بالٹیاں وغیرہ نہ رکھیں۔

۴- گھروں کی ٹنکیوں پر یا ٹنکیاں کھلا نہ رکھیں۔

۵ کولرس یا گملوں میں پانی مستقل
بھرا نہ رہنے دیں۔ بلکہ ہر ہفتہ ان کا پانی پھینک کر اور
خشک کر کے دوسرا پانی بھریں۔

۶ Panicky نہ ہوں
یہ بیماری مہلک نہیں ہے اور خود بخود سات دن کے
اندر ختم ہو جاتی ہے۔

مریض کو بیماری کے پہلے تین
دن کے اندر مچھر دانی میں رکھنا چاہیے۔ جو تیمار دار اس
کے پاس رہیں وہ ہاتھوں اور چہرے پر مچھر بھگانے
والی دوا (Repellent) مثلاً
Odomos استعمال کریں۔

علاج

اگر بخار ۱۰۲ تک ہو تو سر پر
ٹھنڈے پانی کی پٹی رکھیں۔ درد کے لیے کوئی ہلکی دوا
مثلاً ڈسپرین کا استعمال کریں۔

اگر بخار ۱۰۳ یا اس سے زیادہ
ہے تو کروسن گولی اور ساتھ میں وٹامن سی، کھانے
میں کوئی پرہیز نہیں۔ مگر آرام کی سخت ضرورت ہے۔ اس
بیماری میں .... (Antibiotic) کی ضرورت نہیں
پڑتی ہے۔ اگر آپ لینا چاہتے ہیں تو ضرور لیجیے، کیونکہ
Antibiotic لینے سے ایک week میں
بخار جائے گا اور اگر آپ نہیں لیں گے تو ایک ہفتہ میں۔

بقیہ مضمون ملا بحر العلوم فرنگی محلی

متعلقہ صفحہ ۲۹

نہیں ہیں چنانچہ ماتریدی حنفی ہونے کے باوجود الارکان الاربعہ
اور بعض دیگر تصانیف میں کئی مقامات پر ماتریدی احناف
کے مسلک سے اختلاف بھی کیا ہے اور اپنے قول کی تائید
میں دلائل پیش کیے ہیں۔ درسیات کی شروح وحواشی
کے علاوہ اصول حدیث، علم کلام، تصوف اور عقاید
وغیرہ پر بھی ان کی علیحدہ تصانیف موجود ہیں، اور جس
موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے
اور جو حقائق و دقائق آپ کی تالیفات میں ملتے ہیں،
دیگر مصنفین کے یہاں کم نظر آتے ہیں۔ پھر بڑی خوبی
یہ ہے کہ اُن کی تصانیف میں ان کے مذہبی خیالات کا
عکس صاف نظر آتا ہے اور پڑھنے والے کو محسوس ہوتا
ہے کہ مولانا جس مسئلہ کو بھی اٹھاتے ہیں اس کے مالہٗ
وما علیہ سے کما حقہٗ واقف ہوتے ہیں اور جو کچھ بھی
لکھتے ہیں، پوری ثقت وثوق اور یقین کامل کے ساتھ
لکھتے ہیں۔

جملہ خط وکتابت
و
ترسیل زر کے لیے
مندرجہ ذیل پتہ لکھیں
مدیر مسئول۔
تہذیب الاخلاق
صفدر منزل۔ تار بنگلہ۔
اے ایم یو۔
علی گڑھ یو پی 202002

سید محمد کمال الدین حسین
صدر شعبۂ طب وجراحت
اے ایم یو۔

اصولِ صحت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات

سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ آنحضرت نہ صرف ایک طبیبِ روحانی تھے بلکہ ایک طبیب جسمانی بھی تھے۔ آنحضرت صلعم نے جس طرح روح کی اصلاح و تدبیر کی ہدایات سے بنی نوع انسان کو سرفراز فرمایا، اسی طرح جسم کی اصلاح و درستی کے لیے بھی رشد و ہدایات سے نوازا۔ کتب احادیث میں آپ کی اکثر احادیث ایسی موجود ہیں کہ جن کا تعلق علم طب سے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینِ مقدس اسلام سرآمدِ ادیان ہے اور اس دین میں انسان کی اصلاح کے لیے ہر قسم کی تعلیمات موجود ہیں۔ علم طب جس کا تعلق بدنِ انسان کی حفظ صحت اور علاج الامراض سے ہے اس کی روح بھی اسلام میں موجود ہے۔ قرآن مجید کا دعویٰ ہے

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک اور احادیث دونوں علوم قرآنی خصوصاً طب قرآنی کی آئینہ رہیں۔ احادیثِ نبوی کا مطالعہ اگر بغور کیا جائے تو طب کے ہر شعبے سے متعلق احادیث موجود ہیں۔

ان احادیث سے بھی قرآن مجید کی طبی آیات کی مزید تشریح ہوتی ہے۔ اگر ان جملہ احادیث کو طب کے مختلف شعبوں کی صورت میں مرتب و مدوّن کیا جائے تو یہ کتاب طبِ اسلامی کی بنیادی کتاب ہوگی۔ اس سلسلہ میں بعض مصنفین نے کوشش کی ہے اور متعدد کتابیں طب اسلامی پر قرآنی آیات و احادیث پر مشتمل لکھی گئی ہیں۔ لیکن کوئی جامع کتاب ابتک سامنے نہیں آئی۔ چند کتابیں جو احقر کی نظر سے گزری ہیں، حسب ذیل ہیں۔

(۱) طب نبوی　(۲) طب النبی
(۳) طب الصادقؑ　(۴) طب الرضاؑ
(۵) طب الائمہ　(۶) طب معصومین
(۷) قرآن پاک اور غذائے انسانی
(۸) تحریم الخمر فی الاسلام
(۹) موائد القرب فی آداب الاکل والشرب

مذکورہ کتب کے علاوہ کتاب حقائق العلاج اور قرابادین کبیر میں بھی حضرت رسول خدا صلعم اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی احادیث طب کے مختلف موضوعات کے ذیل میں ترتیب دی گئی ہیں۔

احقر نے علم تشریح سے متعلق آیات و ...

آحادیث کو ایک رسالہ میں بعنوان "تشریح جعفری" جدید انداز
پر مرتب کیا ہے جو امامیہ مشن پاکستان سے شائع ہوا ہے

علم طب کے دو بڑے شعبے ہیں۔ پہلا شعبہ علم حفظ صحت سے اور دوسرا شعبہ علم العلاج سے متعلق ہے ان دونوں شعبوں پر آنحضرت صلعم کی واضح احادیث موجود ہیں۔ پیش نظر مقالہ میں اس کے عنوان کی رعایت سے اصولِ صحت سے متعلق آنحضرت صلعم کی تعلیمات اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

صفائی و پاکیزگی جسم و لباس

حضرت رسول خدا صلعم نے جسم و لباس کی صفائی و طہارت کے متعلق قرآنی تعلیمات کے بموجب اسلامی بہت متقدسہ اور احادیث کے ذریعہ جو تعلیم دی ہے، اور احادیث جو الگ الگ اعضائے جسمانی کی صفائی اور جسم و لباس کی صفائی سے متعلق ہیں، حسب ذیل ہیں۔

سرمہ کا استعمال

سرمہ کی پابندی سے آنکھیں اکثر امراض سے محفوظ رہتی ہیں اور بصارت کو تقویت حاصل ہوتی ہے سرمہ کے استعمال سے متعلق چند احادیث حسب ذیل ہیں۔

(۱) حدیث معتبر میں جناب جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ جناب رسول خدا صلعم سوتے وقت طاق سلائیاں دونوں آنکھوں میں لگایا کرتے تھے (۳۶)

(۲) حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ حضرت رسول خدا صلعم تین تین سلائیاں سوتے وقت دونوں آنکھوں میں لگایا کرتے تھے (۳۷)

(۳) حدیث صحیح میں منقول ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت تین تین سلائیاں دونوں آنکھوں میں لگایا کرتے تھے۔ (۳۸)

خلال و مسواک کی ہدایت

کھانا کھانے کے بعد دانتوں کی درمیانی ریخوں کی صفائی کے لیے خلال ضروری ہے۔ اسی طرح دانتوں کی صفائی کے لیے شب میں سونے سے قبل اور صبح اٹھ کر مسواک ضروری ہے۔ اس لیے کہ دانتوں کی ریخوں میں غذائی اجزاء کے جمع ہونے اور متعفن ہونے سے متعدد امراض دانتوں، مسوڑھوں اور معدہ وامعاء میں پیدا ہوتے ہیں نیز منہ میں بدبو بھی پیدا ہوتی ہے۔ خلال و مسواک کے استعمال کے لیے چند احادیث حسب ذیل ہیں

(۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہمان کے حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے لیے خلال مہیا کرو۔ یہ بھی فرمایا کہ خلال کرو کیونکہ فرشتے اس سے زیادہ کسی چیز کو دشمن نہیں سمجھتے ہیں جیسا کہ کسی کے دانتوں میں کوئی کھانا دیکھنا۔ (۹۴)

(۲) معتبر حدیثوں میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ مسواک کرنا پیغمبروں کی سنت ہے اور حضرت رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیلؑ مجھے برابر مسواک کا حکم پہنچاتے تھے۔ یہاں تک کہ مجھے خوف ہوا کہ میرے دانت گھس جائیں گے (۱۴۹)

(۳) حضرت رسولِ خدا صلعم نے فرمایا کہ اگر امت کے لیے دشواری کا خیال نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ مسواک واجب کر دیتا (۱۵۰)

(۴) حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ شخص کہ جو دو چوب یعنی مسواک و خلال سے استفادہ کرتا ہے، وہ دو سنگ کے ضرر سے محفوظ رہتا ہے (طب النبیؐ)

(۵) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ غذا کے بعد بلا فاصلہ دانتوں میں خلال اور مضمضہ یعنی کلی کے ذریعہ منہ کو دھوؤ تاکہ تمہارے دانتوں کو آرام پہنچے۔ (طب النبیؐ)

لبیں کتروانا اور داڑھی کی اصلاح

مردوں کے لیے داڑھی رکھنا سنت موکدہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی لبیں کتروانے اور ریش کی اصلاح کی ہدایات بھی آنحضرت صلعم نے جاری فرمائی ہیں۔ تاکہ انسانی شکل وصورت بھی نہ بگڑے اور زیادہ بالوں کے بڑھ جانے سے جن بیماریوں کا اندیشہ ہے وہ بھی پیدا نہ ہوں۔ اس لیے کہ بال بھی فضلات سے ہیں جن کی صفائی واصلاح ضروری ہے۔ اس بارے میں آنحضرت کی چند احادیث درج ذیل ہیں

۱۔ لبیں کتروانا سنتِ موکدہ ہے اور جتنی زیادہ کتروائی جائیں بہتر ہے۔ حضرت رسولِ خدا صلعم سے منقول ہے کہ ”اپنی لبیں نہ بڑھنے دو ورنہ شیطان کو گھات کا زیادہ موقع ملے گا۔“ (۱۵۴)

۲۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ ”لبیں یہاں تک کتروانی سنت ہیں کہ اوپر کے ہونٹ سے اونچی ہو جائیں (۱۵۴)

(۳) داڑھی کو متوسط رکھنا سنت ہے۔ نہ زیادہ طویل ہو نہ بہت کم اور ایک مشت سے زیادہ داڑھی بڑھانا مکروہ ہے۔

ناخن کتروانا

ناخن بھی فضلات سے ہیں اور یہ بڑھ جاتے ہیں تو ان کے نیچے میل کچیل جمع ہو جاتا ہے اور جب غذا کھائی جاتی ہے تو میل کچیل غذا کے ساتھ شامل ہوتا اور معدہ میں فساد کا باعث بننے کا احتمال ہوتا ہے۔ لہذا ناخن کتروانے کی ہدایات بھی آنحضرت صلعم نے جاری فرمائی ہیں۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

(۱) حضرت رسولِ خدا صلعم سے منقول ہے کہ ناخن کتروانے سے بہت بڑے بڑے امراض دفع ہوتے ہیں اور روزی فراخ ہوتی ہے۔ (۱۵۸)

۲ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ ناخن کتروانا سنت موکدہ ہے۔ (۱۵۰)

۳ حضرت رسولِ خدا صلعم نے دانتوں سے ناخن کاٹنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ (۱۵۸)

ختنہ

اسلام میں ختنہ کو سنتِ موکدہ قرار دیا گیا ہے اور اس سے اعضائے تناسل کی صفائی اور طہارت مقصود ہے۔ تاکہ گندگی پیدا ہو کر امراض کا باعث نہ ہو۔ لڑکوں کی ختنہ پیدائش کے ساتویں دن سنت قرار دی گئی ہے۔

حضرت رسولِ خدا صلعم سے منقول ہے کہ ”جو شخص مختون نہ ہو، زمین اس کے پیشاب سے چالیس دن تک نجس رہتی ہے (۱۴۰)

نورہ لگانا

موئے زہار اور بغل کے بال بھی جب بڑھ جاتے ہیں تو جسم پر گندگی کو بڑھاتے ہیں اور ان میں جوئیں، لیکھیں اور دیگر کیڑے پرورش پا کر جسم انسانی کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ لہذا ان باتوں کی صفائی کے لیے آنحضرت صلعم نے احادیث کے ذریعہ واضح ہدایات فرمائی ہیں۔

(۱) حدیث معتبر میں حضرت رسولِ خدا صلعم سے منقول ہے کہ جو شخص خدا اور قیامت پر ایمان لایا ہو، اسے لازم ہے کہ چالیس دن سے زیادہ ناپاکی کے بال نہ بڑھنے دے۔ (۱۵۵)

۲ حدیث صحیح میں حضرت امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ نورہ لگانے کے بارے میں سنت ہے

د پندرہ دن میں ایک مرتبہ لگائے۔ ایک روایت ہے
کہ تین ہفتہ میں ایک دفعہ لگائے۔

وضو و اغسال؛

قرآن و حدیث کی رو سے مسلمانوں پر نماز و دیگر امور کے لیے وضو اور اغسال واجب یا مستحب قرار دیے گئے ہیں جن کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔ وضو اور اغسال کا مقصد جسم انسانی کی صفائی اور طہارت ہے اور ظاہر ہے کہ جسمانی صفائی اور طہارت انسان کو اکثر امراض سے محفوظ رکھتی ہے جیسا کہ علماء میں مشہور ہے۔ واجب غسل چھ ہیں

(۱) غسلِ جنابت (۲) غسلِ حیض (۳) غسلِ استحاضہ
(۴) غسلِ انفاس ۵ غسل مسِ میت (۶) غسلِ میت

اور سنتی غسل تعداد میں ۶۲ ہیں ازآنجملہ غسل جمعہ اوّل ہے جس کو بعض علماء واجب جانتے ہیں اور احتیاط اسی میں ہے کہ حتی الامکان ترک نہ کریں (۱۹۰-۱۹۱)

خوشبو کا استعمال

خوشبو اور عطریات کے استعمال سے انسانی قلب و دماغ میں فرحت و انبساط پیدا ہوتا ہے اور طاقت بڑھتی ہے اور کام کے لیے جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا آنحضرت صلعم نے طہارت و پاکیزگی جسم و لباس کے ساتھ خوشبو اور عطریات کے استعمال کی ہدایات بھی جاری کی ہیں۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں۔

(۱) حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیلؑ نے مجھ سے کہا کہ ایک دن بیچ کر کے خوشبو لگایا کرو اور جمعہ کے دن تو ضرور لگاؤ۔

(۲) ایک حدیث میں منقول ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اتنا مشک ملتے تھے کہ حضورؐ کی پیشانی مبارک سر مشک کا رنگ نمایاں ہوتا۔

(۳) حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منقول ہے کہ بدن کے لیے چنبیلی کے تیل سے کوئی تیل نہیں ہے (۱۰۲)

(۴) ایک اور روایت میں حضرت رسول اکرم صلعم۔ منقول ہے کہ چنبیلی کے تیل کے فائدے بہت ہیں اور وہ ستر بیماریوں کو نفع دیتا ہے۔

(۵) حدیث میں مذکور ہے کہ حضور نبی کریم صلعم کے سر میں جب درد عارض ہوتا تھا تو دھوئی تلی کا تیل ناک میں ٹپکایا کرتے تھے۔

(۶) دوسری معتبر حدیث میں آنحضرت صلعم سے منقول ہے کہ آنحضرت صلعم کو تلی کا تیل ناک میں ٹپکانا پسند تھا۔

(۷) ایک اور روایت میں وارد ہوا ہے کہ حضور صلعم عود قماری کی دھونی لیا کرتے تھے۔

(۸) ایک اور حدیث میں آنحضرت صلعم سے منقول ہے کہ تمہیں عود ہندی کا بخور لینا چاہیے اس میں آٹھ قسم کی شفا ہے۔

(۹) حضرت رسول اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ گلاب سے منہ دھویا جائے تو چہرے کی رونق زیادہ ہوتی ہے اور پریشانی دور ہوتی ہے۔

(۱۰) دوسری حدیث میں فرمایا کہ جو شخص صبح کو گلاب منہ پر مل لے۔ تمام دن بدحالی اور پریشانی سے محفوظ رہے گا جس وقت گلاب منہ پر ملے خدا کی تعریف کرے اور محمدؐ پر درود بھیجے

صحت کو قائم رکھنے کیلئے اچھی غذاؤں کا استعمال؛

بدن انسان میں ہمہ دم کون و فساد جاری رہتا ہے جس کے نتیجے میں اجزائے بدن تحلیل ہوتے

رہتے ہیں اور ان کے بدل یعنی بدل ما تحلل کی ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ جس کے لیے انسان کو غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں غذا کے استعمال کے لیے واضح آیات موجود ہیں اور ان کی تشریح و تفصیل حضرت رسول خدا صلعم کی احادیث سے ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں پروردگار عالم کا ارشاد ہے

اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَطَعَامُ الَّذِیْنَ
اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ (مائدہ۔ رکوع اول)

"ہم نے آج حلال کر دیں وہ تمام چیزیں تمہارے لیے جو عمدہ ہیں اور وہ غذائیں بھی جو اہل کتاب استعمال کرتے ہیں وہ بھی تمہارے لیے حلال کی گئی ہیں۔"

اب جو چیزیں عمدہ ہیں اور حلال نہیں اور جو غذائیں خراب اور حرام ہیں ان کی تشریح بھی احادیث سے ہوتی ہے۔ نیز آداب طعام کے متعلق بھی احادیث موجود ہیں جو نہ صرف اخلاقی اعتبار سے بلکہ طبی اعتبار سے بھی اہمیت رکھتی ہیں۔

آدابِ طعام

آدابِ طعام کے متعلق قرآن مجید میں واضح آیات موجود ہیں۔ مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے

کلوا واشربوا ولا تسرفوا ان اللہ لا
یحب المسرفین (انعام۔ رکوع ۳)

(ترجمہ) کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

اس آیت شریفہ کی روشنی میں کیا کھایا جائے کیا نہ کھایا جائے۔ کیا پیا جائے اور کیا نہ پیا جائے۔ اور کس قدر کھایا اور پیا جائے۔ ان امور کی تشریح میں بھی حضرت صلعم کی واضح احادیث موجود ہیں اور ان کی تائید و توثیق علم طب کی رو سے بھی ہوتی ہے۔ چند احادیث حسب ذیل ہیں۔

(۱) تفسیر زاہدی میں لکھا ہے کہ جس شخص کو منظور ہووے یہ بات کہ شیطان میرے ساتھ کھایا نہ کرے تو اس کو چاہیے کہ داہنے ہاتھ سے کھایا کرے اور داہنے ہاتھ سے طعام کو پکڑا کرے اور اللہ کا نام لے کر اس کھانے کو شروع کرے۔ اس واسطے کہ حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ہر کسی کو چاہیے کہ اپنے داہنے ہاتھ سے کھایا کرے اور داہنے ہاتھ میں غذا پکڑا کرے کہ شیطان کھاتا ہے بائیں ہاتھ سے اور پیتا ہے بائیں ہاتھ سے اور غذا پکڑتا ہے بائیں ہاتھ سے۔ اور فرمایا حضرت رسول اللہ صلعم نے کہ ہر کھانے پر اللہ کا نام لیا کرو۔ اور جس کھانے پر اللہ کا نام نہیں لیا جاتا ہے وہ کھانا شیطان کے واسطے حلال ہو جاتا ہے

(۲) حدیث موثق میں منقول ہے کہ حضور صلعم نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے فرمایا کہ یا علی رض! کھانے سے پہلے نمک کھایا کرو اس لیے کہ جو شخص کھانے کے اول و آخر نمک کھائے گا۔ خدا تعالیٰ اس سے ستر قسم کی بلائیں دور کر دے گا۔ جن میں سے ادنیٰ جذام ہے اور پیٹ کا درد اور آنتوں کا دکھنا ہے۔ (صفوہ۔ طب نبوی)

(۳) ابو نعیم نے کتاب الطب میں لکھا ہے کہ فرمایا رسول خدا صلعم نے کہ نہیں پیدا کیا کوئی برتن کہ وہ برا پیٹ سے ہو اور جب ضرورت ہو آدمی کو کھانے کی تو وہ پیٹ کے تین حصے کرے۔ ایک حصہ کھانے کے لیے ایک حصہ پینے کے لیے اور ایک حصہ دم آنے جانے کے لیے

خالی رکھو۔

(۴) ابونعیم نے روایت کی ہے انس بن مالکؓ سے کہ فرمایا رسول اللہ صلعم نے کہ کھایا کرو لوگو رات کو کھانا۔ اس واسطے کہ رات کا کھانا ترک کرنے سے بڑھاپا آتا ہے۔

(۵) فرمایا حضرت صلعم نے کہ ایک وقت میں متعدد قسم کی غذائیں استعمال نہ کرو۔

مفیدِ صحت غذائیں

قرآن مجید میں پروردگار عالم کا ارشاد ہے۔ یا ایھا الرسل کلوا من الطیبات واعملوا صالحا (ترجمہ) "اے پیغمبر پاک چیزیں کھاؤ اور اچھے کام کرو" نبی رسول اللہ صلعم نے احادیث کے ذریعہ اچھی اور مفید غذاؤں کے استعمال کے متعلق ہدایات سے سرفراز فرمایا۔ چند اہم غذائیں کہ جن کے متعلق آنحضرت کی صریح احادیث موجود ہیں ان میں اناج، گوشت اور میوہ جات کا تذکرہ نمایاں ہے۔ چند احادیث حسب ذیل ہیں۔

(۱) حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ حضرت رسول صلعم برابر جو کی روٹی استعمال کرتے تھے۔

(۲) اکثر حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ جناب رسول اللہ صلعم دست کے گوشت کو پسند فرماتے تھے اور ران کے گوشت کو ناپسند۔ کیوں کہ یہ پیشاب گاہ کے قریب ہے۔

(۳) حدیث حسن میں حضرت امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ دودھ میں پکا ہوا گوشت پیغمبروں کی مرغوب غذا ہے۔

(۴) منقول ہے کہ حضرت رسول اللہ صلعم کے نزدیک - جن جن چیزوں سے روٹی کھا سکتے ہیں ان میں سب سے بہتر سرکہ ہے۔ (۷۷-۷۶)

(۵) حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ بہترین تمہارے واسطے نان اور بہترین میوہ تمہارے واسطے انگور ہے

۶۔ پنیر کھاؤ کہ پنیر خواب لاتا ہے۔

۷ دنیا میں بہترین غذا گوشت اور انگور ہے۔

۸ • حدیث معتبر میں منقول ہے کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کدو بہت پسند تھا اور اپنی عورتوں کو حکم دیتے تھے کہ کدو زیادہ ڈالا کریں۔

اور حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو وصیت فرمائی کہ یا علی! کدو کھانا لازم سمجھو کہ اس سے دماغ بڑھتا ہے اور عقل زیادہ ہوتی ہے

(۹) حدیث معتبر میں منقول ہے کہ حضرت رسول اللہ صلعم ککڑی کو نمک کے ساتھ استعمال فرماتے تھے

(۱۰) روایت معتبر میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلعم کو سب میووں میں انار سب سے زیادہ پسند تھا۔

حضرت امام رضاؑ سے منقول ہے کہ آنحضرت صلعم کو سبز ترنج اور سرخ سیب کھانا بہت پسند تھا۔ (عرب لیموں اور نارنگی کو بھی ترنج کہتے ہیں)

(۱۱) حضرت صلعم نے فرمایا کہ صبح کے وقت خرما استعمال کرو تاکہ تمہارے بدن کے اندرونی کیڑے نابود ہو جائیں۔

۱۲ انجیر قولنج کی دوا ہے۔

(۱۳) انجیر مولد شیر اور نقرس کے لیے سودمند ہے۔

(۱۴) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ کشمش بہترین میوہ ہے۔ جوشِ صفرا کو فرو کرتا ہے اور بلغم کی اصلاح کرتا ہے۔

(۱۵) ابن عباسؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے

روایت کی ہے کہ خربزہ مثانہ کو صاف کرتا ہے۔
معدہ کو ہلکا کرتا ہے اور بدن کی جلد کو شاداب کرتا ہے

(۱۶) حضرت رسول اللہ صلعم سے منقول ہے کہ جو کوئی شخص
کوئی میوہ کھائے اور کھانے سے پہلے بسم اللہ کہہ لے تو یہ
اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔ (۸۵)

(۱۷) حدیث معتبر میں منقول ہے کہ اگر چند قسم کے کھانے حضرت
رسول خدا صلعم کے سامنے لائے جاتے تھے جن میں خرما
بھی ہوتا تھا تو حضورؐ ابتدا خرمے سے فرمایا کرتے تھے

۱۸ حضرت نبی اکرم صلعم سے منقول ہے کہ جب تم کسی شہر
میں پہنچو تو سب سے پہلے وہاں کی پیداوار میں سے
پیاز کھاؤ کہ اس شہر کی بیماریاں تم سے دور رہیں
گی۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جو شخص جس شہر میں پہونچے
وہاں کی سبزی ضرور کھائے

(۱۹) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ "لہسن کھاؤ کہ یہ ستر (۷۰)
بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے

(۲۰) ایک روایت میں حضرت صلعم سے منقول ہے کہ ستر
پیغمبروں نے چنے کے واسطے دعا برکت مانگی ہے (۹)

(۲۱) آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ مشروبات (پینے کی چیزوں)
میں بہترین شہد ہے کہ یہ قلب میں نشاط پیدا کرتا
ہے اور سینہ کو گرم کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث
کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلعم
نے اچھی غذاؤں کو حلال فرمایا اور ان کے استعمال کے لیے
ہدایات جاری فرمائیں۔ طبی اعتبار سے دیکھا جائے تو حلال
غذائیں وہی ہیں جو بدن انسان کے لیے نہایت مفید اور
ضروری ہیں اور مضرت کا پہلو ان میں نہیں ہے اور اگر ہے
تو خفیف نیز انسان کے لیے حرام ان ہی غذاؤں کو قرار دیا
گیا ہے کہ جن میں ان کی صحت یا اخلاق کی خرابی کے لیے کوئی مضر
پہلو موجود تھا۔ چنانچہ شریعت محمدی کی رو سے جملہ اچھی اور
مفید اغذیہ انسان کے لیے حلال کر دی گئی ہیں۔

احادیث رسول کی رو سے ایک اور حقیقت
بھی واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ انسان کو چاہیے کہ وہ سادہ
غذائیں حسب ضرورت استعمال کرے اور تقلیل غذا کا پابند
رہے تو ہضم اچھا رہے گا اور اس کے قویٰ درست رہیں گے
پُرخوری سے انسان کو روکا گیا ہے۔ آنحضرت صلعم کی تعلیمات
اور سیرت کی رو سے انسان کو غذا اور روزہ سے متعلق
جو ہدایات ملتی ہیں ان میں انسانی صحت کا بڑا راز مضمر ہے۔
روزہ اور غذاؤں کی صورت میں نہ صرف مواد فاسد جسم میں
پیدا ہوتا ہے بلکہ جو پیدا ہو کر بدن انسان میں جمع ہو گئے ہیں
وہ تحلیل ہو جائیں گے اور جسم انسان فاضل و فاسد مواد
سے محفوظ ہو جائے گا۔

ریاضت جسمانی (محنت)

قرآن مجید میں ریاضت جسمانی (محنت)
سے متعلق بھی واضح آیات موجود ہیں اور عبادات بھی ایسی
مقرر کی گئی ہیں کہ جن کے ذریعہ اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے
نماز صبح طلوع آفتاب کے وقت میں فرض کی گئی ہے اول وقت
ادا کرنے والوں کو بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ صبح کی تازہ
ہوا سے صحیح معنوں میں وہی لوگ مستفید ہوتے ہیں جو
علی الصبح اٹھنے کے عادی ہوں۔

اسلام میں ان ہی اوقات میں نمازیں
فرض کی گئی ہیں کہ جن اوقات میں جسم میں کسل اور سستی پیدا
ہوتی ہے۔ مثلاً نماز صبح، نماز ظہر، نماز عصر، نماز مغرب
اور نماز عشا۔ پھر مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب زیادہ
بیان کیا گیا ہے خصوصاً مسجد جامع میں پڑھنے میں۔

ان کے ابدان کا کسل دور ہوجاتا ہے اور وہ لوگ فرائض کی ادائیگی کے لیے چاق وچوبند ہوجاتے ہیں۔ نیز نماز سے قبل وضو بھی فرض ہے اور وضو سے بھی بدن کی سستی یقیناً دفع ہوتی ہے نماز واجبہ کے علاوہ نافلہ، سنتی اور مستحب نمازوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے کہ اگر انسان تمام نمازوں کو ادا کرے تو روحانی ریاضت کیساتھ اچھی خاصی جسمانی ورزش بھی ہوجاتی ہے جس سے جسم میں طاقت اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور سستی وکاہلی دفع ہوتی ہے۔ نماز کے ارکان مثلاً تکبیر، قیام وقعود، رکوع وسجود اور قنوت و تشہد کی ادائیگی سے جسم کے تمام اعضاء کی ورزش ہوجاتی ہے۔ پھر یہ ورزش خشوع وخضوع کے ساتھ ہوتی ہے جس کا اثر صحت جسمانی پر زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ یوگا ورزشوں کو صحت انسان کے لیے مفید بتایا گیا ہے جن میں انسان کو مختلف قسم کے آسن اختیار کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے۔ نماز ایک ایسی ریاضت ہے کہ جس میں جملہ انسانی آسنوں کا مجموعہ ہے کہ ہر لحاظ سے صحت کے لیے مفید ہوسکتے ہیں اور جن کی انجام دہی سے معدہ کے حرکات اور جسم کے جملہ اعضاء کے حرکات کا صحیح توازن قائم رہتا ہے۔

حضرت رسول اللہ صلعم نے فرمایا۔ صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي (نماز اس طرح پڑھو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو) پھر آپ نے اس قدر عبادت وریاضت فرمائی کہ آیت کریمہ کے ذریعہ آپ کو منع کیا گیا۔ مثلاً قم اللیل الا قلیلا۔

اگر انسان نمازوں کی ادائیگی صحیح طور پر کرے اس کی صحت جسمانی بہتر ہوگی۔ اس کی غذا بھی خوب ہضم ہوگی اور بدن کی طاقت بڑھے گی۔

قرآن اور احادیث کے ذریعہ دفاع اور جہاد کے احکامات بھی دیے گئے ہیں اور فنون جنگ کی تعلیم بھی دی گئی۔ چنانچہ آنحضرت صلعم نے متعدد جنگیں سر کیں جن میں آپ نے اور امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے جنگوں میں وہ کارنامے دکھائے ہیں کہ تاریخ اسلام میں یادگار رہیں گے ظاہر ہے کہ فنون جنگ کے اصول اور ان کی مشق سے بدن میں طاقت بھی بڑھتی ہے اور صحت جسمانی بہتر ہوتی ہے پھر اسلام میں جملہ اچھے پیشے مباح قرار دیے گئے ہیں اور تجارتیں بھی کہ جن کے اختیار کرنے سے اچھی خاصی جسمانی ورزش ہوجاتی ہے۔ مثلاً کاشت، لوہار، بڑھئی، جہاز رانی وغیرہ کے اختیار کرنے سے اتنی محنت انسان کو کرنا پڑتی ہے کہ جو اگر حد سے زیادہ نہ بڑھے تو جسمانی اعضاء کی طاقت کو بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔

قرآن نے انسان کو ایسے جملہ کاموں سے روکا ہے جو اسکی صحت کو تباہ کرنے والے ہیں اور ان کاموں کو گناہ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ گناہوں کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔ گناہوں میں بھنگ شراب وغیرہ کا استعمال، خراب صحبتوں کا اختیار کرنا، اغلام وزنا وغیرہ کا اختیار کرنا گناہان کبیرہ میں شامل کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کاموں سے صحت انسانی برباد ہوتی ہے اور ایسی بیماریاں انسان کو ہوجاتی ہیں کہ بطور وراثت اولاد کو بھی ملتی ہیں اور بالآخر نسل کا خاتمہ ہوجاتا ہے مثلاً سوزاک وآتشک وغیرہ

جملہ قرآنی احکامات کی تشریح احادیث میں موجود ہے اور ان کی عملی تعلیم آنحضرت صلعم کی سیرت پاک سے واضح ہے۔ جو انسان ان کی متابعت کرے گا اس کی زندگی سدھرے گی اور وہ ایک بہترین انسان بنے گا اور اس کی صحت بھی بہتر رہے گی اور جو اس کی خلاف ورزی کرے گا اس کی زندگی خراب ہوگی اور صحت بھی درست نہ رہ سکے گی۔

مولانا ہادی نقشبندی
بالاپور (بہار)

ہماری موجودہ تعلیم! ایک لمحۂ فکر!

کسی قوم و ملت کی تعمیر میں اس کے بچوں کی ابتدائی تعلیم بنیادی حیثیت رکھتی ہے جس کے لیے اوائل عمری میں بچہ کی مادری زبان میں دینی و اخلاقی تعلیم کا اہتمام ضروری ہے۔ لیکن ہماری موجودہ تعلیم میں ایسے نقائص پائے جاتے ہیں جس سے ہماری انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں پہ مہلک اثر پڑ رہا ہے جس کے بغیر صحیح فکر و تربیت، ملی تہذیب و ثقافت، قومی تمدن و معاشرت، دینی غیرت و حمیت کا استحکام و امتیاز ممکن نہیں آغاز ہی سے ان تمام اقدار کا تحفظ لازمی ہے۔ اس سے عدم توجہ، اخلاقی گراوٹ، معاشرتی بگاڑ اور بے راہ روی کا موجب ہوگی جس کی وجہ سے ہماری نئی نسل دینی و اخلاقی تربیت سے محروم، کشمکش حیات میں بیکار ہو کر رہ گئی ہے ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

ایک زمانہ تھا کہ ہمارے بزرگ اپنے بچوں کی تعلیم خانقاہوں، مسجدوں اور مکتبوں میں "بغدادی قاعدہ" سے شروع کروا کر دینی مبادیات، ضروری معلومات اور مجلسی و معاشرتی آداب سے واقفیت پر ہی مطمئن ہو جاتے تھے۔ مغربی دور حکومت میں فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ لیکن اس کے باوجود کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ دینی و اخلاقی تعلیم کے مواقع حاصل اور کافی حد تک ماحول پر قدیم تہذیب و شائستگی کے اثرات بھی باقی تھے۔

آج کے لادینی ماحول میں راست طریقہ تعلیم، کلچرل تربیت اور نام نہاد دیگر ترقی پذیر غیر ضروری اسباق کی کثرت نے کم عمر بچے کے دماغ کو ماؤف اور کھیل کا منڈ رکھا نیز باستثناء چند اساتذہ نہ تو کسی کو اپنے پیشے سے دلچسپی ہے اور نہ ان کی عدم صلاحیت و نااہلیت طلباء میں تعلیم سے کسی قسم کی رغبت پیدا کرنے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ نتیجتاً بدذوقی، اخلاقی گمراہی، ذہنی انارکی اور اس معصیت زدہ ماحول نے ان کی وضع قطع اس طرح بدل دی ہے کہ جانی پہچانی صورتیں بھی پہچانی نہیں جاتیں۔ نیم عریاں لباس، سربازار ٹرانزسٹر لیے سینما بینی، آوارگی [illegible] محض ذوق شہرت میں سیاسی بازیگروں کا آلۂ کار بنے ہوئے ہیں ؎

خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

ساتھ ہی ساتھ بعض قومی رہنماؤں اور زمانہ ساز دانشوروں نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا کہ "اگر

یہاں زندہ رہنا ہے تو مین اسٹریم [illegible]
میں اپنے آپ کو جذب کر لو۔ اس مادیت زدہ ماحول کے
کچھ پڑھے لکھے لال بجھکڑ ابن الوقتوں نے جنہیں نہ دین کی خبر
ہے اور نہ دنیا کی اور تعلیم کی ابجد سے بھی واقف نہیں محض
حصولِ دولت و شہرت کی خاطر مشنری مدرسوں کی ریس
میں جنہیں عیسائی مشنریوں نے تبلیغ مسیحیت کی خاطر پورے
ملک میں پھیلا رکھا ہے (۔ کتا کھائی ہوئی گندگی مٹھائی سے
دی جاسکتی ہے جسے اچھے کاغذ میں سجا کر دلکش بنا دیا گیا
ہو جس کے جال میں فیشن پرست و دولت مند طبقہ ایک عرصہ
سے پھنسا ہوا ہے) کی نقل کرتے ہوئے چھوٹے بچوں کے لیے
کنڈرگارٹن (K-G) اسکول قائم کرنا شروع
کر دیئے، جن میں نو دولتیے، یتیم العقل سرپرستوں نے ہر
چمکتی شے لذیذ ہوتی ہے سمجھ کر محض فخر و امتیاز کے لیے اندھا
دھند اپنے معصوم بچوں کو داخل کروانا شروع کر دیا ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

ابتدا کھاتے پیتے گھرانوں سے ہوئی
ان کی دیکھا دیکھی متوسط اور معمولی خاندانوں میں بھی اس کا
رواج بڑھتا رہا ہے۔ تعلیم تو کیا ہوتی اور مرض کیا جاتا لیکن
دین و دنیا دونوں سے جاتا رہا۔ یہ لوگ نہ صرف مذہبی عقائد
و تمدنی روایات بلکہ شریف گھرانوں کے رسم و رواج سے
بھی ناواقف ہیں۔ ان کا سب سے بڑا معلم سینما گھر ہوتا ہے
جس کی اتباع میں ان معصوم بچوں کو ناچ و رنگ اور فحش گانے
[illegible] یوم سرپرستان یا سوشل گیدرنگ میں
انتہائی جرأت سے ان کے سرپرستوں کے سامنے اس فسق
و فجور [illegible] مبتلا کروائے جانے کا [illegible]
[illegible] ہے۔

اس پر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ یہ خود
ساختہ جاہل محض ماہرینِ تعلیم جلبِ منفعت کے تحت کسی ماہر
تعلیم، ملی قومی رہنما، عالموں اور بزرگوں کی بجائے ایسے
افراد کو ان جلسوں کا کرسی نشین اور رونق ڈائس بناتے
ہیں جن پر تعلیم کا کوئی اثر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ان
معصوم بچوں کے دل و دماغ پر اس کا جو بھی اثر مرتب ہو ظاہر
ہے اس پر متضاد وقفۂ نماز تو کیا ہوتا انہیں معصوم بچوں
کو مذہب کے متعلق کچھ بھی بتایا نہیں جاتا۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

کنڈرگارٹن (K.G) کے بعد بچے کو اسی قسم کے کسی
اسکول میں داخل کروا دیا جاتا ہے جہاں اپنے مذہب و
رواج سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے
بجائے نصابی کتب کے زہر کا اثر بچے کی شخصیت پر بہت
پڑتا ہے اور جب اس ماحول میں اس کا تمام وقت گزرے گا
تو ایسے مدرسوں سے فارغ ہونے والے لڑکوں سے قوم و
جماعت کو کیا توقع ہو سکتی ہے۔ والدین کو کبھی نظر نہیں پڑتا
کہ صاحبزادے کو اپنے مذہب، اپنی قوم اور اپنے ملک کے
متعلق کچھ بھی معلومات نہیں ہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ پیغمبرِ اسلام
صلی اللہ علیہ وسلم کس زمانے میں پیدا ہوئے تھے اور
ان کی تعلیم کے بنیادی اصول کیا ہیں؟ خلفائے راشدین
کون تھے؟ اسلام کہاں پھیلا اور اس کی ترقی کے اسباب
کیا تھے اور آج کن چیزوں کی کمی نے ہمیں علم و ہنر اور مال
و دولت سے ہمسایہ قوموں کی بہ نسبت کمتر کر رکھا ہے

ہم نے سمجھا تھا کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچے حقیقتاً یہ محسوس نہیں

سمجھ پاتے کہ وہ بھی کسی قوم وملت کے فرد ہیں۔ نیز ان کی ملت کی حالت زار وزبوں ہے۔ ان کی حد نظر اپنے خاندان اور ان افراد تک ہوتی ہے جو ان سے قریبی تعلق اور ان ہی کی طرح ہیں۔ اپنی قوم و ملت کی کمزوری کا علم انھیں اس لیے نہیں ہوتا۔ کیوں کہ بہرحال وہ اور ان کے خاندان کے لوگ بخیر وعافیت ہیں۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ جب ان کی قوم وملت کے افراد تباہ وبرباد ہو جائیں گے تو وہ کس کے بل بوتے پر عیش وعشرت کریں گے اور پھر انھیں کون چین و امن سے رہنے دے گا

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

جدید تعلیم کا یہ زبردست المیہ ہے کہ اس کا راست طریقۂ اسباق طالب علموں کی عدم دلچسپی کے ساتھ اُن کے "صاحب نما" اساتذہ کو بھی راس نہیں آتا۔ یا وہ سمجھ نہیں پاتے جس کی وجہ سے عدم توجہی کے باعث طالب علم کہیں کا نہیں رہتا اس کی تعلیمی استعداد انتہائی پست اور زندگی کے اقدار مسلمہ بلکہ کچھ نہیں ہوتے۔ ایسی صورت میں ان کی زندگی کی لذتیں زیادہ تر یہی ہوتی ہیں کہ جدید فیشن کے ہپّی نما لمبے بال رکھیں اور نئی طرز کے بھڑکدار نیم برہنہ لباس پہنیں اور زیادہ سے زیادہ وقت سیر و تفریح میں گزاریں اور فلم و تماشے دیکھیں۔ علمی، تاریخی وادبی کتابوں کا کیا ذکر وہ اپنی زبان کے اردو اخبارات بھی نہیں دیکھتے جن سے انھیں اپنی قومی زندگی و ملی حالت کا اندازہ ہو سکے، ان کی تگ وتاز زیادہ سے زیادہ فلمی رسائل یا جاسوسی ناولوں تک محدود ہوتی ہے۔ یا بطور فیشن کسی مشاعرے میں ہلڑ مچانے پہنچ جائیں۔ حالی، اکبر، واقبال کو وہ کیا جانیں کسی اچھے شعر سے لطف اندوز ہونا تو کجا، سمجھنا بھی

ان کے بوتے کا نہیں وہ اپنی زبان میں کوئی صحیح جملہ تو کیا لکھ پائیں گے۔ صحیح اردو میں دو چار منٹ گفتگو کرنا بھی ان کے لیے دو بھر ہے ؎

مایوس کر رہا ہے نئی روشنی کا رنگ
اس کا نہ کچھ ادب ہے نہ کچھ اعتبار ہے

اس میکینکی مادی دور انتشار میں مجھے اپنے زمانے کے بنیادی وثانوی مدارس کے وہ اساتذہ یاد آتے ہیں جو کسی اعلیٰ سند کے نہ رکھتے ہوئے بھی اپنے فن میں مشاق، عام معلومات اور خوش نویسی کے ساتھ اعلیٰ صلاحیت کے مالک ہوتے ان کی ماہانہ یافت صرف ۱۲ سے ۸۰ روپے تک ہوتی۔ علاوہ ازیں انھیں کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی اختیار کرنے کی اجازت بھی تھی، اس کے باوجود وہ مطلق وابستگی سے اپنے پیشے کی مصروفیت کو عبادت سمجھتے اور انتہائی دلچسپی سے اوقات مدرسہ کے بعد بھی اپنے شاگردوں کی دینی، ذہنی واخلاقی نگرانی وتربیت کے ماسوا ان کے کمزور اسباق میں شگفتگی سے بلا معاوضہ امداد واعانت میں منہمک رہتے۔

موجودہ دور کے اساتذہ میں زمانہ سابق کے معلمین کی طرح نہ تو اپنے پیشے اور شاگردوں سے کوئی وابستگی وشغف ہے اور نہ طلباء ان سے خوف کھاتے ہیں اور نہ احترام کرتے ہیں، بلکہ آج کے اساتذہ طلبہ سے ڈرتے ہیں اور ان کی توجہ تعلیم کے بجائے لباس ظاہری آرائش، کھیل کود، تماشوں اور کلچر پروگراموں پر مرکوز کرا دیتے ہیں۔ ان اساتذہ کو سیکڑوں روپیہ ماہانہ پانے کے بعد کوئی سکون واطمینان حاصل نہیں، مزید برآں اوقات مدرسہ کے بعد انھیں دیگر حصول ذرائع آمدنی کی عام اجازت ہے نتیجتاً وہ تعلیم سے زیادہ ان ذرائع آمدنی میں دلچسپی رکھتے ہیں جس کے باعث وہ نہ تیاری اسباق پر توجہ دے سکتے ہیں،

اور نہ ہی عام مطالعہ کتب و اخبارات دیکھ پاتے ہیں۔ بلکہ ان اساتذہ کی توجہ زیادہ تر اس پر مرکوز ہوتی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے زیادہ سے زیادہ مادی فوائد حاصل کر کے ناجائز دوڑ دھوپ سے انھیں اعلیٰ ڈویژن دلوادیں یا انھیں کامیاب کرادیں جس کا نتیجہ ظاہر ہے ؎

جب مسیحا دشمن جاں ہو کب ہو زندگی
کوئی رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگے۔

خاتمہ کلام پر صرف یہ واضح کرنا ہے کہ سطور بالا میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے ایسا نہیں ہے کہ کوئی نہ جانتا ہو بلکہ یہ ایک ایسی کھلی واقفیت و حقیقت ہے جس میں ہمارے تقریباً تمام مدارس مبتلا ہیں اور عام طور سے یہ باتیں سب کو معلوم ہیں کوئی نیا انکشاف نہیں ہے۔ بلکہ محکمہ تعلیم اور ملی مدارس کے تمام سربراہ اس سے خوب واقف اور آگاہ ہیں ان ہی کی صرف نظر اور عدم توجہی اساتذہ اور طلبا دونوں کی بے راہ روی میں ممد و معاون ہی اور اجرأت و ہمت بیجا کی جس نے نئی نسل کو بربادی کے دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ موجودہ طریقہ تعلیم ہونی طور پر ملک اور قوم کے لیے تباہ کن اور خصوصی طور پر ہماری ملت اس کی بُری طرح شکار ہے جس کے باعث نئی نسل ہم پر ایک بوجھ بن گئی ہے جو پورے ملک کے لیے باعث فکر یہ ہے؟

کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہمارے رہنمایان قوم و دانشوران نئی نسل کی اس بگڑتی ہوئی صورت حال پر غور کریں! اور سربراہان تعلیم فوری طور پر ملی مدارس کی جانب توجہ دیں!! ورنہ وہ وقت دور نہیں کہ یہی نئی نسل کے نوجوان "واخذہ اخروی" سے قبل ہی اپنی تباہی و بربادی کا اسی دنیا میں ہم مواخذہ کریں!!!

وما علینا الا البلاغ المبین

بقیہ مضمون "مولانا آزاد لائبریری"

متعلقہ صفحہ نمبر ۲۵

میں عام طور پر مشینوں کے ذریعہ کیے جارہے ہیں۔ اس سلسلہ میں ضروری ساز و سامان اور مشینوں کی فراہمی بجائے خود ایک اہم مسئلہ ہے۔

لائبریری صرف نادر و نایاب اور اعلیٰ معیاری کتب کے ذخیرہ کا نام نہیں ہے۔ اس بزم کی رونق علم کے دیوانوں سے اور اس چمن زار کی رنگا رنگی شائقین علم کے دم سے ہے۔ تشنگان علم نہ ہوں تو یہ چشمۂ علم جلد یا بدیر ضرور خشک ہوجائے گا۔ اس لائبریری کی اصل روح بھی اس کے ارباب علم و تحقیق اور طلبہ ہیں جن کا ذوق علم و تحقیق اس کے حسن کو نکھار رہا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی "بجلی کی دودھیا روشنی میں لائبریری کی فضا طلوع سحر اور شائقین کا انہماک مطالعہ عبادت سحری کا منظر پیش کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یہی اس کا اصل حسن ہے اور اس کے تابناک مستقبل کی ضمانت

رسالہ میں مضامین بھیجتے وقت ان باتوں کا خیال رکھیں

مضامین صاف اور کاغذ کے ایک جانب تحریر ہوں۔

رسالہ کے معیار اور اس کی تحریک سے مطابقت رکھتے ہوں۔

تیسری اور آخری قسط

عشرت علی قریشی
ڈپٹی لائبریرین
مولانا آزاد لائبریری۔ اے ایم یو

مولانا آزاد لائبریری

لائبریری حاطہ [کمپلیکس]

یونیورسٹی کا لائبریری کمپلیکس مولانا آزاد لائبریری (مرکزی لائبریری) اور ۴۳ شعبہ جاتی اور کالج لائبریریوں کو محیط ہے۔ ان کے علاوہ گیارہ لائبریریاں رہائشی ہالوں کی ہیں۔ یہ شعبہ جاتی لائبریریاں دراصل مرکزی لائبریری کی توسیع کی حیثیت رکھتی ہیں اور پوسٹ گریجویٹ طلبا، ریسرچ اسکالر اور اساتذہ کے استفادہ کے لیے ہیں۔ ان میں سائنس کے شعبہ جات کی لائبریریاں اور مرکز دراسات ایشیائے غربی، ادارہ علوم اسلامیہ، شعبۂ تاریخ، انجینرنگ کالج، میڈیکل کالج، طبیہ کالج، ادارۂ امراض چشم، شعبۂ دینیات اور شعبۂ قانون کی لائبریریاں نہ صرف تعداد کتب کے اعتبار سے کافی بڑی ہیں بلکہ اپنے اپنے مضمون پر لٹریچر کے اعتبار سے جامع بھی۔ سائنس فیکلٹی کے شعبہ جات (انجینرنگ اور میڈیکل کالج کی لائبریریوں میں سائنسی اور فنی رسائل کا بہترین ذخیرہ ہے جو تحقیقی کاموں کے لیے اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ کتابوں کی سالانہ خریداری کا تقریباً دو تہائی حصہ مرکزی لائبریری سے شعبہ جاتی اور کالج لائبریریوں کو منتقل ہو جاتا ہے۔

کتب و رسایل پر سالانہ صرفہ: یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد ۲۲-۱۹۲۱ء کے بجٹ میں کتب و رسائل کی خریداری کے لیے پانچ ہزار روپیہ کی رقم منظور کی گئی۔ ۴۸-۱۹۴۷ء میں یہ رقم بڑھ کر ۲۵،۰۰۰ ہزار ہوگئی۔ تقسیم ملک کے بعد چند سال تک یونیورسٹی سخت مالیاتی بحران سے دو چار رہی۔ لیکن ملک میں پنج سالہ منصوبہ بندی کے ساتھ یونیورسٹی کی توسیع و ترقی کا نیا دور شروع ہوا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں کتب و رسائل کی رقم خریداری ۳۵،۲۳۵ تھی جو ہر سال تیزی سے بڑھتی رہی۔ ۶۲-۱۹۶۱ء میں یہ رقم ۱۰۸،۷۰۰ اور ۷۱-۱۹۷۰ء میں ۶۰۰،۰۰۰ ہوگئی۔ سال گزشتہ یہ گرانٹ ۲۰،۵۰،۰۰۰ تھی اور سال رواں کے بجٹ میں اس کا تخمینہ ۲۲،۰۰،۰۰۰ ہے۔ یونیورسٹی کے اپنے بجٹ سے اتنی بڑی سالانہ رقم خریداری کے علاوہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے بھی ہر پنج سالہ منصوبہ میں ایک خطیر رقم کتب و رسایل کے ذخیرہ میں توسیع کے لیے منظور کی۔ پہلے پنج سالہ منصوبہ میں یہ رقم ۱،۶۰،۰۰۰ تھی۔ جو ہر نئے منصوبہ میں تیزی سے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ پانچویں منصوبہ میں یہ رقم بڑھ کر ۳۵،۰۶،۰۰۰ ہوگئی۔ پنج سالہ منصوبوں کے درمیانی وقفہ میں بھی سالانہ پلان کے ساتھ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن برابر خاصی رقم کتب و رسائل کی خریداری کے لیے دیتا رہا۔ یونیورسٹی بجٹ اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایڈہاک گرانٹ دونوں کو ملا کر لائبریری اب اوسطاً تیس لاکھ روپیے سالانہ کتب و رسایل کی خریداری پر صرف کرتی ہے۔ لیکن یہ رقم بھی تحقیق و تدریس کے روز افزوں تقاضوں کو پورا کرنے

کے لیے ناکافی ہوتی ہے۔ گزشتہ پندرہ سال میں طلبہ اور تحقیقی کام کرنے والے حضرات کی تعداد میں بڑی سرعت سے اضافہ ہوا۔ نئے تعلیمی شعبہ جات کا قیام عمل میں آیا۔ نئے نئے درسی نصابوں کا آغاز ہوا۔ ان تمام عوامل نے یونیورسٹی کے لیے اقامتی اور تدریسی مسایل کے ساتھ لائبریری میں مطالعہ جاتی اور تحقیقی مواد کے فراہم کے مسئلہ کو بھی خاصا سنگین بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ کتب و رسایل کی خریداری پر ہر سال اتنی بڑی رقم صرف کرنے کے باوجود یونیورسٹی لائبریری کئی سال سے مالیاتی بحران میں گرفتار ہے۔

لائبریری کی مطبوعات

لائبریری اپنے ذخائر کو علمی دنیا سے روشناس کرانے کے لیے اور تحقیقی کام کرنے والے حضرات کی رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً مختلف کیٹلاگ اور فہرستیں شائع کرتی رہی ہے یہ سلسلہ جاری ہے اور آجکل بھی چند دیگر شعبۂ مخطوطات کے ہر ذخیرہ کی فہرست تیار کی جا رہی ہے۔ لائبریری کی اہم مطبوعات مندرجۂ ذیل ہیں۔

۱۔ فہرست نسخ قلمی (عربی، فارسی و اردو) سبحان اللہ کلکشن ۱۹۲۹ء
۲۔ فہرست مطبوعات (عربی، فارسی و اردو) سبحان اللہ کلکشن ۱۹۳۱ء
۳۔ فہرست کتب شیفتہ کلکشن (مخطوطات و نوادر) ۱۹۳۲ء
۴۔ فہرست نمائش گاہ مخطوطات و نوادر ۱۹۵۳ء
۵۔ کیٹلاگ فارسی مخطوطات۔ جلد اول (تاریخ و جغرافیہ، سوانح، سفرنامے وغیرہ۔ ۱۹۶۹ (انگریزی)
۶۔ کیٹلاگ سائنسی رسایل ۱۹۶۹ء (انگریزی)
۷۔ فہرست کتب حوالہ جات و تحقیق ۱۹۶۹ء (انگریزی)
۸۔ فہرست مقالہ جات ڈی ایس سی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، ایم اے۔ (ایم ایس سی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۲۰ء لغایت ۱۹۶۹ء)۔ ۱۹۶۹ء (انگریزی)
۹۔ فہرست مقالہ جات پی ایچ ڈی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ضمیمۂ اول۔ (۱۹۶۹ء لغایت ۱۹۷۰ء) ۱۹۷۳ء (انگریزی)
۱۰۔ سرسید احمد خاں: منتخب کتابیات ۱۹۷۱ء (اردو، ہندی و انگریزی۔ سرسید کی تصانیف اور ان پر کتب و رسایل میں مضامین کی فہرست جو آزاد لائبریری میں موجود ہیں)
۱۱۔ گاندھی جی: کتابیات ۱۹۷۱ء (اردو، ہندی و انگریزی۔ گاندھی جی کی اور گاندھی جی پر تصانیف کی فہرست جو آزاد لائبریری میں موجود ہیں)۔
۱۲۔ اردو رسایل کی ڈائرکٹری (مولانا آزاد لائبریری اور مسلم یونیورسٹی کے دیگر شعبہ جاتی کتب خانوں کے ۱۹۷۰ء تک کے مخزونہ رسائل کی فہرست)۔ جلد اول ۱۹۷۳ء (اردو)
۱۳۔ سوشل سائنس رسائل کی ڈائرکٹری ۱۹۷۳ء (انگریزی)
۱۴۔ کیٹلاگ مخطوطات فارسی۔ حبیب گنج کلکشن

جلد اول - حصۂ اوّل (منظومات)
۱۹۸۱ء (انگریزی)

۱۵ کیٹلاگ مخطوطات فارسی (اضافہ
دورانِ ۱۹۵۸ء تغایت ۱۹۷۸ء)
۱۹۸۰ء (انگریزی)

ان کے علاوہ تذکرہ "جواہر زواہر" یعنی مخطوطات فارسی جواہر میوزیم۔ اٹاوہ کی فہرست (۱۹۵۹ء) ہے یہ فہرست لائبریری کی شائع کردہ نہیں ہے۔ اِس ذخیرہ کا عطیہ لائبریری کو ۱۹۶۱ء میں ہوا۔

لائبریری کا استعمال اور تعداد ممبران

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کیونکہ ایک اقامتی ادارہ ہے۔ اس لیے یہاں لائبریری کا استعمال دوسری مرکزی یونیورسٹیوں کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں طلبہ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے جس نے اقامتی مسئلہ کو یونیورسٹی انتظامیہ کے لیے انتہائی سنگین بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتِ حال میں طلبہ کے لیے اپنے کمروں پر پڑھنا انتہائی دشوار ہے۔ مطالعہ کے لیے سنجیدہ اور پرسکون ماحول انھیں صرف لائبریری میں ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے مطالعہ کا زیادہ وقت لائبریری میں گزارتے ہیں۔ کتابوں کی قیمتوں میں بے پناہ اضافہ نے متوسط گھرانوں کے طلبہ کے لیے کتابوں کی خریداری کو تقریباً ناممکن بنا دیا ہے اور درسی کتب کے مطالعہ کے لیے اُن کا انحصار کلیتاً لائبریری پر ہوتا ہے۔ یہ دوسرا سبب ہے جس نے لائبریری کے استعمال کو بہت زیادہ بڑھایا ہے علاوہ ازیں موجودہ طریقۂ تعلیم کہ جس میں درسی کتب کے علاوہ اور بہت سی دوسری کتابوں سے مخصوص ابواب طلبہ کو مطالعہ کے لیے بتائے جاتے ہیں۔ لائبریری کے استعمال کو برابر بڑھا رہا ہے۔ تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد بھی گذشتہ دس سال میں بہت زیادہ بڑھی ہے اور لائبریری کے استعمال پر اس کا نمایاں اثر ہوا ہے۔ ان تمام وجوہ سے لائبریری میں صبح سے رات کے پچھلے پہر تک اتنا ہجوم رہتا ہے کہ بسا اوقات طلبہ کو بیٹھنے کے لیے جگہ نہیں ملتی اور انھیں واپس جانا پڑتا ہے۔ لائبریری کے تمام دارالمطالعوں میں کل ۶۵۰ نشستیں ہیں جو طلبہ کی موجودہ تعداد کے اعتبار سے قطعاً ناکافی ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے اصولوں کے مطابق کل طلبہ کی تعداد کے دس فیصد ہی کے لیے لائبریری میں مطالعہ کے لیے نشستیں ہونا ضروری ہیں۔ اس اعتبار سے آزاد لائبریری میں کم از کم ڈیڑھ ہزار نشستوں کی ضرورت ہے۔ مطالعہ کے لیے جگہ کی شدید قلّت اور کتابیں رکھنے کے لیے جگہ کی تنگی اس وقت لائبریری کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ کالج اور شعبہ جاتی کتب خانوں کے باوجود یہ مسئلہ دن بدن شدّت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اسی مسئلہ کی شدّت نے گزشتہ سال مجبور کیا کہ رہائشی ہالوں میں بھی کتب خانے قائم کیے جائیں اور جو ہالوں میں پہلے سے کتب خانے موجود ہیں انھیں اور بڑھایا جائے۔ تاکہ طلبہ اپنے ہالوں کی لائبریریوں میں ہی بیٹھ کر مطالعہ کر سکیں اور جگہ کی قلّت کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو۔ موجودہ وائس چانسلر صاحب نے اس مسئلہ کی سنگینی کو پوری طرح محسوس کیا اور موصوف کے حکم سے تقریباً ڈھائی لاکھ روپے کی درسی کتب خرید کر مختلف ہالوں کی لائبریریوں کو بھیجی گئیں۔ آزاد لائبریری میں بھی ان کتب کا کافی تعداد میں اضافہ ہوا۔ اس کے بعد وائس چانسلر صاحب نے راقم الحروف کے ساتھ تمام ہالوں کی لائبریریوں کا دورہ کیا اور وہاں ضروری سامان کا انتظام فرمایا تاکہ طلبہ کو مطالعہ کے لیے زیادہ سے

زیادہ آسانیاں فراہم ہوں۔

گزشتہ سال سے لائبریری میں طلبہ کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ کثیر تعداد میں درسی کتب کی خریداری اور مطالعہ کے لیے دوسری سہولتوں کی فراہمی ہے۔ یہ سب کچھ وائس چانسلر صاحب کی خصوصی توجہ سے ممکن ہو سکا۔ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے لیے موصوف کے حکم سے لائبریری کے اوقات ستمبر ۱۹۸۰ء میں ۱۰ بجے رات سے بڑھا کر ۱۲ بجے تک کیے گئے اور بعدازاں ۲ بجے رات تک وقت بڑھایا گیا۔ دو دارالمطالعوں کے بجائے لائبریری کے پانچوں دارالمطالعے کھولے گئے۔ لائبریری کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ لائبریری رات کے ۲ بجے تک کھولی گئی۔ غالباً ملک میں کوئی اور یونیورسٹی لائبریری ایسی نہیں ہے جو اتنی رات گئے تک کھلی رہتی ہو۔ توسیع اوقات کی وجہ سے وائس چانسلر صاحب نے مزید اسٹاف منظور فرمایا جو چند ماہ کے وقفہ کے علاوہ برابر کام کر رہا ہے۔

لائبریری میں روزانہ تقریباً چار ہزار طلبا آتے ہیں۔ سب سے زیادہ استعمال درسی کتب کے دارالمطالعہ کا ہوتا ہے۔ طلبا کی تعداد اور کتابوں کے استعمال کے روزانہ اعدادوشمار کی بنیاد پر یہ تعداد ۸۲-۱۹۸۱ء میں بالترتیب ۸۱۷، ۴،۲۴ اور ۹۳۵، ۱۷، ۳ تھی۔ لائبریری پورے سال کھلی رہتی ہے اور صرف آٹھ دن مخصوص ہندو، مسلم اور قومی تہواروں پر بند ہوتی ہے۔

درسی کتب کی قلت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے انجینیرنگ کالج اور شعبۂ قانون کی لائبریریوں میں کئی سال سے بک بینک کی اسکیم چل رہی ہے کتابوں کی لاگت قیمت جمع کراکر سال بھر کے لیے طلبا کو کتابیں دے دی جاتی ہیں۔ طلبہ سے جو رقم وصول ہوتی ہے، اس سے نئی کتابیں خریدی جاتی ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن بھی اس طرح کی اسکیم شروع کرنے اور اسے فروغ دینے کے لیے مالی امداد دیتا ہے۔ آزاد لائبریری جلد ہی یہ اسکیم پوری یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے شروع کرنے والی ہے۔

ممبران کی تعداد میں گزشتہ پندرہ سال میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ سال ممبران کی تعداد ۸۵۴،۸ تھی۔ جبکہ ۶۸-۱۹۶۷ء میں کل ۴،۴۲۶ ممبران تھے۔ طلبا، اساتذہ اور ریسرچ اسکالر کی تعداد کے اعتبار سے یہ تعداد کم ہے۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ میڈیکل کالج، طبیہ کالج اور ادارۂ امراض چشم کے طلبا اور سائنس فیکلٹی کے ریسرچ اسکالر بالعموم اپنی لائبریریوں سے استفادہ کرتے ہیں جو ان مضامین کے لٹریچر پر بڑی وسیع ہیں۔ اسی طرح ویمنس کالج کی طالبات اپنی کالج کی لائبریری کا استعمال کرتی ہیں۔ دوسری وجہ ہے کہ گزشتہ دو برسوں کے غیر معمولی حالات نے بھی اس تعداد کو متاثر کیا ہے۔ اسی کے باعث کتابوں کی تعداد بھی جو ممبران کو لائبریری سے باہر مطالعہ کے لیے دی گئیں، پچھلے سال کافی گھٹ گئی۔

لائبریری کی خدمات: اندرونِ لائبریری مطالعہ کی سہولتوں اور بیرونِ لائبریری مطالعہ کے لیے کتابیں دینے کے علاوہ لائبریری ان کتابوں کو بھی مہیا کرتی ہے جو لائبریری میں موجود نہیں ہوتی ہیں اور جن کی اساتذہ اور تحقیقی کام کرنے والے حضرات کو ضرورت ہوتی ہے۔ یہ کتابیں دوسری لائبریریوں سے مستعار منگائی جاتی ہیں۔ لیکن لائبریری کی اہم ترین خدمت تحقیق کے

کاموں میں ہاتھ بٹانا ہے۔ مختلف نوعیت کے استفسارات کے جوابات دینا، تحقیقی موضوعات پر لٹریچر کا جائزہ لینا اور اس کے متعلق اربابِ تحقیق کو ضروری معلومات بہم پہونچانا گاہے گاہے ان جائزوں کی فہرستیں تیار کرنا، کتابوں اور رسائل میں مختلف حوالے تلاش کرنا، یونیورسٹی میں جن موضوعات پر ریسرچ ہو رہی ہے، ان کے لیے مطلوبہ مواد کی فراہمی کے لیے کوشش کرنا اور اس طرح لائبریری کے کتب و رسائل کے ذخیرہ کو تحقیقی تقاضوں سے زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرنا، اس خدمت کے اہم عناصر ترکیبی ہیں۔ ان کے علاوہ اساتذہ اور شائقین علم کے لیے لائبریری میں موجود کتابوں کو فراہم کرنا، اُن کے لیے مخصوص کتابوں کو تلاش کرنا۔ نئے طلبا کو لائبریری کے ذخیروں سے روشناس کرانا اور انھیں لائبریری سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کے لیے کیٹلاگ کا طریقۂ استعمال سمجھانا نیز ضروری حوالہ جاتی کتب ان کے علم میں لانا، یہ سارے کام بھی اسی خدمت میں شامل ہیں۔ تحقیق کی روز افزوں وسعت کے ساتھ کتابیاتی خدمت کا مطالبہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ لائبریری کا شعبہ خدمات اس خدمت کو کسی خاطر خواہ پیمانہ پر دینے سے قاصر ہے اس سلسلہ میں اسٹاف کی کمی سب سے بڑا مسئلہ ہے اور موجودہ حالات میں کوئی نئی خدمت شروع کرنا ممکن نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس طرف توجہ دی جائے اور اس مسئلہ کو حل کیا جائے تاکہ لائبریری نئے تقاضوں سے نبرد آزما ہونے کے قابل ہو سکے۔ اور تحقیق کے کاموں میں ایک جدید لائبریری کی طرح اپنا رول پوری طرح ادا کر سکے۔

مندرجہ بالا خدمات کے علاوہ لائبریری مقامی اور بیرونی تحقیق کرنے والے حضرات کی امداد کے لیے مخطوطات و نادر مطبوعات کی مائیکروفلم اور فوٹو کاپیاں بھی مہیا کرتی ہے۔ یہ خدمت کافی عرصہ سے جاری ہے۔ بدقسمتی سے لائبریری کے پاس ضروری سازوسامان کی بہت کمی ہے جس کی وجہ سے یہ بڑھتے ہوئے مطالبات کو اکثر پورا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔

لائبریری کے موجودہ مسائل

جگہ کی شدید قلت اس وقت لائبریری کا اہم ترین مسئلہ ہے جس کا حل صرف عمارت کی توسیع ہے دوسرے اہم مسائل لائبریری کی عمارت کی ایر کنڈیشننگ اور مخطوطات کا تحفظ ہیں۔ توسیع عمارت اور ایر کنڈیشننگ دونوں مسائل پر وائس چانسلر صاحب کی خصوصی توجہ ہے موصوف اس سلسلہ میں مطلوبہ رقم کی فراہمی کے لیے وزارتِ تعلیم اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن سے کوشش کر رہے ہیں امید ہے کہ جلد ہی آپ کی سعی و کاوش سے یہ مسائل حل ہو جائیں گے۔

مخطوطات کا تحفظ صرف مائیکروفلم کی شکل میں ممکن ہے۔ کافی مخطوطات تقریباً ایک ہزار سال پرانے ہیں کاغذ انتہائی بوسیدہ اور خستہ ہو چکا ہے۔ اگر اس سلسلہ میں جلد ہی کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تو اندیشہ ہے کہ یہ بیش بہا اور نادر و نایاب سرمایہ تلف ہو جائے گا۔ اور علمی خسران کے ساتھ یہ ایک بہت بڑا علمی و قومی نقصان بھی ہوگا۔

لائبریری پر نئے علمی و تحقیقی تقاضوں کا دباؤ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ لائبریری کو ان نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اور اس کی خدمات کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اسٹاف کی کمی کے مسئلہ کو حل کیا جائے۔ اس کا موثر حل یہ ہے کہ اسٹاف کو ان کاموں سے فارغ کیا جائے جو اب بڑی لائبریریوں

پروفیسر محمد اقبال انصاری
صدر شعبۂ اسلامیات
اے ایم یو۔

ملّا بحر العلوم فرنگی محلّی

اودھ کے جن قصبات نے علوم اسلامیہ کی خدمت اور نشر و اشاعت میں غیر معمولی و گرانقدر خدمات انجام دیں اُن میں ایک قصبہ سہالی بھی ہے جو ایک زمانہ میں بہت بڑا سرچشمۂ علم تھا۔ بڑے بڑے نامور علماء و فضلاء یہاں درس دیتے تھے اور نہ صرف اطراف و اکنافِ ہند بلکہ بیرون ہند سے بھی طالبانِ علم و فضل یہاں آکر زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے اور اپنی تشنگیٔ علم بجھاتے تھے۔ استاذ الکل ملّا قطب الدین شہید سہالوی یہیں کے رہنے والے تھے جن کے درس میں شرکت کی غرض سے دُور دُور سے دانشجو آیا کرتے تھے مگر ۱۸ رجب سنہ ۱۱۰۳ھ میں ان کی شہادت کے بعد ان کے اہلِ خاندان لکھنؤ کے اس علاقہ میں جاکر آباد ہوگئے جو فرنگی محل کے نام سے موسوم ہے۔

استاد الکل کے نامور فرزند ملا نظام الدین محمد سہالوی (۱۶۷۶ء - ۱۷۴۸ء) نے فرنگی محل میں مسند درس و تدریس بچھاکر درسِ نظامی کی بنیاد رکھی جس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی اور جو معمولی ردّ و بدل کے ساتھ آج بھی ہندوستان کے بیشتر عربی مدارس میں رائج ہے۔ اس لیے کہ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ طالب علم میں بہت جلد ایسی استعداد و صلاحیت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ فراغت سے پہلے ہی استاد کی مدد سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتا ہے۔

اس بانیٔ درسِ نظامی کے فرزند ملا بحر العلوم فرنگی محلی تھے جو ۱۱۴۴ھ میں فرنگی محل (لکھنؤ) میں پیدا ہوئے آپ کا اصلی نام عبد العلی محمد فرنگی محلی تھا۔ اگرچہ بیشتر تذکرہ نگاروں نے صرف عبد العلی لکھا ہے۔ آپ کی کنیت ابو العیاش تھی اور لقب بحر العلوم تھا جو شاہ عبد العزیز دہلویؒ نے آپ کے تبحر علمی کی بنا پر دیا تھا اور جس نے ایسی شہرت عام حاصل کی کہ اس کے مقابلہ میں رئیس کرناٹک، نواب والا جاہ محمد علی کا عطا کردہ "ملک العلماء" کا خطاب بھی ماند پڑ گیا۔

باپ نے اپنے اکلوتے فرزند کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور چار سال چار ماہ کی عمر پر بڑی شان و شوکت سے بسم اللہ کی تقریب کی اور پھر خصوصی توجہ سے معقولات و منقولات کی ساری تعلیم خود ہی دے کر سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں تعلیم سے فارغ کرکے لکھنؤ کے قریب قصبہ کاکوری میں آپ کا عقد کر دیا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں اپنے فرزند کو اپنا صحیح جانشین بنا دیں مگر ان کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی اور چند ماہ بعد ہی ۹ جمادی الاوّل ۱۱۶۱ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا اور گھر کی ساری ذمہ داریاں ملّا بحر العلوم کے سر آن پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی طبیعت درس و تدریس کی طرف زیادہ مائل نہ ہوتی تھی اور

بیشتر وقت کبوتر بازی اور بٹیر بازی کی نذر ہو جاتا تھا اور
شاید آپ کی زندگی کا رُخ ہی دوسرا ہوتا اگر پے در پے دو
واقعے پیش نہ آجاتے :

پہلا واقعہ تو پدر بزرگوار کے انتقال کے
چند دنوں بعد ہی پیش آیا جب کہ ملّا صاحب حسبِ معمول
چھت پر کبوتر بازی میں مصروف تھے کہ فقیر نے در پر صدا
لگائی ، ماما نے اُسے کچھ دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار
کیا اور کہا کہ وہ صرف ملّا صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ ماما نے
جواب دیا کہ ان کا تو انتقال ہو چکا ہے ۔ اس پر فقیر نے کہا
کہ میں ان کے صاحبزادے کو ملّا صاحب کہہ رہا ہوں۔ ماما نے
آکر اندر اطلاع دی تو ملّا صاحب کبوتر لیے ملنے آگئے ۔ اس
پر فقیر نے کہا کہ "آپ کا یہ منصب نہیں ہے کہ کبوتر بازی کریں"
اور چلا گیا ۔ ملّا صاحب پر اس کا بیحد اثر ہوا اور کبوتر اسی
وقت اُڑا دیا۔

دوسرا واقعہ اس کے چند دنوں بعد ہی
پیش آیا کہ شیلہ کی مسجد پر حسبِ معمول جلسۂ دستار بندی ہو رہا
تھا جس کی صدارت ملّا نظام الدین محمد کیا کرتے تھے ۔ بحر العلوم
بھی اسے دیکھنے پہونچے اور اس شان سے کہ بٹیر کی کابک
ہاتھ میں تھی۔ مجمع بہت زیادہ تھا۔ ملّا بحر العلوم نے اندر گھسنے
کی کوشش کی تو ایک شخص نے دھکا دے کر روکا۔ اُس پر
بحر العلوم نے کہا کہ " جانتے نہیں ہو کہ میں ملّا نظام الدین محمد
کا بیٹا ہوں"۔ اس پر اس شخص نے برملا جواب دیا کہ " اگر
تم ان کے بیٹے ہوتے تو ان کی جگہ صدر نشین ہوتے اس طرح
بٹیر کی کابک ہاتھ میں نہ لیے ہوتے"۔ اس بات پر بحر العلوم
کی حمیت جوش میں آگئی ۔ کابک توڑ کر بٹیریں اُڑا دیں۔ گھر
کر کتاب بغل میں لی اور پدر بزرگوار کی قبر پر جا کر دیر تک
روتے رہے۔ پھر کتاب کا مطالعہ شروع کیا اور بقیہ عمر

درس و تدریس ، تصنیف و تالیف میں گزار دی۔ بہت جلد
فاضلِ اجل اور مرجع انام بن گئے ، بحر العلوم کے لقب اور
ملک العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور ملک کے
گوشہ گوشہ میں ان کی شہرت ہوگئی اور دُور دُور سے تشنگانِ
علم ان کے حلقۂ درس میں شرکت کی غرض سے آنے لگے مگر
چند سال بعد ہی ایک ناخوشگوار واقعہ پیش آجانے کی بنا پر
جو اگرچہ سراسر غلط فہمی پر مبنی تھا بحر العلوم نے اسی میں عافیت
سمجھی کہ لکھنؤ سے ترکِ سکونت کرکے شاہجہاں پور چلے جائیں
جہاں ان دنوں حافظ رحمت خاں روہیلہ کی حکومت تھی ۔
انھوں نے مولانا کا بہت گرم جوشی سے استقبال کیا اور
آپ کے نیز طلبہ کے قیام و طعام و دیگر مصارف کا معقول
انتظام کر دیا ۔ اور مولانا تدریسی و تصنیفی مشاغل میں لگ گئے
لیکن یہ سلسلہ بھی زیادہ دنوں تک جاری نہ رہ سکا اور ۱۱۸۸ھ
میں حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد مولانا شاہجہاں پور کو
خیر باد کہہ کر نواب فیض اللہ خاں والی رامپور کی دعوت پر
وہاں منتقل ہو گئے ۔ انھوں نے بھی مولانا کی بیحد تعظیم و تکریم
کی اور انھیں اور طلبہ کو ہر ممکن سہولت بہم پہونچائی ۔ مگر
ریاست کی خستہ حالی کی بنا پر وہ کچھ دقت محسوس کرنے لگے
تھے کہ اسی اثنا میں منشی صدر الدین بوہاری نے مدرسہ
عالیہ ، بوہار (ضلع بردوان) کے لیے مولانا کی خدمات
حاصل کرلیں اور ایک مدت تک وہاں مولانا درس و تدریس میں
مصروف رہے مگر کچھ عرصہ بعد ان کے اور منشی صدر الدین
بوہاری کے درمیان رنجش پیدا ہوگئی جس سے مولانا بیحد
دل برداشتہ ہوئے۔ اس کی خبر جب رئیس کرناٹک نواب
والاجاہ محمد علی کو پہونچی تو انھوں نے مولانا کو مدراس
آنے کی دعوت دی جسے مولانا نے قبول فرمایا اور
۲۴ ذی الحجہ ۱۲۰۵ھ کو جب مولانا مدراس پہونچے

تو نواب والاجاہ نے اپنے کچھ عزیزوں اور حاشیہ برداروں کو استقبال کے لیے بھیجا اور جب مولانا کی پالکی نواب کرناٹک کے دولت خانہ پہونچی تو خود نواب والاجاہ نے مع شہزادوں کے بڑھ کر استقبال کیا اور پھر اپنے خویش و اقارب کے کاندھوں کے سہارے پالکی صدر مقام تک لے گئے اور جہاں خود اُن کی نشست تھی اس جگہ مولانا کو بٹھا کر قدم بوسی کی اور کہا اللہ اکبر یہ نصیب کہاں تھے کہ حضور کا قدم میرے غریب خانہ پر آتا۔ پھر اس کے بعد مولانا کا ایک ہزار روپیہ مشاہرہ مقرر کر دیا اور ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا جس میں مولانا درس دیتے تھے اور اطراف و اکناف سندھ و بیرون ہند سے فوج در فوج آپ کے درس میں شرکت کی غرض سے آتے تھے۔

آخر دم تک نواب والاجاہ بحر العلوم کا پہلے ہی دن کی طرح احترام کرتے رہے اور آپ کی راحت و آسائش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے عمدۃ الامراء اور تاج الامراء نیز پوتے عظیم الدولہ نے بھی بحر العلوم کے اعزاز و اکرام میں ذرہ برابر کوئی کمی نہیں کی اور مولانا نے اپنی زندگی کے بقیہ دن درس و تدریس و تالیف میں گزار دیے۔ بالآخر وہیں ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ میں وفات پائی اور دوسرے دن مسجد والاجاہ کے صحن سے ملحق داہنی جانب کے احاطے میں مدفون ہوئے۔ آپ کا مزار اب تک زیارت گاہ خلائق ہے۔ "قَدْ اِنْتَقَلَ مَوْلَانَا مَلِکُ الْعُلَمَاءِ" سے سال وفات نکلتا ہے۔

مولانا کے تین بیٹے اور تین ہی بیٹیاں تھیں۔ بڑے صاحبزادے کا نام عبد الاعلیٰ اور منجھلے کا عبد النافع تھا مگر دونوں جوانعمری ہی میں مولانا کی حیات میں وفات پا گئے۔ البتہ سب سے چھوٹے صاحبزادے عبد الرب بچپن ہی سے بڑے ہونہار معلوم ہوتے تھے اس لیے مولانا نے

انھیں بڑے لاڈ و پیار سے پالا تھا اور اپنے ہی سایۂ عاطفت میں بڑی ہی محنت اور جانفشانی سے تعلیم و تربیت کی تھی اور بہت جلد علوم معقولہ و منقولہ سے فارغ کر دیا تھا اور ان کی دلی خواہش تھی کہ وہ ان کے صحیح جانشین بنیں۔ اسی لیے ہر جگہ ساتھ رکھا اور خصوصی توجہ بھی رکھی مگر وہ صرف کوشش ہی تو کر سکتے تھے فطرت بدلنا اُن کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ علوم عقلیہ و نقلیہ پر کامل دستگاہ کے باوجود ان کی طبیعت تدریس و تالیف کی طرف راغب نہ ہوئی اور بحر العلوم کے انتقال کے بعد جب انھیں سلطان العلماء کا خطاب دے کر باپ کی مسند درس پر بٹھایا گیا تو اُن کی طبیعت اس میں نہ لگی اور وطن چلے آئے اس لیے پھر بحر العلوم کے چھوٹے داماد مولانا علاء الدین کو صدر مدرس بنا کر ان کا جانشین کر دیا گیا، اور پھر یہی بحر العلوم کے حقیقی جانشین ثابت ہوئے اور ملک العلماء کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے اور ان کی اولاد بحمد اللہ اب بھی موجود ہے۔ منجھلی بیٹی لاولد ہی فوت ہو گئی تھیں۔ بڑی بیٹی کی بھی اب کوئی اولاد ذکور باقی نہیں ہے۔

بحر العلوم نے تقریباً ساٹھ سال درس و تدریس اور تالیف و تصنیف میں گزارے۔ ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں بےشمار حضرات نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا ہوگا۔ مگر سوانح نگاروں نے ان کی کوئی تعداد نہیں بتلائی ہے۔ البتہ آپ کے خاص تلامذہ میں مولوی محمد غوث شرف الملک بہادر (م ۱۲۳۸ھ)، ملک العلماء علاء الدین فرنگی محلی (م ۱۲۴۲ھ) اور مولانا عماد الدین اللبکنی کا ذکر خاص طور پر ملتا ہے۔ یہ سب صاحب تصنیف تھے۔

تلامذہ کی ایک بڑی تعداد کے علاوہ بحر العلوم نے تصانیف بھی اپنے علمی ورثہ میں چھوڑی ہیں جن کی تعداد تیس ہے۔ ان میں کچھ مطبوعہ ہیں، کچھ غیر مطبوعہ اور چند کے ب

صرف نام ہی محفوظ رہ گئے ہیں۔ میں اس وقت صرف چند اہم تصانیف کے مختصر تعارف پر اکتفا کروں گا۔

۱۔ احوال قیامت۔ یہ فارسی میں ایک مختصر رسالہ ہے جس میں اشراط ساعت، قیامت، حشر ونشر اور جنت وجہنم کا محققانہ ذکر ہے۔

۲۔ الارکان الاربعہ یا رسائل الارکان:۔ یہ عربی میں ہے اور اس میں حنفی نقطۂ نظر سے نماز، روزہ اور زکوٰۃ و حج کے مسائل کو بہت مدلل طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ متعدد بار چھپ چکی ہے اور اسی پر شاہ عبدالعزیز صاحب نے بحرالعلوم کے لقب سے نوازا۔

۳۔ تنزلات ستہ:۔ یہ تصوف پر فارسی میں ایک مختصر رسالہ ہے۔ جس میں مسئلہ تنزلات کی دلنشین وضاحت کی ہے۔

۴۔ تنویر المنار:۔ اصول فقہ میں حافظ الدین ابوالبرکات عبداللہ النسفی (م ۱۳۱۰ء) کی منار الانوار مشہور و متداول کتاب ہے۔ یہ اسی کی فارسی میں شرح ہے جو کئی بار چھپ چکی ہے۔

۵۔ حاشیہ علی الشمس البازغہ:۔ حکمت و فلسفہ میں ملا محمود جونپوری (م ۱۶۵۱ء) نے پہلے الحکمۃ البالغۃ لکھی۔ پھر خود ہی اس کی شرح الشمس البازغۃ کے نام سے لکھی جو مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے۔ یہ اسی شرح پر حاشیہ ہے۔

۶۔ شرح سلم العلوم:۔ منطق میں ملا محب اللہ بہاری (م ۱۷۰۷ء) کی سلم العلوم بہت مشہور اور عربی مدارس کے نصاب میں داخل ہے۔ یہ اسی کی شرح ہے جو بہت متداول ہے۔

۷۔ شرح مسلم الثبوت:۔ منطق میں سلم العلوم کی طرح اصول فقہ میں مسلم الثبوت بھی محب اللہ بہاری (م ۱۷۰۷ء) کی بہت ہی مقبول کتاب ہے اور متعدد علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں۔ مگر بحرالعلوم کی شرح بہت مشہور ہوئی اس کا تاریخی نام فواتح الرحموت ہے اور یہ مصر سے بھی شائع ہو چکی ہے۔

۸۔ العجالۃ النافعہ:۔ حکمت و فلسفہ میں بحرالعلوم کی بہت اہم کتاب ہے اور انھوں نے خود بھی اپنی تصانیف میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر جہاں تک مجھے علم ہے، یہ ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہے۔ البتہ اس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔

علمائے فرنگی محل کی تصانیف میں ملا بحرالعلوم کی تالیفات و تصنیفات کو ایک اہم و نمایاں مقام حاصل ہے اور چوں کہ ان کا بیشتر وقت درس و تدریس ہی میں گزرا اس لیے ان میں ایک معتدبہ تعداد درسیات کی شروح و تعلیقات اور حواشی پر مشتمل ہے جن میں بحرالعلوم کو ید طولیٰ حاصل ہے اور ان میں اصل نصاب کا اس طرح اختصار کے ساتھ حل ہوتا ہے جس کی نظیر ملنا دشوار ہے اور اوسط استعداد کا طالب علم ادق مسائل کو استاد کی مدد کے بغیر سمجھ لیتا ہے۔ عام طور پر متاخرین قدماء کی جا و بیجا حمایت کرتے ہیں اور ان کے مسائل و دلائل کی تشریح و توضیح پر ہی اکتفا کرتے ہیں مگر بحرالعلوم ان کی گرفت کرنے اور ان کی لغزشوں کو ظاہر کرنے میں تامل نہیں کرتے اور ان کے دلائل کی وضاحت کے ساتھ خود اپنے دلائل بھی پیش کرتے ہیں اور آسان مسئلہ کو پیچیدہ طرز ادا سے دشوار بنا دینے کے بجائے دشوار و پیچیدہ مسئلہ کی اس طرح تحلیل کرتے ہیں کہ اس کا رگ و ریشہ تک صاف نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے باوجود وہ تقلید جامد کے قائل

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

یونیورسٹی میں یوم سرسید: سابقہ روایات کے مطابق اس سال بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں یوم سرسید اپنے پورے تزک و احتشام کے ساتھ منایا گیا۔ تقریبات کی ابتدا بعد نماز فجر قرآن خوانی سے ہوئی۔

سرسید کی روح کو ایصال ثواب کے بعد وائس چانسلر جناب سیّد حامد نے ان کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔

اپنی درسگاہ کے عظیم بانی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے طلبا اور اساتذہ کا ملا جلا جلسہ ہوا۔ جس کی صدارت جناب سید حامد نے فرمائی۔ وسیع و عریض کینیڈی ہال سامعین سے پوری طرح بھرا تھا۔ حکومت ہند کے وزیر مسٹر شیو شنکر اور وزیر مملکت مسٹر خورشید عالم خاں بحیثیت مہمان خصوصی اس جلسہ میں شریک ہوئے اور اپنی تقاریر کے دوران سرسید کی حیات اور ان کے مشن پر روشنی ڈالی۔ دیگر مقررین میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر منظر عباس نقوی، مسٹر علی امیر صدر طلبہ یونین اور حافظ عرفان علی معتمد اعزازی طلبہ یونین کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ اس موقع پر طلبہ نے مسلسل ڈھائی گھنٹے تک سبھی تقریروں کو بڑی دلچسپی اور شائستگی سے سنا، اس بات کی ہر سمت تعریف کی گئی۔

جناب سیّد حامد اور جناب خورشید عالم خاں نے اپنی تقاریر کے دوران وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی، گیانی ذیل سنگھ جی، مسٹر شنکر آنند اور مسٹر شیو شنکر کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی بحالی کے معاملے میں ہر موقع پر مدد کی۔

جناب سید حامد نے خاص طور پر اس بات کا ذکر کیا کہ اس سلسلہ میں مسٹر شیو شنکر کا رول بیحد اہم اور قابل تعریف رہا اور انھوں نے ہر قدم پہ سچے دل سے ہماری مدد بھی کی اور رہنمائی بھی کی جس کے لیے ہم ہمیشہ ان کے ممنون رہیں گے۔

طلبہ یونین کے صدر مسٹر علی امیر نے اپنی تقریر میں وائس چانسلر جناب سیّد حامد کے اس اقدام کی پرزور الفاظ میں تعریف کی کہ انھوں نے سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق کو پھر سے جاری کیا ہے۔ جلسے سے قبل مسٹر خورشید عالم خاں نے سرسیّد سے متعلق کتابوں، تصویروں اور اہم دستاویزوں کی ایک نمائش کا افتتاح فرمایا۔

سہ پہر میں طلبہ یونین کی جانب سے مسٹر شیو شنکر اور مسٹر خورشید عالم خاں کا یونین بلڈنگ میں پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ صبح دونوں وزرا کی آمد پر یونیورسٹی رائڈنگ کلب کے ممبران نے اپنے روایتی انداز میں منٹو گیٹ پر ان کا خیر مقدم کیا۔

شام کے وقت یونیورسٹی قلعہ کے خوبصورت سبزہ زاروں اور سایہ دار درختوں کے درمیان شعبۂ حیوانات کے زیر اہتمام قائم کیے جانے والے "پرندوں کے گھر" کا افتتاح جناب سیّد حامد وائس چانسلر نے کیا۔

شب میں رہائشی ہالوں نے اپنے اپنے یہاں خصوصی ڈنر کا اہتمام کیا جس میں مہمانوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نوٹس

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اسٹیٹیوٹ کے اسٹیٹیوٹ ۱۴ کے تحت ایسے معطیوں میں سے یونیورسٹی کورٹ کی ممبری کے لیے دس نمائندوں کا انتخاب ہونا ہے جو ہندوستانی شہری ہوں اور جنہوں نے کم ازکم دس ہزار روپے نقد بطور عطیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دیے ہوں یا کم ازکم دس ہزار روپے کی جائیداد بطور عطیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام منتقل کی ہو۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۸۱ء کے ذریعہ ترمیم شدہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۲۰ء کے تحت یونیورسٹی کورٹ کی تشکیل کی جارہی ہے۔ معطیوں کا انتخاب نومبر ۱۹۸۲ء میں کرائے جانے کی تجویز ہے۔ جو لوگ مذکورہ اسٹیٹیوٹ کے تحت معطیوں کے انتخاب میں حصہ لینے کے مستحق ہیں وہ اپنے بارے میں مندرجہ ذیل تفصیلات بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ اس طرح روانہ فرمائیں کہ ۱۵ نومبر ۱۹۸۲ء تک یہاں پہنچ جائیں:۔

۱۔ نام

۲۔ پتہ

۳۔ عطیہ کی نوعیت (نقد یا بذریعہ منتقلی جائیداد)

۴۔ عطیہ جس وقت دیا گیا تھا اس وقت اس کی کیا قیمت تھی

۵۔ عطیہ دیے جانے کی تاریخ۔

معطی کے دستخط

اگر مقررہ مدت کے اندر یہ تفصیلات دستیاب نہ ہوئیں تو یہ سمجھ لیا جائے گا کہ یا تو معطی حیات نہیں ہیں یا اپنی قومیت تبدیل کر چکے ہیں اور معطیوں کے انتخاب میں حصہ لینے کے مستحق نہیں رہے ہیں اور اسی بنا پر مزید کارروائی کی جائے گی۔

جو لوگ اب معطی بننے اور کورٹ کے مجوزہ انتخاب میں حصہ لینے کے خواہش مند ہوں وہ دس ہزار روپے بطور عطیہ بھیج سکتے ہیں یا کم از کم دس ہزار روپے کی جائیداد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام منتقل کر سکتے ہیں۔ نقد عطیہ کی رقم بحق فائننس آفیسر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بذریعہ اکاؤنٹ پے ای" ڈرافٹ روانہ کی جا سکتی ہے۔

جن معطیوں کے عطیات ۱۵ر نومبر ۱۹۸۲ء کے بعد موصول ہوں گے وہ ۱۹۸۲ء میں ہونے والے یونیورسٹی کورٹ کے انتخابات میں بحیثیت امیدوار شرکت کرنے کے یا ووٹ دینے کے مستحق نہیں ہوں گے۔ بہر حال بعد میں ہونے والے انتخابات کی ووٹر لسٹ میں اُن کا نام درج رہے گا اور انھیں بحیثیت امیدوار انتخابات میں کھڑے ہونے کا حق بھی ہوگا۔

دستخط

محمود علی

رجسٹرار

۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۲ء

پبلشر قاضی معزالدین احمد نے لیتھو کلر پرنٹرس میں چھپوا کر صفدر منزل تار بنگلہ اے ایم یو علی گڑھ سے شائع کیا

۱۔ رانی لکشمی بائی ریجنل رورل بینک۔ جھانسی کو ۲۵ عدد افسر، ۲۵ عدد فیلڈ سپروائزر اور ۵۰ عدد کلرک اور کیشیر کی ضرورت ہے۔ ان جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔ امیدوار کو اترپردیش کا پیدائشی باشندہ ہونا ضروری ہے۔ تفصیلات کے لیے ایمپلائمنٹ نیوز مورخہ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۲ء ضرور ملاحظہ کیجیے

۲۔ بینکنگ سروس ریکروٹمنٹ بورڈ۔ دہلی کے تحت ۲۰۵ پروبیشنری افسر کی جگہوں کے لیے درخواستیں برائے امتحان درکار ہیں۔ امیدوار کو ۲۱ سے ۲۸ سال کے درمیان اور گریجویٹ ہونا چاہیے۔ ۴۰ روپے فیس کے ساتھ مکمل درخواست دفتر میں ۷ر نومبر تک ضرور پہنچ جانا چاہیے۔ تفصیلات کے لیے ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۳ر اکتوبر ۸۲ء ضرور ملاحظہ فرمایے۔

۳۔ بینکنگ سروس ریکروٹمنٹ بورڈ۔ ویسٹرن گروپ بمبئی کے تحت ۲۵۰ پروبیشنری افسر کی جگہوں کے لیے مقابلہ کا امتحان فروری ۸۳ء میں ہوگا۔ اس کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔ تفصیل کے لیے ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۴ر اکتوبر ۸۲ء ضرور دیکھیے۔

۴۔ بینکنگ سروس ریکروٹمنٹ بورڈ۔ سینٹرل گروپ بھوپال کے تحت ۶۵ عدد مینیجمنٹ اسپیشلسٹ ۲۰ عدد اکنامسٹ، ۴۰ عدد فائنانشیل اناسٹ، ۴۰ عدد آڈیٹرز اور ۱۰ عدد ہندی افسر کی جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔ دفتر میں مکمل درخواست پہونچنے کی آخری تاریخ ۲۰ر نومبر ۸۲ء ہے۔ تفصیل کے لیے ایمپلائمنٹ نیوز مورخہ ۲۳ر اکتوبر ۸۲ء ملاحظہ کیجیے

۵۔ پبلک سروس کمیشن اترپردیش کے تحت سپروائزر قانون گو مقابلے کا امتحان برائے سال ۸۲ء ماہ دسمبر میں منعقد ہو رہا ہے۔ کل ۹۰ جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں۔ متعلقہ دفتر میں مکمل درخواست پہنچنے کی آخری تاریخ ۸ر نومبر ۸۲ء ہے۔ تفصیل کے لیے ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۸۲ء ملاحظہ فرمایے۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱ ۱۶ نومبر ۱۹۸۲ء شمارہ ۲۰

"اسلام میں جو خوبی ہے وہ یہی ہے کہ اس کے تمام قانون قانونِ قدرت کے مطابق اور عملدرآمد کے لائق ہیں۔ رحم کی جگہ، جہاں تک قانونِ قدرت اجازت دیتا ہے، رحم ہے۔ معافی کی جگہ معافی ہے، بدلے کی جگہ بدلا ہے لڑائی کی جگہ لڑائی ہے، ملاپ کی جگہ ملاپ ہے اور یہی بڑی دلیل اس کی سچائی کی اور قانونِ قدرت کے بنانے والے کی طرف سے ہونے کی ہے۔"

سید احمد

(ایک تقریر جو جہاد کے متعلق کی گئی)

فہرست مضامین

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ ۲۰ روپے

بیرون ہند سے فی شمارہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ قاضی معزالدین احمد۔ صفدر منزل۔ تاربنگلہ۔

اے ایم یو۔ علی گڑھ یوپی ۔۲۰۲۰۰۱

پندرہ روزہ

تہذیب الاخلاق

علی گڑھ

مدیر: سید حامد
وائس چانسلر اے ایم یو

مدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

خطبۂ جمعہ

ایک مسلمان صحافی کا کسی غرض سے علی گڑھ آنا ہوا۔ اس روز جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز انھوں نے یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کی تو دیکھا کہ امام مسجد نے خطبہ عربی میں پڑھا۔ اُن کو خطبہ سن کر تعجب ہوا۔ انھوں نے کہا کہ اب تک مسلمانوں کی اِس عظیم دانش گاہ میں عربی خطبہ لوگوں کو ہر جمعہ کو سنایا جاتا ہے۔ کس کی سمجھ میں کیا آتا ہوگا۔ ؟

سنا ہے کچھ عرصہ ہوا حجاز سے عرب علماء کا ایک وفد ہندوستان آیا۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں امام کو عربی کا خطبہ پڑھتے سنا تو اپنے ہندوستانی رفقا سے تعجب سے پوچھا کہ یہ عربی کا خطبہ لوگوں کو کیوں سنایا جاتا ہے؟ ان کے رفقا کیا جواب دیتے۔ اُن سے یہی کہتے بنا کہ امام مسجد عام طور پر کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں اور ہر جمعہ کو اپنے مقتدیوں کو خطاب نہیں کر سکتے۔ حجازی وفد کے لوگ متعجب ہوئے۔ لیکن خاموش ہو گئے۔

عرصہ ہوا دینی حلقوں میں یہ سوال زیر بحث آیا تھا کہ جمعہ کا خطبہ اردو میں ہونا چاہیے عربی میں نہیں۔ حسب دستور اس کے جواز اور عدم جواز پر بحث چھڑی اور بے نتیجہ رہی۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ جو لوگ اردو میں خطبہ دینے کے مؤید تھے، انھوں نے جمعہ کے خطبے اردو میں طبع کرا کر تقسیم کیے اور یہ اپیل کی کہ جمعہ کے دن پہلا خطبہ ان خطبات میں سے پڑھ دیا جائے۔ ایک سلسلہ یہ بھی شروع ہوا کہ خطبہ کی اذان سے قبل پانچ دس منٹ پہلے ایک مختصر وعظ ہو جائے۔ مسئلہ کا یہ حل کچھ مقبول ہوا لیکن زیادہ نہیں۔ مسلمانوں میں کوئی دینی انجمن ایسی نہیں ہے جو ان کے اصلاحی کاموں میں دلچسپی لے۔ اصلاحی اقدامات کرے اور وہ مسلمانوں کو قبول بھی ہوں۔ علماء کی ایک تنظیم ضرور ہے لیکن وہ دینی خدمات سے زیادہ سیاسی اور سماجی کام کرتی ہے اور وہ بھی گاہے گاہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم جن کو مسلمان ابھی بھولے نہ ہوں گے، بڑے روشن خیال اور بڑے روشن ضمیر عالم دین تھے۔ انھوں نے اردو میں خطبہ کا سلسلہ شروع کیا وہ عیدین کی نماز کلکتہ کے مشہور میدان میں پڑھایا کرتے تھے اور خطبہ اردو میں دیتے تھے۔ یہ سلسلہ برسوں رہا ۱۹۳۸-۳۹ء میں مولانا نے اپنے محلہ کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانے اور خطبہ اردو میں دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا پہلا خطبہ اردو میں دیتے تھے۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ خطبہ کا وقت

کم ہوتا ہے۔ یہ فرماکر وہ ہمیشہ خطبہ کے لئے [illegible] کسی مسئلہ کا انتخاب کرتے اور بڑی خوبی سے اس کی وضاحت [illegible] میں کر دیتے۔ وہ سیاسی لیڈر تھے لیکن جمعہ کے خطبہ میں کبھی کوئی سیاسی مسئلہ نہ چھیڑتے۔ نہ کسی اختلافی مسئلہ پر بولتے افسوس کہ یہ سلسلہ مولانا کی صحت کی خرابی اور سیاسی مصروفیات کی بنا پر پابندی سے جاری نہ رہا۔

مولانا نے جس مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھانی شروع کی وہ ان کے مکان کے بہت قریب تھی اور اس علاقہ میں ایک ہی مسجد تھی۔ مسجد کے امام کا بیان ہے کہ ایک بار مولانا جمعہ کے روز نماز جمعہ کے لیے تشریف لائے۔ مسجد کے امام نے اُن سے نماز پڑھانے کی درخواست کی تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔

جس روز مولانا نے پہلی بار وہاں نماز پڑھائی، مسجد میں بہت تھوڑی سی تعداد میں نمازی تھے لیکن یہ خبر کہ مولانا نماز پڑھاتے اور خطبہ اردو میں دیتے ہیں مسلم محلوں میں پھیل گئی اور پھر نمازیوں کی تعداد بڑھنی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ سڑک پر صف بندی کی نوبت آگئی۔ لیکن افسوس کہ یہ سلسلہ جلد منقطع ہو گیا۔

مسلم معاشرہ کی بنیاد گو ایک دین پر ہے لیکن۔ مسلمانوں کی زندگی پر اثرات عہدِ وسطیٰ کی قوموں کی تہذیب کے ہیں۔ غالباً یہی سبب ہے کہ لوگ دین کی روح اور مقصد کو اہمیت کم دیتے ہیں اور اس جمود کا شکار رہتے ہیں جو اس عہد کی خصوصیت ہے اور زندگی میں تبدیلی اور اصلاح آسانی سے قبول نہیں کرتے۔

دین زندگی کو بدلنا چاہتا ہے۔ تہذیب و معاشرت کی عادتیں جمود پیدا کرتی ہیں۔ مسلم معاشرہ میں یہ کشمکش صدیوں سے جاری ہے۔ عربوں میں اب تک قومی عصبیت ہے۔ دین کی تعلیم خواہ کچھ ہی ہو۔

ہندوستان میں مائکروفون کا استعمال شروع ہوا لیکن یہ آلہ مسجد میں برسوں داخل نہ ہوا۔ اب صرف اذان کے لیے مائک کا جواز ہے۔ نماز مائک پر ادا کرنا اب بھی ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں نماز ادا کرنے کے دوران بھی مائک استعمال ہوتا ہے۔ نمازی امام کی آواز سنتے ہیں تو کچھ نہ کچھ استفادہ بھی کرتے ہیں ۔ خطبہ جمعہ عبادت کا جز ہے اس کا مقصد نمازیوں کی اصلاح ہے لیکن اس مقصد کی اہمیت کا احساس ہی نہیں۔ توجہ ایک رسم ادا کرنے کی طرف ہے وہ ہوتی جاتی ہے سہ "خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات"۔ اقبال نے کس زندگی کو کہا ہے؟

ق م ا

" اسلامی جذبات کو ابھارنے، ایمان کو تازہ رکھنے اور تذکیر و یاد دہانی کے فریضہ کو تسلسل اور ترتیب کے ساتھ انجام دینے کے لیے جمعہ کا خطبہ انتہائی موثر اور منظم ذریعہ ہے۔ فطری انداز میں ہر ہفتے مسلمانوں کو ان کے فرائض یاد دلانے، دین کے تقاضے سمجھانے اور اسلام کے لیے کچھ کرنے کی تڑپ پیدا کرنے کے لیے ایک ایسا دینی انتظام ہے، جس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جا سکتی لیکن اس سے خاطر خواہ فائدہ آپ اسی وقت اٹھا سکتے ہیں جب آپ سامعین کو اُن کی اپنی زبان میں ہی خطاب کریں۔"

ماخوذ از
کتاب " آداب زندگی
مولفہ محمد یوسف اصلاحی

قاضی معزالدین احمد

فرقہ وارانہ فسادات

یہ کون نہیں جانتا کہ انگریزوں نے اپنی حکومت کو مستحکم کرنے کے لیے یہ محسوس کیا کہ ہندوستان کے بسنے والوں میں اختلافات پیدا کیے جائیں۔ یہاں قومی اتحاد نہ ہونے پائے اور تہذیب و کلچر ایک نہ ہو۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے ہندوستان کی ماضی کی تاریخ کو مسخ کیا گیا اور حکومت کا طریقہ کار ایسا رکھا گیا کہ جس سے ہندو مسلم اختلافات پیدا ہوں اور بڑھتے رہیں۔ چنانچہ پہلا قدم یہ اٹھایا کہ بنگال میں زمین داروں کے کارندوں کو جو عام طور پر غیر مسلم تھے آراضی کا مالک قرار دیدیا۔ مسلمان بے سہارا ہوگئے۔ پھر مسلمانوں پر نظر کرم کی اور بنگال تقسیم کر دیا۔ مشرقی بنگال جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اس کو مغربی بنگال سے علیحدہ کر کے مسلمانوں کی ہمت افزائی کی یہ ہندو مسلمان اختلافات بڑھانے کے لیے ایک اور قدم تھا۔ ہندوؤں میں بیداری پیدا ہوئی تو مسلمانوں کو ابھارا اور ان کے ہمدرد بن گئے پہلے ہندوؤں کو سرکاری نوکریاں دیں۔ پھر مسلمانوں کو بخشیں۔ چونکہ ملک میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لیے ان کو ناخوش کیسے کیا جاتا۔ کبھی ان کی ہمت بڑھائی تو کبھی مسلمانوں کی۔ مسلمان کمزور اور اقلیت میں ہیں اس لیے توجہ انگریزی سرکار کی ہندوؤں کی طرف زیادہ رہی۔ اپنے وفاداروں کا ایک گروہ مسلمانوں میں رکھا۔ ان کو بہلانے کے لیے یہی گروہ کافی تھا۔ اس کے ذریعہ ان کو خوب استعمال کیا۔ عام ہندوؤں پر یہ اثر رہا کہ سرکار تو مسلمانوں کی طرف جھکی ہوئی ہے۔

تحریک آزادی شروع ہوئی تو فسادات شروع ہوگئے جنگ عظیم کا اعلان ہوا تو اس وقت ملک میں امن کی ضرورت تھی اور ہند مسلمانوں کی ہمدردی بھی حاصل کرنا تھی۔ اس لیے فسادات ہونا بند ہوگئے۔ جنگ کے بعد قومی تحریک کی رفتار تیز ہوئی تو فسادات کی شدت بڑھ گئی۔ گائے کے ذبیحہ اور مسجد کے سامنے نماز کے وقت باجہ بجانے کو فسادات کا سبب قرار دیا گیا۔ ملک کی فضا اس قدر خراب کی گئی کہ خاص و عام فرقہ وارانہ تلخی کا شکار ہوگئے۔ اسی فضا میں تحریک آزادی جاری رہی اور اسی فضا میں ملک آزاد ہوا۔ لیڈر یہ کہتے رہے کہ ہندوستان کی تاریخ اس طرح لکھی گئی کہ ہندو مسلم اختلافات پیدا ہوگئے۔ لیکن کسی نے کوئی قدم ایسا نہ اٹھایا کہ اس تاریخ کی اصلاح ہوتی۔ تحریک آزادی کے دوران اچھوت ادھار کی کوششیں تو بہت ہوئیں لیکن کانگریس نے کوئی بورڈ یا کوئی کمیٹی ایسی مقرر نہ کی جو تاریخ ہند مرتب کرتی اور انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخ کی اصلاح کرتی۔

ہندوستان کو آزاد ہوتے ۳۵ سال ہو چکے ہیں اب تک ہندو مسلم تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لیے کوئی موثر قدم نہ اٹھایا گیا۔ رسمی باتیں بہت ہوئیں۔ فرقہ وارانہ منافرت پیدا کرنے والے آزادی کے ساتھ اپنی کوششوں میں مصروف ہیں۔ تاریخ ہند آج بھی وہی پڑھائی جاتی ہے جس کو ہندو مسلم اختلافات کا سبب بتایا جاتا رہا۔ اقلیت کے وجود کو اکثریت کے مفاد اور ملکی سالمیت کے لیے خطرہ کہہ کر سیدھے سادے عوام کو بھڑکایا جاتا ہے۔ کسی پر کوئی پابندی عاید نہیں ہوتی۔ صحافی بیٹھیں لکھیے تو فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے جرم میں ماخوذ ہو جاییے۔ فرقہ وارانہ

پروپیگنڈے نے پورے ملک میں تعصبات بڑھا رکھے ہیں اور ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ حکومت کے کارندوں تک کا ذہن صاف نہیں رہا۔ پھر مسلمانوں کی نعرہ بازی اور جوشیلی باتوں سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی اور پھیلتی ہیں ان کو کون سمجھائے۔

ان حالات میں فرقہ وارانہ فسادات کیسے کم ہوں؟ ملک کی فضا کیسے خوشگوار ہو؟ اور کون ہے جو فسادات بند کرائے؟ اور یہ کیسے ہو کہ اکثریت کے عوام اس غلط پروپیگنڈے کا شکار نہ ہوں جو ان میں پھیلایا جاتا ہے اور مسلمانوں میں کون یہ شعور پیدا کرائے کہ وہ جوش سے کم ہوش اور عقل سے زیادہ کام لیا کریں۔

ملک میں فرقہ وارانہ صورتِ حال کچھ بھی ہو اور حالات کیسے ہی خراب کیوں نہ ہوں، ملک کے دانشوروں اور حکومتِ ہند کا یہ فرض ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات بند کرائے اور اقلیتوں کو سکون سے زندگی گزارنے کے لیے ملک کی فضا ہموار کرے۔

ملک میں جہاں آر ایس ایس ہے وہاں انصاف پسند شریف ہندو اور ایک جمہوری حکومت بھی تو ہے۔ کیا یہ ان کا فرض نہیں ہے کہ وہ اقلیتوں کے جان و مال کی حفاظت کا بندوبست کریں اور ذمہ داری لیں۔

ملک میں جو فضا پیدا کی گئی ہے جس کی ذمہ دار آر ایس ایس ہے، اس نے لوگوں کے دلوں میں انسان کی جان کا احترام باقی نہیں رکھا۔ آج کل عام طور پر نوجوان ہتھیار بند پھرتے ہیں اور معمولی بات پر آمادۂ فساد ہو جاتے ہیں۔ چاقو اور پستول استعمال کرتے ہیں۔ سوال مسلمان کا نہیں اس کے خلاف تو منظم فساد ہوتا ہے، شریف ہندو بھی ان نوجوانوں کے حملے سے نہیں بچتے۔

مہاتما گاندھی نے اہنسا کا سبق پڑھایا۔ لوگوں پر ان کی تعلیمات کا اثر نہیں۔ وہ گاندھی جی کے قاتل کے

ملا بکھیش میں۔ ان حالات کی ذمہ داری حکومت کی ہے۔ اگر حکومت نے اب بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا اور ملک کی فضا بدستور خراب رہی تو پھر وقت آئے گا کہ ہر شہری کی جان ہر وقت خطرے میں ہو گی اور رات کی نیند اور دن کا چین حرام ہو جائے گا۔

بقیہ "مسلم یونیورسٹی کے شب و روز"

امراضِ چشم پر سمپوزیم

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ آف آفتھلمولاجی میں امراضِ چشم سے متعلق اہم موضوع پر ۱۲ دسمبر تک ایک سمپوزیم کے انعقاد کی تیاری کی جا رہی ہے۔

اس میں مقامی ماہرین اور ریسرچ اسکالرس کے علاوہ ہندوستان کے کم از کم بیس مشہور و معروف ماہرین امراضِ چشم شرکت کریں گے

اس شعبہ سے متعلق حکومتِ ہند کے مشیر جناب ڈاکٹر مدن موہن سمپوزیم کا افتتاح فرمائیں گے۔ اس کا اہتمام یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے اشتراک سے کیا جا رہا ہے۔

بقیہ مضمون چہرہ نوائے لاکھ ......

کے چاروں طرف اردو زبان کو گلاب جیسی شگفتگی عطا کرنے والے کی یاد دلاتے رہیں گے۔ ادویہ سازی کا شعبہ اور جدید جراحی میں استعمال ہونے والے Plates و Rods بنانے کا شعبہ میڈیکل کالج میں ناگزیر اضافے ہیں جن کی جانب توجہ مبذول ہونا ضروری ہے۔

یومِ سرسیّد پر جناب سیّد حامد کی تقریر

کینڈی ہال میں منعقدہ جلسے میں جناب سید حامد وائس چانسلر و مدیر تہذیب الاخلاق کی تقریر

سید احمد خاں علیہ الرحمہ کی شخصیت ہشت پہلو تھی۔ انھوں نے اپنی ذات میں بہت سی حیثیتوں کو جمع کر لیا ہے اور ہر حیثیت میں امتیاز اور اختصاص حاصل کیا تھا۔

اِس وقت میں اُن کے صرف ایک وصف کا ذکر کروں گا۔ یہ تھی اُن کی فراست اور حکمتِ عملی، ہر مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر اور تحقیق کی عادت۔ اِس میں وہ اِسلام سے بہت قریب تھے اور ہندوستانی مسلمانوں نے بہت دور۔ یہ کہنا چنداں ضروری نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں نے جذبات کو اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔ ذرا سی تحریک ہوئی اور وہ جذبات کی رَو میں بہہ گئے۔ جذبات سے عقل کا آئینہ دھندلا جاتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ جذباتی انسان کے لیے نفع و نقصان اور دوست دشمن کی شناخت بھی دشوار ہوتی ہے۔ ایسے اِنسان کو ہر وقت بہکایا جا سکتا ہے۔ وہ جذبات کے سیلاب میں بہتا ہے اور عقل پر ضرب نہیں پڑنے دیتا۔ وہ سوچ کر نہ منصوبہ بنا سکتا ہے، نہ لگ کر محنت کر سکتا ہے جذبہ کی رو میں اس سے وہ باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جن سے اسے بالآخر نقصان ہی پہنچتا ہے اور جن پر اسے اکثر پشیماں ہونا پڑتا ہے۔ جذباتی آدمی کی شخصیت، وزن، وقار، ریاضت اور استقامت سے محروم رہتی ہے۔ وہ شعر کہہ سکتا ہے، شاعری سے حظ اندوز ہو سکتا ہے لیکن جستجو اور تحقیق، سائنس اور علم اس کی دسترس سے باہر رہتے ہیں۔

سیّد احمد خاں نے سائنسی اور علمی طرزِ فکر پر زور دیا۔ اس سے ان کا مقصد نہ صرف یہ تھا کہ مسلمان جدید علوم سے بہرہ ور اور زمانے سے ہم آہنگ ہو سکیں بلکہ یہ بھی کہ ان میں سوجھ بوجھ کا مادہ اور نفع نقصان اور اچھائی برائی کو پرکھنے کی صفت پیدا ہو سکے۔ وہ جوش کی ناہموار زمین سے نکل کر ہوش کی ہموار شاہراہ پر قدم رکھ سکیں۔

افسوس یہ ہے کہ اِس بڑے مصلح کو اپنے اِس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی اور ہندوستانی مسلمان اپنے آپ کو جذبات کے شکنجے سے نہ نکال سکے۔ انھوں نے عقل اور تحقیق، جستجو اور تفتیش اور غور و خوض کو

نا

چند قدم دور کی چیز بھی صاف نظر نہیں آتی۔ انھوں نے دلفریب ابہام اور عقل آشوب جذبات اور نعروں سے ناتہ جوڑلیا اور بقا اور ترقی اور روشنی کو پسِ پشت ڈال دیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمت اور ریاضت کے علاوہ ایک بہت بڑا سبق جو ہم سید احمد خاں سے سے سکتے ہیں وہ ہر بات اور ہر مسئلہ کو ٹھنڈے دل سے عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی عادت ہے۔

چوں کہ ہم نے یہ سبق سیکھنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے سرسید کو چھوڑ کر ہمارے بیشتر رہنما جذبات میں بہتے بھی رہے اور جذبات سے اپیل کرتے رہے۔ جذبات کا تسلط خامکاری کی دلیل ہے۔ ایسا انسان ہمیشہ دوسروں سے دھوکا کھاتا ہے اور اکثر خود کو دھوکا دیتا بھی ہے۔

سید احمد خاں کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا کہ جذبات سے انسان عاری ہو جائے۔ جذبات ہی سے زندگی میں حرکت اور آب و رنگ آتا ہے۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ جذبات پر انسان حکومت کرے، ان کا محکوم نہ بنے۔ انھوں نے ایک مرکزی جذبے سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ قوم کی محبت اور اس کی ترقی کی آرزو اس کے بعد انھوں نے عقل سے پوچھا کہ حصول مقصد کے لیے کیا کیا جائے اور عقل کی رہبری میں انھوں نے منزل طے کی۔

اقبال نے جو یہ کہا ہے:

وہی سجدہ ہے لائقِ احترام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

اس کا مفہوم بھی سید عالی گہر کے مسلک سے ملتا جلتا ہے کہ ایک شریف جذبہ ایک اعلیٰ مقصد کو زندگی بنا لو اور عقل کی روشنی میں اس کے حصول کی تمام عمر کوشش کرتے رہو۔

بس میرے عزیزو! چھوٹا منہ بڑی بات، میری گزارش بھی تم سے وہی ہے جو اس کے بانی نے اپنی قوم سے کی تھی کہ مایوسی اور بے حسی، غم و غصہ، قدامت پرستی اور جمود سے ناتہ توڑ کر جستجو، تحقیق اور زمانہ سے ہم آہنگی اور شرافت سے دل بستگی اور عقل کی روشنی میں مسائل کو جانچنے کی عادت ڈالیں۔ جذبات کو ایک طرف عقل اور دوسری طرف ضمیر کو قابو میں رکھیں۔ انفرادی مفاد کو اجتماعی مفاد پر ترجیح دینا ترک کر دیں۔

محمد اللہ خاں

مشرق و مغرب کا تہذیبی لین دین

"مشرق، مشرق ہے اور مغرب، مغرب۔ یہ دونوں آپس میں ملے ہیں اور نہ مل سکتے ہیں"۔ یہ مقولہ بہت پرانا ہے۔ شاید صدیوں پرانا۔ جو ابھی تک دہرایا جا رہا ہے اور نہ جانے کب تک دہرایا جاتا رہے گا۔

مشرق و مغرب کی "سمت" اور "محل وقوع" کے علاوہ تہذیب و تمدن اور افکار و خیالات کے اعتبار سے بھی تقسیم کی جاتی ہے۔ جہاں تک سمت یا محل وقوع کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ اس میں کوئی ردّ و بدل ہو سکتا ہے اور نہ یہ دونوں حصے آپس میں مل سکتے ہیں۔ مشرق ابدالآباد تک اپنی جگہ رہے گا اور مغرب اپنی جگہ۔ لیکن افکار و خیالات اور طرز معاشرت جامد چیزیں نہیں ہیں۔ اُن میں تبدیلی بھی ہوتی ہے اور باہمی لین دین بھی۔ یعنی اوپر جس مقولہ کا ذکر کیا گیا ہے، اس اعتبار سے وہ بالکل غیر حقیقی اور واقعات کے خلاف ہے اور یہ مقولہ اس عصبیت کا مظہر ہے جو تاریخ کے تقریباً ہر دور میں مشرق کو مغرب سے اور مغرب کو مشرق سے رہی ہے اور آج بھی ہے اہل مشرق اپنے تہذیب و تمدن اور افکار و خیالات کو بغیر کسی معقول وجہ کے اہل مغرب سے ارفع و اعلیٰ اور اہل مغرب اپنی معاشرت اور نظریات کو اہل مشرق سے بلند و بالا سمجھتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک قائم ہے اور نہ جانے کب تک قائم رہے گا۔ اس سلسلہ میں مشرقی اور مغربی حضرات اتنے آگے چلے گئے ہیں کہ اپنے بُرے سے بُرے طور طریقوں کو بھی اپنے مدِ مقابل سے بہرحال بہتر سمجھتے اور اس کے لیے عجیب و غریب دلیلیں اور تاویلیں پیش کرتے ہیں۔ جب کہ یہ ساری باتیں حقیقت کے خلاف ہیں۔

مشرق اور مغرب کی سماجی اور تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرنے اور گہری نظر سے جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں مشرق و مغرب کے درمیان میں افکار و نظریات اور تمدنی قدروں کا لین دین ہوتا رہا ہے، آج بھی ہو رہا ہے اور کل بھی ہوگا۔

دنیا کے ہر خطہ کی تہذیب اور افکار و نظریات پر وہاں کی آب و ہوا، جائے وقوع، سیاسی اور سماجی حالات اور مختلف عوامل کا اثر پڑتا ہے۔ اسی اعتبار سے مختلف خطوں کی تہذیبوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور ہر خطہ کی تہذیب میں کچھ ایسی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں کہ جس کی وجہ سے اُس کا تمدن دوسرے خطوں کے تمدن سے ممتاز ہو کر اس خطہ کے عوام کی شناخت بن جاتا ہے۔

اس انداز کا تہذیبی امتیاز انسانی سماج کو بڑے بڑے گروہوں میں بھی تقسیم کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے

دائروں میں بھی۔ مثلاً ہندوستان کے مختلف حصوں کی تہذیب وتمدن میں نمایاں فرق ہے۔ جیسے بنگال کا تمدن، گجرات کا تمدن، پنجاب کا تمدن۔ لیکن ہندوستان کا ایک مجموعی تمدن بھی ہے، جسے ہم ہندوستانی تہذیب کہتے ہیں۔ اس سے وسیع دائرہ میں پورے ایشیا کی اپنی مخصوص تہذیب ہے اسی طرح یورپ کے مختلف ملکوں اور خطوں کی علیحدہ علیحدہ تہذیبیں ہوتے ہوئے بھی پورے یورپ کی ایک مجموعی تہذیب ہے جسے یورپی تہذیب کہا جاتا ہے۔

• اسی انداز پر مشرق اور مغرب کی تہذیبیں ہیں جو بہت سے عناصر سے مل کر بنی اور پرورش ہوئی ہیں۔ ان دونوں بڑی تہذیبوں کی کچھ خصوصیات اور امتیازات ہیں جو تاریخی عوامل کی دین ہیں۔ ان دونوں تہذیبوں نے تاریخ کے ہر دور میں ایک دوسری کو متاثر کیا۔ کچھ لیا اور کچھ دیا ہے۔ اس کے باوجود اپنے اپنے علاقوں کے محلِ وقوع آب وہوا، اور تاریخی عوامل کی بنیاد پر دنیا کی ان دونوں بڑی تہذیبوں کی کچھ نمایاں خصوصیات ایسی رہی ہیں کہ جو ان کی بنیادیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ مثلاً مشرق باسیوں کی غیرت، ایثار، اپنی بات پر مر مٹنے کا جذبہ، قناعت، رحمدلی، سماجی ضابطوں کا لحاظ، دوسروں کو آرام پہنچانے کے لیے خود تکلیف اٹھا لینے، بلکہ خطرات مول لے لینے کا حوصلہ۔

اسی طرح وقت کی قدروقیمت کا بھرپور احساس، نظم وضبط۔ اپنی ذمہ داریوں کو کسی دباؤ کے بغیر پورا کرنے کا احساس اور اس کی ہر ممکن کوشش، اپنی عقل ومحنت کی بنیاد پر آگے بڑھنے کا جذبہ، خوب سے خوب تر کی جستجو اور اس کے حصول کے لیے مر مٹنے کا حوصلہ یورپی باشندوں کی وہ خصوصیات ہیں جو ان کی تہذیب کی ہمیشہ آبیاری کرتی رہی ہیں۔

ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ مشرق اور مغرب کے باسیوں کی کچھ اجتماعی کمزوریاں بھی ہیں جنھیں کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً مشرقی عوام کی بد وقت کی ناقدری، سستی وکاہلی، محنت کے بغیر بلند مقام حاصل کرنے کی آرزو، کسی خصوصیت یا امتیاز کے بغیر خود کو دوسروں سے بلند سمجھنا اور اس پر بلا وجہ اصرار۔

اسی طرح مغربی دنیا کے باشندوں کی بری سے بری خواہشوں کو بھی بلا جھجک پورا کر لینے کی امنگ، حرص کے ڈانڈے بے غیرتی سے مل جاتے ہیں۔ تہذیب تمدن کی خود ساختہ رنگین پردوں میں چھپ کر دوسری قوموں کو شدید سے شدید عذاب میں بلا جھجک مبتلا کر دینے سے ذرا بھی نہ چوکنا۔ نفسانی خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے سماجی قدروں کو پامال کر دینا۔ ذہن میں قناعت کا تصور بھی نہ رکھنا —— اسی قسم کی اور بھی بہت سی کمزوریاں ہیں جن میں مغربی دنیا کے باشندے مبتلا ہیں۔

مشرق ومغرب کی جن خصوصیتوں اور کمزوریوں کا میں نے مختصر الفاظ میں ذکر کیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مشرق ومغرب کا ہر باشندہ ان خصوصیات کا حامل اور ان کمزوریوں میں مبتلا ہے۔ لیکن ہاں دنیا کے ان دو بڑے خطوں کے باشندوں کا غالب حصہ ان کا حامل ہے۔ اور اسی لیے وہ توانائیاں اور کمزوریاں ان علاقوں کے اجتماعی مزاج کا جزو بن گئی ہیں اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ وہ توانائیاں اور کمزوریاں مشرق سے مغرب میں اور مغرب سے مشرق میں منتقل ہوتی رہتی ہیں اور آج کل کے تیز رفتار دور میں جبکہ صبا رفتار ٹرینیں، موٹریں، ہوائی اور بحری جہاز دنیا کے کونے کونے سے لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ

بہت تیزی سے منتقل کر رہے ہیں اور مہینوں کے سفر گھنٹوں میں طے کیے جانے لگے ہیں۔ ایک دوسرے کی اچھائیوں اور برائیوں سے متاثر ہونے کا عمل بھی تیز ہو گیا ہے۔ اور پچھلے دور میں جو تبدیلیاں صدیوں میں ہوتی تھیں وہ اب سالوں بلکہ مہینوں میں ہونے لگی ہیں۔

دنیا بھر کے باشندے، ایک دوسرے کے خیالات، تصورات، عملی اقدامات، تہذیب و تمدن اور طرزِ معاشرت کو انتہائی گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے اس کا دقیق نظر سے مطالعہ کر رہے ہیں اس مقصد کے لیے ایک دوسرے سے مسلسل مل رہے ہیں۔ افکار و خیالات کا باہمی تبادلہ کرنے کے لیے دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں سیمینار، اسٹڈی سرکل اور سمپوزیم منعقد کیے جا رہے ہیں کہ جن کے ذریعہ مشرق و مغرب ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مشرق و مغرب کے شہری اس فضا سے وسیع پیمانہ پر بھرپور فوائد حاصل کریں اور ہر فریق ہر قسم کی عصبیت، بیجا تفاخر اور "ہم چو من دیگرے نیست" کے جذبات سے دامن بچا کر دوسرے فریق کی خصوصیات کو کھلے دل سے قبول کرے اور ان کی روشنی میں اپنی کمزوریوں کو رفع کرنے کی کوشش کرے تو مشرق و مغرب کی تقدیر بدل سکتی ہے۔ مثلاً اہلِ مشرق مغرب والوں کا نظم و ضبط، وقت کی قدر، ذمہ داری کا بھرپور احساس، مفید قومی ہمدردی اور خوب سے خوب تر کی آرزو کو اپنی زندگی کا شعار بنالیں تو ان کی سستی و کاہلی، بدنظمی، وقت کو برباد کر دینے کی خطرناک عادت، محنت و مشقت اور عقل و خرد کی بنیاد پر ترقی کرنے کے بجائے ہیر پھیر کے ذریعہ بلند مقامات حاصل کرنے کے ناقص تصورات یقیناً بدل جائیں گے۔

اسی طرح اہلِ مغرب، مشرق کی غیرت، سماجی قدروں کا احترام، قناعت، ایثار اور اس انداز کی دوسری توانا اور مفید خوبیوں کو اپنالیں تو ان کی بہت سی خامیاں دور ہو سکتی ہیں اور اس طرح مشرق و مغرب کی خصوصیات یکجا ہو کر ایک نئے انسان کو جنم دے سکتی ہیں جو موجودہ انسان سے یقیناً بہتر ہوگا۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ مشرق مغرب کی ان خوبیوں کو اپنانے کے بجائے کہ جو مغرب کی مادی قوت اور اس کی تیز رفتار ترقیوں کی بنیاد ہیں ان خامیوں بلکہ خرافات کو سینہ سے لگا رہا ہے کہ جنھوں نے مغربی اقوام کو شدید پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ جیسے بے ڈھنگی فیشن پرستی، بدترین عیاشی، [illegible] بے راہ روی خاندانی نظام کی بربادی اور اس [illegible] کی دوسری بری عادتیں۔

اسی طرح مشرق کی سستی و کاہلی، زندگی کے بنیادی تقاضوں سے فرار، عقل و محنت کو ترقی کا ذریعہ بنانے کے بجائے ہیر پھیر سے کام نکالنے کی بدبختانہ عادتیں مغرب کو پسند آ رہی ہیں اور اس خطے کے نوجوان بڑی تیزی سے ان بری عادتوں کو اختیار کر کے زندگی کے بنیادی مسائل کو نظر انداز کرتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ نشہ آور چیزوں کا خالص مشرقی انداز میں بے تحاشا استعمال اور ہپّی ازم کو جو انسان کو حیوان کے درجہ تک پہونچا دیتا ہے۔ اس گہرے تاثر کا لازمی نتیجہ اور وہ مصیبتیں ہیں کہ جن میں مغربی نوجوان کثیر تعداد میں مبتلا ہو چکے ہیں اور ان طور طریقوں سے اپنے پورے سماج کو کمزور کر رہے ہیں۔

مشرق و مغرب کا یہ تہذیبی لین دین اسی انداز پر جاری رہا تو دنیا کا مستقبل بہت مخدوش ہو جائے گا۔

٭٭٭

مولانا محمد اسماعیل شہید دہلوی کا ایک واقعہ

ہندوستان میں آٹھ سو سال مختلف مسلم خاندانوں کی حکومت رہی ہے۔ شاہی دربار میں علماء بھی ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے فتوے دیتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہے اس وقت بڑے حق گو علماء بھی ہوتے تھے۔ وہ عام طور پر دربار سے دور رہتے تھے اور اگر دربار سے ان کا تعلق ہوتا تھا تو بھی حق گوئی سے وہ کبھی گریز نہ کرتے تھے۔ مغلیہ حکومت کے آخری دور میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی خاندان کی نمایاں حیثیت تھی۔ شاہ اسماعیل شہید کا اسی خاندان سے تعلق تھا۔ شاہ صاحب بالاکوٹ کی سرحد پر جہاد میں شہید ہوئے۔

قاضی معز الدین احمد

حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید جامع مسجد دہلی میں مع اپنے عقیدت مندوں و شاگردوں کے وضو کے لیے حوض کے پاس تشریف رکھتے تھے کہ اتنے میں "اکبر شاہ ثانی" کی زیارت کے لیے جامع مسجد کے ایک گوشہ سے کچھ چیزیں تبرکات کے نام پر برآمد کی گئیں۔ ان غیر مستند تبرکات کو مجاورین ایک مقدس نمائش کی شکل سے لال قلعہ میں زیارت کے لیے ہمیشہ لے جایا کرتے تھے چونکہ ان تبرکات کی کوئی حقیقت حدیث سے ثابت نہ تھی۔ اس لیے باوجود یہ کہ لوگ سروقد باادب کھڑے ہوئے مگر حضرت مولانا مع اپنے حلقہ ارادت کے اسی حوض پر بدستور بیٹھے رہے۔

مجاورین ان رسمی تبرکات کو لے کر اکبر شاہ ثانی کے حضور میں پہنچے شاہ اور دربار کے وزراء و امراء نے آکر سروقد ادب ہو کر تعظیم کی اور زیارت سے مشرف ہوئے۔ اسی اثنا مجاورین نے شاہ کی عقیدت مندی کے پیش نظر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا بادشاہ نے جب دریافت کیا کہ آپ لوگ کیوں روتے ہیں؟ کیا معاملہ پیش آیا؟ تو اور بھی بناوٹ کے ساتھ رونا شروع کیا۔ آخر شاہ بادشاہ کے دوبارہ سہ بارہ سوال پر بتلایا کہ حضور بادشاہ سلامت! ان تبرکات کی تو از حد توہین ہو گئی۔ پوچھا کہ وہ کیسے؟ مجاورین نے کہا کہ جب تبرکات آپ کے حضور میں لائے جا رہے تھے تو ساری خدائی نے تعظیم دی۔ مگر شاہ عبدالعزیز کے خاندان میں ایک شخص مولوی محمد اسماعیل نامی ہیں نہ انھوں نے تعظیم دی نہ ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کے شاگردوں نے تعظیم دی۔ بادشاہ نے مجاورین کو تسلی دی کہ اس معاملہ کو سمجھ کر اس کا تدارک کیا جائے گا چنانچہ بادشاہ نے شاہی ہرکارہ کے ذریعے خط بھیج کر مولانا کو طلب کیا جس وقت دربار میں سے طلبی کا خط چوبدار کی معرفت آیا۔ تو خاندان والوں نے باہم مشورہ کیا کہ اس کی اطلاع

انگریز ریزیڈنٹ کو کر دی جائے تاکہ بادشاہ کوئی گزند نہ پہونچا سکے کیوں کہ اس زمانہ میں اس کی سلطنت برائے نام تھی اور انگریز کمپنی کے ریزیڈنٹ عملاً حاکم تھے۔ بنا بریں بادشاہ کسی کو قتل کرنے یا پھانسی دینے یا کسی کو جاگیر/وظیفہ دینے کے اہم معاملے میں تنہا مختار نہ تھا۔ مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اس کی اطلاع کی کوئی ضرورت نہیں اور یہ آیتِ کریمہ تلاوت کی۔ قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا وھو مولانا وعلیہ فلیتوکل المومنون (آیۃ) یعنی جس قدر ضرر و تکلیف مقدر ہے وہ چیز پہنچ کر رہے گی۔ وہ ہم سب کا آقا ہے اور اس پر ایمان والوں کو بھروسہ اور توکل کرنا چاہیے۔ چنانچہ مولانا نے بلا کسی اطلاع کے شاہی دربار کی حاضری کو منظور فرما کر شاہی چوب دار کو خط کا جواب دیا۔ اس میں یہ بھی لکھا کہ شاہی آداب دنیوی کی پابندیوں سے معافی چاہتا ہوں۔ صرف اسلامی طریقہ پر سلام مسنون پر اکتفا کروں گا۔ یہ خط روانہ کر کے مولانا تھوڑی دیر بعد لال قلعہ میں تشریف لے گئے۔ بادشاہ اس وقت دربار برخاست کر چکے تھے۔ اندر آپؒ نے اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ بادشاہ نے وہیں جلوت خانہ میں طلب فرمایا۔ مولانا نے اسلامی طریقے پر السلام علیکم فرمایا۔ اس کے بعد ہی بادشاہ کے پاس ایک صوفے پر تشریف فرما ہوگئے۔ بادشاہ نے اوّل تو تشریف آوری پر اظہارِ خوشی فرمایا۔ اس کے بعد کہا کہ میں جناب کی زبانِ مبارک سے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب سننا چاہتا ہوں۔ آپ نے حکم شاہی کی تعمیل کی اور اس سوزِ جگر اور گدازِ قلب کے ساتھ وعظ فرمایا کہ اکبر شاہ ثانی بہت متاثر ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی فضائل اور عملی مجاہدات پر بے اختیار رونے لگا۔ ہر چند چاہتا تھا کہ نہ روئے اور رونے کی آواز پیدا نہ ہوسکے لیکن یارائے ضبط باقی نہ رہا۔ جب بادشاہ رو دھو کر خاموش ہوا تو اس نے کہا کہ مولانا جب حضرت رسالت مآبؐ کے فضائل و محاسن آپ کے قلبِ مبارک میں اس

قدر ہیں کہ آپ خود بھی ان کے اثر سے روتے ہیں اور دوسروں کو بھی رُلاتے ہیں تو پھر آپ نے حضورؐ کے تبرکات کی تعظیم کیوں نہیں کی؟ فرمایا وہ چیزیں سرے سے تبرکات ہی نہیں ہیں۔ بادشاہ اس پر بہت چکرایا اور کہنے لگا کہ یہ کس طرح؟ فرمایا بخاری شریف اور قرآن شریف منگوائیے۔ جب دونوں چیزیں بادشاہ کے حضور میں لاکر رکھ دی گئیں تو مولانا نے فرمایا غور فرمایئے کہ وہ تبرکات یعنی نعلین مبارک یا موئے مبارک وغیرہ کے نام سے جو چیزیں آپ کے سامنے ملاحظہ کے لیے آئی ہیں اور وہ حضورؐ کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔ اول تو ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوسکتی کہ وہ واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی چیزیں ہیں۔ یا محض رسمی طور پر کمانے کھانے والوں نے حضورؐ کی طرف منسوب کر کے ظاہر پرستوں سے فائدہ اٹھانا چاہا ہے دوسرے اگر آپ خود بھی دراصل ان کو تبرکات سمجھتے ہو اور زیارت کے قابل گردانتے ہو تو خود جا کر زیارت کرتے۔ یہ چیزیں آپ کی زیارت کے لیے جامع مسجد سے اٹھا کر نہ لائی جاتیں۔ پیاسا کنویں کے پاس جاتا ہے، کنواں پیاسے کے پاس نہیں آتا۔ تو اگر زیارت کی پیاس اور حقیقی اشتیاق تھا آپ جامع مسجد جا کر خود زیارت کر لیتے۔ لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ یہ بخاری شریف رسولِ اکرمؐ کی قولی، فعلی و تقریری احادیث کا صحیح ترین مجموعہ ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ان فرمودات کی نسبت حقیقتاً بلا شک و شبہ درست ہے اور اسی طرح کلامِ پاک واقعتاً حق تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں ایک ذرہ برابر شک نہیں لیکن آپ نے بخاری شریف اور قرآن کریم کی آمد پر کوئی تعظیم نہیں کی۔ نہ سروقد کھڑے ہوئے اور نہ اس کی زیارت کے لیے کوئی آداب بجا لائے۔ پس حقیقی اور واقعی چیزوں کی تعظیم آپ نے نہیں کی۔ لیکن جو چیزیں بال و نعلین وغیرہ ایسی ہیں

... ان کا ... سے واجبی تعلق ہونا ثابت نہیں کیا جاسکتا ایسی جعلی و رسمی چیزوں کی آپ نے تعلیم کی۔

بادشاہ نے اِن باتوں کو غور و توجہ سے سنا اور بڑا متاثر ہوا ۔ آخر میں مولانا نے بادشاہ کو ایک اور منکر امر کی طرف توجہ دلائی ۔ کہ آپ نے سونے کے کنگن اپنے ہاتھ میں کیوں پہن رکھے ہیں ؟ حالاں کہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اظہار بیزاری فرمایا ہے اور مردوں کے لیے سونا اِستعمال کرنا حرام ٹھہرایا ہے ۔ بادشاہ نے مسکرا کہا کہ حضرت مولانا! میرے دربار میں بہت سے علماء ہیں مگر آج تک کسی نے یہ فرمان نبوی مجھ کو نہیں سنایا ۔ اچھا مولانا! اب میں اِس کو نکالتا ہوں اور نکالنے میں آپ بھی میری مدد کریں ۔ دونوں کنگنوں کو بادشاہ نے نکال کر فرش پر رکھ دیا ۔ جب کنگن علیحدہ ہو چکے تو بادشاہ نے فرمایا کہ ان کنگنوں کو اپنے ہمراہ لیتے جایئے اور غریبوں میں تقسیم کر دیجیے ۔ حضرت مولانا نے ارشاد فرمایا کہ آپ کے دربار کے علماء اس پر کہیں گے کہ اسماعیل آیا تھا اور شاہی کنگنوں کو اینٹھ لے گیا ۔ آپ خود جن کو مناسب سمجھیں انھیں تقسیم کرا دیجیے ۔ چنانچہ مولانا ایک پُر وقار حالت میں لال قلعہ سے نکلے اور شاہی سواری پر سوار ہو کر مکان پہونچے ۔ اس کے بعد بادشاہ نے ایک پُر تکلف خوان اور کپڑوں وغیرہ کے تحائف کو چوبداروں کے ذریعہ سے حضرت مولانا کے مکان پر بھیجا ۔

مولانا شہیدؒ اپنے اوصاف کی روشنی میں مولانا سے زیادہ ایک سپاہی، ایک مجاہد معلوم ہوتے ہیں ۔ ہمہ وقت قرآن اور تلوار گلے میں حمائل رکھتے تھے ۔ آپ کے ایمان افروز بدعت شکن مواعظ سے دلی اور اطراف دہلی میں ایک غلغلہ گونجا ہوا تھا آپؒ نے کتاب و سنت اور توحید و رسالت کی صحیح عظمت و محبت سے سب کو آشنا کیا ۔ آپؒ کے دلکش بیانات اور متواتر مواعظ سے فضائے ہند کا گوشہ گوشہ گونج اُٹھا ۔ آج بھی ان کی توحید و رسالت کی صحیح عظمت و محبت سے سب کو آشنا کیا ۔ آپ کے دلکش کی رد پر ایک مجموعہ "تقویۃ الایمان" موجود ہے جس نے نذر و نیاز اور قبر پرستی وغیرہ سے سب کو روک کر "توحید و رسالت" کے عقائد صحیحہ کی طرف پوری دنیا کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے ۔

بقیہ "ٹیپو سلطان" صفحہ نمبر ۱۴ سے

شبہ نہیں کیا جاسکتا ۔ لیکن حالات کی ناسازگاری کہ اسے اپنی کاوشوں کو بار آور ہوتے دیکھنا نصیب نہیں ہوا ۔ مگر اس کی ناکامیوں کے باوجود اس کو جو عظمت و مرتبت حاصل ہوئی، آج بھی اس کے سامنے ہمارے سر عزت سے جھک جاتے ہیں ۔ شہادت اس کا مقدر تھی اور ایک جانباز محب وطن کی طرح اس نے جامِ شہادت نوش کیا ۔

نوٹ

جملہ خط و کتابت

اور

ترسیل زر

(ڈرافٹ / چیک وغیرہ)

" قاضی معزالدین احمد

"تہذیب الاخلاق"

تارسنگھ اے ایم یو علی گڑھ

کے نام ارسال فرمائیں ۔ صرف رسالہ کا نام نہ تحریر فرمائیں ۔

مولانا وحید الدین خاں

کچھ اور کرنا ہے

اٹھارویں صدی میں جن انگریزوں کی سرفروشی نے ہندوستان کو برطانیہ کی نوآبادی بنایا ان میں لارڈ رابرٹ کلائیو (۱۷۷۴ء ۱۷۲۵ء) کا نام سرفہرست ہے۔ ۱۷۴۳ء میں جبکہ اس کی عمر ۱۸ سال تھی، وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک کلرک کی حیثیت سے مدراس آیا۔ اس وقت اس کی تنخواہ صرف پانچ پونڈ سالانہ تھی۔ یہ رقم اس کے خرچ کے لیے بہت ناکافی تھی چنانچہ وہ قرضوں کے بوجھ کے نیچے دبا رہتا اور مایوسانہ جھنجھلاہٹ کے تحت اپنے ساتھیوں اور افسروں سے لڑتا جھگڑتا رہتا۔

اس کے بعد ایک حادثہ ہوا جس نے اس کی زندگی کے رُخ کو بدل دیا۔ اس نے اپنی ناکام زندگی کو ختم کرنے کے لیے ایک روز بھرا ہوا پستول لیا اور اپنے سر کے اوپر رکھ کر اس کی لبلبی دبا دی۔ مگر اس کو سخت حیرت ہوئی کہ جب اس نے دیکھا کہ اس کا پستول نہیں چلا ہے۔ اس نے پستول کھول کر دیکھا تو وہ گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اپنے ارادہ کی حد تک اپنے کو ہلاک کر لینے کے باوجود وہ بدستور زندہ حالت میں موجود تھا۔

یہ بڑا عجیب واقعہ تھا۔ رابرٹ کلائیو اس کو دیکھ کر چلا اُٹھا "خدا نے یقیناً تم کو کسی اہم کام کے لیے محفوظ رکھا ہے"۔ اب اس نے کلرکی چھوڑ دی اور انگریزی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ اس زمانہ میں انگریز اور فرانسیسی دونوں بیک وقت ہندوستان میں اپنا قدم جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں دونوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں رابرٹ کلائیو نے غیر معمولی صلاحیت اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کے بعد اس نے ترقی کی اور اس کو انگریزی فوج میں کمانڈر انچیف کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ جس کلائیو نے مایوس ہو کر خود اپنے ہاتھ سے اپنے اوپر پستول چلا لیا تھا، اسی کو اس کے بعد یہ مقام ملا کہ برطانیہ کی تاریخ میں اس کو ہندوستان کے اولین فاتح کی حیثیت سے لکھا جائے۔

ہم میں سے ہر شخص کے ساتھ یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ وہ کسی شدید خطرے میں پڑنے کے باوجود معجزاتی طور پر اس سے بچ جاتا ہے تاہم بہت کم لوگ ہیں جو رابرٹ کلائیو کی طرح اس سے سبق لیتے ہوں۔ جو اس طرح کے واقعات میں قدرت کا یہ اشارہ پڑھ لیتے ہوں کہ —— ابھی تمہارا وقت نہیں آیا۔ ابھی دنیا میں تم کو اپنے حصہ کا کام کرنا باقی ہے۔

ہر آدمی کو دنیا میں کام کرنے کی ایک مدت اور کچھ مواقع دیے گئے ہیں۔ یہ مدت اور مواقع اس سے اس وقت تک نہیں چھنتے جب تک خدا کا لکھا پورا نہ ہو جائے۔ اگر رات کے بعد خدا آپ پر صبح طلوع کرے تو سمجھ لیجیے کہ خدا کے نزدیک ابھی آپ کے لیے کچھ دن باقی ہیں۔ اگر آپ حادثات کی اس دنیا میں اپنی زندگی کو بچانے میں کامیاب ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے منصوبے کے مطابق آپ کو کچھ اور کرنا ہے جو ابھی آپ نے نہیں کیا۔

(منقول از "الرسالہ")

پروفیسر عتیق احمد صدیقی
شعبۂ اردو
اے ایم یو

ٹیپو سلطان

مغربی استعماری قوتوں نے ہندوستان میں تجارتی کمپنیوں کے بھیس میں قدم جمانا شروع کیے تو یہاں کے کچھ لوگ یہاں کے عوام وخواص اپنی سادہ لوحی میں جس صورتِ حال کا شکار ہوگئے تھے اس کا کچھ احساس پیدا ہوا۔ بعض دوربین نگاہوں نے مستقبل کے خطرات کو بھانپ لیا۔ اُن کے تدارک کی تدبیریں بھی سوچیں۔ لیکن یہ یلغار اس قدر زبردست تھی کہ اس کے سامنے کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوسکی۔ ان بڑھتی ابھرتی قوتوں نے نہ صرف اپنی دانش اور تدبر گری اور ایک بہتر و برتر تنظیم سے کام لیا۔ بلکہ ہر طرح کی حیلہ جوئی، مکر و فریب اور بدعہدی کو اپنا شعار بنا کر مطلب برآری کی۔ ڈچ، فرانسیسی اور انگریز کمپنیاں تجارت کے ذریعہ ہمارے وسایل کا استحصال کرتی رہیں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اپنا حلیف بنا کر دوسری ریاستوں کو زیر کرتی اور اپنے دائرۂ اقتدار میں لاتی رہیں۔ انگریزی سیاست نے ڈچ اور فرانسیسیوں کو رفتہ رفتہ بے دخل کر دیا۔ ان کے زیر اثر علاقوں پر اپنا اثر و رسوخ جمایا، وہاں کے وسایل پر قبضہ کیا اور اس طرح ان کو ہندوستانی ریاستوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے مزید مواقع اور وسایل میسر آگئے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کی یہ داستان نہ صرف ہماری تاریخ کا خونچکاں باب ہے بلکہ غیروں کی ریشہ دوانیوں اور اپنوں کی غداریوں، دغابازیوں اور خود فروشیوں کی بھی ا[illegible] روداد ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اسی صورتِ حال کا نتیجہ تھا کہ نام نہاد مرکزی حکومت اور دیسی ریاستیں تابِ مقاومت نہ لاسکیں۔ شکست اور زوال کے یہ واقعات برابر رونما ہوتے رہے اور بپایانِ کار اس سلسلہ کا انجام ۱۸۵۷ء میں سقوطِ سلطنتِ دہلی کی صورت میں نمودار ہوا۔ پیکار و معرکہ آرائی کے اس پورے دور میں تباہی، قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ عوام ہی نہیں بلکہ خواص اور بالخصوص حکمراں طبقہ اس صورتِ حال سے بوکھلا گیا۔ اکثروں نے سپر ڈال دی اور خود اُن بیرونی قوتوں کے آلۂ کار بن گئے۔ بعض اس حد تک تو نہیں گئے لیکن اس بات کو غنیمت جانا کہ ان کی ریاست یا جاگیر بچ جائے یا ان کے ذاتی مفادات محفوظ ہو جائیں۔ لیکن ایسے غیور اور شجاع بھی تھے جن کی غیرت کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ان کے سامنے محض اپنا ذاتی مفاد نہیں تھا۔ بلکہ ان نئی قوتوں کے جلو میں انقلاب کا جو طوفان آرہا تھا اس پر ان کی نظر تھی۔ ان کی دوربین نگاہیں دیکھ سکتی تھیں کہ ملک اور حکومت، مذہب، تہذیب، معاشرت، ملکی صنعت و حرفت اور پھر حرمت و وقار غرض ہر چیز بھی زد پر رہی ہے اور ان میں سے ہر ایک کا تحفظ ضروری ہے۔ اس کے لیے انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ وطنِ عزیز اور ان تصورات و اقدار کے تحفظ کے لیے جو سرزمینِ وطن سے متعلق تھیں، بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کیا اور اس جد و جہد میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیا۔ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان ایسے ہی گنتی کے چند افراد میں سے تھے

عزم وحوصلہ، جرأت وشجاعت، تدبر و دور اندیشی اور
تدبیرِ مملکت کے اوصاف ٹیپو کو اپنے باپ حیدر علی سے ورثہ میں ملے
حیدر علی نے اپنی زندگی ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے شروع
کی اور اپنی اُولوالعزمی سے ترقی کی منازل طے کرتا ہوا میسور کی
ریاست کا حکمران بن گیا۔ انگریزوں نے بعض دیسی ریاستوں
کی مدد سے حیدر علی کی قوت کو کچل ڈالنا چاہا، لیکن ان کو
کامیابی نہ ہو سکی۔ خود حیدر علی بھی انگریزوں کی چالوں کو خوب
سمجھ رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ
مل کر ان بدیسی غاصب قوتوں کو ختم کر دے، لیکن وہ تعاون
حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے تن تنہا انگریزوں کو پے در پے
شکستیں دے کر اپنی بہادری کا لوہا منوا لیا۔ اس نے بہت سی
کامیابیاں حاصل کیں اور مزید کامیابیاں اس کی منتظر تھیں کہ اس نے
داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ یہ ۱۷۸۲ء کی بات ہے۔ ٹیپو کی عمر اس
وقت ۳۰ سال تھی۔

فتح علی ٹیپو اس سے قبل ہی حیدر علی کے ساتھ
بہت سی مہمات میں شریک ہو چکا تھا۔ حیدر علی نے ایک طرف تو بیٹے
کی اعلیٰ ترین تعلیم کا بندوبست کیا تھا اور دوسری طرف فنِ حرب
کی عمدہ تربیت دلائی تھی اور پھر عملی تربیت کے لیے اپنے ساتھ
مہمات میں شریک رکھا۔ وہ باپ کی نگرانی میں اور پھر آزادانہ طور پر
میدانِ جنگ میں اپنی شجاعت اور جنگی مہارت کا متعدد بار ثبوت
دے چکا تھا۔ حیدر علی کے زمانے سے ہی ریاستِ میسور کو اندرونی
خلفشار کے علاوہ مرہٹوں، نظام اور انگریزوں سے مدافعانہ
جنگ لڑنی پڑ رہی تھی۔ اول الذکر دو طاقتوں کی مدد سے انگریز
اس ریاست پر قابض ہو جانا چاہتے تھے کہ اپنے وسائل کے
علاوہ اس کی جغرافیائی حیثیت جنگی نقطۂ نظر سے نہایت اہم تھی۔
مسند نشیں ہوتے ہی ٹیپو نے خود کو جنگ میں گھرا ہوا پایا۔
دو سال کی جنگ کے بعد اس نے انگریزوں کو اپنی شرائط پر صلح

کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ یہ میسور کی پہلی لڑائی تھی جس کا خاتمہ
۱۷۸۴ء میں صلح پر ہوا۔ اس کے بعد ہی ٹیپو نے ریاست کے اندرونی
استحکام کی طرف توجہ دی۔ حالات کی اس نزاکت کو دیکھتے ہوئے
مرہٹوں اور نظام نے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا اور ریاستِ
میسور پر فوج کشی کی لیکن منہ کی کھائی۔

ان جنگوں میں ٹیپو سلطان نے اپنی شجاعت
اور حربی مہارت کے ساتھ اس جوانمردی اور اولوالعزمی کا ثبوت
بھی دیا جو اسے ایک انسان کی حیثیت سے اعلیٰ درجہ پر فائز کرتی
ہے۔ اس نے اپنے دشمنوں کے ناموس کی بھی حفاظت کی۔ کئی
بار جب دشمن اپنی مستورات کو میدانِ جنگ میں چھوڑ کر فرار ہو گیا
تو اُن کو بہ حفاظت واپس کیا۔ اس نے اپنے فوجیوں کو اس بات
کے لیے سرزنش کی کہ انھوں نے مستورات کے ساتھ یا لاچاروں
اور کمزوروں کے ساتھ ناروا سلوک کیا۔ اس نے کبھی بدعہدی کو
روا نہیں رکھا۔

انگریزوں نے ٹیپو سلطان کی اس قوت کو دیکھ کر
سازشوں اور عیاریوں کا جال پھیلا دیا۔ انھوں نے اگر ایک
طرف مرہٹوں اور نظام کو ٹیپو کے خلاف اکسایا تو دوسری طرف
خود ٹیپو کے امرا کو جائدادوں اور جاگیروں کا لالچ دے کر
غداری پر آمادہ کیا۔ میسور کے سابق ہندو راجا کے وارثوں
کو ان کی ریاست کی بازیابی کا سبز باغ دکھایا اور اس بہانے
ہندو رعایا کو اکسا کر ان میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ ریاست
کے لوگوں میں انتشار پیدا ہوا تو قوت منتشر ہونے لگی۔ اس
صورتِ حال کی طرف سے اطمینان کر کے انگریزوں نے تیسری
بار جنگ چھیڑ دی۔ دیگر سمتوں سے مرہٹوں اور نظام کی فوج
نے یلغار کی۔ ساتھ ہی ریاست کے سرداروں نے بھی غداری
پر کمر باندھی۔ سلطان کو با دلِ ناخواستہ دشمن کی شرائط ماننے
پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن اس کا دل پر ایسا اثر ہوا کہ انتہائی ذلت

کی قسم کھائی جس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ جب تک اِس بے عزتی کا بدلہ نہیں لے لیا جائے گا، چارپائی پر نہ سوؤں گا اور پھر مرتے دم تک وہ چارپائی پر نہ سویا۔

ٹیپو نے حکومت میں عوام کی شمولیت

کے لیے عوام کے سربرآوردہ لوگوں پر مشتمل ایک مجلس بنائی جسے ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ کہا جا سکتا ہے۔ اس نے ایران، ترکی، افغانستان اور فرانس سے اتحاد کا رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ فرانسیسی افسروں سے اُس نے اپنی فوج کو جدید اصولوں پر تربیت دلائی۔ ان کی نگرانی میں آتشیں جدید اسلحہ اپنی ریاست میں تیار کرائے۔ فوج میں نظم و ضبط کو سختی سے قائم کیا مختلف اصلاحات جاری کر کے ٹیپو ایک منظم و مستحکم ریاست قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے امن و سکون کی ضرورت تھی۔ سلطان جہاں تک ہو سکا جنگ کو ٹالتا رہا۔ لیکن اس استحکام سے انگریز خائف تھے اور اُس کا زور توڑ ڈالنا چاہتے تھے۔ انھوں نے پارلیمنٹ کے صدر میر صادق اور وزیر مال پورنیا کو اپنے اثر میں لے لیا۔ اِس طرح بعض اور بھی فوجی سردار انگریزوں سے مل گئے۔ پورنیا اور میر معین الدین جیسے سرداروں نے سلطانی فوجوں کو دانستہ تباہی کے غار میں دھکیل دیا اور میر قمرالدین اور میر قاسم علی جیسے سرداروں نے انگریز فوجوں کی اس طرح رہنمائی کی کہ وہ کمزور مورچوں کو سر کرتی ہوئی سرنگاپٹم پہنچ گئیں۔ چاروں طرف سے نرغہ کرنے کے بعد شرائط صلح پیش کی گئیں جن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ سلطان انگریزوں کی بالادستی تسلیم کرے اور ان کا باجگزار بن کر ریاست کا انتظام کرے لیکن سلطان کو ایسی غلامی کی زندگی کے مقابلے میں لڑتے ہوئے میدانِ جنگ میں جان دے دینا زیادہ عزیز تھا۔

محاصرہ قلعہ کے بعد جنگ شروع

ہوئی تو خود سرداروں نے ہمت شکنی کے طرح طرح کے حربے استعمال کیے۔ شرائط صلح مان لینے کے لیے کہا۔ سلطان کو وہاں سے نکل کر کہیں پناہ گزیں ہونے کا مشورہ دیا۔ سلطانی فوج کے گولوں میں بارود کے بجائے ریت اور ریتی بھری ہوئی نکلی۔ پورنیا نے عین جنگ کے دوران تنخواہ کی تقسیم کا اعلان کر دیا۔ جس سے سپاہی مورچوں پر سے ہٹ گئے۔ اشارہ پاتے ہی انگریز فوجیں میر قاسم کی رہنمائی میں قلعہ میں داخل ہو گئیں۔ دست بدست جنگ شروع ہو چکی تھی۔ سلطان خود اس میں شریک تھا۔ گولیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ اُن کی زد سے بچنے کے لیے سلطان نے فصیل کے ایک مخصوص دروازے میں داخل ہونا چاہا تو معلوم ہوا کہ اسے میر قاسم پہلے ہی مقفل کر چکا تھا۔ سلطان کو فصیل پر رہ کر ہی لڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جب وہ چاروں طرف سے گھر گیا تو کسی سردار نے ہتھیار ڈال کر انگریزوں کی پناہ لینے کا مشورہ دیا۔ ٹیپو نے اِس مشورہ کو حقارت سے ٹھکرا دیا اور جو کچھ کہا وہ تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

"گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی

ایک دن کی زندگی اچھی ہے۔"

کئی گھنٹہ کی جنگ کے بعد بالآخر سلطان ایک گولی کا نشانہ بن ہی گیا اور یوں اس نے اپنی جان اپنے ملک کی اور اپنی آن پر نچھاور کر دی۔ قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور اِس طرح ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو ملک کی بدنصیبی کا ایک باب اور رکھا گیا۔

کیا ٹیپو صرف ایک سپاہی تھا جس کی

زندگی جنگی مہمات سے بھری ہوئی ہے؟ سچ پوچھیے تو وہ جنگ سے جتنا بچنا چاہتا تھا، شاید ہی کوئی حکمراں چاہتا ہو، لیکن جب حالات نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور دشمن طاقتوں نے اس کی اولوالعزمیوں کو للکارا تو اس نے جنگ سے بھی گریز نہیں کیا اور اس میدان میں بھی اس نے اپنا لوہا منوا لیا۔ وہ خود علم و فضل سے آراستہ اور علم کا قدرداں تھا۔ وہ اعلیٰ درجہ

کا انشا پرداز تھا۔ خود تصنیف و تالیف کی مہلت اس کو نہیں ملی، لیکن علوم و فنون کی ترویج کے لیے وہ برابر کوشاں رہا۔ مختلف علوم و فنون کی تعلیم کے لیے اس نے ایک اعلیٰ درس گاہ [یونیورسٹی] قائم کی۔ اس کا ذاتی کتب خانہ نہایت شاندار تھا۔ سماجی اصلاحات کی طرف اس نے خاص طور پر توجہ کی۔ لڑکیوں کی خرید و فروخت اس علاقہ میں عام تھی، اس کو قانوناً ممنوع قرار دیا گیا۔ ایسے قانون بنائے گئے جن سے سماج میں عورت کو باعزت مقام حاصل ہو۔ حتیٰ کہ جنگ میں بھی مستورات کی عزت و ناموس کا پورا خیال رکھا گیا۔ میسور کے بعض حصوں میں انسانی قربانی کی رسم تھی، اس کا بھی قانونی طور پر انسداد کیا۔ تعدد شوہر کی قبیح رسم پر بھی سلطان نے قانونی پابندی عاید کر دی۔

اُس نے برّی فوج کی اہمیت کے ساتھ بحری فوج کی ضرورت کو بھی محسوس کیا اور اس کی ترتیب پر پوری توجہ دی۔ مضبوط بحری بیڑہ تیار کرنے اور جہاز سازی کی صنعت کو فروغ دینے کی بنیادیں ڈالیں۔ فوجوں کو جدید تقاضوں کے مطابق تربیت دی۔ اسلحہ سازی کے جدید طریقے اختیار کیے۔ پولیس کی بھی تنظیم جدید کی۔ سرقہ یا ایسے دوسرے جرائم کا پتا نہ چلتا تو افسران پولیس کو اس کی تلافی کرنی ہوتی تھی۔ عدلیہ کا نظام ایسا قائم کیا گیا تھا کہ سب کو انصاف بہ آسانی مل سکے۔ ہندو مسلمانوں کے مقدمات ان کے مذہبی احکام کے مطابق طے کیے جاتے تھے۔ مذہبی رواداری کی جو مثالیں ٹیپو نے قایم کیں، کہیں اور مشکل سے نظر آئیں گی۔ اس نے مندروں اور اُن کے پروہتوں کے لیے جائیدادیں وقف کیں اور ان کی حفاظت کا پورا انتظام کیا۔ مرہٹوں نے ریاست کے بعض مندروں کو تاراج کیا تو سلطان نے ان تمام تر نقصان کی تلافی کر دی۔

ملکی مصنوعات کو غیر ملکی مصنوعات پر ترجیح دینے کا تصور پہلی بار ہندوستان میں ٹیپو نے پیش کیا۔ اس کی دور رس نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ مغرب تجارت و صنعت کے پردے میں کس طرح ہندوستان کا اور اس کے وسائل کا استحصال کر رہا ہے۔ اس نے اپنے لیے اور عاملانِ سرکاری کے لیے بدیسی کپڑے اور بدیسی نمک کا استعمال ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اس پر اس نے سختی سے عمل کیا۔

اس نے زراعت کی طرف توجہ کی۔ کاشت بہتر کرنے کے لیے کاشتکاروں کی ہر طرح مدد کی۔ اس نے ہندوستان میں پہلی بار کاشت کار کو زمین کا مالک قرار دیا۔ اُن کو مفت زمینیں تقسیم کیں۔ ان کو لگان میں زیادہ سے زیادہ سہولت دی۔ اس نے سرکاری فارم کھلوائے جن میں زراعت کے نئے تجربے ہوتے اور جو تجربے کامیاب ہوتے اُن سے کاشتکاروں کو واقف کیا جاتا۔ ریشم کی پیداوار کی حوصلہ افزائی کی گئی اور باہر سے ریشم کے کیڑوں کی نئی نسلیں منگوائی گئیں۔ [illegible] آب پاشی کا بہتر انتظام کرنے کے لیے اس نے دریائے کاویری پر پشتہ باندھنے کا منصوبہ بنایا۔ کام شروع بھی ہو گیا۔ لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی اور منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ یہ وہی مقام ہے جسے کافی تلاش و جستجو کے بعد بیسویں صدی میں بند باندھنے کے لیے منتخب کیا گیا۔ مویشیوں کی نسلوں کو بہتر کرنے اور [illegible] نسلیں پیدا کرنے پر بھی اُس نے توجہ دی۔

صنعت و تجارت کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی نئی راہیں نکالیں۔ اُس نے ریاست میں کارخانے قائم کرائے جن میں طرح طرح کی مصنوعات تیار ہوتی تھیں۔ تجارت کا باقاعدہ محکمہ قائم کیا جو اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک تجارت کے فروغ کا ذمہ دار تھا۔

ٹیپو نے ایک طرف ریاستی استحکام اور دوسری طرف عوامی فلاح و بہبود کے لیے جتنی تدابیر اختیار کیں، ان کی صحت و افادیت پر آج بھی

[illegible] ۱۲ [illegible]

مصطفیٰ شروانی
حیدرآباد

چورانوے (۹۴) لاکھ چونتیس (۳۴) ہزار تین سو (۳۰۰)!

یہ گنتی ہندوستان کی قبل مسیح آبادی کی نہیں ہے جو اب بڑھ کر ۸۴ کروڑ ہو گئی ہے نہ یہ کسی نو دریافت ستاروں کے جھرمٹ کی ہے اور نہ ہی ایٹم کے ان اجزا کی جو منتشر کر دینے کے بعد ناقابلِ فہم توانائی میں مرکوز ہو جاتے ہیں بلکہ اس رقم کی ہے جو حال میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج ہسپتال علی گڑھ میں مزید ایک سو پچاس بستروں کی جدید عمارت کی تعمیر کے لیے منظور کیے ہیں (تہذیب الاخلاق یکم اکتوبر ۹۲ء ص۱۶)۔ جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج علی گڑھ مرحوم سر ضیاء الدین احمد، ڈاکٹر ہادی حسن مرحوم، رشید احمد صدیقی مرحوم اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ان بے شمار بہی خواہوں کے خواب کی تعبیر ہے جن کی زندگی کا مطمح نظر مسلم یونیورسٹی کے وقار اور وسعت کو اس کے اولین بانی سر سید علیہ الرحمۃ کے بتائے ہوئے شایانِ شان پیمانہ پر قائم رکھنا تھا۔ ہمالیہ کے دامن سے راس کماری کی چوکھٹ تک اور گجرات سے برما کی سرحد تک میڈیکل کالج کے لیے چندہ جمع کرنے والی طلباء و اساتذہ کی ٹولیاں برسوں چھوٹی چھوٹی رقومات کو محض اس غرض سے اکٹھا کرنے میں مشغول رہی ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کو ایک عصری ضروریات سے آراستہ میڈیکل کالج نصیب ہو۔ آزادیٔ ہند کے بعد مرکزی حکومت نے جس فراخدلی سے مسلم یونیورسٹی کی ہر ضرورت کو پورا کرنے میں تعاون کیا اس کی صرف ایک اور مثال بنارس ہندو یونیورسٹی میں ہو سکتی ہے لیکن وہاں میڈیکل کالج کے قیام کی طرف توجہ ابھی تک نہیں دی جا سکی اور یہ فخر مسلم یونیورسٹی کو حاصل ہے کہ میڈیکل کالج ہندوستان کی آزادی کے اولین سپاہی جواہر لعل نہرو کے نام سے موسوم ہے۔

راقم الحروف کو جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع حاصل رہے ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں جب ہمشیرہ کی علالت نے کسی قدر طول کھینچا تھا اور X Ray کی ضرورت درپیش ہوئی اس وقت میڈیکل کالج کے Radiology شعبہ میں Closed Circuit T V کی کرامت سب سے پہلے نظر آئی۔ مریضوں کے علاج میں مختلف شعبہ جات کا باہمی تعاون اور مریض کو زیادہ سے زیادہ سہولت اور سکون پہنچانے کا جذبہ یوں تو ہر طبی ادارہ کا طرۂ امتیاز ہونا چاہیے مگر جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج میں یہ جذبہ بدرجہ اتم مہیا ہے۔ بعض مرتبہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ جدید ترین آلات استعمال کرنے کے طریقے اگر ان آلات کے بنانے والی کمپنیوں میں ڈاکٹروں، ورٹیکنیشینز کو سکھا دیے جائیں تو مریضوں کی حیات معلوم کرنے میں زیادہ سہولت ہو سکتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی نیا ہوائی جہاز آنے سے پہلے تجربہ کار پائیلٹوں کو بھی امریکہ یا روس بھیج کر مزید ٹریننگ دلوائی جاتی ہے۔ میڈیکل کالج میں صفائی کا بہتر انتظام اور پھلدار درختوں سے مریضوں کو سکون حاصل ہوگا۔ مسلم یونیورسٹی میں گلاب کے درختوں کا باغیچہ رشید احمد صدیقی مرحوم کی نزاکت خیال کا رہین منت ہے۔ ان میں بعض بڑھیا قسم کے گلاب میڈیکل کالج

باقی صفحہ نمبر ۴۴ پر

علم

(مقالات سرسید مرتبہ عبداللہ خان خویشگی صفحہ ۷۲ تا ۷۴)

جہاں اور بہت سے عجائبات قدرتِ الٰہی ہیں ان ہی میں سے انسان کے خیالات بھی نہایت عجیب ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قسم کی مخلوقات ایک ہی سا خیال رکھتی ہے۔ جانوروں کی وہ حرکات اور افعال جو جاندار ہونے کے سبب سے ہیں، اور وہ ہر چیز جو محرک ان افعال یا حرکات کی بالواسطہ یا بلا واسطہ ہے اس کا کچھ ہی نام رکھو، مگر وہ وہی چیز ہے جس کو انسانی حالت میں خیال کہتے ہیں۔

تمام افعال اور حرکات جانوروں کی بلاشبہ ارادی ہیں اور کچھ شک نہیں کہ وہ متحرک بالارادہ ہیں۔ ان کی تمام حرکتوں کا باعث بالواسطہ یا بلا واسطہ ایک خیال جلبِ منفعت مادی، جیسے غذا اور مسکن وغیرہ یا غیر مادی جیسے فرحت وانبساط اور بشاشت یا خیال دفع مضرّتِ مادّی وغیر مادّی کا ہوتا ہے۔ ہم نہیں پاتے کہ انسان میں اور کوئی چیز اس سے زیادہ ہے۔ بلاشبہ اتنا فرق پاتے ہیں کہ جانور میں وہ خیالات محدود اور انسان میں نامحدود ہیں۔ مگر تعجب تو ہم کو اس بات پر ہوتا ہے کہ ہرگاہ ایک قسم کے جانوروں میں ایک ہی سے خیالات ہیں اور ان پر وہ سب ایک ہی سا یقین کامل رکھتے ہیں تو تمام انسان بھی باوجود یہ کہ ایک قسم کے جاندار ہیں ایک سے خیالات اور ایک ہی سا یقین کیوں نہیں رکھتے ہیں۔

کبھی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جانوروں کے خیالات محدود ہونے کے سبب متفق ہیں اور انسان کے خیالات میں نامحدود ہونے کے سبب وہ صفت نہیں ہے۔ مگر یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ نامحدود ہونے کے لیے مختلف ہونا ضرور نہیں ہے۔ پس انسانوں کے خیالات سے جہاں تک ہم کو واقفیت ہوتی ہے اور ان خیالات کا صحیح ہونا یا غیر صحیح ہونا ہمارے اس فائدہ میں کچھ نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ درصورت مختلف ہونے کے اور بھی زیادہ فائدہ دیتا ہے۔ اس لیے ہم اپنے اس آرٹیکل میں ایک انسان کے خیالات بیان کرتے ہیں جن کو وہ اس طرح پر کہتا ہے۔

"مجھ کو خیال آیا کہ جس قدر اور جانوروں کو کرنا ہے اتنا ہی مجھ کو بھی کرنا ہے یا اس سے زیادہ کرنا ہے۔ مگر میرے خیال میں یہ آیا کہ انسان کے سوا تمام جاندار مخلوقات کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے ان کو بنانے والے کاریگر نے سب کچھ

ان کے ساتھ بنا دی ہیں۔ ان کو ان چیزوں کے بہم پہنچانے یا پیدا کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ تمام جانداروں کی خوراک بغیر ان کی سعی و تدبیر کے پیدا ہوتی ہے۔ سرد ملکوں کے جانوروں کے لیے نہایت عمدہ پشمینہ کا گرم لباس ان کے بدنوں پر پیدا کیا ہے۔ پرند جانوروں کے لیے مینہ سے بچنے کا باران کوٹ ان کے بدنوں پر سیا ہے۔ گرم ملک کے جانوروں کے لیے اسی آب و ہوا کے مناسب ان کا جامہ قطع کیا ہے مگر انسان کے لیے کچھ نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو یہ سب کچھ خود کرنا ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان اپنے کاموں کے کرنے کے لیے کسی سے کچھ سیکھنے یا تعلیم پانے کے محتاج نہیں ہوتے۔ خود سیکھے سکھائے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ شہد کی مکھی کو رس چوسنے کے لیے عمدہ قسم کے ماخذوں کی شناخت کوئی نہیں بتاتا اور اپنے گھروں کو ایسی عمدہ تقسیم سے نکالنا جس میں ایک بڑا مہندس بھی حیران ہو جاوے کوئی نہیں پڑھاتا۔ بئے کو ایسا عمدہ اور محفوظ کاشانہ بنانا کوئی نہیں سکھاتا۔ مگر انسان کو بغیر سیکھے کچھ بھی نہیں آتا۔

پھر میں نے خیال کیا کہ حیوان کے کام خواہ افعالِ جوارح سے ہوں یا دوسری قسم سے اور خواہ وہ از خود ان کو آئے ہوں یا تعلیم سے۔ نہایت محدود ہیں۔ مگر انسان کے ہر قسم کے کام نامحدود ہیں۔ ان سب باتوں سے میں نے خیال کیا کہ انسان کو اور جانوروں سے بہت کچھ زیادہ کرنا ہے۔

پھر میں نے خیال کیا کہ ایسے بڑے کاریگر نے جو انسان کو اور جانوروں سے زیادہ درماندہ بنایا ہے اور طرح طرح کی مشکلات میں ڈالا ہے تو کیا چیز اس کو دی ہے جس سے وہ یہ سب چیزیں کر سکتا ہے اور تمام مشکلوں پر فتح پا سکتا ہے؟ اتنے میں میرا دل بول اٹھا کہ "عقل"۔

یہ بات سن کر میں سوچ میں پڑ گیا کہ کیا یہ بات سچ ہے مگر میں نے خیال کیا کہ عقل سے تو یہ کام نہیں نکل سکتا۔ نہ تو وہ خود یہ کام نکال سکتی ہے اور نہ اس کے بغیر یہ مشکل حل ہو سکتی ہے۔ یہ تو کسی دوسری چیز کے حاصل کرنے کو بطور آلہ کے ہے۔ جیسے کہ سونا چاندی ہماری بھوک نہیں کھو سکتا مگر اس چیز کو بہم پہونچا دیتا ہے جو ہماری بھوک کھو دیتی ہے۔ بہت سی تلاش اور جستجو میں نے کی اور خیال دوڑایا کہ وہ کیا چیز ہے کہ جس کے حاصل کرنے کے لیے عقل بھی صرف آلہ ہے تو خیال میں آیا کہ وہ چیز "علم" ہے۔ جس کے معنی "دانستن (جاننا)" ہیں۔ تب میں سمجھا کہ مجھ کو اور جانوروں سے زیادہ جو کچھ کرنا ہے وہ صرف تمام باتوں کی اصلیت دریافت کرنا ہے۔"

٭٭٭

(از مقالات سرسید حصہ ششم۔ مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی)

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری
اسسٹنٹ لائبریرین
مولانا آزاد لائبریری، اے ایم یو

سرسید کی ایک نادر تحریر

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ ہندوستان کا اوّلین ادارہ ہے جس نے کلاسیکی کتب کی بازیافت اور صحتِ متن کے ساتھ ان کی اشاعت کی طرف توجہ کی اور ان کو سائنٹیفک اصولوں پر ترتیب دلا کر شائع کیا۔ اس سلسلہ میں سوسائٹی کی مساعی زیادہ تر فارسی ادبیات بالخصوص فارسی شاعری اور ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کے تاریخی مآخذ پر مرکوز رہیں۔ چنانچہ جہاں اس نے حضرت امیر خسرو کے دواوین مبسوط مقدموں کے ساتھ ایڈٹ کرا کر شائع کیے وہیں مآثر رحیمی تالیف عبدالباقی نہاوندی، منتخب التواریخ تالیف ملا عبدالقادر بدایونی، مآثر الامراء تالیف شاہنواز خاں، ظفرنامہ تالیف شرف الدین علی یزدی، بادشاہ نامہ تالیف عبدالحمید لاہوری، منتخب اللباب تالیف محمد ہاشم خافی خاں اکبرنامہ تالیف شیخ ابوالفضل علامی، تاریخ فیروز شاہی تالیف شمس سراج عفیف وغیرہ جیسے اہم تاریخی مآخذ کو صحتِ متن کے ساتھ شائع کرکے انھیں محفوظ کر دیا۔ ورنہ یہ نادر و نایاب سرمایہ آج ہماری دسترس سے باہر ہوتا۔

ان تالیفات کی اہمیت ان کے مخصوص موضوع میں تو بنیادی ہے ہی، اس کے ساتھ سوسائٹی سے شائع ہوجانے سے ان کی افادیت اور اہمیت دوبالا ہوگئی ہے ان پر مرتبین نے جو مبسوط مقدمے تحریر کیے ہیں، ان میں مؤلفین کے سوانح اور تالیف پر عمومی تعارفی تبصرہ بھی ہوتا ہے جس سے ہمیں مؤلف کے حالات معلوم کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے اور دوسری طرف کتاب کے بارے میں رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ مقدمے چونکہ ماہرین موضوع کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں، اس لیے ان کے مستند اور معتبر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں مقدمہ نگار اپنے خیالات کو بڑے جامع اور وقیع انداز میں پیش کرتا ہے۔ اس لیے ان سے اختلاف کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے۔

اس اسکیم کے تحت ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید احمد خاں کی خدمات بھی مستعار لیں اور ان سے تاریخ فیروز شاہی" تالیف ضیاء الدین برنی کو ایڈٹ کرنے کی فرمائش کی۔ سرسید نے صحتِ متن کا کام بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے کیا۔ اور جیسا کہ خود انھوں نے دیباچہ میں لکھا ہے، پانچ مختلف نسخوں سے صحت کرکے ایک مستند متن تیار کیا۔ جسے ایشیاٹک سوسائٹی نے ۱۸۶۱ء میں شائع کیا۔

اس نسخہ میں یہ عجیب بات ہے کہ مرتب کا کوئی مقدمہ یا دیباچہ اس میں شامل نہیں ہے کتاب بغیر کسی تعارف کے اصل متن سے شروع ہوجاتی ہے۔ یہ انداز سوسائٹی کی روایات کے منافی ہے۔ اس کے علاوہ کسی مقام پر بھی اختلاف نسخ کو ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی توجیہ تو یہ کی جاسکتی ہے

... مقدمہ یا اس قسم کے حواشی دینے کا رواج نہیں تھا
لہٰذا مرتبین نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ البتہ مقدمہ کا نہ ہونا خاصی
اہم بات ہے۔ اس کو دیکھتے ہی یہ خیال ہوتا ہے کہ سرسید کسی
سبب سے مقدمہ یا دیباچہ تحریر نہ کر سکے ہوں اور سوسائٹی کے
اربابِ ذمہ دار نے اسے بغیر کسی مرتب کی تحریر کے شائع کرنا
منظور کر لیا ہو۔ مگر یہ بات اُن کے مزاج کے خلاف تھی۔ لہٰذا یہ
بات کسی طرح بھی قرینِ قیاس نہیں کہ محض متن کی تصحیح پر ہی اکتفا
کر لیا گیا ہو اور سرسید کے تعارفی نوٹ کو نظر انداز کر دیا گیا ہو
البتہ اتنا ضرور ہے کہ کتاب کے اختتام پر انگریزی میں ایک
اعلان درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سرسید نے مقدمہ تحریر
کیا تھا لیکن کسی سبب سے وہ کتاب میں شامل نہ ہو سکا۔ بعد
میں علیحدہ سے شائع کیا جائے گا۔ مگر اس کے کتاب میں
شامل نہ ہونے کے اسباب پر اس اعلان میں کوئی روشنی نہیں
ڈالی گئی۔ اصل اعلان کی عبارت اس طرح ہے:

MEMO

The preface to this work
including a brief sketch
of Author's life, and some
notices of this history,
will appear in a separate
form.

غالباً یہ ارادہ پورا نہ ہوا اور اب ایشیاٹک سوسائٹی کی
مطبوعات میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ مزید یہ کہ یہ
دیباچہ اتنا مختصر ہے کہ اس کو جداگانہ حیثیت سے شائع نہیں
کیا جا سکتا۔ ممکن ہے کہ سرسید کا یہ دیباچہ کتاب کی اشاعت
کے وقت تک تیار نہ ہوا ہو اور سرسید اس کی تسوید ہی کر رہے
ہوں۔ اس لیے اعلان کر دیا گیا ہو کہ بعد میں علیحدہ سے شائع
کیا جائے گا اور بعد میں ملنے پر یہ محسوس ہوا ہو کہ یہ تو بہت مختصر
ہے، اسے جداگانہ حیثیت سے شائع بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا
اس کی اشاعت کا ارادہ بدل گیا ہو۔

یہ سب قیاس آرائیاں ہیں، حقیقتِ حال تو صرف
خدا کو معلوم ہے۔ تعجب ہے مولانا حالی نے بھی حیاتِ جاوید
میں اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔

خوش قسمتی سے یہ دیباچہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ
گزٹ کی ۲۵ اگست ۱۸۶۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس
طرح یہ نادر تحریر محفوظ ہو گئی۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ ہم اس سے
استفادہ کی سعادت سے محروم ہی رہتے۔ اس کے بارے
میں ادارہ کی طرف سے حسبِ ذیل نوٹ مندرج ہے۔

"سید احمد خان سائنٹیفک سوسائٹی کے سکریٹری
نے ۱۸۶۱ء میں تاریخ فیروزشاہی ضیاء برنی
کا ایک دیباچہ لکھا تھا جب کہ ایشیاٹک سوسائٹی
بنگال اُس کتاب کو انھیں کی تصحیح سے چھاپتی تھی
جو کہ وہ دیباچہ ایک نہایت عمدہ مضمون ہے
ایشیا کی تاریخوں کے حال کا۔ اس لیے ہم
اس دیباچے کو واسطے فائدہ اپنے اخبار کے
دیکھنے والوں کے چھاپتے ہیں۔"

دیباچہ اردو و انگریزی دونوں زبانوں میں شائع ہوا ہے۔
قرینِ قیاس یہ ہے کہ سرسید نے اصلاً اس کو اردو میں تحریر کیا۔
اور گزٹ کے منتظمین نے اس کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ
بھی شائع کر دیا گزٹ بنیادی طور پر ذو لسانین اخبار تھا اس
میں اہم خبریں اور مضامین انگریزی اور اردو دونوں زبانوں
میں شائع ہوتے تھے، اسی لیے سرسید کی اس اردو تحریر کا بھی
انگریزی روپ شائع کیا گیا

دیباچے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

سرسید ہندوستان کی تاریخ اور بالخصوص عہدِ وسطیٰ کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس کے مآخذ پر انھیں پوری طرح عبور حاصل تھا۔ وہ اُن کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی واقف تھے انھیں علم تاریخ اور فنِ تاریخ نویسی کا بھی درک تھا۔ اس کی ایک جھلک ہمیں ان کے زیرِ نظر دیباچہ میں ملتی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ دیباچہ بہت مختصر ہے۔ اس میں ان کے جوہر پوری طرح ظاہر نہیں ہو سکے ہیں۔ اس کے مطالعے کے بعد تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں نہ تو تاریخ فیروز شاہی پر سیر حاصل تبصرہ ہے اور نہ ہی اس کے مؤلف ضیاء الدین برنی کے حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ انداز سرسید کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ممکن ہے وہ اس کے لیے مطلوبہ وقت نہ دے پائے ہوں۔

سرسید کا دیباچہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

دیباچہ

مصنفہ

سید احمد خاں۔

جب کہ مسلمان بادشاہوں کی فتوحات ہندوستان میں شروع ہو گئیں تو مورخوں نے ان کا حال کتبِ تواریخ میں لکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تاریخ یمینی، تصنیف ابو النصر عتبی مازنی سنہ ۴۱۲ھ مطابق سنہ ۱۰۲۱ء میں بعہد سلطان محمود عربی زبان میں لکھی گئی۔ اِس تاریخ میں ابتدائے ظہورِ دولتِ غزنویہ اور عروج امیر ناصر الدین سبکتگین سے سنہ مذکور تک جو جو فتوحات اس کو اور اس کے بیٹے سلطان محمود کو ہندوستان اور اور ملکوں میں ہوئیں وہ سب مندرج ہیں۔

بعد اس کے خواجہ ابو الفضل بیہقی نے ۵۵۶ ہجری مطابق ۱۱۶۰ء میں بعہد سلطان ابراہیم غزنوی بن سلطان مسعود بن سلطان محمود فارسی زبان میں کتاب تاریخ لکھی اور اس میں ابتدائے جلوس سلطان محمود سے تمام فتوحات کا حال جو ہندوستان اور اور ملکوں میں ہوئیں، لکھا ہے۔

بعد اس کے جب کہ سلطنتِ غزنویہ آخر ہوئی اور دولتِ غوریہ نے ترقی پکڑی اور سلطان شہاب الدین غوری ۵۸۷ ہجری مطابق ۱۱۹۱ء کے تخت گاہ ہندوستان یعنی دار الخلافہ دہلی کو فتح کیا تو اس کے عہد میں خواجہ صدر الدین محمد بن حسن نظامی نے ۶۰۲ ہجری مطابق ۱۲۰۵ء کے کتاب تاج المآثر لکھنی شروع کی اور ۶۱۴ ہجری مطابق ۱۲۱۷ء تک یعنی اواسط عہد سلطان شمس الدین یلتمش تک کا اس میں حال لکھا ہے اور اس کے ضمیمہ میں حال فتح اوچہ اور ملتان اور آنے خلعت اور فرمان خلیفہ بغداد امام مستنصر باللہ عباسی کا سلطان شمس الدین یلتمش کو زیادہ کیا ہے۔

اُس کے بعد مولانا سدید الدین عُرفی نے کتاب جامع الحکایات بنام نظام الملک جنیدی وزیر سلطان شمس الدین یلتمش لکھی اور اس میں بھی کچھ حالِ فتوحاتِ یلتمش مندرج ہے۔

اُس کے بعد ۶۵۸ ہجری مطابق ۱۲۶۰ء میں بعہدِ سلطان ناصر الدین محمود بن سلطان شمس الدین یلتمش قاضی منہاج السراج الجرجانی نے طبقات ناصری جو نہایت عمدہ و کم یاب کتاب ہے لکھی اور اس میں ابتدائے ظہورِ سلطنتِ غوریہ سے اپنے زمانہ تک ان کی تمام فتوحات اور ان کے شعبہ اور انساب بہت درستی اور شائستگی سے لکھے ہیں۔

اُس کے بعد ۷۵۸ ہجری مطابق ۱۳۵۶ء

کے عہد سلطان فیروز شاہ مولانا ضیاء الدین برنی نے یہ کتاب لکھی جس کا نام تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی ہے۔ اس کتاب میں سلطان ناصر الدین محمود کے بعد سے جو بادشاہ ہوئے ہیں اور جو واقعات کہ سال ششم جلوس فیروز شاہ تک گزرے ہیں مندرج ہیں۔ حقیقت میں یہ کتاب تتمہ ہے طبقات ناصری کا اور ان دونوں کتابوں کو ملا کر ایک کتاب سمجھنا چاہیے

اس کتاب میں آٹھ بادشاہوں کا حال ہے جن کے نام حاشیے پر ثبت ہیں[1]۔ واقعی یہ کتاب نہایت عمدہ اور بہت معتبر ہے۔ اکثر حالات اس میں خود مصنف کے دیکھے ہوئے مندرج ہیں اور باقی حالات وہ ہیں جو مصنف نے بزرگوں سے سنے۔ اور انھوں نے بچشم خود دیکھے تھے۔

جو لوگ کہ کتب تواریخ کی سیر کرتے ہیں ان کو معلوم ہوگا کہ ممالک ایشیا کی تواریخ میں بہت بڑا عیب یہ ہے کہ بادشاہوں کی بے جا تعریف اور خوشامد سے پُر ہیں۔ مگر اس تاریخ کی بہت بڑی عمدگی یہ ہے کہ اس کے مصنف نے جس بادشاہ کا حال لکھا ہے اور جہاں اس کی خوبیاں اور بھلائیاں مذکور کی ہیں وہیں جو جو عیب اور برائیاں اُس بادشاہ میں یا اس کی سلطنت میں تھیں وہ بھی بیان کی ہیں۔ اکثر جگہ تدبیر ملک داری جو ان بادشاہوں کے مدِ نظر تھیں وہ بھی مذکور کی ہیں اور اس باب میں کوئی تاریخ ان ملکوں کی اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ سلطان فیروز شاہ کا حال بھی اس مصنف نے ایسا ہی لکھا ہے۔ کیوں کہ میں اس کے حال میں اس طریقہ کو گھٹا ہوا پاتا ہوں۔ سچ ہے کہ کسی بادشاہ کی تاریخ اُسی بادشاہ کے عہد میں بغیر طرفداری کے لکھنی نہایت مشکل ہے۔

اس مصنف نے ارادہ کیا تھا کہ سلطان فیروز شاہ کا حال ایک سو ایک مقدمہ یعنی ایک سو ایک باب میں لکھے مگر اس نے صرف سال ششم جلوس فیروز شاہ تک کا حال گیارہ مقدموں میں لکھا ہے اور باقی مقدموں کے لکھنے کا وعدہ کیا تھا مگر پھر اس مصنف نے نہیں لکھے۔

مگر شمس سراج عفیف نے اوایل نویں صدی ہجری مطابق سولہویں صدی عیسوی میں ایک تاریخ بنام تاریخ فیروز شاہی شمس سراج عفیف لکھی۔ اُس کتاب کو اس نے پانچ حصّوں میں تقسیم کیا اور ہر حصہ کو اٹھارہ مقدموں پر کہ مجموع ان کے نوے مقدمہ ہوئے۔ گویا اس مصنف نے ضیاء برنی کے ارادہ کو پورا کیا ہے۔ اس کتاب میں ابتداء ولادت فیروز شاہ سے اس کے آخرِ عہد تک کا حال مندرج ہے۔ یہ دونوں کتابیں تاریخ فیروز شاہی کے نام سے مشہور ہیں مگر پہلی ضیاء برنی کی کہلاتی ہے اور دوسری شمس سراج عفیف کی۔

علاوہ ان کے ایک اور کتاب از نام 'فتوحات فیروز شاہی' مشہور ہے۔ اس کتاب کو خود فیروز شاہ نے لکھا ہے۔ یہ بہت چھوٹی کتاب ہے۔ اور

---

[1] (۱) غیاث الدین بلبن
(۲) معز الدین کیقباد
(۳) جلال الدین فیروز خلجی
(۴) علاء الدین خلجی
(۵) قطب الدین مبارک شاہ
(۶) غیاث الدین تغلق شاہ
(۷) سلطان محمد تغلق شاہ
(۸) سلطان فیروز شاہ

اس میں بعض حال امور خاص و عام اور بیان قواعد جدید کا جو
اس بادشاہ نے اپنے عہد میں جاری کیے، مندرج ہے یہ تمام
کتاب مسجد جامع فیروز شاہی واقع دہلی کے برجوں پر کندہ تھی
مگر اب وہ مسجد اور اس کے برج سب ٹوٹ گئے ہیں اور
کوئی پتھر کندہ کیا ہوا دستیاب نہیں ہوتا۔

تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی بہت
کم یاب کتاب ہے۔ بہت تلاش اور تجسس سے مجھ کو ایک نسخہ
بہم پہونچا تھا۔ اس کے مقابلہ اور صحت میں مجھ کو بہت دقت
اٹھانی پڑی۔ ایک ناقص نسخہ کتب خانہ شاہی دہلی سے مجھے
میسر ہوا تھا اور ایک نسخہ جو مسٹر ایلیٹ صاحب بہادر نے
بہم پہونچایا تھا وہ میں نے لیا اور ایک نسخہ مسٹر اڈورڈ
طامس صاحب بہادر کے پاس تھا وہ بھی میں نے لیا
اور ایک نسخہ بنارس سے ہاتھ آیا۔ ان چار نسخوں سے
میں نے اپنی کتاب کا مقابلہ کیا اور جہاں تک ممکن تھا اس کے
صحیح کرنے پر کوشش کی۔ اب ہماری ایشیاٹک سوسائٹی نے
اس نایاب اور عمدہ کتاب کا چھاپنا چاہا اور میری کتاب
اور میری صحت اور مقابلہ سے یہ کتاب چھپی۔ اس دفعہ
میں نے زیادہ تر اس کتاب کی صحت پر توجہ کی اور جہاں
تک ممکن تھا اس کے صحیح کرنے میں دریغ نہیں کیا۔

مناسب ہے کہ اس مقام پر
کچھ مختصر حال اس کتاب کے مصنف کا بھی لکھوں[1]۔ واضح
ہو کہ نام اس کتاب کے مصنف کا ضیاء الدین ہے اور
قصبہ برن جو اب بلند شہر کے نام سے مشہور ہے
اس کا مسکن ہے۔ آدمی ذی علم تھا اور تاریخ سے
بہت شوق رکھتا تھا اور بہت سی پرانی نقلیں اور حکایتیں
اس کو یاد تھیں۔ شعر سے بہت شوق تھا اور امیر خسرو
اور میر حسن سے بہت صحبت اور ملاقات تھی۔ اس کا باپ
اور دادا سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد میں صاحب خدمت
تھے۔ اسی بادشاہ کے عہد میں اس کا نانا حسام الدین سپہ سالار
تھا اور سلطان علاء الدین کے عہد میں اس کا چچا ملک
علاء الدین دہلی کا کوتوال اور بادشاہ کا بہت مقرب
تھا۔ اس مصنف کو بھی سلطان محمد تغلق کے دربار میں
بہت تقرب حاصل تھا۔ مگر اس کے بعد پھر کوئی خدمت
اس مصنف کو ہاتھ نہیں آئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مصنف
نے یہ تاریخ اس ارادے سے لکھی تھی کہ اس کے ذریعہ
سے سلطان فیروز شاہ کے دربار میں تقرب حاصل کرے
مگر یہ امید اس کی بر نہیں آئی۔ اور اس نے خانہ نشینی
اختیار کی اور غیاث پور میں جہاں اب درگاہ حضرت نظام الدین
کی متصل دہلی کی ہے، رہنا اختیار کیا اور وہیں مر گیا۔
متصل درگاہ حضرت موصوف کے مدفون ہوا۔ سال وفات
اس کا معلوم نہیں۔ کہتے ہیں کہ جب یہ مصنف مرا تو
ایسے تنگ حال میں تھا کہ اس کے جنازہ پر بجز بوریہ
کے اور کچھ نہ تھا۔ مگر یہ عمدہ کتاب اس کی یادگار
باقی ہے۔

---

[1] دیکھو کتاب اخبار الاخیار اور تاریخ فیروز شاہی ضیاء برنی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

نوٹس داخلہ نمبر ۱۰
سیشن ۱۹۸۲-۸۳ء

۱۹۸۲-۸۳ء کے سیشن کے لیے شعبۂ اردو کے تحت اردو خطاطی کے ایک سالہ کورس کورس کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں
کم از کم استعداد اس یونیورسٹی کا پری یونیورسٹی امتحان یا اردو بحیثیت ایک اختیاری مضمون کے ہمراہ کوئی امتحان جسے یہ یونیورسٹی پری یونیورسٹی امتحان کے مساوی تسلیم کرتی ہو۔

یا

جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب ماہر اور پری یونیورسٹی کلاس کی استعداد کے مطابق انگریزی کا امتحان پاس شدہ۔
۲۵ سیٹوں میں سے ۱۰ سیٹیں طالبات کے لیے مخصوص ہیں۔
منتخب امیدواروں کو سو روپیہ ماہوار وظیفہ دیا جائے گا۔ مگر انھیں ہاسٹل میں رہائش نہیں دی جائے گی
فارم داخلہ اور کورس میں داخلہ کے متعلق جملہ معلومات اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) پوسٹ بکس نمبر ۲۵ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے تین روپیہ کی نقد ادائیگی یا فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا تین روپیہ کے کراسڈ پوسٹل آرڈر بھیجے جانے پر طلب کیے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ۲۸ × ۱۲ سینٹی میٹر کا لفافہ جس پر ۱.۹۰ روپیہ کے ٹکٹ چسپاں ہوں اور اس پر اپنا پتہ تحریر ہو روانہ کریں۔ اگر درخواست فارم بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک مطلوب ہوں تو خود کا پتہ تحریر کیے ہوئے لفافہ کے ہمراہ ۵.۷۵ روپیہ کے ٹکٹ چسپاں کیے جائیں
ہر لحاظ سے مکمل درخواست فارم ۵/- روپیہ کے کراسڈ پوسٹل آرڈر کے ہمراہ جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، رجسٹریشن فیس (ناقابلِ واپسی) کے بطور ۲۵ نومبر ۸۲ء کو پانچ بجے شام تک اسسٹنٹ رجسٹرار (ایڈمیشن) کے دفتر میں پہنچ جانا چاہیے۔
نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی اور اس طرح کی درخواستوں کے سلسلہ میں مزید کوئی مراسلت نہیں کی جائے گی۔

این محی الدین
کنٹرولر آف اگزامینیشن اینڈ ایڈمیشنز

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی قومی یکجہتی سمتی کے زیر اہتمام محلہ اچل تال میں ۱۸ نومبر کو ایک جلسہ ہوا جس میں یونیورسٹی کے طلبا و اساتذہ کے علاوہ شہر کے سبھی فرقوں کے دانشوروں، صحافیوں اور تاجروں نے شرکت کی۔ اور علی گڑھ کو فرقہ وارانہ منافرت کے زہر سے پاک رکھنے کے لیے مقررین کے قیمتی مشوروں پر غور و خوض کیا۔ سب ہی لوگ اس بات پر متفق تھے کہ جب فساد شروع ہوتا ہے تو وہ ہندو مسلم بلوہ نہیں ہوتا بلکہ ان بدمعاشوں اور غنڈوں کا جھگڑا ہوتا ہے جن کا نہ کوئی دھرم ہے نہ مذہب۔

جلسے کی صدارت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب سید حامد نے فرمائی۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم رکھنے کے لیے ضروری اقدامات پر زور دیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو قومی یک جہتی کی جیتی جاگتی تصویر بتلاتے ہوئے اس بات کی خاص طور پر وضاحت کی کہ یونیورسٹی کا اپنا مفاد تو اسی میں ہے کہ شہر میں ہمیشہ امن و امان اور بھائی چارے کی فضا قائم رہے تاکہ درس و تدریس کا کام پروگرام کے مطابق پورا کرنے میں کسی طرح کا خلل نہ ہو۔ لہذا یونیورسٹی سے متعلق ہر شخص کی یہ خواہش رہتی ہے کہ علی گڑھ ہمیشہ جھگڑے فساد سے پاک رہے۔

اس موقع پر یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اسی طرح کا ایک جلسہ ۲۰ نومبر کو محلہ اوپر کوٹ میں ہوگا۔

جلسے کے اختتام پر قومی یک جہتی سمیتی کے سکریٹری مسٹر خالد ہاشمی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پانچ سو طلبہ کے لیے نئے ہوسٹل کی تعمیر کا کام شروع

مسلم یونیورسٹی بنیادی طور پر ایک درس گاہ کے علاوہ ایک اقامتی ادارہ بھی ہے۔ کچھ عرصے سے طلبہ کی تعداد میں کافی اضافہ ہو جانے کے سبب سے اس کا اقامتی کردار مجروح ہو رہا تھا۔ ادھر دو سال سے یونیورسٹی انتظامیہ کی جانب سے طلبا کے لیے مزید رہائشی سہولیات مہیا کرنے کی متواتر کوشش کی جا رہی تھی جس کے نتیجے میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے پانچ سو طلبا کی رہائش کے لیے ایک نئے ہوسٹل کی تعمیر کے واسطے ڈیڑھ کروڑ روپے کی منظوری دے دی ہے۔

اب اس ہوسٹل کی تعمیر کے سلسلے میں داغ بیل کا کام مکمل ہو گیا ہے۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ جلد از جلد عمارت تیار ہو جائے۔

تعمیرات کے جدید ترین تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوسٹل کی پلاننگ کی گئی ہے۔ طلبہ کی ضرورت کے پیش نظر ایک لائبریری بھی ہوسٹل سے ملحق ہوگی

فی الحال اس ہوسٹل کی تعمیر سے طلبا کی رہائشی دشواریوں کو دور کرنے میں بڑی حد تک مدد ملے گی۔

باقی صفحہ نمبر ۳ پر ملاحظہ فرمایئے

ترتیب:
انور حبیب علوی
امین ہاسٹل اے ایم یو۔ علی گڑھ

۱۔ پبلک سروس کمیشن (منعصبہ پردیش) کے تحت ۱۰۲۳ (۱۰۲۷) لکچررز کی عارضی جگہیں مختلف مضامین میں خالی مشتہر کی گئی ہیں ایسے حضرات جو دیے ہوئے مضامین میں کم ازکم ایم۔فل کی لیاقت رکھتے ہوں درخواست دے سکتے ہیں۔ متعلقہ دفتر میں مکمل درخواست ۳۰ر نومبر ۸۲ء تک ضرور پہنچ جانا چاہیے۔ تفصیل کے لیے امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۶ر نومبر ۸۲ء صفحہ ۱۰ ضرور ملاحظہ کیجیے۔

۲۔ یو پی ایس سی کے تحت سی ڈی ایس امتحان برائے ۸۳ء اور ۷۱ ویں قومی دفاع اکادمی امتحان برائے ۸۳ء ماہ مئی ۸۳ء میں منعقد ہوں گے۔ تفصیل کے لیے امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۶ر نومبر ۸۲ء صفحہ ۱۵ ملاحظہ فرمایئے

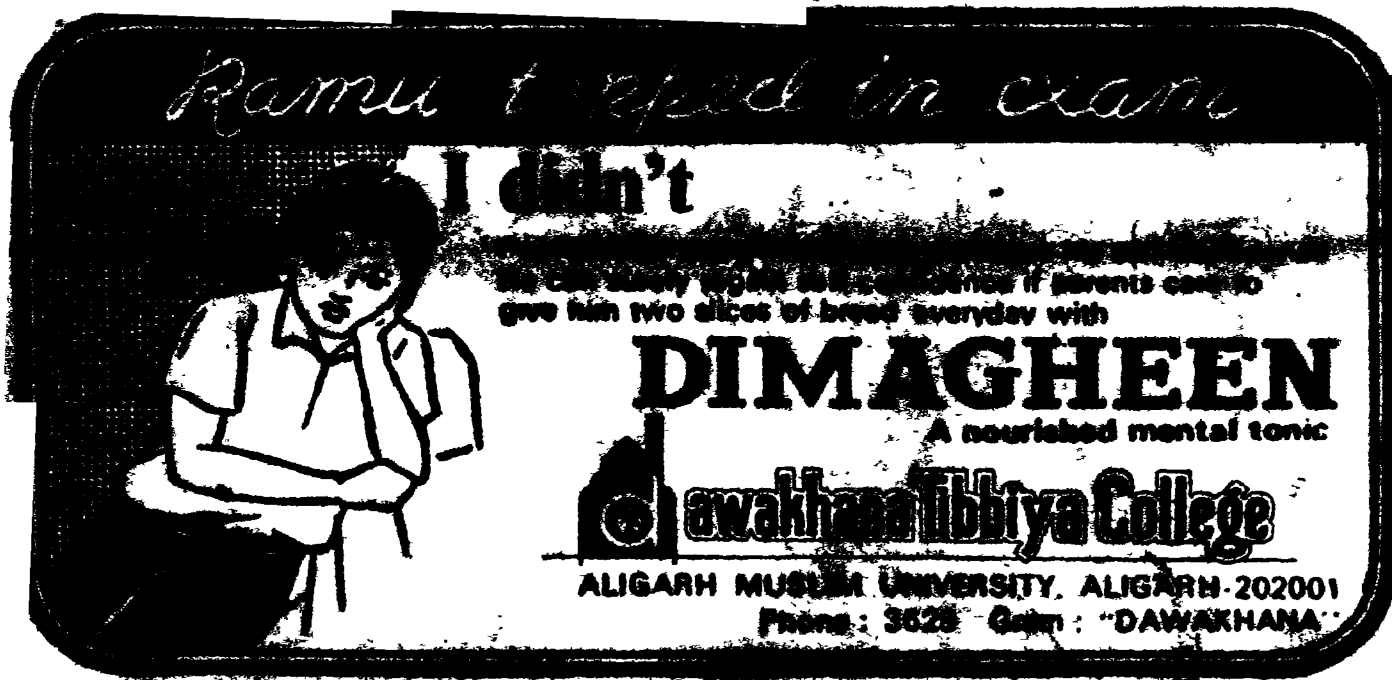
۳۔ ہندوستان کاپر لمٹیڈ (قومی ادارہ) کو گریجویٹ انجینیر ٹرینیز درکار ہیں۔ امیدوار کی عمر یکم اکتوبر ۸۲ء کو ۲۵ سال سے کم ہونا چاہیے۔ تفصیلات چاہیے تو امپلائمنٹ نیوز ۱۳ نومبر ۸۲ء کا ضرور ملاحظہ فرمایئے۔

۴ ریزرو بینک آف انڈیا کو گریڈ "بی" میں افسر کی پوسٹ پر ۷۰ لائق لوگ درکار ہیں۔ امیدوار کی عمر ۲۱ سے ۲۸ کے درمیان ہونا چاہیے۔ اور کم سے کم کسی مضمون میں ماسٹر ڈگری میں ۵۵ فی صد نمبر ہونا ضروری ہیں ۲۴ر دسمبر تک مکمل درخواست دفتر میں ضرور پہنچ جانا چاہیے۔ یہ اشتہار امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۱۳ر نومبر ۸۲ء میں ملاحظہ فرمایئے

۵۔ جنرل منیجر ٹیلی کمیونیکیشن (نارتھ ویسٹ) سرکل۔ انبالہ کو ۱۹۵ جونیر انجینیر درکار ہیں۔ امیدواروں کا تقرر میرٹ کے اعتبار سے ہوگا۔ ۱۹ سے ۲۷ سال کے حضرات اس میں درخواست دے سکتے ہیں۔ امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۱۳ر نومبر ۸۲ء میں ملاحظہ فرمایئے۔ (صفحہ نمبر ۱۵ پر)

اور اسی صفحہ ۱۵ پر ہی ۲۶۶ ٹیلی فون آپریٹر کی جگہوں کا بھی اشتہار ہے۔ جس میں ۲۱۶ جگہیں مستورات کے لیے ہیں اور باقی مردوں کے لیے۔ ۱۵ر دسمبر آخری تاریخ ہے مکمل درخواست دفتر میں پہنچنے کی۔

پرنٹر پبلشر قاضی معزالدین احمد مطبع لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ مقام اشاعت۔ صفدر منزل۔ تار بنگلہ۔ اے ایم یو۔ علی گڑھ



DIMAGHEEN
A nourished mental tonic
Dawakhana Tibbiya College
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH-202001

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER
تہذیب الاخلاق

جلد نمبر ۱ | یکم دسمبر ۱۹۸۲ء | شمارہ نمبر ۲۱

میں پردہ کی رسم کا متعدد وجوہ سے طرف دار رہا ہوں اور بالتخصیص ہندوستان میں۔ اس میں میرا کچھ اجتہاد نہیں ہے نہ میں نے اس پر کبھی غور کیا، مگر فقہائے اسلام کا مسئلہ یہ ہے کہ منہ اور ہاتھ پہنچے تک اور پاؤں ٹخنے تک ستر میں داخل نہیں ہیں۔ فقہائے متاخرین نے بسبب فسادات زمانہ منہ کو بھی پردے میں داخل کیا ہے۔

سید احمد

(ایک خط کے جواب میں)

فہرست

مادہ کے خواص — قاضی معز الدین احمد

ایک سچی کہانی — مرزا سعید الظفر چغتائی

عورت اور اسلام — محمد مجتبیٰ صدیقی

تجدید طب — سیّدہ طیبہ بیگم

انسان میں تمام خوبیاں تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں — حکیم سید کمال الدین

یونیورسٹی کے شب و روز — سر سیّد

روزگار سماچار — انور حبیب علوی

فی پرچہ ایک روپیہ
ششماہی ۱۱ روپے
سالانہ ۲۰ روپے

بیرون ہند
ایک پرچہ ایک ڈالر
سالانہ ۱۵ ڈالر

ڈرافٹ/چیک/منی آرڈر "قاضی معز الدین احمد" کے نام سے بھیجیں۔

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ
قاضی معز الدین احمد
صفدر منزل، تار بنگلہ، اے ایم یو علی گڑھ یو پی 202001

علی گڑھ

تہذیب الاخلاق

مدیر: سید حامد
وائس چانسلر، اے ایم یو

مدیر مسئول: قاضی معزالدین احمد

[illegible]

افسوس ہے کہ ماہ نومبر کے دونوں شمارے مقررہ تاریخوں سے کئی روز بعد شائع ہوئے اور خریداروں کو تاخیر سے بھیجے گئے۔ اس تاخیر کا سبب دسہرے اور محرم و دیوالی کی تعطیلات اور پریس چلانے کے لیے بجلی کی طاقت کا بار بار طویل وقفہ [illegible] تہذیب الاخلاق کے خریداروں اور پابندی سے پڑھنے والوں کو انتظار کی جو زحمت اٹھانی پڑی ہم اس پر [illegible] ہیں۔

ہر پرچہ پوسٹ کرنے کی تاریخیں ڈاکخانہ ناشر کے لیے مقرر کر دیتا ہے۔ ناشر پر ان تاریخوں میں رسالہ پوسٹ کرنے کی پابندی ہوتی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو رعایتی محصول ڈاک کا مستحق نہیں رہتا۔ رسالہ اشاعت میں تاخیر ہو جائے تو پھر ڈاک خانہ سے پوسٹ کرنے کی اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ [illegible] سمجھا جاتا ہے۔ [illegible] کے اندر دفتر کو اطلاع دے کر دوسری کاپی طلب کر لینا چاہیے۔ ایک ماہ گزر جانے کے بعد [illegible]

ہے۔ تار اتفاقیہ ہی کسی کو وقت پر مل سکتا ہوگا ورنہ جو وقت ایک کارڈ کے پہنچنے میں لگتا ہے وہی تار کے پہنچنے میں لگتا ہے یا پھر تار بالکل ہی نہیں ملتا۔ ڈاک خانہ تار کے اخراجات پورے لیتا ہے لیکن عام خط کی طرح تار بھیجتا ہے۔ اسی بنا پر تار پہنچنے میں تاخیر ہوتی ہے — راقم الحروف نے ایک ایکسپریس تار ریلوے کے ایک اعلیٰ افسر کو ایزت نگر (بریلی) بھیجا۔ ڈاک خانہ نے اس کے پورے دس روپیے وصول کیے لیکن تار چار روز میں ان صاحب کو ملا۔ یہ کوئی واحد واقعہ نہیں۔ راقم کو تو تار کے بارے میں ایسا ہی تجربہ ہوا ہے۔ حال ہی میں متعدد تار راقم کے پاس دوستوں کے آئے۔ ہر تار تین چار روز بعد ملا۔ اتنی مدت میں خط مل جاتا ہے۔ تار پر جو زر زائد خرچ ہوتا ہے۔ بس کچھ پرانی عادت ہے کہ اگر کسی سے جلد رابطہ قائم کرنا ہوتا [illegible] دے دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ رابطہ اب کبھی وقت پر قائم نہیں ہوتا اور تار دینے کا مقصد نہیں پورا ہوتا۔

اب حالت یہ ہے کہ ڈاک جو مل جائے اس پر ڈاک کا احسان مند ہونا چاہیے اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اگر نہ ملے تو پھر شکایت سے [illegible] کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی قسمت [illegible]

[illegible]

[illegible]

بعض آدمی کو اپنا [illegible] ہے یہ خیال نہیں ہوتا کہ وہ تنہا نہیں کوئی [illegible]
بستا ہے جبھی گاڑی کو روکنا ان کے لیے کوئی معیوب بات نہیں ان کو یہ
[illegible] ہوتا کہ [illegible] ہو سکتا ہے کتنوں کا قیمتی وقت ضائع
ہوگا اور وقت ضائع ہونے سے کتنوں کو مالی نقصان اٹھانا پڑے گا
کتنے ایسے ہوں گے جو اپنے کسی بیمار دوست کو دیکھنے جا رہے ہوں اور
ہو سکتا ہے کہ ان کی [illegible] ہوں۔ گاڑی اگر وقت پر نہ پہنچے تو اس کو
دیکھنے سے محروم ہو جائیں۔

بسوں کا جلانا تو اب عام بات ہے۔ بسیں جلانے میں تو یہ احساس
نہیں ہوتا کہ نقصان کس کا کر رہے ہیں اور بسیں جلنے سے جو بسوں کی تعداد
کم ہوگی اس سے پریشانی کس کو ہوگی اور مالی نقصان ہوگا تو کس
ملک کا ہوگا؟ جس کو تعمیری کاموں کے لیے ایک ایک پیسے کی ضرورت ہے

ہمارے معاشرہ میں بدقسمتی یہ ہے کہ تخریبی کاموں پر کسی
کا ضمیر اس کو ملامت نہیں کرتا۔ تعلیم اس قدر ناقص ہوتی ہے کہ طالب علم
کو سرٹیفکٹ تو مل جاتا ہے، اس کے کردار کی تعمیر نہیں ہوتی۔ اس کا ضمیر
بیدار نہیں ہوتا اور تربیت کی کمی پورے معاشرہ کی زندگی پراگندہ کر دیتی ہے

تہذیب الاخلاق سو سال بعد جاری کرنے کا فیصلہ
جب سید حامد صاحب نے کیا تو کتابت، طباعت اور کاغذ سب ہی
کے بارے میں غور کیا گیا۔ اور طباعت کے ہر مسئلہ پر تبادلۂ خیال
ہوا۔ تجربہ کار لوگوں سے بھی مشورہ کیا گیا۔ سرسید ٹائپ کی طباعت
پسند کرتے تھے۔ اس پہلو پر بھی سوچا گیا۔ آفسٹ، ون کلر سب
ہی پر تبادلۂ خیال ہوا۔ خواہش یہ تھی کہ رسالہ کی قیمت کم سے
کم ہو تاکہ زیادہ سے زیادہ عام ہو سکے اور جس خدمت کی غرض سے
نکالا گیا تھا اور اب سو سال بعد پھر جاری کیا جا رہا ہے، وہ خدمت
ہو سکے۔ اس لیے رسالہ کی طباعت کا سب سے ارزاں طریقہ اختیار

[illegible]
یہ رسالہ [illegible] کی [illegible] کھا جائے گا۔ کاتب یا آفسٹ
شائع ہو سکے رسالہ خوبصورت تو شاید ہو [illegible]
موجود ہو جائے گی اور [illegible]
کی جگہ [illegible]

یہ سب کتنا اس لیے [illegible] کی گئی کہ ہمارے
بعض قارئین رسالہ نہ ملنے کی شکایت کرتے ہیں۔ شاید خیال
یہ کرتے ہیں کہ ہم ان کو نہیں بھیجتے۔ بعض یہ چاہتے ہیں کہ رسالہ
خوبصورت طبع ہو اور آفسٹ سے چھپے۔ جو [illegible] سب
حضرات جو تہذیب الاخلاق سے [illegible] ہیں ہم ان کے ممنون ہیں
ہم ان کی تجاویز کی اور ڈاک کے سلسلے میں [illegible] کی قدر
کرتے ہیں۔ ہماری خود بھی خواہش اور کوشش ہے کہ رسالہ
اچھے سے اچھا طبع ہو اور طبع ہوتے ہی جلد سے جلد خریداروں
اور مسلسل مطالعہ کرنے والوں کو مل جائے

ق ۔ م ۔ ک

ازراہ کرم

تمام رقوم بجائے [illegible] کی شکل میں
آپ بھیجیں یا چیک کی شکل میں ارسال [illegible]
یا منی آرڈر سے
قاضی [illegible] ناصر
کے نام بھیجیے

مادّہ کے خواص

(PROPERTIES OF MATTER)

[illegible] کا [illegible] تھا کہ وہ جگہ گھیرتا ہے اور اس کا
[illegible] تھا۔ غور کرنے پر مادّہ کا تصور پیدا ہوا اور دوسرے
[illegible] ہونے لگے، جن میں سے کچھ مادے کے عام
[illegible] کی مخصوص شکلوں اور حالتوں سے متعلق۔ ہم
[illegible] مادّہ کے خواص کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ مادّہ اور توانائی کی بقا۔ بیسویں صدی کے
شروع تک قانون یہ تھا کہ مادہ نہ پیدا کیا جا سکتا ہے اور نہ فنا،
[illegible] میں آئنسٹائن نے مادّہ اور توانائی کو ہم پلہ قرار دیا
[illegible] تجربات سے تصدیق ہو گئی کہ مادّہ توانائی میں بدل جاتا ہے
[illegible] کے دوران بڑے پیمانہ پر اور متفرق نیوکلائی اعمال
و اتصال Fusion، انشقاق Fission اور تابکاری
[illegible] کے وقت تھوڑی مقدار میں لیکن قابلِ
[illegible]۔ اس کے برعکس زوج آفرینی Pair Production
وغیرہ اعمال میں توانائی مادّہ میں بدلتی ہے۔ سیاہ سوراخ ہر قسم کی
توانائی جذب کر لیتے ہیں اور وہ مادہ کی تخلیق کے کام آتی ہے۔ اس
[illegible] کہ مادہ و توانائی [illegible] کے دو مرحلے [illegible]
[illegible] دونوں [illegible] حیثیت سے غیر فانی ہیں اور ناقابلِ
[illegible]

۲۔ کمیت [illegible]۔ وزن [illegible] کے
[illegible]
[illegible]

چاروں طرف سے ڈالتے ہیں۔ اس لیے مادّہ کا بنیادی خاصّہ کمیت
ٹھہری نہ کہ وزن۔ لیکن جب آئنسٹائن نے اسی ۱۹۰۵ء میں اضافیت
کا خصوصی نظریہ پیش کیا تو اس سے نتیجہ نکلا کہ مادّہ کی رفتار روشنی
کی رفتار کے قریب ہو تو وزن محسوس طور پر بڑھنے لگتا ہے۔
۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک والٹر کاؤفمان (۱۸۷۱ء - ۱۹۴۶ء)
الفرڈ ہائن رش بیوشرر (۱۸۶۳ء ۱۹۲۶ء)، شارل الویشیے
گی (۱۸۶۲ - ۱۹۴۲ء) اور سی مون رتنوؤسکی (۱۸۸۴ء -
۱۹۳۵ء) کے تجربوں سے یہ خیال من وعن صحیح ثابت ہوا اور
کمیت کی بقا اصل مشکوک ہو گئی۔ اب "زور" Momentum اصل
قرار پایا، جو پرانی زبان میں مادّہ کی کمیت اور رفتار کا حاصل
ضرب ہوتا تھا کیونکہ مادّہ جس توانائی کا ہم پلہ ٹھہرتا ہے، زور
کا اس سے قریبی رشتہ نکل آیا۔ قانون یہ رائج ہوا کہ کسی شے کا
زور ہو، لافانی ہے۔

۲۔ دوری زور کی بقا۔ زور اور رفتار حرکت کرنے
چیزوں کے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانے سے متعلق
ہیں۔ لیکن چیزیں گھومتی بھی ہیں، ایک جگہ اپنا محور قائم رکھتے
ہوئے یا محور کے انتقال کے ساتھ ساتھ گردش Revolu-
tion - یا گھماؤ (Spin) کی رفتار اس
[illegible] ہے جس کے بقدر وہ ایک سکنڈ میں
گھوم گئے۔ اس زاویائی رفتار کو کمیت سے ضرب [illegible]
زاویائی یا دوری زور (Angular momentum) [illegible]

حاصل ہوتا ہے۔ مادّہ کا یہ نیا خاصّہ پہلے زور سے بالکل الگ اور اپنے طور پر لافانی ہے۔

۱۹۳۰ء کے قریب ڈراک (Dirac) اور [illegible] ([illegible]) نے زور کے ساتھ یہ دوررس نتیجہ نکالا کہ طبعیات کے بنیادی قوانین کائنات میں ہر جگہ یکساں ہیں اور کوئی دور سے یہ کہ مکان (space) کھاؤ سے متاثر نہیں ہوتا تھا کے معنیٰ یہ ہیں کہ کوئی چلتی ہوئی چیز اس وقت تک چلتی اور گھومتی ہوئی شے اس وقت تک گھومتی رہے گی کہ اسے باہر سے قوّت لگا کے روکا نہ جائے۔ اس سے کمیّت کی تعریف یہ نکل آتی ہے کہ زیادہ کمیّت والے جسم کو روکنے یا تیز تر حرکت کرانے کے لیے زیادہ قوّت (force) لگتی ہے۔

۴ بنیادی طبعی قوتیں :- قوت ایک تو مکانیکی طور پر لگائی جا سکتی ہے، جیسے گیند پر بلّے کی چوٹ، انجن کا ریل کو کھینچنا، ہوا کے جھونکے سے چیزوں کا اُڑ جانا وغیرہ۔ لیکن چار طبعی طاقتیں ایسی دریافت ہوئی ہیں جو ہر حال میں کام کرتی رہتی ہیں۔ شدّت کے لحاظ سے ان کی ترتیب یہ ہے (۱) مرکزی (Nuclear) (۲) برقی (electrical) (پہلی کی $\frac{1}{100}$) (۳) خفیف (weak) (دوسری کا دس لاکھواں حصّہ) اور (۴) ثقلی (Gravitational) (تیسری کا ہے بھی 10^{-20} یعنی ارب × ارب × ارب گنی کمزور)۔ پہلی قوت بہت شدید ہے، لیکن ایٹم کے قطر (چند انگسٹرام یا ملی میٹر کے کروڑویں حصہ) سے زیادہ فاصلہ پر نہیں لگ سکتی۔ ایٹم کے مرکزے اسی قوت سے بندھے رہتے ہیں۔ برقی قوت کئی سینٹی میٹر، بلکہ استثنائی حالتوں میں کئی میٹر فاصلے تک موثر رہتی ہے۔ تمام ایٹمی، سالماتی اور کیمیاوی اعمال اسی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ خفیف قوت مرکزی انحطاط (decay) کا سبب ہے اور اس کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں۔

۵ ثقلیہ :- (gravitation)۔ اب زمین آخر ہو ہے۔ اس [illegible]

قوتِ ثقل، تو اس سے ہماری واقفیت بہت پرانی ہے۔ نیوٹن نے ۱۶۶۰ء کے قریب یہ بنیادی قانونِ ثقل دریافت کیا تھا کہ سبھی چیزیں چاہے ان کے درمیان کتنا ہی فاصلہ کیوں نہ ہو، ایک دوسرے کو اپنی کمیتوں کے حاصلِ ضرب اور فاصلے کے مربع معکوس کے بقدر اپنی طرف کھینچتی ہیں ($F = G\frac{m_1 m_2}{r^2}$)۔ اس سے سیاروں کی حرکت (Planetary motion) کے وہ تینوں قانون نکل آتے ہیں جو یوہانس کیپلر (Kepla ۱۵۷۱ - ۱۶۳۰ء) نے شروع سترھویں صدی میں دریافت کیے تھے۔ یعنی

(۱) سیارے سورج کے گرد ایسے اہلیجی مداروں (elliptical orbits) پر گھومتے ہیں جن کے ایک ماسکہ نقطہ (focus) پر سورج ہوتا ہے۔

(۲) سورج سے سیارہ تک حامل خط (Vector radius) برابر اوقات میں برابر رقبے پار کرتا ہے اور

۳ سیاروں کی گردش کی میعاد کا مربع مدار کے نصف بڑے محور کے مکعب کے تناسب میں ہوتا ہے ($T^2 \propto a^3$)

نیوٹن کے قانونِ ثقل سے یہ بھی نکلتا ہے کہ زمین کیوں ہمیں عرض البلد، بلندی اور گہرائی کے فرق پر مختلف قوتوں سے کھینچتی ہے اور ہم قطب (pole) سے خطِ استوا (equator) کی طرف آئیں یا سطح سے اوپر نیچے کی طرف ہٹیں، یہ قوت کیوں کم ہوتی جاتی ہے

۱۷۹۸ء میں ہنری کے وندش (Henry Cavendish ۱۷۳۱ - ۱۸۱۰ء) نے ثقلی مستقلہ (6.67×10^{-8} = G سینٹی میٹر فی گرام سکنڈ مربع) تجربہ گاہ میں ناپا تھا۔ ۱۷۷۳ء میں ژوزف لوئی لگ رانژ (Joseph Louis Lagrange ۱۷۳۶ - ۱۸۱۳ء) نے ثقلی صلاحیت (gravitational potential) کی تعریف کی۔ ۱۸۰۰ء میں لاپلاس (Laplace) نے ثقلی صلاحیت [illegible]

۱۸۱۲ء میں اب اس کی تفرقی مساوات (Differential
Equation) ($\nabla^2 \phi = 0$) کو سی مئوں ڈنی پواسون
(Simeon Denis Poisson ف ۱۸۴۰ - ۱۷۸۱)
نے وسعت دے کر نیوٹن کے قانونِ ثقل کو مزید عمومیت بخشی
اب یہ ممکن تھا کہ سورج کے گرد سیاروں کے مدار پیمان خفیف
اثرات کا حساب لگایا جائے جو سیاروں کی باہمی کشش سے
پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح یوہن گاٹ فریڈ گال Johann
Gottfried Galle (ج ۱۸۱۲ - ۱۹۱۰) کے
حساب کی بنیاد پر ۱۸۴۶ء میں اربین ژاں ژوزف لوے
(Urbain Jean-Joseph Leverrier ف ۱۸۱۱ - ۷۷)
نے سیارہ نیپچون (Neptune) دریافت کیا اور پرسی
ول لاول (Percival Lowell ام ۱۸۵۵ ۱۹۱۶)
کے حساب کے مطابق ۱۹۳۰ء میں پلوٹو (Pluto) دریافت
ہوا۔ تاہم اِن قاعدوں کے مطابق حساب لگانے پر سیارہ
عطارد (Mercury) کے مدار کے نقطۂ اقرب
(Perihelion) کی اپنی سطح میں گردش میں فی سو
سال ۴۳ قوسی سکنڈ (sec. of arc) کا فرق رہ گیا
آئنسٹائن نے ۱۹۱۶ء میں عام اضافیت
سے بحث کر کے بتایا کہ برقی، مقناطیسی اور مرکزوی (نیوکلیائی)
میدانوں کی طرح ہر مادّی جسم ایک ثقلی میدان کو جنم دیتا ہے۔
اور دو جسموں کے میدان ایک دوسرے تک پھیل کے ان پر
اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ اعتراض دور ہوگیا کہ
اجسام اپنے سے دور کسی دوسرے جسم پر کیسے عمل کرتے ہیں
آئنسٹائن نے عطارد کے مدار کی گردش کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔
۱۹۱۹ء کے سورج گرہن کے موقع
پر یہ مشاہدہ کیا جا سکا کہ سورج کے قریب سے گزرنے والی
کرنیں اس کی طرف جھک جاتی ہیں جیسے کہ وہ سورج کے میلان ...

سے متاثر ہو رہی ہوں۔ یہ قیاس مجبا قوی کی مقدار کے پیمائش
پر پورا اترا اور اس طرح آئنسٹائن کے ثقلی تصورات کی بھی
تصدیق ہو گئی اور اس کے اس خیال کی بھی کہ مادّہ و توانائی
ہم پلہ ہیں۔
(۶) مکانیک گستاؤ رابرٹ کرشوف Gustav
(Robert Kirchhoff ج ۱۸۲۴ — ۸۷) کے بقول
حرکیات کے علم کو مکانیک کہتے ہیں۔ قوتِ ثقل کے ماتحت چیزوں
یا جسموں کا عمل حرکت کے ان قوانین کے تحت آجاتا ہے جو کیپلر،
دے کارت، گلی لیو، ہائی گنس اور لائب نٹس کی کوششوں
کی بنیاد پر نیوٹن نے ہمیں دی ہیں۔ یعنی
۱۔ جب کسی چیز پر باہر سے قوت نہ لگے، وہ خطِ مستقیم میں
یکساں رفتار سے حرکت کرتی رہتی ہے۔ (۲) جتنی قوت لگائی
جائے، اس کی متناسب شرح سے زور میں تبدیلی ہوتی ہے
اور (۳) ہر عمل کا اس کے برابر لیکن مخالف سمت میں ردِّ عمل
ہوتا ہے۔
کائنات کا نظام حرکی ہے۔ اضافیت سے
ثابت ہوا کہ کسی شے پر باہر سے قوت نہ لگ رہی ہو تو اپنی
رفتار سے چلنے والے ہر نظام سے وہ ساکن معلوم ہوتی ہے
یہی سکون کی تعریف ہے۔ لیکن اگر اس کے برخلاف سکون کو
اصل مان لیں تو حرکت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہی الٹا استدلال
مشہور یونانی فلسفی زینو کے لئے Zeno Paradox
کا سبب تھا۔
قوت لگانے پر توانائی صرف ہوتی ہے
اسی لیے قوت لگا کر کسی جانے والے کام کو منفی توانائی کہتے ہیں
اس طرح دوسرے قانونِ حرکت کے استعمال سے زور اور
توانائی کا وہ رشتہ نکل آتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔
سکونیات یا توازن کے نظریے ...

میکانیک (Mechanics) انسان کی دریافت کردہ اولین علوم میں سے ہے۔ لیور (Lever)، پچ اور ڈھلواں سطح کا استعمال قدیم زمانے سے ہوتا آیا ہے۔ خصوصی گھن اور مرکز ثقل کا تصور یونانیوں نے دیا۔ فرضی انتقال (Virtual displacement) کا تصور نظریہ سکونیات کا کمال سمجھا گیا۔ آرکی میڈیز (Archimedes، ۲۸۷-۲۱۲ ق م) نے یہ قانون دریافت کیا کہ "رقیق میں ڈوبنے پر ہر ٹھوس اپنے حجم کے برابر رقیق ہٹاتا ہے اور اس عمل میں اس کا وزن ہٹنے والے رقیق کے وزن کے برابر گھٹ جاتا ہے"۔ سی مون سٹیوی نس (Simon Stevinus) (۱۵۴۸-۱۶۲۰) نے ڈھلواں سطحوں پر توازن کے مطالعے سے قوت کی اجزا (Component) میں تقسیم کا اصول دریافت کیا

میکانیک کی ریاضیات کو فروغ دے کر جن لوگوں نے عصری فلسفہ و سیاست پر گہرا اثر ڈالا، ان میں یہ نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ڈنیل برنولی (Daniel Bernoulli) (۱۷۰۰-۸۲) اور لیونارڈ آئے لر (Leonard Euler) (۱۷۰۷-۸۳) نے متعدد دکلیتی نقطوں کے نظام، ٹھوس اجسام اور آب حرکیات (Hydrodynamics) کا مطالعہ کیا۔ ژاں لروں ڈلیمبر (Jean Lerond d'Alembert، ۱۷۱۷-۸۳) نے حرکت کی مساواتوں کا اہم اصول بنایا۔ جوزف لوئی لاگرانژ (Joseph Louis Lagrange) (۱۷۳۶-۱۸۱۳) نے ان تفرقی مساواتوں (Differential equations) کو اور وسعت بخشی۔

لاپلاس کی فلکی میکانیک کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اس میں [illegible] اور باریک نلیوں پر [illegible] بحث ملتی ہے۔ لوئی پوئی ریاں سون (Louis Poisson، ۱۷۸۱-۱۸۴۰) نے واقعات پر زمین کے گھماؤ کے اثرات کا تجزیہ کیا۔ کارل گستاف یاکوب یاکوبی نے ہملٹن یاکوبی تفرقی مساوات نکالی۔

متغیرات کے فرما اصول کے نتیجے پر پیئر لوئی موپرتوئیس (Pierre Louis Maupertuis) (۱۶۹۸-۱۷۵۹ء) نے مختصر ترین اقدام (Least Action) کا اصول بتایا، اسے لاگ ماگر نے صحیح طور پر بیان کیا اور ولیم روون ہملٹن (William Rowan Hamilton) (۱۸۰۵-۶۵ء) نے موجودہ شکل میں رواج دیا کہ فطری اعمال اس طرح پیش آتے ہیں کہ ان کا راستہ قائم رہ سکے۔ یعنی وہ کم سے کم، زیادہ سے زیادہ یا ہمیشہ برابر ہوتا ہے، جس صورت کا بھی اطلاق ممکن ہو۔ ہرمن ہلم ہولٹس (Hermann von Helmholtz، ۱۸۲۱-۹۴ء) نے ۱۸۸۶ء میں اسے بہت سے مکانیکی اعمال پر لگایا اور ماکس پلانک (Max Planck، ۱۸۵۸-۱۹۴۷ء) نے اسے خطرات کا سب سے جامع قانون ٹھہرایا۔

اس بحث سے پتہ چلتا ہے کہ سکونیات (Statics) میکانیک کی قدیم ترین شاخ تھی۔ حرکیات (Dynamics)، آب حرکیات (Hydrodynamics) جو دراصل رقیق حرکیات ہے، سیال میکانیک (Fluid Mechanics)، ہوا حرکیات (Aerodynamics) وغیرہ شاخیں بعد میں نکلتی چلی آئیں۔ خالص نظریاتی طور پر تاریخ میکانیک (Classical Mechanics) آگے چل کر مقادیری (Quantum) میکانیک میں ڈھل گئی۔ عملی میدان میں لچک (Elasticity)، سطحی تناؤ (Surface Tension)، گاڑھا پن (Viscosity) کے نظریوں کا اضافہ ہوا۔ جن کا انجینئرنگ میں بڑا استعمال ہوتا ہے۔

۷- لچک۔ ۱۹۲۹ء میں رابرٹ ہک (Robert Hooke) [illegible]

ہو سکے۔ اس لیے رسالہ کی طباعت کا سب سے اہم [illegible]

ب ۱۶۳۵ء-۱۷۰۳ء نے اس قانون کی دریافت سے لچک کے نظریہ کا در کھولا کہ ایک حد کے اندر ٹھوس چیزوں کی لمبائی، جسامت یا شکل میں کھنچاؤ (Strain) ان کے اندرونی تناؤ (Stress) کے تناسب میں ہوتا ہے۔ اوگیوسٹین لوئی کوشی (Augustin Louis Cauchy ۱۷۸۹ء-۱۸۵۷ء) نے ۱۸۲۲ میں کھنچاؤ اور تناؤ کی ریاضی اور شکل بدلنے والے Deformable اجسام کی میکانیک بنا ڈالی

ہک قانون کے مطابق لچک کی حد کے اندر کھنچاؤ اور تناؤ کا تناسب قائم رہتا ہے۔ رشتہ تناسب Proportionality Constant کو لچک کا پیمانہ کہتے ہیں۔ لچک کا پیمانہ فولاد جیسی سخت چیزوں کا زیادہ ہوتا ہے اور ربر وغیرہ کا بہت کم، جو عرف عام میں زیادہ لچکیلی سمجھی جاتی ہیں۔ کیوں کہ ان کی لچک کی حد (Elastic Limit) بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس حد سے زیادہ دباؤ پڑے تو چیزیں اپنی بالکل پہلی شکل پر واپس نہیں آتیں بلکہ تھوڑی بہت مستقل طور پر کھنچ جاتی ہے۔ دیر تک کھنچاؤ میں رہنے کے بعد بیرونی طاقت گھٹانے بڑھانے پر چیزوں کے بڑھنے گھٹنے میں دیر لگتی ہے۔ کیونکہ انہیں لچکیلا تکان (Elastic fatigue) ہو جاتا ہے۔ لچک کی حد سے دوگنے تک تناؤ پیدا کرنے پر عام طور سے چیزیں ٹوٹ جاتی ہیں۔

تناؤ ہمیشہ اس دقت سے ناپا جاتا ہے جو اپنے دفاع میں اندرونی طور پر فی مربع رقبہ پیدا ہو جاتی ہے۔ کھنچاؤ البتہ تین طرح کا ہوتا ہے۔ یعنی لمبائی، حجم اور شکل سے متعلق۔ یہ علی الترتیب ایک، تین یا دو بُعد میں ہوتا ہے۔ اور اس کی پیمائش اکائی لمبائی یا حجم میں فرق یا شکل بگڑنے کے زاویہ کی صورت میں ہوتی ہے اس طرح ٹھہرنے کی لچک کے تین پیمانے ہوتے ہیں۔ لمبائی کے لحاظ سے ینگ [Young] پیمانہ، حجم کا جسامت پیمانہ اور شکل کا اینٹھن (Shear) پیمانہ۔

لمبائی میں زور لگانے پر لمبائی تو بڑھتی ہے مگر چوڑائی اور موٹائی کچھ گھٹ بھی جاتی ہیں۔ اکائی چوڑائی اور اکائی لمبائی میں پیدا ہونے والے فرقوں کے تناسب کو "پواسوں رشتہ" (Poisson ratio) کہتے ہیں جسے لچک کا چوتھا پیمانہ کہہ سکتے ہیں۔ چاروں کا آپس میں تعلق ہوتا ہے۔ ہر میکانیکی یا شہری تعمیر میں مضبوطی کا اندازہ ان کی مدد سے لگتا ہے۔ ایک مثال مکانوں یا پلوں میں لوہے یا سیمنٹ کی بیموں کے جھکاؤ Bending of Beams کی ہے جو خود ان کے وزن یا دیواروں وغیرہ کے دباؤ سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کا ہر ریشہ لمبائی میں کھنچتا اور چوڑائی میں سکڑتا ہے، لیکن بیرونی ریشوں پر کھنچاؤ زیادہ پڑتا ہے۔ درمیانی ریشوں پر تقریباً نہیں پڑتا۔ اس مطالعہ کی وجہ سے بیم یا ریل کی پٹڑی کا درمیانی حصہ کم رکھا جاتا ہے۔ بیم کا جھکاؤ اس کی لمبائی کے مکعب تناسب میں ہوتا ہے، چوڑائی کے مکعب معکوس اور ینگ پیمانہ و موٹائی کے سادہ معکوس تناسب میں۔

۸۔ سطحی تناؤ :۔ کسی برتن میں رقیق بھرا ہو تو کناروں پر یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ ایک طرف ٹھوس ہے دوسری طرف رقیق اور تیسری سمت ہوا یا خلا۔ ٹھوس اور رقیق دونوں کے ذرّے یا ایٹم ایک دوسرے پر بھی زور لگاتے ہیں اور آپس میں بھی۔ نتیجہ کے طور پر کنارے کنارے رقیق ذرا چڑھ آتی ہے (شیشہ پانی) یا اتر جاتی ہے۔ (شیشہ پارا) اگر برتن کے طور پر ہم ایک مہین نلی استعمال کریں تو یہ اتار چڑھاؤ قطر کے معکوس تناسب میں ہونے کی وجہ سے کئی کئی سنٹی میٹر ہو سکتا ہے [illegible]

سطحی تناؤ کناروں تک محدود نہیں
رقیق کے اندرونی ایٹم سطح پر اندر کی طرف دباؤ ڈالتے ہیں اور خود سطح پر واقع ایٹم ایک دوسرے کو جکڑے رہتے ہیں۔ جب کبھی رقیق میں گھسی ہوئی ہوا باہر نکلنا چاہتی ہے تو یہ انہی قوتیں سطح کو پھٹنے سے روکتی ہیں اور بلبلے بن جاتے ہیں۔ جب تک ہوا کا دباؤ ان دفاعی قوتوں سے بڑھ نہ جائے، وہ ٹوٹتے نہیں۔ برتن سے انڈیلتے وقت رقیق کا دوسری سمتوں میں بہہ نکلنا، چھوٹی بڑی کروی بوندوں کا بننا وغیرہ سطحی تناؤ کے باعث ہے
رقیق کی سطح پر اٹھنے والی چھوٹی لہریں (Ripples) بھی سطحی تناؤ سے متاثر ہوتی ہیں لہروں کی رفتار لہر لمبائی (طول موج) رقیق کے گھنگ اور ثقل g (gravity) کے علاوہ سطحی تناؤ T پر بھی مبنی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ بڑھتی ہے۔ رفتار کم سے کم ہوتی ہے۔ ایک فاصل (Critical) زاویہ پر جو T کے جزر مربع - (Square root) کے براہ راست اور ρ د g کے جزر مربع معکوس کے تناسب میں ہوتی ہے۔ سطحی تناؤ درجہ حرارت کے ساتھ گھٹتا ہے، اس پر سطح کی آلودگی یا رقیق میں ملاوٹ کا اثر پڑتا ہے۔

اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنے والوں میں ژوزف لوئی گے لیوساک (Joseph Louis Gay-Lussac - ۱۷۷۸ - ۱۸۵۰ء) فرانس نوئی من (Franz Neumann ۱۷۹۸-۱۸۹۵ء) کونک (Quincke) لارڈ ریلے (Rayleigh) جیگر (Jaeger) سرل (Searle) فرگوسن (Ferguson ۱۸۸۱ - ۱۹۱۹ء) اور کنیڈی (Kennedy) کے نام خاص طور پر کھڑے ہیں
A سیال کا بہاؤ۔ ۱۶۴۴ء میں توری چلی

(Torricelli) نے یہ نکتہ پیش کیا کہ کسی برتن کے سوراخ سے باہر نکلنے والی رقیق کی رفتار اپنی سطح سے اس سوراخ تک بغیر رکاوٹ کے گرنے سے پیدا ہونے والی رفتار کے برابر ہے۔ یہ نتیجہ برنولی کے اس وسیع تر اصول سے نکل آتا ہے رقیق کی حرکی اور صلاحیتی (Potential) توانائیوں کا مجموعہ مستقل ہوتا ہے۔ یہ اصول خود توانائی کی بقا کے عام اصول کی خاص شکل ہے۔ لیوں پوا سے ژی (Jean Poiseuille ۱۷۹۹ - ۱۸۶۹ء) نے سیالوں کی اندرونی رگڑ کا مطالعہ کیا اور ہلم ہولٹس نے ۱۸۵۸ء میں بھنور Vortex کے قوانین دریافت کیے۔ بعد میں لارڈ ریلے، آسبورن رینولڈز (Osborne Reynolds ۱۸۴۲ - ۱۹۱۲ء) اور پرینٹل L. Prandtl نے سیالوں کی حرکیات کو اور آگے بڑھایا اور آج تک جہازوں اور خصوصاً ہوائی جہازوں کو ترقی دینے کے لیے اس موضوع پر خصوصی تحقیقات جاری ہے

۱.۹ لزوجت یا لیس (Viscosity) بیں ایک حد تک ہر سیال کی خصوصیت ہے۔ بہتے وقت دراصل سیال کی تہیں بن جاتی ہیں۔ برتن کی سطح سے ملی ہوئی تہہ تقریباً نہیں بہتی۔ جو تہہ اس سے جتنی دور ہوتی جاتی ہے اتنی ہی زور سے بہتی ہے۔ تیز رفتار تہہ خود سے ملی ہوئی آہستہ رو تہہ کو اپنی رگڑ سے تیز کرنا چاہتی ہے اور وہ پہلی تہہ کو آہستہ۔ اگر سیال کی مجموعی رفتار زیادہ تیز نہ ہو تو بہاؤ منظم (Stream line) ہوتا ہے اور تہوں کی ترتیب قائم رہتی ہے۔ ورنہ ایک فاصل رفتار کے اوپر پرآشوب (Turbulent) ہو جاتا ہے۔ فاصل رفتار رقیق کے گھنگ اور وہ جس نلی میں بہہ رہی ہو اس کے قطر کے معکوس تناسب میں اور رقیق کے لیس کی شرح ... (Coefficient of Viscosity

ہے ($\eta = \dots$) لیس کی شرح کی تعریف یہ ہے کہ اس کے برابر قوت لگانے سے اکائی عمودی فاصلے پر بہنے والی متعلقہ سیال کی اکائی سطحوں کے بیچ اکائی رفتار کا فرق قائم رہے گا۔

سیال کا لیس ٹھوس کی رگڑ کے جیسا ہے۔ η کی اکائی ایک پیاز جیسی ہوتی ہے۔ اس لیے لیس کو بھاگتی لچک (Fugitive Elasticity) کہہ سکتے ہیں۔

پتلی گاڑھی رقیقوں اور گیسوں کا لیس الگ الگ طریقوں سے نکالا گیا ہے۔ اُن کا مطالعہ پوآسے ئی کے علاوہ اسٹوکس (Stokes) آسٹ والد (Ostwald) اور رینکن (Rankine) نے کیا ہے۔ اسٹوکس کا قانون بتاتا ہے کہ لیس دار واسطوں میں گرنے پر ایک چھوٹے کروی جسم (قطر $2r$) کی حتمی رفتار (v) نصف قطر کے مربع (r^2) جسم اور واسطے کے گھنوں کے فرق کے متناسب اور (η) واسطے کے لیس کی شرح کے معکوس تناسب میں ہوتی ہے ($v = \frac{2}{9}\frac{gr^2}{\eta}(\sigma - \rho)$)
گاڑھے پن کی شرح عام طور پر درجہ حرارت کے ساتھ گھٹتی ہے مگر اس کا کوئی عالمی قانون نہیں۔

۹-۴ خلا سازی (Vacuum Production) سیالوں کے بہاؤ کے مطالعہ کا اہم استعمال دباؤ کم کرنے والے پمپ بنانے میں ہوا ہے۔ جن کی مدد سے گھومنے والے اور پارے یا تیل کی بھاپ استعمال کرنے والے پمپ یکے بعد دیگرے استعمال کر کے 10^{-6} تور (پارے کے ملی میٹر) جتنا دباؤ گھٹایا جا سکا۔ نئی حرفت (Techno-logy) کے استعمال سے ۱۹۷۵ء میں $10^{-[illegible]}$ تور تک دباؤ گھٹانے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے لیے $10^{-[illegible]}$ تور کے آگے جھلیوں کے آرپار نفوذ (Diffusion) اور آسموسس (Osmosis) کے اصول استعمال کیے جاتے ہیں۔
[illegible]

سیال کا گھن یا گاڑھا پن مختلف ہے تو وہ آہستہ آہستہ جھلی کے مہین مساموں (Pores) سے ہو کر دوسری طرف پہنچ نکلتے ہیں۔

۹-۳ نفوذ اور آسماسس۔ سیالوں کے سالموں کا ثقلیت (gravitation) یا کم زیادہ گاڑھے پن (concentration) کی پرواہ کیے بغیر ایک سے دوسرے میں داخل ہوتے رہنا نفوذ کہلاتا ہے۔ ۱۸۵۵ء میں فک (Fick) نے گرمی کے ایصال کے فوریے (Fourier) قانون کے جوڑ پر نفوذ کا یہ قانون بنایا کہ کسی سمت میں ایک سیال کے نفوذ کی شرح (Rate) اس سمت میں اس کے گاڑھے پن کے ڈھال (یا اتار) (gradient) کے تناسب میں ہوتی ہے۔ گراہم (Graham) کا مشہور قانون نفوذ یہ ہے کہ دو گیسوں کے نفوذ کی شرح ان کے گھن (density) کے جزر مربع کے متناسب ہوتی ہے۔ نمک یا شکر کے حل جیسی چیزیں تیزی سے نفوذ کرتی ہیں۔ انھیں "قلم نما" (Crystalloids) کہتے ہیں۔ چربی گوند وغیرہ چیزیں دیر میں نفوذ پاتی ہیں۔ انھیں "بستہ" (Colloids) قرار دیتے ہیں۔

جھلی سے ہو کر پانی وغیرہ قسم کی پتلی چیزیں جلد گزر جاتی ہیں اور الکحل کی طرح زیادہ گاڑھے رقیق نسبتاً دیر میں۔ اس خاصہ کے استعمال سے مخلوط رقیقوں کو چھانا جا سکتا ہے اور اس عمل کو (dialysis) کہتے ہیں۔

جھلی کے آرپار نفوذ (آسماسس) رقیق کے گاڑھے پن اور درجہ حرارت کے متناسب ہوتا ہے اور اس دباؤ سے بڑھتا گھٹتا ہے جو نفوذ کی سمت میں یا اس کے خلاف ڈالا جائے۔ جتنا خلاف دباؤ اس عمل کو بالکل روک کر دے، اسے آسماٹک یا نفوذ کا دباؤ (Osmotic Pressure) کہتے ہیں۔ اس موضوع پر ابتدائی کام کرنے والوں کے نام ہیں۔ Pfeffer ...

ا رڈ [illegible] Hart) اور فانٹ ہوف (Van't Hoff)
جس کی دریافت کے مطابق بہت ہلکے محلول کا آسماٹک دباؤ صرف
محلول کے اس دباؤ کے برابر ہوتا ہے جو وہ اسی درجۂ حرارت
اور حجم پر گیس ہونے کی صورت میں ڈالتا

۱۰ - اعلا سیالی۔ دو پروٹان اور نیوٹران کے صفت
مرکزہ والی ہیلیم ۴ گیس ۲٫۰۵ درجہ مطلق سے نیچے ٹھنڈی
کی جائے تو رقیق بننے لگتی ہے جو ۴٫۲ درجہ مطلق پر ابلتی ہے
لیکن یہ رقیق ہیلیم ۴ مطلق صفر درجہ تک رقیق ہی رہتا ہے
اور اس وقت تک ٹھوس نہیں ہوتی کہ کم از کم ۲۵ فضائی اکائی
کا دباؤ (Atmospheric pressure) نہ ڈالا
جائے۔ یہ خاصہ اس مقادیری سبب سے ہے کہ کم درجۂ حرارت
پر اپنی صلاحیتی توانائی اور گھٹا لینے کے لیے ہیلیم کے آزاد ایٹم
اپنے کم سے کم ممکن فاصلہ ۴ انگسٹرام سے زیادہ دور چلے جاتے
ہیں۔ اور ٹھوس کا ڈھانچہ جمنے نہیں پاتا

اس رقیق کے زیادہ حیرت انگیز خاصے ۲٫۱۸
کے فاصل درجہ مطلق کے نیچے مشاہدہ میں آئے ہیں۔ عکس ریز
یا نیوٹران تداخل (Diffraction) کے استعمال سے اس درجۂ
حرارت پر رقیق بناوٹ میں تو کوئی تبدیلی دریافت نہیں ہو سکی
لیکن رقیق کی خصوصی گرمی (Specific heat) اور
پھیلنے کی شرح (Coefficient of expansion)
میں اس نقطہ پر دفعتاً غیر مسلسل تبدیلی ہوتی ہے۔ اس نقطہ سے
کم درجۂ حرارت پر کچھ رقیق ہیلیم ۴ ملی میٹر کے دس ہزارویں
حصے جتنے غیر معمولی طور پر تنگ راستوں سے بھی بہہ نکلتا ہے،
جس کے لیے رقیق کے لیس کی شرح عام طور (۱) اکائی کے بجائے
۱۰⁻¹¹ اکائی کے بہ قدر ہونا چاہیے۔ سیالی کی رگڑ کی مدد سے
نکالی جائے تو اس درجۂ حرارت پر رقیق ہیلیم ۴ کے لیس کی
[illegible]

کیا گیا کہ ۲٫۱۸ کے فاصل درجۂ حرارت ایک نئی رقیق ہیلیم
۴ II بننے لگتی ہے اور معمولی رقیق ہیلیم ۴ I دو درجہ مطلق تک
پہنچتے پہنچتے تمام تر اس میں بدل جاتی ہے۔ نئی رقیق اعلیٰ
سیال ہے اور غیر معمولی مظاہر اس کی بدولت پیش آتے ہیں
۲٫۱ ملی میٹر کے فاصلوں پر متعدد متوازی تھالیاں رکھ کے
۲٫۱۰ درجہ کے نیچے مختلف حرارتوں پر لیس کی شرح نکالی گئی
تو نتیجے دو رقیقوں کے اس نظریہ کے مطابق آئے۔

ہیلیم ۴ II فاصل درجہ حرارت کے اندر گرمی
پاکے سکڑتی ہے، اور معمولی ہیلیم ۴ I کے برخلاف گرمی کے
مخرج کی طرف بھاگتی ہے۔ اس کا لیس عام رقیق کا دس لاکھواں
حصہ یا تقریباً صفر ہوتا ہے، اس لیے گرمی پا کے اس کا درجۂ
حرارت تقریباً نہیں بڑھتا، یعنی ہیلیم ۴ II کی خصوصی گرمی بھی
بہ قدر صفر ہوتی ہے اور اس سے وابستہ انٹراپی بھی۔

عام آواز کی لہر کے علاوہ جو ہیلیم ۴ I اور
II کے ہم مرحلہ (in-Phase) ارتعاش سے پیدا ہوتی ہے
رقیق ہیلیم میں ایک "دوسری آواز" کی حرارت کی لہریں بھی پیدا
ہوتی ہیں۔ دونوں ہیلیم رقیقوں کے خلاف مرحلہ (out of - Phase) - ارتعاش سے یہ نئی لہریں وجود میں آتی ہیں۔
اور ان کی رفتارِ حرارت گھٹنے کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

ہیلیم ۴ II کی باریک تہہ حرارت کے چڑھاؤ
(upward temp gradient) اور ثقل کے خلاف
برتن پر رینگ جاتی ہے۔ جس کا سبب غالباً ہیلیم ایٹموں اور
برتن کے درمیان فان ڈر وال (Van der waals)
قوتیں ہوتی ہیں۔

اعلیٰ سیالی کے ان مظاہر کا مطالعہ کرنے
والوں میں لنڈن (F. London)، تیشا (L. Tisza)
کپتسا [illegible]

محمد مجتبیٰ صدیقی
علی گڑھ

ایک سچّی کہانی

بات کچھ سو برس سے اوپر کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کا جوشِ انتقام ٹھنڈا پڑا تو ان میں سے چند کو جن کا ضمیر بالکل مردہ نہیں ہو گیا تھا، یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ان مظالم کی جو بے گناہ مسلمانوں پر توڑے گئے تھے، کسی طرح تلافی کی جائے۔ ایک صاحب نے مسلمانوں کی پسماندگی دور کرنے کے خیال سے ایک مدرسہ قائم کرنا چاہا اور مدرسہ کے لیے اچھے اساتذہ کی تلاش میں وہ مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی میں پہنچے۔ وہاں ایک مولوی صاحب کی لیاقت کی تعریف سن کر اُن کے مدرسہ میں گئے۔ مولوی صاحب اس وقت طلبا کو درس دے رہے تھے۔ اُن سے اجازت لے کر یہ بھی وہاں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک درس میں شرکت کے بعد (اس وقت اکثر انگریز اردو و فارسی سے واقف ہوا کرتے تھے) انھوں نے اندازہ کیا کہ مولوی صاحب ان کے مدرسہ کے لیے بہت موزوں ہوں گے۔ چنانچہ درس ختم ہونے کے بعد انھوں نے سلسلۂ کلام یوں شروع کیا۔

انگریز:۔ مولوی صاحب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو کیا مشاہرہ ملتا ہے۔

مولوی صاحب:۔ جی مجھ کو دس روپیہ ماہوار ملتے ہیں۔

انگریز:۔ میں قریب کے ایک شہر میں ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ وہاں چل کر تعلیم دینا پسند کریں گے۔ میں جتنی روپیہ ماہوار آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔

مولوی صاحب: (کچھ پس و پیش کے بعد) آنجناب کا شکریہ۔ مگر یہاں مدرسہ میں بیر کا ایک درخت ہے جس کے پھل مجھے کھانے کو ملتے ہیں دوسری جگہ وہ کہاں دستیاب ہوں گے۔

انگریز:۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گا کہ پھل آپ کے پاس پہنچ جایا کریں

مولوی صاحب:۔ ان بچوں کا جو یہاں زیرِ تعلیم ہیں کیا حشر ہوگا؟

انگریز:۔ میں ان بچوں کو بھی لے چلوں گا اور ان کے تمام اخراجات کا کفیل ہوں گا۔

مولوی صاحب:۔ مگر بچوں کے ماں باپ ان کو غیر جگہ بھیجنے پر کس طرح رضامند ہوں گے۔

انگریز:۔ اگر آپ اس معاوضہ کو جو میں نے پیش کیا ہے، ناکافی سمجھتے ہوں تو میں پچاس روپیے تک نذر کر سکتا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس سے زیادہ معاوضہ دینے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔

مولوی صاحب:۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) یہ آپ کا کرم ہے۔ مگر جب آخرت میں اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کریں گے کہ ہم نے تمہارے سپرد

ماہوار کا انتظام کر دیا تھا جو تمہاری ضروریات کے لیے کافی تھا۔ لیکن تم نے ہم پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ لالچ میں پڑ کر دوسری جگہ چلے گئے اور اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی برتی، تو بتایئے کہ میں اس کا کیا جواب دوں گا۔

اس کا جواب انگریز کے پاس نہیں تھا۔

اساتذہ میں فرض شناسی اور توکل کا یہ نمونہ پہلے وقتوں میں شاذ نہیں بلکہ اکثر ملتا تھا۔ مگر اب شاذ ہی نظر آتا ہے اس وقت توکل کی جگہ شاد خوری نے لے لی ہے۔ ضروریاتِ زندگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دولت مند طبقہ کے افراد کی بات تو الگ رہی اب متوسط طبقہ والوں کے پاس بھی ریڈیو ہونا چاہیے ٹیلی ویژن ہونا چاہیے۔ ریفریجریٹر ہونا چاہیے اور اس طرح کی اور کتنی چیزیں ہونا چاہییں جو آج ضروریاتِ زندگی میں شمار ہوتی ہیں مگر کل تک ان کے بغیر آرام سے زندگی بسر کی جا سکتی تھی۔ اس شاد خوری کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے اور ہر شخص کے پاس اس کی فراوانی نہیں۔ مجبوراً آمدنی بڑھانے کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں پھر قیمتیں چونکہ آسمان تک پہنچ کر اور اوپر جانے کی کوشش کر رہی ہیں اس لیے اس تمام سامانِ تعیش کی فراہمی ... اگر آج ہم کو ہزار روپے کی ضرورت ہے تو کل ڈیڑھ ہزار میں بھی ... نہ پڑے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بددیانتی کو اور بھی فروغ ہوگا۔

ایسے ماحول میں توکل کا گزر کہاں ہو سکتا ہے۔

... اسی شاد خوری کا عطیہ ہے کہ ہند و سماج میں سیکڑوں بے گناہ لڑکیاں کافی جہیز نہ لانے کی پاداش میں اگنی دیوتا پر بھینٹ چڑھا دی جاتی ہیں۔ ماں باپ لڑکی کا "دان" تو کر دیتے ہیں مگر منہ مانگے جہیز کا دان ان کے بس کا نہیں ہوتا۔ جہیز پر روک لگانے کے لیے ... سخت قانون بنائے جا رہے ہیں مگر سماجی برائی کے آگے قانون بے بس ہوتا ہے۔ قانون ایک طرف بنتا ہے تو دوسری طرف اس سے بچنے کے لیے سامان تیار کر لیے جاتے ہیں ضرورت سماج میں تبدیلی لانے اور اپنی رہائش کے معیار کو کم کرنے کی ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ صرف جو کی روٹی اور پانی پر گزارہ کر لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے آرام و آسائش کے لیے جو بھی وسائل پیدا کیے ہیں ان سب سے فائدہ اٹھانا چاہیے مگر چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے۔ توکل تو خیر بڑی چیز ہے اور ہر شخص کے بس کی بات نہیں لیکن اگر انسان اتنا ہی کر سکے کہ جو کچھ اپنے دست و بازو سے پیدا کیا ہے اسی پر قناعت کرے اور قدرت نے اس کے پڑوسی کو جو کچھ دیا ہے اس پر دندانِ آز تیز نہ کرے تو یہی بہت بڑی بات ہوگی۔

فرض شناسی ایک جوا ہے جو کندھوں پر رکھا ہوا ہے کہ انسان کو صحیح راستہ پر چلائے۔ طلباء نے اس جوئے کو اپنے کندھوں سے اتار پھینکا ہے۔ اس لیے بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہ زمانہ گیا جب طلبا کھاتے پیتے گھروں سے آتے تھے اور ان کی تعلیم کا بار ماں باپ پر کچھ ایسا زیادہ نہیں پڑتا تھا۔ اب تو ماں باپ اپنا پیٹ کاٹ کر بچوں کو تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں، لیکن بچے یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ ان کا کام اب صرف ہنگامہ آرائی رہ گیا ہے۔ آج کسی استاد کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے تو کل شیخ الجامعہ کی خبر لی جا رہی ہے۔ آج ان کے خیال میں اگر پرچہ مشکل آیا تو اسٹرائک ہو گئی۔ کل امتحان گاہ میں نگران نے نقل کرنے سے روکا تو غریب پٹتے پٹتے بچ گیا۔ علامہ اقبال کے کلام کا آج کل ہر شخص شیدائی نظر آتا ہے، کاش ان کی عملی زندگی سے بھی کچھ سبق لیا جاتا۔ اپنے استاد میر سید حسن کا علامہ اس قدر ادب کرتے تھے کہ ان کے سامنے اپنے اشعار نہیں پڑھتے تھے کیوں کہ اس سے ایک گونہ استاد

برتری کا اظہار ہوتا تھا۔ پنجاب کے گورنر نے جب اُن کو "سر" کے خطاب کی پیشکش کی تو انھوں نے خطاب صرف اس شرط پر قبول کرنا منظور کیا کہ ان کے استاد نے عربی اور فارسی ادب کی جو خدمت کی ہے اس کا بھی اعتراف کیا جائے۔ گورنر نے جب دریافت کیا کہ ان کی کچھ تصنیفات ہیں تو علامہؒ نے جواب دیا کہ وہ خود ان کی سب سے بڑی تصنیف ہیں۔ چنانچہ جب ان کو "سر" کا خطاب عطا ہوا تو ساتھ ہی ساتھ میر سید حسن کو بھی شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ اب نہ ایسے استاد ہیں نہ ایسے شاگرد۔ صرف ان کی یاد باقی رہ گئی ہے:

اے ہم نفسان محفل ما
رفتید ولے نہ از دل ما

طلباء میں درس سے غیر حاضری اب ایک وبا کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ پہلے تو بدشوق طلباء ہی درس سے غیر حاضر ہوتے تھے مگر اب بہت کم طالب علم اس کو عیب سمجھتے ہیں۔ کاروباری دنیا میں تو بالا دست سے اپنا جائز حق لینے کے لیے کام سے غیر حاضر ہو جانا شاید ایک طرح سے جائز کہا جا سکے مگر علم و ادب کے سرچشمہ میں، جہاں ہر مسئلہ کو افہام و تفہیم کے ذریعہ سے حل کرنا چاہیے، اس حربہ کے استعمال کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کارخانہ سے مزدور اگر غیر حاضر ہو جائیں تو پیداوار میں کمی آ جاتی ہے اور کارخانہ کے مالک کا نقصان ہوتا ہے، مگر طلبا درجہ سے غیر حاضر ہو کر صرف اپنا نقصان کرتے ہیں۔ سال کے ۳۶۵ دنوں میں درس کے لیے شاید نصف سے بھی کم دن مقرر ہیں لیکن طلباء اس نصف کا بھی نصف کر دیتے ہیں۔ بدشوقی کا یہ حال ہو تو کیسے ادیب، ماہر ہیئت، نفس داں، حاذق طبیب اور ہونہار انجینئر کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ سستی ڈگریاں ضرور مل جاتی ہیں۔ البتہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہم بھی زندگی کی دوڑ میں آگے ہیں۔ طوطے کی طرح رٹے ہوئے چند نام گنا دیے جاتے ہیں کہ علی گڑھ نے شوکت علی، محمد علی، حسرت موہانی، ضیاء الدین، ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی پیدا کیے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس فہرست میں آپ دو ایک نام کا اور اضافہ کر دیں لیکن یہ سب گزرے ہوئے زمانے کے لوگ ہیں۔ آخر اب مادرِ درس گاہ سے ایسے مایہ ناز فرزند کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ صرف وجہ ایک ہی ہے کہ اب ہمارا مسلک محنت کوشی نہیں بلکہ تن آسانی ہے جو ہماری رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ زندگی کی مہم تن آسانی سے سر نہیں ہوتی۔ زندگی نام ہے چٹانوں سے ٹکرانے کا۔ چاہے اس کا انجام پاش پاش ہو جانا ہو۔

بہر حال لڑکے پھر بھی لڑکے ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ اب اساتذہ نے بھی اپنے مطالبات منظور کرانے کے لیے اس غیر معقول حربہ کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ تنازعہ تو ان کا کسی دوسرے سے ہوتا ہے مگر اسٹرائک کر کے وہ طلباء کے حقوق کو پامال کرتے ہیں۔ دہلی میں اساتذہ کی اسٹرائک قریب دو مہینے سے جاری ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ طلباء کی تعلیم کا کیا حشر ہوتا ہے۔ خیریت ہے کہ علی گڑھ ابھی اس بلا سے محفوظ ہے مگر اس کی داغ بیل یہاں بھی پڑ گئی ہے۔ چند سال ہوئے ایک استاد نے شیخ الجامعہ کے گھر پر دھرنا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دھرنا طلباء کے جواب میں تھا۔ گویا طلباء اگر اپنے منھ پر سیاہی پھیر لیں تو استاد کے لیے بھی ایسا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

گر ہمیں مکتب، ہمیں ملاّ
کار طفلاں تمام خواہد شد

ابھی حال میں ضلع کی انتظامیہ نے ایک استاد کا رہائشی مکان ناجائز طریقے سے خالی کرا لیا تھا۔ اس کے خلاف اساتذہ کی طرف سے احتجاج کیا گیا جو بے شک مناسب تھا

مگر جس طریقے سے احتجاج کیا وہ مناسب نہیں تھا۔ تمام اساتذہ نے ایک دن کے لیے اسٹرائک کر دی اور ایک جم غفیر کی شکل میں حاکم ضلع کے مکان پر جا وارد ہوئے۔ ایسا کرنا اساتذہ کے وقار کے منافی تھا۔ آخر کارخانہ کے مزدوروں اور دانش گاہ کے دانشوروں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ حاکم ضلع نے ان کے ساتھ وہ اخلاق بھی نہیں برتا جس کی ان سے امید کی جا سکتی تھی۔ لیکن جس کی نظر میں خود اپنی ذات قابل احترام نہ ہو وہ دوسرے سے کیوں امید رکھے کہ وہ اس کی عزت کرے گا۔

اساتذہ کی ایک دوسری اسٹرائک اس کے فوراً ہی بعد ہوئی۔ یہ اسٹرائک ایک مرکزی قانون کے خلاف تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس قانون سے یونیورسٹی کی حیثیت خود اختیاری مجروح ہوتی ہے۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے اس اعتراض کو تسلیم کیے لیتے ہیں۔ مگر اس سے اسٹرائک کا جواز کسی طرح پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں اس شکایت کو بھی افہام و تفہیم ہی سے طے ہونا چاہیے تھا۔ ان دونوں اسٹرائکوں کی وجہ سے طلبہ دو دن کے لیے درس سے محروم رہے۔ اس کی تلافی کس طرح سے ہوگی۔ یہ سننے میں نہیں آیا کہ اساتذہ نے یہ پیش کش کی ہو کہ وہ تعطیل کے دو دنوں میں درس دے کر اس کی تلافی کر دیں گے اور اگر وہ کرتے بھی تو طلبا اس کو کب ماننے کے لیے تیار ہوتے!

اساتذہ میں ہر مکتب خیال کے لوگ شامل ہیں۔ کمیونسٹ بھی ہیں اور جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے ممبر بھی، اور ایسے مسلم اساتذہ بھی جو کسی جماعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ کمیونسٹ فلسفہ میں تو شاید اس طرح اپنے کار منصبی سے غیر حاضر ہو جانا جائز سمجھا جاتا ہو مگر کیا ان اساتذہ کی نظروں میں جو اپنے کو اسلامی اقدار کا پیرو کہتے ہیں ایسی غیر حاضری جائز ہو سکتی ہے۔ ہماری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ اگر ان دو دنوں کا مشاہرہ وہ یونیورسٹی سے لیں گے تو ان کے لیے اکل حلال کی تعریف میں نہیں آ سکتا۔ اگر کچھ اساتذہ، چاہے وہ دو چار ہی کیوں نہ ہوں، ہمارے خیال سے متفق ہوں تو ہم ان سے امید رکھیں گے کہ وہ ان دو دنوں کا مشاہرہ یونیورسٹی کو واپس کر دیں۔ ایسا کر کے وہ دیانت داری کی ایک اعلیٰ مثال قائم کریں گے

اکل حلال کے متعلق علامہ اقبالؒ کے والد شیخ نور محمدؒ کا ایک مثالی واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ شیخ صاحب ایک بڑے زمیں دار کے یہاں ایک معمولی سے کام پر تعینات تھے۔ کچھ دنوں آرام کرنے کے بعد ان کو اس بات کا احساس ہوا کہ کام کی نوعیت دیکھتے ہوئے ان کو مشاہرہ زیادہ ملتا ہے۔ ایک دن خاموشی سے انھوں نے اپنا استعفا پیش کر دیا۔ زمیں دار کو تعجب ہوا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ جب اس نے وجہ پوچھی تو انھوں نے صحیح صورت حال گزارش کر دی کہ جو معمولی سا کام ان کے سپرد ہے اس کے لیے جو مشاہرہ ان کو دیا جاتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس کا لینا ناجائز سمجھتے ہیں۔

مولوی صاحب یا شیخ صاحب کے معیار کو اس وقت کون پہنچ سکتا ہے کہ ایک نے پانچ گنا مشاہرہ بھی اس لیے ٹھکرا دیا کہ جن بچوں کو وہ تعلیم دیتے تھے ان کا نقصان ہوگا اور دوسرے نے ایک اچھی بھلی ملازمت سے اسلیے کنارہ کشی اختیار کر لی کہ کام کو دیکھتے ہوئے ان کو معاوضہ زیادہ ملتا تھا جس کو لینا وہ ناجائز سمجھتے تھے۔ لیکن ہم اپنے اساتذہ سے اتنی امید تو کر سکتے ہیں کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے جو نعرہ ملک کو دیا تھا کہ "آرام حرام ہے" اس پر سو فیصدی عمل نہ کرتے ہوئے بھی وہ "آرام" کو "کام" سے نہ بدل دیں گے۔ ہم کو اس میں شبہ نہیں ہے کہ اساتذہ کی غالب اکثریت اپنے تعلیمی فرائض کو خوش اسلوبی سے ادا کرتی ہے لیکن کیا کچھ اور کوشش کر کے "حالات" "بہتر" سے "بہترین" نہیں بنائے جا سکتے؟ مولوی صاحب کی کہانی میں ہمارے لیے فرض شناسی اور استغنا کا ایک بہت بڑا سبق ہے بشرطیکہ ہم اس کو سیکھنے کے لیے تیار ہوں۔

سیدہ طیبہ بیگم
حیدرآباد

عورت اور اسلام

(محترمہ طیبہ بیگم کا مضمون مارچ یا اپریل میں ہمیں موصول ہو گیا تھا۔ لیکن ہم اس کو جلد شائع نہ کر سکے جس کے لئے ہم معذرت خواہ ہیں۔ امید ہے کہ یہ ناظم ہمیں محترمہ کے قلمی تعاون سے محروم نہ کریں گی۔ (ق م ہا)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو ایک باوقار زندگی اور پاکیزہ و محترم مقام دے کر ایک ایسی مثال قائم کی ہے جس کا مقابلہ کوئی مذہب نہیں کر سکتا۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار اسلام نے عورت کو اس کا حق اور صحیح مقام بخشا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ جو ناروا سلوک ہوتا تھا، اسلام نے اسے ختم کیا۔ رومیوں اور یونانیوں نے عورت کو کمزور درجہ دیا تھا۔ تعلیم سے محرومی نے عورتوں میں جمود، پست ہمتی اور کم نظری پیدا کر دی تھی اور ان کو زندگی کے ہر شعبے میں مدد کا دست نگر بنا دیا تھا اس کی صلاحیتوں کو گھن لگا دیا اور اس کی جائز آزادی کو غلامی کی بیڑیاں پہنا دی تھیں لیکن اسلام کا جب نور پھیلا تو بربریت اور جہالت کی تاریکی دم توڑنے لگی۔ اسلام نے عورت کی عظمت اور مرتبے کو پہچانا اور اسے اعلیٰ اور ارفع مقام بخشا۔ اس کی شخصیت کی حفاظت کی، اس صلاحیتوں اور سمجھ بوجھ کی قدر کی اور اسے مرد کے برابر مساوی کا مقام عطا کیا۔ جب خود قدرت نے اسے تخلیقی قوت بخش کر اس کی اہمیت اور بلند مقام کا اعتراف کیا تو خدا کے رسول ؐ نے اس کے قدموں کے نیچے جنت بنائی اور خدا اور رسول ؐ کے بعد عورت کو سب سے زیادہ قابل احترام ہستی ٹھہرایا۔

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ مسلم عورت ہر میدان میں مرد کے دوش بدوش کام کرتی رہی اور عفت و پاکیزگی کی چادر اوڑھے رہی۔ جنگ ہو کہ میدان سیاست، علم و ادب ہو یا امور سلطنت سب میں وہ مرد کی شریک رہی۔ فقہ اور حدیث میں کمال حاصل کیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کئی علوم سے واقف تھیں۔ شعر و ادب، طب و حکمت اور تاریخ و انساب میں ماہر تھیں اور قرآن کی عالم تھیں۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا بھی پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ حضرت اسماء رض جنگ کے میدان میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دیتی تھیں۔ جس مذہب نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا، حضرت خدیجہ رض اور حضرت عائشہ رض، حضرت ہاجرہ رض، حضرت اسماء رض، حضرت حفصہ رض، اور حضرت رابعہ بصریہ رض جیسی محترم ہستیاں پیدا کی ہوں جو مذہبی، سیاسی، علمی اور دینی ہر شعبہ میں نامور رہی ہوں اس نے یقیناً عورت کو ایک باعزت مقام بخشا۔ اس کی قدر کی اور اس کے ساتھ انصاف کیا۔

اسلام میں عورت کے مقام کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اخلاق و اعمال سے دنیا پر روشن کر دیا اپنی صاحبزادی فاطمہ زہرا ؓ آتیں تو اٹھ کھڑے ہوتے اور ان کے بیٹھنے کے لیے اپنا رومال بچھا دیتے۔ اپنی اہلیہ حضرت خدیجہ رض کے سامنے کبھی اونچی آواز سے بات نہیں کی۔ فرماتے تھے کہ عورتوں کے ساتھ درگزر اور چشم پوشی سے کام لو اور حسن سلوک سے پیش آؤ، نرمی کے ساتھ معاملہ کرو۔

درشتی اور سختی سے وہ اپنا کام انجام نہیں دے سکتیں
مردوں سے کہا، "تم میں وہ سب سے بہتر ہیں جو اپنے
اہل و عیال سے نیک سلوک کرتے ہیں" عورت کے جذبات و
احساسات کا حضرت نے ہمیشہ لحاظ رکھا۔
اسلام نے عورت کو وہی خوشگوار ذمہ داریاں سونپیں
جو وہ آسانی کے ساتھ انجام دے سکتی ہے اور جو اس کی فطرت
کے مطابق ہے یعنی نسلوں کی بہترین تربیت اور معاشرے کی
اصلاح کا کام اسے سونپا۔ اسے گھر کا حکمران بنایا لیکن گھر کی ملکہ
بنا کر بھی اسے ہر قسم کی جائز آزادی دی۔ اپنے نسوانی وقار کے
ساتھ معزز پیشہ اختیار کرکے روزی کمانے کی اجازت دی لیکن
معاشی ذمہ داری کا بوجھ مردوں کے کاندھوں پر ہی رکھا۔ نکاح
اور طلاق اور تعدد ازدواج میں جو بے قاعدگی چلی آ رہی تھی اس
میں اصلاح کی۔ اسلام نے پردے کا حکم ضرور دیا لیکن علمی مجالس
اور مسجدوں اور دوسرے فلاحی کاموں سے انھیں روکا نہیں۔
وہ مردوں کے ساتھ نماز میں بھی شریک ہوا کرتی تھیں، پردے
کے حکم سے تنگی نہیں پیدا کی بلکہ غیرت کا ثبوت دیا۔
اسلام نے عورتوں کے حقوق کے بارے میں
پر زور وکالت کی۔ وراثت میں اسے حصہ دلایا
۱۔ تقسیم وراثت میں لڑکی کو لڑکے کے مقابلے میں ایک حصہ کم دے
کر شوہر سے بقیہ حصہ دلوایا۔ کیونکہ شوہر پر بیوی کا نان و نفقہ
اور مکمل ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔
۲۔ شوہر کی ملکیت میں اس کا حصہ واجب کروایا۔
۳۔ ساتھ ہی عورت کو اپنی ملکیت اور جائیداد رکھنے
کا الگ حق دیا جسے وہ جس طرح چاہے صرف کر سکتی ہے اور
شوہر کو اس میں مداخلت کا حق نہیں دیا۔ مقصد یہ تھا کہ عورت
مرد سے کم حیثیت زندگی نہ گزارے بلکہ برابر کا مرتبہ رہے
۴۔ شادی بیاہ کے وقت لڑکی کی پسند اور قبول لینے کو
ضروری قرار دیا جس کے بغیر نکاح نہ کرنے کی ہدایت کی۔
۵۔ عورت کا مہر واجب قرار پایا تاکہ طلاق کی صورت
میں وہ کسی کی دست نگر نہ رہے بلکہ خود مکتفی رہے۔
۶۔ شوہر کی بدسلوکی سے محفوظ رکھنے کے لیے اسے
خلع کا حق دیا۔
۷۔ طلاق کی صورت میں یا شوہر کے انتقال پر بیوہ کے
تحفظ کے لیے اسے دوسرے نکاح کی ہدایت کی تاکہ اسے سکون
قلب ہو اور اس کے بچوں کی حفاظت ہو سکے۔
اس طرح عورت کی زندگی کو ٹکراؤ اور بے اطمینانی سے
بچانے کے لیے ایسے راستے اور طریقے مقرر کیے جن کی بنا پر وہ عزت
و احترام اور سربلندی سے معاشرے میں رہ سکے۔
اسلام میں عورت کی شخصیت کبھی بھی مرد کے تابع
نہیں رہی۔ قرآن حکیم نے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی
اس کی اجازت نہیں دی کہ مرد بالادستی سے کام لے کر عورت
پر ظلم ڈھائے، اس پر حکومت کرے۔ یا اس کے اختیارات چھین
کر اسے بے بس کر دے۔ عورت اور مرد کے درمیان حاکم و
محکوم کا رشتہ کبھی نہیں رکھا بلکہ دونوں کو ایک دوسرے کا
ساتھی کہا۔ عورت کو پورے معاشرتی حقوق دیے۔ جسمانی
طور پر عورت چونکہ مرد سے مختلف واقع ہوتی ہے اس لیے
زندگی کے بعض پہلو اس کی صلاحیتوں کے لحاظ سے اس کے
تابع کیے اور بعض مرد کے، تاکہ دونوں اپنے اپنے کام عمدگی
سے انجام دے سکیں۔ لیکن عورت کو کسی بھی طرح مرد سے
کم تر نہیں ٹھیرایا۔
اسلام ایک ایسا نظام حیات ہے جس میں
معاشرے میں عورت اور مرد کے حقوق و فرائض بتا کر اپنے
اپنے دائرے میں رہنے کی ہدایت کی ہے تاکہ ایک کے حق
سے دوسرے کی حق تلفی نہ ہو۔ اور سلامتی و سکون قائم رہے

قرآن کریم کی ہدایت ہے کہ " دونوں فریق مساوی طور پر اپنی ذمہ داریوں پر کاربند ہو کر امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔

قرآن حکیم نے یہ بھی کہا ہے کہ " وہ (یعنی بیویاں) تمہارا لباس ہیں اور تم (یعنی مرد) ان کا لباس ہو۔" قرآن کریم کی یہ آیت اس باہمی رشتے کی وضاحت کرتی ہے جو مرد اور عورت کے درمیان ہونا چاہیے۔ مرد کا بیوی سے جو تعلق ہے اس بنا پر شوہر کا فرض ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اسی طرح کی عزت اور مقام دے جس طرح خود وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔

قرآن مجید نے جہاں کہا ہے "الرجال قوامون علی النساء" اس سے مطلب حکومت ہرگز نہیں۔ مرد کو عورت کا نگران اور محافظ بنایا، اس کا مشیر بنایا لیکن جہاں تک انسانی حقوق و فرائض کا تعلق ہے، اسلام نے دونوں کو برابر کا حق دار ٹھہرایا۔ دونوں کو ایک دوسرے کا جوڑا بتایا۔ اس طرح دونوں کی حیثیت کو یکساں بتایا اور یکساں طور پر قابلِ احترام بھی ٹھہرایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو محبت کا منبع اور خیر و برکت اور بلند اقبالی کا باعث سمجھا۔ آپؐ نے فرمایا "عورت ہی مرد کی خوشحالی کا وسیلہ ہے" بیویوں کے بارے میں فرمایا " وہ خانہ آبادی کی بنیاد ہیں اور رزق ان کے نیک قدموں سے بڑھتا ہے۔"

ازدواجی رشتہ کو "خیر و سعادت اور مہر و محبت کا سرچشمہ" کہا۔

قرآنی تعلیمات اور ارشادات محمدیؐ ہماری زندگی کے مشعلِ راہ ہیں۔ عورت کا مقام مسلم معاشرے میں وہ ہے جو کتاب و سنت نے اسے عطا کیا ہے نہ کہ وہ جو لوگ اپنے جدید یا قدیم رواج کے تحت عورت کو دیتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا مسلم معاشرہ کس حد تک کتاب و سنت پر کاربند ہے اور ارشادات نبویؐ کا کس قدر پاس کرتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں اخلاقی ضابطوں کے نفاذ اور ان کی خلاف ورزی کی سزاؤں میں عورت اور مرد دونوں کے ساتھ یکساں سلوک رکھا گیا ہے۔ سزاؤں میں ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں لیکن ہمارے نام نہاد معاشرے میں اس کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔

اسلام بے حیائی اور بدکرداری سے روکتا ہے۔ جسم فروشی کو بدترین گناہ تصور کرتا ہے۔ لیکن آج کل معاشرے میں یہی چیزیں عام ہیں۔

زمانے کے تقاضوں نے عورت پر اقتصادی ذمہ داری بھی ڈال دی تو عورت کے باہر نکلتے ہی اسے جنسِ بے مایہ تصور کیا جانے لگا۔ حالانکہ اسلام نے اسے جنسِ گراں مایہ قرار دیا ہے۔ عورت کا تحفظ جس کا اسلام ضامن ہے آج کے معاشرے میں ایک خواب بن گیا ہے۔ عورت کی عظمت و حرمت اس مرتبے اور مقام کی جو صراحت اسلام نے کی تھی وہ داستانِ پارینہ بن گئی ہے۔ قرآنی احکامات کی من مانی تشریح ہوتی ہے اور ارشاداتِ نبوی کا کوئی پاس نہیں۔ عدم مساوات اور ناانصافی زندگی کے ہر شعبے میں نظر آنے لگی ہے۔ معاشی طور پر عورت کو مختلف پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اسی معاشی پستی کی وجہ سے عورت مرد کی دستِ نگر بننے پر مجبور ہو جاتی ہے اور معاشی طور پر بھی عورت کو برابر کا مرتبہ حاصل نہیں۔ اکثر اوقات مرد عورت سے اس کا مہر بھی معاف کروا لیتے ہیں۔

مسلم معاشرے میں عدم یکسانیت "...

گو کہ مسلمان عورتوں کو اسلامی تعلیمات [illegible]

کرانا ضروری ہے۔ خود قرآن مجید نے بھی تلقین کی ہے کہ "عورتوں کو ان کے حقوق بتا دیے جائیں۔"

قرآن حکیم کے مطابق " عورتوں کے وہی حقوق ہیں (اپنے شوہروں کی نسبت) جن کی خود اُن سے (یعنی شوہروں سے) توقع کی جاتی ہے۔ اِس سلسلہ میں دو اہم نکات قابل توجہ ہیں یعنی طلاق کے احکام اور تعداد ازواج کے شرائط ۔ جن کے غلط استعمال نے عورت کے تحفظ، اس کی زندگی اور اس کے مستقبل کو گھناونا بنا دیا ہے ۔

رائج الوقت عدالتوں نے بھی اسے قبول کر لیا ہے کہ ایک ہی وقت میں تین بار " طلاق، طلاق، طلاق" کہہ کر مرد اپنی بیوی سے بری الذمہ ہو جاتا ہے لیکن سورۃ نساء کے تحت یہ طلاق مناسب نہیں ہے ۔ جب نکاح کے وقت عورت کی مرضی کو ضروری سمجھا گیا ہے تو طلاق کے وقت اس بات کو ملحوظ کیوں نہیں رکھا جاتا۔ حالانکہ قرآن نے طلاق میں بھی عورت اور مرد دونوں کی مرضی ملحوظ رکھی ہے ۔

خدا اور رسولؐ کے نزدیک طلاق سب سے ناپسندیدہ عمل ہے لیکن جب شوہر اور بیوی میں مصالحت ناممکن ہو تب کہا گیا ہے کہ تین مہینے کے وقفے وقفے سے ایک دوسرے کو سوچ سمجھ کر اچھے اور احسن طریقے سے طلاق دی جائے اس طرح کہ ایک ایک مہینے کے وقفے سے اس کا استعمال ہو تیسرے مہینے بھی اگر مصالحت کی اگر کوئی صورت نہ نکلے تو پھر طلاق ہو جائے ورنہ رجوع کر لیں۔ یہ مدت اس لیے رکھی گئی ہے کہ آدمی سوچ سمجھ کر طلاق کا لفظ منھ سے نکالے

آج کل معاشرے میں جو بے حساب طلاقیں دی جاتی ہیں کیا وہ اسلامی احکامات کے تحت دی جاتی ہیں ؟

دوسرا نکتہ ہے تعداد ازدواج کا۔ اس مسئلے کو صحیح طور پر نہ سمجھنے والوں کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ اس آیت کو ایک سے زائد بیویوں کے لیے دلیل ٹھہراتے ہیں۔ حالاں کہ اس کے ذریعہ کثرت ازدواج پر پابندی لگائی گئی ہے ۔

تعدد ازدواج پر اسلام نے کڑی شرط لگائی ہے اور جو اصول اس سلسلہ میں بیان کیے گئے ہیں، انھیں غلط سمجھا گیا ہے اسی وجہ سے مسلم معاشرے میں برائیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

دراصل اسلام نے تعدد ازدواج کی مشروط اجازت دی ہے۔ ان شرائط کو نظرانداز کرنے والا مرد گناہ گار ہے۔ عرب میں زمانہ جاہلیت میں غیر محدود شادیاں ہوا کرتی تھیں ۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت کے ذریعہ تعدد ازواج کو صرف چار میں محدود کر دیا گیا۔ اور بیویوں کے درمیان عدل و انصاف کی شرط لگائی ۔ دوسری شادی کی اسی صورت میں اجازت دی جب کہ (۱) کسی کی بیوی دائم المریض ہو اور اس کے اولاد نہ ہو سکے (۲) جنگ یا فسادات کی وجہ سے بیواؤں کا مسئلہ پیدا ہو جائے تو ان کے نان و نفقہ رہائش اور اخلاق کے تحفظ کے لیے تاکہ انسانیت گمراہ نہ ہو اور عورت اور اس کی اولاد محفوظ رہ سکے ۔ لیکن ہمارے معاشرے نے اس میں من مانی آسانیاں پیدا کر لیں اور اپنی خوشی اور سہولت کے لیے مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرنے لگا۔ کیا یہ عدل و انصاف ہے ؟ سچ تو یہ ہے کہ مرد ایک ہی بیوی کے ساتھ عدل و انصاف نہیں کر سکتا تو دو یا تین یا چار کا کیا سوال ؟

اسلام کی بنیادوں کو کھوکھلی کرنے کا ذمہ دار آج کا مسلمان ہے ۔ ضرورت ہے کہ اسلامی تعلیمات عام کی جائیں، ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ نوجوان نسل کو دین سے واقف کرایا جائے اور بے راہ روی کو روکا جائے۔

باقی صفحہ نمبر ۱۴ پر ملاحظہ فرمائیں

[redacted]

حکیم سید محمد کمال الدین حسین
اجمل خاں طبیہ کالج اے ایم یو

تجدیدِ طب

تجدید اور ریسرچ جس طرح ہر علم کے لیے ضروری ہے، اسی طرح علمِ طب کے لیے بھی ضروری ہے۔ بانیِ طب "بقراط" کے دور سے دورِ حاضر تک طب کے دروازے تحقیق و ریسرچ کے لیے کھلے رہے ہیں اور طب ریسرچ ہی کے ذریعہ نکھر نکھر کے فروغ پاتی رہی ہے۔

طب کی بنا کا سہرا بقراط کے سر رہا پھر جالینوس نے طب کی تشریح و توضیح فرمائی۔ ابو بکر محمد بن زکریا رازی نے منتشر طب کو جمع کیا اور شیخ الرئیس بو علی سینا نے طب کی تجدید اس انداز پر کی کہ علمِ طب سمجھنے اور سمجھانے کے لیے آسان ہو گیا۔ شیخ الرئیس نے علمِ طب پر "القانون" وہ کتاب لکھی جسے بین الاقوامی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اس درجہ تک کہ یہ کتاب سولھویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں داخلِ نصابِ علمِ طب رہی۔ طبی دنیا میں اس کتاب کی مقبولیت اس تاریخی حقیقت سے واضح ہے کہ اس کتاب کی تشریحات کا سلسلہ شیخ الرئیس کے عہد سے دورِ حاضر تک طبی دنیا میں جاری رہا ہے۔

"القانون فی الطب" کی متعدد شرحیں اور خلاصے اور پھر خلاصوں کی شرحیں لکھی گئیں۔ اس کتاب پر حکمار نے جس قدر طبع آزمائی کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ کسی دوسری کتاب پر اس قدر تحقیقی کام نہیں ہوا ہے آج بھی طب کے نصابِ تعلیم کے لیے یہ کتاب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ طب کے دیگر شعبوں کے علاوہ کلیاتِ طب پر تو یہ ایک عدیم المثال کتاب ہے۔ القانون کے شعبۂ کلیات پر مشاہیر اطبا میں سے ہر ایک نے تحقیقی کام کیا ہے۔ قانونچہ، موجز، نفیسی، سدیدی، اقسرائی، مفرح القلوب، مفتاح الکانون، افادۂ کبیر اور اصول طب کلیات قانون کے مشہور و مستند خلاصے ہیں اور ان کتب میں القانون کے کلیاتی موضوعات کی تشریح واضح طور سے کی گئی ہے۔ القانون کی ایک جامع شرح جامع الشرحین مصنفہ علامہ محمود آملی اور علامہ علی حسین گیلانی زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر دنیائے طب میں خراجِ تحسین پا چکی ہے۔

مذکورہ کتب میں علمِ طب کے کلیات خالص طبی انداز پر پیش کیے گئے ہیں۔ ان کتابوں کی زبان بھی طبی ہے اور اصطلاحات بھی طبی ہیں اور اس بنیاد پر ان کتب کو علمِ طب کا ضامن بجا طور پر قرار دیا جا سکتا ہے اور اس بنیاد پر یہ کتابیں طبی مدرسوں اور کالجوں میں داخلِ درس اور شاملِ نصاب رہی ہیں۔

دورِ جدید میں علمِ طب کی ریسرچ کے لیے نئے دروازے کھولے گئے ہیں۔ یعنی علمِ طب کی ریسرچ جدید سائنس اور جدید ڈاکٹری مضامین کی روشنی میں کی جا

ہے۔ اس اندراج ریسرچ کی افادیت سے کسی اہلِ علم کو انکار نہیں ہو سکتا۔ بشرطیکہ علمِ طب کو اس ریسرچ سے فائدہ حاصل ہو اور اس ریسرچ کے بعد علمِ طب کے کسی کلیہ کی تصدیق ہو یا کسی کلیہ کی اصلاح ہو اس طرح کہ طب کی بنیادیں بھی قائم و برقرار رہیں اور ان کی شکل و شمائل بھی باقی رہیں نہ یہ کہ طب کے کسی شعبے کا سرے سے نام ہی تبدیل کر دیا جائے اور طبی حقائق کو رد اور مسترد کر کے جدید سائنس یا جدید ڈاکٹری حقائق کو علمِ طب میں من وعن داخل کر دیا جائے تو یہ ایک نئی ریسرچ تو ضرور ہو گی لیکن علمِ طب کی تنقیص کے ساتھ کہ جس کے بعد علمی دنیا میں طب کا کوئی مقام ہی باقی نہ رہے گا۔ مثال کے طور پر اگر کسی مرض کے متعلق اصلاح و تجدیدِ طب کے نقطۂ نظر سے ریسرچ کرنا مقصود ہے تو اس مرض کے متعلق ریسرچ کے بعد یہ حقیقت دلائل کی روشنی میں ضرور واضح ہونا چاہیے کہ اطبائے متقدمین نے جو کچھ اس مرض کے متعلق بیان فرمایا ریسرچ کے بعد کس حد تک اس کی تصدیق ہوتی ہے اور کس حد تک تکذیب ہوتی ہے اور پھر اصلاحی نقطۂ نظر سے اس کا حل بھی طبی انداز پر اسباب و اعراض اور تشخیص و اصولِ علاج کی روشنی میں طبی زبان اور طبی مصطلحات کے جامے میں بیان کرنا ضروری ہے نہ کہ جدید ڈاکٹری انداز پر کہ جس سے واضح ہو کہ بجائے طبی معالجات پر ریسرچ کے ماڈرن میڈیسن پر ریسرچ کی جا رہی ہے۔

اسی طرح کسی دواء پر ریسرچ کے بعد طبی انداز پر یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ اس دواء کے متعلق طبی بیانات کی کس قدر تصدیق ہوتی ہے اور کس قدر تکذیب ہوتی ہے۔ اور پھر اصلاح کے لیے حل کیا ہو سکتا ہے نہ یہ کہ کسی دواء کے افعال و خواص جدید انداز پر بیان کیے جائیں کہ جس طرح ماڈرن فارماکالوجی میں دواء کے افعال و خواص بیان کیے جاتے ہیں تو حقیقتاً یہ ہے کہ ریسرچ ماڈرن فارماکالوجی کی ہوئی نہ کہ طبی علم الادویہ کی۔

یہ بات قابلِ تسلیم ہے کہ کسی امر کی تحقیق نگاہِ عمیق سے کی جائے تو قدیم و جدید طبوں کے حقائق میں یکسانیت نظر آتی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم و جدید طب کے اندازِ بیان اور مصطلحات اور بنیادی مسلمات میں بیّن فرق ہے۔ ریسرچ کے دوران یہ بھی لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ دیگر علوم کی طرح علمِ طب بھی ایک مستقل اور مکمل علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ علمِ طب کا ایک مخصوص دائرہ ہے ایک مخصوص مزاج ہے اور اس کے مصطلحات میں وہ جامعیت پائی جاتی ہے جس کی مثال علومِ جدیدہ میں نہیں ملتی۔ مثال کے طور پر طب میں خلطی امراض کے علاج کا دار و مدار اصول نضج و استفراغ پر ہے۔ علمِ طب کے یہ وہ بنیادی اصول ہیں کہ جس کی مثال طبِ جدید یعنی ڈاکٹری میں نہیں ملتی۔ صرف اصطلاحی ترجمہ کر دینے سے نضج و استفراغ کو نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر ان اصطلاحات کو واضح اور صحیح طور سے سمجھنا ہے تو علمِ طب کے نظریہ اخلاط کو واضح طور سے سمجھنا ضروری ہے۔ پھر خلطی امراض میں اخلاط کی غیر طبعی صورتوں کو اور آخر میں اصول نضج کے ذریعہ غیر طبعی اخلاط کی اصلاح کو اور غیر طبعی فاسد اور فاضل مواد مرضیہ اور ان کے تنقیہ کے ذرائع کو سمجھنا ضروری ہے۔

آمدم بر سرِ مطلب ریسرچ کے لیے آپ کسی بھی علم سے استفادہ فرمائیں لیکن نتائج ریسرچ کو طبی انداز پر طبی زبان و مصطلحات کے جامہ میں مرتب فرما کے بیان فرمائیں تاکہ علمِ طب اپنی جگہ محفوظ و مامون رہے اور علمِ طب کے مسلمات جدید علوم کے مسلمات کے تحت دب کر اور گھٹ کر اپنی حقیقی شان نہ کھو بیٹھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علمِ طب پر ریسرچ کے

دروازے کھول دیے گئے ہیں لیکن علم طب پر ریسرچ کے صحیح اصول ریسرچ وضع نہیں کیے گئے ہیں۔ طب کے گریجویٹ خودساختہ اصول ریسرچ بنا کے ان کے مطابق موضوعات طب پر آزادانہ ریسرچ فرما رہے ہیں۔ نیز ڈاکٹری مضامین کے اصول ریسرچ چوں کہ مقرر و متعین ہو چکے ہیں، لہٰذا طب کی ریسرچ کے لیے ان ہی اصولوں کو اپنا رہے ہیں اور ریسرچ ان ہی کی روشنی میں فرما رہے ہیں اور اس طرح جو لٹریچر سامنے آرہا ہے، اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ریسرچ طب پر کم اور ڈاکٹری پر زیادہ ہو رہی ہے۔

پھر دورِ جدید کے طبی طالب علم جو جدید طبی لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو اس لٹریچر میں علم طب کی تنقیص کے پہلو زیادہ ملتے ہیں اور طب کا ہر پہلو اور ہر مسئلہ ڈاکٹری طرزِ ریسرچ کے مطابق ٹوٹتا اور کمزور ہوتا نظر آتا ہے جس کی بنا پر ان کا قلب و دماغ علم طب سے دل برداشتہ ہو جاتا ہے اور وہ جدید سائنس اور جدید طب کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب نے علم طب کی اصلاح اور تجدید کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی جس نے علم طب کی تجدید کے لیے کچھ اہم اصول وضع کیے جو قانون عصری میں شامل ہو گئے۔ علامہ حکیم محمد کبیر الدین صاحب نے ان ہی اصولوں کے مطابق علم طب کی تجدید پر قلم اٹھایا اور اکثر کتب تصنیف و تالیف فرمائیں۔ ان ہی اصولوں پر حامیان علم طب کو آگے کام کرنا تھا اور اسے فروغ دینا تھا مگر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور فرمایئے کہ اب کتنے لوگ ان اصولوں پر علم طب کی تجدید کا کام انجام دے رہے ہیں۔

حضورِ والا جس طرح ہر علم کے اصول ریسرچ جدا ہوتے ہیں، علم طب کے اصول ریسرچ بھی جدا ہوں گے۔ اگر کسی طالب علم کے اصول ریسرچ کے مطابق دوسرے علم کی ریسرچ کی جائے گی تو نتائج صحیح برآمد نہ ہو سکیں گے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ڈاکٹری جو نظریہ مزاج اور اخلاط کی قائل نہیں ہے، اس کے اصول ریسرچ کے مطابق علم طب کی ریسرچ کہ جس کی بنیاد ہی نظریہ مزاج و اخلاط پر رکھی گئی ہے کس طرح صحیح ثابت ہوگی۔ ڈاکٹری اصول ریسرچ کے مطابق اگر علم طب کی ریسرچ کی گئی تو اس کا نتیجہ یہی برآمد ہوگا کہ طب کی شکل و شمائل بھی تبدیل ہو جائیں گے اور آخر میں یہی قول صادق آئے گا کہ ڈاکٹری طب کی ترقی یافتہ صورت ہے اور بس یہی کافی و شافی ہے۔ ڈاکٹری الفاظ و عبارت میں طب کا وظیفہ پڑھنا بے سود ہے۔ پس بہتر یہی ہے کہ طب کو چھوڑ کر ڈاکٹری کو اپنایا جائے اور یہی اب ہو رہا ہے۔

محترم ناظرین! میں نے بھی تیس سال بزرگوں کی خدمت انجام دی ہے۔ میں نے بزرگوں سے یہی سیکھا کہ "خُذْ ما صَفا وَدَعْ ما كَدِرَ" طب کی تحقیق و ریسرچ کے لیے جس علم سے چاہو استفادہ کرو لیکن جب طب کا کوئی مضمون لکھو یا موضوعِ طب پر کوئی کتاب لکھو تو خالص طبی انداز پر طبی زبان و مصطلحات کے ساتھ تاکہ مطالعہ کنندہ کو اس کے مطالعہ سے یقین ہو کہ وہ کوئی طبی مضمون یا طبی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ نہ کہ کوئی جدید ایلوپیتھی مضمون یا ایلوپیتھی کتاب۔

پچاس برس کا تجربہ شاہد ہے۔ اگر طب کے ساتھ ڈاکٹری کو شامل کیا جائے گا یا علم طب کو ڈاکٹری اصولِ ریسرچ کے مطابق بیان کیا جائے گا تو یہ علم طب، نہ علم طب ہی رہے گا اور نہ ڈاکٹری بنے گا۔ بلکہ ایک جدید مرکب علم بن جائے گا یعنی طب نما ڈاکٹری یا ڈاکٹری نما طب۔ جس سے صحیح معنوں میں نہ ایک طبیب ہی کو فائدہ حاصل ہوگا اور نہ ڈاکٹر ہی کو۔ اور [illegible]

یہ مرکب علم غلط مبحث کا نشانہ بن کر رہ جائے گا۔

مسیح الملک جناب حکیم اجمل خاں صاحب نے طبی کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی بتاریخ ۲۶ دسمبر ۱۹۱۱ء میں تجدید طب کے متعلق ارشاد فرمایا تھا۔

صاحبو! ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ہم
ان دونوں میں (آیورویدک و یونانی طب میں)
مغربی طب کی آمیزش کرکے اپنے چہروں کو
بگاڑ دیں اور اپنے اسلاف کی یادگاروں کو
خراب کردیں بلکہ ہم یونانی کو خالص یونانی
اور ویدک کو خالص ویدک رکھ کر ملک کو دکھانا
چاہتے ہیں کہ ہم کس طرح ترقی کر سکتے ہیں۔

پھر اسی تقریر میں آپ نے آگے چل کر ارشاد فرمایا!

ہم نیم یونانی اور نیم ڈاکٹر بن کر مذبذبین
بین ذالک لا الی ھولاء و لا الی
ھولاء بننا نہیں چاہتے ہیں۔"

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو رپورٹ مرتبہ وید مان سنگھ صاحب صفحہ نمبر ۱۱)

مسیح الملک کے مذکورہ بالا اقوال طب کی تجدید اور طب کے ارتقاء کے لیے نہایت گرانقدر ہیں ان ہی اقوال کی روشنی میں طب یونانی کی تجدید اور ترقی صحیح معنوں میں کی جاسکتی ہے۔

مسیح الملک کے نظریہ کے خلاف اگر طب یونانی میں مغربی طب کی آمیزش کی گئی تو یقیناً طب یونانی کو نقصان پہنچے گا اور آج تک طب یونانی کو جو کچھ نقصان پہنچا ہے وہ اسی بنا پر پہنچا ہے کہ طب یونانی کے ساتھ مغربی طب کی آمیزش کی گئی اور اس درجہ آمیزش کی گئی کہ طب یونانی گھٹ کر رہ گئی اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ طب کے طالب تشنۂ طب رہ کر ڈاکٹری کی جانب مائل ہوئے اور ڈاکٹری پریکٹس اختیار کی۔

کاش آپ بھی ارباب حل و عقد مسیح الملک کے نظریہ تجدید طب کو سمجھیں اور اس پر غور و خوض کرکے طب یونانی کی تعلیم و تدریس کا صحیح طریقہ اختیار فرمائیں تو طب یونانی پھر فروغ پاسکتی ہے۔

بقیہ، مادہ کے خواص۔ صفحہ نمبر ۱۰

اندرونکاشویلی (E.L. Andronikashvili) الیکنس (K.R. Atkins) انسانگر (Onsanger) فائن مین (R.P. Feynman) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہیلیم ۴ II کے لیے حرارت کے نقطۂ فاصل کے وجود کی تشریح بوس آئنسٹائن انجماد کے طور پر ہوتی ہے۔ کیونکہ اس نظریہ کا اطلاق ہیلیم ۳ پر نہیں ہوسکتا اور نہ اس کا کوئی نقطہ فاصل ہوتا ہے جس کے نیچے اعلیٰ سیالی کا مظاہرہ ہو۔

مطلق صفر سے تقریباً ۱۵ درجہ اوپر حرارت تک بعض دھاتیں اور بھرت (alloys) اعلیٰ ایصال کا مظاہرہ کرتے ہیں جب کہ ان میں برقی رکاوٹ دفعتاً تقریباً غائب ہوجاتی ہے۔ یہ مظہر بڑے کام آتا ہے۔ "ٹھوس حالت کی طبیعیات" میں اس کا بیان قدرے تفصیل سے آئے گا۔

اِنسان میں تمام خوبیاں تعلیم سے پیدا ہوتی ہیں

میں سمجھتا ہوں کہ اِنسان کی روح بغیر تعلیم کے چتکبرے سنگ مرمر کے پہاڑ کی مانند ہے کہ جب تک سنگتراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا، اس کا دھندلا اور کھردرا پن دور نہیں کرتا، اس کو خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا اس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا، اس وقت تک اس کے جوہر اسی میں چھپے رہتے ہیں اور اس کی خوش نمانسیں اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال اِنسان کی روح کا ہے۔ اِنسان کا دل کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا، اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوتی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔

ارسطو نے تعلیم کے اثر کو مجسم مورتوں کے بنانے کی تشبیہ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ موہنی مورت ایک پتھر کے ڈھوکے میں چھپی ہوئی ہوتی ہے مگر مورت بنانے کا ہنر صرف فضول چیزوں کو ان میں گھڑ دیتا ہے مورت تو پتھر ہی میں ہوتی ہے مگر آذر صرف اس کو نمود کر دیتا ہے جو نسبت کہ مورت گھڑنے والے کو اس پتھر کے ڈھوکے سے ہے وہی نسبت تعلیم کو انسان کی روح سے ہے۔ بڑے بڑے حکیم اور عالم ولی وابدال نیک و عقلمند، بہادر و نامور ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں جب میں جاہل اور وحشی قوموں کے حالات پڑھتا ہوں تو ان نیکیوں سے جو اُن میں ہیں مگر ناشائستہ اور اس دلیری اور جرات سے جو ان میں ہے مگر خوفناک اور اس استقلال سے جو اُن میں ہے مگر بے ڈھنگا اور اس دانائی اور عقلمندی سے جو ان میں ہے مگر جانوروں کے سے مکر و فریب سے ملی ہوئی اور اس صبر و قناعت سے جو اُن میں ہے اور گویا نا امیدیاں ہی ان کی امیدیں ہیں نہایت خوش ہوتا ہوں۔ سچ ہے کہ اِنسان کے دل کے جوش مختلف طرح پر کام کرتے ہیں اور جس قدر کم و بیش عقل کی ہدایت ان کو ہوتی ہے اور جس قدر عقل کہ ان جوشوں کو درست کرتی ہے اس قدر مختلف طور پر ان سے کام ہوتے ہیں۔ امریکہ کے حبشی غلاموں کا جب ہم یہ حال سنتے ہیں کہ اپنے آقا کے مرنے پر یا ایک کام پر سے چھڑا کر دوسرے کام میں لگانے پر جنگلوں کے درختوں میں لٹک کر اپنی جان دے دیتے ہیں یا ایک ہندو عورت اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ جل کر ستی ہو جاتی ہے۔ تو کون شخص ہے جو ان کی وفاداری اور محبت کی تعریف نہ کرے گا گو کہ کیسے ہی ناشائستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہے اس قسم کی جاہل اور وحشی قوموں کے دلوں میں بھی نہایت عمدہ عمدہ باتیں پائی جاتی ہیں گو وہ وحشی پنے کے حالات میں کھلی نہ ہوں لیکن اگر ان کی مناسب طور سے اور عمدہ تعلیم سے درستی کی جاوے تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر

ترقی پاسکتی ہیں اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب و شائستہ نیکیاں ان سے پیدا ہو سکتی ہیں

مجھ کو اس بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں۔ پر خوفناک، ان میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا۔ ان کو نہایت دانا اور عقل مند پاتا ہوں پر اکثر مکر و فریب اور زور سے ملے ہوئے۔ ان میں صبر و قناعت بھی اعلیٰ درجے کی ہے مگر غیر مفید اور بے موقع پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے کیسی کچھ مفید ہوں۔

میری یہی خواہش ہے کہ اس قسم کی تحریرات سے نیکی کو ترقی دوں گو میری یہ خواہش پوری نہ ہو، مگر میں اس خیال سے تو بہت خوش ہوں کہ میں ہر پندرہ روز میں انسان کے دل کی درستی میں کچھ کچھ مدد کرتا رہتا ہوں"

(اس وقت رسالہ تہذیب الاخلاق" پندرہ روزہ چھپتا تھا۔ یہ اشارہ اسی طرف ہے) (محمد اسماعیل)

[تہذیب الاخلاق بابت یکم شوال ۱۲۸۹ھ]

منقول از مقالات سرسید۔ حصہ ششم۔ صفحہ نمبر ۱۲۔ مرتبہ مولانا محمد اسماعیل پانی پتی

ناشر: مجلس ترقی ادب لاہور

بقیہ مضمون عورت اور اسلام

متعلقہ صفحہ نمبر ۱۸

اسلام نے عورت کے حقوق کی پاسبانی کی ہے تو اس کی روشنی میں آیئے ہم عورت کی شخصیت کو اس کی زندگی اور مستقبل کو جسے آج کے معاشرے میں داؤں لگایا جا رہا ہے، پہچانیں۔ آج ہمارے سامنے عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے، معاش کا مسئلہ ہے، حقوق کا مسئلہ ہے، عزت و ناموس کا مسئلہ ہے، ان سب مسئلوں کو انسانیت کے دائرے میں، مذہب کے دائرے میں، اسلامی احکامات کے دائرے میں رہ کر سلجھانا ہے۔

اسلام کیا ہے اور قرآن کیا کہتا ہے؟ انھیں جانے اور سمجھے بنا ہماری زندگی مکمل نہیں ہو سکتی۔ اپنی زندگی کو اسلامی طرز زندگی کا نمونہ بنانا ہے تو اسلامی اصولوں اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں "عورت" کے مقام کو بھی سمجھنا اور پہچاننا ہے، اپنے علم و عمل سے اسلام کا نام اونچا رکھنا ہے تاکہ کسی کی انگلی ہم پر نہ اُٹھے کہ قرآن نے ہماری رہنمائی نہیں کی۔ اور اسلام ہماری حفاظت نہیں کرتا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۳-۸۲/۱۱

مندرجہ ذیل اسامیوں کے لیے مقررہ فارموں پر درخواستیں مطلوب ہیں

فیکلٹی آف میڈیسن/اجمل خاں طبیہ کالج

پروفیسرس۔

شرح تنخواہ:- ۱۵۰۰-۹۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ مع دوسرے الاؤنس

۱۔ پروفیسر آپتھلمالوجی (۲ پوسٹ) ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی (مستقل)

استعداد

۱۔ لازمی۔ (۱) ایم۔بی بی ایس یا ایم سی آئی سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۲) ایم ایس (آپتھلمالوجی)/ ایم ڈی (آپتھلمالوجی) یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی معلومات۔

تعلیمی/تحقیقی تجربہ

بحیثیت ریڈر کسی میڈیکل کالج میں کام کا تجربہ

پسندیدہ

(۱) ریٹینل سرجری/ امٹرالیمالوجی/ اوکیولر پیتھالوجی میں تجربہ

(۲) ملکی اور غیر ملکی جریدوں میں شائع شدہ اوریجنل تحقیقی کام

نوٹ ۱۔ وہ امیدوار جنھوں نے اشتہار نمبر ۱۴/۸۲-۸۱ کے تحت پروفیسر آف آپتھلمالوجی کے لیے درخواست دی ہے انھیں از سر نو درخواست دینے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ [illegible]

سابقہ درخواست ہی کافی ہے۔

۲۔ پروفیسر آف انیستھیسیولوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف انستھیسیولوجی (مستقل)

استعداد

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا کی تسلیم شدہ کوئی استعداد

(۱۱) ایم ڈی (انستھیسیولوجی)/ایم ایس (انستھیسیولوجی)/میڈیکل کونسل آف انڈیا کی تسلیم شدہ کوئی استعداد۔

بحیثیت ریڈر اِن انستھیسیولوجی کسی میڈیکل کالج تدریس/تحقیق کا چار سالہ تجربہ

پسندیدہ۔

ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اِس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ اوریجنل کام

ریڈرس :۔

شرح تنخواہ :۔ ۱۲۰۰۔ ۵۰۔ ۱۳۰۰۔ ۶۰۔ ۱۹۰۰ روپیہ مع دیگر الاؤنس

۳۔ ریڈر اِن اناٹمی۔ ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی (مستقل)

استعداد

۱۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی استعداد

(۱۱) ایم۔ ایس (اناٹمی)/ ایم ایس (اناٹمی)/ پی ایچ ڈی (میڈیکل اناٹمی)/ ڈی ایس سی (میڈیکل اناٹمی) میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی استعداد

بحیثیت لکچرر کسی میڈیکل کالج میں تدریس/تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

(۱۱) پسندیدہ :۔

ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ اوریجنل کام

۴۔ ریڈر اِن فزیالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف فزیالوجی (مستقل)

استعداد

۱۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی استعداد

(۱۱) ایم ڈی (فزیالوجی)/ایم ایس سی (فزیالوجی)/ پی ایچ ڈی (میڈیکل فزیالوجی)/ ڈی ایس سی/ میڈیکل فزیالوجی) یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی استعداد

بحیثیت لکچرر فزیالوجی کسی میڈیکل کالج میں تدریس/تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

(۱۱) پسندیدہ :

ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ اوریجنل کام

۵۔ پروفیسر ان نیورو سرجری (بلان پوسٹ) ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (مستقل)

استعداد

۱۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی استعداد۔

(۲) ایم سی ایچ (نیورو سرجری)۔ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی استعداد۔

بحیثیت لکچر ر نیورو سرجری کسی میڈیکل کالج میں تدریس/تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ:۔

ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ اور تخلیقی تحقیقی کام

۶ ریڈر ان فارماکالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف فارماکالوجی (مستقل)

استعداد

(۱) لازمی:۔ ۱۔ ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۲) ایم ڈی (فارماکالوجی)/ ایم ڈی (فارماکالوجی اینڈ تھیراپیوٹکس)/ایم ایس سی (فارماکالوجی)/

پی ایچ ڈی (میڈیکل فارماکالوجی)/ ڈی ایس سی (میڈیکل فارماکالوجی)۔ میڈیکل کونسل آف

انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

بحیثیت لکچر ر فارماکالوجی کسی میڈیکل کالج میں تدریس/تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ:۔

ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ تحقیقی اور تخلیقی مضامین۔

۷۔ ریڈر ان ای این ٹی۔ ڈپارٹمنٹ آف اوٹو۔ رینو۔ لرنگولوجی (۲ مستقل اسامیاں)

استعداد:

(۱) لازمی:۔ (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۲) ایم ایس (اوٹو۔ رینو۔ لرنگولوجی)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی

مساوی استعداد۔

بحیثیت لکچر ر اوٹو۔ رینو۔ لرنگولوجی کسی میڈیکل کالج میں تدریس/تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

(۲) پسندیدہ:۔

(۱) ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ تحقیقی و تخلیقی مضامین

(۲) برونکو اوئسوفیگولوجی/ رینالوجی اور لرنگولوجی میں طبعی میلان

نوٹ:۔ جن لوگوں نے اشتہار نمبر ۳/۸۳-۸۲ کے تحت درخواست دے دی ہے۔ ان کو از سر نو درخواست دینے کی

ضرورت نہیں ان کو سابقہ درخواست کی بنیاد پر ہی طلب کیا جائے گا۔

۸ ریڈر اِن نیورو - سائیکٹری - ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن (مستقل)

استعداد

ا۔ لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(۱۱) ایم ڈی (سائیکٹری)/ایم ڈی (سائیکالوجیکل میڈیسن)/ایم ڈی (میڈیسن) معہ ڈپلومہ اِن سائیکالوجیکل میڈیسن۔ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی استعداد
بحیثیت لکچرر سائیکٹری کسی میڈیکل کالج میں تدریس/تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ:۔

ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ تحقیق اور تخلیقی مضامین

۹ ریڈر اِن آرتھوپیڈک سرجری - ڈپارٹمنٹ آف آرتھوپیڈکس۔

استعداد

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(۱۱) ایم ایس (آرتھوپیڈکس)/ایم سی ایچ (آرتھوپیڈکس)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔
بحیثیت لکچرر کسی میڈیکل کالج میں آرتھوپیڈکس) میں تدریس/تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ:۔

ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ تخلیقی و تحقیقی مضامین

۱۰ ۔ ریڈر اِن انستھیسیالوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف انستھیسیالوجی (۲ مستقل اسامیاں)

استعداد:۔

لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(۱۱) ایم ڈی (انستھیسیالوجی)/ایم ایس (انستھیسیالوجی)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔

پسندیدہ:۔

ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں شائع شدہ تخلیقی و تحقیقی مضامین

۱۱ ۔ ریڈر اِن پیتھالوجی ۔ ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی (مستقل)

استعداد:۔

بیب الاخلاق یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ

پی ایچ ڈی (پیتھالوجی) / ڈی ایس سی (پیتھالوجی)

کوئی مساوی استعداد

بحیثیت لکچرر کسی میڈیکل کالج میں تدریس / تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

(ii) پسندیدہ :- ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ تخلیقی اور تحقیقی مضامین

۱۲- ریڈر ان پری وینٹو اینڈ سوشل میڈیسن۔ ڈپارٹمنٹ آف پی ایس ایم۔ (مستقل)

استعداد :-

(i) لازمی (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(ii) ایم ڈی (سوشل اینڈ پری وینٹو میڈیسن) / کمیونٹی میڈیسن / ایم ڈی میڈیسن معہ ڈی پی ایچ / میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔

بحیثیت لکچرر کسی میڈیکل کالج میں سوشل اینڈ پری وینٹو میڈیسن کی تدریس / تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ

ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ تحقیقی و تخلیقی مضامین۔

۱۳- ریڈر ان جنرل سرجری ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (مستقل)

استعداد :-

(i) لازمی (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی متبادل استعداد

(ii) ایم ایس (سرجری) ایم ایس (جنرل سرجری) / میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد۔

بحیثیت لکچرر جنرل سرجری کسی میڈیکل کالج میں تدریس و تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

(ii) پسندیدہ :- ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ تخلیقی و تحقیقی مضامین۔

۱۴ ریڈر ان سرجری (بائیو کیمسٹری) ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (مستقل)

استعداد :-

(i) لازمی (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(ii) ایم ڈی (بائیو کیمسٹری) ایم ایس سی (میڈیکل بائیو کیمسٹری) / پی ایچ ڈی (میڈیکل بائیو کیمسٹری) / میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ مساوی استعداد

اا پسندیدہ :-

(ا) ایسے بائیوکیمیکل مریضوں کی دیکھ ریکھ کا تجربہ جبکی قلب/دماغ کی سرجری ہوئی ہو

(ا) ہندوستانی اور غیر ملکی جرائد میں اس تحقیقی مضمون میں شائع شدہ تحقیقی و تخلیقی مضمون

۱۵- ریڈر ان آپتھلمالوجی :- ڈپارٹمنٹ آف آپتھلمالوجی (عارضی لیکن مستقل ہونے کی امید)

استعداد

(ا) لازمی (ا) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(ا) ایم ایس (آپتھلمالوجی)/ایم ڈی (آپتھلمالوجی)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مسا

استعداد

بحیثیت لکچرر آپتھلمالوجی کسی میڈیکل کالج میں تدریس/تحقیق کا پانچ سالہ تجربہ

پسندیدہ :-

ہندوستانی و غیر ملکی جرائد میں اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ تحقیقی و تخلیقی مضامین

لکچررز :

شرح تنخواہ ۷۰۰ - ۴۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ مع الاؤنس

۱۶- لکچرر کارڈیالوجی - ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن (مستقل)

استعداد :-

ا- لازمی (ا) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا کی تسلیم کردہ کوئی مساوی استعداد -

(ا) ڈی ایم (کارڈیالوجی)/میڈیکل کونسل آف انڈیا کی تسلیم کردہ مساوی استعداد -

تدریسی/تحقیقی تجربہ

اس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ :- اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ مضامین -

۱۷- لکچرر ان نیفرولوجی - ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن (مستقل)

استعداد :- لازمی ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(ا) ڈی ایم (نیفرولوجی)/ایم ڈی (میڈیسن) اور نیفرولوجی میں دو سالہ تجربہ/میڈیکل کونسل

انڈیا سے کوئی تسلیم شدہ مساوی استعداد

تدریسی/تحقیقی تجربہ

اس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ :- اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ مضامین

لکچرار ان نیور سائکٹری۔ ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن

استعداد :-

۱۔ لازمی : (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۲) ایم ڈی (سائکٹری)/ایم ڈی (سائیکلوجیکل میڈیسن)/ایم ڈی (میڈیسن) مع ڈپلوما ان سائیکلوجیکل میڈیسن/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی/تحقیقی تجربہ

اِس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

(۲) پسندیدہ :-

اِس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ مضامین۔

۱۔ لکچرار ان جنرل میڈیسن، ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن (مستقل)

استعداد

۱۔ لازمی : (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۲) ایم ڈی (میڈیسن)/ایم ڈی (جنرل میڈیسن)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی/تحقیقی تجربہ

اِس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ اِس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ مضامین۔

۲۰۔ لکچرار ان اناٹمی، ہسٹیلوجی) (پلان پوسٹ) ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی (مستقل)

استعداد (۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۲) ایم ایس (اناٹمی)/ایم ایس سی (اناٹمی) پی ایچ ڈی (میڈیکل اناٹمی)/ڈی ایس سی (میڈیکل اناٹمی)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی/تحقیقی تجربہ

اِس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ :- اِس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ مضامین اور ہسٹیلوجی میں تدریس کا تجربہ

۲۱۔ لکچرار کم پیڈریاٹک سرجن۔ ڈپارٹمنٹ آف پیڈریاٹکس۔ (پلان پوسٹ)۔ (مستقل)

استعداد :- لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی متبادل استعداد

(۲) ایم سی ایچ (پیڈریاٹک سرجری)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی/تحقیقی تجربہ
اِس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

(ii) پسندیدہ :- اِس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ مضامین

۲۲۔ لکچرر اِن پریونٹو اینڈ سوشل میڈیسن ڈپارٹمنٹ آف پی ایس ایم (مستقل)
۲۳ لکچرر (ایم۔او۔ایچ۔لیڈی) ڈپارٹمنٹ آف پی ایس ایم (")
۲۴۔ لکچرر (ایم۔او۔ایچ) ڈپارٹمنٹ آف پی ایس ایم (")
استعداد :-

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
(۱۱) ایم ڈی (سوشل اینڈ پریونٹو میڈیسن)/کمیونٹی میڈیسن/ایم ڈی میڈیسن مع ڈی پی ایچ
میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
تدریسی/تحقیقی تجربہ
اِس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد۔

پسندیدہ :- (۱) اِس مخصوص مضمون میں شائع شدہ مضامین
(۲) برائے پوسٹ ایم او ایچ لیڈی لکچرر نمبر ۲۳
کسی رورل ہیلتھ ٹریننگ سینٹر ضلع یا درجہ اول کی میونسپلٹی میں کام کا علمی تجربہ

نوٹ :- شمارہ ۲۳ - ۲۴ کے تحت مشتہر اسامیوں کے تحت منتخب امیدواروں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ رورل
ہیلتھ ٹریننگ سینٹر (R.H.T.C) جواں میں جو میڈیکل کالج کیمپس سے ۱۵ کلومیٹر ہے، قیام کریں۔

۲۵۔ لکچرر پلاسٹک سرجری۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (مستقل)
استعداد :-

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی استعداد
(۱۱) ایم سی ایچ (پلاسٹک سرجری)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
تدریسی/تحقیقی تجربہ
اِس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ اِس مخصوص مضمون میں شائع شدہ مضامین

۲۶۔ لکچرر اِن اوبسٹیٹرک اینڈ گائناکالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف گائناکالوجی (۲ مستقل اسامیاں)
استعداد

[illegible]

(ii) ایم ڈی (اوبسٹیٹرک اینڈ گائنا کالوجی)/ایم ایس (اوبسٹیٹرک اینڈ گائنا کالوجی) ایم ڈی
(مڈ وائفری اینڈ گائنا کالوجی)/ ایم او/ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
تدریسی/تحقیقی تجربہ
اس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ :- اس تخصیصی مضمون میں شائع شدہ مضامین

۲۷۔ لکچررس ان پیتھالوجی۔ ڈپارٹمنٹ آف پیتھالوجی (۳ مستقل اسامیاں)

استعداد :-

۱۔ لازمی (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ایم ڈی (پیتھالوجی)/ایم ڈی (پیتھالوجی اینڈ بیکٹریالوجی)/ایم ڈی (پیتھالوجی مع بیکٹریالوجی)/
پی ایچ ڈی (پیتھالوجی)/ ڈی ایس سی (پیتھالوجی/ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ
کوئی مساوی استعداد
تدریسی/تحقیقی تجربہ
اس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ :-

(i) اس مخصوص مضمون میں شائع شدہ مضامین

نوٹ :- ایک پوسٹ سائٹو پیتھالوجی کے لیے

۲۸۔ لکچرر ان اسکن اینڈ وی ڈی ڈپارٹمنٹ آف میڈیسن (مستقل)

استعداد :-

(۱) لازمی (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی استعداد
(ii) ایم ڈی (ڈرماٹولوجی اینڈ وینرالوجی)/ایم ڈی (میڈیسن) مع ڈی وی ڈی/ ڈی وی ڈی/
میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد
تدریسی/تحقیقی تجربہ
اس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ :-

اس مخصوص مضمون میں شائع شدہ مضامین

۲۹۔ لکچرر جنرل سرجری ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (۱۲ اسامیاں) ایک مستقل اور دو سال کے۔ ایک عارضی اسامی

استعداد (i) لازمی (i) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے منظور شدہ کوئی مساوی استعداد

۱۰۲

(۱) ایم ایس (سرجری)/ایم ایس (جنرل سرجری)/میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کو مساوی استعداد

تدریسی/تحقیقی تجربہ

اس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ (۱) اس مخصوص مضمون میں شائع شدہ مضامین

(۲) پوسٹ گریجویٹ ڈگری حاصل کرنے کے بعد مطب کا تجربہ

۳۰۔ لکچرر ان نیوسرجری ۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (مستقل)

استعداد

(۱) لازمی (۱) ایم بی بی ایس یا اس کے مساوی میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ استعداد

(۲) ایم سی ایچ (نیوسرجری)/ میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

تدریسی/ تحقیقی تجربہ

اس مضمون کے لیے منظور شدہ مطلوبہ پوسٹ گریجویٹ استعداد

پسندیدہ :۔

(۱) اس مخصوص مضمون میں شائع شدہ مضامین

(۲) اس مخصوص مضمون میں تدریسی تجربہ

۳۱۔ لکچرر ان ڈینٹل سرجری ۔ ڈپارٹمنٹ آف جنرل سرجری (عارضی اسامی)

استعداد :۔

(۱) لازمی (۱) بی ڈی ایس/بی ڈی ایس کے ساتھ اگر ایم بی بی ایس بھی ہو تو ترجیح دی جائے گی۔

پسندیدہ :۔

(۱) اس مخصوص مضمون میں شائع شدہ مضامین

(۲) اس مضمون کی تدریس کا تجربہ

اجمل خاں طبیہ کالج

ریڈر :

شرح تنخواہ ۱۲۰۰ – ۵۰ – ۱۳۰۰ – ۶۰ – ۱۹۰۰ مع دوسرے الاؤنس

۳۲۔ ریڈر ان کلیات ۔ ڈپارٹمنٹ آف یونانی میڈیسن اینڈ سرجری (مستقل)

استعداد

(۱) لازمی :- بی یو ٹی ایس / بی یو ایم ایس / بی یو ایم ایم ایس یا کوئی مساوی ڈگری قانونی طور پر
باضابطہ قائم شدہ یونیورسٹی یا بورڈ فیکلٹی / کسی امتحان لینے والی تنظیم سے طب یونانی میں
حاصل شدہ ڈپلوما
تدریسی / تحقیقی تجربہ
کسی تسلیم شدہ ادارہ میں طب یونانی کی تدریس کا تجربہ

پسندیدہ :-

کسی یونیورسٹی یا طب یونانی کے لیے قائم شدہ کسی باقاعدہ ادارہ سے حاصل شدہ پوسٹ
گریجویٹ استعداد۔
طب یونانی میں کلیات پر طبع شدہ تخلیقی کام
اردو / عربی / فارسی / انگریزی کا علم

لکچررس

شرح تنخواہ : ۷۰۰ - ۴۰ - ۹۰۰ - ۱۱۰۰ - ۵۰ - ۱۶۰۰ روپیہ مع الاؤنس

۴۳۔ لکچرر منافع الاعضاء (فزیالوجی) ۔ ڈپارٹمنٹ آف یونانی طب سرجری (مستقل)

استعداد

لازمی (۱) بی یو ایم ایس / بی یو ایم ایم ایس یا مسلم یونیورسٹی یا کسی تسلیم شدہ ادارہ سے حاصل
کردہ کوئی مساوی استعداد
(۲) کسی تسلیم شدہ ادارہ میں تدریس کا کم از کم تین سال تجربہ

پسندیدہ

(۱) اردو میں قرار واقعی اور انگریزی میں کام کرنے کی لیاقت
(۲) مطبوعہ کام

۴۴۔ لکچرر ان موڈرن میڈیسن ۔ ڈپارٹمنٹ آف یونانی طب و سرجری (عارضی اسامی مگر مستقل ہونے کی امید)

استعداد

ا۔ لازمی (۱) ایم ڈی (میڈیسن)
(۲) کسی تسلیم شدہ میڈیکل / یونانی کالج میں تدریس کا تین سال تجربہ
(۳) اردو کا علم

پسندیدہ :-

اعلیٰ پایہ کا مطبوعہ کام

۳۷۔ لکچرر عوارض نسواں (گائنا کالوجی) مستقل

استعداد :

۱۔ لازمی۔ بی یو ایم ایس یا اس کے مساوی کوئی ڈگری یا ایم بی بی ایس
اس مضمون میں تدریس کا تین سال تجربہ۔ اردو اور انگریزی کا علم

پسندیدہ :-

مطبوعہ کام
اس مضمون میں پوسٹ گریجویٹ ڈگری

غیر معمولی استعداد اور تجربے کے حامل افراد کو ابتداء ہی سے اعلیٰ گریڈ دیا جا سکتا ہے۔
انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امید واروں کو بطور ٹی اے۔ صرف سکنڈ کلاس کا یکطرفہ ریلوے کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سیلکشن کمیٹیز) سے ۲ روپے نقد فائننس آفس کے کیش سکشن میں جمع کرکے/ یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، جمع کرکے ذاتی طور پر یا 23 x 10 cm کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو بھیج کر حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

درخواست فارم وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۲ء ہے۔
نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہیں کیا جائے گا۔

محمود علی
رجسٹرار

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اشتہار نمبر ۸۲/۱۲-۸۳

درج ذیل آسامی کے لیے مقررہ فارم پر درخواستیں مطلوب ہیں۔

۱۔ پروفیسر آف اناٹمی۔ ڈپارٹمنٹ آف اناٹمی (مستقل)

شرح تنخواہ ۱۵۰۰-۶۰-۱۸۰۰-۱۰۰-۲۰۰۰-۱۲۵/۲-۲۵۰۰ روپیہ معہ الاؤنس

استعداد

۱۔ لازمی:

(۱) ایم بی بی ایس یا میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی مساوی استعداد

(۱۱) ایم ایس (اناٹمی)/ ایم ایس سی (اناٹمی)/ پی ایچ ڈی (میڈیکل اناٹمی)/ ڈی ایس سی (میڈیکل اناٹمی) - میڈیکل کونسل آف انڈیا سے تسلیم شدہ کوئی استعداد

کسی میڈیکل کالج میں بحیثیت ریڈر اناٹمی تدریس/تحقیق کا ۴ سالہ تجربہ

پسندیدہ:-

اس مخصوص مضمون میں تخلیقی تحقیقی مطبوعات اور تصنیفات میں سرگرم عمل ہونے کے علاوہ ڈاکٹریٹ سطح پر ریسرچ کی رہنمائی کا تجربہ

نوٹ:- اشتہار نمبر ۸۲-۸۳/۱۱ کے تحت ریڈر اناٹمی کی جس پوسٹ کو مشتہر کیا گیا تھا، اس کو اس اشتہار کے ذریعہ کالعدم کیا جاتا ہے۔

غیر معمولی استعداد اور تجربہ کے حامل امیدواروں کو ابتدا ہی سے اعلیٰ گریڈ دیا

جاسکتا ہے۔

انٹرویو کے لیے طلب کیے جانے والے امیدواروں کو بطور ٹی اے صرف سکنڈ کلاس کا یکطرفہ ریلوے کرایہ ادا کیا جائے گا۔

مطلوبہ درخواست فارم اور ہدایات اسسٹنٹ رجسٹرار (سلیکشن کمیٹیز) سے دو روپیہ نقد (فائننس آفس کے کیش سیکشن میں جمع کرکے) یا اسی قیمت کا انڈین پوسٹل آرڈر جو فائننس آفیسر مسلم یونیورسٹی کے نام واجب الادا ہو، جمع کرکے ذاتی طور پر یا 23x10 سمر کا ایسا لفافہ جس پر خود کا پتہ تحریر ہو، بھیج کر حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

درخواست فارم وصول ہونے کی آخری تاریخ ۲۴ر دسمبر ۱۹۸۲ء ہے۔

نامکمل یا تاخیر سے موصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

ضمیر احمد خاں

رجسٹرار

مسلم یونیورسٹی کے شب و روز

اکیڈمک کاؤنسل کے انتخابات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اکیڈمک کاؤنسل کے لیے یونیورسٹی اساتذہ کے پندرہ نمائندوں کا انتخاب آٹھ دسمبر کو ہوگا۔

چیف الیکشن آفیسر، پروفیسر فصیح الحسن رضوی کے ذریعہ اعلان شدہ پروگرام کے مطابق نامزدگی کے فارم جمع کرنے کی آخری تاریخ ۲۹ نومبر تھی۔ ۳ دسمبر تک نام واپس لیے جاسکتے ہیں

ان انتخابات میں پروفیسر، ریڈر اور لکچرار اپنے اپنے حلقہ سے تین پروفیسر، پانچ ریڈر اور سات لکچررس کا انتخاب کریں گے۔ ووٹر لسٹ پہلے ہی مشتہر کی جاچکی ہے۔

سائنٹیفک سوسائٹی:

سائنٹیفک سوسائٹی کے زیر اہتمام اہم موضوعات پر ماہرین کی تقاریر کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ سوسائٹی کے کنوینر پروفیسر سید آفتاب احمد زیدی اب تک آٹھ لیکچرس کرا چکے ہیں

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسیز میں بائیو فزکس کے ماہر پروفیسر آر کے معرا نے ۱۳ و ۱۴ نومبر کو لیکچر دیا جس کا موضوع تھا "زندگی - ماہر طبعیات کی نظر میں"

لیکچر کا موضوع جس قدر دلچسپ تھا اسی قدر دلچسپ اور پُر اثر انداز میں پروفیسر معرا نے باریک سے باریک نکتہ عام فہم مثالوں اور رنگین سلائڈس کی مدد سے بخوبی سمجھانے کی کوشش کی۔

جلسے کی صدارت وائس چانسلر جناب سید حامد نے فرمائی۔

مولانا آزاد کا یوم پیدائش

یونیورسٹی میں زیر تعلیم بیرونی ممالک کے طلبہ کی جانب سے مولانا ابوالکلام آزاد کا یوم پیدائش (۱۱ نومبر) کے سلسلہ میں ۱۳ نومبر کو کینیڈی ہال میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ وائس چانسلر جناب سید حامد نے جلسے کی صدارت فرمائی

اس موقع پر کئی بیرونی ملکوں کے طلبہ نے تقاریر کیں اور مولانا آزاد کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ اس بات کا تذکرہ خاص طور پر کیا گیا کہ مولانا نے اپنی زندگی میں "انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز" قائم کرکے بیرونی ممالک کے طلبہ پر بڑا کرم کیا جسے وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

کلچرل پروگرام

جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج کی کلچرل کمیٹی کی جانب سے ۲۰ نومبر کی شام کینیڈی ہال میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں قابل تعریف ڈرامے اور دیگر ثقافتی پروگرام بڑے اچھے ڈھنگ سے پیش کیے گئے

وائس چانسلر جناب سید حامد مہمان خصوصی کی حیثیت سے جلسے میں تشریف لائے۔ کینیڈی ہال طلبہ و اساتذہ سے بھرا ہوا تھا۔

دیگر پروگراموں کے علاوہ تین ڈرامے "خیریت ہے"، "وصیت" اور "شطرنج کے مہرے" بھی پسند کیے گئے۔

نئے رجسٹرار

ضیا احمد خاں صاحب نے مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدہ پر ۲۷ نومبر کو چارج لے لیا ہے۔ اس سے پیشتر وہ یو پی گورنمنٹ میں ڈپٹی سکریٹری و ایڈیشنل کمشنر (اوقاف) کے عہدے پر فائز تھے۔

روزگار سماچار

۱۔ مرکزی روزگار دفتر نے استادوں کی سولہ سو چھپن جگہوں کے لیے اشتہار شائع کیا ہے۔ ۷۵۰ جگہیں پرائمری ٹیچرز کے لیے ہیں۔ ۶۵۰ جگہیں تربیت یافتہ گریجویٹ ٹیچرز کے لیے اور ۲۵۶ جگہیں پوسٹ گریجویٹ ٹیچرز کی ہیں۔ متعلقہ دفتر میں مکمل درخواست پہنچنے کی آخری تاریخ ۱۰ دسمبر ۸۲ء ہے۔ سبھی جگہیں مرکزی اسکولوں کے لیے ہیں۔ تفصیل دوسرے اخباروں کے ساتھ ساتھ امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۲۰ نومبر ۸۲ء میں بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

۲۔ کونسل آف سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ میں مختلف جگہوں کے لیے مقابلہ کا امتحان ۱۹۸۳ء کے درمیانی مہینوں میں ہونے والا ہے۔ تفصیلی اشتہار روزگار سماچار مورخہ ۲۰ نومبر ۸۲ء ضرور ملاحظہ کیجیے۔

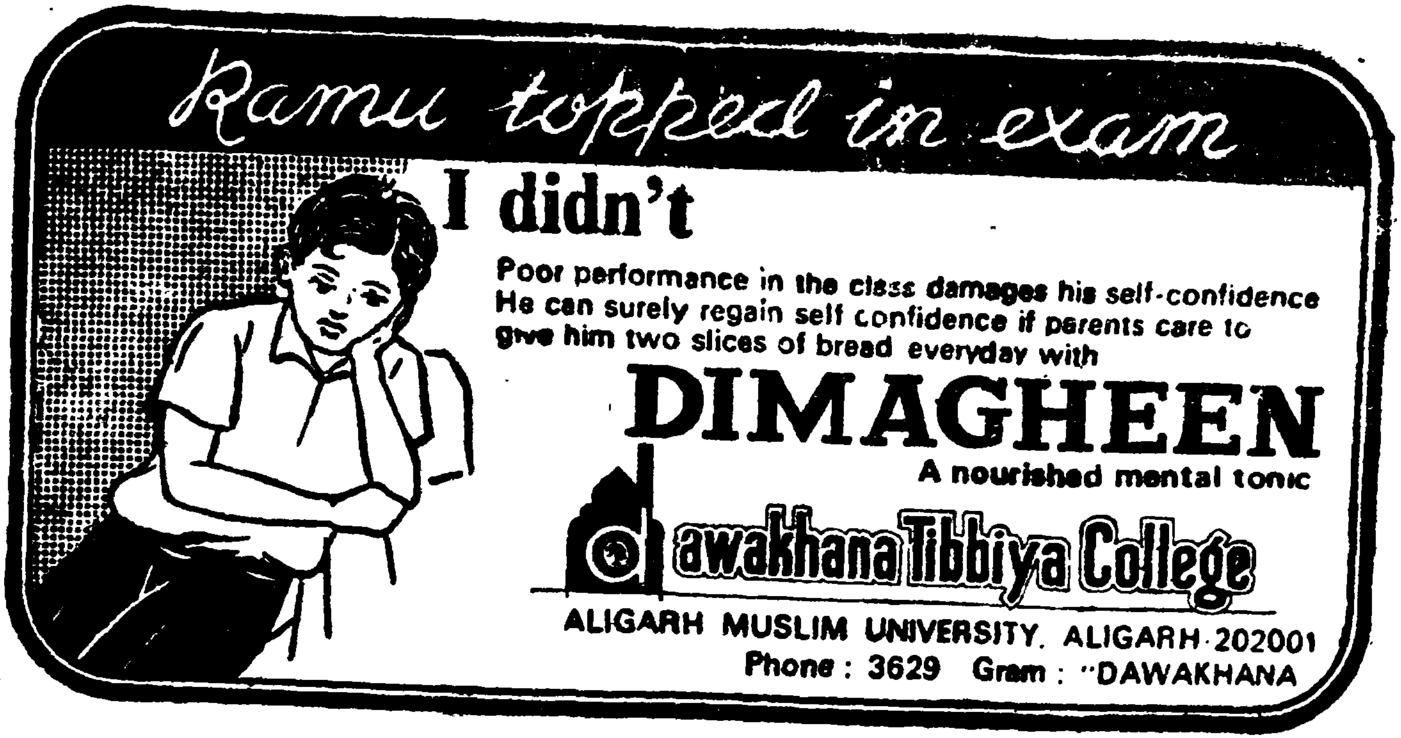
۳۔ یونین پبلک سروس کمیشن کو درخواستیں مطلوب ہیں، برائے اسسٹنٹ انجینیر برقیاتی یا مشینی۔ جگہوں کی تعداد ۴۰ ہے۔ امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۲۰ نومبر صفحہ ۱۳ ضرور پڑھیے۔

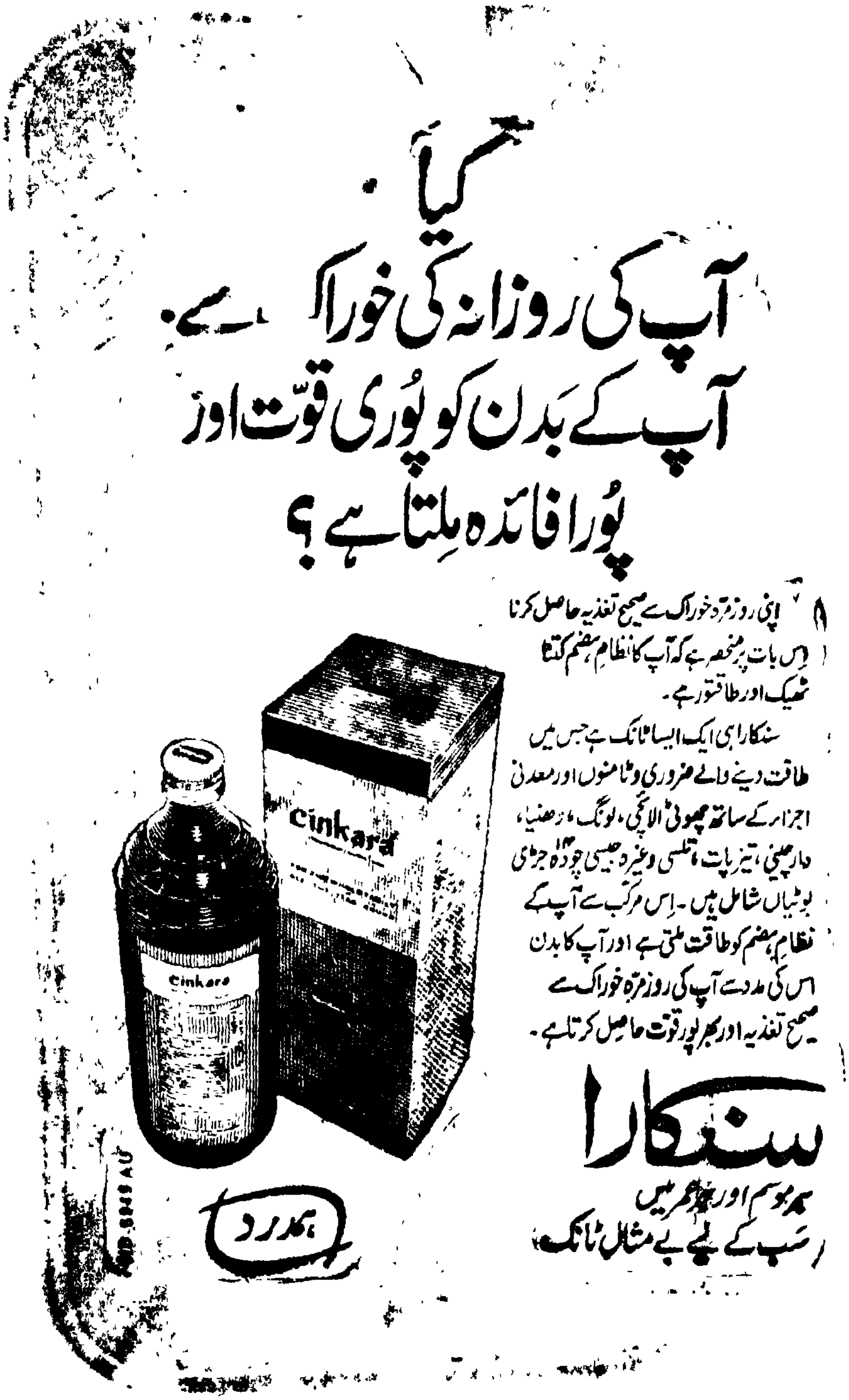
۴۔ کول انڈیا لمیٹڈ میں ۲۵ عدد جگہوں کے لیے سول انجینیر پاس لوگوں سے درخواستیں مطلوب ہیں اور ۲۹ عدد ڈرانز کی جگہوں کے لیے بھی درخواستیں چاہییں۔ سبھی مکمل درخواستیں متعلقہ دفتر میں ۱۰ دسمبر ۸۲ء تک پہنچ جانا چاہیے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ فرمایئے، امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۲۷ نومبر ۸۲ء صفحہ ۶۔

۵۔ یونین پبلک سروس کمیشن کے تحت ۱۲ عدد سندھی افسروں کی جگہوں کے لیے درخواستیں درکار ہیں۔ ان جگہوں کے لیے بھی آپ امپلائمنٹ نیوز مورخہ ۲۷ نومبر میں ملاحظہ فرمایئے۔ صفحہ ۱۲

۶۔ ۲۷ نومبر کے ہی امپلائمنٹ نیوز میں صفحہ ۱۸ پر دیکھیے ۹۷ جونیئر انجینیر کی جگہوں کے لیے درخواستیں مطلوب ہیں سب ہی جگہیں ڈاک و تار شعبے کے تحت ہیں۔

ترتیب انور حبیب علوی
امین ہوسٹل۔ اے ایم یو۔ علیگڑھ


Ramu topped in exam
I didn't
Poor performance in the class damages his self-confidence
He can surely regain self confidence if parents care to
give him two slices of bread everyday with
DIMAGHEEN
A nourished mental tonic
Dawakhana Tibbiya College
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH-202001
Phone : 3629 Gram : "DAWAKHANA


کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ ملتا ہے؟
اپنی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اِس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔
سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزا کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اِس مرکب سے آپ کے نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔
cinkara
سنکارا
ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک
ہمدرد

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد نمبر ۱ ۱۴ دسمبر ۱۹۸۲ء شمارہ نمبر ۲۲

بایں ہمہ مجھ کو یقین ہے کہ میری زندگی میں عام مسلمانوں کی گالیوں اور نفرت سے مجھ کو نجات نہ ملے گی۔ عیسائی بھی میری تفسیر سے خوش نہیں ہو سکتے کیونکہ جس طرح میں انجیل کی تعلیم صحیح اور درست سمجھتا ہوں اسی طرح تثلیث کے مسئلہ کا قائل نہیں ہوں اس لئے کہ میں انجیل میں اس مسئلہ کی تائید یا وجود نہیں پاتا ہوں مجھ کو یقین ہے کہ مذہب اسلام صحیح ہے اور اس کی صحت اور وجہ دونوں انجیل سے ثابت ہیں۔ اس لیے مجھے کچھ پرواہ نہیں کہ میں کسی گروہ کے لوگوں کو خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی، خوش کروں۔ میں حق پر ہوں اور اس خدا کو خوش کرنا چاہتا ہوں جس کے روبرو سب کو ایک دن جانا ہے۔"

سید احمد

(بہ پروفیسر جان میولسن آرنلڈ کے نام ایک خط میں)

11.1.83

فی پرچہ ایک روپیہ ششماہی ۱۱ روپے سالانہ : ۲۰ روپے

بیرون ہند سے

ایک پرچہ ایک ڈالر سالانہ ۱۵ ڈالر

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ:

"قاضی معز الدین احمد"

منصور منزل - تار بنگلہ - اے ایم یو - علی گڑھ - یو پی - انڈیا

نوٹ :- ڈرافٹ / چیک وغیرہ "قاضی معز الدین احمد" کے نام سے ارسال کریں نہ کر "تہذیب الاخلاق" کے نام سے۔

پندرہ روزہ

علی گڑھ

تہذیب الاخلاق

جلد نمبر ۱

شمارہ نمبر ۲۲

مدیر: سید حامد
وائس چانسلر اے ایم یو۔

مدیر مسئول قاضی معز الدین احمد

فضا (Atmosphere) کی کثافت

ہم آپ جس ماحول میں رہتے ہیں اس کو ہم نے خود پیدا کیا ہے اور ہمارے فکر و عمل کی آزادی سے پیدا ہوا ہے۔ جہاں ہم نے ترقی کی ہے اور اپنے تمدن کو بلند کیا ہے وہاں ہم اپنے معاشرہ اور اپنے تمدن کی بربادی کا بھی سامان کر رہے ہیں۔ ہم حالات کے ہاتھوں بے بس ہیں۔ اور جس طرف حالات ہم کو دھکیل رہے ہیں، اسی طرف ہم دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ نہیں دیکھتے کہ ہمارے سامنے ایک دلدل ہے جو ہماری تہذیب و تمدن و معاشرہ کو برباد کر دے گی۔

ہمارے فکر و عمل نے جو علوم پیدا کیے، ان سے جہاں ہم نے بہت سے فائدے حاصل کیے ہیں، وہاں اپنی بربادی کا سامان بھی خود پیدا کیا ہے۔ ایٹم بم تو ایک بڑی چیز ہے اس کو تو ہم نے اسی لیے بنایا ہے کہ وہ نسل انسانی کو ختم کر دے اور جو کچھ انسان نے آج تک پیدا کیا ہے اس کو برباد کر دے۔ ایٹم بم سے بھی زیادہ مہلک وہ نتائج ہیں جو ہماری ترقی کے دور میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

انسان نے مشین بنائی۔ اس کے ذریعہ گذشتہ دو سو سال میں ہم نے بہت ترقی کی۔ لیکن یہ انجن جو چلتا ہے وہ آواز پیدا کرتا ہے، اور جلا ہوا میل جس میں پانی کوئلہ وغیرہ ہوتا ہے وہ خارج کرتا ہے۔ یہ وہ چیزیں جو مشین پیدا کرتی ہے جہاں وہ ہماری تہذیب کی ترقی کا ذریعہ ہوتی ہیں وہاں انسان کے لیے مضر اور مہلک اثرات بھی ان کے استعمال سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ریلوے ٹرین سب سے اہم چیز ہے۔ اس کی گڑگڑاہٹ سے ہماری فضا مکدر ہوتی ہے جس کا مضر اثر ہمارے اعصاب اور دل و دماغ پر پڑتا ہے۔ ریلوے کا استعمال روز بروز بڑھ رہا ہے اور ہمارے شہروں کی فضا بھی کثیف ہوتی جاتی ہے۔ ریل کی گڑگڑاہٹ سے زیادہ ان مشینوں کی گڑگڑاہٹ ماحول کو کثیف کرتی ہے جو شہروں کی رونق کا سبب ہیں۔ پھر اس آواز کے علاوہ شہروں میں جو مل اور کارخانے ہیں ان کا میل کچیل بہہ کر دریا یا سمندر میں جاتا ہے اس میل میں تیل، گندہ پانی اور بہت سے دوسرے مضر صحت اجزا شامل ہوتے ہیں جو شہر کے رہنے والوں کی صحت کے لیے

بڑا خطرہ ہیں۔ مشینوں کا دھواں ماحول برابر خراب کرتا رہتا ہے۔ کوئلہ کے ذرات متعدد بیماریوں کا سبب ہیں وہ فضا میں اُڑتے رہتے ہیں اور سانس کے ذریعہ انسانی جسم میں داخل ہوتے ہیں۔ نزلہ، کھانسی۔ دق ان ہی کا نتیجہ ہیں۔

ہوائی جہاز ہماری تہذیب کی ترقی کی اہم علامت ہے اس کی گڑگڑاہٹ اور اس کا دھواں بھی فضا کو کثیف کرتا ہے۔ ہم ریڈیو بڑے شوق سے سنتے ہیں اور چونکہ خود زور سے بولتے ہیں، اس لیے ریڈیو کی دھیمی آواز سے مطمئن نہیں ہوتے اس کو پورا کھول دیتے ہیں اور اس شور سے بڑوں سے زیادہ چھوٹے لطف لیتے ہیں۔

بڑے شہروں کے گھروں کی غلاظت بہہ کر دریا یا سمندر میں جا ملتی ہے۔ اس سے سمندر کے ساحل کا پانی نہایت کثیف اور گندہ ہو جاتا ہے اور دریاؤں کا پانی تو پینے کے قابل نہیں رہتا۔ بڑے شہروں کے باشندے جو پانی نلوں سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ صاف کرکے فراہم کیا جاتا ہے۔ گو پانی میں غلاظت باقی نہیں رہتی لیکن پانی وہی رہتا ہے جو غلیظ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ دہلی کے بارے میں یہ رپورٹ تھی کہ پانی کے ہر گلاس میں کسی نہ کسی کا پیشاب شامل ہوتا ہے (Atmosphere)

فضا کی کثافت اس قدر تیزی سے دنیا میں بڑھ رہی ہے کہ مجلس اقوام متحدہ کو اس کی طرف خصوصیت سے توجہ کرنی پڑی۔ اب کوشش ہو رہی ہے کہ رائے عامہ فضا کی اصلاح کے لیے تیار کی جائے۔ فضا میں جو مہلک اثرات پیدا ہو رہے ہیں ان کے بارے میں معلومات لوگوں کو فراہم کی جائے اور فضا کی اصلاح کی اپیل ان سے کی جائے۔ اس مسئلہ میں حال ہی میں مسلم یونیورسٹی میں بھی ایک سیمینار ہوا اس کی رپورٹ بھی تہذیب الاخلاق میں انشاء اللہ شائع کی جائے گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اپنے ملک، شہر، اور گھر کی فضا کی کثافت ہم خود کیسے کم کریں اور کرہ فضا کی کثافت کم کرنے کے لیے جو عالمی تحریک جاری ہے میں حصہ لیں۔

فضا کو کثیف کرنے کے ان دو اسباب پر غور کیجیے جو ہمارے آپ کے بس کے ہیں۔ ایک شور ہے اور دوسرا جسم، گھر اور محلہ کی صفائی ہے۔ ہم آہستہ بولنے کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ اگر ہم خود آہستہ بولیں گے اور خاموشی پسند کریں گے تو ہمارے گھر میں بھی کم شور ہوگا۔ ہمیں ریڈیو کی دھیمی آواز سننا چاہیے۔ گھروں اور محلوں میں ریڈیو کا شور رہنا زہر درد ہے۔ اس شور سے طالب علموں اور بیماروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ہم اخلاقی طور پر بھی ذمہ دار ہیں کوئی ایسا شور گھر میں نہ ہو جس سے کسی کو پریشانی ہو۔ یہ شور نہ صرف بیماروں اور طالب علموں کو پریشان کرتا ہے بلکہ شور کرنے اور شور سے لطف لینے والے کے کانوں، دل، اور اعصاب کو بھی کمزور کرتا ہے۔ اس سے زیادہ سے زیادہ بچیے۔ جو شور ہم بند کر سکتے ہیں یا کم کر سکتے ہیں ہم کو اس کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ ریل گاڑی، ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سے جو شور پیدا ہوتا ہے اس کو تو حکومت اور میونسپل کمیٹیاں ہی روک سکتی ہیں۔ ہم آپ نہیں۔ حکومت کا یہ فرض ہے کہ اس کی طرف توجہ کرے۔

فضا کو مکدّر کرنے کا دوسرا سبب جسم، گھر اور محلہ کی صفائی سے تعلق رکھتا ہے۔ گھروں اور ہوٹلوں کے باورچی خانے بہت میلے اور گندے ہوتے ہیں۔ ان کی صفائی

ف ہوٹل والوں کو اور ہم سب ہی کو توجہ کرنی چاہیے۔ گھر میں
بندی سے دو وقت جھاڑو دینا چاہیے۔ کوڑا گلی میں نہ پھینکنا
اسیے بلکہ گھر میں ہی ایک طرف جمع کرکے محلہ صاف کرنے والے
کی ٹوکری میں ڈال دینا چاہیے۔ تھوکنے کی عادت بہت بری
ہوتی ہے اس کو ترک کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ گھر کے
صحن، محلہ، گلی، سڑک پر تھوکنا ترک کیجیے۔ دھواں ایک بڑی
مہلک چیز ہے۔ جہاں تک ممکن ہو دھواں نہ ہونے دیجیے۔
سردی کے موسم میں گھروں کارخانوں اور ریل کے انجن
کا دھواں شہروں میں پھیل جاتا ہے اور پھر سانس کے
ذریعہ جسم میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس
سے بچیے۔

مذہب انسان کے سکون کا ذریعہ ہے
لیکن بدقسمتی سے وہ بھی فضا کو مکدر کرنے کا ایک سبب ہوگیا
ہے۔ عبادت کے دوران اس قدر شور ہوتا ہے کہ کان
پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

فضا کی کثافت دور کرنے کے سوال
کی طرف متوجہ کرنے کے لیے چند موٹی موٹی باتیں لکھی
گئی ہیں۔ حکومت۔ اور عوام سبھی کو صورت حال کی
اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ البتہ جسم اور گھر کی
صفائی ایک ایسا کام ہے جس کی طرف ہم آپ کو توجہ کرنے
کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی روایات میں جسم
گھر، باورچی خانہ کی صفائی کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طہارت اور پاکیزگی کو
نصف ایمان قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارے ملک کی حالت
عجیب ہے۔ نہ عوام اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوتے
ہیں اور نہ ہی حکومت۔ بس ضرورت یہ ہے کہ ہر شخص اپنی
ذمہ داری پوری کرے۔ اپنے گھر کی اصلاح کرے

اپنے مکان کی ...
کہ حکومت بھی اس کی طرف خصوصیت سے متوجہ ہوگی اور
حالات جس قدر اصلاح کا موقع دیں گے، اصلاح
ہو جائے گی۔ (ف۔م۔ا)

بقیہ مضمون "مہق ابیض"۔
صفحہ 19 کا بقیہ۔

نوٹ:- دھبوں کے زائل ہو جانے کے چند
ہفتہ بعد تک دواؤں کا استعمال جزو علاج ہے
مرض کے لاحق ہو جانے کی صورت میں
عام مصفیات خون کا داخلی استعمال اور تنقیہ بلغم کی
تدابیر علاج کی مدت کو کم کرنے کی صورت میں بہت مو
ثابت ہوتی ہیں۔ علاج کے ساتھ ہی ساتھ اصول حفظ
صحت کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے۔

بقیہ مضمون "ٹی وی کیسے دیکھیں"
متعلقہ صفحہ نمبر 12 کا

نہیں دیکھنا چاہیے۔ اس سے زیادہ دیر تک ایک
بغیر آنکھوں کو آرام دیے ٹی وی دیکھنا آنکھوں کے
انتہائی نقصان دہ ہے۔
مسلسل آدھ گھنٹہ تک ٹی وی دیکھنے کے بعد
کم دو گھنٹے تک آپ آنکھوں کو آرام دیجیے۔ تاکہ تھ
دور ہو سکے۔ اور بینائی کمزور نہ ہو۔ اگرچہ کہ
کچھ مشکل نظر آتا ہے۔ لیکن اگر آپ کو اپنی بینائی
ہے تو پھر ایسا کرنا ضروری ہے۔ ورنہ آنکھ
کمزور ہو جانا لازمی ہے۔

محمد یونس قاضی
دہلی۔

مارکسزم پر ایک منصفانہ نظر

انصاف کا تقاضہ ہے کہ ہم اِس مضمون کا آغاز مارکس کے اس مقولے سے کریں جس کے بموجب سرمایہ دارانہ نظام میں غیر جانبداری اور انصاف (کم از کم جہاں تک مزدور طبقہ کے مفاد کا تعلق ہے) مفقود ہیں۔ پورا کا پورا نظام خواہ وہ عدلیہ ہو یا مذہبی، ڈنڈی مارنے اور محنت کشوں کے خلاف جھوٹی شہادت دینے کے لیے تلا رہتا ہے۔ مارکس کی یہ شکایت بیجا نہیں ہے۔ ہر دولت پرست اور اخلاق سے مبّرا نظام میں جہاں "اے ایمان والو، انصاف کی گواہی دینے کے لیے اللہ کے واسطے تیار رہو چاہا گرو کسی قوم کی دشمنی کی بنا پر انصاف کو نہ چھوڑو، بلکہ انصاف سے (ہر حال میں) کام لو" کی تعلیم پر عمل نہیں ہوتا ہے۔ کمزور کو انصاف مشکل ہی سے ملے گا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان محض مادی ماحول کا نتیجہ ہے (جیسا کہ مارکس کا نظریہ ہے) یہی بات کہ مارکس نے اپنے زمانہ کے برطانوی فیکٹری انسپکٹروں کی غیر جانبداری کا اعتراف کیا ہے، مارکسسٹ نظریہ کے خلاف جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ برطانوی عمال حقیقت کو چھپاتے، حکمران طبقہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے!

میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ مارکس مفکّر کم تھے اور وکیل زیادہ۔ ایک حساس اور خدا ترس (جی ہاں! خدا ترس[1]) فرد کی حیثیت سے انھیں اپنے زمانہ کے مظلوم اور بدحال طبقہ سے دلی ہمدردی تھی اور ان پر ظلم کرنے والوں سے نفرت۔ انھوں نے حالات کا مطالعہ کیا اور مزدور طبقہ کی طرف ایک ایسا استغاثہ تیار کیا جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا اور طرزِ فکر ہی کو بدل ڈالا۔ اپنا کیس (Case) مضبوط کرنے کے لیے انھوں نے اپنے دشمنوں ہی کے ہتھیار (کاروبار یعنی Economic Man کے تخیل) کا استعمال کیا اور بڑی کامیابی سے کیا مگر جو "ماڈل" (Model) انھوں نے تیار کیا وہ بظاہر جتنا مضبوط تھا اتنا ہی کمزور بھی تھا۔ ایک تو یہ کہ وہ تمام تر انیسویں صدی کے حالات پر مبنی تھا۔ مزدور طبقہ کی حالت اس وقت واقعی ناگفتہ بہ تھی۔ دوسرے یہ کہ اپنے عہد کے معاشرتی مسائل پر لکھنے والوں کی طرح انھیں بھی یہ شوق اور زعم تھا کہ وہ ایسے سوشل قوانین کا پتہ لگائیں جو طبعی قوانین کی طرح اٹل ہوں اور افراد کی مرضی اور خوشی ناخوشی کے محتاج نہ ہوں۔ یہ امر ان کے لیے اس لیے اور بھی ضروری ہے تاکہ مزدور طبقہ کے حقوق کو آئندہ کوئی جھٹلا نہ سکے اور سرمایہ دار طبقہ کی نا انصافی پر پردہ نہ ڈال سکے!

مارکس (اور ہم سب کی) بدقسمتی یہ تھی کہ ان کی اپنی زندگی میں کسی ملک میں بھی سوشلسٹ نظام

---

[1] اپنے غیر محتاط لمحات میں مارکس نے "The Truth" (حق) "The Conscience" (ضمیر) "Free Scientific enquiry" کا

اس طرح وہ اپنے نظریات کو تجربہ کی روشنی میں پرکھنے اور
نظرثانی کرنے سے قاصر رہے۔ اس لیے اکتا پور کا پورا ماڈل
سودہ ہو رایک معنی میں خیالی (utopian) ہے
جب ہم ان کے نظریات کو ان کی اپنی ہی بتائی ہوئی کسوٹی
(زندگی) سے جانچتے ہیں تو ان کی کئی اہم تعلیمات کے "وقتی"
کا احساس ہوتا ہے اور ان کا سائنٹفک سوشلزم" کچھ کچھ
سائنٹفک جوتش" معلوم ہونے لگتا ہے۔ آج کے جوتشی تک
لگے ہیں کہ ان کا علم رجحانات کا "پتہ دینا" ہے اور خطرہ کا نشان
مترادف ہے۔ ایسا خطرہ جس سے بچا جا سکتا ہے۔ مغربی ممالک
سرمایہ دار کو اب عقل آگئی ہے اگو یا پسماندہ ممالک میں اب
کی ذہنیت نہیں بدلی) ایک اور بد مذاقی تاریخ کی طرف سے
ہوئی کہ انقلاب روس جیسے ملک میں آیا۔ خود روسی کمیونسٹ
سوائے ٹراٹسکی کے)) اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے
اور ان کی توقعات بر ٹروا انقلاب سے آگے نہ تھیں۔ روسی
انقلاب نہ عوام کی مرضی اور نہ ہی مادی حالات کی بنا پر آیا بہت
سی زیادتیاں اور گناہ جو روس میں سرزد ہوئے وہ مارکسزم
کے کھاتے میں ڈال دیے گئے
اینگلز (engels) کو اپنے رفیق
فلسفہ تاریخ کے غلو کا پورا پورا احساس تھا جس کے بموجب
تمام تاریخ صرف طبقاتی جنگ ہے اور معاشی حالات کی پیدا
کردہ اور ٹھیک اسی طرح جیسے بچوں کی مشہور مٹھائی بڑھیا
کا کاتا قد اور رنگ سے بنتی ہے۔ تاریخ مادی حالات کا
نتیجہ ہے۔ ایک خط میں انھوں نے صاف اور کھلے طور پر کہا
ہے کہ معاشی حالات ہرگز ہرگز تاریخ کا واحد محرک اور
سبب نہیں ہیں۔ تاریخ بنانے میں بنانے والے شخص کا حصہ ہے
اور اس کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے فرد کے رول کی چھاپ رہتی
ہے اور جم غفیر (masses) کے کارناموں میں مدغم نہیں ہو جاتا

اینگلز نے یہ بھی کہا ہے کہ ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ مارکس ان
حالات میں لڑ رہے تھے اور یہ کہ ان کی جنگ ایسے لوگوں سے
تھی جو معاشی اسباب کو کوئی مقام دینے کے لیے تیار نہ تھے۔
انھوں نے اپنے زمانے کے ان نو آموز مارکسسٹوں کو ڈانٹا ہے
جو بغیر پورے طور پر سوچے سمجھے نظریات کو روزمرہ کی زندگی
پر چسپاں کرتے رہتے ہیں اور بنا ہلدی کے ٹکڑے کے اپنے
کو پنساری تصور کرنے لگتے ہیں۔
مارکسزم کا شہرہ اس قدر ہے کہ لوگوں کو اس
کا مطالعہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دوست دشمن
سب ہی کے لیے دروازہ کھلا ہے کہ جو چاہے مارکس اور
اینگلز سے منسوب کر دے۔ مثلاً روسی عمال نے "مزدور
طبقہ کی آمریت" کے تصور کو استبداد میں تبدیل کر ڈالا۔ حالانکہ
مارکس کے نزدیک "پرولتاری ڈکٹیٹر شپ" وہ نظام تھا جو
سولہ آنے جمہوری تھا۔ مارکس کے ذہن میں پیرس کمیون
(Paris Commune) کا نمونہ تھا جس میں ہر بالغ کو
ووٹ کا حق تھا۔ ایڈمنسٹریشن کا اساس بلدیہ تھا۔ پولس
مقامی تھی اور بلدیہ کے ماتحت۔ افسران بلدیہ کا انتخاب
(election) ہوتا تھا، تقرر نہیں اور ان کی
تنخواہ ایک عام مزدور کی تنخواہ کے برابر تھی وغیرہ وغیرہ
مارکس کو ریاست (National state) سے سخت
نفرت تھی۔ وہ تو "سوسائٹی (society) کے قا
تھے جس کا ہر فرد فیصلوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ فیکٹری میں
مزدور، بلدیہ میں تمام شہری وغیرہ وغیرہ۔ موجودہ کمیونسٹ
ممالک کے نظام کو انھوں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ مارکس کے
مخالفین نے ان کے متعلق یہ غلط فہمی پیدا کی کہ وہ ذاتی ملکیت
کے خلاف ہیں حالاں کہ وہ صرف ذرائع پیداوار میں ذاتی
ملکیت کے خلاف تھے۔ ان کا دعوی تو یہ تھا کہ ذاتی ملکیت

کا قلع قمع سرمایہ داری نے کیا، جب سرمایہ دار نے کسان سے اس کی زمین اور کاریگر سے اس کے اوزار لے کر محنت فروش اور فاقہ زدہ میں تبدیل کر دیا۔ جو حقیقت بھی ہے !! (علی گڑھ شہر کے وہ بسکٹ بنانے والے آج کہاں ہیں ؟)

II

اب ہم مارکسزم کے بنیادی نظریات پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے۔

لینن نے (Lenin) نے مارکسزم کے تین عنصر بتائے ہیں :

۱۔ مادیت : جیسا کہ اوپر کی سطور میں ذکر ہو چکا ہے، مارکس ایک نہایت کامیاب وکیل تھے اور اس لیے اپنے موکل کو جتانے کے لیے ڈنڈی مارنے سے احتراز نہیں کرتے تھے۔ چونکہ آگے چل کر انھیں انسان کو مادی حالات کا مطیع ثابت کرنا تھا، اس لیے انھوں نے انسان کو اشرف المخلوقات نہیں کہا۔ ان کے نزدیک انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ وہ اپنی روزی کے ذرائع کو دہراتا اور توسیع دیتا ہے ! انھوں نے جان بوجھ کر نہ پوچھا کہ حیوان کے مقابلہ میں یہ برتری کہاں سے حاصل ہوئی ؟ جو جواب ملتا وہ ان کے پورے گھروندے کو مسمار کر دیتا۔ وہ تو عدالت کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ انسانی فہم کی اپنی کوئی آزادانہ حیثیت نہیں ہے فریق مخالف کا منھ بند کرنے کے لیے انھوں نے یہ بندش بندی کی کہ مادہ (Matter) کو فکر (Thinking Matter) کی قوت عطا کر دی۔ اگر یہ الف لیلہ نہیں تو اور کیا ہے ؟

۲۔ معاشیات : مارکس کی معاشیات کی جان اس کا اپنا "(Surplus Value Theory)" کا نظریہ ہے جس کے بموجب مزدور کی اجرت اس دولت سے بہت کم ہے جو وہ اپنے زور بازو سے پیدا کرتا ہے۔ دونوں یعنی مزدور کی اجرت اور پیدا شدہ دولت میں جو فرق ہے وہ مالک کے قبضہ چلی جاتی ہے اور مالک اس دولت کو پھر سے بزنس میں لگا اور اس طرح دولت کی افزونی (اور غربت کی بہتات لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے جو اسی وقت ٹوٹتا ہے جب فاقہ زدہ محنت کش تمام ذرائع پیداوار کو اپنے قبضہ لے لیں اور سرمایہ داری کو ختم کر دیں۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اس نظریہ میں جان ہے اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں شاید ایسا معاشرہ ہو جو پکار پکار کر اس کی شہادت نہ دیتا ہو۔ دور کیوں جایے لکھنؤ کی چکن کی صنعت، علی گڑھ تالے کے کارخانے کی سیر کر لیجیے اور جب بارہ برس کے چلانے والے کو دیکھیں (جو جان بیچ کر اپنا، اپنی بیوہ یتیم بہن بھائیوں کا پیٹ بھرتا ہے) تو مارکس کے نظریہ کو یاد رکھیے۔ جہاں جہاں محنت کش طبقہ اپنے حق لیے نہیں لڑ رہا ہے، جہاں جہاں اس کی اپنی یونین ہے، مزدور کو صرف اتنا ہی ملتا ہے کہ وہ اور اس کم از کم فی الحال نہ مرے مگر مغربی ممالک پر یہ چسپاں ہوتا۔ وہاں عام طور سے نہ صرف ٹریڈ یونین ہیں کی حکومتیں بھی بنتی ہیں۔ مارکس کے زمانہ کی حالت ہے۔

آج ایک ایسا مسئلہ درپیش ہے جسے نے نہیں سوچا تھا۔ ان ممالک میں بھی جہاں ذرائع انفرادی ملکیت میں نہیں ہیں مزدور کو اس کی پیدا کردہ کا پورا حصہ نہیں مل رہا۔ قومی پیداوار کی تقسیم میں اس کا ہاتھ نہیں ہے۔ کچھ اوپر کے لوگ اس کے نام پر قابض ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ "کمیونزم" اور "کمیونسٹ ریاست" چیز نہیں اور مارکس کے یہاں "سوسائٹی" (ملت

"سلطنت" نہیں۔ مگر اس جواب سے تشفی نہیں ہوتی، بالآخر فیصلہ چند ہی لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا اور اگر وہ "ضمیر" سے مبرا ہیں اور خوفِ خدا سے آزاد تو ہم کس طرح توقع کریں کہ وہ انصاف کریں گے؟ دوسری جنگِ عظیم کے دوران فاتح سرخ فوج کو برلن میں داخل ہونے سے پہلے اعلان کرنا چاہیے تھا کہ "جو شخص ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے یا اپنے گھر کے دروازے بند کرلے یا مسجد حرام میں چلا جائے وہ مامون ہے"۔ (محمد صلعم)

اسٹالن نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ آج پورے یورپ میں اشتراکی نظام ہوتا، اگر سنتِ محمدی پہ عمل کیا ہوتا!"

۴۔ طبقاتی جنگ: چونکہ حکمراں سرمایہ دار طبقہ خود سے مزدور کے ساتھ انصاف نہیں کرے گا اس لیے لازم ہے کہ اس کے خلاف مستقل جہاد کیا جائے اور اس سے تمام طاقت لے لی جائے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اصلاح کے ذریعہ بھی وہی مقصد حاصل ہوسکتا ہے، سراسر خود فریبی ہے۔ یہ ہے طبقاتی جنگ کے جواز کا لب لباب۔

اگر ہم انیسویں اور بیسویں صدی کے آغاز تک کے حالات لیں تو اس نظریہ میں صداقت نظر آئے گی۔ مگر پہلی جنگِ عظیم کے بعد حالات بدلنا شروع ہوگئے اور سرمایہ دار طبقہ کو عقل آگئی۔ دوسرے یہ کہ یورپ میں مزدوروں کو سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا اور بغیر "طبقاتی جنگ" کے انھیں مفت علاج، تعلیم، سالانہ تعطیلات، پانچ دن کام کا ہفتہ وغیرہ وغیرہ (جو مارکس کے زمانہ میں ناممکن تھے) مل گئے۔ آج سرمایہ دار ملک کے مزدور کا معیارِ زندگی اشتراکی نظام والے مزدور کے مقابلہ میں کہیں زیادہ بلند ہے۔

البتہ ایشیا افریقہ اور لاطینی امریکہ کے حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے اور وہاں سرمایہ مزدور طبقہ کی لڑائی جاری ہے اور قرائن بتا رہے ہیں کہ اشتراکی ممالک میں بھی مزدور خوش نہیں ہیں اور کہیں کھلے طور پہ اور کہیں خفیہ طور پر حکومتِ وقت سے نبرد آزما ہیں۔

تجربہ نے یہ بھی بتایا کہ سوشلسٹ نظام میں بھی طبقات قائم رہتے ہیں گو ان کے نام بدل جاتے ہیں اور مالک کی جگہ "پارٹی" لے لیتی ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سوشلسٹ نظام میں بھی ہاتھ کے کام کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ ساتھ کے ساتھ مزدوروں کو حقوق کے لیے لڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ مارکس کا یہ خیال کہ سوشلزم میں مزدور سر اونچا کرکے چلے گا وہ غلط ثابت ہوا۔ آج تو سرمایہ پرست مغرب میں مزدور سر اونچا کرکے چلنے کا عادی ہے۔

اس مضمون کے دو مقاصد تھے۔ مارکسزم سے کچھ واقفیت پیدا کرانا اور جو بیکار کی چپقلش مذہب اور مارکسزم کے درمیان پیدا کردی یا کرا دی گئی ہے اس میں کمی۔ اہلِ مذہب کی مخالفت خوف اور لاعلمی پہ ہے اور انھوں نے میدان کمیونسٹ جہلاء کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ "دشمن" اسی وقت زیادہ خوفناک معلوم ہوتا ہے جب تک اسے قریب سے دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ مارکسزم بہرحال انسانی دماغ کا نتیجہ ہے اور حالات نے اس کی کمزوریاں اظہر من الشمس کردی ہیں۔ اس کی اچھی باتوں سے اتفاق کرنا چاہیے اور غلطیوں کی مخالفت۔ میدان کسی حالات میں بھی کمیونسٹ ملاؤں کو نہیں سونپنا چاہیے۔ کسی زمانے میں مسلمانوں نے یونان کے فلسفہ سے استفادہ حاصل کیا تھا وہی استفادہ مارکس سے کیوں نہ حاصل کیا جائے؟ رہا مذہب کا سوال تو سے

"پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!"

پروفیسر اسلم قادری
اے ایم یو

مسلم یونیورسٹی کمپیوٹر سینٹر

آج کل مسابقتی تحقیق اور مختلف علمی موضوعات پر ترقیاتی سرگرمیاں اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتیں جب تک کمپیوٹر کی سہولتیں فراہم نہ ہوں۔ مسلم یونیورسٹی میں کمپیوٹر سینٹر ۱۹۰۰ء میں قائم ہوا اور IBM 1130 سسٹم کا کمپیوٹر یونیورسٹی میں نصب کیا گیا اور تقریباً دس سال تک اس کے بھرپور استعمال اور اس پر شب و روز کام کے بعد اس کو جدید ترین طرز کے اس DEC VAX ۱۱/۷۸۰ کمپیوٹر سے بدل دیا گیا ہے IBM کمپیوٹر پہلی جنریشن سے تعلق رکھتا تھا اور موجودہ کمپیوٹر تیسری جنریشن سے تعلق رکھتا ہے جو بہت زیادہ تیز رفتار ہے۔ اس کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ کمپیوٹر سینٹر سے یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جات میں اس کے کنکشن دے جا سکتے ہیں۔ ایک اچھے کمپیوٹر کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بیک وقت کتنے انسٹرکشن (INSTRUCTION) ایک سکنڈ میں قبول کرتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں نصب موجودہ کمپیوٹر ایک اعشاریہ چھ ملین انسٹرکشن فی سکنڈ قبول کرتا ہے۔ یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں روز افزوں سرگرمیوں کے سبب اب بھی یہ تقریباً نصف شب تک استعمال میں رہتا ہے۔

کمپیوٹر سینٹر سے ملحق لائبریری میں کمپیوٹر سے متعلق مختلف چارٹ اور جدید ترین لٹریچر موجود ہے اور لائق و تجربہ کار اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلباء کی معاونت کے لیے ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ شعبہ کے تحت ایک گریجویٹ ڈپلومہ کورس ان کمپیوٹر سائنس اور کمپیوٹر پروگرامنگ کا ایک جز وقتی کورس چل رہا ہے۔

حال ہی میں یونیورسٹی نے کمپیوٹر سائنس کے مکمل شعبہ کے قیام کے لیے کچھ اقدامات کیے ہیں اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اس کی ضروریات کا جائزہ لینے کے لیے جو وزیٹنگ کمیٹی بھیجی تھی، اس نے سفارش کی ہے کہ آئندہ تعلیمی سال کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر ڈگری کورس بی ایس سی پاس شدہ طلبہ کے لیے ڈپلوما کورس شروع کیا جا سکتا ہے جن کی ضروری سہولتیں یہاں موجود ہیں۔ یہ دونوں کورسیز نئے تعلیمی سال سے شروع کیے جائیں گے۔

سینٹر کی ضروریات کے مدنظر یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے موجودہ کمپیوٹر کے لیے ایک نئی بلڈنگ کی تعمیر کے واسطے ساڑھے اٹھائیس لاکھ روپیہ گرانٹ دی ہے اور جس کی تعمیر جلد ہی شروع ہونے والی ہے۔

[انگریزی سے ترجمہ]

حافظ محمد ارشد فیاضی

رزقِ حلال اور رشوت

مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تقریباً ۱۴۰۰ سال قبل ارشاد فرمایا تھا لوگوں پر ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ آدمی پرواہ ہی نہیں کرے گا کہ وہ کیا لے رہا ہے (حلال ذریعہ سے لے رہا ہے یا حرام ذریعے سے) (صحیح بخاری)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے یہ مقدس الفاظ ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ حلال وحرام کی تمیز کا احساس ہمارے ذہنوں سے اٹھ گیا ہے کہاں تو یہ عالم تھا کہ ہمارے اسلاف گھروں سے روزی کمانے کے لیے نکلتے تو قدم قدم پر انھیں حلال وحرام کی فکر رہتی تھی وہ حرام سے اس طرح بچتے تھے جیسے وہ کوئی بھڑکتی ہوئی آگ ہو کر ان کا ہاتھ اس کے قریب گیا نہیں اور آگ نے اسے جلایا نہیں۔ انھیں اپنی حلال کمائی کے بارے میں اگر یہ شبہ ہو جاتا تھا کہ اس میں حرام کی کمائی کا ایک ذرہ بھی شامل ہو گیا تو وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے کہ اس حرام کو حلال سے نکال پھینکیں بلکہ وہ اس پوری حلال کمائی سے دستبردار ہو جاتے تھے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے والد بزرگوار حضرت اسماعیلؒ کے بارے میں ایک محدث بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسماعیلؒ کے انتقال کے وقت میں ان کے پاس موجود تھا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں ترکہ میں مال کی بہت بڑی مقدار چھوڑ کر جا رہا ہوں مگر الحمد للہ کہ اس میں ایک درہم بھی مشتبہ نہیں ہے۔ یہ بات لفظوں میں تو چھوٹی سی ہے مگر میدانِ عمل میں نہایت کٹھن اور صبر آزما ہے اور کہاں اب یہ عالم کہ ہم روزی کمانے کے لیے اپنے گھروں سے نکلتے ہیں تو باقاعدہ منصوبہ بندی کرتے ہوئے نکلتے ہیں کہ کون کون سے ذرائع ایسے ہیں جن کو اپنے مقاصد کے مطابق استعمال کر کے ہم دولت کما سکتے ہیں۔

ہمارے اور اسلاف کے طرز عمل کے درمیان زمین وآسمان کا یہ فرق صاف دلیل ہے اس بات کی کہ ہم اپنے اسلاف کے برعکس حرام کی شناخت اور سنگینی سے پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔ ہم حرام کے صرف ظاہر کو دیکھتے ہیں۔ اس کے باطن سے ہم واقف نہیں یا واقف ہو کر ناواقف بنے ہوئے ہیں۔ رشوت کے معاملے میں بھی بالکل یہی صورت حال ہے۔ ہماری نظر رشوت کے صرف ظاہر پر ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ رشوت لینے سے آدمی دیکھتے ہی دیکھتے دولت مند اور امیر و کبیر بن جاتا ہے۔ کاروں اور کوٹھیوں کا مالک بن جاتا ہے عیش اور عیش دونوں اس کے گھر کی زر خرید لونڈیاں ہو جاتی ہیں۔ بس رشوت کے اسی ظاہر پر ہم فریفتہ ہیں۔ نتیجۃً اس کے پیچھے آنکھیں بند کیے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ حالاں کہ رشوت کے باطن پر اگر غور کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ رشوت اور شیطان یہ دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ دونوں کے خصائل باہم بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ اسی بات کو پرکھنے کے

لیے کہ کیا واقعی راشی اور شیطان باہم مشابہ ہیں، رشوت لینے والے کے کردار پر ذرا نظر ڈالیے

نمبرا۔ اگر ایمان داری سے اپنا نفسیاتی تجزیہ کریں تو تین باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں وہ محسوس کریں گے کہ رشوت ان کے کردار کا لازمی جزو بن کر رہ گئی ہے۔

ان میں پہلی بات [illegible] ہے کہ

جب کبھی [illegible] سے خوف زدہ ہو کر یا کسی کی نصیحت آمیز باتوں سے متاثر ہو کر وہ رشوت لینا ترک کر دینے کا ارادہ کرتے ہیں تو ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم نے رشوت سے منہ موڑ لیا تو ہمارے فلاں فلاں کام رک جائیں گے ہماری فلاں فلاں ضروریات ادھوری رہ جائیں گی اور فقر و مفلسی کا شکار ہو جائیں گے۔

دوسری بات یہ کہ

جس کو وہ اپنے کردار میں نمایاں طور پر محسوس کریں گے کہ جوں جوں رشوت کی آمدنی میں اضافہ ہوتا جائے گا، ان کے دل میں نیک کاموں سے دوری اور برے کاموں کی طرف رغبت اور میلان بڑھتا چلا جائے گا۔ وہ ہر نوع کی برائی اور بے حیائی کے کاموں میں دلچسپی لینے لگیں گے

تیسری بات جو رشوت لینے والوں کو اپنے کردار کا ایک حصہ نظر آئے گی وہ یہ کہ

رشوت کی آمدنی میں اضافے کے ساتھ ساتھ وہ فضول خرچ ہوتے چلے جائیں گے۔ بے موقع اور بے محل بڑی بیدردی سے دولت خرچ کریں گے۔ خریداری کرتے وقت بھاؤ تاؤ کرنے میں اپنی توہین محسوس کریں گے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی دکانوں میں جائیں گے جو ان کی کھال اتار کر ان کو دولت مند سمجھنے کا عملی ثبوت مہیا کریں۔ تاکہ ان کو ذہنی تسکین مکمل حاصل ہو۔

یہ تین صفات ایسی ہیں جو ہر رشوت لینے والے کو اپنے کردار کا لازمی جزو ہی نظر آئیں گی اور شاید آپ نے غور نہیں کیا ہو کہ یہی تینوں صفات اس ہستی کے کردار کا بھی لازمی جزو ہے جس کو ہم شیطان کے نام سے جانتے ہیں۔ قرآن حکیم نے ان ہی تینوں صفات کو شیطان کی طرف بڑی صراحت کے ساتھ بطور خاص منسوب کیا ہے۔

راشی کے کردار کی پہلی صفت تھی کہ وہ فقر اور مفلسی سے اپنے آپ کو ڈراتا رہتا ہے۔ شیطان کے بارے میں بھی قرآن [illegible] ہے۔

"شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا رہتا ہے"۔ (البقرہ ۲۶۸)

راشی اپنے آپ برے کاموں پر اکساتا رہتا ہے۔ شیطان بھی یہی کام کرتا ہے

رزق حلال کی جو اہمیت اسلام میں ہے۔ اس پر آپ نے یہ مختصر مضمون دیکھا۔ حلال و حرام کی اسلامی تعلیمات کا مقصد صرف روحانی تسکین نہیں ہے۔ اس کا تعلق انسانی زندگی سے گہرا ہے اور معاشرہ کی فلاح و بہبود اس پر منحصر ہے۔ اسی بنا پر اسلام میں اس کی اہمیت بنیادی ہے۔ بس افسوس اس کا ہے کہ اس طرف اس دور

کے اسلام کے علم بردار وں نے توجہ کم کی ہے اور وہ لوگ بھی جو نا جائز ذرائع سے روزی پیدا کرتے اور دولت جمع کرتے ہیں، مسلم معاشرہ میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور دین دار اور بے دین سب ہی ان کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے اکلِ حلال کی اہمیت مسلم خاص و عام کی نظروں میں نہیں رہی۔ دینیات کی کتابوں میں بھی رزقِ حلال کی وضاحت نہیں ہوتی اور کوئی قلم نہیں جو حلال روزی کی حمایت میں اٹھتا ہو۔

انسانی معاملات میں فلاح و بہبود اور عام خوشحالی کے لیے ضروری ہے کہ فرد کی آزادی پر پابندی لگائی جائے اور کسی کو اس کی اجازت نہ ہو کہ جیسے چاہے روزی پیدا کرے۔ اسلام نے حلال و حرام کے فرق کو واضح کیا ہے اور دوسروں کے حقوق کا تعین کیا ہے ان ہی پابندیوں میں آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

اس دور میں کسی قسم کی پابندی پسند نہیں کی جاتی نہ معاشی نہ سماجی زندگی میں یہی آزادی ہے جس نے انسان کے معاشرے کی فضا مکدر کی ہوتی ہے اور پوری دنیا میں اور ہر ملک میں، ہر گروہ میں ایک تلخ کشمکش جاری ہے۔ یہ آپ کی خوشی پر موقوف ہے کہ آپ اس آزادی کو اختیار کریں جس نے دنیا میں ایک ابتری پیدا کی ہوئی ہے یا اپنی آزادی پر ان پابندیوں کو قبول کریں جو انسان کی فلاح و بہبود کی طرف آپ کی رہنمائی کرتی ہیں

ق ے م ل

بقیہ مضمون اردو اور قومی یکجہتی

شخصیات سے اپنی عقیدت کا اظہار نہ کیا ہو۔

اردو کے ہندو شعرا نے بھی مسلم بزرگوں اور صوفیوں میں اس طرح دلچسپی لی۔ مسلم تیوہاروں پر انھوں نے بھی اسی طرح اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ مرثیہ گو شعرائے قدیم میں دلگیر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ الفت، رونق، شیدا، بانی وغیرہ سے لے کر جدید دور کے متعدد ہندو شعرا نے مرثیے لکھ کر شہدائے کربلا کو خراج عقیدت پیش کیا۔ نعت گو ہندو شعرا کی بھی طویل فہرست تیار کی جا سکتی ہے۔ عرش ملسیانی اور چھمی نرائن سخا نے تو پورے نعتیہ دیوان مرتب کیے۔ سخا کی ایک نعت کا مقطع ملاحظہ کیجیے ؎

نبی کے منشور کا جب جوش ہوا اس وقت اسے دیکھو
سخن پر جھومتوں میں اس وقت کہتا ہے سخا کیا کیا

اسی طرح بہت سے ہندو شعرا نے دیگر مسلم بزرگوں کی شان میں بھی نظمیں لکھیں۔ منور لکھنوی، گوپی ناتھ امن، جگن ناتھ آزاد اور گلزار زتشی وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔

ان تمام ہندو مسلم شعرا نے اپنے مذہبی عقائد کو برقرار رکھتے ہوئے دوسروں کے مذہب و عقائد کے بارے میں رواداری، وسیع القلبی اور احترام باہمی کی جو روایت قائم کی وہ آج بھی قومی یکجہتی کے لیے ٹھوس بنیاد فراہم کر رہی ہے۔ اقبال کی نظمیں "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اور "نیا شوالہ" وطن کی وہ تصویر پیش کرتی ہیں جو آج بھی ہمارا آئیڈیل ہے۔

ٹی۔ وی کیسے دیکھیں

ٹی۔ وی کہاں نہیں ہے؟ گھروں، ہوٹلوں، موٹروں بلکہ جھگیوں میں بھی اسے دیکھا جاتا ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی وجہ سے ہماری سماجی زندگی میں ایک بڑی ناخوشگوار تبدیلی آئی ہے۔ لوگ اپنے پسندیدہ پروگرام کے وقت کہیں جانے اور کسی کے آنے کو پسند نہیں کرتے۔ اکثر تقاریب محض کسی معروف و مقبول پروگرام کی وجہ سے وقت پر شروع نہیں ہوتیں۔ اگرچہ پاکستان میں (؟) کے مضر اثرات کا جائزہ بھی احتیاط سے لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ اس کی وجہ سے طلبہ کی تعلیم پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ طلبہ کی اکثریت ہوم ورک سے جی چراتی ہے اس کی تمام تر توجہ ٹی۔ وی کے پروگراموں پر ہوتی ہے۔ پہلی اور دوسری جماعت کے بچے ٹی۔ وی پروگراموں کے حافظ ہوتے ہیں۔ یہ تو ہوئے ٹی۔ وی کے چند سماجی اور تعلیمی نقصانات۔ طبی اعتبار سے بھی اس کو متواتر دیکھنا نقصان دہ ہے۔ امریکہ میں ٹی۔ وی سیٹ بڑی کثرت سے ہیں۔ وہاں کے ماہرین اب اس کی مضرتوں کے قائل ہیں۔ اب تو روس والے بھی یہی کہنے لگے ہیں کہ ٹی۔ وی سے صحت کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ کیف میں واقع روسی انسٹی ٹیوٹ آف جنرل اینڈ کمیونل ہائجین نے ایک محتاط اور باضابطہ جائزے کے بعد اسے مضر صحت قرار دیا ہے۔ انسان پر ماحولی اثرات کی تحقیق کا یہ ممتاز روسی ادارہ ہے۔ اس ادارے کی محقق یالینا سوتنیکا یا نے سروے اور جائزے کا یہ کام اپنی نگرانی میں سرانجام دیا ہے۔ انھوں نے پہلے مرحلے میں اس شہر کے بارہ سو خاندانوں کی تفصیلات اکٹھا کیں پھر ان میں سے چالیس خاندانوں کا انتخاب کیا۔ ان خاندانوں میں مختلف عمر کے افراد شامل تھے۔ یہ لوگ اوسط معیار کے مکانوں میں رہتے تھے۔ ان کے مکانوں کے درجہ حرارت، نمی اور ان کی ہوا میں موجود آکسیجن وغیرہ کی احتیاط سے پیمائش کی گئی۔

ان لوگوں کی اعصابی صحت و توانائی اور عمومی صحت کی بڑی سختی سے جانچ پڑتال کی گئی۔ اس تحقیق میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا کہ ہر عمر کے تمام افراد بالکل صحت مند ہوں۔ جمع شدہ معلومات کمپیوٹر کے ذریعے سے مرتب کی گئیں، اور پھر ان سے نتائج اخذ کیے گئے ان کے مطابق ٹی۔ وی سے پیدا ہونے والا برقی میدان انتہائی بلند ترین سطح سے کم تھا۔ جہاں تک برقی سکونی میدان کا تعلق ہے، سیاہ و سفید بالخصوص رنگین ٹی۔ وی کی سطح ۵۰ سینٹی میٹر کے فاصلے پر معمول سے زیادہ پائی گئی۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ٹی۔ وی کو ڈھائی سے تین میٹر کے فاصلے سے دیکھا جائے۔ یہ ردوبدل فوراً کر لینا چاہیے۔ اس کے علاوہ کمرے میں بجلی کی روشنی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ تحقیق کے مطابق ٹی۔ وی کو نصف گھنٹے سے زیادہ [illegible] دیکھیے۔

عتیق احمد صدیقی
شعبہ اردو
اے ایم یو

اردو اور قومی یکجہتی

ہندوستان قدیم الایام سے مختلف نسلوں، مذہبوں، تہذیبوں اور زبانوں کا گہوارہ رہا ہے۔ تاریخ کی روشنی میں جو نسلیں ہمیں یہاں آباد نظر آتی ہیں، وہ باہر سے وارد ہوئیں اور یہاں آکر رس بس گئیں۔ وہ خواہ دراویدی دور سے پہلے کی آبادیاں ہوں، یا آریوں کی آبادیاں، یا اُن کے بعد آنے والی عربی، ایرانی، ترکی اور منگول نسلیں۔ جو یہاں آیا یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اس سرزمین کی خصوصیت کہیے کہ سب کو خوش آمدید کہا اور پھر سب کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ تفاوت میں دوئی کی گنجائش کم ہی رہ گئی۔ تہذیبوں کے مختلف دھارے یہاں آکر ملے اور ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہو گئے کہ کسی کا بھی اپنا اصلی رنگ باقی نہ رہا، بلکہ ہر ایک میں دوسرے کے رنگ کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس اخذ و قبول میں غالب و مغلوب اور فاتح و مفتوح کا امتیاز بھی اُٹھ گیا۔

اس صورتِ حال کے نتیجہ میں نسلی، مذہبی اور لسانی اختلافات کے باوجود تہذیبی سطح پر بڑی ہم آہنگی پیدا ہو گئی۔ رہنا سہنا، کھانا پینا، پہننا اوڑھنا اور ایسے ہی دیگر معاشرتی مظاہر جزوی اختلافات کے ساتھ سب یکساں ہو گئے۔ یہاں تک کہ بہت سے وہ تہذیبی عناصر بھی جن کے ڈانڈے مذہب سے ملے ہوئے تھے، ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور یوں صدرنگی میں یک رنگی نظر آنے لگی۔ اردو زبان کی پیدائش صدیوں کی اس تہذیبی ہم آہنگی کی مرہونِ منت تھی۔ ہزاروں سال کی شکست و ریخت اور تراش خراش کے بعد جب آریائی زبان جدید دور یعنی اپنے عہدِ شباب میں داخل ہونے لگی تو ترکی، عربی اور فارسی نے اس کی شمالی وسطی شاخ کی تزئین و آرائش کے لیے اپنے بہترین عناصر اس میں شامل کر دیے۔ اس کو کھڑی بولی کہہ لیجیے یا ہندوستانی یا قدیم محاورے میں ہندوی، گجری، دکنی وغیرہ۔ لیکن جب یہ زبان اپنے پورے نکھار کے ساتھ نک سک سے درست ہو کر سامنے آئی تو اردو کہلائی۔ اردو کا خمیر ایسی امتزاجی ترکیب سے اُٹھا، جس میں متنوع لسانی عناصر گھل مل کر ایک ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان میں شامل مختلف عناصر کی نشان دہی کر کے اردو کو مختلف علاقوں سے منسوب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سندھ، سرحد، پنجاب، دہلی سب ہی کو اردو کے نقطۂ آغاز کا مرکز قرار دیا گیا اور سندھی، پشتو، پنجابی، ہریانی، برج، کیکئی وغیرہ سے اردو کا رشتہ قائم کیا گیا ہے۔ (یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہ رشتہ ماں جائی بہنوں کا ہے، ماں بیٹی کا نہیں)۔ ہم سب جانتے ہیں کہ لسانی عناصر اپنے اندر تہذیبی قوت کے کیمیائی اثرات رکھتے ہیں کہ جب وہ دوسری زبانوں میں ملتے ہیں تو نہ صرف ان کی ظاہری شکل بدل دیتے ہیں بلکہ اپنی تہذیبی اقدار کو بھی محسوس یا غیر محسوس طور پر ان میں منتقل کر دیتے ہیں، گویا یہ عمل لسانی ہی نہیں

نہیں تھا بلکہ تہذیبی اور سماجی اشتراک کی داغ بیل بھی پڑ رہی تھی۔ اِس طرح اردو زبان کی عمارت جذب و انجذاب، اشتراک باہمی مفاہمت، رواداری، آشتی اور محبت کی بنیادوں پر استوار ہونا شروع ہوئی۔ آج اردو کا لفظی سرمایہ بجائے خود اس کا واضح ثبوت ہے۔

اردو کی ادبی روایت بھی ان لوگوں کے ہاتھوں شروع ہوئی جن کی زندگی ایک لفظ محبت سے تعبیر کی جا سکتی ہے۔ جنھوں نے ملک، قوم، مذہب اور منصب و منزلت کے تمام امتیازات سے صرف نظر کر کے صرف انسان کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا، جن کے نزدیک انسانیت ہی اعلیٰ ترین قدر تھی۔ میر کی آواز میں اسی آواز کی بازگشت ہے۔ جب وہ کہتے ہیں ؎

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

اور سودا نے اس احساس کو اور زیادہ شدت کے ساتھ پیش کیا ؎

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

اِنسانی شرف کو اس طرح بلند کرنے کے ساتھ، یہ شعرا ان تمام دیواروں کو بھی منہدم کرنے پر زور دیتے تھے جو انسانوں کے درمیان تفریق و امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ انھوں نے دیر و حرم، مندر و مسجد اور تسبیح و زنار کے درمیان اختلافات کو اجاگر کرنے کے بجائے ان کے اشتراکات پر زور دیا۔ خواجہ میر درد کا ارشاد تھا ؎

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا

سودا نے کہا ؎

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی ٭ نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

اور غالب کی آواز آئی ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یہ آوازیں اردو کے لیے نئی نہیں تھیں۔ امیر خسرو، کبیر، گرو نانک، بابا فرید، خواجہ بندہ نواز وغیرہ بے شمار بزرگوں نے محبت، رواداری اور اتحاد و مساوات کا جو درس دیا تھا، اس نے جس فضا کو جنم دیا تھا، اس کا لازمی نتیجہ تھا۔ اردو شاعری نے ابتدا سے ہی اس کی بھرپور ترجمانی کی۔ آج بیسویں صدی میں قومی اتحاد و یکجہتی کے جو تقاضے ہمارے سامنے ہیں اور اس کے جن عناصر کی ترویج و اشاعت اور قیام و استحکام کے لیے شعوری کوششیں کی جا رہی ہیں، اردو ادب بالخصوص اردو شاعری کی پوری تاریخ ان سے مالا مال نظر آتی ہے۔ ان عناصر کے مطالعہ کے لیے ہم اردو شاعری پر کئی سمتوں سے نظر ڈال سکتے ہیں۔

اردو شاعری کا ابتدائی دور بیانیہ شاعری کا دور تھا۔ اس دور میں سب سے زیادہ جس صنف کی طرف توجہ دی گئی وہ مثنوی تھی۔ یہ مثنویاں اظہارِ فن کا ذریعہ بھی تھیں لیکن فن سے کہیں زیادہ مقصدیت ان مصنفین کے پیشِ نظر تھی۔ وہ مختلف حکایتوں، قصوں، کہانیوں اور تمثیلوں کے ذریعہ کوئی نہ کوئی سبق دینا چاہتے تھے۔ قدیم ترین مثنویاں دکن میں تصنیف ہوئیں۔ ان کے لیے مواد جہاں اسلامی تاریخ اور نیم تاریخی قصوں سے اخذ کیا گیا، وہیں ہندوستانی قصوں کو بھی استعمال کیا گیا۔ ان میں وہ لوک کتھائیں بھی تھیں جن کی بنیاد سماجی واقعات پر تھی اور ہندو اساطیر سے ماخوذ قصے تھے۔ پرانوں سے ماخوذ قصے بھی ان مثنویوں کی بنیاد بنے۔ اس طرح عربی، ایرانی، ہند آریائی اور ہندوستانی روایات اور حکایتیں بلا امتیاز اپنا لی گئیں۔ ایسی کم و بیش سو مثنویاں

ـشان دہی کی گئی ہے جو خالص ہندوستانی قصوں پر مبنی ہیں
ـبات کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ غیر ہندوستانی
ـوں سے ماخوذ مثنویوں کی فضا بھی اس مشترک تہذیب کی
ـندہ داری کرتی ہے جو یہاں صدیوں سے پروان چڑھتی رہی
ـ۔ سحرالبیان اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس کے قصہ کی وطنیت
ـتعین مشکل ہے۔ لیکن اس کے کرداروں کی سیرت، اس کے
ـسم ورواج، اس کی سماجی تقریبات، غرض کہ اس کی ساری
ـفا میں مختلف عناصر اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کی واضح
ـشناخت مشکل ہے۔

مرثیہ کا تعلق اگرچہ مذہبی روایات سے تھا
ـرواقعات وافراد سب عربی تھے، لیکن ان میں بھی وہ معاشرتی
ـما در آئی جس میں ہندوستانی بوباس ہے۔ محسن کاکوروی نے
ـنے نعتیہ قصیدہ "سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل" کی
ـشبیب میں کرشن کنھیا کی سرزمین کے خوشگوار ماحول کی تصویر
ـشی کر کے اتحاد واشتراک کی ایک نئی راہ نکالی۔ غرض کہ بیانیہ
ـشاعری میں جہاں جہاں معاشرتی امور کا ذکر آیا ہے، ان میں
اس مشترک تہذیب کی کارفرمائی نظر آتی ہے جو ہندوستان
میں پروان چڑھی۔

اسی اتحاد و اشتراک کا نتیجہ تھا کہ ہندو
اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے تیوہاروں، خوشیوں اور
تقریبوں میں بھی دلچسپی لینا شروع کی۔ گولکنڈہ کے بادشاہ
اور اردو کے مایہ ناز شاعر قلی قطب شاہ کے کلیات میں یہ
روایت کافی مستحکم انداز میں نظر آتی ہے۔ اس کی مقرر کردہ
سرکاری تقریبات میں دیوالی اور بسنت کو خاص اہمیت حاصل
تھی۔ ان تیوہاروں پر اس نے جو نظمیں لکھی ہیں ان سے اس
کے پرخلوص ذوق وشوق کا اظہار ہوتا ہے۔ شمال میں فائز
دہلوی نے اس رنگ کو ملا دکھالی۔ اس نے بڑے والہانہ انداز

میں ہندو تقریبات پر نظمیں لکھیں۔ اس سلسلے میں نظیر اکبرآبادی
کا نام سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس نے اگر ایک
طرف ہولی، دیوالی، بسنت، راکھی پر نظمیں لکھیں تو دوسری
طرف کرشن کنھیا، بلدیوجی اور گرونانک پر نظمیں لکھ کر اپنی
عقیدت کا اظہار کیا ؎

ہیں کہتے نانک شاہ جنھیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو

ہولی کا تیوہار آتا ہے تو شاعر کا دل خوشی سے جھوم
اٹھتا ہے ؎

پھر آن کے عشرت کا مچا ڈھنگ زمیں پر
اور عیش نے عرصہ ہے کیا تنگ زمیں پر
ہر دل کو خوشی کا ہوا آہنگ زمیں پر
ہوتا ہے کہیں راگ کہیں رنگ زمیں پر
بجتے ہیں کہیں تال کہیں ڈھنگ زمیں پر
ہولی نے مچایا ہے عجب رنگ زمیں پر

یہ تقریبات اور شخصیات اردو شعراء کے تخیل کو برابر
مہمیز کرتی رہیں اور خراج مسرت اور خراجِ عقیدت وصول
کرتی رہیں۔ دیوالی کے چراغ روشن ہوتے ہیں تو شاعر
کا تصور بھی جگمگا اٹھتا ہے ؎

کیا رنگ ونور ایوان ہستی عشرت فروز ذہن ونظر ہے
ہر در پہ شمعیں ہر سر میں مستی گھر گھر چراغاں گھر گھر اجالا
(سیماب)

شری رام، سوامی رام تیرتھ، گرونانک جیسی مقدس ہستیوں
کو اقبال نے خراجِ عقیدت پیش کیا ؎

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

شاید ہی کوئی قابلِ ذکر شاعر ہو جس نے ان موضوعات و

خمسہ شہریار
گرلز کالج اے ایم یو

دوسری دنیا کا باسی

اوپر کھلا ہوا، نیلگوں، تا حدِّ نظر بکھرا ہوا آسمان تھا اور نیچے دور تلک پھیلی ہوئی زمین!

اچانک کسی سمت سے ایک ہیولی بڑے پُراسرار انداز میں نیچے اُترا۔ اُس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اُس جا جمع ہیں۔ اُن میں سے چند ایک کو جب اُس نے زمین پر گرتے ہوئے دیکھا تو وہ بے چین ہو کر آگے بڑھا اور ایک ایک کر کے ان کو سنبھال لیا ــــ!

وہ غیر مرئی ہستی جو کہ یقیناً برگزیدہ تھی، جب آگے بڑھی تو اسے ایک قطار میں چند لوگ کھڑے نظر آئے جن کے چہرے نہ تو اداس تھے، نہ پشیمان، نہ ہی گھبرائے ہوئے

اس بزرگ ہستی نے یہ بھی دیکھا کہ کچھ دوری پر بہت سے لوگ اُن کو خونخوار نگاہوں سے گھور رہے ہیں اور ان کے ہاتھوں میں نوکیلے پتھر ہیں اور پھر کچھ ہی لمحوں میں قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں پر پتھراؤ……..

اس پراسرار ہستی نے آگے بڑھ کر بڑی جرأت اور پھرتی سے پتھراؤ کرنے والوں کے ہاتھوں سے سارے پتھر چھین لیے………. اور ان کو مہربان نگاہوں سے دیکھا کہ جن میں ایک خاموش سرزنش شامل تھی۔

وہ غیر دنیاوی، غیر مرئی، پراسرار برگزیدہ ہستی جب ذرا اور آگے بڑھی تو اسے ایک قدِ آدم پر شکوہ بت نظر آیا کہ جس کے آگے سربسجدہ ہونے کو یکے بعد دیگرے لوگ آتے ہی جاتے تھے………. یہ منظر دیکھ کر اسے بہ طیش آیا اور اُس نے پوری قوت سے بت پر ایک بڑا سا پتھر دے مارا کہ وہ زمین بوس ہو گیا۔

لوگ چیخ اُٹھے اور اس بزرگ ہستی پر پتھر مارنا شروع کر دیا………. اُس پر پتھر برستے رہے اور اُس کے قدم کو جنبش نہ ہوئی………….. اس کے لب مسکراتے رہے۔

اور پھر سب نے دیکھا کہ اس غیر دنیاوی شئے یعنی کہ اُس بزرگ ہیولے کے چاروں طرف بجائے پتھروں کے پھول ہی پھول بکھرے ہوئے ہیں ــــــــــ!

اور یہ بھی دیکھا گیا کہ وہ ہیولی بڑے ہی پراسرار انداز میں جہاں سے آیا تھا وہیں چل دیا کہ وہ کسی دوسری دنیا کا باسی تھا اور یہ دنیا اُس کے قابل نہیں تھی ــــ!

حکیم احسان اللہ
شعبہ یونانی طب جراحت
اجمل خاں طبیہ کالج اے ایم یو

بہق ابیض

جسم انسانی مختلف اعضاء ظاہرہ و باطنہ پر مشتمل ہے۔ جسم کا ہر عضو اپنے افعال و اشکال میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے لیکن نظام جسمانی کو حالت صحت پر قائم رکھنے کے لیے تمام اعضاء کا باہم تعاون ناگزیر ہوتا ہے۔ کسی عضو کے نقص فعل ہی کو بیماری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جسم کا سب سے بیرونی اور باعتبار وسعت سب سے بڑا عضو جلد کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا وزن پورے جسم کے وزن کا تقریباً ۶ فیصد اور رقبہ کم و بیش ۱۸ مربع فٹ ہوتا ہے۔ جسم کے مختلف حصوں کی جلد اپنی ساخت، رنگت، دبازت ملامت و صلابت اور فعل کے اعتبار سے جداگانہ ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں بالوں، شکنوں، غدود دہنیہ و عرقیہ کی موجودگی و عدم موجودگی کے لحاظ سے بھی مختلف مقامات جسم کی جلد جداگانہ ہوتی ہے۔

پوری جلد اپنی دبازت میں دو طبقات یا تہوں میں منقسم ہوتی ہے۔ اوپری تہہ جس کو بشرہ کہتے ہیں، پتلی اور عروق سے محروم ہوتی ہے۔ جبکہ اندرونی طبقہ جو ادمہ کہلاتا ہے، موٹا، عروق، عصب، عضلی ریشوں اور غدد دہنیہ و عرقیہ کا حامل ہوتا ہے۔ بشرہ کی سب سے نیچے والی صف کے خلیات میں افزائش ہوتی رہتی ہے اس طرح یہ اپنے اوپر واقع خلیات کی صف کو باہر کی جانب دباتے رہتے ہیں۔ اس مسلسل دباؤ کے نتیجے میں سب سے بیرونی سطح کے خلیات بتدریج مردہ ہو کر مختلف نقصان رساں ذرات و جراثیم کے بہاؤ کو روکتے رہتے ہیں۔ جلد کا یہ مدافعاتی عمل تا عمر برابر جاری رہتا ہے۔

نظام جسم انسانی کو اعتدال و صحت پر قائم رکھنے میں مختلف جہت سے جلد بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اعضاء کی تلطیف، توازن حرارت، درد، سردی اور گرمی وغیرہ کا احساس، جسم کے مضرت رساں و غیر ضروری اجزاء کا اخراج، بالا بنفشی شعاعوں اور جلد کے اندر موجود Ergosterol کی مدد سے وٹامن D_2 کی ترکیب وغیرہ جلد کے وہ افعال ہیں جن کی افادیت و اہمیت کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی شخص ان میں سے کسی فعل کے نقصان یا فقدان کے نتائج سے دوچار ہوتا ہے۔

جسم انسانی کے لیے جلد بہترین دافع عفونت کی حیثیت رکھتی ہے اور صحت و مرض انسانی کی آئینہ دار ہے۔ یہ ایک طرف اگر طرح طرح کے خارجی مثلاً مادی، کیمیاوی، جراثیمی اور طفیلیاتی صدمات و حملے سے دوچار ہوتی ہے تو دوسری طرف احشاء و دیگر اعضاء کی بیماریوں، نقص تغذیہ اور غدد عرقیہ و غدد غیر ناقلہ) کی خرابیوں سے متاثر ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں مختلف جسم کی جلدی تبدیلیاں ظاہر ہوتی ہیں جیسے رنگت و دبازت میں تغیر، طفحات و آبلوں کا ظہور وغیرہ۔

جلد کی رنگت میں تغیر پیدا کرنے والی بیماریوں میں سے ایک بیماری بہت عام ہے جو اگرچہ جغرافیائی حدبندیوں سے آزاد ہے مگر گرم مرطوب ممالک میں عام طور پر زیادہ پائی

جاتی ہے مختلف علاقائی زبانوں میں یہ بیماری چھیپ، سہوداں، سبلی وغیرہ کے نام سے مشہور ہے۔ طبی اصطلاح میں اسے "بہق ابیض" کہتے ہیں۔ اس بیماری کے نتیجے میں جسم کے بعض مخصوص حصوں پر سوکھے "داغ" ہلکے (زردی مائل) دھبے پیدا ہوجاتے ہیں۔

اس کے اسباب وعلل کے بارے میں حکماء کا نقطۂ نگاہ مختلف ہے۔ بغور مطالعہ کے بعد ان اختلافات کو دو بنیادی اور بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

الف۔ عوامل داخلی کو بیماری کا سبب قرار دینے والا گروہ

ب۔ عوامل خارجی کو بیماری کا سبب قرار دینے والے گروہ

الف ۱۔ شیخ الرئیس اور ان کے حامیوں کے نزدیک بلغم خام اور قوت مغیرہ کا ضعف اس کا بنیادی سبب ہے چونکہ مقام ماؤف کی قوت مغیرہ ضعیف ہوجاتی ہے اس لیے وہاں کے تغذیہ میں پہونچنے والا خون صالح اور گرم ہونے کے باوجود فساد مزاج سے متاثر ہوجاتا ہے اور اس اثرپذیری کا نتیجہ تغیر رنگت کی شکل میں نظر آتا ہے۔ صحت مند حصوں کی جلد اپنی اصلی رنگت پر قائم رہتی ہے۔

الف ۲۔ حامیان علی بن ربن الطبری اس نظریہ کے قائل ہیں کہ رطوبت محترقہ خون میں شامل ہوکر عروق شعریہ تک پہونچتی ہے اور ان کے دہانوں پر نکل کر جمع ہوجاتی ہے یہ گروہ حسب ذیل علامات وخصوصیات کو اپنے زاویۂ نگاہ کی تائید میں بطور دلیل پیش کرتا ہے۔

i دھبوں کا شروع میں گول ہونا۔

ii مرض کا اچانک پیدا ہونا۔

iii سوزشی علامات سے پاک ہونا۔

(iv) شدید دستوں کے بعد از خود زائل ہونا اور (v) اطلیۂ جالیہ کے استعمال سے دھبوں کا ختم ہوجانا وغیرہ

ب ۱۔ داؤد انطاکی نے اس مرض کو متعدی بتایا اور اس کا سبب اجسام غریبہ خبیثہ کو قرار دیا ہے۔ یہ نظریہ جدید سائنسی تحقیقات سے ہم آہنگ نظر آتا ہے اور مقام ماؤف سے اترنے والی بھوسی کے خورد بینی معائنہ کی روشنی میں انطاکی کا یہ نظریہ مزید مستحکم، مدلل اور قابل اعتبار ہوجاتا ہے۔

اس ترقی یافتہ سائنسی دور کی جدید طبی تحقیق نے اس مرض کا سبب ایک جرثومہ کو قرار دیا ہے جو اس آخر الذکر گروہ کے نظریہ کے لیے ٹھوس اور مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اس جرثومہ کو Malassezia furfur کہتے ہیں۔ اس کا نام Malassezia Tropica اور Microsporon furfur بھی ہے۔

گو کہ اس جرثومہ کو سب سے پہلے فرانس کے Louis Charles Malassez نامی ایک ماہر نے دریافت کیا اور اس کی خصوصیات کی تفصیل بیان کی۔ تاہم اس بیماری کے اسباب وعلل کے سلسلہ میں خارجی عوامل اور جرثومہ کے نظریہ کو پیش کرنے میں انطاکی کو اولیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے اسے ایک قسم کا سمارُوغ بتایا ہے جو مخصوص قسم کے Enzyme (خمیرہ) کا حامل ہوتا ہے اسی Enzyme کے عمل سے جلد کی بالائی سطح میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور مقام ماؤف کی رنگت صحت مند جلد سے متغیر نظر آتی ہے۔

اس کا تعدیہ مریض کے لباس، بستر

ین کے ساتھ معاشرت سے ہوتا ہے لیکن اس کا عدوی اتنا
ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ تک معاشرت یا اشیاء مستعملہ کا استعمال
نے کے بعد ہی دوسرے تک منتقل ہوتا ہے اور علاماتِ مرض
ہوتی ہیں۔ براہِ راست کبھی مرض کا ہونا ممکن ہے۔ کثرتِ تعرق
...رق اور اصولِ حفظانِ صحت سے بے اعتنائی مثلاً کئی روز
باس تبدیل نہ کرنا وغیرہ اس کے اسباب معدہ قرار
دیے جاتے ہیں۔

عام طور پر یہ مرض بالائی حصۂ صدر و پشت
شانوں پر ظاہر ہوتا ہے لیکن علاج سے لاپرواہی کرنے کی صورت
زیریں حصۂ صدر و پشت، گردن اور بازو پر بھی پھیل سکتا ہے
ں ہو جانے کی صورت میں چہرہ کو بھی متاثر کر سکتا ہے۔ ہاتھ اور
ذات اسفل بالعموم اس سے محفوظ رہتے ہیں۔

یہ مرض عموماً نوجوانوں کو لاحق ہوتا ہے عورتوں
کے مقابلہ میں مردوں میں زیادہ پایا جاتا ہے .... کا
زمانہ اس کے لیے سازگار موسم ہوتا ہے۔ یہ مرض موروثی نہیں
ہوتا۔ ابتدا میں گول دھبے کسی شعر کے گرد ظاہر ہوتے ہیں جو
بلد ہی باہم مل کر مختلف شکل کے دھبوں میں تبدیل ہو جاتے
ہیں۔ یہ دھبے ہلکے بھورے زردی مائل اور خشک ہوتے ہیں
دھبوں کے اوپر سے بھوسی اترتی رہتی ہے۔ بال اپنی اصلی رنگت
پر قائم رہتے ہیں۔ بسا اوقات ان دھبوں میں معمولی خارش کا
ہونا ممکن ہے۔ ان میں کسی قسم کی سختی، ورم نہیں ملتا اور درد
یا جلن وغیرہ بھی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ جلد کی بالائی سطح تک محدود
رہتے ہیں اور بالائی سطح عصب و عروق سے خالی ہوتی ہے۔
سوزش، سختی، رطوبت، ورم اور درد وغیرہ کی عدم موجودگی
علاج سے بے پرواہی اور بے توجہی کا سبب بنتی ہے۔ البتہ اس
مرض کا صرف ایک پہلو ایسا ہے جو پریشان کن اور تشویش ناک
ہے۔ وہ ہے ان دھبوں سے پیدا ہونے والی بدنمائی —

جس کے دفعیہ کے لیے مریض اطباء سے رجوع کرتا ہے۔

اگرچہ مذکورہ بالا علامات وخصوصیات کی روشنی
میں مرض تشخیص کی گرفت میں آجاتا ہے۔ پھر بھی تشخیص کی
گرفت کو مضبوط اور یقینی کرنے کے لیے دھبوں سے اترنے والی
بھوسی کا خوردبینی معائنہ ناگزیر ہوتا ہے۔ جس کی مدد سے
سماروغ اور ان کے تحمک کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اس مرض کے علاج سے متعلق معالجین واطباء
نے بہت سے نسخے ترتیب دیے ہیں اور نسخوں کے اجزاء
کی خصوصیت و منافع اور اپنے بیش قیمت تجربات کی روشنی
میں بعض نسخوں کی افادیت پر زور دیا ہے۔ چند سہل الحصول
اور سہل العمل مجرب نسخے درجِ ذیل ہیں۔

ادویہ جالیہ کا خارجی استعمال اکثر حالات میں اس
مرض کے لیے موثر علاج ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ گلنار اور باپچی ہموزن سفوف کرکے پانی میں ملا کر
مقام ماؤف پر لگانا دھبوں کو جلد صاف کر دیتا ہے۔

۲۔ بیخ کبر شیطرج ہندی عاقرقرحا تخم ترب پوست
ترنج ان میں سے چند یا سب مساوی وزن میں لے کر سفوف
کریں اور وقت ضرورت آب لیموں یا تیز سرکہ میں حل کرکے دھبوں
پر لگانا مفید ثابت ہوتا ہے۔

۳۔ اسی طرح فوہ یا قسط تلخ یا کلونجی یا سمندر
جھاگ یا تخم پیاز یا تخم مولی یا پوست سنترہ تیز سرکے کے
ہمراہ پیس کر مقام ماؤف پر لگانے سے خاطر خواہ فائدہ ہوتا
ہے اور بدنمائی جاتی رہتی ہے۔

۴۔ روغن بیضہ مرغ اور نوشادر آپس میں ملا کر
کچھ عرصہ تک لگانا مجرب و آزمودہ ہے۔

۵۔ نوشادر آب پیاز میں حل کرکے لگانا اس مرض
کے لیے سود مند ثابت ہوتا ہے۔

باقی صفحہ نمبر ۳۰ پر

سرسید کی زندگی کے واقعہ میں
کتنا بڑا سبق ہے

سرسیدؒ کا ایک واقعہ عجیب و غریب ہے۔ ایک انگریزی تعلیم یافتہ شخص ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے پریشان تھا۔ کیا سوجھی کہ ایک بہت بڑے انگریز افسر کے پاس پہنچا اور کہا کہ میں سرسید کا داماد ہوں مجھکو ملازمت کی ضرورت ہے۔ وہ انگریز بہت ہی خاطر سے پیش آیا اور کہا کہ آپ ٹھہریں۔ اس کو ٹھہرا کر اس نے (لاعلمی میں) ایک تار سرسید کو دیا کہ فلاں شخص اس نام کا ہمارے پاس ملازمت کے خیال سے آیا ہے اور اپنے آپ کو آپ کا داماد کہتا ہے کیا یہ واقعہ صحیح ہے؟

جواب میں سرسیدؒ نے اس انگریز کو لکھا کہ بالکل صحیح ہے ضرور آپ ملازمت کے لیے کوشش فرمادیں میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ اس شخص کو ملازمت مل گئی۔

ایک روز اتفاقاً اس انگریز نے اس شخص سے یہ واقعہ (سرسید سے تحقیق حال کا) بیان کردیا۔ یہ بہت ہی شرمندہ ہوا اور کچھ عرصے کے بعد یہ شخص علی گڑھ آیا اور سرسید سے مل کر معافی کی درخواست کی اور کہا کہ میں وہی ہوں جس نے اپنے آپ کو آپ کا داماد بتا کر ملازمت لی ہے۔ یہ گستاخی ہوئی گو یہ گستاخی بضرورت تھی

سرسیدؒ نے جواب میں کہا کہ گو یہ بات اس وقت غلط تھی مگر اب صحیح ہوجائے گی، داماد کہتے ہیں بیٹی کے شوہر کو۔ اس کی ایک ضرورت تو یہ تھی کہ میری بیٹی آپ کی بیوی ہوتی۔ سو یہ تو نہیں ہوسکتا، مگر دوسری صورت ممکن ہے کہ آپ کی بیوی کو میں اپنی بیٹی بنالوں۔ سو میں آپ کی بیوی کو اپنی بیٹی بناتا ہوں۔ وہ میری بیٹی اور میں اس کا باپ!

پھر یہ توجیہہ وقتی ہی نہ تھی بلکہ تازندگی باپ بیٹی اور داماد کا سا برتاؤ رکھا۔ بلانا، لینا دینا سب اسی طرح رکھا۔

[بزبان حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ۔ ماخوذ از الافاضات الیومیہ ج ۱]

تہذیب الاخلاق
پروفیسر محمد اقبال انصاری
صدر شعبۂ اسلامیات
اے ایم یو۔

امام غزالی

آپ کا نام محمد، کنیت ابو حامد، لقب زین الدین اور حجۃ الاسلام اور خاندانی لقب یا نسبت غزالی تھی اور اسی سے شہرت پائی۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اس میں "ز" مشدد ہے یا نہیں "غ" اور "ز" کو تو بہرحال زبر ہے۔ علامہ شبلی نعمانی اور بعض دوسرے تذکرہ و سیرت نگاروں نے بالتشدید ترجیح دی ہے اور اس کا سبب یہ بتلایا ہے کہ آپ کے والد اون و سوت کاتنے کا کاروبار کرتے تھے اور جرجان و خوارزم وغیرہ میں پیشہ کے ساتھ نسبت کا یہی قاعدہ ہے کہ آخر میں "ی" بڑھا دیتے ہیں جیسے عطاری وغیرہ۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے پہلے ایڈیشن میں "غزّالی" ڈبل "زیڈ" سے لکھا گیا ہے۔ بعض دیگر تذکرہ نگاروں کی رائے میں "غزالہ" ایک قبیلہ یا طوس کے ایک گاؤں کا نام ہے اس لیے "ز" کو مشدد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاج الاسلام سمعانی (المتوفی ۱۱۶۶) نے کتاب الانساب میں موخر الذکر وجہ کو ترجیح دی ہے اور امام غزالی کے ایک نواسے مجد الدین کی اس روایت سے اس کو تقویت ملتی ہے کہ "میرے نانا کا نام بتشدید نہیں ہے بالتخفیف ہے" اور بعض سوانح نگاروں نے یہی بات امام غزالی کے چھوٹے بھائی امام احمد غزالی کی طرف بھی منسوب کی ہے اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے جدید ایڈیشن میں بھی اسے صرف ایک "زیڈ" سے کر دیا گیا ہے۔ اور یہی آج کل بیشتر مستعمل ہے

آپ کے والد کا نام محمد بن محمد الغزالی تھا اور جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے وہ سوت اور اون کات کر اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔ البتہ نہایت پارسا درویش صفت تھے۔ کمائی سے جو کچھ بچتا اسے علماء و مشائخ کی نذر کر دیتے اور ان کی صحبتوں میں شریک ہوتے اور ان کی علمی گفتگو سے متاثر ہو کر دعا مانگتے کہ بارِ تعالیٰ مجھے بھی ایسا بیٹا عطا فرما جو ایسی ہی علمی گفتگو کیا کرے۔ اللہ پاک نے ان کی دعا قبول فرمائی اور دو بیٹے عطا فرمائے جو علم و فضل اور دین و دانش میں یکتۂ روزگار ہوئے

امام ابو محمد الغزالی ۴۵۰ ہجری (مطابق ۱۰۵۹ء) میں موجودہ مشہد سے کچھ فاصلے پر طوس کے مردم خیز شہر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد نے اپنی بساط بھر ان کی گھر پر تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا اور اس مقصد سے کچھ رقم رفتہ رفتہ پس انداز کرنا بھی شروع کی۔ مگر افسوس کہ ان کی عمر نے زیادہ وفا نہ کی۔ چنانچہ جب وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تو اپنے ایک دوست کو بلا کر کل پونجی ان کے سپرد کی اور وصیت کی کہ وہ اسے ان کے دونوں بچوں کی تعلیم میں صرف کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے دوست کی وصیت کے مطابق دونوں کی تعلیم کا انتظام کر دیا۔ مگر پونجی کل تھی ہی کتنی جب کچھ دنوں بعد ختم ہو گئی تو انھوں نے کہا کہ "تمہارے والد کا سرمایہ ختم ہو چکا ہے اور میرے پاس کچھ مال و متاع

نہیں ہے۔ اس لیے تم دونوں بھائی کسی مدرسہ میں داخل ہو جاؤ۔

اس زمانہ میں باقاعدہ مدارس بہت کم تھے البتہ بڑے بڑے نامور علماء و فضلاء اپنے گھروں یا مسجدوں میں تعلیم دیتے تھے اور شہر کے امراء و روساء طلبہ کی کفالت کرتے تھے تاکہ ہر طالب علم بقدر شوق تشنگی علم بجھا سکے۔ چنانچہ امام غزالی نے بھی فقہ کی ابتدائی کتابیں مشہور شافعی فقیہ احمد بن محمد راذکانی سے پڑھیں۔ اس کے بعد جرجان (استرباد) گئے اور ابو نصر اسماعیلی کے حلقہ درس میں شریک ہو کر تکمیل علم کی۔ اس زمانہ کا عام قاعدہ یہ تھا کہ مطالب علمیہ پر استاد جو تقریر کرتا تھا طلبہ اسے قلم بند کر لیتے تھے جو تعلیقات (Notes) کہلاتے تھے اور انھیں پر بعد میں خود اضافہ کرتے تھے۔ امام غزالی بھی تعلیقات جمع کر کے ایک قافلہ کے ساتھ وطن واپس آ رہے تھے کہ راستہ میں ڈاکہ پڑا اور راہزنوں نے مسافروں کا تمام مال و متاع لوٹ لیا جس میں امام غزالی کے تعلیقات بھی تھے۔ جب وہ امام غزالی کو یاد آئے تو انھیں بے حد رنج ہوا اور ہمت کر کے راہزنوں کے سردار کے پاس گئے اور کہا کہ آپ میرا کل سامان لے لیجیے پس تعلیقات واپس کر دیں کہ وہ آپ کے کسی کام کے نہیں ہیں اور میرا سرمایہ حاصل سفر یہی ہیں"۔ سردار اس پر ہنسا اور بولا کہ "پھر آخر تم نے کیا خاک سیکھا کہ چند کاغذ ہاتھ سے نکل گئے تو کورے رہ گئے" اور یہ کہہ کر تعلیقات واپس کر دیں۔ امام غزالی پر اس طعنہ آمیز جملہ کا اس قدر اثر ہوا کہ وطن واپس پہونچ کر تمام تعلیقات ازبر کر ڈالیں اور آئندہ علم سفینہ کی بجائے علم سینہ کو شیوہ بنا لیا۔

اگرچہ اس زمانہ میں علوم و فنون کا بے حد چرچا تھا اور ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک قصبہ میں مدرسے موجود تھے اور ہر ایک عالم و فاضل بجائے خود ایک درسگاہ ہوا کرتا تھا پھر بھی اس زمانہ میں بغداد و نیشاپور علم و فن کے اہم مراکز شمار کیے جاتے تھے۔ اس لیے کہ بغداد میں استاذ الکل ابو اسحاق شیرازی (۱۰۰۲-۱۰۸۳) موسس مدرسہ نظامیہ درس دیتے تھے اور نیشاپور میں ان کے ہم عصر و استاد الکل امام الحرمین عبد الملک الجوینی (۱۰۲۸-۱۰۸۵) درس دیتے تھے جن کے لیے نظام الملک حسن علی راذکانی (۱۰۱۸-۱۰۹۲) نے نیشاپور میں خاص طور پر مدرسہ نظامیہ قائم کیا تھا۔ اگرچہ کہ عام طور پر مدرسہ نظامیہ بغداد کو اسلام کا پہلا مدرسہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے قبل ہی نیشاپور میں متعدد مدرسے قائم ہو چکے تھے جن میں مدرسہ بیہقیہ اس لیے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ امام الحرمین نے اسی میں تعلیم پائی تھی جب کہ ابو القاسم اسکافی اس کے صدر مدرس تھے۔

الغرض امام غزالی نیشاپور پہنچ کر امام الحرمین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت محنت و مشقت سے تحصیل علم شروع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے ساتھیوں میں اس قدر ممتاز ہو گئے کہ امام الحرمین انھیں فخر کے ساتھ "بحر ذخار" کہا کرتے تھے اس زمانہ میں نامور علماء کے یہاں یہ دستور تھا کہ جب وہ خود درس دے چکتے تو اس کے شاگردوں میں جو سب سے لائق ہوتا تھا وہ باقی طالب علموں کے سامنے استاد کے درس کا اعادہ کرتا تھا اور اسی لیے معید کہلاتا تھا۔ امام غزالی نے اپنی خداداد قابلیت کی بنا پر یہ منصب بہت جلد حاصل کر لیا اور پھر جب تک امام الحرمین زندہ رہے ہمیشہ ان کے ساتھ رہے۔

۱۰۸۵ میں امام الحرمین کی وفات کے بعد امام غزالی نیشاپور سے اس شان سے نکلے کہ دور دور تک ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، حالانکہ عمر اس وقت صرف ۲۸ سال کی تھی۔ لیکن امام الحرمین کی حیات ہی میں صاحب تصنیف ہو چکے تھے اور دور دور تک ان کی علمی شہرت پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ جب

نظام الملک کے دربار میں پہنچے تو اس نے بہت ہی عزت واحترام کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ اور کچھ دنوں بعد نظامیہ بغداد کی صدر مدرسی پیش کی جو آپ نے قبول فرمائی اور تھوڑے ہی دنوں میں آپ کے علم وفضل کا یہ اثر ہوا کہ وزرا اور امرا بھی آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرتے تھے اور سلطنت کے تمام اہم امور آپ کے مشورے کے بغیر انجام نہ پا سکتے تھے۔

اس ظاہری اعزاز واکرام کے باوجود آپ کی تحقیق وتدقیق طلب طبیعت اس پر قانع نہ ہوئی اور بالآخر چند ماہ کے تامل وتردد کے بعد سب چھوڑ چھاڑ اور تقریباً ساڑھے چار سال کی مدرسہ نظامیہ کی صدر مدرسی کو خیرباد کہہ کر شام کی راہ لی، اور اس شان کے ساتھ کہ قیمتی وپرتکلف لباس کی بجائے ایک معمولی کمبل بدن پر تھا اور لذیذ وپرلطف غذاؤں کی بجائے ساگ پات پر گذر اوقات ہوتی اور دمشق پہنچ کر مجاہدہ وریاضت میں مشغول ہوگئے۔ اگرچہ علمی مشاغل ترک نہیں کیے تھے اور جامع اموی کے مغربی زاویہ میں درس بھی دیا کرتے تھے مگر بیشتر وقت جامع اموی کے مغربی مینار میں ذکر و شغل اور مجاہدہ ومراقبہ میں گزارتے تھے۔ تقریباً دو سال وہاں گزارنے کے بعد بیت المقدس تشریف لے گئے اور "قبۃ الصخرہ" میں مجاہدہ کرتے رہے۔ پھر وہاں سے مقام خلیل گئے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر ہے۔ کچھ دنوں وہاں مراقبہ ومجاہدہ کرتے رہے پھر حج کی نیت سے مکۂ مکرمہ اور مدینہ منورہ گئے اور مدت تک دونوں جگہوں پر مقیم رہے۔

حج کرنے کے بعد اہل وعیال کی کشش نے پھر وطن پہنچا دیا مگر خلوت وعزلت ہی کی زندگی کو ترجیح دی لیکن مذہب کی طرف زمانہ کی بے اعتنائی سے خیال ہو رہا تھا کہ گوشۂ عزلت سے نکلیں کہ حسن اتفاق سے فخر الملک نے (جو نظام الملک کا سب سے بڑا بیٹا اور نہایت علم دوست تھا) خود حاضر خدمت ہو کر نہایت عاجزی کے ساتھ نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کی صدر مدرسی قبول کرنے کی درخواست کی جو آپ نے خدمت علم دین کے پیش نظر قبول فرمائی لیکن ۱۱۰۶ء میں ایک باطنی نے فخر الملک کو شہید کر دیا اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد امام غزالی نے عہدۂ تدریس سے سبکدوش ہو کر طوس میں سکونت اختیار کی اور گھر کے پاس ہی ایک مدرسہ وخانقاہ کی بنیاد ڈالی جن کی خدمت میں زندگی کے بقیہ دن گذار کر ۱۴ جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں انتقال فرمایا اور وہیں مدفون ہوئے۔

امام صاحب نے کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی چند لڑکیاں تھیں جن میں ایک ست امنی تھیں جن کی اولاد میں شیخ مجد الدین تھے جن کا اوپر ذکر آچکا ہے آپ کے تلامذہ کی تعداد بھی بیشمار ہے خود امام غزالی نے ایک خط میں ان کی تعداد ایک ہزار بتائی ہے۔ علامہ شبلی نے "الغزالی" میں صرف سترہ کا ذکر کیا ہے جن میں محمد بن تومرت (۱۰۹۱ - ۱۱۳۳) بانی دولت موحدین اور حافظ ابن عساکر کے استاد ابوالحسن علی دینوری و ابوالحسن علی جمال الاسلام و ابوبکر عربی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

تلامذہ کی طرح آپ کی تصانیف بھی بے شمار ہیں۔ علامہ شبلی نے صرف اٹھتر ۷۸ کا ذکر کیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (جدید ایڈیشن) میں ان کی تعداد چار سو تک بتلائی گئی ہے۔ البتہ ان میں سے بیشتر کے صرف نام ہی ملتے ہیں۔ بعض آپ کی طرف غلط منسوب ہیں اور بعض متعدد جلدوں میں ہیں۔ بہر حال آپ نے تفسیر و حدیث کے علاوہ دیگر تمام متداولہ علوم اسلامیہ: فقہ، اصول فقہ، منطق وفلسفہ، علم کلام اور تصوف واخلاق میں گرانقدر تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ اگرچہ تفسیر میں یاقوت التاویل جو چالیس جلدوں میں ہے آپ کی جانب منسوب کی گئی ہے۔ مگر عام طور پر علماء اسے آپ کی تصنیف نہیں مانتے۔ میں اس جگہ آپ کی چند اہم تصانیف کے مختصر تعارف پر اکتفا کروں گا جو متفقہ طور

یہ آپ ہی کی ہیں:۔

۱۔ احیاء علوم الدین جو احیاء العلوم یا صرف احیاء کے نام سے مشہور ہے اور عربی میں چار ضخیم جلدوں میں ہے آپ کی سب سے اہم اور گرانقدر تصنیف ہے اور بعض علماء نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر امام غزالی کی اس کے علاوہ کوئی دوسری تصنیف نہ ہوتی تو ان کی شہرت جاودانی کے لیے یہی کافی ہوتی۔ مشہور محدث زین الدین عراقی کا قول ہے کہ "امام غزالی کی احیاء العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیف ہے۔" امام صاحب کے ہمعصر اور امام الحرمین کے شاگرد عبدالغافر فارسی کا بیان ہے کہ "احیاء العلوم کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی" اور شیخ ابومحمد کارزدنی کا دعویٰ تھا کہ "اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیے جائیں تو احیاء العلوم سے میں سب کو زندہ کر دوں" اسی لیے علماء و فضلاء نے آپ کی اس تصنیف کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ متعدد علماء نے اس کے خلاصے لکھے جن میں ایک خود ان کے چھوٹے بھائی احمد بن محمد غزالی کا ہے جس کا نام "لباب الاحیاء" ہے۔ حافظ جلال الدین سیوطی نے مختصر احیاء العلوم کے نام سے اس کا خلاصہ لکھا ہے۔ خلاصوں کے ساتھ ساتھ متعدد علماء نے اس کی شرحیں لکھی ہیں جن میں ایک سید نژاد مرتضیٰ حسینی بلگرامی مولانا زبیدی موطنا کی ہے جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے اور اس کا نام "اتحاف السادۃ المتقین بشرح احیاء علوم الدین" ہے۔

اس کتاب میں امام صاحب نے فلسفہ و مذہب کی ہم آہنگی کی بڑی ہی کامیاب کوشش کی ہے اور طرز تحریر اس قدر سادہ و دلنشیں ہے کہ ایک ایک فقرہ گویا دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ اس لیے اگر ایک طرف ائمہ اسلام نے اس کو الہامات ربانی سمجھا ہے تو دوسری طرف ہنری لوئس نے تاریخ فلسفہ میں لکھا ہے کہ "اگر ڈیکارٹ (یورپ میں اخلاق کے فلسفہ جدید کا بانی) کے زمانہ میں احیاء العلوم کا ترجمہ فرنچ زبان میں ہو چکا ہوتا تو ہر شخص یہی کہتا کہ ڈیکارٹ نے احیاء العلوم کو چرا لیا ہے۔"

۲۔ کیمیائے سعادت:۔ یہ فارسی میں ہے اور اگرچہ بظاہر تصوف کی ایک کتاب ہے مگر حقیقتاً اس میں تمام علوم اسلامیہ کے بحر ذخار کو یکجا کر کے ایک کوزے میں بند کر دیا گیا ہے اور اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ پیش نظر رکھا جائے کہ فارسی زبان میں علوم اسلامیہ پر یہ پہلی تصنیف ہے۔ اس لیے بقول علامہ شبلی "امام غزالی نے جب احیاء العلوم کو فارسی کا لباس پہنایا اور کیمیائے سعادت لکھی تو فارسی زبان میں کثرت سے اخلاقی تصانیف لکھی جانے لگیں جن میں اخلاق ناصری، اخلاق جلالی، اخلاق محسنی عام طور پر مشہور اور متداول ہیں۔" احیاء العلوم کی طرح ائمہ اسلام نے اس کتاب کو بھی کافی اہمیت دی ہے اور اردو میں اس کے متعدد ترجمے ہوئے ہیں جن میں پہلا بمبئی سے شائع ہوا دوسرا اکسیر ہدایت کے نام سے مولوی فخر الدین احمد کا کیا ہوا نولکشور پریس لکھنؤ سے تیسرا لاہور سے ملک دین محمد کا شائع کردہ اور چوتھا آسان اور سلیس اور بامحاورہ ترجمہ جناب نائب نقوی کا کیا ہوا شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور نے شائع کیا ہے اور غالباً یہی سب سے بہتر ہے۔

۳۔ المنقذ من الضلال: یہ امام غزالی کی خود نوشت سوانح عمری ہے جس میں انھوں نے اپنے خیالات و مذہبی تغیرات قلمبند کرنے کے ساتھ یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ کس طرح انھوں نے فلسفہ کی وادی پرخار سے گزر کر سلوک و طریقت کی راہ اختیار کی اور یہ کہ نبوت کی حقیقت کیا ہے۔ ۴۔ مقاصد الفلاسفہ: اس میں یونانی فلسفہ کے مسائل سے بحث ہے اور انھیں نہایت خوش اسلوبی و خوش سلیقگی سے پیش کیا گیا ہے اور ابتداء میں مبادیات منطق سے بحث ہے

۵۔ تہافۃ الفلاسفہ: یہ امام غزالی کی بہت ہی اہم کتاب ہے اور اس میں یونانی فلسفہ کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں اور اس کی برتری ختم کی گئی ہے۔

پبلشر قاضی معز الدین احمد ۔ مطبع لیتھو کلر پرنٹرس ۔ مقام اشاعت ۔ صفدر منزل ۔ تار بنگلہ اے ایم یو علیگڑھ

احمد رشید شیروانی

علیگ بھائیوں سے پھر التجا

مسلم یونیورسٹی کورٹ میں پورے پچیس نمائندے مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کو منتخب
کرنے ہیں۔ نئے ایکٹ کے تحت کورٹ کی پہلی میٹنگ طلب کر لی گئی لیکن ابھی تک اولڈ بوائز ایسوسی ایشن
اپنے نمائندے نہیں چن سکی۔ کیوں نہیں چن سکی؟ پوچھیے ایسوسی ایشن کے ذمہ داروں سے
اور ذمہ داران سے کون پوچھے؟ حالت یہ ہے کہ سارے ملک میں کم و بیش ایک لاکھ
اولڈ بوائز (یعنی علیگ بھائیوں) میں سے صرف ایک ہزار کے قریب اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر ہیں
اس ایسوسی ایشن کے ذمہ داروں کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ دہلی کے دسیوں پھیرے لگائیں۔ ونود دے نے
کر ارکان حکومت کے دروازوں پر دستک دیں کہ اقلیتی کردار بحال کیجیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ان کو اتنی
فرصت نہ تھی کہ [illegible] ایسوسی ایشن کی ممبر سازی کر کے اسے درحقیقت علیگ بھائیوں کی نمائندہ تنظیم بنائیں اور
اس سے بہترین پچیس ۲۵ علیگ نمائندے چن کر مسلم یونیورسٹی کورٹ میں بھیجیں۔
صرف ایسوسی ایشن کے ذمہ داران کو الزام دینے سے کیا حاصل؟ سوال یہ ہے کہ اس
وقت ایک لاکھ علیگ بھائیوں میں سے صرف ایک ہزار ایسوسی ایشن کے ممبر کیوں ہیں۔ باقی ننانوے ہزار
علیگ بھائیوں کو یہ توفیق کیوں نہ ہوئی کہ وہ اس ایسوسی ایشن کے ممبر بنیں؟ مسلم یونیورسٹی پر تنقید
سب کریں گے۔ مسلم یونیورسٹی میں یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اور جناب مسلم یونیورسٹی میں وہ کیوں نہیں
ہوتا؟ اور صاحب مسلم یونیورسٹی میں یہ ہرگز نہ ہونا چاہیے اور قبلہ مسلم یونیورسٹی میں وہ ضرور بالضرور ہونا
چاہیے۔ جس علیگ بھائی کو دیکھیے ہر مسئلہ پر اپنی رائے عالی سے سرفراز فرمائیں گے لیکن مسلم یونیورسٹی
کے تئیں ان کا جو بنیادی فرض ہے یعنی سارے ہندوستان کے علیگ بھائیوں میں سے پچیس سب سے اچھے
سب سے مفید اور کارگر علیگ بھائیوں کو منتخب کر کے مسلم یونیورسٹی کورٹ میں بھیجیں۔ بس اس فرض
کی ادائیگی کی طرف ننانوے ہزار (ننانوے فیصد) علیگ بھائیوں کی کوئی توجہ نہیں۔ یعنی یہ حضرات

مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں۔

کیوں نہیں؟ فرماتے ہیں "ارے ہمیں کسی نے ممبر بنایا ہی نہیں"۔ کمال ہے۔ یعنی ننانوے فیصد علیگ بھائی یہ توقع کرتے ہیں کہ کوئی ان کے خدمت کدہ پر فارم لے کر آئے ان سے بھروائے ان سے باعدہ پیسے لے کر جا کر فارم اور بارہ روپے ایسوسی ایشن کے دفتر میں داخل کرے اور ان کو ممبر بنوائے۔ کس کو فرصت ہے؟ کون فالتو ہے؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ علیگ بھائی خود تعلیم یافتہ ہیں۔ کامیاب ہیں اہم ہیں۔ صاحب حیثیت ہیں ان میں سے ننانوے فیصد اتنے بے حس اور لاپرواہ کیوں ہیں کہ وہ ابھی تک مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بھی نہیں بنے

پھر جب ایسوسی ایشن کے ۲۵ نمائندے منتخب ہوں گے تو کہا جائے گا ارے یہ تو نالائق ہے بالکل نکھٹو ہے، یہ ایک دم ناکارہ ہے، یہ چمچہ ہے، یہ ایسا ہے، یہ ویسا ہے۔ ظاہر ہے جب ننانوے فیصد علیگ بھائی اتنے بے اعتنا رہیں کہ وہ اس ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں بنے تو پھر ملک بھر کے سب علیگ بھائیوں میں سے بہترین منتخب ہو کر مسلم یونیورسٹی کورٹ میں کیسے پہنچ جائیں گے۔

علیگ بھائیوں کو مسلمانان ہند کی کریم کہنا غلطی نہیں۔ لیکن جب "کریم" میں سے ننانوے فیصد خود الگ ہو کر بیٹھ جائیں گے تو وہ از خود مسلم یونیورسٹی کو مسلمانان ہند کی کریم کے بہترین ٹیلنٹ کے ننانوے فیصد سے محروم کر دیں گے اور مجبوراً صرف ایک فیصد علیگ بھائیوں میں سے ۲۵ نمائندوں کا انتخاب ہوگا۔ پھر ترقی پسند علیگ بھائی بیٹھ کر چیخیں گے کہ ارے مسلم یونیورسٹی پر رجعت پرستوں کا قبضہ ہو گیا۔ بھلے آدمیوں جب تم ترقی پسند نیک معاش ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں بنو گے تو رجعت پرست بدمعاشوں کا قبضہ کیسے نہ ہوگا؟ اور "اسلام پسند" علیگ بھائی بیٹھ کر روئیں گے کہ ارے مسلم یونیورسٹی پر کفر پسند شیطان غالب آ گئے۔ نیک بختو! جب تم اسلام پسند فرشتے ایسوسی ایشن کے ممبر ہی نہیں ہوگے تو پھر کفر پسند شیطان غالب کیسے نہ آئیں گے؟ مدراسی علیگ بھائی چلائیں گے کہ سب یو پی والے بھر گئے جب آپ مدراس والے ممبر ہی نہیں بنیں گے تو اور کیا ہوگا؟

چنانچہ دست بستہ التماس سب علیگ بھائیوں سے ہے کہ خدا کے واسطے جلد از جلد مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بنیں۔ اگر ایک لاکھ علیگ بھائی ممبر بن جائیں اور ان میں سے ۲۵ بہترین نمائندے مسلم یونیورسٹی کورٹ میں چنے جائیں تو یہ پچیس ایسے ہوں گے کہ دنیا دیکھ کر دنگ رہ جائے گی۔ علیگ بھائیوں میں ایک سے ایک لائق و فائق ایک سے ایک زوردار ایک سے ایک دھاکڑ موجود ہے علیگ بھائی نہ صرف فخر مسلمانانِ ہند بلکہ فخر مسلمانان عالم ہیں۔ ہر ایک علیگ بھائی اپنی مسلم یونیورسٹی، اپنی مادرِ درسگاہ سے اتنی محبت کرتا ہے کہ کسی اور یونیورسٹی کا اولڈ بوائے اس کی آدھی بھی تہائی ایک

بمادس بھی اپنی یونیورسٹی سے نہیں کر سکتا۔ ہر ایک علیگ مسلم یونیورسٹی پر جان چھڑکتا ہے تو کیا بارہ روپے دے کر اپنی مسلم یونیورسٹی کا اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا ممبر بننا مشکل ہے۔

صرف ممبر بننا ہی کافی نہیں۔ میں تو کہوں گا کہ ہر جگہ علیگ بھائی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی شاخ قائم کریں۔ ہر جگہ کے علیگ بھائی اپنے علاقے سے چند ہونہار ترین مسلم طلبا کو وظائف دے کر مسلم یونیورسٹی میں پڑھنے بھیجیں تاکہ مسلم یونیورسٹی میں ملک کے ہر حصے سے لائق اور ہونہار ترین مسلم طلبا آکر داخل ہوں جو مسلم یونیورسٹی میں چار چاند لگائیں۔

ہر علاقے، ہر صوبے، ہر شہر کے علیگ بھائی مسلم یونیورسٹی کے ساتھ رابطہ قائم رکھیں۔ اس کے حالات میں دلچسپی لیں۔ مسلم یونیورسٹی کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ لیکن یہ سب کرنے سے پہلے اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر تو بنیں۔

میں ہر ایک علیگ بھائی سے عرض کروں گا کہ کوئی نہیں آئے گا، آپ کے پاس فارم لے کر آپ سے بھروانے۔ اگر آپ کو دلچسپی ہے تو آپ خود خط لکھ کر فارم منگائیے، اسے بھر کر بھیجیے اور منی آرڈر سے اپنا چندہ بھیج کر رسید حاصل کیجیے۔

میں پہلے بھی التجا کر چکا ہوں اور اب پھر کرتا ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار محفوظ رکھنے سے زیادہ اہم ہے کہ اس کا "عقلیتی کردار" بھی محفوظ رہے۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ملک کے تمام ذی ہوش، باشعور، ذہین اور لائق مسلمان مسلم یونیورسٹی کے معاملات میں تعمیری اور مثبت دلچسپی لیں اور ظاہر ہے سب سے زیادہ ضروری ہے کہ سب علیگ بھائی مسلم یونیورسٹی میں دلچسپی لیں اور یہ دلچسپی صرف علی گڑھ کے قصے اور لطیفے سنانے اور علی گڑھ کے دنوں کے بارے میں گپیں لڑانے تک محدود نہ رہے۔ بلکہ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے ممبر بن کر مسلم یونیورسٹی کے معاملات پر اچھا اثر ڈالیں۔

احمد رشید شیروانی
۱۲-اے کناٹ پلیس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ندوی فضلاء کی خدمت میں ایک اہم التماس

جمعیۃ الاصلاح جو طلبہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی یونین اور علمی و ثقافتی سرگرمیوں کا ایک اہم ادارہ ہے، محتاج تعارف نہیں۔ امسال اس کی ایک علمی نمائش کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ جس میں فضلائے ندوہ کی علمی و تصنیفی خدمات کا تفصیلی تعارف کرایا جائے گا۔ نیز جمعیۃ الاصلاح کی لائبریری کی تنظیم جدید کے سلسلہ میں فضلائے ندوہ کی تصانیف کا ایک الگ مستقل شعبہ قائم کر دیا گیا ہے۔ اس لیے ندوی فضلاء کی خدمت میں مودبانہ التماس ہے کہ وہ مندرجہ ذیل وضاحت طلب امور کے سلسلہ میں جلد از جلد مندرجہ ذیل پتہ پر جوابات عنایت فرمائیں۔

۱۔ مکمل نام (اصل نام۔ معروف نام) مع ولدیت و پتہ

۲ مقام و تاریخ پیدائش

۳۔ ندوہ میں مدت تعلیم و سن فراغت

۴۔ جمعیۃ الاصلاح سے تعلق کی نوعیت

۵۔ علمی کارناموں کا مختصر تعارف

۶۔ موجودہ مشاغل و معروفیات

۷۔ مطبوعہ تالیفات کا ایک ایک نسخہ بھی عنایت فرمائیں

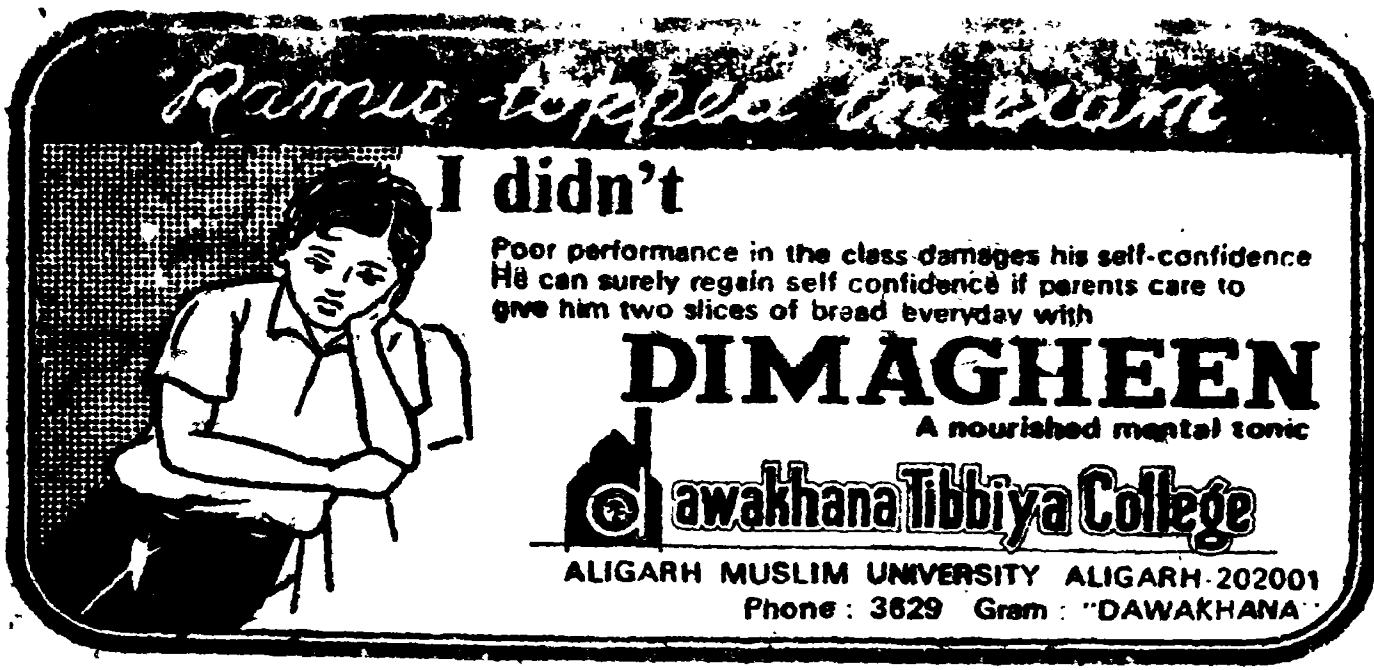
والسلام

اسحاق حسین ندوی

ناظم جمعیۃ الاصلاح

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

(الحمد)


Ramu topped in exam
I didn't
Poor performance in the class damages his self-confidence
He can surely regain self confidence if parents care to
give him two slices of bread everyday with
DIMAGHEEN
A nourished mental tonic
Dawakhana Tibbiya College
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH-202001
Phone : 3629 Gram : "DAWAKHANA"


کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوت اور
پورا فائدہ مِلتا ہے؟
۱ اپنی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اِس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔
۲ سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزا کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اِس مرکب سے آپ کے نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔
cinkara
سنکارا
ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک
ہمدرد